رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اُٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ عدل و فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر۔ بشیر احمد۔ بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر | حامد علی خاں۔ بی اے
منصور احمد

فہرست مضامین

جلد ۱۵ — بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۲۹ء — نمبر ۳

تصویر:- آمدِ افلاس

جہاں نما

چین

"مجلۂ چین" میں ملک کی موجودہ سیاسی حالت پر یوں تبصرہ کیا گیا ہے۔

وہ خطرناک خانہ جنگی جسے ملک کو پارہ پارہ کرتے ہوئے پندرہ سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا تھا آج ختم ہو چکی ہے اور اگرچہ ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ بعض علاقوں میں ابھی پوری طرح سے امن قائم نہیں ہوا، اور پیشین گوئیاں بھی ہو رہی ہیں کہ پھر جلد ہی آتش جنگ مشتعل ہوگی تاہم ہمیں ملک کے طول و عرض میں رجائیت کی ایک لہر دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ آخر اُن کا وطن اُس درد و کرب سے نجات پا چکا ہے جسے اس نئی جمہوریت کی پیدائش پر اُسے برداشت کرنا تھا اور اُن کا ملک اب قومی، سیاسی اور صنعتی ترقی کے دور میں داخل ہو رہا ہے جس کی بدولت وہ جلد سے جلد اُس مقام پر پہنچ جائیں گے جہاں وہ بجا طور پر دوسری ترقی یافتہ قوموں کی ہمسری کا دعویٰ کر سکیں گے۔

۱۹۱۱ء کے انقلاب کے بعد شاید پہلی مرتبہ ملک کنئے کو ایک حکومت کے ماتحت آیا ہے اور گو حکومت کو ابھی بہت سا کام انجام دینا ہے اور اُس کو اس میں بہت سی مشکلات بھی پیش آئیں گی لیکن پھر بھی بڑی حد تک کام سر انجام ہو چکا ہے اور ملک مبارکباد کا مستحق ہے کہ اُس نے اتنی ترقی کر لی ہے۔

موجودہ صورتِ حالات میں ہمیں مستقبل کے لئے بڑی بڑی امیدیں نظر آتی ہیں اور جب تک موجودہ حکومت تجارت، صنعت، اندرونی سیاسیات اور بیرونی تعلقات کو قائم کرنے میں اپنی مساعی کو سرگرمی سے انجام دے رہی ہے ہم دل و جان کے ساتھ اُس کے مقاصد سے ہمدردی رکھتے ہیں۔

ہمیں یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ اگر وہ جن کے ہاتھ میں طاقت ہے اپنے اختلافات اور خواہشات کو مٹا کر اُن بہت سے مشکل مسائل کو مل کر باہمی مشوروں سے حل کریں جو اس وقت ہمیں درپیش ہیں تو کوئی شک نہیں کہ چین پر حقیقت میں امن و فلاح کا زمانہ آ جائے۔

آخر خدا نے عیسائیوں ہی کو امن و محبت کا منصب دے کر زمین پر نہیں بھیجا، چین کے حکما و عقلا ہمیں بھی یہ سبق دے گئے ہیں، اور ہم اُن سے جن کے ہاتھوں میں ملک کی قسمت کی باگ ڈور ہے یہ کہیں گے کہ وہ اپنے آبا کی تعلیم کی طرف راغب ہوں اور علم و عرفان کے اُن سرچشموں میں سے قومی عظمت کے رازوں کو سیکھیں۔

اور ان رازوں میں سے سب سے بڑا راز یہ ہے کہ لوگوں کی فلاح و بہبود کا نہایت دیانت داری سے پاس کیا جائے اور سب کے حقوق کا حد درجہ احترام ملحوظ رکھا جائے۔ صرف اُس وقت تک حکومت کو کامیابی کی توقع رکھنی چاہیے جب تک اُس کے دل میں ان باتوں کا خیال ہے۔

اُر کے مقبرے

کالدیوں کا شہر اُر جو زیادہ تر حضرت ابراہیم کا وطن ہونے کی حیثیت سے معروف ہے برطانی عجائب خانے اور جامعۂ پنسلوینیا کی متفقہ جمعیتوں کی کوشش سے حال ہی میں منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔ جب یہاں کے شاہی مقابر کی کھدائی ہوئی تو معلوم ہوا کہ ایک ملکہ اور بادشاہ کی موت پر جسے پانچ ہزار سال کا عرصہ گزر چکا ہے اُن کے ساٹھ خدام کو قتل کر کے ساتھ دفن کر دیا گیا تاکہ دوسرے جہان میں بھی بادشاہ اور ملکہ اُن کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ بادشاہ اور ملکہ سومیری حکمرانوں میں سے تھے۔ بادشاہ کا نام میس کلم ڈگ اور ملکہ کا نام شُب آد تھا۔ پہرے کے سپاہیوں حرم کی عورتوں، خادموں اور خادماؤں سائیسوں، گاڑی بانوں، سازندوں، غلام بچوں کے علاوہ چھ بیل اور دو گدھے اس وحشت و بربریت کا شکار ہوئے سرزمینِ فرات کی قدیم تہذیب کے نشانوں میں سے مقابر کی دریافت اب تک عظیم ترین تصور کی جاتی ہے اور اپنی انتہائے ندرت کی حیثیت سے مصر کی نادرات سے بڑھ کر نہیں تو اُس کے برابر ضرور ہے۔

مختلف اشیا کی اہمیت اور اس قسم کی قربانی کی رسم کے انکشاف کے علاوہ جو بات مکتشفین نے دریافت کی ہے وہ مقبرے کے صدر دروازے کی ایک نفیس محراب ہے جو پکی ہوئی اینٹوں سے بنی ہے اور اس طرزِ تعمیر کی قدیم ترین مثال ہے۔

شہنشاہِ روم کا مجسمہ

روم کے شہنشاہِ اعظم مارکوس اوری لیوس کا مجسمہ جس میں وہ گھوڑے پر سوار ہے اور جو صدیوں سے کیپی ٹولین ہل پر ایک چبوترے کے درمیان کھڑا ہے کچھ عرصہ سے لوگوں کی حیرت و استعجاب کا سامان بن رہا ہے۔ یہ مجسمہ رومیوں کو اس قدر محبوب ہے کہ اس کے نقصان کو وہ شاید "وحشیوں" کے فتنہ سے بھی بڑھ کر محسوس کریں گے۔

جب بعض اخباروں نے لکھا کہ غالباً مجسمہ کا توازن برقرار نہیں رہا اور شہنشاہ کو ایک طرف جھکتے ہوئے دیکھا گیا ہے، اس لئے خطرہ ہے کہ کہیں وہ اپنے دیو قامت گھوڑے سے کسی وقت گر نہ جائے تو رومی بھاگے بھاگے جوق در جوق مجسمہ کو دیکھنے کے لئے کیپی ٹولین ہل کی جانب جانے لگے لیکن یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ یہ فلسفی بادشاہ اپنے اسپ پر یا

پر بے چین ہو گیا ہو۔

گزشتہ چند صدیوں کے دوران میں رومیوں کو اکثر اس خطرے سے دوچار ہونا پڑا ہے بعض دفعہ صبح کے وقت لوگوں نے دیکھا کہ شہنشاہ کچھ آگے کی طرف جھکا ہوا ہے جیسے وہ بیزار ہو کر اپنے گھوڑے سے اترجانا چاہتا ہے پھر کبھی یوں معلوم ہوا کہ اُس نے اپنے پاؤں رکاب میں سے نکال لئے ہیں اور راتوں رات لوگوں کی نظر بچا کر نکل جانا چاہتا ہے کہ کسی مقبرے میں پہنچ کر قدیم باعظمت رومیوں میں مل کر محوِ خواب ہو جائے۔ اُس کو سکون و قرار دینے کی ہمیشہ کوششیں کی گئیں۔ تقریباً اسّی سال گزرتے ہیں کہ سیسہ پگلا کر اُس کی ایڑیوں میں پلا دیا گیا تاکہ وزن بڑھ کر توازن درست ہو جائے۔

اب دیکھا گیا ہے کہ کسی پُراسرار طریقہ سے شہنشاہ کی واہنی ایڑی بائیں سے پورے چار انچ نیچی ہو گئی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے اپنے پاؤں رکاب میں سے نکالنے کی پھر کوشش کی ہے۔

مجسمہ کو ۱۵۳۸ء میں پوپ پال سوم نے مائیکل اینجلو کے خیال پر کاربند ہو کر کیپی ٹولین ہل پر نصب کیا تھا۔ اس سے پہلے صدیوں تک یہ لیٹرن بسلیکا کے سامنے کھڑا رہا۔ لیکن کب اور کیونکر وہاں نصب ہوا یہ کوئی نہیں جانتا۔

مگر اس قدر یقینی ہے کہ شہنشاہ نے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر دن اور رات ہر قسم کے موسم برداشت کر کے پندرہ سو سال گزار دیئے ہیں۔ اس طویل مدت میں اُس نے بڑے بڑے انقلاب دیکھے ہیں۔ اُس نے وحشیوں کے حملہ کو قرونِ وسطیٰ کے ہنگاموں کو، کولا ڈی رینزو کے انقلابوں کو اور "شہر جادواں" سے پوپوں کی ہجرت کو دیکھا ہے۔

انجینیروں اور فنِ تعمیر کے ماہروں کو موجودہ صورتِ حالات کا معائنہ کرنے کے لئے بلایا گیا ہے۔ روم کے گورنر نے خود ایک خاص مجلس کو متعین کیا ہے کہ وہ شہنشاہ کے مجسمہ کے متعلق حفاظت کی تدابیر عمل میں لائیں۔

صلح یا جنگ

انسان کی ترقی میں زیادہ حصہ کس نے لیا ہے؟ صلح نے یا جنگ نے؟ یہ ایک سوال ہے جو اکثر کیا گیا ہے مگر جس کا فیصلہ کن جواب دینا مشکل ہے۔ یقیناً وہ لوگ جو مریخ کے پرستار ہیں ہرقلیطوس کے ہم آہنگ ہو کر یہی کہیں گے کہ "جنگ ہر چیز کا باپ ہے" یا ایک اور حکیم کے بہ قول "جنگ تمام اچھی چیزوں کی ماں ہے" جرمن اہلِ قلم اور ماہرینِ سپہ گری نے جنگ کی تعریف میں بہت کچھ کہا ہے، ان اقوال کو مسٹر ولیم آرچر نے "جرمن حکمت کے پانچ سو موتی" کے نام سے ایک کتاب کی شکل میں جمع کر دیا ہے۔ ہم ان موتیوں میں سے چند ایک یہاں پیش کرتے ہیں۔

جرمنی انسانیت کا مستقبل ہے۔ . . . . جرمنیّت کا زوال انسانیت کا زوال ہوگا۔

جنگ ایک الوہی ادارہ ہے، ایک عالمگیر قانون ہے جو فطرت کے ہر شعبہ میں موجود ہے۔ جنگوں سے مطلع اسی طرح صاف ہو جاتا ہے جیسے طوفانِ بادوباراں سے ۔۔۔۔۔۔ برک ہارٹ

پیہم امن ایک خواب ہے، لیکن کوئی خوبصورت خواب نہیں۔ جنگ خدا کا ایک جاودانی ادارہ ہے۔ . . . . . جنگ نہ ہو تو انسانیت مادہ پرستی میں غرق ہو جائے ۔۔۔۔۔۔ مولکے

جنگ ہمیشہ ہوا کرے گی اور اس کا اعادہ انسانیت کے ورد کی حکمی دوا ثابت ہوگا ۔۔۔۔۔۔ ٹریشکی

یسوع نے خود کہا تھا "میں زمین پر امن لے کر نہیں آیا بلکہ تلوار لے کر آیا ہوں"، دنیا میں کوئی مذہب مسیحیت سے زیادہ جنگ آزما نہیں ہوا ۔۔۔۔۔۔ برن ہارڈی

انسانیت سے، جب وہ بھول ہو گئی ہو کہ جنگ کیونکر کی جاتی ہے، بڑی بڑی توقعات رکھنا جنوں نہیں تو کیا ہے ۔۔۔۔۔۔ نیٹشے

جب تک ہم ارتقا کی طرف سے اپنی آنکھیں بند نہ کرلیں ہمیں جنگ کی ضرورت کو ماننا پڑے گا ہمیں جنگ کو قبول کرنا پڑے گا وہ ہماری ترقی اور وجود کے ساتھ قائم رہے گی۔ ہمیں جاودانی جنگ کو قبول کرنا پڑے گا۔
ویگ نر

صرف قبرستان کے سیاہ دروازے پر ہمیں "امنِ جاوداں" کے الفاظ نظر آسکتے ہیں۔ جو لوگ زندہ ہیں اُن کے لئے "جاودانی جنگ" ہی بہترین مقولہ ہے ۔۔۔۔۔۔ ویگ نر

دنیا کے نام نہاد امن میں سکون نہیں ہے بلکہ خلفشار ہے ۔۔۔۔۔۔ ہبولڈ

قلم نما بندوق

بنکوں میں استعمال کے لئے ایک قسم کا قلم ایجاد ہوا ہے جس سے ڈاکوؤں کو زیر کرنا مقصود ہے۔ اس میں گیس کا دھواں بھرا رہتا ہے اور ایک چھوٹی سی کمانی کے ذریعہ سے اسے بارہ فٹ کے فاصلہ تک پھینکا جا سکتا ہے۔ ناواقفوں کو اس سے بڑا دھوکا لگ جاتا ہے کیونکہ اس کی ہیئت دیکھ کر اس کے مقصد کا علم نہیں ہو سکتا۔ کارتوس داخل کرنے کے لئے قلم درمیان سے کھلتا ہے۔

افلاس

اے خدا! یہ روٹی اتنی مہنگی ہے اور گوشت اور خون اتنا سستا ہے! ـــــ ہڈ

افلاس اتقا کے ہاتھوں سے زمامِ حیات چھین لیتا ہے ـــــ سعدی

مفلس ہونا ایک امرِ اضافی ہے اس لئے غیر شریفانہ نہیں ـــــ بلورلٹن

معاشرہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ افلاس کا معیار بھی بڑھتا ہے ـــــ پارکر

تنگی کو کاٹنے کا بھی ایک شریفانہ ڈھنگ ہے جسے یہ معلوم نہیں وہ کبھی فراخی کا منہ نہ دیکھ سکے گا۔
سنیکا

غریبی کا سب سے بڑا ستم یہ ہے کہ وہ انسان کو مضحکہ خیز بنا دیتی ہے ـــــ جونیل

غریب وہ نہیں جس کے پاس کم ہے، غریب وہ ہے جسے زیادہ کی ہوس ہے ـــــ سنیکا

پھٹے ہوئے کپڑوں میں سے چھوٹی چھوٹی بدیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ مگر چغے اور فرغل ان سب کو چھپا لیتے ہیں ـــــ شیکسپیر

دولت کی کمی آسانی سے پوری کی جاسکتی ہے مگر روح کا افلاس ناقابلِ تلافی ہے۔

منصور احمد

آمد اجلاس
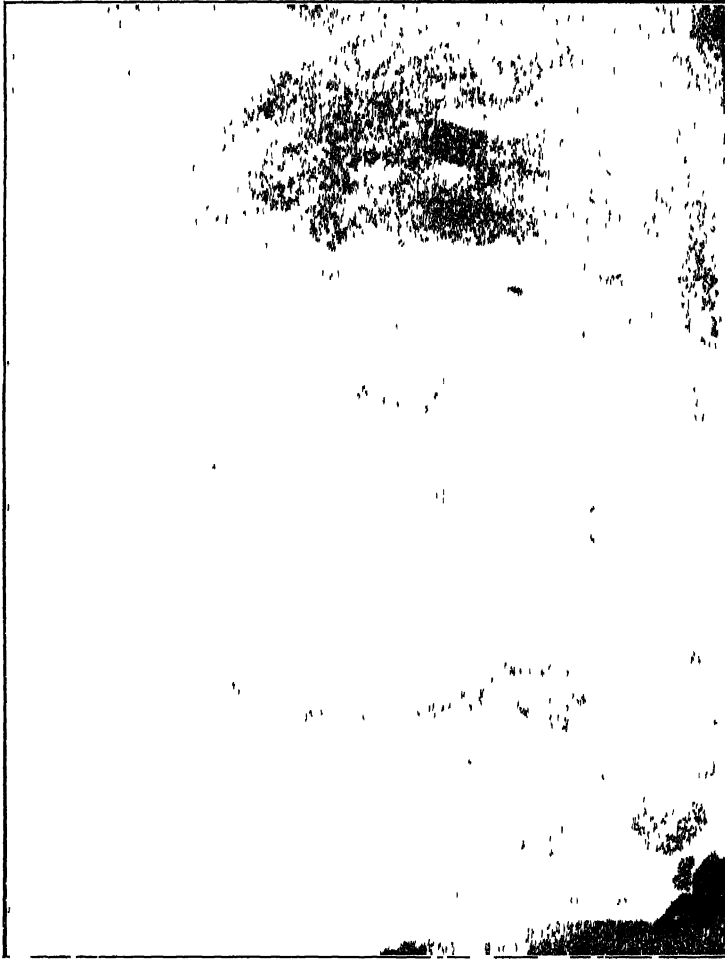
تعلیم میں آزادی

۱- آزادی تعلیم کا مقصد ہے۔ آزادی کا تعلق انسان کی روحانی فطرت سے ہے اور روحانی فطرت ہی کی بدولت اُس کو وہ زندگی حاصل ہوتی ہے جو روح اور جسم دونوں کو آزاد کردیتی ہے۔ انسان اپنی روحانی اور فطری حیثیت ہی سے آزاد پیدا ہوا ہے اور آزادی اس میں بالقوۃ موجود ہے وہ اسے اپنی پیدائش ہی سے ساتھ لاتا ہے۔ انسان کا بچہ صرف اسی لحاظ سے آزاد ہے اور آزاد کہلاتا ہے کہ اس کی فطرت ہی میں روحانیت ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اُسے بالکل آزادی کے ساتھ اُس کی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ جب تک ہم اپنی فطرت سے خائف ہیں اور جب تک ہم خود کو یعنی اپنے روحانی وجود کو پہچاننے کی جرأت نہ کریں گے اُس وقت تک ہم بجا طور پر مسئلہ تعلیم پر بحث کرنے کے قابل نہیں ہوسکتے روحانی معلومات کی روشنی ہی میں ہم تعلیم اور زندگی کے بہترین نتائج کی امید کرسکتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ روحانیت کی تحقیقات کے بارے میں ہم ہر قسم کی سعی او کوشش کا خیر مقدم کریں اور ہمیں اس کے نور کو قبول کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہئیے۔ خواہ وہ کسی ذریعہ اور وسیلہ سے ہو۔

اب ہم کو اس امر پر غور کرنا چاہئیے کہ زندگی کے روحانی معنی کے معلوم کرلینے اور آزادی کی حقیقی روحانی قدر و قیمت کے سمجھ لینے کے بعد تعلیم کے مسئلہ پر کیا اثر پڑ سکتا ہے اور اُس کے کیا کیا عملی نتیجے رونما ہوسکتے ہیں۔ اس امر کے تسلیم کرنے میں ہمیں مطلق تامل نہ ہونا چاہئیے کہ بچہ ایک متبرک ہستی ہے اس لئے اُس کی ہستی اور وجود کا مطالعہ کرکے اُس کی اس طرح مدد کرنی چاہئیے کہ وہ اپنی اصل نوعیت ہی میں ترقی کرے۔ نہ یہ کہ اُس کو مٹا کر اُس کی بجائے ایک فرضی اور محض مصنوعی چیز بنا کر اپنے سامنے رکھی جائے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہر بچے میں ایک روحانی ہستی اور ایک قوتِ حیات ہے۔ اِس لئے ہمیں چاہئیے کہ ہم اُس کی جی جان سے حفاظت کریں او اُس میں بے جا مداخلت کرنے سے اجتناب کریں۔ بچہ طبعًا آزاد ہے اِس لئے ہم پر بھی واجب ہے کہ ہم اسے فطری اور انسانی اور ماحول کی بندشوں سے آزاد کر دیں۔ اگر واقعی ہمارا یہ مقصد ہے کہ وہ آزاد اور خود دار ہستی ہوکر رہے تو اُسے نہ صرف اپنے فطری ذوق سے بلکہ اپنی غلطیوں سے بھی زندگی بسر کرنے اور صحیح اور صالح عمل پیدا کرنے دینا چاہئیے۔

مدرسہ حقیقی آزادی کی راہ میں ایک بہت ہی ضروری منزل ہے کیونکہ یہی وہ منزل ہے جو اُس کے "گھر" اور وسیع دنیا کے درمیان واقع ہے۔ اور اسی منزل اور اسی مکان سے گزر کر وہ اس بڑے مکان میں پہنچتا ہے۔ ایسے مدرسوں میں جن

کو تمام انتظامی حقوق دے دیئے گئے ہیں یہ پایا گیا ہے کہ مدرسہ کی باقاعدگی کے لئے ایک عام خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ہر فرد پر اس کا بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔

۲۔ آزادی ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے ۔ دنیاوی زندگی روحانی بصارت کی محتاج ہے اور ہمارا نصب العین یہی ہونا چاہئے کہ ہم اپنے بچّوں کے لئے ایسے ذریعے اور وسیلے پیدا کریں جن سے اُن میں حقیقی بیدار مغزی پیدا ہو اور وہ اپنی حیات کے ہر لمحہ میں بہتر اور زیادہ کامل ہوتے جائیں۔ بچوں کو اس امر کے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ حیات کو کس کس طرح استعمال کرنا چاہئے اور اس سے کیا کیا فائدے حاصل ہو سکتے ہیں تاکہ وہ ایک کامل انسان کی حیثیت پیدا کر سکیں لہذا ہمارا فرض ہے کہ ہم اُن کی صحیح طریقہ پر راہنمائی کریں تاکہ وہ زندگی کی اصل ماہیت اور قدر و قیمت کو صحیح طور پر سمجھ سکیں۔

"آزادی" کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر استعمال کرنے سے مراد یہ ہے کہ ہم پوری طرح سے اس صداقت کو تسلیم کر لیں کہ انسانی زندگی کا دار و مدار روحانیت پر ہے۔ کیونکہ جب تک ہم اس صداقت کے معتقد نہ ہونگے حقیقی تعلیم کا حاصل ہونا ممکن نہیں ہو سکتا۔

انسان ایک پیچیدہ ہستی ہے اگر امن اور ہم آہنگی مقصود ہو تو اُس کے افراد میں اشتراکِ عمل ہونا چاہئے محض یہی بات اِس امر کی مقتضی ہے کہ فضا و عمل آزاد ہو۔

ایک بچّہ کے جسم اور ذہن کا حقیقی نشو و نما صرف آزاد فضا ہی میں ممکن ہے اس لئے بچوں کی ماہیّت ہی میں روحانیت داخل ہے۔ بچّے جب بغیر کسی قسم کی روک ٹوک کے کام کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اُن میں نیک خیالات کے آثار موجود ہیں اور یہیں سے فنونِ لطیفہ میں اُن کے علمی ذوق و شوق کی ابتدا ہوتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جن نتائج پر وہ پہنچتے ہیں وہ نوجوانوں سے زیادہ صحیح اور درست ہوتے ہیں۔

یہ خیال کہ مدرسہ ایک خود دار منتظم جماعت ہے اب ہر طرف مقبول ہو چکا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ مدرسہ اور جماعت دونوں کے اندرونی انتظامات اور اُن کی تنظیم اور ترتیب خود طلبا کے ہاتھ میں بہت سرعت کے ساتھ منتقل ہو رہی ہے۔ اور اس طرزِ عمل سے نہایت ہی تشفی بخش نتائج حاصل ہو رہے ہیں۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ جہاں کہیں لڑکے اور لڑکیاں پوری طرح ذمہ دار کر دی جاتی ہیں وہاں قواعد عموماً بہت سخت ہوتے ہیں اور عدولِ ضابطہ کی سزا بھی سخت ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کی حالت ایسے مدرسوں سے بہتر ہوتی ہے جہاں استاد اور اُستانیاں مدرسہ کی ذمہ دار ہوں۔ اور اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جہاں ضرورت کے اصلی معنی سمجھے جا چکے ہوں وہاں کسی طرح

بھی قاعدہ اور ضابطہ کی خلاف ورزی کا احتمال نہیں ہو سکتا۔ کم سن طبائع کو جس چیز سے خاص نفرت ہے وہ یہی ہے کہ اُن کی آزادی میں کسی طرح کی دست اندازی ہو۔

۳۔ ترقی کے مدارج۔ انسان کے مدارجِ ارتقا کے متعلق اب تک جو خیال عام طور پر رائج ہے وہ بہت کچھ مبہم اور غلط سمجھا جا رہا ہے۔

جب ہم ایک عملی نقطۂ نظر سے تعلیم کے مدارجِ ارتقا کا ذکر کرتے ہیں تو ہماری مراد جسمانی، دماغی اور قلبی قوتوں کی ترقی سے ہوتی ہے اور ہمارا منشا وہ تدریجی ترقی ہوتا ہے جس سے ہماری شخصیّت اور خودی آگے بڑھتی اور تقویّت حاصل کرتی ہے۔

ہم ذیل میں مدارجِ ارتقا کی تشریح کرتے ہیں۔ مگر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس تشریح میں ذہنی ترقی کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے:۔

سات سال کی عمر سے قبل چھوٹے بچوں کو صرف اپنے عملی تجربوں سے سبق حاصل کرنے دینا چاہئے۔ اگر بچّے کو یہ سکھانا مقصود ہے کہ وہ اپنے حواس کو آزادی کے ساتھ کس طرح استعمال کر سکتا ہے تو اس عمل کا بہترین زمانہ اُس کے لئے وہی ہے جب کہ ذہن اور حواس کے قوٰی ترقی کے مدارج طے کر رہے ہوں۔

میڈم مون ٹیسوری کا یہ خیال بالکل صحیح تھا کہ لڑکوں کے لئے پند آموز اسباب مہیا کئے جائیں اور وہ براہِ راست انہیں سے تعلیم حاصل کریں۔ سات برس سے کم عمر کے بچوں کو بہت کثرت سے عقلی تجربے کرنے چاہئیں اور اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُن کے سامنے جس قدر اشیا ہوں وہ سب "زندہ" حالت میں موجود ہوں۔ ایک چھوٹا بچّہ ایسی ضروری اشیا کا محتاج ہوتا ہے جن سے وہ اپنے آپ کو مصروف رکھے اور اُس کا ماحول ایسا ہو کہ وہ اپنی معلومات بغیر مزاحمت کے حاصل کر سکے۔ اگر چھوٹے چھوٹے بچوں کو مشغول رکھنے کے لئے کافی سامان مہیا ہو تو کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی طرح تکلیف دہ یا شریر ہوں۔ اسی لئے یہ ضرورت ہے کہ اُن کو بالکل شخصی آزادی دی جائے۔

والدین کا یہ سوال ہوتا ہے کہ بچے کو کب پڑھانا چاہئے؟ اور جب اُن سے یہ کہا جاتا ہے کہ عمر کا تعیّن نہیں کیا جا سکتا تو اُنہیں سخت مایوسی ہوتی ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ اُس وقت تک انتظار کیا جائے جب تک کہ بچے میں تعلیم پانے کا احساس از خود پیدا نہ ہو۔ بہت کم عمر میں پڑھنا شروع کرا دینے سے ہمیشہ نقصان کا خطرہ رہتا ہے۔ اس لئے ابتدائی سال تو محض ماحول کے مطالعہ کے لئے مخصوص کر دیئے جائیں اس کے بعد مناسب وقت کا انتخاب کیا جائے۔ لکھنے کے متعلق بھی یہی ہونا چاہئے۔ لکھنا نقشہ کشی سے پہلے شروع کیا جائے۔ اور یہ دونوں یعنی لکھنا اور نقشہ کشی۔

ھنے سے پہلے۔

بچپن ہی سے حفظ کرنے کی ترغیب نہ دی جائے۔ ایک ایسا زمانہ آتا ہے جو سات سے بارہ سال تک محدود
ہے جب کہ حفظ کرنا نہ صرف آسان بلکہ مناسب بھی ہوتا ہے۔ یہ امر بچوں کی فطرت کے قطعی خلاف ہے کہ جب وہ
عت میں ہوں تو حفظ کریں۔ کسی کھلے مقام پر جہاں چلا پھرا جا سکے، (یا باغ میں حفظ کیا جائے تو بہتر ہے) اس لئے
س طرح حفظ کرنے میں نہ صرف آسانی ہوتی ہے بلکہ اس کا جسمانی ترقی پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے۔ ہمیں کسی بچے کی
ی میں مزاحم نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اسے اُسکی رفتار پر چھوڑ کر بالغ ہونے دینا چاہیئے تاکہ اُس کے حقوقِ طفلی قائم رہیں۔
یہ ظاہر ہے کہ کسی ایسے استاد کا کام جو طلبہ کے لئے راہِ آزادی کی بنا ڈالنا چاہتا ہے آسان نہیں اُس
، لئے علم ہمدردی فہم اور ہر ایک طرح کے خلقی اور خوش آیند عمل کی ضرورت ہے تاکہ ہر ایک بچے کی ترقی کی حالت
امل احساس و ادراک ہو سکے اور کوئی رُخ باقی نہ رہ جائے۔

نو سال کی عمر سے سن بلوغ کے پہنچنے تک بچے کو اپنی شخصیت کی جداگانہ ہستی کا خیال پیدا ہونے لگتا ہے
زندگی کا خوف اور کچھ یہ احساس کہ وہ تنہا ہے اور رہنمائی کا محتاج - وہ کسی پیشوا کی ہدایتوں کا طالب رہتا ہے۔
بلوغ کے ساتھ ہی اُس میں جذبات نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ حیا بڑھ جاتی ہے اور بعض اوقات اس کی غیر معمولی
رت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت نوجوانوں کو ایسے معتمد دوست کی بے حد ضرورت محسوس ہوتی ہے جس سے وہ
رہ کر سکیں۔

والدین اپنے اور لڑکے لڑکیوں کے تعلقات کی اہمیت کو جو بارہ برس کی عمر کے بعد سے بتدریج بدلتے رہنے چاہیں
کر بہت نقصان اُٹھاتے ہیں۔ نوجوانوں کے لئے اُن کے بہترین دوست اُن کے والدین ہونے چاہئیں۔
فہم و ادراک کے ارتقائی مدارج جو ۱۱ سے ۱۵ سال کے درمیان واقع ہوتے ہیں نہایت
اہم ہیں۔ ہر قسم کی تحصیلِ علم کا جو ذوق شوق اس دور میں ہوتا ہے وہ یقیناً پھر کبھی نہیں ہوتا اس
پر طلبا کو قواعد اور اصول کے تنہا مطالعہ اور غور کا پابند کرنا سخت غلطی ہے۔ زندگی کا وہ پہلو جو بڑھنے والے جذبات
تعلق ہے ایک ایسے مناسب سرچشمہ کا محتاج ہے جو علمِ ادب سے مخروج ہے سوائے اچھی ادبی کتابوں کے مطالعہ
اور کوئی شے جذباتی زندگی کی رہنمائی صحیح اصول پر نہیں کر سکتی۔ تاریخ و ادب کی مناسب تعلیم نہایت ہی اچھی ہے
س میں خوشگوار نتائج مضمر ہیں۔ ناصحانہ اور بلاواسطہ اخلاقی تعلیم غیر مرغوب ہوتی ہے۔ لیکن مناظرہ اور مباحثہ جس
بنسبت استاد کے طالب علم بہت زیادہ تقریر کرتا ہے خیالات کی صفائی اور باہمی تفہیم میں نہایت بیش بہا

اضافہ کرتے ہیں۔ خصوصاً لڑکپن کے آخری سالوں میں جب جسم و دماغ کے تدریجی ارتقا کے ساتھ سچی روحانیت اپنا عمل کرتی ہے تو یہ چیز نوجوانوں کے لئے اہمیت رکھتی ہے تاکہ وہ آزادی کی ذمہ داریوں کو بخوبی سمجھ سکیں۔

اگر ہر منزل کے مناسب علموں کو تمام قید و بند سے آزاد کر کے ترقی دیں اور اپنی زیرِ نگرانی کر لیں اور اگر ہم بچے کے لئے کلیدِ علم بھی مہیا کر دیں جس سے اچھائی کی طرف اُس کی آنکھیں کھل جائیں تو سمجھ لیجئے کہ اس عمل سے ہم نے اُسے تحصیلِ روحانیت کے لئے آزاد راستہ پر چلنے کے لئے آزادی دے دی۔

اس کے بعد ایک اور درجہ شعورِ ذات کا آتا ہے جب کہ کسی گہری مناسبت کا پیدا ہونا ممکن ہو جاتا ہے۔ لفظ "مناسبت" میں ہر جائز محبت اور ہمدردی جو ہم سنوں یا مختلف العمر لوگوں میں ہو شامل ہے۔ جیسے استاد و شاگرد میں دوستی کا ہونا۔ دوستی کی ضرورت اس قدر شدید ہے کہ مصنوعی رکاوٹیں اس ارتباط کے درمیان حائل کرنا خلافِ عقل ہے۔ ظاہرا نامناسب دوستی کا قیام والدین اور اُستاد کے لئے ہمیشہ تفکر اور پریشانی کا باعث ہوا کرتا ہے مگر عموماً ہر فرد ایسے موقع پر اپنی ضرورت کو بہتر جانتا ہے۔ اور نامناسب و ناموزون دوستی ہو تو دوست فطرتاً جدا ہو جاتے ہیں۔ ایک اور امر ایسا ہے کہ جس کا ہم صرف سرسری ذکر کر سکتے ہیں اور وہ یہ کہ اصناف کا اختلاف ترقی پر کہاں تک اثر کرتا ہے۔

یہ بات بالکل عیاں ہے کہ لڑکیاں بہ نسبت لڑکوں کے بہت جلد ذہنی پختگی حاصل کر لیتی ہیں۔ اور اُن کے عمل کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ ایک معینہ مدت میں بمقابلہ لڑکوں کے زیادہ دماغی کام کر سکتی ہیں۔ مگر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر وہ کئی گھنٹوں تک کام نہیں کر سکتیں۔ اگر وہ مسلسل کام کرتی ہیں تو زیادہ تھک جاتی ہیں یا محض تحفظِ ذات کی غرض سے لاپروائی سے کام کرتی ہیں اور اپنی پوری قوت سے کام نہیں لیتیں۔ یہ عادت اُن میں مستقلاً پیدا ہو جاتی ہے اور اُن کی آئندہ زندگی میں نقصان دہ اثرات پیدا کر دیتی ہے جسمانی و دماغی قویٰ کا صرف حسبِ ضرورت پوری قوت سے استعمال کرنا ہی زیادہ بہتر ہے۔ اِس سے بہت سا وقت آرام اور فرصت کے لئے فراہم ہو سکتا ہے۔ بہترین دماغی نتائج حاصل کرنا مقصود ہوں تو لڑکی کو موقع دیا جائے کہ جب تک اُس کی طبیعت تازہ اور موزوں رہے جس قدر ممکن ہو کام کرے اور اس دوران میں کبھی کبھی دم بھی لیتی جائے۔

معلم کی آزادی ۔ فی زمانہ استاد کا مسئلہ نہایت اہم ہے۔ اساتذہ کی استعداد ناکافی ہے اور اُن کی قابلیتیں بالکل متغائر ہیں۔ تدریس اس زمانہ میں بھی نہایت مناسب پیشہ سمجھا جاتا ہے لیکن اگر کوئی اور کام حاصل ہونا ممکن ہو تو بہت کم تعداد اس پیشہ میں داخل ہوتی ہے۔ چنانچہ اکثر یہ قول سننے میں آتا ہے کہ جب دوسرے پیشے میسّر نہیں

ہوتے تو ہم ہمیشہ تعلیم کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔

یہ خیال عام طور پر پھیلا ہوا ہے کہ اساتذہ کا میدانِ عمل تنگ اور آزادی بہت کم ہے اور یہی وہ امر ہے جو اعلیٰ درجہ کے مردوں اور عورتوں کو اس پیشہ کی طرف راغب کرنے میں حارج ہوتا ہے۔ صرف انفرادی کوششوں سے مالی توقعات بہت کم ترقی کی گنجایش رکھتی ہیں۔ تنخواہوں کے درجے اور ضابطے اور سخت سخت قوانین تعلیمی خدمات کے محاصل کو محدود کر دیتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ تعلیمی پیشہ میں ایسی بہت سی مخالفانہ رکاوٹیں مثلاً رائے عامہ، آدابِ ملازمت وغیرہ بھی موجود ہیں۔ ہم ہمیشہ اس امر کو بھول جایا کرتے ہیں کہ استاد کا بہترین عمل خلقی ہے، اور ہم یہ تصوّر نہیں کر سکتے کہ ایک خلقی صناع اپنا کام اچھی طرح نہیں کر سکتا تاوقتیکہ اُس کو پوری آزادی حاصل نہ ہو۔

ہم کو اس کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ استاد حسبِ ضرورت اپنی تمام معلومات اور فراست سے کام لے سکتا ہے مگر اُسے اس امر کا موقع دیا جانا چاہیئے کہ وہ اپنی معلومات اور فرزانگی کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق فراہم اور استعمال کر سکے۔ مگر ہم کو اساتذہ پر اتنا ہی بھروسا ہے جتنا کہ طلبا پر اور اسی لئے ہم اُن کو آزادی دیتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ہماری بہت سی تعلیمی مشکلات کی بنیاد یہی باہمی بے اعتمادی ہے۔

تعلیمی پیشہ کی طرف عموماً اُن لوگوں کی توجہ ہوتی ہے جو کلیہ کو چھوڑ دیتے ہیں اور بجائے اس کے کہ کسی فنِ لطیف یا کسی خلقی کام کو اختیار کریں اس پیشہ کو ذریعۂ کسبِ معاش بنا لیتے ہیں۔ مقررہ روزانہ کام کی قید و بند کی دیواریں، نصاب کا نظم الاوقات، امتحانات، ضوابط اور طریقِ تعلیم یہ سب چیزیں اُن نوجوان شوقینوں کو محصور کر دیتی ہیں جو تعلیم کو اپنا پیشہ بناتے ہیں حتیٰ کہ والدین بھی زندگی کی سرگرمیوں کو اندر ہی اندر ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آزاد خلقی مشاغل اور عمل کی تحریک سے بے حس ہو جاتے ہیں۔

ہماری امیدِ مستقبل کا انحصار اس پر ہے کہ ہم ایسے اساتذہ کی تعداد میں اضافہ کریں جو کسی حد تک اندرونی اور بیرونی آزادی حاصل کر سکیں اور ہمیں فکر یہ ہو کہ جس طرح ممکن ہو ہم اُن کے کام کو فروغ دیں۔

تعلیمِ اساتذہ۔ ایک استاد کی تعلیم کا نصاب نہ صرف مطالعۂ نظریات تاریخِ تعلیم اور اسالیبِ تعلیم کے جو تعلیمی عمل کے ساتھ ہو، سیکھنے پر منحصر ہو بلکہ بہت زیادہ زور تدریس کے فن پر دینا چاہیئے۔

بسا اوقات فن اور عمل کو مخلوط کر دیا گیا ہے۔ کبھی فن کو عمل ہی سمجھ لیا گیا ہے جس کے ساتھ بعض تعلیمی طریقے اور تعلیمی امدادیں شریک ہیں جو امر یہاں طور پر ہمیں اپنے پیشِ نظر رکھنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ تعلیم نہ صرف ایک فن ہے بلکہ فنِ لطیف ہے۔ اسی لئے تعلیم کا بہت کچھ مدار طریقِ عمل کی بہ نسبت بصیرتِ صحیحہ پر ہے۔ استاد کی ذات بھی بہ نسبت

اُس کی قابلیت کے اس سے زیادہ متعلق ہے اور واقعہ یہ ہے کہ صحیح تعلیم کا مدار بھی فطرتِ انسانی کے درست علم پر ہے
صرف درس اور علمی تعلیم کے مواقع ہی نصابِ تعلیم کے بہت اہم اور قیمتی اجزا نہیں ہو سکتے بلکہ جو کچھ کہ
ایک طالب علم اپنے لئے اپنی ذات پر آزادانہ عمل سے اپنے اور دوسروں کے (جو اسی قسم کی مساعی میں مشغول
ہوں) مقابلہ سے باہمی اشتراکِ عمل سے حاصل کرتا ہے وہی اہم اجزا ہیں۔

جب درس ذہن سے فراموش ہو جائے تو درس دینے کی مشق بھی صرف اسی حد تک اس کی معین ہو سکتی
ہے کہ وہ مدارس میں اپنی ذات پر اعتماد کر کے داخل ہو لیکن اگر وہ خود کو سمجھ لے اپنے ذہن و قلب کی خصوصیات کو
پہچان لے اور حقیقی طور پر اپنی پوشیدہ قوتوں کو ترقی دینے لگے تو اُس وقت جو زمانہ تربیت و تعلیم پر صرف ہو گا وہ
یقیناً مستقل ثمرہ پیدا کر سکتا ہے۔

اگر آزادی کو بحیثیت منشائے تعلیم اور ذریعہ تعلیم قابلِ تمنا تصور کیا جائے تو یہ صاف ظاہر ہے کہ نہ
صرف یہ امر اہم ہے کہ استاد خارجاً جس قدر ممکن ہو سکے آزاد ہونا چاہیئے بلکہ اس سے زیادہ اہم یہ امر ہے کہ وہ
باطنی آزادی بھی رکھتا ہو جس کے باعث کامل ترقی اور پختگی حاصل ہو سکتی ہے۔

یاد رکھئے صرف وہ لوگ جو بذاتِ خود آزاد ہیں دوسروں کی بھی آزادی کی طرف رہنمائی کر سکتے ہیں!

سیّد محمد حفیظ

رات اندھیری ہے اور تیری نیند میرے وجود کی خاموشی میں غرق ہے۔
جاگ اے دردِ محبت! جاگ کہ میں دروازہ کھولنا نہیں جانتا اور میں باہر کھڑا ہوں۔
گھڑیاں انتظار کرتی ہیں۔ تارے پاسبانی کر رہے ہیں۔ ہوا خاموش کھڑی ہے۔ خاموشی میرے
دل میں بوجھل ہو رہی ہے۔
جاگ اے محبت! جاگ میرے خالی پیالے کو لبالب بھر دے اور گیت کی ایک سانس سے
رات کو بیدار کر دے۔

گلچیں

رباعیات

(۱)

بدنام ہوں افسانے کی زینت کیلئے
رسوا ہوں جنوں کی تیز دستی کیلئے
دل حسن و جمال کا صنم خانہ ہے
مشہور جہاں ہوں بت پرستی کیلئے

(۲)

دولت نہ سہی فریب دولت ہی سہی
عشرت نہ سہی سراب عشرت ہی سہی
اسباب نشاط عشق رنگین تو ہے
اسکا خواب خواب وحشت ہی سہی

(۳)

زہراب ہے ساغر مئے ناب نہیں
سیلاب جنوں ہے ذوق پایاب نہیں
میرے لئے تار تار ہے ذوق یقیں حجاب
میرے لئے کوئی چیز نایاب نہیں

(۴)

دشوار ہیں عاشقی کی راہیں ساقی
پُرسوز ہیں درد و غم کی آہیں ساقی
لا بادہ دل گداز و اندوہ ربا
ساغر کو ترس گئیں نگاہیں ساقی

عابد

رباعیات

(۱)

اب چھوڑ دے آنسوؤں کو آہوں کو تو
حسرت سے بھری ہوئی نگاہوں کو تو
کرنے ہیں جو کام کر اٹھا کر کتاب
رونے کے لئے ہوئے الگ راہوں کو تو

(۲)

آیا تھا نہ تو نہ پھر کبھی آئے گا
پیغام یہ حق کا کون پھر لائے گا؟
گو ہیچ ہے سب ہیں پھر بھی کیا ہے تو
تیرے لئے اک زمانہ چلا آئے گا

(۳)

رونا نہ کبھی کسی فریبی کے لئے
کھو دینا نہ جی کو اپنے بیگانے کے لئے
رو رو کے نہ کھونا اس طرح تو اس کو
اے دوست اپنی زندگی کو جینے کے لئے

(۴)

جو کام ہیں ان کو ہے نبھانا تجھ کو
باتیں جو ہیں ان کو ہے بھلانا تجھ کو
وہ کام کر اس سے بنے فلک کا تارا
مٹی کے پتلے کو ہے بنانا تجھ کو

ا ب

مبادئ سیاسیات

باب ۶

(۲) حقوق و آزادی

ملکیت، قانون، حق۔ سب سے پہلے تو ہمیں حقوق کا مطلب اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہیئے۔ اِس سے قبل یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ مملکت میں جو قوانین رائج ہوتے ہیں وہ دراصل مقتدرِ اعلیٰ کے ایسے احکام ہوتے ہیں جن کے ذریعے سے اُس کی شیرازہ بندی ہوتی ہے اور جن کا ماننا ہر فردِ مملکت کا فرضِ عین ہے[۱]۔ مملکت کے اِس اختیار کے باعث وہ اپنے اداراتِ مختار کے ذریعے سے موجودہ قواعد و قوانین کی ترمیم کرسکتی ہے، اور انہیں ایسے ڈھنگ پر لاسکتی ہے جس سے باشندگانِ ملک کے مجموعی مفاد میں ترقی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ قوانین ہی کے ذریعے سے مملکت میں آزادی کا وجود ممکن ہے، ورنہ انسانوں کی کسی جماعت میں اتنی مرکز گریز قوتیں ہوتی ہیں کہ وہ اسے شاید ایک دن بھی چین نہ لینے دیں۔ اگر مملکت کا دباؤ بالکل ہٹا دیا جائے تو انسانوں کا مجموعہ گویا مختلف قسم اور مدارج کی قوتوں کا مجموعہ ہوجائیگا، جو ایک دوسرے سے سیادت اور تفوق کی غرض سے برسرِ پیکار ہونگی۔ لیکن ایسے مجموعۂ افراد میں حقوق و فرائض کا نشان بھی نہیں ہوگا۔ مملکت کے غیاب میں ہر انسان کے "حق" کا واحد معیار بس اُس کی ذاتی قوت ہی تک محدود ہوگا یعنی صرف اُس کے قیام ہی کی صورت میں مختلف اشخاص امن و امان کے ساتھ اپنے اپنے حقوق کا دعوےٰ کرسکتے ہیں۔

جب یہ طے ہوگیا کہ قوانین کی ساخت اور اُن کی ترمیم و تنسیخ کا واحد آلۂ کار مملکت ہے، اور قوانین ہی حقوق و فرائض کا تعین کرتے ہیں، تو اس سے یہ انتاج بالکل قدرتی ہے کہ حقوق کا تعین بھی مملکت ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہم روزمرّہ اس قسم کے الفاظ سنتے ہیں جیسے "ہمارا پیدائشی حق"، "انسان کے فطری حقوق"، "اخلاقی حقوق" وغیرہ، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ہمارا کوئی "پیدائشی حق" ایسا ہے جسے مملکت نے تسلیم نہیں کیا ہے تو اُس کی نوعیت کیا ہوگی؟ اگر کوئی شخص یہ دعوےٰ کرے کہ میرا پیدائشی حق یہ ہے کہ میرے مقدمات جیوری کے ذریعہ سے تصفیہ پائیں، اور اس ملک میں جس میں یہ دعویٰ کیا جارہا ہے، جیوری کا قانون نہ ہو، یعنی اس اصول کو مملکت نے

---

[۱] باب ۶ (۱)

تسلیم نہ کرلیا ہو تو ایسی حالت میں اُس کا یہ دعوے بالکل باطل اور لغو محض ہوگا۔ دوسرے آخر "فطری حقوق" کے تعیّن کا معیار کیا ہے؟ جب تک کوئی ایسی ذی اقتدار قوت موجود نہ ہو جو ان حقوق کا تعیّن کرسکے اُس وقت تک ہم "فطری حقوق" کو کیسے پہچانیں؟ ظاہر ہے کہ یہ قوت الٰہی ہوسکتی ہے یا دنیوی، لیکن عملی انتظام کا مقتضا یہی ہے کہ بہر نہج جب تک نظامِ مملکت اُسے تسلیم نہ کرلے اُس وقت تک ان حقوق کی بنا پر تنازعات کا جبری تصفیہ نہیں ہو سکتا۔ ہم جن حقوق کو عام طور پر "فطری" یا "پیدائشی" کہتے ہیں وہ ایسے حقوق ہیں جو فی الواقع قانون کا رتبہ نہیں رکھتے بلکہ مملکت کے بعض مصلح چاہتے ہیں کہ انہیں قانون کا رتبہ حاصل ہو جائے مثلاً جب کوئی ہندوستانی سیاسی مصلح کہتا ہے کہ سیاسی آزادی ہمارا "فطری" یا "پیدائشی" حق ہے جس کی وجہ سے مملکت کو یہ حق فوراً تسلیم کرلینا چاہئے تو اس کے یہی معنے ہوسکتے ہیں کہ اس وقت ہمیں سیاسی آزادی حاصل نہیں، چنانچہ اس سیاسی مصلح کا مطمحِ نظر یہی ہوگا کہ کسی نہ کسی طرح اس کے ملک والوں کو سیاسی آزادی حاصل ہو جائے بعض حقوق ایسے ہیں جو ہمیں بدیہی نظر آتے ہیں لیکن دوسرے ممالک میں انہیں زیادہ سے زیادہ "فطری حقوق" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، چنانچہ بہت سے سیاسیوں کو حقِ مالکانہ جیسے بدیہی حق میں شبہ ہے کہ آیا یہ انسان کا فطری حق ہے یا نہیں، مثلاً روس میں افراد کو کامل حقوقِ ملکیت حاصل نہیں۔ یہی کیفیت اخلاقی حقوق کی بھی ہے۔ اخلاقی حقوق اُن حقوق کا نام ہے جنہیں رائے عامہ نے تسلیم کرلیا ہو، لیکن جنہیں اس وقت تک مملکت کی سرپرستی حاصل نہ ہوئی ہو۔ چونکہ رائے عامہ اور مملکت میں جو فرق ہے وہ تنظیم کا ہے، یعنی رائے عامہ باشندوں کی غیر منظم کیفیت کا نام ہے اور مملکت اُن کی منظم اجتماعی حیثیت کا، اس لئے ان دونوں میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ ان "اخلاقی حقوق" کو بالجبر نہیں منوایا جاسکتا، یعنی جو فریق ان سے روگردانی کرے اُس پر قانونی سختی نہیں کی جاسکتی، اور اُسے جو خوف ہوگا وہ محض لوگوں کے مضحکے یا اُن کے غصّے یا اُن کی ناراضی کا ہوگا اگر وہ چاہے تو اُن کی پروا نہ کرے اور اپنی ہٹ پر قائم رہے۔

ان سب اقسام کے حقوق سے ممتاز وہ حقوق ہیں جنہیں ہم "اثباتی" یا "قانونی" کا لقب دیتے ہیں اور جنہیں مختار اداراتِ مملکت نے تسلیم کرلیا ہے، یعنی جن کا نفاذ مملکت کے محکمۂ عدلیہ کے ذریعے سے ہوتا ہے[۵۲]۔ کوئی "پیدائشی" یا "فطری" حق اُس وقت تک "اثباتی" حق نہیں بن سکتا جب تک ادارۂ مجازِ مملکت اسے پورے طور پر تسلیم نہ کرلے جب اداراتِ مملکت (بالخصوص محکمۂ عدلیہ) اُسے تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوگئے تو اُس کے معنی یہ ہوئے کہ حق دار شخص کو ایک دوسرے شخص کے ساتھ ایک خاص قسم کا برتاؤ کرنے کا اختیار ہوگیا، اور اس دوسرے شخص کا یہ فرض ہوگیا کہ وہ اس طریق

---

۵۲ رچی: "قوانینِ فطری" Ritchie: National Rights باب ۵

کار پر سرِ تسلیم خم کرے، ورنہ بشرطِ ضرورت مملکت اُسے جبراً و قہراً مجبور کرے گی۔ مثلاً اگر زید نے خالد سے روپیہ قرض لیا ہے تو میعادِ مقررہ کے بعد خالد کو یہ حق ہے کہ وہ زید سے روپیہ واپس وصول کرلے، اور اگر زید نے روپیہ دینے سے انکار کیا تو خالد عدالتِ مجاز میں مقدمہ دائر کر کے ڈگری کرائے گا اور سرکاری قرقی اور نیلام کے ذریعے سے روپیہ وصول کرلے گا۔ معاشرۂ انسانی کا مدعا ہی یہ ہے کہ مختلف افراد جن امور کو بطورِ خود انجام نہ دے سکیں یا ان کا انجام دینا خلافِ مصلحت ہو، وہ اُس کی تائید اور پشت پناہی سے اُن کے انجام دینے کے اہل ہو جائیں، اور اس مقصد کی انجام دہی کے لئے معاشرۂ سیاسی اوامر و نواہی کے ذریعے سے لوگوں کو مختلف کام کرنے یا نہ کرنے پر مجبور کرتا ہے؛ انہیں اوامر و نواہی سے افراد کے فرائض کا تعیّن ہوتا ہے اور ہر ایسے فرض کے جواب میں جو حق محسوس ہو اُسے قانونی حق سمجھنا چاہیئے۔

قانونی حقوق کی تقسیم۔ قانونی حقوق دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو حقوقِ عامہ اور دوسرے حقوقِ خانگی۔ یہ تقسیم کچھ نئی تقسیم نہیں ہے بلکہ اس میں بجنسہٖ وہی فرق مدّنظر ہے جو فقہائے اسلام نے حقوق اللہ اور حقوق العباد کے مابین رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ "حق اللہ" سے (علاوہ عبادات کے) ایسے حقوق مراد نہیں ہو سکتے جن سے انسان مستفید نہ ہوتا ہو (اس لئے کہ خداوندِ تعالیٰ تو کسی حق یا کسی دنیوی امر کے استفادہ سے بالاتر ہے) اور ان سے یہ بھی مراد نہیں ہو سکتی کہ یہ حقوق خاص طور پر خدا کے پیدا کئے ہوتے ہیں (اس لئے کہ خدا نے تو ہر ایک حق پیدا کیا ہے) بلکہ ان دونوں باتوں کے برعکس انہیں حقوق اللہ غالباً ان کی انتہائی اہمیت کی وجہ سے کہتے ہیں اور ان میں سے اکثر کے ذریعے سے مملکت کی شیرازہ بندی عمل میں آتی ہے[۳]۔ سب سے پہلے تو خانگی حقوق و فرائض کو لیجئے۔ خانگی حقوق و فرائض وہ ہیں جو مختلف افراد کے باہمی تعلقات کو معیّن و منضبط کرتے ہیں۔ ہمارے روزمرہ کے کاروبار کے ضمنی حقوق اسی کے تحت آتے ہیں، مثلاً میاں بیوی، بائع و مشتری، مکان دار و کرایہ دار، زمیندار و کاشتکار، آقا و ملازم کے حقوق و فرائض کا تعلق اکثر و بیشتر انہی دونوں شغلوں کے اندر محدود ہے، اور مملکت کا کام یہ ہے کہ ایک طرف انہیں جبراً منوائے، دوسری جانب حد سے تجاوز نہ ہونے دے۔ ان کے برعکس حقوقِ عامہ ہیں جن کے ذریعے سے حکومت اور افراد کے باہمی تعلقات کا تعیّن ہوتا ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ بعض معاملات میں حکومت مثل کسی فرد کے ایک فریق ہو (مثلاً جب حکومت کسی سرکاری عمارت بنانے کا کسی کو ٹھیکہ دے) لیکن ایسی حالت میں اُس کی حیثیت محض خانگی ہوگی، حقوقِ عامہ وہ حقوق ہیں جن کے ذریعے سے مملکت، افراد اور حکومت کے باہمی تعلقات

---

[۳] حقوق اللہ اور حقوق العباد کے لئے دیکھو عبدالرحیم: "اصولِ قانونِ اسلامی" Abdur Rahim: Muhammadan Jurisprudence

کا تعین اور اُن کی تحدید کرتی ہے۔ یہ اُوپر بتایا جا چکا ہے کہ مملکت اور حکومت میں ایک عظیم الشان فرق ہے مملکت افراد کی مجموعی سیاسی کیفیت کا نام ہے، اور یہی فی الواقع مقتدر اعلیٰ ہے۔ حکومت وہ آلۂ کار ہے جس کے ذریعے سے مملکت کا انتظام و انصرام ہوتا ہے۔ مملکت ایک مجرد فلسفیانہ تخیل ہے، حکومت چند انسانوں کے مجموعے کا نام ہے جو مرکز گریز قوتوں کو زیر کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب حکومت کا مقصد ہی افراد کے نقصان رساں احساسات کو زیر کرنا ٹھہرا تو اُس کے اور افراد کے مابین ایک کشمکش اور کھینچ تان کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ مملکت اپنی ہیئتِ حاکمیہ کے ذریعے سے دساتیر تیار کرتی ہے، اور اُن دساتیر یا اُن کے مطابق بنے ہوئے قوانین کے ذریعے سے افراد اور حکومت دونوں کی حدود معین کرتی ہے۔ حال کے زمانے تک یعنی اس وقت تک جب تک مملکت اور حکومت کا فرق بیّن طور پر واضح نہیں ہوا تھا، مملکت اور حکومت کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھ لیا گیا تھا، چنانچہ سیاسیوں اور معاشیوں کے ایک مخصوص گروہ، یعنی انفرادیوں، کا مقصد ہی یہ ہو گیا تھا کہ فرد کو "مملکت" کی دست برد سے بچایا جائے۔ اس خیال میں جو مغالطہ ہے وہ صاف ظاہر ہے[۵۵]۔ مملکت اور فرد کے درمیان کشمکش کی شکل پیدا ہی نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ مملکت افراد ہی کی اجتماعی حس کی ایک اخلاقی شکل کا نام ہے، ہوتا یہ ہے کہ حکومت (یعنی دستورِ مملکت کے ذریعے سے جو آلۂ کار مقرر ہوا ہے، وہ) مرکز گریز اثرات کا استیصال کرنے میں بعض مرتبہ افراد کے صحیح احساسات و جذبات کی پروا نہیں کرتی، جس سے ملک کی اجتماعی کیفیت میں نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مملکت ایک طرف حکومت کے اختیارات کی حد بندی کرتی ہے اور دوسری جانب افراد کے حیطۂ عمل کا تعین کر دیتی ہے۔ حکومت کے اختیارات کی حد بندی کی مثالیں تقریباً ہر ملک کے دستور و آئین میں نظر آئیں گی اور دراصل مسودۂ قانونِ حقوق ۱۶۸۹ء، فرانس کا اعلانِ حقوق ۱۷۹۱ء، جرمنی کا اعلانِ حقوق ۱۹۱۹ء اور نہرو رپورٹ کا اعلانِ حقوق ۱۹۲۸ء[۵۶] میں فرد کے مقابلے میں حکومت کے اختیارات کی تحدید ہی کی گئی ہے۔ ان کے

---

[۵۴] باب ۲

[۵۵] یہ مغالطہ ہربرٹ سپنسر کی مشہور کتاب "فرد بمقابلۂ مملکت" Hurbert Spencer: Man versus the State کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔

[۵۶] "نہرو رپورٹ" کے اعلان کا ملخص خالی از دلچسپی نہ ہوگا:-

(۱) حکومت کے جملہ اختیارات کا منبع خود قوم ہے۔

(۲) بلا قانونی چارہ جوئی کے کسی شخص کی آزادی سلب نہ کی جائیگی، نہ اُس کی مملوکات پر قبضہ کیا جائے گا۔

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

برعکس وہ قوانین ہیں جن کے ذریعے سے افراد کے اختیارات کی حدود مقرر کی جاتی ہیں، مثلاً قوانینِ غداری و قوانینِ تعزیری، اور جن کے ذریعے سے حکومت کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ اگر کوئی فرد ان حدود سے تجاوز کرے تو حکومت فی الفور مداخلت کر کے اُسے ایسی جسمانی سزا دے کہ خود اُس فرد کے لئے باعثِ تفضیحت اور دوسروں کے لئے باعثِ عبرت ہو، اور بعض ممالک میں حکومت کے عہدہ دارانِ مجاز کو اُس کی جان تک لینے کا اختیار ہوتا ہے۔

اہم حقوق کا شمار۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر افراد کے بعض حقوق کا شمار کر دیا جاتے تاکہ ایک طرف تو امورِ متذکرۂ بالا اچھی طرح سے واضح ہو جائیں، اور دوسرے افراد کی مجموعی آزادی کا مفہوم بخوبی سمجھ میں آسکے۔ ظاہر ہے کہ ہر مملکت میں افراد کے حقوق یکساں نہیں ہوتے، مثلاً ایک طرف تو ہمارے سامنے ایسی اشتراکی مملکتیں (جیسے روس) ہیں، جہاں حکومت اور ہیئتِ حاکمیہ میں بہت کم فرق باقی رہ گیا ہے اور جہاں حکومت نے واقعتاً مقتدرِ اعلیٰ کی جگہ لے لی ہے۔ ایسی مملکتوں میں افراد کو بحیثیتِ افراد بہت ہی کم حقوق حاصل ہیں یعنی مملکت بمنزلہ محافظِ افراد اُن کے اکثر امور پر حاوی ہے۔ دوسری وہ مملکتیں ہیں جہاں حقوق کی ترازو کا پلڑا دوسری طرف جھکتا ہے، یعنی جہاں حکومت اکثر و بیشتر محض افراد کی حفاظت، مملکت کی شیرازہ بندی اور افراد کے لئے آسانیاں بہم پہنچانے کے لئے مداخلت کرتی ہے، جیسے دنیا کے اکثر و بیشتر ممالک کا حال ہے جہاں "انفرادی" طرزِ حکومت رائج ہے۔ بہر نہج اگر بیشتر ممالک کے قوانین پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ افراد کو عام طور پر مفصلۂ ذیل حقوق حاصل ہوتے ہیں[۵۷]:-

زندگی اور شخصی آزادی۔ سب سے اہم حقوق تو زندگی اور شخصی آزادی کے حقوق ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر زندگی و آزادی نہ ہوگی یا اس کا اطمینان نہ ہوگا تو پھر مملکت کا نظام بالکل بے کار ہے۔ حقوق کے اعتبار سے مردہ اور غیر آزاد یعنی غلام کی نوعیت بالکل ایک ہی ہوتی ہے، چنانچہ آج کل متمدن ممالک میں مملکت نہ صرف زندگی کی ضامن ہوتی ہے بلکہ ذاتی آزادی کی بھی حفاظت کرتی ہے، اور نہ صرف قاتل کو سخت سے سخت سزا دی جاتی ہے

---

(۳) افراد کو ضمیر و مذہب کی آزادی حاصل ہوگی اور کسی مذہب کو ترجیح نہ دی جائیگی نہ کسی پر قانونی مجبوریاں عائد کی جائیں گی۔

(۴) ہر فرد کو، خواہ اُس کی ذات اور مذہب کچھ بھی ہوں، دولتِ عامہ کے مدارس میں داخل ہونے کی اجازت ہوگی۔

(۵) مکمل قانونی مساوات۔

(۶) ہر شخص کو کوئی پیشہ اختیار کرنے کی آزادی حاصل ہوگی اور مختلف عہدے کسی خاص مذہب والوں کے لئے مخصوص نہیں کئے جائینگے

(۷) معاشی ترقی کے لئے اتحاد کرنا اور انجمن بنانا جائز ہے۔

۵۷ انفرادیت اور اشتراکیت کے لئے دیکھئے آئندہ باب ۸۔

(جو بعض ممالک میں سزائے موت[۵۸] اور بعض میں حبس دوام ہے)، بلکہ اُس شخص کو بھی قابلِ الزام گردانتی ہے جو اپنے ہاتھوں اپنی جان لینے کی کوشش کرتا ہے[۵۹] لیکن اس میں بعض مستثنیات بھی ہیں، مثلاً اگر زید خالد پر اُس کی جان لینے کی غرض سے حملہ آور ہو تو خالد کو حق حاصل ہے کہ اپنے بچاؤ کی خاطر زید کو مار ڈالے[۶۰]۔ اسی طرح کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے کو جبراً کہیں جانے سے روکے رہے، اسے قانونی اصطلاح میں حبسِ بے جا کہتے ہیں اور اکثر قانونی نظاموں میں اس کے لئے بھی سزا مقرر ہے[۶۱]۔ آج کل کے متمدن ممالک میں غلامی قانوناً ناجائز ہے، اور ہم اس صورتِ حال سے اس قدر مانوس ہوگئے ہیں کہ ہمارے ذہن میں مشکل سے ایسی متمدن مملکت آسکتی ہے جس میں غلامی کا ادارہ حیاتِ عامہ کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہو۔ بڑے بڑے نظامہائے قانونی، (جیسے رومن قانون) میں کسی زمانے میں غلامی ایک ادارۂ حیات تھی اور قدیم یورپ میں اسے اتنا ہی "عاملِ پیدائش" سمجھا جاتا تھا جتنا آج کل کے معاشیین محنت، سرمایہ اور زمین کو سمجھتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ سیاسی تنظیم کی بنیاد صرف غلامی تھی، اس لئے کہ روما و یونان کے مفکر ایسی سیاسی صورتِ حال کا اندازہ ہی نہیں کرسکتے تھے جس میں کسی شخص کو فکرِ معاش بھی ہو اور ساتھ ہی وہ مملکت کے انتظام و انصرام میں حصہ بھی لے سکے۔ یہی وجہ تھی کہ پیدائشِ دولت کا کام غلاموں سے لیا جاتا تھا، اور مملکت کے "شہری" اطمینان سے سیاسی کاروبار میں حصہ لیتے تھے۔ روما میں غلاموں کی حالت ناگفتہ بہ تھی، اور اُس کے عہدِ زریں میں بیچارے غلاموں کو کسی قسم کے حقوق حاصل نہیں تھے، چنانچہ اُن کے مالک انہیں بھوکا مار سکتے تھے اور ہر طرح کی اذیتیں پہنچا سکتے تھے[۶۲]۔ مشرق میں عام طور پر غلاموں کی حالت بہتر تھی، چنانچہ گو ہندوؤں میں غلاموں پر طرح طرح کی شرائط عائد تھیں، اور انہیں حقوقِ مالکانہ حاصل نہیں تھے تاہم اُن کی ذات اور زندگی محفوظ تھی[۶۳]۔ اسلام نے غلاموں کی حالت پہلے سے بہت بہتر کردی[۶۴]۔ اول تو اُس نے آزاد مسلمان کو

---

۵۸ مثلاً مجموعۂ تعزیراتِ ہند، دفعہ ۳۰۲۔

۵۹ ایضاً دفعہ ۳۰۹۔

۶۰ دیکھئے تعزیراتِ ہند دفعات ۹۶ و ۹۷۔ ۶۱ تعزیرات، دفعہ ۳۴۰۔

۶۲ سلطنتِ روما میں غلاموں کی حالت کے لئے دیکھئے تفسیرِ قوانینِ گایوس، مولفہ پوسٹ Poste: Commentary on Gai Institutions باب اول زیرِ دفعہ ۵۳۔

۶۳ پریا ناتھ سین:- اصولِ دھرم شاستر P.N.Sen: Hindu Jurisprudence درس ۱۰۔

۶۴ اسلام نے جس قسم کی شرائط غلامی پر لگائیں اُن کے لئے دیکھو عبدالرحیم "اصولِ فقہ اسلامی" Abdul Rahim "Muhammadan Jurisprudence" باب ۵۔

غلامی کے خطرے سے بالکل آزاد کردیا۔ پھر غلام کی جسم وجان بالکل محفوظ ومامون ہوگئے اور اُسے ایذا دینے والے یا اسکی جان لینے والے کو وہی سزادی جانے لگی جو آزاد شخص کی اذیت یا قتل کے لئے مقرر تھی۔ ساتھ ہی غلام آزاد کرنے کو ایک ثواب عظیم قرار دیا گیا، چنانچہ ممالکِ اسلامی میں عام میلان غلاموں کی آزادی کی طرف ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام میں ہم اکثر ممالک میں آزاد شدہ غلاموں کو بڑے بڑے عہدوں پر متمکن دیکھتے ہیں، اور بعض ملکوں میں تو ایسے لوگ سریر سلطنت پر نظر آتے ہیں جنہوں نے کسی زمانے میں اپنی زندگی غلامی کی حالت میں بسر کی تھی۔ خود محمد الرسول اللہ صلعم نے آزاد شدہ غلام اور پیدائشی آزاد شخصوں کی مساوات کو عملی جامہ اس طرح پہنایا کہ حضرت زید ابن حارث رضؓ کو (جو رسولِ اکرم صلعم کے ایک آزاد شدہ غلام تھے) مہاجرین، انصار اور دوسرے شرفائے عرب کے لشکر پر کماندار بنا کر موتہ کی جنگ کے موقع پر روانہ کیا، اور اس لڑائی میں وفادار سپہ سالار نے اپنی جانبازی کا ثبوت شہید ہو کر دیا۔ اسی طرح جگہ جگہ سابق غلاموں کے کارناموں کی مثالوں سے تاریخ اسلام بھری پڑی ہے۔ چنانچہ سلطان محمود غزنوی ایک غلام زادہ تھا، مصر میں "مملوکوں" نے تقریباً چار سو برس تک اور ہندوستان میں نام نہاد "خاندانِ غلاماں" نے کم وبیش ایک صدی تک نہایت شان وشوکت سے حکومت کی۔ مغربی ممالک میں غلاموں کی آزادی کا خیال زمانۂ حال ہی کے ذہنی ارتقا کا نتیجہ ہے، اور بعض ممالک، مثلاً ریاستہائے متحدہ امریکہ میں تو غلاموں کو اُس وقت تک آزادی میسّر نہیں ہوئی جب تک کہ موافقین ومخالفینِ آزادی کے مابین ایک عظیم الشان خونخوار جنگ ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۵ء تک برابر جاری نہ رہی۔ امریکہ میں اب بھی بیچارے زنگیوں کی جان خطرے سے خالی نہیں رہتی اور اب بھی اخبارات میں کبھی کبھی پڑھنے میں آتا ہے کہ کسی معمولی بات پر وہاں کے سفید باشندوں نے کسی بیچارے زنگی کو زندہ جلا دیا یا مار ڈالا۔

حقِ حیات اور حقِ آزادی کے اصول پر مفصل بحث کرنے کی اس لئے ضرورت ہوئی کہ اول تو یہ حق جملہ دوسرے حقوق سے زیادہ اہم ہے، اور دوسرے باوجود اس قدر بدیہی ہونے کے اس میں مختلف زمانوں اور مختلف ممالک میں ہمیشہ تغیر وتبدل ہوتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں صرف ایک بات باقی رہ گئی ہے، وہ یہ کہ حقِ آزادی اور حقِ حیات دونوں دورانِ جنگ میں معطل ہو جاتے ہیں اور ساتھ ہی اگر کسی سے کوئی جرم سرزد ہو تو اُس کی سزا میں حکومت کو عام طور پر مجرم کی آزادی محدود کرنے اور بعض مواقع پر اُس کی جان تک لینے کا اختیار ہوتا ہے۔

ملکیت ۔ دوسرا حق جو عام طور پر اکثر ممالک میں پایا جاتا ہے وہ حقِ مالکانہ ہے۔ حقِ مالکانہ کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی چیز کسی کی ملکیت میں ہو تو اُسے یہ حق حاصل ہے کہ اُس چیز کو اپنے قبضے میں رکھے اور اس سے مستفید

ہو اور دوسروں کی دست برد سے بچائے۔ یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ یہ حق "فطری حقوق" میں سے ایک ہے، بلکہ اس حق کا انطباق جملہ افرادِ آبادی پر صرف زمانۂ حال میں ہوا ہے۔ جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے، دھرم شاستر میں انہیں حقِ مالکانہ تقریباً بالکل حاصل نہیں، اور اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہندو مقننوں اور ہندوؤں کی کتبِ سماویہ میں صنفِ لطیف کو مرفوع القلم قرار دیا گیا ہے[۱۵]۔ اسلام نے عورتوں کی معاشرتی سطح کو بلند کر کے انہیں حقوقِ ملکیت اور دوسرے حقوق بجنسہٖ اسی طرح دیئے جیسے مردوں کو، اور جہاں تک اپنی مملوکہ اشیا پر قبضے اور اُن سے استفادے کا تعلق ہے، اُن میں اور مردوں میں مطلق کوئی فرق باقی نہیں رکھا لیکن مغرب میں یہ اصول کہ عورت مرد دونوں کو مملوکات پر مساویانہ حقوق حاصل ہیں، حال ہی میں تسلیم کیا گیا ہے، چنانچہ "قانون متعلق جائدادِ زنانِ منکوحہ" سے پیشتر (جو ۱۸۸۲ء میں منظور ہوا) انگلستان میں عورتوں کو حقِ مالکانہ حاصل نہ تھا[۱۶]۔ ایک اور بات کی طرف توجہ مبذول کرنی ضروری ہے۔ آج کل اشتراکیوں کا ایک خاص گروہ یہ کہتا ہے کہ افراد کے حقِ مالکانہ اور اُن کے معاشی مقابلے کی وجہ سے پیدائش دولت میں بہت کچھ وقت، محنت اور سرمایہ رائگاں جاتے ہیں لہذا عاملینِ پیدائش پر حکومت کا پُورا اختیار ہونا چاہئے، اور سرمایہ وزمین دونوں مملکت ہی کی مملوکہ ہونی چاہئیں۔ یہاں اس بحث کا موقع نہیں کہ آیا اس اصول کے دعوے دار حق بجانب ہیں یا نہیں، لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اُن میں سے اکثر ضروریاتِ زندگی کو ذاتی انفرادی ملکیت ہونے میں چنداں حرج نہیں سمجھتے۔ نیز ہر مملکت میں جنگ یا کسی اور ضرورت کے وقت حکومت کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ افراد کی مملوکات میں سے ایک حصّے پر جبراً قبضہ کرلے، اور اسی طرح اپنی روزمرہ ضروریات کے لئے حکومت کو محاصل عائد کرنے کا اختیار بھی ایک طرح سے مملوکاتِ انفرادی پر جبراً قبضہ کرنے ہی کی ایک شکل ہے۔

مناکحت و ازدواج۔ تیسرا حق جو تقریباً ہر جگہ عام ہے، حقِ خاندانی و حقِ ازدواج ہے۔ خاندان کی بنا نکاح ہے اور یہی وہ ادارہ ہے جس کے ذریعے سے بنی آدم کی نسل جاری رہتی ہے، وارث کا پتہ لگتا ہے اور معاشرۂ انسانی کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے۔ نکاح کے قواعد و قوانین اور عورت مرد کے حقوق و فرائض مختلف ممالک میں مختلف ہیں۔ بعض ممالک میں صرف ایک ہی زن و مرد کی باہمی مناکحت کی اجازت ہے، بعض میں ایک مرد متعدد عورتوں سے

---

۱۵ دھرم شاستر میں عورتوں کے بعض حقوق کے لئے دیکھو پران ناتھ سین: اصول دھرم شاستر، درس ۵ و ۹۔

۱۶ Merried Womens Property Act, 1882, 45 & 46 Vict. C. 75 اس کے اثرات کے لئے دیکھو ہالزبری: قوانینِ انگلستان Halsbury's Laws of England جلد ۱۶ صفحہ ۳۲۲ دفعہ ۶۳۸ و صفحہ ۳۵۲ دفعات ۷۰۵ وغیرہ۔

نکاح کرسکتا ہے (جیسے ہندوستان میں ہندو اور مسلمان) اور بعض میں ایک عورت متعدد مردوں سے نکاح کرسکتی ہے (جیسے تبت اور ملیبار میں) چونکہ موخرالذکر ممالک کی معاشرتی وقانونی صورت حال ہمارے معاشرہ سے مختلف ہے اس لئے اُسے تو یہاں نظرانداز کیا جاتا ہے، رہے وہ نظامہائے قانونی جو ایک مرد کو متعدد بیویوں سے نکاح کرنے کو جائز رکھتے ہیں، اُن کی بابت یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان میں جو اصول مدنظر ہے وہ یہی ہے کہ مرد مختلف بیویوں کے مابین مکمل مساوات قائم رکھے گا۔ اور عام طور پر بلاضرورت نکاح نہیں کرے گا۔ اور کم ازکم قرآن مجید میں تو جہاں ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت دی گئی ہے وہاں مکمل مساوات کو تقریباً ناممکن العمل قرار دیا گیا ہے[۱]۔ اسی طرح جن اقوام میں طلاق کا طریقہ رائج ہے وہاں کم ازکم آج کل عورت مرد دونوں کو ایک دوسرے کو اُس وقت چھوڑ دینے کا اختیار دیا گیا ہے جب دونوں کی زندگی ایک دوسرے کے باہمی اختلافات یا بدسلوکی کی وجہ سے تلخ ہو جائے۔

آزادیٔ ضمیر اور رواداری۔ اس سلسلے میں آخری حق خانگی جس کا ذکر یہاں مناسب ہوگا، حق آزادیٔ ضمیر یا حق عقائد ہے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی عقائد کا تعلق انسان کی کیفیات قلبی سے ہے اور اسے کسی قسم کے مذہبی عقیدے کا جبراً پابند نہ ہونا چاہئے۔ لیکن تاریخ دنیا کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عملاً مذہب مختلف افراد یا مختلف مجموعوں کے مابین ایسا ربط پیدا کرسکتا ہے جس سے زیادہ مضبوط اور پائدار ربط مشکل سے ممکن ہے، چنانچہ حکومت نے ہمیشہ ایسے مذاہب اور فرقوں کو معاندانہ نظر سے دیکھا ہے جن کے علمی اور دنیوی مقاصد سے وہ خلاف ہوں، اور بعض ممالک میں تو مذہب کے نام سے خون کی ندیاں بہہ گئی ہیں۔ اس ضمن میں مشرقی اور مغربی تاریخ میں بیّن فرق نظر آتا ہے۔ چونکہ مشرق میں مذہب کو انسان کے تقریباً ہر ایک شعبۂ زندگی میں دخل حاصل ہے اور حکومت اس امر سے اچھی طرح واقف ہوتی ہے کہ اُس کی سختی سے لوگ اپنا عزیز مذہب نہ چھوڑیں گے، شاید اسی لئے یہاں اکثر و بیشتر زمانوں اور ممالک میں رواداری برتی گئی ہے اور محض مذہب کی خاطر بہت ہی کم تشدد روا رکھا گیا ہے۔ اس کے برعکس یورپ میں بالکل حال کے زمانے تک مختلف حکومتوں کا شیوہ ہی یہ رہا ہے کہ وہ اپنے مخالف مذہب کی جڑ بنیاد اکھاڑ کر پھینک دیں۔ دوتین واقعات کو لیجئے اور اُن کا مقابلہ کیجئے۔ ۱۴۹۲ء میں فرناندو اور ازابیلا نے غرناطہ سے وہاں کے آخری بادشاہ ابوعبداللہ کو نکال دیا اور یہ وہ تاریخ ہے جب سے لے کے ۱۶۱۰ء تک ہسپانوی مسلمانوں پر انتہائی سختیاں کی گئیں، اُن کی عورتوں کی بے حرمتی کی گئی، مردوں کو بزور شمشیر

---

[۱] قرآن مجید، سورۂ نساء، رکوع ۱۔

اصطباغ دیا گیا یا ملک بدر کر دیا گیا[۱۸]۔ چنانچہ سرزمینِ اندلس میں ایک بھی اسلام کا نام لیوا باقی نہیں رہا۔ اس کے برعکس ۱۴۹۲ء سے صرف چالیس سال پیشتر سلطان محمد خاں ثانی نے قسطنطنیہ فتح کر کے وہاں کی غیر مسلم ملتوں کو منظم کیا اور اُن میں سے ہر ایک کو مذہبی معاملات میں بلکہ بعض دنیوی امور میں بھی آزادی دی، اور یہ آزادی تا انقلابِ حال کے انقلابِ ترکی تک مسلسل جاری رہی[۱۹]۔ اسی طرح جب ۱۵۷۲ء میں شاہ چارلس نہم سنت برتولومیو کے دن فرانس کے احتجاجیوں کا مشہور قتلِ عام کرا رہا تھا، یہاں ہندوستان میں اکبرِ اعظم تختنشین تھا، جو فتح پور سیکری کے مشہور عبادت خانے میں بیٹھ کر ٹھنڈے دل سے ہر مذہب کے پیشواؤں کے مناظرے سنتا اور اپنی راجپوت رعایا پر اس درجہ اعتماد کرتا کہ اُن میں سے ایک یعنی راجہ مان سنگھ کو کابل کا صوبہ دار مقرر کرنے میں مضائقہ نہ سمجھتا۔ یہ کیفیت شہنشاہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر تک برابر جاری رہتی ہے، جس نے اپنے مشہور مدِ مقابل سیواجی مرہٹہ کے خلاف ایک غیر مسلم راجہ جے سنگھ کو سپہ سالار بنا کر بھیجا، اور آج بھی ہندوستان میں بہت سے ہندو معابد ملیں گے جن کی جاگیریں اسی مغل بادشاہ (یعنی اورنگ زیب) کے زمانے سے وقف ہیں[۲۰]۔ لوگ کہتے ہیں کہ مغرب مشرق سے زیادہ روادار ہے، لیکن آج کے دن بھی اگر شاہِ انگلستان کلیسائے انگلستان سے منحرف ہو جائیں تو انہیں "قانونِ بند و بست" ۱۷۰۱ء کی رُو سے تخت سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ مشرق میں محض مذہب کی خاطر بہت کم لڑائیاں لڑی گئی ہیں اور بہت کم ممالک میں لوگوں کا مذہب بزورِ شمشیر بدلوایا گیا ہے، لیکن مغرب میں چارلس اعظم کے زمانے میں جرمنی کا جبراً عیسائی مذہب اختیار کرانا، جنگ ہائے صلیبی، جنگِ سی سالہ، اور ہسپانوی

---

[۱۸] زوالِ غرناطہ کے بعد ہسپانوی مسلمانوں پر جو سختیاں کی گئیں اُن کا تھوڑا بہت حال "مس پ۔ سکاٹ کی کتاب میں درج ہے جس کا ترجمہ مولوی خلیل الرحمن صاحب نے "اخبار الاندلس" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس کی جلد ۳، باب ۲۶ کا مطالعہ کیا جائے۔

[۱۹] حدودِ دولتِ عثمانیہ میں مختلف مذاہب اور اُن کی آزادی و تنظیم کے لئے دیکھو میرز "ترکیہ حالیہ" Mears: Modern Turkey باب ۹، ٹوائن بی و کرک وڈ "ترکیہ" Toynbee & Kirkwood: Turkey باب ۴، الیسن فلپس "جنگِ آزادی یونان" Alison Phillips: War of Greek Independence باب ۱۔

[۲۰] عالمگیر کی عطا کردہ جاگیروں کا شمار یہاں نہ ضروری ہے اور نہ ممکن؛ خود راقم الحروف نے بیدر (دکن) کے قریب خانہ پور نامی بے چراغ قصبے میں ایک بہت بڑا مندر دیکھا جس کے مجاور آج تک دولتِ آصفیہ کے زیرِ سایہ شہنشاہِ عالمگیر کے اوقاف کی آمدنی سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ اسی طرح ڈیرہ دون میں گرو رام رائے کے گردوارہ کے لئے بھی اورنگ زیب نے جاگیریں وقف کی تھیں۔ اس گردوارہ پر اب ہندوؤں کا قبضہ ہے۔

عدالتِ استیصالِ ارتداد کی یاد آج تک تازہ ہے یہی اسباب ہیں جن کے باعث آج ہندوستان کے اسلامی مرکزوں یعنی دہلی، لکھنؤ، اور حیدر آباد دکن میں غیر مسلم آبادی مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے، اور سابق آستانۂ خلافت یعنی قسطنطنیہ میں یونانی، ارمنی اور دیگر عیسائی فرقے تعداد میں مسلمانوں سے بڑھے ہوئے ہیں؛ اگر مسلمان "لکم دینکم ولی دین"[۲۱] پر عمل نہ کرتے اور اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ رواداری نہ برتتے تو ان مقامات میں ایک بھی غیر مسلم کی شکل نظر نہ آتی۔

بہرنہج شاید مشرقی تخیلات سے متاثر ہو کر عقاید اور مذہب کی آزادی زمانۂ حال کی تہذیب کا مایۂ ناز سرمایہ بن گئی ہے۔ مغرب اب بھی مشرقی مذاہب سے متشکک نظر آتا ہے اور اُن کی سیاسی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا، تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج کل کی سیاسیات کا مطمحِ نظر یہی ہے کہ ہر شخص کو جس مذہب کی چاہے پیروی کرنے کا حق حاصل ہے۔

سیاسی حقوق۔ آخر میں اُن نہایت اہم حقوق کا ذکر کرنا باقی ہے جنہیں بعض مرتبہ مجموعی طور پر "سیاسی حقوق" کہتے ہیں، یعنی حقوقِ آزادیٔ تقریر، آزادیٔ اجتماعِ عامہ، آزادیٔ مطابع اور آزادیٔ ارتباط۔ عام طور پر جو اصول برتا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر انسان کا کوئی فعل کسی تعزیری قانون کے تحت نہ آئے تو وہ اس کے لئے مباح ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص اپنی زبان سے کوئی لفظ نکالے یا اُسے تحریر میں لائے یا چھپوائے، اور اُس کا یہ فعل کسی تعزیری قانون کے خلاف نہ ہو تو اُس کی پکڑ نہیں ہوسکتی لیکن اُس کے ان افعال کا دائرہ محدود ہے۔ اول تو اُس کا کوئی فعل ایسا نہیں ہونا چاہیئے جس سے مملکت کا شیرازہ بکھر جانے کا احتمال ہو یا حکومت کو اپنے وجود کی طرف سے خطرہ پیدا ہو جائے۔ آج کل کے عمومی زمانے میں کسی شخص کو حکومت کی نکتہ چینی سے مشکل سے روکا جاسکتا ہے، لیکن جب حکومت یہ دیکھے گی کہ مصنّف یا مقرر نے لوگوں کو علانیہ بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے تو وہ اُسے جبرًا روکے گی۔ حکومت کے خلاف اس معاندانہ روش کو "غداری" کا لقب دیا جاتا ہے[۲۲]۔ اسی طرح اگر حکومت یہ دیکھے گی کہ کسی کے قول یا فعل سے نقضِ امن کا اندیشہ ہے تو بھی اُسے روک دے گی، اس لئے کہ امن وامان کا قیام بھی مملکت کے فوری مقاصد میں سے ایک ہے۔ تحریر وتقریر کی آزادی کے یہ معنے نہیں کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے عیوب بے جا ظاہر کرے؛ اُس کی ناموس کو گزند پہنچائے، اور چونکہ اس "ازالۂ حیثیتِ عرفی" سے نہ صرف ایک خانگی حق یعنی ناموس کو ٹھیس لگتی ہے بلکہ اس منہم کی مخالفانہ کارروائی سے نقضِ امن کا بھی اندیشہ ہوتا ہے اس وجہ سے ایسی حرکات کے انسداد کا اختیار افراد اور حکومت دونوں کو ہوسکتا ہے، یعنی جس فرد کے ناموس کو نقصان پہنچا ہے وہ ہرجہ وصول کرسکتا ہے اور حکومت اس کو سزا دے

---

[۲۱] قرآن مجید، سورۂ کافرون"

[۲۲] مثلاً تعزیراتِ ہند، دفعہ ۱۲۴ (الف)

سکتی ہے۔[۲۳]

بعض مرتبہ اگر حکومت کو ملک میں کسی خاص خطرے سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو ان "سیاسی" حقوق میں قطع وبرید کرنے لگتی ہے، مثلاً غنیم کے حملے کے دوران میں یا ملک میں اگر خلفشار پیدا ہو جائے اور اس میں خود شیرازۂ مملکت معرضِ خطر میں آجائے تو بعض مواقع پر حکومت اکثر حقوق و قوانین کو معطل کر کے ملک میں صرف فوجی قانون کا نفاذ کر دیتی ہے، جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ احکامِ حکومت کی خلاف ورزی کی شکل میں چند افسر بیٹھ کر سرسری طور پر سزا تجویز کرتے ہیں جس کا مرافعہ نہیں ہو سکتا، اور وہ سزا فی الفور دے دی جاتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ بغیر "فوجی قانون" کے نفاذ کے حکومت بعض مخصوص حقوق کو معطل کر دے، یعنی مدارج مقدمات تو قائم رکھے لیکن افراد کے سیاسی حقوق کم کر دے، جیسے حکومتِ ہند بعض مرتبہ دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کا نفاذ کر کے اپنے آپ کو مامون و مصئون سمجھ لیتی ہے[۲۴] لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ حکومت کو اس قسم کے اختیارات نہایت سوچ سمجھ کر استعمال کرنے چاہئیں، ورنہ ممکن ہے کہ ایسی کارروائیوں سے بجائے خلفشار کم ہونے کے بدامنی اور زیادہ بڑھ جائے۔

سیاسی آزادی جب حکومت لوگوں کے سیاسی حقوق میں کم سے کم مداخلت کرتی ہے تو اس صورتِ حال کو سیاسی آزادی کہتے ہیں۔ آزادی کے لغوی معنی تو فقدانِ مداخلتِ بیرونی کے ہیں، لیکن جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے مکمل آزادی، خواہ کسی قسم کی بھی ہو، ناممکن ہے، ورنہ مملکت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔[۲۵] اگر حکومت عادتاً سیاسی حقوق کا دائرہ تنگ کرنے کی طرف مائل ہے، یا اُن کے حقوق کو کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ کر گھٹاتی رہتی ہے تو ایسے ملک میں سیاسی آزادی میں کمی یا اُس کا فقدان سمجھا جائے گا۔ ایسے ممالک اکثر وہ ہوتے ہیں جہاں یا تو کوئی غیر ملکی حکومت ذی

---

۲۳ تعزیری ازالۂ حیثیت عرفی کی تعریف "تعزیراتِ ہند" دفعہ ۵۰۰ میں دی ہوئی ہے۔

۲۴ ناظرین کی دلچسپی و معلومات کے لیئے دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کا ملخص دینا مناسب ہوگا:۔

اُن مقدمات میں جن میں مجسٹریٹ ...... کی دانست میں فوری انسداد یا جلد تدبیر کرنی مناسب ہو تو یہ مجسٹریٹ بذریعہ حکم تحریری جس میں مقدمہ کے حالات قلمبند ہونگے ...... مجاز ہوگا کہ کسی شخص کو کسی فعل سے باز رکھنے کی ہدایت کرے ...... جائز ہے کہ حکم متعلق دفعہ ہذا اشد ضرورت ...... کی حالت میں ...... یکطرفہ صادر کیا جائے ...... نیز جائز ہے کہ حکم مطابق دفعہ ہذا کسی شخص خاص کے نام یا عموماً خلق اللہ کے نام ... منضبط کیا جائے ...... کوئی حکم حسب دفعہ ہذا اُس کے صدور کی تاریخ سے زائد از دو ماہ نافذ نہ رہے گا بجز اس کے کہ لوکل گورنمنٹ ...... بذریعۂ اشتہار مندرجہ گزٹ ...... ہدایت کرے۔

۲۵ باب ۵۔

اقتدار ہے، ورنہ جہاں کی رعایا پر حکومت کا اعتبار واعتماد نہیں ہے۔ ہندوستانیوں کو جن کے ملک میں کبھی تو قانون مطابع رائج ہوتا ہے، کہیں فوجی قانون، کہیں دفعہ ۱۴۴ ضابطۂ فوجداری، سیاسی آزادی کا بہت کم جزو حاصل ہے! اس کے برعکس ممالکِ متحدۂ امریکہ اور انگلستان ہیں، جہاں کے باشندے دل کھول کر حکومت کی تنقید کر سکتے ہیں، اور خود بھی اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہو سکتے ہیں، سیاسی آزادی کم و بیش مکمل سمجھنی چاہیئے[26]۔ اس کے ساتھ ہی زمانۂ حال میں چند ممالک میں ایسی حکومتیں قائم ہوگئی ہیں جو خود ملک کے باشندوں پر مشتمل ہیں لیکن جنہوں نے اپنا فرض سمجھ لیا ہے کہ اپنے اپنے ملکوں کو ایک خاص قالب میں ڈھال لیں۔ ایسے ممالک کی مثالیں روس ترکی اور اٹلی ہیں۔ اگر ان ملکوں پر غیر اقوام کی حکومت ہوتی۔ اور حکومت کی طرف سے روزمرہ زندگی کی کیفیات میں جبر کیا جاتا تو یہ صراحتہً کہا جا سکتا تھا کہ اُن میں سیاسی آزادی مفقود ہے، لیکن اول تو ان ممالک کے باشندوں کا اپنی حکومتوں پر بظاہر کلیتہً اعتماد ہے۔ دوسرے حکومتیں جو کچھ کر رہی ہیں وہ اپنی دانست میں ملک والوں کی بہتری کے لئے ہی کر رہی ہیں، چنانچہ زیادہ سے زیادہ یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ ان ملکوں میں بالفعل انفرادی آزادی کو محدود کر دیا گیا ہے تاکہ ملک کی حالت پہلے سے بہتر ہو جائے، اور جب یہ ایک خاص سطح پر پہنچ جائے گی تو پھر ممکن ہے کہ حکومت اپنے مخصوص طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کرے۔

دستوری آزادی۔ اب دستوری آزادی کے معنی سمجھ میں آجائیں گے۔ اس عہد عمومیت میں بہترین حکومت وہی سمجھی جاتی ہے جو مملکت کے باشندوں کی حقیقی نائب اور قائم مقام ہو۔ جو لوگ اس اصول کے حامی ہیں اُن کا مطمحِ نظر یہ ہے کہ "ملک والے خود اپنے اوپر اپنے ہی مفاد کے لئے حکومت کریں"۔ اور اسی سے قوم کی دیرینہ قابلیں

---

[26] ۱۳۴۵ہجری (۱۹۲۶ء) کے موسمِ حج میں مکہ مکرمہ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں عبدالعزیز السعود شاہِ حجاز و نجد برسرِ حکومت تھے اور علاوہ احکامِ شرعی کے باقی ہر امر پر شخصی مطلق العنانی کا دور دورہ تھا۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ حجاز میں جہاں صرف دو سال پیشتر آلِ سعود کی حکومت قائم ہوئی تھی لوگوں کو مکمل آزادیٔ تقریر حاصل تھی، اور نہ صرف وہ اپنے اپنے گھروں میں اور حرم شریف میں حکومت پر دل کھول کر نکتہ چینی کرتے تھے، بلکہ جلالۃ الملک نے آزادی دے رکھی تھی کہ جو چاہے اُن کے سامنے آئے اور راہِ راست کی تلقین کرے۔ اس سے معاً اسلام کا وہ عہدِ زریں سامنے آگیا جب ایک معمولی بڑھیا حضرتِ عمرؓ کے ذاتی افعال پر علانیہ دوبدو نکتہ چینی کرنے کی مجاز سمجھی جاتی تھی۔

[27] ۱۸۶۳ء میں ابراہم لنکن Abraham Lincoln صدرِ ریاستہائے متحدۂ امریکہ نے گیٹس برگ Gettysburg والی تقریر میں اپنا مطمحِ نظر یہی قرار دیا۔ اُس کے مشہور الفاظ Government of the people by the people for the people. اب گویا انگریزی زبان کی ایک مثل بن گئے ہیں۔

کا صحیح ارتقا ممکن ہوگا چونکہ آج کل کی عظیم الشان مملکتوں میں ملک کے باشندے براہِ راست حکومت نہیں کر سکتے اس لئے منتخب شدہ نیابت کا طریقہ ایجاد کیا گیا ہے جس کے ذریعے سے اُن کے نمائندے حکومت کو ترتیب دیتے ہیں۔ یہ خیال بعض ممالک میں اس قدر جاگزین ہو گیا ہے کہ اگر عمومی حکومت غلطیاں بھی کرے اور ملک کو نقصان بھی پہنچائے تاہم اسے اتنا مضر نہیں سمجھا جاتا جتنا ایک ایسی صورت کو جو نیابتی نہ ہو لیکن جو ملک کی بہتری کے لئے کوشاں ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسولینی کی مطلق العنان وزارت کے دوران میں اٹلی کو دن دگنی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے، لیکن عمومیت پسندوں کے نزدیک دستوری آزادی کے فقدان کی وجہ سے اٹلی کی حالت نہایت درجہ ناقابلِ برداشت ہے۔ اس اصول کے مطابق دستوری آزادی صرف اُن ہی ممالک کے باشندوں کو حاصل ہے جن کا حکومت کی ترتیب و تنظیم میں حصّہ ہے اور جہاں خود وہ براہِ راست اپنے نمائندوں کے ذریعے سے اُن کی نگرانی رکھتے ہیں اور اُن کے افعال کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالتے رہتے ہیں۔

ملکی آزادی۔ آزادی کا مفہوم ایک اور بھی ہے، وہ یہ کہ وہی ملک آزاد تصوّر کیا جائے گا جو کسی دوسرے ملک کے زیرِ اقتدار نہ ہوگا۔ آج کل کے زمانے میں مختلف ممالک ایک دوسرے سے اس قدر وابستہ ہیں کہ نام نہاد آزاد ملک بھی مکمل طور پر آزاد نہیں کہے جا سکتے۔ مختلف ممالک کے مابین معاشری تعلقات، عہد ناموں اور حکمیات کے کرشموں کے باعث فاصلے اور وقت کے معیار میں عظیم الشان تغیر پیدا ہو گیا ہے، وروسائل آمد و رفت اور دید و شنید کے انقلابات کی وجہ سے مختلف ممالک کے مابین معاشری روابط بڑھ گئے ہیں اور ان سب امور کے باعث کوئی ملک خواہ کتنا ہی باقی ماندہ دنیا سے الگ تھلگ ہو، محض من مانی حکمتِ عملی پر کاربند نہیں ہو سکتا۔ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ مکمل ذہنی اور مادی ارتقا کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک اپنے اندرونی معاملات میں آزاد ہو اور بیرونی معاملات میں کلیتہً کسی دوسرے کا محکوم نہ ہو، ورنہ ممکن ہے اس بیرونی سلطنت یا حاکمِ ملک کی خاطر اسے روزمرہ ایسی قربانیاں کرنی پڑیں جن سے نہ صرف اُس کی خودداری مٹ جائے بلکہ اُسے بہت سے مادی نقصانات بھی پہنچیں۔ اور اگر حاکمِ ملک نے اپنی مطلب برآری کے لئے اپنے اقتدار کا شکنجہ زیادہ کس دیا تو ممکن ہے کہ اسے اپنی دستکاری، تجارت اور جہاز رانی اور صنعت و حرفت سے بالکلیہ ہاتھ دھونا پڑ جائے۔

ہارون خاں شروانی

اصطلاحات باب ۶(۲)

English	اردو	English	اردو
Science	حکمیات	Positive rights	اثباتی حقوق
Constitutional Liberty	دستوری آزادی	Protestant	احتجاجی
Commonwealth	دولتِ عامّہ	Moral rights	اخلاقی حقوق
Land, Labour, Capital	زمین، محنت، سرمایہ	Institution	ادارہ
Negro	زنگی	Freedom of Speech	آزادیٔ تقریر
Agent of Production	عاملینِ پیدائش	Freedom of Conscience	آزادیٔ ضمیر
Duty	فرض	Liberty of the Press	آزادیٔ مطابع
Natural Rights	فطری حقوق	Defamation	ازالۂ حیثیتِ عرفی
Martial Law	فوجی قانون	Inquisition	استیصالِ ارتداد
Act of Settlement	قانونِ بندوبست	Socialism	اشتراکیت
Legal Rights	قانونی حقوق	Declaration of Rights	اعلانِ حقوق
Penal Laws	قوانینِ تعزیری	Individualism	انفرادیت
Anglican Church	کلیسائے انگلستان	Organization	تنظیم
Abstract	مجرد	Thirty years' War	جنگِ سی سالہ
Indian Penal Code	مجموعۂ تعزیرات ہند	The Crusades	جنگ ہائے صلیبی
Autocratic Govt.	مطلق العنان حکومت	Wrongful Confinement	حبسِ بے جا
National freedom	ملکی آزادی	Right	حق
Bill of Rights	مسودۂ قانونِ حقوق	Right of Association	حقِ ارتباط
The Judiciary	محکمۂ عدلیہ	Right of Public meeting	حقِ اجتماعِ عامہ
Economic Competition	معاشی مقابلہ	Proprietary Right	حقِ مالکانہ
Representation	نیابت	Private Rights	حقوقِ خانگی
Representative Govt.	نیابتی حکومت	Public Rights	حقوقِ عامّہ

غزل

مؤقّر سے مؤقّر ہو، مفخّر سے مفخّر ہو
اُدھر سب سے مقدّم تھے، اِدھر سب سے مؤخّر ہو

غلط شکووں سے کیا حاصل کہ ظالم ہو ستمگر ہو
اگر ہو کچھ مناسب جان کر، بہتر سمجھ کر ہو

خوشا وہ دن! کہ حسبِ مدّعا عزت میسّر ہو
خوشا وہ دن، کہ قسمت سے مرا سر ہو، ترا در ہو

گل و سرو و صنوبر ہو، مہ و خورشید و اختر ہو
اِدھر بھی جلوہ گستر ہو، اُدھر بھی جلوہ گستر ہو

نگارانِ زمن صدقے، بہارانِ چمن صدقے
نگارِ حُور پیکر ہو، بہارِ نُور پیکر ہو

اب اس پردے سے کیا حاصل اٹھا بھی دو کہ لا حاصل
تمہیں پردے کے باہر ہو، تمہیں پردے کے اندر ہو

جو تیرا تیرِ غم کھایا تو میں ایمان لے آیا
وہی دم ہے جو پُر غم ہو، وہی دل ہے جو مُضطر ہو

محبت سے جلا پائیں تو دل آئینے بن جائیں
نہ میں تجھ سے مکدّر ہوں، نہ تو مجھ سے مکدّر ہو

درِ دولت سے جاتے ہیں، مگر اتنا جتاتے ہیں
ہم آخر بندۂ در ہیں، تم آخر بندہ پرور ہو

مرض ہے اور یہ دعوےٰ کہ ارماں بن کے دم لوں گا
عرض ہے اور یہ سودا کہ ہم افعالِ جوہر ہو

خدا شاہد، ہم از خود بزمِ صہبا میں نہیں آئے
کوئی دامن پکڑ لایا کہ چل حقدارِ کوثر ہو

خدا معلوم، کیوں آزاد حالِ دل نہیں کہتا
بہت ممکن ہے اس میں کوئی رازِ خاص مضمر ہو

حکیم آزاد انصاری

سرگوشیاں

مجبت جو ہوتی ——— کس قدر خوشی ہے اِس غم میں!
مجبت جو ہے ——— کس قدر غم ہے اِس خوشی میں!

دنیا کی تاریکی میں، اک کونے میں دبکے ہوئے ——— خدا کا شکر زبان پر، قسمت کی شکایت دل میں ——— محبّت کے پرستار اور نیکی کے فداکار!

وعدہ جو میں نے تجھ سے کیا وفا ہو گا خواہ اس وفا و محبت میں میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو اور میری رُوح پاش پاش ہو جائے میری راہ میں ندامت اپنے روڑے نہ اٹکا سکے گی کیونکہ میں محبت کی پستیوں کو چھوڑ کر ہمیشہ اُس کی بلندیوں کی طرف گامزن رہوں گا!

یہ ہے میری تمنّا کہ میں اپنے خیالوں کو یوں ہی پاکیزہ رکھوں، یہ ہے میرا ارادہ کہ میں اپنی بے تابیوں کو کم کر لوں تاکہ اس طرح نیکی کا چاند میرے باغِ زیست میں جلوہ گر ہو تاکہ اس طرح تیری محبّت کا پھول میری موت تک دنیا کے لق و دق صحرا میں میری اور تیری رُوح کو مُعطّر رکھے!

چھپا کے رکھ اس موتی کو دل میں، دنیا اس کی نازک چمک کی تاب نہیں لا سکتی! چھپا کے رکھ اس موتی کو اپنی رُوح کے اک کونے میں! چھپا کے رکھ اس موتی کو اپنے نفس سے کہ جذبے اس کی اچھوتی روشنی کو اپنی نگاہوں سے آلودہ نہ کر دیں! چھپا کے رکھ اس موتی کو اپنے وجود کے اندر ہی اندر!

محبت میں آلودگی سے ہراساں نہ ہو جا، محبّت کا کام دنیا بھر کی آلودگیوں کو پاک و صاف کرتے رہنا ہے! محبت خوبصورت جھیل کے پانی میں تیرنا نہیں، محبت زندگی کے سمندر میں جذبات کے طوفان کے اندر لہروں کے تھپیڑے کھانا اور ڈوب ڈوب کر اُبھر چلنا ہے!

اب ج

جالینوس

یہ عجیب بات ہے کہ جالینوس[1] کو یونانی حکما میں شمار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ یونانی نہیں کیونکہ تمام مورخین خواہ وہ انگریز ہوں یا عرب، اِس امر پر متفق ہیں کہ اُس کی جائے پیدائش ایشیائے کوچک ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ اُس کے آبا واجداد اصلاً یونانی تھے لیکن اہلِ یونان کے علمی سیاسی اور تمدنی انحطاط کے زمانہ میں جب کہ رومیوں کی ترقی کا عہدِ شباب تھا وہ ایشیائے کوچک کے ایک شہر پرگامس[2] میں آکر آباد ہو گئے۔ اسی سرزمین کو اس یگانۂ روزگار حکیم کا وطن ہونے کی عزت حاصل ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس خاندانی انتساب پر وہ یونانی مشہور ہو گیا ہو ورنہ حقیقت میں ایسا سمجھنا ایک تاریخی غلطی کا ارتکاب ہے۔ بہرحال سنہ ۱۳۰ء میں جب وہ پیدا ہؤا اُس کا باپ نیکن فضل وکمال میں شہرۂ آفاق تھا یعنی ہندسہ اور ریاضی اور مساحت میں متبحر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفہ، منطق اور ہیئت میں اُسے کافی دستگاہ حاصل تھی۔ ایسے باپ کا بیٹا جس کی ذات میں قدرت نے ابتدا ہی سے غیر معمولی قابلیتیں ودیعت کر دی تھیں۔ بہترین تعلیم و تربیت سے کیوں محروم رہتا۔ چنانچہ ہوش سنبھالتے ہی نیکن نے اُس کو علوم ریاضیہ کی تعلیم دینی شروع کی جس کا وہ خود امامِ وقت تسلیم کیا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جالینوس بہت ذہین واقع ہؤا تھا۔ اُس کو اپنا روزانہ سبق ایک ہی مرتبہ پڑھ لینے سے حفظ ہو جاتا تھا اُس کے وہ ہم سبق طلبا جن میں کچھ سلوٹ نے کے کچھن اور ہونہاری کی نشانیاں پائی جاتی تھیں، اپنی ان تھک محنت سے اُس کو زک دینے کی کوشش کیا کرتے لیکن کبھی کامیاب نہ ہوتے۔ اسی غیر معمولی ذہانت نے نیکن کو اُس کی تعلیم و تربیت کی طرف بہت زیادہ متوجہ کر دیا وہ خود تعلیم دینے کے علاوہ اُسے شہر کے علماء فضلا اور ماہر اساتذہ کی خدمت میں بھی بھیجا کرتا، غرض باپ کی تعلیم و تربیت فضلائے عصر کا فیضِ صحبت اور خود اُس کی خداداد قابلیت نے اُس کی عمر کے پندرہویں ہی برس میں اُسے تمام علوم ریاضیہ کا استاد بنا دیا۔

اس کے بعد نیکن نے اپنے لائق بیٹے کو فلسفہ کی تعلیم دلانی شروع کی۔ فلسفہ کی تحصیل میں دو ہی برس گذرے تھے کہ یکایک نیکن نے اُسے علمِ طب کی تحصیل کے لئے مجبور کر دیا[3]۔ گو ابتدا میں اُسے اِس فن میں کچھ دلچسپی نہ ہوئی لیکن

---

[1] انگریزی میں اسے گیلن Galen یا گیلی نس Galenus کہتے ہیں۔

[2] اس کا جدید نام سمرنا ہے اور اہلِ عرب کے ہاں اس کا قدیم معرب نام فرغاموس ہے۔

[3] اس انقلاب کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ نیکن نے خواب میں اپنے بیٹے کو بحیثیت طبیب کے مراتب جلیلہ حاصل کرتے دیکھا تھا۔

جوں جوں اُس میں بصیرت پیدا ہوتی گئی اُس کے خیالات میں بھی ایک نمایاں انقلاب نظر آنے لگا۔ عنفوانِ شباب ہی سے ترکِ خواہشاتِ دنیوی کو اُس نے اپنا شعار بنا لیا لیکن اُس کی طبیعت میں سب سے بڑا انقلاب اِس احساس نے پیدا کیا کہ کائنات کی عظمت و وسعت کے مقابلہ میں انسان کی ہستی نہایت حقیر اور محض بے حقیقت ہے۔ ۱۴۹ء میں جب اُس کی عمر انیس سال کی تھی، جالینوس اپنے نوجوان احباب کے ساتھ فواکہات کی ایک پُر تکلّف ضیافت میں شریک ہؤا تو اصولِ صحت کے برخلاف مجبوراً خوب میوے کھا گیا جس کے باعث وہ کچھ عرصہ کے بعد سخت بیمار ہو گیا۔ اور ابھی پوری طرح تندرست بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اُسے ایک اور صدمۂ روح فرسا سے سابقہ پڑا، یعنی اُس کے باپ کا سایۂ عاطفت اس کے سر سے اُٹھ گیا۔ ذہنی انقلاب نے پہلے ہی سے اس غریب کو نفس کُش اور مرتاض بنا رکھا تھا، یہ نئی مصیبت اُس کی جانِ ناتواں پر ایک اور قیامت ڈھا گئی۔ تحصیلِ علم کے علاوہ اب فکرِ معیشت بھی دامنگیر ہوئی اور اسی سبب سے اُس کی صحت روز بروز خراب ہونے لگی۔ چنانچہ آٹھ سال کے عرصہ تک وہ مختلف بیماریوں کا شکار رہوتا رہا لیکن یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ تحصیلِ علم کی راہ میں گو مصائب کا ایک بہت بڑا پہاڑ حائل تھا مگر اُس کی ہمتِ بلند نے کبھی پستی کا منہ نہ دیکھا اور وہ اس دورانِ پریشانی میں بھی برابر اپنے مقصد کے حصول کے لئے جد وجہد کرتا رہا۔ خدا خدا کر کے اٹھائیس برس کی عمر میں جب اُس نے علمِ طب سے فراغت پائی تو اُس کی مصیبتوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

جالینوس دو برس تک اپنے وطن ہی میں طبابت کو فروغ دیتا رہا۔ اس کے بعد ۱۶۰ء میں اس نے روم کا سفر اختیار کیا۔ ان دنوں روم ترقی و تہذیب اور فضل و کمال کا مرکز ہو رہا تھا؛ اطرافِ عالم سے اہلِ علم و کمال کھنچ کھنچ اس شہر میں چلے آتے تھے۔ زوال پذیر خطۂ یونان کے تمام کاملانِ فن ایک ایک کر کے اسی علم آباد کی زینت ہو چکے تھے۔ پس اگر جالینوس جیسا فردِ فرید اس سرزمین کو اپنے کمالات کی جولانگاہ نہ سمجھتا تو کیا کرتا۔ جب یہ رومۃ الکبریٰ میں وارد ہؤا اور ے لیوس انطونی نوس سریر آرائے حکومت تھا چونکہ پہلے ہی سے اس نوجوان حکیم کا آوازۂ کمال بلند ہو چکا تھا اس لئے اہلِ روم نے تپاک کے ساتھ اُس کا خیر مقدم کیا۔ اُس کے بعد جالینوس نے مسلسل کئی دن تک عام جلسوں میں علمِ تشریح الاعضا پر تقریریں کیں۔ اُس کی غیر معمولی قوتِ تقریر، فصاحت و بلاغت اور علمِ تشریح کے انوکھے اندازِ بیان نے عام طور پر وہ قبولیت حاصل کی کہ تمام رومیوں نے بالاتفاق اُس کو "معجز بیان"[۱] کا خطاب دیا۔

ایک مرتبہ اکابرِ روم اور حاذق اطبائے یونان اُس کی تقریر سننے کے لئے کسی جلسہ میں بیٹھے تھے۔ تقریر کرتے

---

[۱] رومی زبان کا اصلی لفظ "Paradoxologus" ہے جس کا انگریزی ترجمہ Wonder Speaker ہے۔

کرتے اُس نے کچھ پرندے طلب کئے۔ کسی پرندہ کی کچھ رگیں کاٹ دیں اور کسی کا پیٹ چاک کرکے اسے اندرونی آلائش سے پاک کیا پھر ایک ایسے انداز کے ساتھ جس میں ادعا کا رنگ جھلکتا تھا اُس نے اطبا سے سوال کیا کہ کون ایسا طبیب ہے جو ان کٹی ہوئی رگوں اور اس بے ترتیب آلائش کو اپنی اصلی حالت میں مرتب کرسکتا ہے ؟ جب کسی نے بھی اس صلا پر لبیک نہ کہی تو خود اُس نے ان پرندوں کو کچھ اس طرح ٹھیک کردیا جیسے وہ پہلے ہی سے صحیح و سالم تھے۔ اس واقعہ کا عام لوگوں پر اور عہدہ دارانِ سلطنت پر بہت اثر ہوا چنانچہ ایک عہدہ دار نے اُسے کسی فوجی دواخانہ کی مہتممی پیش کی۔ جالینوس نے اسے بہ طیبِ خاطر قبول کیا اور اس خوش اسلوبی سے مفوضہ خدمت کو انجام دینے لگا کہ سینکڑوں مایوس مریض شفا پانے لگے۔ اِس حسنِ کارگزاری نے چند ہی دنوں میں اُسے صدر فوجی دواخانہ کا مہتمم بنادیا۔ یہاں بھی اُس نے اپنی کاردانی کا اس قدر سکہ بٹھا دیا کہ روم سے شام تک اُسی کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ حسنِ قبول اور شہرتِ عام خدا کی دی ہوئی نعمت تھی، تعجب تھا اگر یہ اُسے شہنشاہِ وقت کے دربار میں نہ پہنچا دیتی۔ چنانچہ اس اعزاز سے مفتخر ہونے کے بعد وہ شہزادگان والاتبار کا معالجِ خاص مقرر ہؤا۔ اور یہ وہ خدمت تھی جس کی آرزو میں نامور اور حاذق اطبا اپنی عمریں صرف کرتے تھے۔

شاہی قرب گو جاہ پسندوں کے نزدیک کتنا ہی بامِ منزلت پر پہنچانے والا کیوں نہ ہو لیکن ایک ایسے حکیم کے لئے جو دنیا کی دل لبھانے والی چیزوں پر ایک عرصہ تک غور کرکے انہیں بے حقیقت سمجھ چکا ہو اس کی کیا حیثیت تھی طوعاً و کرہاً وہ کچھ دنوں تک تو اس خدمت کو انجام دیتا رہا اور خود اُس کے الفاظ میں یہ مدت گویا اُس کی آزاد طبیعت کے لئے قیدِ سخت سے کسی طرح کم نہ تھی، لیکن اس کے بعد بڑی دشواریوں کے ساتھ واپسیٔ وطن کی اجازت چاہ کر یہاں سے چل کھڑا ہؤا۔ وطنِ مالوف کی خدمت کا شوق، اور طلبِ علم کا ذوق عرصہ سے دل میں موج زن تھا، اب اسے پورا کرنے کا سامان ہاتھ آیا۔ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں دو مشہور باکمال شخص روم میں قیام پزیر تھے۔ ایک شخص پیلاپ نامی تھا جو فنِ طب میں بڑا ماہر سمجھا جاتا تھا اور دوسرا البینس، جو فلسفہ کا عالم مانا جاتا تھا۔ دراصل انہیں کاملانِ فن سے مستفید ہونے کی خاطر جالینوس نے روم کا سفر اختیار کیا تھا۔ لیکن اُس کی ہر دلعزیزی اور اعزازِ شاہی نے اُسے اس امر کا موقع نہ دیا۔ اب جو ان علائق سے فرصت ملی تو کچھ عرصہ کے لئے ان بزرگوں کے آگے زانوئے شاگردی تہ کیا[۱]۔ اسی طرح اتھنز اسکندریہ اور مصر میں باکمالوں کی خبر پاکر اُن سے خوشہ چینی کی اور کچھ عرصہ کے بعد وطن چلا گیا۔

جالینوس نے اب ارادہ کرلیا کہ مدت العمر اہلِ ملک کی خدمت اور حصولِ کمال میں صرف کردوں گا۔ انسان کے

---

[۱] بعض مورخین کا قول یہ بھی ہے کہ جالینوس نے شہرِ روم میں وارد ہوتے ہی پیلاپ Pelop اور البینس Albinus سے استفادہ کیا ہے۔

ارادے تو بہت کچھ ہؤا کرتے ہیں لیکن اُن کی تکمیل قدرت کے اختیار میں ہے اور انسان کی زندگی میں اسی فسخِ عزائم کی وجہ سے جو زبردست تغیرات برپا ہو جاتے ہیں اُن کی ذمہ دار یہی قدرت نیرنگ نواز ہے۔ بیچارہ وطن میں آکر سستانے بھی نہ پایا تھا کہ دفعتہً قیصرِ روم کا فرمانِ قضا شیم اُس کی طلبی میں آپہنچا "پابدستے دگرے دست بدستے دگرے" اب حاضرِ دربار ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ دربار میں حاضر ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد ملک کے اندر ۱۶۷ء میں وبا شروع ہوگئی۔ جالینوس کو اس دوران میں بہت کچھ سرگرمیاں دکھانی پڑیں۔ اس کے بعد جب قیصرِ روم کشور کشائی کے نشہ میں جھومتا ہؤا شہر روم سے نکلا تو حکم ہؤا کہ جالینوس میدانِ جنگ میں صدر طبیب کی خدمت انجام دے۔ لیکن جالینوس نے اپنی کسی منت کا بہانہ کرکے جو روم کے مندر میں خاص انہیں دنوں میں پوری کی جاتی تھی، اجازت چاہی۔ قیصرِ روم نے واپس آنے تک شہزادہ کا موڈس کے معالج رہنے کی شرط پر اُس کو جانے کی اجازت دے دی۔ قیصرِ روم کی واپسی پر وہ پھر اپنے وطن کو روانہ ہؤا۔ طلبِ علم و کمال کے شوق نے اُس کو وطن میں بھی نچلا بیٹھنے نہ دیا۔ یہاں سے اس کی بقیہ عمر سیر و سفر ہی میں بسر ہوگئی۔ اس مدت میں اُس نے بیسیوں مشہور اہلِ کمال سے اکتسابِ فن کیا۔ بالآخر یہ شہید علم و کمال سنہ ۲۰۰ء میں جب کہ وہ جزیرہ سائپرس میں مقیم تھا، اپنی حیاتِ مستعار کی ستر منزلیں طے کرکے اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگیا۔

بڑے لوگوں کی موت حقیقت میں موت نہیں ہوتی بلکہ زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ بڑائی کیا ہے؟ انسان کا کمالات اور پاکیزہ صفات سے متصف ہونا یہی چیز ہے جو اُس کو عزت و شہرت کے پر لگا کر اڑاتی اور بقائے دوام کے دربار میں لا بٹھاتی ہے۔ ایسے ہی باکمال بزرگوں کے نقشِ قدم ہوتے ہیں جو شمعِ ہدایت بن کر بھولے بھٹکوں کو راستہ بتاتے ہیں۔ آج دنیا اٹھارہ سو برس دُور نکل آئی ہے، لیکن جالینوس کی بزرگی اور ہردلعزیزی میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔ آج بھی عوام اُس سے اُسی طرح مستفید ہو رہے ہیں جس طرح قدما اُس کی ضیائے کمال سے روشن دماغ بن گئے تھے۔

اگر جالینوس کو یونانی حکما میں شریک کیا جائے (جیسا کہ ہوتا آیا ہے) تو اُس کا نمبر ان مشہور و معروف حکماء میں بحیثیتِ زمانہ گو سب سے آخر ہے، لیکن باعتبار صاحبِ کمال ہونے کے وہ ان سے کسی طرح پیچھے نہیں بلکہ علم و فضل اور اپنے فن میں مجتہدانہ نظر رکھنے کی بنا پر اُسے اُن میں سے اکثر پر فوقیت حاصل ہے۔ زمانہ حال میں طبِ جدید کی روز افزوں ترقی نے یونانی طب کا بازار ایک عرصہ سے سرد کر رکھا ہے اور ان دونوں میں جو چیز مابہ الامتیاز ہے وہ یہی ہے کہ یونانی طب میں زیادہ تر ظن و قیاس سے کام لیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے طبِ جدید بغیر تجربہ کے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتی لیکن جالینوس کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ فنِ طب میں تمام عمر اُس کا مسلک جزئیات

تک میں تجربات پر مبنی رہا۔ اُس کا قول تھا کہ طب میں میری ہر ایک رائے گویا ایک تجربہ ہے، علمِ تشریح الاعضا (اناٹمی) میں جو معلومات اُس کو حاصل تھے اور غیر معمولی اضافہ کے ساتھ اس نے جس طرح اس علم کو مدون کیا ہے وہ تمام حکمائے یونان میں اسی کا اور صرف اسی کا حصّہ ہے۔

جالینوس کو جو شہرت اور مقبولیت اپنی زندگی میں حاصل ہوئی اُس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ امرا اور سلاطین کی اس کو مجبوراً درباداریاں کرنی پڑتی تھیں۔ لیکن ایسی پابندیاں اُس کی آزاد طبیعت پر بڑی شاق گزرتی تھیں۔ وہ ہر وقت اُن کی صحبت سے پہلو بچانے کی فکر میں رہتا۔ اسی بنا پر اُس نے بہت کچھ تکلیفیں بھی اٹھائی ہیں۔ اکثر ایسا ہؤا ہے کہ بادشاہوں نے اُسے بزورِ حکومت اپنا پابند بنانا چاہا، اور اُس نے فرار ہو کر مدتِ مدید تک شہر شہر کی خاک چھانی ہے۔ اُس کا طرزِ زندگی حکیمانہ اصول پر مبنی تھا۔ کثرت سے مطالعۂ کتب کیا کرتا تھا۔ سونا اور کھانا تو بہت کم لیکن بولتا بہت زیادہ تھا۔ ہر چیز میں صفائی اور پاکیزگی کا بہت اہتمام کیا کرتا تھا۔ دو چیزیں دل سے مرغوب تھیں، خوشبو اور موسیقی۔ موسیقی میں اُسے خود بھی کچھ دخل تھا اس لئے عموماً گایا بھی کرتا تھا۔ سیر و تفریح کا بہت شائق تھا اور مناظرِ قدرت کی دلفریبیوں سے بے حد حظ حاصل کرتا تھا۔ خوش مزاجی، خندہ پیشانی اور خلق و مروت کی مجسم تصویر تھا۔

جالینوس ایک ہمہ گیر لیاقت کا انشا پرداز تسلیم کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کی تصانیف خواہ وہ کسی فن میں ہوں قطعاً عالمانہ اور مجتہدانہ ہیں۔ اپنے وقت میں علمِ منطق کا وہ ایک منفرد عالم مانا جاتا تھا اور اس علم میں اُس نے جو کچھ اضافے کئے ہیں وہ آج بھی محفوظ ہیں اور قدیم علمِ منطق کی تاریخ میں اُس کا یہ کارنامہ وقیع ترین حیثیت رکھتا ہے۔ رومۃ الکبریٰ کے شاہی کتب خانہ میں اُس کی بے شمار تصانیف محفوظ کر لی گئی تھیں لیکن افسوس کہ اس لاجواب کتب خانہ کو آگ لگ گئی اور تمام علمی ذخیرہ خاک میں مل گیا۔ اس پر بھی اُس نے اپنی تصانیف سینکڑوں کی تعداد میں یادگار چھوڑیں[1] لیکن آج اُس کی بہت کم کتابوں کا وجود دنیا میں ہے۔ زیادہ تر اُس کی تصانیف کا موضوع قواعد اخلاقیات اور منطق رہا ہے۔ ان میں بہت سی کتابیں ایسی ہیں جو غلط طور پر اُس کی طرف منسوب ہو گئی ہیں اور بہت سی ایسی ہیں جو مشتبہ سمجھی جاتی ہیں۔ بہر حال تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ صرف تراسی رسالے شائع شدہ کتابوں میں ایسے ہیں جنہیں یقینی طور پر جالینوس کی تصانیف کہا جا سکتا ہے۔

احمد عارف

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں مذکور ہے کہ جالینوس کی کل تصانیف کی تعداد ۵۰۰ ہے۔

پیپل کے پتّے

پیپل کے سبز پتّے جو لہلہا رہے ہیں ۔۔۔ بادِ صبا سے مِل کر کیا سرسرا رہے ہیں
کس سے جُدا ہوئے ہیں کیوں تلملا رہے ہیں ۔۔۔ کس نام کا وظیفہ یہ گنگنا رہے ہیں
کس کا جلال ان کی آنکھوں نے دیکھ پایا ۔۔۔ کیوں کانپتے ہیں اتنا کیوں تھرتھرا رہے ہیں
کس کی صدائے دلکش سُن کر یہ کیفیت ہے ۔۔۔ سر دُھن رہے ہیں دل کو بیخود بنا رہے ہیں
جکڑے گئے ہیں کیسے کتنے بندھے ہوئے ہیں ۔۔۔ ہستی کی قید میں ہیں پر پھڑپھڑا رہے ہیں
بکھرا پڑا ہے گویا یہ معرفت کا دفتر ۔۔۔ رودادِ حسنِ وحدت ہم کو سنا رہے ہیں
پیوستہ ہیں شجر سے اور متفق ہیں باہم ۔۔۔ روئے زمیں پہ یُوں سب مل کے چھا رہے ہیں
تھامے ہوئے ہیں گویا دینِ ہدیٰ کا رشتہ ۔۔۔ "لاتفرقوا" کا نعرہ مل کر لگا رہے ہیں

پابستہ بھی ہیں بے شک اور سخت نارسا بھی
اپنے قدم کو پھر بھی آگے بڑھا رہے ہیں

ح - ب

دُعا

انسان فطرتاً کمزور واقع ہؤا ہے۔ اس کارگاہِ عالم میں، جہاں حوادث کی آندھیاں اُس کے پائے ثبات کو ڈگمگا دینے کے لئے ہر وقت تیار ہیں، اپنے آپ کو قائم رکھنے کے لئے وہ کسی ایسی ہستی کی اعانت کا محتاج ہے جو اُس سے زیادہ طاقتور، زیادہ مضبوط اور زیادہ ذرائع کی مالک ہو۔ مذہب نے یہ ضرورت پوری کر دی ۔ خدا پر غیر متزلزل اور محکم ایمان، اُس کی صفات پر پورا پورا اعتقاد انسان کو بہت سی پریشانیوں سے بچائے رکھتا ہے ۔ وہ لوگ جو کام سے مطلب رکھتے ہیں "یہ کیوں ہے؟ کب سے ہے؟ کہاں ہے؟ ایسا کیوں ہے اور ایسا کیوں نہیں؟" کی دور از کار الجھنوں میں نہیں پڑتے ۔ جو اپنے پروردگار کی بھیجی ہوئی چیزوں کو بطیب خاطر قبول کر لیتے ہیں عموماً مطمئن اور خوش زندگی بسر کرتے ہیں ۔ وہ ناخواندہ اور جاہل شخص جو تکلیف کے وقت سچے دل سے خدا کی طرف رجوع کرتا ہے، جس کا دعا پر پختہ یقین ہے اور جو اس بات کو مانتا ہے کہ خدا چاہے تو اُس کی مصیبت دم بھر میں کھو دے اُس عالم سے زیادہ طمانیتِ قلب کا مالک ہے جس نے اپنے تئیں فلسفہ سائنس اور مابعد الطبیعات کی بھول بھلیاں میں کھو دیا ہو۔ مذہب کا دوسرا نام دُعا ہے ۔ مذہب نام ہے اُس شاہراہ کا جس پر چل کر انسان اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملتا ہے۔ مذہب ایک طریقہ ہے جس سے عابد براہِ راست معبود سے تعلق پیدا کر سکتا ہے ۔ اور یہ سب امور دعا سے حاصل ہوتے ہیں۔ دنیا میں ایسا کوئی مذہب نہیں جس نے اپنے پیروں کو دعا کی تلقین نہ کی ہو۔ باوجود اس مذہبی انتشار و افتراق کے جو ہمیں ہر طرف نظر آتا ہے صرف دعا ایک مسئلہ ہے جس پر سب مذاہب متفق ہیں۔ دعا مانگنے سے انسان کا اضطراب رفع ہو جاتا ہے ۔ اُس کے مضطرب اور کھولتے ہوئے دماغ پر گویا برف کی سی ٹھنڈک پڑ جاتی ہے ۔ اُس کے قلبِ پریشاں میں اطمینان کی لہر دوڑ جاتی ہے اور وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ کوئی بھاری بوجھ جو اُس کے وجود کو بُری طرح اپنے اندر دبائے ہوئے تھا اُس سے زیادہ بلند، زیادہ با اعتبار اور زیادہ قابلِ وثوق ہستی کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔

عاشق بٹالوی

پہلی پیشی

(ایک مختصر برلسک[1])

ارکان

جان	ایک نوآموز وکیل
جین	جان کی بہن
لوقس	ایک سوداگر
جولیا	جان کی والدہ
صوفیہ	خادمہ

(مقام لاہور۔ عہدِ حاضر۔ جان کی تعلیم ختم نہ ہوئی تھی کہ اُس کے والد کا انتقال ہوگیا۔ ماں نے لاکھ جتنوں سے اُسے ایل ایل بی تک تعلیم دلا کر وکالت کی سند دلائی۔ ایک طرف قرض خواہوں کا تقاضا عدالت کی ڈگری تک جا پہنچا، دوسری طرف جان نے بہتیرا سر ٹپکا، مگر کسی نے اُسے بھنی تک نہ کرائی۔ یہ تھی اس گھرانے کی حالت جب یہ ڈراما شروع ہوتا ہے)

پہلا سین

(جان کے مکان کا ایک کمرہ۔ فرنیچر پرانا ہے مگر ہر چیز سلیقہ سے رکھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غربت کے آثار پر قرینہ کا لباس چڑھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جولیا ایک ہاتھ سے منہ کو سہارا دیئے اداس سی بیٹھی ہے۔ جین ایک ٹرنک کی موجودات لے رہی ہے)

جولیا۔ یہ مکان نیلام ہو جائے گا؟ ہول پر ہول آتا ہے اس خیال سے، یہ مکان جس میں پل کر جوان ہوئی اور جس میں رنڈاپا کاٹ ڈالا ہاتھ سے نکل جائے گا؟ اسی کمرے کو لو کتنی یادگاریں اس میں مدفون ہیں۔ اسی کمرے میں میری پہلی گڑیا ٹوٹی۔ اسی کمرے میں مجھے بھیّا نے کاٹا۔ پٹا، بیمار پڑا اور اسی کمرے میں مرگیا۔ اسی کمرے میں مجھے جان کے ابا نے شادی کی دعوت دی۔ لوگو! صرف اس ننھی سی خطا پر گھر سے بے گھر ہو رہی ہوں کہ اس نگوڑی کمپنی کے

[1] ایک قسم کا مضحکہ آمیز ڈراما۔

حصّے کیوں خرید بیٹھی جس کو بجلی کی طاقت سے بُوٹ صاف کرنے کا کارخانہ کھولنا تھا۔ تین مہینے کی مہلت! اس میں پانچ ہزار روپیہ پیدا کرنا انہونی سی بات ہے۔ مکان کے رہنے کی کوئی صورت نہیں۔ (رومال آنکھوں پر)

جین (ٹرنک میں کپڑے ڈالتے ہوئے) اس ٹھیکرے کو رو رہی ہو؟ جاتا ہے تو جانے دو۔ تھا کس کام کا؟ آئے دن کی مرمت ہلکان کئے رکھتی تھی۔ کل کا جاتا آج جائے میں تو کہوں بھلا ہوا میری مالا ٹوٹی، رام جپن سے چھوٹی۔ اِس لئے بے فکر تو بے کار رہے۔ میری سنو امیں تو کہیں آنے جانے جوگی نہ رہی۔

جولیا۔ ہائے ہائے کیا بنی میری بچی پر۔

جین۔ (منہ بسورتے ہوئے) چیتھڑوں سے بھرا پڑا ہے۔ (ٹرنک کی طرف اشارہ کرکے) حرام ہے جو کوئی چیز پہننے کے لائق ہو۔ اُدھر بلاوے پر بلاوا آرہا ہے۔ (دعوتی رقعوں کا ایک بنڈل میز پر پھینک دیتی ہے)

جولیا۔ یہ جلسے اور پارٹیاں بے کاروں کا کھیل ہیں۔ مجھے تو اس ناچ سے وہ نفرت ہے کہ کیا کہوں۔

جین۔ ہاں جسم ہی ایسا ملا ہے کہ ایک گت میں ہانپنے لگو۔

جولیا۔ ادب سیکھو۔

جین۔ ای! اِس عمر میں ادب۔ بے جوڑسی بات ہے۔ ابھی میرا سن ہی کیا ہے۔

جولیا۔ سن کا ہمیشہ خیال رکھنا۔ مرتی مرجاؤ پر اُسے نہ بڑھنے دینا۔

جین۔ بکری کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ اکیسویں میں قدم رکھا اور لڑکی بننے کا زمانہ گیا۔

جولیا۔ میں تو اکیس کی ہو کر بھی پانچ سال تک میٹھا سال ہی بتاؤں۔

جین (گلے میں ہاتھ ڈال کر) یہ گُر نہ بتاؤ گی تو ماں کون کہے گا۔

(جان آتا ہے)

جولیا۔ ہنستے آرہے ہو۔ مِل گیا نا آخر مقدمہ۔

جان۔ توبہ کرو۔ اس زندگی میں تو ملتا نظر نہیں آتا۔ ہاں ایک بات ہے اُس پر عمل کرو تو شاید عدالت کی شکل دیکھ لوں۔

جین۔ کہو تو سہی۔

جان۔ دُور کی کوڑی لایا ہوں۔ داد دینا۔ لوئس کو جانتی ہو نا جس کی دکان ٹھنڈی سڑک کی نکڑ پر ہے۔

جین۔ دیکھا تو ہے۔ پھر؟

جولیا۔ ابھی وکالت شروع نہیں کی پہیلیاں پہلے کہنے لگے۔ صاف کہو جو کہنا ہے۔

جان۔ تو اُس سے شادی کرلو۔

جولیا۔ شاباش! بیٹا شاباش۔ اب بڑھی میّا کا بیاہ رچاؤ گے کیا؟

جان۔ خواہ مخواہ! میں تو جین سے کہہ رہا ہوں۔

جین۔ بیاہ کرے اپنی کسی ہوتی سوتی سے۔

جان۔ کاتا اور لے دوڑی۔ پہلے کسی کی سن تو لو، پھر جواب دینا۔ کون کہتا ہے کہ سچ مچ اُس کی بیوی بن جاؤ۔ یونہی دو ایک دن کے لئے منگنی سی ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔

جین۔ جی ہاں، میں خوب جانتی ہُوں تمہاری باتیں۔ مَیں شادی سے انکار کروں گی تو ساری عمر کا چھدّا میرے سر رہے گا۔

جان۔ یہی تو عورتوں کو مرض ہے کہو کچھ سمجھتی کچھ ہیں۔ یہ تو سب ایک کھیل ہے تھیئٹر یا سنیما کا تماشا سمجھ لو۔ بس دنیا کو یہ دکھانا ہے کہ لوئس کی ہمارے یہاں ایک مدت سے آمدورفت تھی اور قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے، جسے آخر اماں نے اور تم نے قبول کر لیا۔ پس پردہ یہ کرنا ہے کہ جب وہ یہاں آئے تو ہم سب کھسک جائیں۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد جب وہ شادی کا پیغام دے تو تم لجا شرما کر اُسے قبول کرو۔ ایک ہفتہ یونہی گذر جائے۔ اُس کے بعد مَیں اُسے بتاؤں کہ تمہارا مزاج ذرا تیز ہے بعض لوگ تمہیں چڑچڑی خیال کرتے ہیں۔ پھر گھر کی نوکرانی اس سے علیحدہ ملے اور یہ حاشیہ چڑھائے کہ تم پھوہڑ، بدمزاج اور سدا کی روگی ہو۔ اور دو ایک محلہ دار اس کی تائید کردیں۔ وہ ڈر کر ناتا توڑ دے۔ تم نقضِ معاہدہ کی نالش داغ دو اور دس ہزار روپیہ ہرجانہ "دلا پانے" کا دعویٰ کرو۔ بس پھر کیا ہے۔ میری آواز سے عدالت گونج اُٹھے گی۔ سارے شہر میں دھاک بیٹھ جائے گی۔ روپیہ ملے گا۔ قرض کا دلدّر دور ہو گا۔ مکان پر آنچ نہ آئے گی اور ساتھ ہی میری وکالت چمک اُٹھے گی۔

جولیا۔ بیٹا۔ آخر کس باپ کے بیٹے ہو۔ جیتے رہو۔ جب خدا دینے پر آتا ہے تو یوں چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے۔

جین۔ بے ڈھنگی سی بات ہے مگر خیر خاندان کی ناک رکھنے کے لئے جو کہتے ہو کر گزروں گی۔

جان۔ شاباش! آخر کس ماں کی بیٹی ہو۔ میں اسے کہہ آیا ہوں۔ آیا سمجھو اسے۔

جین۔ مگر کچھ جان پہچان تو ہو پہلے۔

جان۔ اس کی فکر بے کار ہے۔ وہ جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ پر ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ بیسیوں دفعہ منتیں کر چکا۔ آج

تو میرے یار نے ہاتھ جوڑ دیئے اور جھٹ ٹوپی پاؤں پر رکھ دی۔

(صوفیہ آتی ہے)

صوفیہ۔ کوئی مردوا صاحب کو سلام دیتا ہے۔ باہر سے تو نرا گدھا ہے۔ اندر کا حال خدا جانے۔

جولیا۔ صفیہ۔

صوفیہ۔ حضور میرا نام صوفیہ ہے۔

جولیا۔ تو صوفیہ ایسی واہی تباہی ہمارے سامنے نہ بکا کرو۔

(لوقس آتا ہے)

لوقس۔ مزاج تو اچھے ہیں آپ سبھوں کے۔

جان۔ آپ کی عنایت۔ یہ میری والدہ اور یہ میری بہن۔

لوقس۔ شرفِ نیاز حاصل کر کے بہت مسرت ہوئی

جولیا۔ ملاقات سے جی خوش ہو گیا۔ جیسا سنا تھا ویسا پایا۔

لوقس (کورنش بجا لا کر) ذرّہ نوازی ہے۔ قدر افزائی ہے۔ آپ نے موری کی اینٹ کو چوبارے پر پہنچا دیا، اور کیا عرض کروں۔

(اس محاورے کے استعمال پر سب مسکراتے ہیں)

جولیا۔ اجی تکلف برطرف۔ ہاں اجازت ہو تو گھر کا کام دھندا ذرا دیکھ آؤں۔ خانہ واحد ہے۔

لوقس۔ شوق سے۔

(جولیا جاتی ہے)

جان۔ پچھلے سنیچر شاید میں نے آپ کو تھیٹر میں دیکھا تھا۔

لوقس۔ جی ہاں۔ جب کوئی کام نہ ہو تو وہیں جا بیٹھتا ہوں۔

جان (لوقس سے علیحدہ) آج تو کمال کر رہے ہے استاد۔ بس اسی طرح رنگ جمائے جاؤ (بلند آواز سے) کل ایک مقدمہ ہے۔ کہئے تو ذرا اُس کے کاغذات دیکھ آؤں۔ عجیب مقدمہ ہے۔ ایک خاوند نے بیوی سے کہا ذرا لوٹ تو صاف کر دینا۔ اس نیک بخت نے اُٹھ کر اُس کے منہ پر سیاہی مل دی۔ امید ہے آپ معذور خیال فرمائیں گے۔

لوقس۔ یقیناً (علیحدہ) خدا کے لئے مجھے اکیلے نہ چھوڑ جانا۔

جان۔ اجی گھبراتے کیوں ہو۔ مرد بنو۔ جہاں رک جاؤ وہاں کہہ دینا معلوم نہیں۔ اچھے گواہ ایسا ہی کرتے ہیں۔

(جان جاتا ہے لوفتس اور جین رہ جاتے ہیں)

جین۔ آپ اس سے پہلے کیوں نہ آیا کرتے تھے؟

لوفتس۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔

جین۔ فرمائیے۔

لوفتس۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جین۔ جی میں متوجہ ہوں۔

لوفتس۔ ڈرتا تھا۔

جین۔ ڈرنے کی ایک ہی کہی، مگر اس کی وجہ؟

لوفتس۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں (علیحدہ) اب میں کوئی بات شروع کروں (مخاطب ہوکر) آپ کو پلاؤ پسند ہے؟

جین۔ بے حد۔

لوفتس اور کباب؟

جین۔ وہ بھی۔ (علیحدہ) یہ بک کیا رہا ہے (مخاطب ہوکر) میں سمجھی نہیں۔

لوفتس (ہنستا ہے) آپ نہیں سمجھیں؟ شاعرانہ بات پیدا کی ہے۔ پلاؤ اچھی چیز، کباب اچھی چیز، مگر آپ اس قدر اچھی ہیں کہ دونوں کا مجموعہ کہنا چاہیئے آپ کو۔

جین۔ اچھی تعریف ہو رہی ہے میری۔

لوفتس۔ تعریف نہیں اظہارِ حقیقت ہے۔

جین۔ پھر کیا ہوا۔

لوفتس۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں۔

جین (علیحدہ) یہ اول جلول آخر کب تک برداشت کرنا ہے۔ (مخاطب ہوکر) یہ ہوئی ایک —— اور دوسری وجہ؟

لوفتس۔ وہ تو مجھے معلوم نہیں۔ مگر یہ کہئے کہ میں آپ کو جین کہہ سکتا ہوں

جین۔ میرا کیا حرج ہے۔

لوفتس۔ کیا آپ میرا خاوند، میرا مطلب ہے بیوی بننا گوارا فرما سکتی ہیں؟

جین۔ اتنی جلدی کیا کہوں۔
لوئس۔ کہہ ڈالئے۔ جو جی میں آئے کہہ ڈالئے۔
جین۔ تو ہاں کہہ ڈالتی ہوں۔ (لفظ کہہ ڈالتی پر زور)

(جولیا آتی ہے)

جولیا۔ کہیں اکتا تو نہیں گئے آپ؟
لوئس۔ خوب گذری۔ اور ــــ اور شادی کا وعدہ بھی ہوگیا۔ اب آپ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
جولیا۔ میں خوشی سے منظور کرتی ہوں جین کو اپنی قسمت پر ناز کرنا چاہئے۔ صفیہ، اری صفیہ!"

(صوفیہ آتی ہے)

صوفیہ۔ حضور میرا نام صوفیہ ہے۔
جولیا۔ ہاں صوفیہ۔ ذرا لپک کر جاؤ اور جان کو بھیج دو۔

(صوفیہ جاتی ہے اور جان آتا ہے)

جولیا۔ جان کچھ سُنا؟ یہ دونوں شادی کیا چاہتے ہیں!
جان۔ سچ؟ لوئس تم تو بڑے سیدھے سادے دکھائی دیتے تھے، مگر ایک چالیا نکلے۔ اچھا مبارک ہو۔

(لوئس سے ہاتھ ملاتا ہے دونوں ہنستے ہیں)

جولیا۔ اب میں دعا دوں تمہیں۔

(بہت ردوبدل کے بعد یہ صورت بنتی ہے کہ درمیان میں جولیا کھڑی ہوتی ہے، اس کے ایک طرف جین اور دوسری طرف لوئس دوزانو ہوجاتے ہیں۔ جولیا کے عقب میں جان ایک سٹول پر کھڑا ہوتا ہے اور رومال منہ میں ٹھونس کر ہنسی کو ضبط کرتا ہے۔ اس اہتمام کے بعد)

جولیا۔ میرے بچّو میں تمہیں دعا دیتی ہوں۔

دُوسرا سین

(وہی کمرہ)

صوفیہ۔ کہتے ہیں، لوئس ملے تو اسے یہ کہوں کہ مس جین بدمزاج ہے اور اس کے عوض ماہانہ دگنا ہو جائے گا نرالی بات ہے۔ مگر یہ بھی ٹھیک ہے کہ گھر کا گھر ہی نرالا ہے۔ آوے کا آوا بگڑا ہے۔ عجب بے ڈھنگے لوگ ہیں۔

اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔ ان کے گن کہاں تک گاؤں۔ دیکھو نا! صوفیہ تک کہنا نہیں آتا۔ بڑے سے چھوٹے تک جب کہیں گے صفیہ، اور مجھے ٹھہری چڑ، چوٹی سے ایڑی تک لو کا لگ جاتا ہے۔ اچھا بھلا ماں باپ کا رکھا ہوا نام بگاڑنے والے یہ کون؟ نوکری کی ہے، بڑوں کی عزت نہیں بیچی!

جولیا۔ (پس پردہ) صفیہ۔ اری صفیہ۔

صوفیہ۔ پھر وہی صفیہ۔ (ہاتھ جوڑ کر) حضور میرا نام صوفیہ ہے۔

(جاتی ہے)

(جان اور جین آتے ہیں)

جان۔ تو ابھی تک سب داؤں پٹ رہے ہیں؟

جین۔ مگر کبھی کبھی گھبرا جاتا ہے۔

جان۔ چٹھیاں تو احتیاط سے رکھی ہیں نا؟

جین۔ سب رکھی ہیں۔ کہنے کی دیر تھی اور اس نے ایک ایک دن میں چار چار لکھنی شروع کر دیں۔ وہ بے سر و پا باتیں لکھی ہیں کہ پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ خاصہ ملپندا ہو گیا ہے ان کا۔

(صوفیہ آتی ہے)

صوفیہ (بے چینی سے) حضور لوقس صاحب آئے ہیں۔ پوچھتے ہیں گھر ہی ہیں آپ۔ میں نے کہا ہیں تو یہیں مگر سرکار کا مزاج بگڑا ہوا ہے۔ سیدھے منہ بات کے بھی روادار نہیں۔

جان۔ شاباش۔ آج تو بڑا کام کیا صفیہ۔

صوفیہ۔ حضور میرا نام صوفیہ ہے۔

(جاتی ہے۔ لوقس آتا ہے)

جان۔ یار لوقس۔ اب تو دنوں شکل نہیں دکھاتے۔ کدھر رہتے ہو؟

لوقس۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں۔

جان۔ (رازدارانہ انداز سے) میں جاتا ہوں مگر ذرا سنبھل کر۔ آج ذرا ذرا سی بات پر آگ ہو رہی ہے۔

(جاتا ہے)

لوقس (علیحدہ) اس کی شکایت ہی کیا۔ بدمزاجی تو اس کی گھٹی میں پڑی ہے (مخاطب ہو کر) جین پیاری۔

جین (منہ چڑا کر) لوقس پیارے۔

لوقس۔ میرے خیال میں تمہیں میرا منہ چڑانا مناسب نہیں۔

جین۔ ابھی سے یہ پابندیاں؟ نہ سوت نہ کپاس کوری سے لٹھم لٹھا۔ یہ جان لو میں نہ تمہارے خیال کی پابند ہوں نہ ہوسکوں گی اور نہ کبھی ہونگی۔

لوقس۔ (علیحدہ) اس سے برسرآنا مشکل ہے۔ کوئی عذر رکھ کر منگنی ہی توڑے دیتا ہوں (مخاطب ہوکر) سنتا ہوں کل تم بغیر شکر اور دودھ کے چائے پی گئیں۔

جین۔ تو پھر اس میں کسی کے باوا کا کیا گیا۔

لوقس۔ تو میں ایسی بدذوق عورت سے شادی نہیں کرسکتا جو شکر اور دودھ کے بغیر چائے پیئے۔

جین۔ منگنی توڑدو پھر۔

لوقس۔ اور کر ہی کیا سکتا ہوں؟

جین۔ مشکل ہے۔

لوقس۔ آسان ہے۔ ایلو توڑ دی بس۔

(جین چیخ مار کر بے ہوش ہوجاتی ہے، جان جولیا اور صوفیہ گھبرائے ہوئے داخل ہوتے ہیں)

جولیا۔ (جین کا سر زانو پر رکھ کر) صفیہ۔

صوفیہ۔ حضور میرا نام صوفیہ ہے۔

جولیا۔ چنگی بھلی ہنستی کھیلتی چھوڑ گئی۔ ہؤا کیا اسے؟

لوقس۔ کچھ نہیں۔ یونہی سی آپس میں جھوڑ ہوگئی۔

(جین جھٹ ہوش میں آجاتی ہے)

جین۔ منگنی توڑنا چاہتا ہے۔

جولیا۔ لے ہے یہ غضب، یہ قہر، یہ اندھیر۔ دیکھوں تو کس طرح توڑتے ہو۔ دو دن میں ایسی کونسی خطا کی نگوڑی نے جو اسے قبل از وقت رانڈ کئے دیتے ہو۔

لوقس۔ خالی چائے پی جاتی ہے شکر تک نہیں ملاتی۔ کون کرے ایسی سے شادی۔

جولیا۔ سنیں اس مردوے کی باتیں صفیہ!

صوفیہ۔ جی ہاں! مگر حضور میرا نام صوفیہ ہے۔
جولیا۔ چائے میں شکر کیوں نہیں ملاتی۔ میرا سر گھوم رہا ہے۔
(بے ہوش ہو جاتی ہے)

لوقس۔ اچھا تو میں چلتا ہوں۔
جان۔ ٹھہرو۔ پہلے اِس کے معصوم ارمانوں کا جنازہ اٹھاؤ، پھر اپنی قبر بنانے کے لئے قدم اٹھاؤ۔ لوقس! تم نے میرے غصے کے شیر کو بیدار کر دیا۔ سنبھلو! بچو! اب تمہاری خیر نہیں، تم ایک مشہور وکیل کی آبرو کے لاگو ہوئے ہو مگر یاد رکھنا تمہاری دکان کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ قلاش کر کے چھوڑوں گا۔ اتنے بڑے خاندان سے بگڑی الجھانا کھیل نہیں۔ تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ اس خاندان کے کسی رکن کو سرنگوں ہونا پڑا۔ میرے لئے یہ پہلا موقع ہے کہ میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہا (دوسری طرف منہ کر کے ہنستا ہے۔)
لوقس۔ ٹھہرو۔ ذرا دم لو۔
جان۔ چپ رہو۔ یہ میری حماقت تھی جو تجھ سے اٹھائی گیرے کو گھر لایا۔ ہمارے کنبے میں بچے، بوڑھے اور عورتیں چھوڑ کر ایک ہزار ایک سو ایک شخص ہیں۔ اور تم نے اپنی اس حرکت سے ایک ہزار ایک سو ایک ناک کاٹ ڈالی ہے۔ اُن کے غصے سے بچو! اُن کے طیش سے گھبراؤ۔ اور انہیں دیکھتے ہی گر پڑو! ورنہ جانتے ہو کہ کس قدر خوفناک، ہولناک، ہیبتناک نتیجہ ظاہر ہوگا۔
لوقس۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں مگر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان ایک ہزار ایک سو ایک مردوں کے ساتھ عورتیں بچے اور بوڑھے بھی شامل ہو کر میری دکان کے گاہک بن جائیں پھر بھی میں ایسی بدمزاج ایسی پھوہڑ ایسی کلّہ دراز عورت سے شادی نہیں کر سکتا۔
جان۔ یہ اڑان گھائیاں کسی اور کو بتاؤ۔ ایک ہائی کورٹ کا وکیل ایسے دم جھانسوں میں نہیں آئے گا۔ جہیز کے لالچ میں منگنی کی۔ جب کچھ ملتا نظر نہ آیا تو توڑ دی۔
لوقس۔ یہ سراسر بہتان ہے (بھاگ جاتا ہے)
جان۔ جین مبارک ہو تو کامران ہے۔
صوفیہ۔ اِس خوشی کے صدقے میں یہ بھی یاد رکھئے کہ حضور میرا نام صوفیہ ہے۔

تیسرا سین

(عدالت کا کمرہ۔ جج، جان، جین، جولیا، لوقس، اور صوفیہ)

جج ۔ جین حاضر ہے ؟
جین ۔ ہاں حضور ۔
جج ۔ اور لوقس ؟
لوقس ۔ وہ بھی حاضر ہے ۔
جج ۔ (جھڑک کر) غائب کے صیغے میں جواب دیتے ہو عدالت کو ؟ دھکیل دوں حوالات میں تو کیسی رہے ؟ ہم نرمی کرتے ہیں، تم لوگ گستاخ ہوتے جاتے ہو۔
لوقس ۔ حضورِ والا معاف فرمایئے بندہ حاضر ہے ۔
جج ۔ معافی دی جاتی ہے آیندہ احتیاط رکھنا ۔ ہاں مدعیہ کا فاضل وکیل اپنا مقدمہ بیان کرے ۔
جان ۔ حضورِ والا ۔ جذبات اور حسیات سے لبریز دل کے ساتھ اس عظیم الشان عدالت کے روبرو یہ ہیچ مدان کج مج زبان بصد عجز و نیاز یہ گزارش کرنے کی ـــــــ اجازت چاہتا ہے ۔ اس دردانگیز، دلشکن، اور جگر سوز مقدمہ کے واقعات تو عرض کرتا ہوں مگر مدعا علیہ کی عیاری، مکاری، دغا بازی اور چالاکی بیان کرنے کے لئے فرہنگِ آصفیہ تہی دامن نظر آتی ہے ۔ ادھر بیچاری مدعیہ کی حالتِ زار کسی تشریح کی محتاج نہیں ۔ اُس کی زندگی برباد اور مستقبل تاریک ہوگیا ۔
لوقس ۔ (ہاتھ اٹھاکر) ایک سوال ۔
جج ۔ چپ رہو ۔
جان ۔ مدعا علیہ کے حلیے پر نظر ڈالئے ۔ ایک ایک عضو شاہد ہے کہ یہ کس بلا کا بد باطن ہے اور اس کا آزاد پھرنا امن عامہ کے کس قدر خلاف ہے ۔ جنابِ والا ۱۰ ۔ دسمبر کو مدعا علیہ نے مدعیہ کو شادی کا پیغام دیا اور گھر والوں کے کہنے سننے پر اُس بیچاری نے قبول کر لیا مگر اس واقعہ کو ایک ہفتہ بھی نہ ہؤا تھا کہ مدعا علیہ نے یہ عذر رکھ کر معاہدہ فسخ کر دیا کہ مدعیہ نے چائے میں شکر اور بالائی کیوں نہیں ڈالی ۔ غریب پرور عدالت کی اجازت سے اب میں اُن سینکڑوں چٹھیوں میں سے صرف ایک بطور مشتے نمونہ از خروارے عدالت کو سناتا ہوں جن سے ظاہر ہوگا کہ بیچاری مدعیہ کو دھوکا دینے کی کس قدر گہری سازش کام کر رہی تھی ۔
لوقس ۔ (ہاتھ اٹھاکر) ایک سوال ۔
جج ۔ چپ رہو ۔

جان (ایک چٹھی اٹھا کر پڑھتا ہے) میری بلبل ہزارداستان! تیرا اللہ نگہبان! جس وقت سے آیا ہوں انگاروں پر لوٹ رہا ہوں۔ متاسف ہوں کہ آیا کیوں۔ تمہارے پاس ہوتا ہوں تو ڈرتا ہوں کہیں تمہارا دل نہ بھر جائے۔ غرض نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کا نقشہ ہو رہا ہے۔ کروں تو کیا کروں اور نہ کروں تو کیا نہ کروں۔ خط لکھتا ہوں تو روتا ہوں اور روتا ہوں تو خط لکھتا ہوں۔ کثرتِ استعمال سے تمہاری تصویر کا پیراہن کاغذی اُڑ گیا ہے۔ ایک اور کاپی ارسال فرمائیں تو میرے باپ دادا بلکہ سارے خاندان پر احسان رہے۔ دکان خوب چل رہی ہے مگر سیمنٹ کا بھاؤ گر گیا ہے۔ میری محبت کی وسعت الفاظ کے دائرے میں نہیں سما سکتی۔ اس لئے اس محبت نامے کو ختم کرتا ہوں اور اپنی لازوال محبت کا یقین دلاتا ہوں۔

جج۔ اچھا اب مدعا علیہ اور گواہان سے پوچھو۔

جان۔ لوقس تمہارا کیا نام ہے؟

لوقس۔ مردِ خدا! خود ہی تو میرا نام لے رہے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو؟ اسی کو شاید تجاہلِ عارفانہ کہتے ہیں؟

جج۔ صرف سوال کا جواب۔ زیادہ مت بولو۔ صاف بتاؤ نام کیا ہے چھپانے سے کیا مل جائے گا۔

لوقس۔ مگر جناب . . . . . .

جج۔ اگر مگر کچھ نہیں۔ نام بتاؤ نام۔

لوقس۔ حضور میرا نام لوقس۔

جان۔ کیا تم نے مدعیہ کو شادی کا پیغام دیا؟

لوقس۔ تو اس بارے میں عرض ہے۔

جج۔ عرض ورض نہیں چاہئے۔ ہاں کہو یا نہیں۔

لوقس۔ ہاں جناب۔

جان۔ کب؟

لوقس۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں۔

جان۔ پھر انکار کیا۔

لوقس۔ ہاں۔

جان۔ کیوں؟

لوقس ۔ وہ بدمزاج نکلی ۔

جان ۔ کوئی گواہ ۔

لوقس ۔ کوئی نہیں ۔

جان ۔ مسز جولیا جان !

(جولیا آتی ہے)

جان ۔ عدالت کو بتاؤ ۔ لوقس نے منگنی کیوں توڑ ڈالی ۔

جولیا ۔ حضور کو شاید باور نہ آئے مگر مسٹر لوقس نے منگنی اس بنا پر توڑی کہ جین نے بلا شکر چائے کیوں پی ۔

جان ۔ بس ۔ جاؤ ۔

جولیا ۔ مگر میں اور کہنا چاہتی ہوں ۔

جان ۔ ضرورت نہیں ۔

جولیا ۔ مگر مجھے تو ضرورت ہے ۔

جان ۔ عدالت اتنا ہی سننا چاہتی ہے ۔

جولیا ۔ مگر میں تو اور سنانا چاہتی ہوں ۔

جان ۔ بک بک جھک جھک سے فائدہ ؟

جولیا ۔ اب معلوم ہوا کہ تمہیں آج تک کسی نے وکیل کیوں نہیں کیا ۔

جج ۔ بوڑھیا ہٹتی ہے کہ میں ہٹواؤں ۔

(جاتی ہے)

جان ۔ صفیہ !

صوفیہ ۔ حضور میرا نام صوفیہ ہے ۔

جان ۔ تمہارا نام ؟

صوفیہ ۔ عرض کر چکی ہوں ۔

جان ۔ پھر بتاؤ ۔

صوفیہ ۔ فائدہ ؟ جج صاحب بہت باتیں پسند نہیں کرتے ۔

جج ۔ اے عورت ! بتا اور جلد بتا کہ تیرا نام کیا ہے ۔

صوفیہ ۔ بندی کو صوفیہ کہتے ہیں۔

جج ۔ مگر دراصل تیرا نام کیا ہے؟

صوفیہ ۔ صوفیہ

جج ۔ تو نام ہوا صوفیہ المعروف صوفیہ (لکھتا ہے)

جان ۔ مدعا علیہ نے منگنی کیوں توڑی۔

صوفیہ ۔ اس لئے کہ مدعیہ بدمزاج ہے۔

جان ۔ دیکھنا حلف لیا ہے

صوفیہ ۔ اسی لئے تو سچ کہہ رہی ہوں۔

جج ۔ تمہیں یہ کس طرح معلوم ہوا؟

صوفیہ ۔ جان صاحب نے کہا کہ میں لوفس صاحب سے کہوں کہ مس صاحبہ بدمزاج ہیں تو انعام ملے گا ۔ بات بھی سچ تھی میں نے کہہ دیا۔

(عدالت میں سنسنی چھا جاتی ہے)

جان ۔ اسے نمک حرامی کہتے ہیں۔

جج ۔ خاموش رہو۔ مسٹر جان نے ایسا کیوں کیا؟

صوفیہ ۔ تاکہ مسٹر لوفس منگنی توڑ دے اور وہ ہرجانہ وصول کریں۔

جان ۔ بڑی مکارہ ہے۔

جج ۔ تمہیں کس طرح معلوم ہوا؟

صوفیہ ۔ حضور ان کانوں سے سنا۔

جج ۔ کمرے میں تھی تو؟

صوفیہ ۔ نہیں جناب باہر روزن سے کان لگائے کھڑی تھی۔

جان ۔ صفیہ تو نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔

صوفیہ ۔ حضور میرا نام صوفیہ ہے۔

لوفس ۔ اور جو کل صوفیہ لوفس ہو جائے گا۔

نور الٰہی
محمد عمر

جلوۂ سحر

خاموش فضا میں وقتِ سحر جذبات کا دریا جاری ہے
اک کیف کا طوفاں اُمڈا ہے اک وجد کا عالم طاری ہے

وہ چاک ہوا دامانِ سحر وہ ظلمتِ شب کافور ہوئی
عالم عالم پُرنور ہوا دنیا دنیا مسرور ہوئی

وہ کرنیں نور کی نکلی ہیں خورشید کے زریں ساغر سے
وہ بادۂ سرخ جھلکتا ہے پھولوں کے رنگیں ساغر سے

وہ بادِ صبا مستانہ چلی وہ پتلی شاخیں ہلنے لگیں
وہ پتے آگئے جنبش میں وہ نازک کلیاں کھلنے لگیں

خاموشیٔ شب تحلیل ہوئی چڑیوں کی ترنم ریزی میں
شبنم کی نظر افروزی میں پھولوں کی شمیم انگیزی میں

ہر شاخ میں رنگارنگی ہے ہر پھول میں بوقلمونی ہے
ہے ایک تناسب ہر شے میں ہر چیز میں اک موزونی ہے

ہے "جنتِ گوش" اک اک نغمہ ہر منظر ہے "فردوسِ نظر"
پہلو میں دل گھنٹوں رقصاں احساس کا ہو کچھ ذوق اگر

اس وقت عروسِ فطرت کی زیبائش دید کے قابل ہے
ہر غمزہ اُس کا ظالم ہے ہر عشوہ اُس کا قاتل ہے

ہر سُو ہے سعادت کی تابش ہر سمت ہے بارش رحمت کی
تنویرِ سحر ہے ایک ضیا رخسارِ عروسِ فطرت کی

موسم نہیں خوابِ غفلت کا موقع نہیں سہل انگاری کا
اُٹھ اے غافل بیدار ہو اب ہے وقت یہی بیداری کا

کافر ہے وہ دل اس وقت بھی گر جس دل میں خدا کی یاد نہیں
ملحد بھی اگر دیکھے یہ سماں سجدے میں جھکا دے اپنی جبیں

"پیغامِ عمل" پھر لائی سحر پھر دنیا اپنے "کام" میں ہے
سرگرم ہے کوئی طاعت میں اور کوئی شغلِ جام میں ہے

کچھ میری نہ پوچھو اے رندو اک گوشۂ باغ میں بیٹھا ہوں
"خمخانۂ فطرت" میں ہر دم "صہبائے مسرت" پیتا ہوں

ہر سُو ہیں شگفتہ لالہ و گل پُرکیف ہوائے گلشن ہے
اک ہاتھ میں جامِ صہبا ہے اک ہاتھ میں اُس کا دامن ہے

ولی الرحمن ولی

پھول

دوپہر کے بعد سے شام تک میں گلیوں میں گھومتا رہا۔ فضا میں سے برف کے بڑے بڑے گالے آہستہ آہستہ گرتے رہے ـــــ اور اب میں اپنے گھر میں ہوں۔ میرا لیمپ جل رہا ہے۔ میں نے سگار سلگا لیا ہے اور میری کتابیں میرے پاس پڑی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام چیزیں مجھے حاصل ہیں جو تسکینِ خاطر کا باعث ہو سکتی ہیں۔ مگر یہ سب بے کار ہیں۔ میرے دماغ میں تو صرف ایک ہی خیال سما سکتا ہے۔

لیکن کیا میرے لیے وہ مدتوں سے مر نہیں چکی تھی؟ ـــــ ہاں، مر چکی تھی، یا جیسا کہ میں فریب خوردگی کے طفلانہ جوش میں کہا کرتا تھا "مُردوں سے بدتر تھی"۔ اور اب جب کہ میں جانتا ہوں کہ وہ "مُردوں سے بدتر نہیں، بلکہ صرف مُردہ ہے" بہت سے دوسروں کی طرح خاک کے نیچے ہمیشہ کے لئے سوتی ہے ـــــ اس دنیا میں واپس آنے کی امید کے بغیر ـــــ بہار ہو یا تپتی دھوپ یا برف باری ہو رہی ہو، جیسی کہ آج ہو رہی ہے + اب میں نے جانا ہے کہ وہ میرے لئے اُس وقت سے ایک لمحہ بھی پیشتر نہ مری تھی جب وہ باقی دنیا کے لئے مری۔ غم؟ ـــــ نہیں یہ تو محض وہ عام خوف ہے جسے ہم اُس وقت محسوس کرتے ہیں جب کوئی ایسی ہستی جس کی جگہ ہمارے دل میں موجود ہوتی ہے اور جس کا وجود کلیتہً اور صراحتہً ہمارے خیال میں محفوظ ہوتا ہے قبر میں جا سوتی ہے۔

جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھے دھوکا دے رہی ہے تو مجھے سخت رنج ہوا۔ مگر اس رنج کے ساتھ بہت سی اور چیزیں بھی تھیں۔ غصہ اور فوری نفرت، زندگی سے وحشت اور ـــــ آہ ـــــ غیرت کی شکست ـــــ غم تو بعد میں آیا! لیکن اُس وقت یہ دلجمعی تو تھی کہ وہ بھی میری ہی طرح مضطرب ہوگی + وہ تمام اب تک میرے پاس ہیں اور میں جب چاہوں اُن کو پڑھ سکتا ہوں ـــــ اُن بیسیوں خطوں کو جن میں اُس نے نہایت عاجزی سے معافیاں مانگی ہیں! ـــــ اور میں اپنی چشمِ تصور سے اب بھی اُسے دیکھ سکتا ہوں ـــــ اُسی طرح اُسی سیاہ لباس میں گلی کے ایک کونے پر، جب میں شام کے وقت اپنے مکان سے باہر نکلا اور وہ مجھے حسرت زدہ نظروں سے تک رہی تھی ـــــ اور میرے خیال میں اُس آخری ملاقات کی یاد اب تک تازہ ہے جب اُس کی وہ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں میرے سامنے تھیں جو اُس کے گول بچوں کے سے چہرے میں ہیروں کی طرح جڑی تھیں ـــــ وہ چہرہ جس پر اب زردی چھا گئی تھی اور جو اب مرجھا گیا تھا ـــــ اور جب وہ جانے لگی ـــــ جب وہ آخری مرتبہ جانے لگی تو میں نے اُس کے لئے اپنا ہاتھ تک نہ بڑھایا ـــــ اور پھر اپنی کھڑکی

میں دیر تک اُسے گلی میں سے گزرتے ہوئے دیکھتا رہا، یہاں تک کہ وہ میری نظروں سے غائب ہوگئی ـــــ ہمیشہ کے لئے ـــــ اور اب وہ کبھی واپس نہ آسکے گی ......

مجھے اُس کی موت کا علم اتفاقاً ہی ہوا، ورنہ شاید ہفتوں اور مہینوں میں بے خبر رہتا۔ ایک دن صبح کے وقت مجھے اُس کا ماموں ملا، میں نے اُسے کم ازکم ایک سال کے بعد دیکھا ہوگا، کیونکہ وہ ویانا کبھی کبھی آتا ہے اس سے پہلے بھی میں اُس سے بس دو یا تین مرتبہ ملا ہوں گا۔ ہماری پہلی ملاقات آج سے تین سال قبل ہوئی تھی اس موقع پر وہ بھی موجود تھی اور اُس کی ماں بھی۔ اور پھر آئی گرمیوں میں میں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ ایک ہوٹل میں بیٹھا تھا اور ہمارے ساتھ کی میز پر اُس کا ماموں چند اور آدمیوں کے ساتھ موجود تھا۔ وہ سب خوش بہ خوش تھے اور اُس نے میرا جامِ صحت پیا۔ جانے سے پہلے وہ میرے پاس آیا اور رازداری کے لہجہ میں کہنے لگا کہ میری بھانجی کو تم سے بڑی محبت ہے! ـــــ اور اپنی نیم مخموری کی حالت میں مجھے یہ بات بڑی مضحکہ خیز اور عجیب معلوم ہوئی کہ آخر اس قسم کی گفتگو کا یہ کونسا محل تھا اور پھر مجھ سے بہتر اس حقیقت کو اور کون جانتا تھا جس کی آنکھیں اُس کی محبت کے آخری جام سے ابھی سرشار تھیں۔ اور اب، آج صبح! میں اُس کے پاس سے گزر ہی چلا تھا کہ میں نے ازراہِ دلچسپی نہیں بلکہ ازراہِ اخلاق اُس کی بھانجی کے متعلق دریافت کیا۔ اب میں اُس کے متعلق کچھ نہ جانتا تھا۔ مدت ہوئی اُس سے نامہ و پیام کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ صرف پھول وہ مجھے بھیجتی تھی۔ ہمارے مسرور ترین دنوں کی یادگار! مہینے میں ایک مرتبہ وہ آتے تھے، اُن کے ساتھ کوئی پیغام نہ ہوتا تھا، محض خاموش، نیاز آگیں پھول ـــــ جب میں نے اُس سے سوال کیا تو وہ حیران رہ گیا! "تمہیں معلوم نہیں وہ بیچاری تو ایک ہفتہ ہوا مر گئی" مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ پھر اُس نے مجھے اور باتیں بتائیں۔ "وہ مدت سے بیمار تھی مگر بستر پر وہ بمشکل ایک ہفتہ رہی ہوگی" اور اُس کا مرض ہُوا "سودا ـــــ خفقان ـــــ مالیخولیا ـــــ لیکن ڈاکٹر بھی اُس کی صحیح تشخیص نہ کر سکے!"

وہ چلا گیا مگر میں دیر تک وہیں سکتہ کے عالم میں کھڑا رہا۔ میں اتنا ناتوان ہو گیا تھا جیسے کسی جان جوکھوں میں سے گزرا ہوں ـــــ اور اب مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج میری زندگی کا ایک دور ختم ہو گیا ہے۔ کیوں ـــ کیوں؟ محض ایک خارجی بات تھی۔ میرے دل میں اُس کے لئے اب کوئی جذبہ نہ تھا۔ درحقیقت مجھے اب شاذونادر ہی اُس کا خیال آتا تھا۔ مگر اب بھی جب کہ میں یہ سب کچھ لکھ چکا ہوں، اپنی حالت کو بہتر پاتا ہوں۔ میرا دل مطمئن ہے اور مجھے اپنے گھر کا چین اور آرام محسوس ہو رہا ہے ـــــ حقیقت میں اب اس کے خیال کو دل میں جگہ دینا نادانی ہے اور دکھ خریدنا ہے ـــــ یقیناً دنیا میں ہزاروں ایسے ہیں جو مجھ سے زیادہ دکھی ہیں۔

میں سیر کر کے آیا ہوں۔ آج موسم سرما کا ایک شاندار دن ہے۔ آسمان زیادہ نیلا، زیادہ سرد اور زیادہ دور معلوم ہو رہا ہے ـــ اور میں اپنے آپ میں سکون پاتا ہوں۔ اُس کے بوڑھے ماموں سے میں ابھی کل ملا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس واقعے کو ہفتوں گزر گئے ہیں۔ اور جب میں اُس کا خیال کرتا ہوں تو وہ مجھے بالکل صاف نظر آتی ہے۔ صرف ایک چیز کم ہوتی ہے: وہ غصّہ جو ہمیشہ اُس کے خیالات کے ساتھ شامل ہوا کرتا تھا۔ اس بات کا مجھ پر کوئی اثر نہیں کہ وہ اب تنہا قبر میں سو رہی ہے اور صفحۂ ہستی پر موجود نہیں ـــ مجھے اس کا کوئی غم نہیں۔ دنیا آج مجھے زیادہ پُرسکون معلوم ہوئی ہے۔ ایک دفعہ صرف ایک لمحہ کے لئے مجھے یہ محسوس ہوا کہ نہ تو راحت ہی کا کوئی وجود ہے اور نہ رنج کا، رنج و راحت ہماری تصویر حیات کے دو رخ ہیں، ہم ہنستے ہیں اور ہم روتے ہیں، اور ہماری روح اُن کیفیات کو محسوسات کی شکل میں تبدیل کر دیتی ہے۔ میں اب اطمینان سے بیٹھ کر دقیق علمی کتابیں پڑھنے کے قابل ہوں اور اُن کے عمیق نکات سمجھ لینے کی مجھ میں تاب پیدا ہو گئی ہے۔ میں اُن قدیم تصاویر کے سامنے کھڑا ہو کر اُن کے حقیقی حسن کو دیکھ سکتا ہوں جن کے آج سے پہلے میری نگاہ میں کوئی معنی ہی نہ تھے ـــ اور جب میں بعض اُن دوستوں کا خیال کرتا ہوں جو مر چکے ہیں تو میرا دل اتنا غمگین نہیں ہوتا جتنا وہ کبھی ہوا کرتا تھا ـــ موت سے میں کچھ مانوس سا ہو چکا ہوں، موت ہم پر مسلّط ہے لیکن وہ ہمیں کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتی۔

برف، بلند سفید برف ہر چیز پر محیط تھی۔ گرٹیل آئی اور اُس نے کہا آؤ ذرا برف کی سیر کریں۔ ہم ایک ثلج گاڑی میں بیٹھ کر شہر سے باہر نکل گئے۔ گاڑی پھسلوان سڑک پر گھنٹیاں بجاتی ہوئی اڑی چلی گئی۔ آسمان ایک نیلگوں زمرد کی طرح بن رہا تھا۔ گرٹیل میرے کندھے سے سہارا لگائے طویل سڑک کو اپنی مسرور آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ ہم ایک سرائے میں آ گئے جسے ہم گرمی کے زمانے سے جانتے تھے۔ انگیٹھی دہک رہی تھی اور اس قدر گرم تھی کہ ہمیں اپنی میز وہاں سے سرکانی پڑی۔ کیونکہ گرٹیل کا ایک رخسار اور کان آگ کی مانند سرخ ہو رہے تھے۔ مجھے اُس کے دوسرے زرد رخسار پر رہ رہ کر پیار آ رہا تھا۔ اِس کے بعد شام کے قریب جب شفق پھُولی ہوئی تھی ہم واپس گھر آ گئے۔ گرٹیل میرے قریب بیٹھی تھی اور میرے دونوں ہاتھ اُس کے ہاتھوں میں تھے ـــ پھر اُس نے کہا "آخر میں نے پھر تمہیں پا لیا ہے"۔ اُس نے یوں بلا تکلف وہ شیریں نغمہ چھیڑ دیا تھا جو حقیقت میں میری مسرت کا تنہا کفیل تھا۔ لیکن شاید یہ سرد و صاف ہوا کا اثر بھی ہے کہ میرے خیالات ہر قید سے آزاد ہو رہے ہیں، کیونکہ میں گزشتہ چند دنوں کی بہ نسبت زیادہ اطمینان محسوس کر رہا ہوں۔

تھوڑی دیر گزری جب میں اپنے بستر پر اونگھ رہا تھا مجھے پھر ایک عجیب خیال آیا۔ مجھے اپنا دل سخت اور سرد محسوس ہونے لگا۔ اس طرح جیسے کوئی اپنے کسی محبوب کی قبر پر کھڑا ہو اور اُس کی آنکھیں خشک ہوں اور سینہ جذبات سے خالی، اس طرح جیسے کوئی اتنا بے حس ہو گیا ہو کہ وہ موت کے خوف سے بیگانہ ہو گیا ہو ــــ بیگانہ، ہاں بیگانہ۔

رفت و گزشت ہو چکی! زندگی، مسرت اور تھوڑی سی محبت نے اُس ساری حماقت کو محو کر دیا۔ اب میں پھر لوگوں سے آزادانہ ملتا ہوں۔ میں اُن سے مانوس ہو چلا ہوں۔ وہ بے ضرر ہیں۔ وہ ہر قسم کے خوش آئند موضوعات پر گفتگوئیں کرتے ہیں اور گرٹیل کیسی پیاری اور اچھی لڑکی ہے۔ جب وہ میری کھڑکی میں کھڑی ہوتی ہے اور سورج کی کرنیں اس کے سنہری بالوں پر چمکتی ہیں تو وہ کتنی خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔

آج ایک عجیب واقعہ پیش آیا ــــ آج وہ دن ہے جب وہ ہمیشہ پھول بھیجا کرتی تھی۔ اور پھول پھر آ گئے جیسے ــــ جیسے کوئی تبدیلی ہی واقع نہیں ہوئی۔ وہ پہلی ہی ڈاک میں آئے اور ایک لمبے، تنگ اور سفید ڈبے میں بند تھے۔ ابھی صبح ہوئی ہی تھی اور ابھی میری آنکھیں خواب آلود تھیں۔ مجھے ایک دھکا سا لگا۔ میرے سامنے ایک سنہرے دھاگے سے نفاست کے ساتھ بندھے ہوئے کاسنی اور گلابی پھول تھے ــــ اس طرح جیسے وہ کسی تابوت میں پڑے ہوں اور جب میں نے اُنہیں ہاتھ میں لیا تو میرا دل کانپ گیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ آج پھر کیسے آ گئے۔ جب وہ بیمار ہوئی ہو گی یا شاید جب اُس نے موت کو قریب پایا ہو گا تو اُس نے حسبِ معمول گلفروش سے پھول بھیجنے کو کہہ دیا ہو گا تاکہ میں اُس کی توجہات کو کھو نہ بیٹھوں۔ یقیناً اس کی یہی توضیح ہو سکتی ہے، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن دل اس سے متاثر ضرور ہوتا ہے ــــ وہ ابھی میرے ہاتھ میں تھے، وہ پھول اور انہوں نے سرسرانا اور کانپنا شروع کیا، اُس وقت باوجود عقل و فراست اور قوتِ ارادہ کے مجھے اُن سے ڈر آنے لگا۔ مجھے یوں معلوم ہونے لگا جیسے یہ اُسی کے پاس سے آئے ہیں، جیسے یہ اُس کا تحفہ ہیں ــــ جیسے وہ ہمیشہ ــــ اس حال میں بھی کہ وہ مر چکی ہے مجھ پر اپنی محبت جتانا چاہتی ہے ــ اپنی سست عناصر وفا+ آہ، ہم موت کو نہیں سمجھتے، ہم اُسے کبھی نہ سمجھ سکیں گے۔ حقیقت میں کوئی شخص اُس وقت مرتا ہے جب وہ سب جو اُسے جانتے ہیں دنیا سے چل بستے ہیں۔ معمول کے خلاف ان پھولوں پر میری گرفت کا انداز آج مختلف تھا۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میری ذرا سی بے احتیاطی بھی انہیں زخمی کر دے گی ــ جیسے ابھی اُن کی روحیں ہلکی ہلکی سسکیاں بھرنے لگیں گی۔ اور اب جب کہ وہ میرے سامنے میری میز پر ایک ہلکے سبز رنگ کے تنگ سے گلدان میں پڑے ہیں وہ مجھے ماتم انگیز نشکر ہیں

اپنے سرہلاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بے حاصل آرزو کا ایک بادل سا اُٹھتا ہے اور مجھ پر چھا جاتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں اگر اُن چیزوں کے علاوہ جو بولتی ہیں ہم تمام زندہ چیزوں کی زبان جانتے تو وہ مجھ سے ضرور کچھ کہتے۔

میں اب احمق نہ بنوں گا۔ وہ محض پھول ہیں۔ وہ عہدِ ماضی کا ایک پیغام ہیں۔ قبر سے بلاوا یقیناً نہیں۔ وہ وہ بس پھول ہیں۔ کسی گل فروش نے اُن کو ایک جگہ باندھا، روئی کا ایک ٹکڑا اُن کے اردگرد لپیٹا، پھر ایک سفید ڈبے میں رکھ کر ڈاک کے حوالے کر دیا ـــ اور اب کہ وہ یہاں رکھے ہیں، کیوں مجھے اُن کا خیال نہیں چھوڑتا۔

میں گھنٹوں کھلی ہوا میں گزار دیتا ہوں اور طویل اور تنہا سیریں کرتا ہوں۔ جب میں لوگوں کے درمیان ہوتا ہوں تو میری طبیعت اُن سے نہیں ملتی۔ اور میں اس کو اُس وقت محسوس کرتا ہوں جب وہ حسین وجمیل لڑکی میرے کمرے میں بیٹھ کر طرح طرح کی باتیں کرتی ہے اور مجھے خبر بھی نہیں ہوتی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ جب وہ جا چکتی ہے تو ایک لمحہ بھی نہیں گزرتا کہ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ مجھ سے میلوں دُور ہے، جیسے لوگوں کا سیلاب اُسے بہا کر لے گیا ہے اور اُس کا کوئی نشان پیچھے نہیں چھوڑ گیا۔ اب اگر وہ لوٹ کر نہ آئے تو شاید مجھے بالکل تعجب نہ ہو۔

پھول لمبے سبز گلدان میں ہیں۔ اُن کی ڈنڈیاں پانی میں ہیں اور اُن کی خوشبو کمرے میں پھیل رہی ہے۔ خوشبو ابھی تک اُن میں موجود ہے ـــ باوجودیکہ انہیں میرے پاس ایک ہفتہ ہو گیا ہے اور وہ مرجھا رہے ہیں۔ اور میں اُن تمام فضولیات پر یقین رکھتا ہوں جن پر کبھی ہنسا کرتا تھا: مجھے یقین ہے کہ میں بادلوں اور بہاروں سے نامہ وپیام کر سکتا ہوں، اور میں منتظر ہوں کہ پھول ابھی بولنے لگیں گے۔ لیکن نہیں مجھے تو یقین ہے کہ وہ ہر وقت بولتے ہیں، اب بھی وہ بول رہے ہیں۔ وہ ہر لحظہ بولتے ہیں اور میں اُن کی زبان کو بڑی حد تک سمجھ لیتا ہوں۔

میں خوش ہوں کہ موسم سرما ختم ہو چکا ہے! ہوا میں مجھے بہار کی، سانس چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مجھ میں پہلے کی بہ نسبت کچھ زیادہ تبدیلی پیدا نہیں ہوئی، پھر بھی میں دیکھتا ہوں کہ میرے وجود کی حدیں وسیع ہو رہی ہیں۔ کل کا گزرا ہوا دن مدتِ مدید معلوم ہوتا ہے اور پچھلے چند دنوں کے واقعات بھولے بسرے خواب نظر آتے ہیں۔ جب گرٹیل

مجھ سے رخصت ہوتی ہے تو اب بھی مجھ پر وہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، خصوصاً جب اُسے ملے کچھ روز گزر جاتے ہیں تو ہماری محبت ایک پارینہ داستان معلوم ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ دور، بڑی دور سے آتی ہے! ـــــ لیکن جب وہ باتیں شروع کرتی ہے تو پرانے زمانے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور اُس وقت مجھے موجودہ زمانے کا صاف صاف احساس ہوتا ہے۔ پھر اُس کی آواز بلند ہوتی جاتی ہے اور اشیا کے رنگ تیز و تلخ نظر آنے لگتے ہیں۔ مگر جب وہ چلی جاتی ہے تو اُس کے ساتھ ہر چیز رخصت ہو جاتی ہے۔ میرے تصور میں کوئی تصویر کوئی یاد باقی نہیں رہتی۔ اور پھر میں ہوتا ہوتا ہوں اور یہ پھول۔ یہ اب مرجھا گئے ہیں، بالکل مرجھا گئے ہیں۔ اب ان میں قطعاً خوشبو نہیں رہی۔ گریٹل نے ان کو اب تک نہیں دیکھا تھا لیکن آج جب اُس کی نظر ان پر پڑی تو ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ ان کے بارے میں مجھ سے کچھ دریافت کرنا چاہتی ہے لیکن یکایک کسی پُراسرار خوف نے اُس پر غلبہ پا لیا! ـــ اُس کی زبان پر مہر سکوت لگ گئی اور وہ اسی وقت مجھ سے رخصت ہو گئی۔

پنکھڑیاں آہستہ آہستہ گر رہی ہیں۔ میں نے کبھی ان کو ہاتھ نہیں لگایا! اگر میں لگاتا تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتیں۔ اُن کو مرجھائے ہوئے دیکھ کر میرا غم بڑھتا ہے۔ میں نہیں جانتا کیوں اس نادانی کا خاتمہ کرنے کی جرأت مجھ میں نہیں ہے۔ مرجھائے ہوئے پھولوں نے مجھے بیمار کر دیا ہے۔ میں اُن کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا اور میں باہر نکل جاتا ہوں۔ گلی میں پہنچ کر اُن کی حفاظت کی خلش مجھے بے قرار کر دیتی ہے اور میں لوٹ آتا ہوں۔ اور اُن کو اسی لمبے سے سبز گلدان میں پژمردہ اور غمگین پاتا ہوں۔ کل شام میں اُن کے سامنے روتا رہا جیسے کوئی کسی قبر پر روتا ہے۔ تاہم ایک مرتبہ بھی میرا خیال اُن کے بھیجنے والے کی طرف منتقل نہیں ہوا۔ شاید میں غلطی پر ہوں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گریٹل بھی محسوس کرتی ہے کہ میرے کمرے میں کوئی اجنبی چیز موجود ہے۔ وہ اب ہنستی نہیں۔ وہ اب بلند آواز سے نہیں بولتی ـــ اُس صاف، حیات انگیز آواز سے جسے میں نے اکثر سنا ہے۔ اور اب میں اُس طرح اس کا استقبال نہیں کرتا جس طرح پہلے کیا کرتا تھا۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ مجھ سے کوئی سوال نہ کر بیٹھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سوالات میرے لئے کتنے درد و کرب کا موجب ہونگے۔

وہ اکثر اپنا سینا پرونا یہیں لے آتی ہے۔ اور اگر میں ابھی کتابوں میں منہمک ہوتا ہوں تو وہ بھی میز پر آ کر بیٹھ جاتی ہے اور اپنے کام میں لگی رہتی ہے؛ اور بڑے صبر سے انتظار کرتی ہے، یہاں تک کہ میں اپنا کام ختم کر کے کتابیں

ایک طرف رکھ کے اُس کے پاس آتا ہوں اور سوئی دھاگا اُس کے ہاتھ سے لے لیتا ہوں۔ پھر میں سبز سائے کو لیمپ پر سے اتار لیتا ہوں اور کمرے میں سفید روشنی کا ایک سیلاب آجاتا ہے۔ مجھے تاریک کونے اچھے نہیں لگتے۔

بہار! میری کھڑکی چوپٹ کھلی ہے۔ گزشتہ شام جب رات کا سایہ بڑھ رہا تھا گرٹیل اور میں باہر گلی کی طرف جھانک رہے تھے۔ ہوا نرم اور خوشگوار تھی۔ اور جب گلی کے کونے پر میری نظر پڑی، جہاں لمپ اپنی ہلکی سی روشنی پھیلا رہا تھا تو یکایک مجھے ایک سایہ نظر آیا۔ میں نے اُسے دیکھا اور اپنی آنکھیں بند کرلیں، لیکن میری نظریں پلکوں میں سے گزر گزر کر اُس پر پڑنے لگیں۔ لمپ کی زرد روشنی میں وہ بیچارگی کی حالت میں کھڑی تھی، اور میں نے اُس کے چہرے کو صاف طور پر دیکھا، جیسے یہ زرد روشنی سورج کی روشنی تھی۔ اور مجھے اُس کے زرد اترے ہوئے چہرے میں اُس کی بیمار آنکھیں بھی نظر آگئیں۔ میں کھڑکی سے ہٹ آیا اور اپنی میز کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ شمع ہوا میں جھلملانے لگی۔ اور میں بے حرکت بیٹھا رہا کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ بیچاری وہیں کونے میں منتظر کھڑی ہے اور اگر میں نے مرجھائے ہوئے پھولوں کو ہاتھ لگانے کی جرات کی تو بے اختیار میں انہیں گلدان میں سے نکال کر اُس کے پاس لے جاؤں گا۔ یہی میں نے سوچا اور سچے دل سے سوچا، تاہم میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ سب نادانی ہے۔ اب گرٹیل بھی کھڑکی سے ہٹ کر میری کرسی کے پیچھے آکھڑی ہوئی، جہاں وہ ایک لمحہ کے لئے ٹھہری، میرے بالوں کو اُس نے اپنے ہونٹوں سے چھوا اور پھر چلی گئی۔ میں تنہا رہ گیا۔

میں پھولوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اب مٹے جا رہے ہیں۔ صرف سوکھی ہوئی بے برگ شاخیں باقی ہیں۔ وہ مجھے بیمار اور دیوانہ کئے دیتی ہیں۔ اور یہ ایک ظاہر بات ہوگی ورنہ گرٹیل مجھ سے ضرور پوچھتی، لیکن وہ بھی اسے محسوس کرتی ہے۔ اب وہ بھاگ گئی ہے، یوں جیسے میرے کمرے میں روحوں کا بسیرا ہے۔

روحیں! ہاں، ہاں روحیں! مردہ چیزیں، زندوں سے کھیلتی ہوئیں! اور اگر مرجھائے ہوئے پھولوں کی خوشبو ہمیں آتی ہے تو یہ اُن گزرے ہوئے دنوں کی یاد دلاتی ہے جب وہ تازہ اور شگفتہ تھے۔ اور جو مر چکے ہیں وہ ہمارے پاس اُس وقت تک آتے رہتے ہیں جب تک ہم اُنہیں بھول نہیں جاتے۔ کیا ہوا اگر اب وہ بول نہیں سکتے ــــ میں اُن کی آواز سن سکتا ہوں! وہ اب نظر نہیں آتی لیکن میں اُسے دیکھ سکتا ہوں! میرے کمرے کے باہر کی بہار، اور وہ

دھوپ جو میرے کمبل پر پڑ رہی ہے، اور پھولوں کی وہ خوشبو جو باغیچہ سے آ رہی ہے، اور وہ لوگ جو میرے مکان کے نیچے سے گزر رہے ہیں اور مجھے جن سے کوئی دلچسپی نہیں، گیا یہی حیات ہیں؟ اگر میں پردے کھینچ ڈالوں تو آفتاب بے نور ہوجائے۔ اگر ان لوگوں کا خیال میں دل سے نکال دوں تو میرے لئے وہ مردہ ہیں۔ اگر میں کھڑکی کو بند کردوں تو پھولوں کی خوشبو منقطع ہوجائے اور بہار مردہ۔ میں سورج سے، لوگوں سے، بہار سے زیادہ طاقتور ہوں لیکن گزرے ہوئے دنوں کی یاد مجھ سے بھی زیادہ طاقتور ہے کیونکہ وہ جب چاہتی ہے آتی ہے اور اُس سے کوئی مفر نہیں۔ اور یہ خشک تیلیاں زیادہ طاقتور ہیں پھولوں کی اس مہک سے اور بہار سے۔

میں ان صفحات پر دماغ سوزی کر رہا تھا جب گرٹیل داخل ہوئی۔ وہ اتنی سویرے کبھی نہ آئی تھی۔ میں حیران و ششدر رہ گیا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ دہلیز پر رُکی اور میں اُسے خاموش دیکھتا رہا۔ پھر وہ مسکرائی اور میرے پاس آگئی۔ اُس کے ہاتھوں میں تازہ پھولوں کا ایک گلدستہ تھا وہ کچھ نہ بولی اور اُس نے گلدستہ کو میز پر رکھ دیا۔ دوسرے لمحے میں اُس نے خشک تیلیوں کو گلدان سے نکالا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میرا دل نکال لیا ہے؛ —— لیکن میں کوئی آواز نہ نکال سکا۔ اور جب میں نے اُٹھ کر اُس کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو اُس نے مسکرا دیا۔ پھولوں والے ہاتھ کو سر سے اونچا کئے ہوئے وہ کھڑکی کی طرف لپکی اور اُس نے اُن کو نیچے گلی میں گرا دیا۔ مجھ کو یوں محسوس ہوا جیسے میں بھی اپنے آپ کو اُن کے پیچھے گرا دینا چاہتا ہوں، لیکن اب گرٹیل پلٹ کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اور اُس کے سر پر دھوپ، روشن دھوپ پڑ رہی تھی اور بہار کے پھولوں کی خوشبو کھڑکی سے اندر آ رہی تھی۔ اور میں نے خالی سبز گلدان پر ایک نگاہ ڈالی؛ —— مجھے یقین تو نہیں تاہم میرا خیال ہے کہ میں نے اپنے آپ کو اُس وقت آزاد محسوس کیا، ہاں، آزاد۔ پھر گرٹیل میرے پاس آئی اُس نے اپنا گلدستہ اُٹھایا اور تر و تازہ سفید پھولوں کو میرے منہ کے قریب کر دیا۔ آہ، کتنی روح پرور اور جاں بخش خوشبو تھی، نرمی اور خنکی سے لبریز؛ میں نے چاہا کہ میں اپنے چہرے کو اُن میں دفن کردوں۔ ہنستے ہوئے سفید خوبصورت پھول! —— اور میں نے محسوس کیا کہ آسیب رخصت ہو چکا ہے۔ گرٹیل میرے پیچھے کھڑی تھی اور اپنی انگلیوں کو میرے بالوں میں سے گزار رہی تھی۔ "نادان لڑکے" اُس نے کہا۔ کیا وہ جانتی تھی کہ اُس نے کیا کر دیا تھا۔ میں نے اُس کے ہاتھوں کو پکڑ کر چوم لیا۔

شام کے وقت ہم باہر گئے —— وسعت میں، بہار میں۔ ہم ابھی ابھی واپس آئے ہیں۔ میں نے بتی روشن کرلی ہے۔ ہم نے بڑی لمبی سیر کی ہے اور گرٹیل اتنی تھک گئی ہے کہ کرسی ہی میں اُس کی آنکھ لگ گئی ہے۔ آہ وہ کتنی خوبصورت معلوم ہوتی ہے جب یوں نیند میں مسکراتی ہے

میرے سامنے تنگ سبز گلدان میں تازہ سفید پھول ہیں۔ نیچے گلی میں —— نہیں، وہ اب وہاں نہیں ہیں۔ ہوا اُن کو دوسرے

آجانا

تنِ تنہا ہوں میں اے میرے تنہا دوست آجانا
محبت کی سُریلی راگنی مجھ کو سنا جانا

جدائی میں تری پردہ پڑا ہے دل پہ ظلمت کا
ذرا آنا مری جاں اور یہ پردہ اُٹھا جانا

ہُوئی مدت کہ راہِ راست سے بھٹکا ہوا ہوں میں
صداقت کی مجھے دنیا میں سیدھی رہ دکھا جانا

وفا کی پیار کی ایثار کی تصویر بن بن کر
قیامت ہے کسی کا دل میں آنا اور سما جانا

محبت کیا ہے اک شعلہ سا سینے میں بھڑک اُٹھنا
وفا کیا ہے مگر اک خود بخود دل کا کھچا جانا

محبت کو مرے دل نے خدا کی جلوہ گہ پایا
محبت کے سوا ہر شے کو میں نے ماسوا جانا

محبت میں کسی کی میں نے جس دن سے خودی چھوڑی
حقیقت کو تری اُس دن سے میں نے اے خدا جانا

نسیم اُلفت کا خادم ہے مگر اُلفت کی کلفت میں
ذرا کمزور سا ہے حوصلہ اُس کا بڑھا جانا

نسیم

پیتل کا سرطان

موسمِ گرما کی ایک شام کو سندھ کے بالائی حصہ میں "آتشِ شادمانی" کے سامنے چار آدمی اپنے خیمہ کے باہر بیٹھے کرسمس کی تعطیل نہایت مسرورانہ گذار رہے تھے۔ اُن میں تین انگریز اور ایک ہندوستانی میر قادر خان تھے۔ یہ سب حکومتِ ہند کے ملازم تھے اور آپس میں غدر کے زمانہ کی اُن مقتول انگریز خواتین اور انگلوانڈین کرنلوں کے مروجہ قصے بیان کر رہے تھے جن کی روحیں اُس میدان میں جہاں وہ قتل کئے گئے تھے، پھر بھوتوں کی شکل میں رونما ہونے لگی تھیں۔ یہ عجیب و غریب بھوت پیپل کے درختوں پر رہا کرتے تھے اور مسافروں کو ستایا کرتے تھے، غرضکہ سب اسی قسم کے بہت سے قصے بیان کرتے رہے۔ آخر کار بروڈرک نے کہا "میں آپ لوگوں سے ایک سچا قصہ بیان کرنا چاہتا ہوں مگر میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ اس پر یقین نہیں کریں گے" تینوں ساتھیوں نے نہایت شوق سے پورا قصہ سننے کے لئے آمادگی ظاہر کی اور بروڈرک نے نہایت اطمینان سے آرام کرسی پر لیٹ کر بیان کرنا شروع کیا۔

چند سال گذرے جب میں گجرات کے ایک ضلع کا حاکم تھا۔ میرے پاس پیتل کا بنا ہوا ایک بڑا سا سرطان تھا جو میں نے بمبئی سے خریدا تھا اور جو ٹوکیو کا بنا ہوا تھا۔ یہ سرطان جاپانی صناعی کا ایک مکمل نمونہ تھا اور اصلی سرطان سے بہت بڑا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ اُس بڑے سرطان کا نمونہ تھا جو صرف جاپانی مجمع الجزائر کے شمالی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ اُس کی آنکھیں بالکل بے عیب تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ ایک جاندار سرطان ہے اور پہلی نظر میں وہ نہایت خوفناک معلوم ہوتی تھیں پیتل کے کام کی صفائی دیکھ کر غیر ممکن تھا کہ یہ خیال پیدا نہ ہو کہ اُس کی آنکھیں یا ٹانگیں حرکت کر رہی ہیں۔ یہ میں نہایت آزادانہ کہتا ہوں کہ میں اور میرے مرہٹہ ملازمین اکثر اوقات اُس سے ڈر جاتے تھے۔ میں نے اُس کو اپنی لکھنے کی میز پر رکھ دیا تھا۔ اور میں اُس سے پیپر ویٹ کا کام لیا کرتا تھا۔ اپنے ہندوستانی مہمانوں سے میں اکثر اُس کے متعلق گفتگو کرتا۔ جب پہلے پہل میں اس سرطان کو بمبئی سے گجرات لایا تو چپراسی اُس سے خوف زدہ ہوئے لیکن پھر بہت زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ گجرات میں جو احباب مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے اس سرطان کو دیکھ کر بہت تعریف کرتے تھے۔ میرے ملنے والوں میں سے ناسک کے ایک برہمن بھی تھے۔ اُن کو اس پیتل کے سرطان سے غیر معمولی دلچسپی ہو گئی تھی وہ عموماً کسی معمولی سے کام کا بہانہ کر کے میرے پاس آجایا کرتے تھے لیکن اُن کا اصلی مقصد صرف سرطان کو

دیکھنا اور اُس کو چھونا ہی ہوا کرتا تھا - آخر میں اُن کی آمد سے تنگ آگیا اور میں نے کنایۃً یہ ظاہر کردیا کہ میں بہت زیادہ مصروف ہوں اور آپ کے آنے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے - انہوں نے اس کو محسوس کر کے میرے پاس آنا ترک کر دیا - اس واقعے کے دو دن بعد میرا لباس پہنانے والا خادم نہایت اضطراب کی حالت میں میرے پاس آیا - پہلے تو وہ خاموش کھڑا رہا لیکن چند منٹ کے بعد اُس نے کہا " آج صبح میری روپوں کی تھیلی کھو گئی تھی - تلاش کرنے پر خیمہ کی کرمچی دیوار کے نیچے پڑی ہوئی ملی - اُس کے قریب ہی سرطان بھی پڑا ہوا تھا - اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہی اس تھیلی کو چرا کر لایا ہے اور اس کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے پہلے تو میں اُس کی باتوں پر ہنسا اور اُس سے کہا بیوقوف نہ بنو ۔ مگر جب میں نے اُس کے الفاظ پر غور کیا تو دو باتیں میرے ذہن میں آئیں - اول تو جب سے میں اس سرطان کا مالک ہوا تھا میرا خادم ہمیشہ میرے ساتھ ہی رہتا تھا اور اس سے بالکل نہیں ڈرتا تھا دوسری بات یہ تھی کہ آخر سرطان کا خیمہ کی دیوار کے نیچے کیا کام تھا - وہ ہمیشہ میری لکھنے کی میز پر رکھا رہتا تھا میں نے سمجھا تو یہی سمجھا کہ شاید ناسک کا برہمن اُس کو چرانا چاہتا ہے - اس لئے ابھی تو اُس نے اُسے کسی مناسب جگہ پر چھپا دیا ہے اور موقع پا کر اٹھا لے جائے گا - میں اپنے خیمہ کی دیوار کے پاس گیا اور سرطان کو وہاں پڑا پایا - میں نے اس کو پھر اٹھا کر لکھنے کی میز پر رکھ دیا - اُس کی آنکھوں پر غور کرنے سے مجھے اُن میں پہلے سے زیادہ چمک معلوم ہونے لگی مگر میں نے اس پیتل کے کھلونے پر غور و فکر کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا بلکہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا - اُسی روز شام کو میں اپنی خواب گاہ سے دفتر والے خیمہ میں آیا تو میں نے سرطان کو میز پر رینگتے ہوئے دیکھا - جب میں اُس کے قریب پہنچا تو وہ ٹھہر گیا - یہ دیکھ کر مجھے خادم کی بات پر یقین ہو گیا - دوسرے روز علی الصباح جب میں سو کر اُٹھا تو میری جیب میں بٹوا موجود نہ تھا - بہت دیر کی جستجو کے بعد وہ مجھے دری کے نیچے ایک سوراخ میں چھپا ہوا ملا - یہ سوراخ سرطان ہی کا بنایا ہوا معلوم ہوتا تھا اور مٹی سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا کہ یہ سرطان کی پچھلی ٹانگوں سے باہر پھینکی گئی ہے - علاوہ ازیں سرطان کے پنجوں کے نشانات بھی صاف نظر آرہے تھے - اس نظارہ کو دیکھ کر میرے ملازمین حواس باختہ ہو گئے - اگر سچ پوچھئے تو میں بھی شک میں پڑا ہوا تھا - میں نے خوردبین سے سرطان کو دیکھنا شروع کیا - اُس کی آنکھیں ہی خوفناک نہ تھیں ، بلکہ اس کی ٹانگوں میں بھی ریت کے ذرے نظر آرہے تھے - اُس رات کو میں دفعۃً چونک کر اُٹھ بیٹھا اور میں نے سرطان کو بالکل اسی طرح اپنے خیمہ کے پاس کسی چیز کی جستجو کرتے ہوئے دیکھا جیسا کہ اس وقت آپ تینوں کو دیکھ رہا ہوں - اس نظارہ کو دیکھ کر مجھ پر ایسا خوف طاری ہوا کہ مجھ میں بستر سے اُٹھنے کی ہمت بھی نہ رہی اس کے بعد میری آنکھ ایک لمحہ کے لئے بھی نہ جھپکی -

"خوش قسمتی سے کلکٹر ہیری سن جو چند سال گزرے انتقال کر چکے ہیں، میرے قریب ہی خیمہ زن تھے۔ انہوں نے صبح کے کھانے پر مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ ایک قابل قدر عالم اور ایک رحمدل انسان تھے۔ میں نے اُن سے تمام واقعہ بیان کر دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ جب دن اچھی طرح نکل آیا تو میں لکھنے کی میز پر گیا۔ سرطان اپنی جگہ پر موجود تھا اُس کی آنکھوں میں اب وہ خوفناک قوت باقی نہ رہی تھی، بلکہ اب اُن پر ایک غم چھا رہا تھا۔

"وقت مقررہ پر ہیری سن کھانا کھانے کے لئے میرے خیمہ میں آ گئے پہلے تو ہم اپنے دفتر کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ اس کے بعد میں نے سرطان کا قصّہ چھیڑا۔ اول اول تو وہ اس کو محض مذاق سمجھتے رہے لیکن کچھ دیر کے بعد ہمہ تن شوق بن کر اُس کو دیکھنے کی غرض سے میرے ساتھ دفتر والے خیمہ میں چلے آئے۔ یہاں آ کر ہم نے دیکھا کہ سرطان میز پر رینگ رہا ہے اُس نے اپنی حرکت کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ قلمدان سے کاغذوں تک پہنچا اس کے بعد پھر قلمدان کے پاس آ گیا۔ ہیری سن پہلے تو دیکھتے رہے اُس کے بعد بولے "ارے یہ تو لکھ رہا ہے ۔۔۔ یہ تو مرہٹی لکھ رہا ہے۔" میں نے بھی قریب آ کر دیکھا تو واقعی سرطان لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ یہ کام سخت مشکل سے کر رہا تھا کیونکہ قلم کی بجائے وہ اپنے پنجے کو روشنائی میں ڈبو ڈبو کر کاغذ پر گھسیٹ رہا تھا۔ ہیری سن نے جیب سے پنسل نکال کر اُس عجیب و غریب جانور کو دی۔ اُس نے نہایت مسرورانہ انداز میں پنسل کو چھین لیا۔ اور پہلے کی بہ نسبت زیادہ آسانی سے آہستہ آہستہ لکھنا شروع کر دیا۔ قصّہ مختصر چند گھنٹوں کی محنت کے بعد سرطان نے مرہٹی زبان میں اپنی زندگی کے حالات لکھ دیئے ہیری سن اور میں دونوں بخوبی مرہٹی جانتے تھے اس لئے نہایت آسانی سے ہم اس تحریر کا مطلب سمجھ گئے۔ وہ یہ تھی:-

"میں ناسک کا ایک برہمن دھرم شاستر ہوں اور رامچندر کے مندر کا پجاری ہونا میری قسمت میں لکھا تھا۔ ایک مرتبہ میں دریائے نربدا کی جاترا کے لئے گیا۔ وہاں پر چند سنیاسیوں سے میری ملاقات ہوگئی۔ یہ لوگ پاربتی دیوی کے معتقد تھے جس کو وہ کالی دیوی کہتے تھے۔ وہ میرے دوست ہو گئے اور انہوں نے مجھ کو رام چندر کا مندر چھوڑ دینے کی رائے دی کیونکہ اس میں مجھے کچھ بھی فائدہ نہیں تھا۔ چنانچہ میں کالی دیوی کے پرستاروں کی جماعت میں شریک ہو گیا۔ جہاں عزت و دولت میرا انتظار کر رہی تھی۔ یہ لوگ روح کو منتر کے ذریعہ سے کسی دوسرے جسم میں بھی منتقل کر لیتے تھے۔ اگرچہ اس تعلیم کا حاصل کرنا نہایت اہم کام تھا، تاہم میں نے اس علم کو سیکھ لیا، جس کے ذریعہ سے فوراً روح جسم سے جدا ہو کر کسی دوسرے جسم میں منتقل ہو جاتی تھی۔ اِس علم کو حاصل کرنے کے لئے مجھے بہت زیادہ نفس کشی کرنی پڑی۔ تمام موسم گرما آگ کی بھٹیوں کے سامنے بیٹھ کر گذار دیا اور سردی کا تمام زمانہ برفانی چشمہ کے تیز پانی میں دن رات کھڑے رہ کر بسر کر دیا۔ اب رہا غذا کے متعلق تو وہ بھی صرف زندہ رہنے کے لئے برائے نام کھا لیا کرتا تھا۔ جب میری حالت بہت زیادہ ابتر ہو گئی تو میرے گرو نے کہا "اب تم منتر سیکھنے کے قابل ہو گئے ہو" انہوں نے میرے کان میں کچھ خوفناک الفاظ کہے اور مجھے اُن کے دُہرانے کا حکم دیا۔ اُسی وقت میرے دل میں جوہا بننے کا خیال پیدا ہوا۔

چنانچہ اس مقصد کو پورا کرنے کی غرض سے میرے گرو نے فوراً ایک چوہا پکڑ کر مار ڈالا۔ میں نے اُس منتر کو پڑھا، اور میری روح فی الفور چوہے کے جسم میں منتقل ہوگئی۔ چوہا ہوجانے سے مجھے بھوک کی بہت زیادہ تکلیف برداشت کرنی پڑی۔ اس لئے میں نے پھر منتر پڑھا اور میری روح اپنے اصلی جسم میں واپس آگئی۔ اس سے سنیاسی مطمئن ہوگئے اور یہ سمجھنے لگے کہ اب میں ابتدائی تعلیم میں بالکل پختہ ہوگیا ہوں فوراً انہوں نے میرے سامنے چیتے کی لاش لاکر ڈال دی اور مجھے ایک خونخوار درندہ ہوجانے کے لئے حکم دیا۔ چیتا ہوجانے کے بعد میں نے ایک برات پر حملہ کیا اور جواہرات سے آراستہ دلہن کو اٹھا کر ایک مقررہ جگہ پر لے آیا۔ اور اُسے پھاڑ کر کھا گیا۔ سنیاسیوں نے برات کا تمام روپیہ اور جواہرات اکٹھے کر لئے۔ چیتے میں منتقل کرنے سے پہلے مجھے ایک قسم کی شراب پلا دی گئی تھی جس سے میرا اصلی جسم چند ماہ تک سڑنے سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ پھر میں گجرات کے امرا کا شکار کرنے کی غرض سے نکل کھڑا ہوا۔ بہت سی زیور اور جواہرات سے آراستہ لڑکیوں اور دولت مند تجار کو مار ڈالا، اور اُن کی لاشوں کو اُس جگہ لے آیا جہاں لانے کی میرے استاد نے ہدایت کی تھی۔ ہر تیسرے مہینے منتر کے ذریعہ سے میں اپنے انسانی جسم میں واپس آجایا کرتا تھا یہ اس لئے کرنا پڑتا تھا کہ کہیں شراب کا اثر زائل ہوجانے سے میرا انسانی جسم سڑ نہ جائے۔ دیوی کے معتقدین کی جماعت میں ایک یا دو دن رہنے کے بعد میں پھر چیتے ہی کے جسم میں منتقل ہوگیا۔

ایک دفعہ گجرات کے چند اضلاع میں لوگوں پر حملے کر کے میں ریگستان میں گھس رہا تھا کہ چند انگریز افسر میرے مارنے کے لئے پہنچ گئے۔ یہ لوگ شاہراہ کے درختوں پر بیٹھے ہوئے میرا انتظار کر رہے تھے۔ اتفاقاً میں ایک روز شام کو اُن کی تدابیر سے بالکل بے خبر دیوی کے خیالات میں منہمک اُن کی گھات کے پاس سے گذر رہا تھا کہ اُن میں سے کسی نے بندوق چلائی اور گولی چیتے کے جسم میں گھس گئی۔ دیوی کے لطف و کرم سے مجھے بچنے کا موقع مل گیا اور خون جاری ہونے سے پہلے ہی میں اپنے اصلی جسم میں منتقل ہوگیا۔ میں نے اپنے گرو سے قصہ بیان کیا اور بتایا کہ کس صفائی سے میں بچ گیا۔ انہوں نے یہ کہہ کر میری ہمت بڑھائی کہ "تم بہت سے جوہر دکھانے کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔ اور دوسرے جنم میں یقیناً تم ایک خوش قسمت انسان ہوگے"۔ چند ہفتے گذر جانے کے بعد میرا خوف رفع ہوگیا اور میں ایک گھڑیال کی لاش میں منتقل ہونے کے لئے راضی ہوگیا۔ جس کو میرے گرو نے پہلے ہی سے محفوظ کر رکھا تھا۔ مجھے دریائے نربدا کے اندر زندگی بسر کرنے کا حکم ہوا۔ جہاں میں اُن دہقانی عورتوں اور لڑکیوں کی گھات میں رہتا تھا جو مقدس دریا میں اپنے گھڑے بھرنے کی غرض سے آیا کرتی تھیں۔ کئی مہینہ تک یہ فرض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتا رہا۔ اتفاقاً ایک روز سطح آب پر مجھے گوشت کا ایک ٹکڑا بہتا ہوا نظر آیا میں نے بیوقوفی سے اُس کو نگلنے کی کوشش کی لیکن میرے جبڑوں میں ایک آہنی کانٹا چُبھ گیا۔ میں اُس کی تکلیف سے سخت پریشان ہوا اور میں نے اپنے آپ کو کنارے کی طرف کھنچتے ہوئے محسوس کیا، جس سے مجھے یہ معلوم

ہوگیا کہ کوئی کینہ پرور دہقان مچھلی کی طرح مجھے بنسی سے کھینچ رہا ہے۔ بہر حال میرے لئے اُس سے بچنا بہت آسان تھا۔ اپنے بچنے کے لئے اگر کچھ تدبیر میں کرسکتا تھا تو وہ صرف پانی سے باہر نکل کر ممکن تھی۔ کیونکہ انسانی روح میں منتقل ہونے کے لئے ہوا کی ضرورت ہے۔ پانی سے نکلتے ہی میں نے منتر پڑھا اور اپنے اصلی جسم میں منتقل ہوگیا۔ انسانی جسم میں منتقل ہوجانے کے بعد میں نے اپنے گرو سے رخصت کی درخواست کی حقیقتاً اب میں اس کا مستحق بھی تھا کیونکہ میں نے اُن کے واسطے بہت کافی دولت جمع کردی تھی جس کو انہوں نے نہایت بے دردی سے اپنی تفریحات میں صرف کرنا شروع کردیا تھا۔ جب میں اپنا زمانۂ رخصت نہایت آرام سے گزار رہا تھا ایک صاحب بہادر مع اپنے پیتلی سرطان کے تشریف لے آئے۔ سرطان اگرچہ دھات کا بنا ہوا تھا لیکن میرے دل میں اُس کے اندر منتقل ہوجانے کی خواہش پیدا ہوئی وہ نہایت صفائی سے بنایا گیا تھا اور اُس کی آنکھیں بالکل اصلی معلوم ہوتی تھیں جیسی کہ اب بھی دکھائی دے رہی ہیں۔ صاحب بہادر کو یہ بات تو یاد ہوگی کہ میں اکثر سرطان کو اٹھا کر اچھی طرح دیکھا کرتا تھا کیونکہ مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ میرا مقصد حل ہونے کے لئے اس میں کوئی سوراخ بھی ہے یا نہیں۔ آخر کار میں اپنی جستجو میں کامیاب ہوگیا اور مجھے اُس کے پنجے میں ایک سوراخ دکھائی دیا جو کمانی کے ساتھ کھلتا اور بند ہوتا تھا۔ میں نے فوراً سرطان میں منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ محض امتحاناً تھا اس لئے پہلے کی طرح میں نے شراب نہیں پی اب میرا ارادہ دو ایک روز میں اپنے ہی جسم میں منتقل ہوجانے کا ہے کیونکہ مجھے اپنے استاد سے مشورہ کرنا ہے۔ میں نہایت آسانی سے سرطان میں منتقل تو ہوگیا لیکن میں اپنی آرزو میں کامیاب نہ ہوسکا۔ یہ صحیح ہے کہ میں دیکھ سکتا ہوں، لیکن سن نہیں سکتا، کیونکہ سرطان کے کانوں میں سوراخ نہیں ہیں۔ ٹانگیں اگرچہ نہایت خوبصورتی سے بنائی گئی ہیں، لیکن اصلی نہ ہونے کی وجہ سے میں صرف رینگ سکتا ہوں۔ میں نے یہ سوچ رکھا تھا کہ پہلے تو روپے چرا کر کسی جگہ چھپاتا رہوں گا اُس کے بعد اپنے جسم میں واپس آکر اُن کو اپنے گرو کے پاس لے جاؤں گا۔ وہاں پہنچنے پر جو کچھ وہ میرے متعلق فیصلہ کریں گے اُس پر عمل کروں گا۔ اگر وہ اس پیتل کے سرطان میں دوبارہ منتقل ہونے کا حکم دیں گے تو اُس کی تعمیل کروں گا، ورنہ کسی اور جانور کی شکل میں رونما ہوجاؤں گا۔ افسوس میں اپنی تدابیر میں ناکام رہا، کیونکہ صاحب بہادر اور اُن کے خدام میری پوشیدہ جگہ سے بخوبی واقف ہوگئے اور انہوں نے اپنا روپیہ بھی برآمد کرلیا۔ اب میرا یہ ارادہ ہے کہ فوراً اپنے اصلی جسم میں منتقل ہوجاؤں۔ صاحب لوگ میرے خوف کا بخوبی اندازہ کرلیں گے جب کہ انہیں یہ معلوم ہوجائے گا کہ وہ سوراخ جس میں سے میری روح سرطان کے اندر داخل ہوئی ہے بند کردیا گیا ہے اور۔ اسپرنگ دار کھٹکنی صرف باہر کی طرف کھل سکتی ہے یوں اب میں اپنے آپ کو اس پیتل کے سرطان کے اندر ایک قیدی سمجھتا ہوں۔ چند گھنٹے میں میرا جسم سڑ جائے گا اور جلا دیا جائے گا۔ پھر اگر میں سرطان کے اندر سے نکل بھی جاؤں تو میرے لئے کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ میں اپنی زندگی ہمیشہ کے لئے کسی پیپل کے درخت پر گذار دوں ــــ میں نے صاحب بہادر کو تمام قصے سے اس لئے آگاہ کردیا ہے،

کہ اگر اُن کو رحم آگیا تو مجھے یقیناً چھٹکارا مل جائے گا"۔

سرطان کی ناقابلِ یقین سرگزشت پڑھنے کے بعد میں نے ہری سن سے کہا کیا اس بدمعاش برہمن کو آزاد کر دینا چاہئے

ہری سن نے کہا نہیں ہم کو اس قسم کی کوئی کارروائی نہیں کرنی چاہئے ذرا ان خطرناک واقعات پر تو غور کرو جو اس ذلیل برہمن نے دیوی کی پرستاری میں کئے۔ اگر ہم اس کو آزاد کر دیں گے تو پھر وہی مہیب کام انجام دے گا ہم کو اس کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرنا چاہئے جیسا سلیمان علیہ السلام نے اُن جنات کے ساتھ کیا جنہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا ہم کو یہ چاہئے کہ اس برہمن کو ہمیشہ کے لئے اسی سرطان کے اندر بند کر دیں، اور اس کو کسی ایسی جگہ پھینک دیں جہاں سے اس کو کبھی چھٹکارا نصیب نہ ہو سکے"، یہ کہہ کر ہری سن نے لاکھ پگھلائی اور سرطان کے نیچے والے اسپرنگ پر ڈال دی۔ پھر ہم دونوں نے اپنی انگوٹھیوں کی مہریں اس پگھلی ہوئی لاکھ پر حضرت سلیمان علیہ السلام کا اسمِ گرامی پڑھتے ہوئے ثبت کر دیں۔

اس کے بعد ہری سن نے میرے سرطان کو خیمہ کے قریب والے کوئیں میں پھینک دیا۔ کوئیں کی دیواریں اس قدر چکنی اور سپاٹ تھیں کہ اصلی سرطان بھی اُن پر نہیں چڑھ سکتا تھا۔ اس طرح پر ہم برہمن کی روح کی طرف سے تو مطمئن ہو گئے لیکن ابھی اُس کے جسم کا فکر دامنگیر تھا۔ دو تین روز کے بعد ہم کو اطلاع ملی کہ ایک برہمن کی لاش پولس کو پڑی ہوئی ملی ہے جس سے قتل کا شبہ ہوتا ہے۔ پولس والوں نے معمولی تحقیقات کے بعد ایک سنیاسی کو گرفتار کر لیا۔ جس کے پاس سے مردہ برہمن کا مال برآمد ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کی تحقیقات صحیح تھی کیونکہ سرطان کے جسم میں منتقل ہونے سے پہلے برہمن نے اپنا تمام مال و متاع اسی سنیاسی کو دے دیا تھا۔ مسٹر ہری سن کلکٹر ہونے کے علاوہ ضلع کے مجسٹریٹ بھی تھے اس لئے انہوں نے مقدمہ کو اپنی عدالت میں منتقل کرا لیا اور پولس سپرنٹنڈنٹ کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے سنیاسی کو رہا کر دیا"۔

اتنا کہنے کے بعد برو ڈرک دفعتہً خاموش ہو گیا اور اپنے ساتھیوں کے سوال کرنے سے پہلے ہی سلام کر کے رخصت ہو گیا برو ڈرک کے چلے جانے کے بعد کارٹریٹ نے اپنے دوسرے ساتھی سے کہا مارنکس کیا آپ اس قصہ کو لفظ بلفظ صحیح تصور کرتے ہیں؟

جواب دینے سے قبل مارنکس میر قادر خاں سے مخاطب ہو کر بولے "میر صاحب آپ کی اس کے متعلق کیا رائے ہے"؟

اس سوال سے میر قادر خاں کچھ متحیر ہوئے اور کہنے لگے "میں تو اس کو بالکل سچ سمجھتا ہوں۔ الحمدللہ، تمام صاحب لوگ جن سے میری شناسائی ہے ہمیشہ سچ بولتے ہیں اور برو ڈرک صاحب کو تو میں ہمیشہ سے اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔ انہوں نے مجھے قصداً کبھی دھوکا نہیں دیا۔

اِس کے بعد میر قادر خاں محفل کے کندھوں سے اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور خوابگاہ کی طرف چلے گئے۔

کارٹریٹ صاحب اور مارنکس صاحب نے بھی نہایت دانشمندی سے میر صاحب کی پیروی کی، کیونکہ اب کوئی قصہ گو موجود نہیں تھا۔

مشہود زائر

محفلِ ادب

نواہائے راز

دامن پہ زخمِ دل کا لہو لالہ کار ہے — آئے نہ آئے فصلِ بہار اب بہار ہے

اُس بے وفا نے ترکِ وفا کا کیا ہے عہد — اے وائے اُس کا عہد اگر استوار ہے

کس کس کی بزمِ عیش نہ برہم ہوئی یہاں — رونا ہے کیا، یہ قاعدۂ روزگار ہے

کج بازیٔ سپہر سے میری بلا ڈرے — دو دن کا کھیل زندگیٔ مستعار ہے

میرا چراغِ زیست فروزاں سہی مگر — روشن تر اُس سے بھی مری شمعِ مزار ہے

یا تابشِ شرار سے دل وقفِ سوز ہے — یا سوزِ دل ہی غازۂ روئے شرار ہے

پایا ہے جب سے بار تری جلوہ گاہ میں — اقرارِ حسنِ غیر مجھے ناگوار ہے

پروانہ سے یہ رنج کہ مرنا ہے شمع پر — بلبل سے یہ ملال کہ گل پر نثار ہے

کب تک حجابِ غیر میں یہ کم نگاہیاں — حالانکہ عرش و فرش میں تو جلوہ بار ہے

افسردگیٔ شمع سے پروانہ ہے خجل
انجامِ گل سے سرِ گریباں ہزار ہے

"نور جہاں"

سعدی کا پیرایۂ بیان

سعدی کی جس چیز کو ہم پسند کرتے ہیں وہ صرف اُس کے معتدل، معقول اور ہمدردانہ نصائح اور شیریں و تبسم آمیز حکمت ہی نہیں ہیں، بلکہ اُس کا دلکش پیرایۂ بیان اور بامزہ تشبیہات و استعارات و کنایات بھی ہیں جو اُس نے اپنے پند و نصائح میں اختیار کئے ہیں اور نیز مناظرِ قدرت کا ذوق جن کا بیان اُس نے نہایت نزاکت و دل بستگی کے ساتھ کیا ہے، جس طرح کہ کوئی اپنے زیبا اور عزیز محبوب کا کرے گا۔ ذیل میں ایک حمد نقل کرتا ہوں، جو ایک گیت ہے جس میں خدائے تعالیٰ کے فضل و کرم کو مناظرِ قدرت کے اندر دکھایا ہے۔ یہ نظم فراخ و با وسعت ہے جس میں ساتھ ہی ایک

قسم کی نزاکت و صفائی ہے اور پھر محکم و دل نشین بھی ہے۔

"کمالاتِ ایزدی کو کون شمار کر سکتا ہے۔ اُس کی بے شمار نعمتوں میں سے کسی نے ایک نعمت کا بھی پُورا شکر ادا کیا ہے؟ اُس نے سراپردۂ عالم کو کھڑا کیا اور مختلف و دلفریب رنگ اس میں پھیلا دیئے۔ زمین، سمندر، جنگل، سورج چاند، ستارے سب اُس کے ہاتھ کے بنائے ہوئے ہیں۔ اُس کی بے نہایت فیاضی نے تمام عالم کو گھیر رکھا ہے اور آسمان کا گنبد اُس کے فضل کے سامنے گرد ہے۔ نازک اور آسانی سے ٹوٹ جانے والی لکڑی میں خوشنما پھول لگاتا شاخِ گلاب میں شکر بھرتا اور قطرۂ آب سے لولوئے درخشاں پیدا کرتا ہے۔ پہاڑوں کو زمین پر بطور میخوں کے قائم کر رکھا ہے تاکہ پانی پر زمین ٹھہری رہے۔ سورج کے عمدہ اثر سے وہ زمینِ شور کو سبزہ زار بناتا ہے اور صحرا کو نرگس و گلاب کا باغ۔ بادلوں کے سینے سے وہ بارانِ بے حساب برساتا ہے، جو مردہ پودوں کو از سرِ نو زندہ کرتی ہے، اور فصلِ بہار میں وہ برہنہ شاخوں کو سبز اور چمکتا ہوا لباس پہناتا ہے۔ ایسا کون سا انعام ہے، جس کا انسان نے کبھی پُورا پورا شکریہ ادا کیا ہے۔ وہ اپنے انعامات بے دریغ بخشتا ہے لیکن سب سے بڑا، سب سے زیادہ نہ مٹنے والا انعام یہ ہے کہ اُس نے ہمارے دلوں میں خوش بختانہ زندگی کی امید پیدا کر دی ہے"۔

بوستان کے آٹھویں باب میں شکرِ الٰہی پر مندرجہ بالا اقتباس کے مضمون کو مختلف پیرایہ میں ادا کیا ہے۔

"رات، دن، مہِ روشن اور مہرِ گیتی افروز تیری آسائش کے لئے بنے ہیں۔ آسمان فراش کی طرح تیرے لئے بساطِ بہار بچھاتا ہے۔ باد و برف اور باران و میغ، رعدِ غراں اور برقِ درخشندہ سب کارپرداز و فرمانبردار ہیں، جو تیرے تخم کو خاک میں پالتے ہیں۔ اگر تو پیاسا ہے تو تکلیف سے مت گھبرا کہ سقائے ابر تیرے لئے اپنے کاندھے پر پانی لائے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خاک سے رنگ، بو اور طعام پیدا کرتا ہے جو آنکھ دماغ اور حلق کے لئے تماشا گاہ ہیں۔ مکھی کے ذریعے سے شہد اور ہوا سے من پہنچاتا، اور درختِ نخل سے خرما اور گٹھلی سے نخلِ خرما پیدا کرتا ہے۔ تمام نخلبند حیرت سے ہاتھ ملتے ہیں کہ ایسا نخل کسی نے نہیں بنایا۔ سورج، چاند اور پروین تیرے لئے ہیں اور تیرے مکان کی چھت کی قندیلیں ہیں۔ تیرے لئے خار سے گل، نافے سے مشک، کان سے زر اور چوبِ خشک سے برگِ تر پیدا کیا ہے۔ اے خدا! میرا دل خون ہو گیا اور آنکھیں زخمی ہو گئیں کہ بیان سے بڑھ کر تیرے انعامات دیکھتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
آ اے سعدی اپنا دفتر بند کر اور ہاتھ کو روک۔ ایسے راستے ہیں کہ جس کی انتہا نہیں مت دوڑ"۔

"اُردو"

جنّتِ ارضی

سوچو تو سہی، تمہاری زمین ستاروں میں سے ایک ستارہ ہے۔ ایک جنت ہے، دیوتاؤں کے رہنے کے قابل، اگر صرف انسانوں میں مہر و محبت ہو —— اسی مطمحِ نظر کو سامنے رکھ کر مصروفِ عمل ہو جاؤ اور اپنی زندگی کی تکمیل کر کے اس معراجِ کمال کو پالو۔

اپنے لئے کسی ایسی چیز کی آرزو نہ کرو جو کسی دوسرے کی امیدوں اور خوشیوں کا خاتمہ کر دے۔ کسی کو عسرت و محنت کی مصیبت میں اس لئے مبتلا نہ کرو کہ تمہیں وہ عیش و آرام ملے جس کے تم مستحق نہیں۔ بھوکے خادم کے پیٹ پر اس لئے پتھر نہ بندھواؤ تاکہ تمہارے سست مہمان تمہاری روٹیاں کھا کر موٹے ہوں۔

نیکی کو دوست دشمن سب میں تلاش کرو، اپنی تحسین و آفرین کو انہیں کے لئے مخصوص نہ رکھو جو تمہارے منظورِ نظر ہیں۔ اور کمزور ترین گنہگار کو بھی موقع دو کہ وہ تمہاری کوشش سے ناقابلِ عبور بلندیوں تک پہنچ سکے۔

سمجھو کہ تمہاری زمین ستاروں میں سے ایک ستارہ ہے —— ایک جنت دیوتاؤں کے رہنے کے قابل، اپنے قلب میں الوہیت کو بیدار کرو اور اپنی وسیع محبت کی مثال لوگوں کے سامنے پیش کر دو۔ سب انسان دراصل سوئے ہوئے دیوتا ہیں! اُٹھو تاکہ تمہاری ہی آواز اُن کو اس ناسزا نیند سے بیدار کرنے والی ہو۔

"نور جہاں"

مریخ

کیا وہ محبت کا نازک ستارہ ہے؟ عشق اور تخیل کا تارہ؟

نہیں اس نیلگوں ڈیرے سے ایک سپاہی کا زرہ چمک رہا ہے اور جب میں دُور اس سرخ تارے کی سپر پناہ کو شب کے نیلے آسمان پر دیکھتا ہوں تو میرے دل میں جذبات کا ہجوم اُٹھتا ہے۔

اے طاقت اور قوت کے تارے! تو میرے درد پر مسکراتا ہے اپنے دستِ سپاہیانہ سے اشارہ کرتا ہے اور مجھ میں پھر نئی قوت آجاتی ہے۔

"نظام کالج میگزین"

نئی کتابیں

جہد للبقا مصنفہ خواجہ کمال الدین صاحب مبلغ اسلام۔ یہ کتاب سورہ فاتحہ کی ایک حکیمانہ تفسیر ہے اس میں قرآن مجید کی اس سب سے اہم دعا کے انسانی معاشرت اخلاق اور روحانیات پر اثرات ظاہر کئے گئے ہیں، عمل کو دعا کی قبولیت کے لئے ضروری بتایا ہے اور انسان کی معاشری، منزلی، مجلسی، اقتصادی اور سیاسی ترقی کو مذہب کا ایک جزو قرار دیا ہے۔ فاضل مفسر نے ثابت کیا ہے کہ ترقی کے تمام امکانات کو خدا نے انسان کے قبضۂ قدرت میں رکھ دیا ہے، صرف اُس کا علم محدود ہے اور یہ دعا علم و عرفان ہی کی دعا ہے۔ کتاب کا حجم ڈیڑھ سو صفحات کے قریب ہے اور چونکہ اس کی فروخت سے کوئی تجارتی غرض وابستہ نہیں اس لئے قیمت صرف ۴ر رکھی ہے پتہ مینیجر مسلم بک سوسائٹی عزیز منزل لاہور

بقائے دوام مصنفہ ایم اسلم صاحب اس کتاب میں حیات بعد الممات کے مسئلہ پر بحث کی گئی ہے۔ بقائے دوام کا علم انسان کو سب سے پہلے مذہب کے ذریعہ سے ہوا لیکن اب اُس کے مشاہدات سائنس کی مدد سے بھی ہونے لگے ہیں۔ چنانچہ مغربیوں نے ارواح کو مادہ کا لباس پہنا کر زندہ انسانوں سے ملا دیا ہے مصنف نے اس مضمون کو مذہب سے بالکل الگ رکھا ہے اور صرف اہل مغرب کا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ کتاب اس قدر دلچسپ ہے کہ ختم کئے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا چند اہم ابواب یہ ہیں:۔ بقائے دوام، روح، وجود اثیری، موت اور روح، وقت، حیات بعد الممات اور حکما کے اقوال حجم ۱۵۲ صفحے اور قیمت ایک روپیہ ہے۔ ملنے کا پتہ مینیجر نسیم بک ڈپو، بارود خانہ بازار لاہور۔

طرۂ امیر مولفہ جناب مولوی امیر احمد صاحب علوی بی اے کاکوری ضلع لکھنؤ۔ اس میں منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی کی مختصر سوانح عمری اُن کا منتخب کلام اور اُن کی شاعری پر تبصرہ ہے۔ تبصرہ میں داغ اور امیر کے کلام کا مقابلہ بھی کیا گیا ہے۔ اور گو فوقیت امیر ہی کو دی گئی ہے لیکن یہ بھی مانا ہے کہ "بعض خیالات کے نظم کرنے میں امیر کو کمال حاصل ہے اور بعض جذبات کا اظہار صرف داغ ہی کر سکتے ہیں"۔ کلام کا انتخاب بہت اچھا ہے حجم ۸۴ صفحات اور قیمت ایک روپیہ ہے۔ کتاب مولف موصوف سے مل سکتی ہے۔

مضامین چکبست - پنڈت برج نرائن چکبست مرحوم کے بیس مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے اکثر تنقیدی ہیں اور بڑی قابلیت سے لکھے گئے ہیں۔ چکبست مرحوم اردو زبان کے مسلمہ ادیب تھے۔ اُن کا انداز تحریر نہایت دلکش تھا اور زبان پر انہیں بڑی قدرت حاصل تھی۔ اُن کے مضامین کا یہ مجموعہ ادب اردو کا ایک قابل قدر ذخیرہ ہے اور ہمیں ناشرین کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انہوں نے اسے یوں محفوظ کر دیا۔ بعض عنوان یہ ہیں:۔ پنڈت دیا شنکر کول نسیم، پنڈت رتن ناتھ سرشار، داغ، گلزار نسیم، منشی سید محمد سجاد حسین، اردو شاعری، دادا بھائی نوروجی، تاریخ۔ کتابت طباعت اور کاغذ بہت اچھا ہے۔ کتاب کا حجم ۲۴۴ صفحے ہے اور قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد سے منگائیے۔

لنگڑا ماموں - ۳۲ صفحے کا ایک مختصر افسانہ ہے جسے بچوں کی سہل اور سلیس زبان میں لکھا گیا ہے۔ اس میں چوری، جھوٹ، دغا اور فریب کی برائیاں بڑے موثر پیرایہ میں بتائی گئی ہیں۔ ہمارے خیال میں بچوں کے عادات و اخلاق کو سنوارنے کے لئے اس قسم کے افسانے نہایت مفید ہو سکتے ہیں لکھائی چھپائی، کاغذ اور سرورق خوبصورت ہیں۔ کتاب تین آنے کے ٹکٹ آنے پر روانہ کی جاتی ہے۔ پتہ ایم عبد المجید وزیر آبادی مالک کتب خانہ ناشر العلوم لاہور

فہرستِ مضامین

جلد ۱۵ — بابت ماہِ اپریل ۱۹۲۹ء — نمبر ۴

تصویر:- فرشتوں کے حلقے

نکات

(۱)

یہ جوشِ رمیدہ آہو تو نہیں؟
اس عشق میں پنہاں کوئی غم کا پہلو تو نہیں؟
آنکھوں میں ہے کچھ شرارِ عشرت غلطاں
ڈرتا ہوں کہ اس بھیس میں آنسو تو نہیں

(۲)

دل ہوتا ہے اور ارادہ گاہے گاہے
رو لیتے ہیں بھر کے آہ گاہے گاہے
اس ڈر سے کہیں چھوڑ نہ جائے خدا
کر لیتے ہیں ہم گناہ گاہے گاہے

(۳)

ہر صورت سے ایک پیام آتا ہے دل میں
ہر سانس سے دورِ جام آتا ہے دل میں
ہستی ہے خلافِ عقل میں جب تو
وہ شیخ ہے بے نیام آتا ہے دل میں

(۴)

طوفان سے عشرتوں کے لبریز کر دے
اس برقِ جہاں سوز کو پھر تیز کر دے
ہنگامہ بپا ہے علم سے اے معبود!
معصوم جہالتوں کو واپس کر دے!!

جوشؔ
ملیح آبادی

جہاں نما

سٹیلن کی تصویر

سوویٹ روس کا وہ عجیب وغریب اور پُراسرار حاکم جسے بظاہر کوئی بھی نہیں جانتا اور جس کے سینے میں تمام انسانی خواہشات کی جگہ صرف حکومت اور اقتدار کی نہ بجھنے والی پیاس نے لے لی ہے سٹیلن ہے۔ یہی شخص ہے جس نے لینن کے نائب ٹراٹسکی کو جو کسی زمانے میں روسیوں کا محبوب ترین وزیر جنگ تھا منصبِ حکومت سے بے دخل کر کے بے خانماں کر دیا ہے۔ سٹیلن کے سابق سکرٹری بازہانوف نے پیرس کے ایک روسی روزنامہ "فاز روزڈینی" میں جو بالشویک تحریک کا مخالف ہے اُس کی ایک مدھم سی تصویر یوں کھینچی ہے۔

"وہ ایک تارک الدنیا کی طرح قلعۂ کرملین کے اُن دو چھوٹے چھوٹے کمروں میں رہتا ہے جن میں حکومتِ زار کے زمانے میں محل کے خادم رہا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کبھی عیش و تفریح میں مصروف نہیں ہوا اور نہ کبھی اُس نے حکومت کے روپے کو غصب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُس کے لئے کھیل یا اور کسی قسم کی تفریح کا وجود تک دنیا میں نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے، اور اسی لئے شاید اسے بہترین خاوند کہا جاتا ہے، کہ اُس کے لئے اپنی بیوی کے سوا دنیا میں کوئی عورت موجود نہیں۔ وہ کام کے معاملہ میں بھی کچھ زیادہ مستعد نہیں ہے مگر جہاں اُس کی حد سے بڑھی ہوئی حرص و آز کا مسئلہ درپیش ہو وہاں وہ کاہل بھی نہیں رہتا۔

پہلی نظر میں وہ بہت متین، ضابطِ نفس اور سیدھا سادہ آدمی معلوم ہوتا ہے اور انسان خیال کرتا ہے کہ وہ شاید نہایت ہوشیار ہے لیکن جوں جوں کوئی اُس سے واقف ہوتا ہے اُس کی حیرت بڑھتی جاتی ہے۔ وہ جاہلِ مطلق نظر آنے لگتا ہے جتنا کوئی اس کا مطالعہ کرتا ہے اتنا ہی اسے تعجب ہوتا ہے۔ وہ سیاسی مسائل کو سمجھنے سے بالکل قاصر ہے۔ وہ اقتصادیات اور مالیات سے محض نابلد ہے۔ نہ صرف یہ کہ اُسے غیر زبان سے ناواقفیت ہے بلکہ اُسے روسی ادبیات کی بھی کچھ خبر نہیں۔ اور عام تعلیم کی بھی اُسے ہوا تک نہیں لگی اُس کا دماغ بھدا اور سست فہم ہے۔ خوش طبعی اُس میں نام کو نہیں ہے۔ پورے ڈیڑھ سال کے روزانہ میل جول میں میں نے اُسے صرف ایک مرتبہ مذاق کرتے دیکھا ہے وہ بڑی متین صورت بنائے ہوئے اپنے ایک نائب کے پاس آیا۔ اور اُس سے کہنے لگا، "میری ماں نے ایک بکرا پال رکھا تھا اور میں

کی شکل ہو بہو تم سے ملتی تھی، فرق بس اتنا تھا کہ وہ عینک نہ لگایا کرتا تھا" اور پھر اپنے اس چست فقرے پر حد درجہ مطمئن ہوکر اور اپنے نائب کو ہنستا ہؤا چھوڑ کر اپنے دفتر کی طرف چل دیا۔

وہ فی الحقیقت وہی ہے جو ہمیں بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے یعنی جارجیا (کوہ قاف) کا ایک جاہل دہقان۔ وہ فطرتی طور پر اپنے ذاتی بچاؤ کے لئے ملکیوں اور غیر ملکیوں کو ملنے سے احتراز کرتا ہے اور اس قسم کی پُر اسرار گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اُس کے ماتحت عام طور پر اُسے "مالک" کے لقب سے پکارتے ہیں —— گویا، روس کا مالک —— اپنے ماتحتوں سے اُس کا سلوک خود سرانہ بےتکلفی اور بے لحاظی کا ہے اور یہی برتاؤ اس کا اپنے گھر کے لوگوں کے ساتھ ہے۔ وہ پُراسرار، شریر اور کینہ توز ہے۔ وہ اپنی مخفی تجاویز کبھی کسی کے سامنے ظاہر نہیں کرتا۔ وہ ضرورت کے بغیر کسی سے بات نہیں کرتا اور اکثر خاموش رہتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ ایک ایسا شخص کامیناف، زینوویف، ٹراٹسکی اور اسی رتبہ کے دوسرے رہنمایانِ اشتراکیت کو شکست دے کر روس کا مالک بن جائے؟ مسٹر بازہاناف اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اُس کے طریقِ کار کا عطر چند الفاظ میں کھینچا جا سکتا ہے۔ اُس کے حامی اور مددگار ملک کے تمام ذمہ دار عہدوں پر فائز ہیں۔ خصوصاً اُن عہدوں پر جو حکومت کی روح رواں ہیں۔ اشتراکی گروہ کے معتمدِ اعلیٰ کی حیثیت میں ایسے لوگوں میں عہدے تقسیم کرنا اُس کے لئے نہایت آسان تھا۔ چنانچہ وہ ۱۹۲۳ء سے اسی کام میں منہمک ہے۔

افسروں کے انتخاب میں اُس کا اولین اصول ایک عجیب خصوصیت لئے ہوئے ہے۔ اگر ہم محکمۂ سیاسی کے موجودہ ارکان پر نظر کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ سٹیلن سال بہ سال تعلیم یافتہ اور مہذب اشتراکیوں کے ہاتھ سے اقتدار چھین رہا ہے اور ان اہم ترین عہدوں پر جاہل نالائق اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو فائز کر رہا ہے۔ یہی لوگ اس کے مددگار ہیں، کیونکہ وہ ذاتی طور پر اُس کے مرہونِ منت ہیں اور اُن کا عروج اُس کی ذات اور اشتراکی انقلاب سے وابستہ ہے، دوسری صورت میں اُن کا وجود عدم کے برابر ہے +

دو قوموں میں رشتۂ مواصلت

ریاستہائے متحدہ اور کینیڈا کو متحد کرنے کے لئے ایک پل تعمیر ہو رہا ہے، جس پر دو کروڑ ڈالر خرچ ہونگے۔ یہ عظیم الشان پل ڈیٹرائٹ (مچیگان) اور سینڈوچ (اونٹیریو) کے درمیان باندھا جائے گا۔ یکم جولائی تک اس کی تکمیل کی توقع کی جاتی ہے۔ یہ عمارت جس میں وسط کے دو بڑے برجوں کی درمیانی محراب ۱۸۵۰ فٹ ہوگی دنیا میں سب سے

طویل سمجھی گئی ہے۔

اصلی پل ۷۴۰۰ فٹ لمبا ہوگا لیکن داخلہ سے خارجہ تک کا طول دو میل سے کچھ ہی کم رہے گا۔ درمیان میں ڈیڑھ سو فٹ کی جگہ میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہوگی۔ یہاں تک کہ نہری کشتیاں بادبانوں سمیت اگر اپنی موجودہ بلندی سے بیس فٹ بھی زیادہ بلند ہونگی اور اسباب لانے والی کشتیاں اگر موجودہ کی بہ نسبت ساٹھ فٹ بھی زیادہ بلند ہونگی تو اس پل کے نیچے سے بہ آسانی گزر جایا کریں گی۔

پل کی عظمت کا کچھ اندازہ آپ کو مسالہ کی اُس مقدار سے ہوگا جو اُس پر صرف ہو رہا ہے یعنی ۲۴۰۰۰ ٹن لوہا اور تار، ۲۵۰۰۰ مکعب گز کنکریٹ، سیمنٹ کے ۴۰۰۰۰ پیپے، ۶۰۰۰۰ مربع گز ملبہ درمیانی سڑک کے لئے اور ۸۰۰۰ مربع گز کنارہ کی پیدل گزرگاہ کے لئے۔ اُن معلق تاروں پر جو پل کو سہارا دیئے ہوتے ہیں موسم کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے پہلے ایک خاص قسم کا مسالہ لگایا جاتا ہے پھر جست کی تہ چڑھائی جاتی ہے اور اس کے بعد کئی قسم کے روغن کئے جاتے ہیں اور آخر میں ایک نرم تار لپیٹ کر انہیں ڈھک دیا جاتا ہے۔

سن یٹ سین کا مزار

سن یٹ سین کی آخری آرامگاہ کے لئے ایک پہاڑی کا انتخاب کیا گیا ہے چینیوں کی نظر میں پہاڑی ایک خاص وقعت رکھتی ہے۔ بارش، بادل، طاقت اور زندگی کے دیوتا یہیں رہتے ہیں۔ اُن کے خیال کے مطابق اس آسمان کے نیچے پانچ ہزار مشہور پہاڑ ہیں۔ ان میں سے پانچ چوٹیاں افضل ترین ہیں اور وہ پانچ سمتوں میں واقع ہیں، اور چینیوں نے ان سب کی یاترا زمانۂ قبل تاریخ میں کی ہے۔ ان چوٹیوں کا پانچ ہونا کوئی اتفاقی امر نہیں ہے بلکہ چین میں سمتیں بھی پانچ ہیں یعنی مشرق، جنوب، مرکز، مغرب اور شمال۔ اور مادے بھی پانچ ہیں۔ لکڑی، آگ، زمین، دھات اور پانی۔ اور پانچ ہی رنگ ہیں جن سے وہ مطابقت رکھتے ہیں۔ سبز، سرخ، زرد، سفید اور سیاہ مختصر یہ کہ مخمس چینیوں میں ایک اہم شکل ہے۔ حیران کن امر یہ ہے کہ چینی ان متبرک پانچوں میں ایک چھٹی ارغوانی پہاڑی کا اضافہ کرنے والے ہیں جس پر دس لاکھ سے زیادہ رقم صرف ہوگی اور اس طرح وہ سن یٹ سین کا شایانِ شان مزار بنا کر جس کا وہ مستحق ہے یاترا کے لئے ایک اور متبرک مقام کا اضافہ کریں گے۔

تاثرات

فرشتے آسمانوں کی فضا میں مطمئن ہیں انہیں انسانوں کی تعریف کی ضرورت نہیں ـــــــ ملٹن

فرشتے اب بھی آسمان کے ستارے ہیں گو ان میں سے روشن ترین ٹوٹ کر گر پڑا ـــــــ شکسپیئر

یہ بادل فرشتوں کے فرغل ہیں اور یہ آتشین مغرب متبسم چہروں سے روشن ہے ـــــــ کنگسلے

جب بکھرے ہوئے بادل پہاڑوں کی آغوش میں آ کر آرام کرتے ہیں تو زمین آسمان میں اس درجہ مل جاتی ہے کہ یہ بھی آہستہ آہستہ آسمان نظر آنے لگتی ہے۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمانی طبقات میں جانا ممکن ہو گیا ہے۔
ٹھارن

آسمان! یہ رفیع الشان چھت جو آتش زریں سے مزین ہے ـــــــ شکسپیئر

اے ستارو! تم آسمان کی شاعری ہو ـــــــ بائرن

ستارے محبت کے پیکر ہیں ـــــــ بیلی

جنت کے دروازے شاہی محلات کے اونچے اونچے دروازوں کی طرح نہیں ہیں، اِن میں سے جھک کر داخل ہونا پڑتا ہے ـــــــ ویبسٹر

زمین کا کوئی درد نہیں جس کی دوا آسمان میں نہ ہو ـــــــ مور

منصور احمد
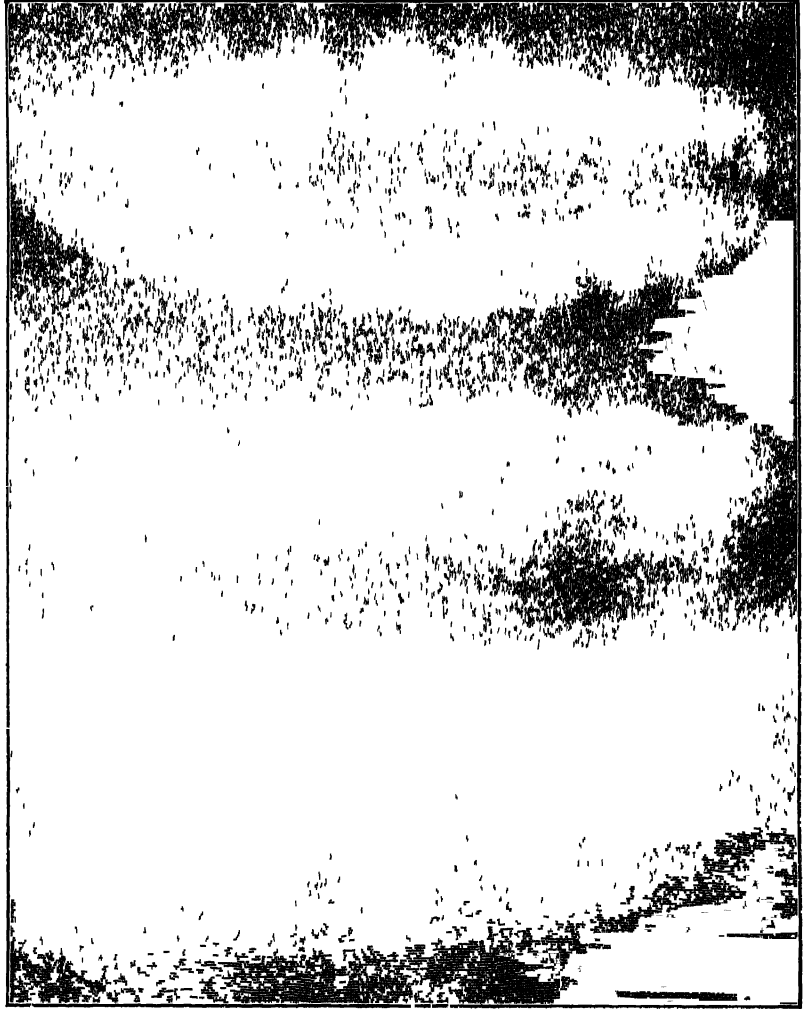
مرسدوں کے حلقے

تاریخِ دنیا پر ایک نظر

نشاۃ الثانیہ اور اصلاحِ مذہبی

۲۳

نشاۃ الثانیہ

قرونِ وسطیٰ میں اطالیہ کی حالت - آخری بار جب ہم نے اطالیہ کی حالت ملاحظہ کی تھی تو ہم نے دیکھا تھا کہ کس طرح جسٹنطین کے مشرقی گاتھوں کی قلمرو کو تباہ کرنے کے بعد لومبارڈوں نے آ کر یہاں لوٹ مار کی اور آباد ہو گئے۔ لیکن لومبارڈ وینس روما اور نیپلز کے شہروں کو فتح نہ کر سکے اور نہ وہ جزیرہ نما کے انتہائی جنوب پر کبھی حکمران ہوئے ان تمام غیر لومبارڈ حصوں میں بازنطینی شاہنشاہ کا اقتدار ابھی رسمی طور پر قائم تھا۔ جنوب کے خطوں میں گیارھویں صدی میں بھی اس کا سکّہ رواں تھا یہاں تک کہ نارمن قزاق آئے اور انہوں نے بتدریج سارے علاقے کو اپنے زیرِ نگیں کرلیا۔ نارمن جو ابھی ابھی لاطینی عیسائیت پر ایمان لائے تھے اس علاقے پر پاپا کے جاگیردار بن کر حکومت کرتے رہے لیکن انہوں نے اس یونانی تمدن کو جس کا تا حال یہاں دور دورہ تھا پھلنے پھولنے دیا اور اُن کے عہد میں بھی یونانی زبان بدستور علم و تجارت کی زبان بنی رہی۔

اس دوران میں وسط و شمالی اطالیہ کی لومبارڈ قلمرو کو فرنگیوں نے فتح کرلیا۔ اپنی اولین فتوحات کو انہوں نے پیپن (۷۵۵ء) اور شارلمین (۷۷۴ء) کے عہد میں پوپ کے حضور بطورِ نذرانہ پیش کیا اور انہیں علاقوں سے پوپ کی دنیوی طاقت کی ابتدا ہوئی۔ لیکن شارلمین نے اپنے تئیں "لومبارڈوں کا بادشاہ" بنالیا اور جب اُس کی شخصیت میں "مغربی سلطنتِ روما نے پھر سر نکالا تو پاپائی اور شاہنشاہی جوع الارض ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوئیں اور قرونِ وسطیٰ کے آخری حصے میں "گلف" اور "گبیلاین" کی ان دو طاقتوں کے درمیان لومبارڈی ٹسکنی اور جنوبی علاقے پر اپنا اثر پھیلانے کے لئے متواتر جدوجہد ہوتی رہی۔

شاہنشاہ فریڈرک ثانی کی وفات (۱۲۵۰ء) اور اُس کے چند سال بعد (۱۲۶۸ء) میں اُس کے خاندان کے خاتمے

پر شاہنشاہی اقتدار کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ آوی نیوں میں پوپ کی "بابلی قید" (۱۳۰۹ء تا ۱۳۷۶ء) نے اسقفی طاقت کو بالکل کمزور کردیا۔ شہر ضلعے اور صوبے خود مختار بن بیٹھے اُنہوں نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کریں اور شوکت کے حصول اور قلمرو کی وسعت کو انہوں نے اپنا مطمح نظر بنالیا۔

زمانہ وسطیٰ کے اواخر کی اطالوی شہری ریاستوں میں فلارنس خاص طور پر ممتاز تھا جس کا عہدِ خود مختاری ۱۲۶۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ اُس نے ایک ترقی یافتہ جمہوری دستور اختیار کیا دور دور تجارت چلائی اور لین دین کا ایک وسیع نظام قائم کیا اور اپنی روز افزوں دولت کو فنون وادب کی ترقی میں صرف کیا۔ بالخصوص جب (۱۴۳۴ء میں) میڈیسی کا خاندان برسرِ اقتدار ہوا تو شائستگی اور "انسانیت" میں فلارنس کا نظیر دنیا بھر میں موجود نہ تھا۔

عثمانی ترکوں کی آمد۔ فلارنسی نشاۃ الثانیہ کی ایک خصوصیت یونانی علوم کے مطالعہ کا جدید شوق تھا۔ اگر پوچھا جائے کہ اطالیہ میں یونانی علوم کے لئے اس اشتیاق کی بنیاد کس نے ڈالی تو ایک جواب جو بظاہر کچھ خیالی سا معلوم ہوتا ہے یہ ہوگا کہ "چنگیز خاں نے" اور اس جواب کی صحت کا ثبوت حسبِ ذیل ہے:۔

جب چنگیز خاں بالکش اور ارال کی جھیلوں کے درمیانی علاقے کے خانہ بدوشوں پر سکہ بٹھا رہا تھا تو اُن میں کچھ (عثمانی ترکوں کے آباو اجداد) ایسے تھے جنہوں نے اس کا لوہا ماننے سے انکار کردیا۔ اس لئے وہ اُس کی فوجوں کے آگے آگے بھاگ نکلے اور سیحون کو عبور کرکے بہت سی آوارہ گردی اور جنگ و جدل کے بعد ایشیائے کوچک میں پہنچے جہاں سلجوقیوں نے انہیں ۱۲۵۰ء کے قریب بحیرۂ مارموار کے ساحل پر آباد ہونے کی اجازت دے دی۔ ۱۳۰۱ء میں انہوں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا اور وہ اپنی فوجی قوت کو خوب بڑھانے لگے۔ اسلام قبول کرکے ایشیائے کوچک میں اپنی قلمرو کو چاروں طرف وسعت دینے کے بعد ۱۳۵۸ء میں وہ سمندر پار کرکے یورپ میں جادھمکے اور انہوں نے زوال پذیر بازنطینی سلطنت سے گیلی پولی کا جزیرہ نما چھین لیا۔ تین سال بعد انہوں نے ایڈریانوپل پر قبضہ کرکے اُسے اپنا دارالسلطنت بنالیا جس سے اُن کا یورپ میں ایک سلطنت قائم کرنے کا ارادہ ظاہر ہوگیا (۱۳۶۱ء)۔ اس بے باکانہ خطرناک کارروائی سے خائف ہوکر اُن کے خلاف یکے بعد دیگرے تین یورپی اتحاد ہوئے لیکن ماٹزا (۱۳۶۴ء) کوسوو (۱۳۸۹ء) اور نکوپولس (۱۳۹۶ء) کی تینوں لڑائیوں میں انہوں نے اپنے مخالفین کے دھوئیں بکھیر دیئے اور قسطنطنیہ کی تسخیر کی تیاریاں شروع کردیں۔ ۱۴۰۰ء میں انہوں نے اس عظیم الشان شہر کے گرد محاصرہ ڈال دیا لیکن غیر متوقع حالات نے انہیں محاصرہ چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ دوسری دفعہ ۱۴۲۲ء میں انہوں نے پھر کوشش کی لیکن بے سود۔ آخر ۱۴۵۳ء میں یہ پُرعظمت شہر جسے سب سے پہلے عیسائی شہنشاہ نے گیارہ سو سال قبل مغربی تمدن کو اس کے

ایشیائی دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے لئے بنایا تھا ترکوں کے آگے سرنگوں ہو گیا۔

بازنطینی سلطنت کی اس لمبی نزع (۱۳۵۸ء تا ۱۴۵۳ء) کے اطالیہ پر بلحاظ تمدّن دو جداگانہ اثر ہوئے۔ جوں جوں عثمانی شہر کے بعد شہر فتح کرتے اور آخر قسطنطنیہ کے قریب ہوتے گئے یونانی علما اور تاجر اپنے ساتھ اپنے علمی خزانے لئے ہوئے جنوبی اطالوی علاقے میں جاجا کر آباد ہونے لگے جہاں ابھی اُن کی زبان بولی جاتی تھی + ساتھ ہی قریب المرگ بازنطینی سلطنت اور یونانی کلیسا نے مغربی عیسائیت سے امداد طلب کی اور ایک نئی صلیبی جنگ کے لئے اپنی آوازیں بلند کیں + یہاں تک کہ ۱۴۳۹-۱۴۳۸ء میں شاہنشاہ اور صدر اسقف دونوں اطالیہ کو سدھارے اور وہاں فلارنس میں جاکر پوپ کے آگے اپنی اطاعت و فرمانبرداری کا اظہار کیا اور یونانی و لاطینی فرقوں میں اتحاد قائم کر لیا + یہ اتحاد دیر تک قائم نہ رہا اور نہ اس سے قسطنطنیہ ہی بچ سکا لیکن اس سے اطالیہ میں یونانی علوم کی ترویج کی تحریک کو بے انتہا تقویت ملی + ترکوں کے اس مشہور شہر کو سخر کرنے سے بہت عرصہ پیشتر پاپاؤں اور کلیسائی عمائدوں شہزادوں اور بڑے بڑے تاجروں کے کارندوں نے قسطنطنیہ کے ایک ایک کتب خانے کو جاکر ٹٹولا اور وہاں سے قدیمی دنیا کے تمام علمی و ادبی خزانے لاکر مغرب میں جابجا بکھیر دیئے +

تحریکِ معقولات۔ قدیم علوم کے اس نشاۃ الثانیہ کا اثر چودھویں صدی کے آخر سے پہلے فلارنس میں خاص طور پر محسوس ہوا۔ پٹرارک (۱۳۰۴ء تا ۱۳۷۴ء) نے تعلیمی نصاب کو عہدِ وسطیٰ کی بربریت سے پاک و صاف کیا اور رومی علمِ ادب کے بہترین نمونوں کے مطالعہ کی طرف توجہ دلائی + بوکاچیو (۱۳۱۳ء تا ۱۳۷۵ء) نے یونانی ذخیرے میں تحقیق و تفحص سے کام لیا اُس نے جنوبی اطالیہ کے ایک پناہ گزین سے یونانی زبان سیکھ کر عیسائیت سے قبل کی دنیا کے کبھی کے بھولے ہوئے خیالات کی اشاعت کی + ۱۳۹۶ء میں جنوبی اطالیہ کا ایک اور یونانی کرسولوس فلارنس میں لایا گیا جہاں ہر طبقے اور ہر پیشے کے لوگ بخوشی اس سے تحصیلِ علوم کرنے لگے تاکہ وہ بھی اس "جدید" علم کے مخفی خزانوں پر دسترس پاسکیں +

اگر ہم یہ سوال کریں کہ یونانی زبان کے مطالعہ کے لئے کیوں اس قدر جوش بھرا شوق جتنا کہ اب بھی پیدا نہیں ہوتا قسم قسم کے لوگوں کے دل میں یوں موجزن ہو گیا کہ وہ بغیر فرہنگ و لغت یا صرف و نحو یا تفسیروں کی مدد کے اپنی ساری عمریں اور اپنا سارا مال و متاع صرف اس غرض سے صرف کرنے کے لئے تیار ہو گئے کہ وہ کسی طرح افلاطون اور ارسطو ہومر اور ہیروڈوٹس ایسکیلس و ریوری پیڈیز کی اصلی تصانیف کا مطالعہ کر سکیں تو اس کا جواب دینا کچھ دشوار نہیں + یونانیوں کی زندگی کا نصب العین زمانہ وسطیٰ کے خیالات سے قطعی مختلف تھا۔

قدیمی علوم کی نشاۃ الثانیہ گویا انسان کی حقیقت کا مکرر انکشاف تھا + زمانہ متوسط کے ماہرانِ دینیات نے زوال آمادہ یونانی و رومی تمدن کی دنائت و خباثت سے بیزار ہو کر اور ایرانی مذاہب کی ثنویت اور شام و مصر کی رہبانیت سے متاثر ہو کر دنیا کو برائی سے لبریز اور انسانی فطرت کو قطعی شیطانی قرار دیا تھا۔ اُن کی تعلیم تھی کہ حقیقی زندگی کا تقاضا ہے کہ انسان خودی کو ترک کر دے اور اپنے نفس کو ریاضت روزے اور کفارے اور عزلتِ تاہل اور خانقاہ نشینی سے روحانی ربط و ضبط سکھائے + یونانیوں کے لئے زندگی کا ماحصل اس کے عین برعکس تھا + انہوں نے بہ صراحت نہیں لیکن عملاً اسی امر کی تلقین کی کہ زندگی کا مدعا خودی کا پہچاننا ہے اور فرائض کی انجام دہی بخوبی اُسی وقت ہو سکتی ہے جب جسم و نفس کی ہر قوت اور فعلیت کو مکمل طور پر عمل میں لا کر پوری ترقی دی جائے + اُن کا خیال تھا کہ دنیا و انسان ہی میں خیر اولیٰ مضمر ہے اور آئینِ فطرت انسانی عادات و اطوار کے لئے بہترین رہنما ہے + اطالیہ کی "تجدید معقولات" صریحاً پھر کفر کی طرف ایک مراجعت تھی!

فنون و طبیعیات کی از سرِ نو پیدائش - نشاۃ الثانیہ کی تحریک محض یونان و روما کی قدامت کی طرف عود کرنے پر ختم نہ ہو گئی کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ محض ایک قدامت پرست بے جان سی تحریک ہو جاتی + کلیسا سے ایک زیادہ قدیمی دنیا کا انکشاف ایسے نفوس کو جنہیں تعلیم وسطیٰ نے سنوارا اور آزادی کے لئے ابھارا تھا جدید مخترع مساعی کے لئے آمادہ کر رہا تھا + علوم سہ گانہ نے علمیت کی بنیاد رکھ دی تھی "علوم چہارگانہ" نے طبیعیات کی تھوڑی سی عمارت اس پر کھڑی کرنی شروع کی۔ دینیات نے مابعد الطبیعیات کے دقیق نکات میں کچھ مشق کرنی سکھائی۔ قانون نے ذہنی عجلت کا سبق دیا۔ درسی فلسفے نے عقلی ریاضت کا ایک نصاب مہیا کیا جس کی لپیٹ میں سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنا دشوار ہو گیا + قصہ کوتاہ یہ کہ شمالی بربریوں کی شاگردی کا وقت ختم ہو رہا تھا اور لاطینی تفوق کا زمانہ انجام کو پہنچ رہا تھا + دنیا کا نفس اپنے اسقفی استادوں کی بندش توڑ رہا تھا اور اب وہ دنیا کو اپنی ہی متجسس اور ثنا خواں آنکھوں سے دیکھنے لگا تھا + فنون و طبیعیات کے حلقوں میں انسان پھر اُس مقام سے آگے ترقی کرنے لگا جہاں یونانی سنِ عیسوی سے پہلے پہنچ چکے تھے +

اپنی حیرت انگیز طرزِ تعمیر کے علاوہ فنِ وسطیٰ محض دہقانی سا تھا + اُس کی سنگ تراشی ابتدائی حالت میں تھی اُس کی نقاشی مضحکہ خیز تھی جس میں نہ منظریت تھی نہ پس منظر۔ نہ روشنی و سایہ کا امتیاز نہ جسمانی ساخت کی طرف توجہ اور نہ فطرت حرکت یا قوت کا کچھ خیال + فنی نشاۃ الثانیہ تیرھویں صدی کے فرانسسکنوں کے ساتھ شروع ہوئی جو قطعی طور پر فطرت پرست اور ملحدانہ نقطۂ خیال سے زندگی کو دیکھتے تھے + علی الخصوص اُن مشہور دیواری تصویروں نے جو جیوٹو (۱۲۶۶ء تا ۱۳۳۷ء) نے آسیسی کے گرجا کی دیواروں پر بنائیں عہدِ وسطیٰ کے لوگوں کے سامنے دنیا کی خوبصورتیاں اور انسان کی حقیقتیں کھول کر رکھ

دیں۔ فطرت کی طرف یہ فنی عود خاص طور پر فرا انجیلیکو (۱۳۸۷ء تا ۱۴۵۵ء) فرا لیپو لیپو (۱۴۰۶ء تا ۱۴۶۹ء) اور بوتی سیلی (۱۴۴۴ء تا ۱۵۱۰ء) کے کام میں رونما ہؤا لیکن اس کی بہترین شکل فنی لحاظ سے مکمل ہو کر لینا دو وادنسی (۱۴۵۲ء تا ۱۵۱۹ء) جو دنیا کی عظیم ترین ہستیوں میں شمار ہوتا ہے، مائیکیل انجیلو (۱۴۷۵ء تا ۱۵۶۴ء) اور رافیل (۱۴۸۳ء تا ۱۵۲۰ء) کی اختراعات فائقہ میں پرتو افگن ہے!

سولہویں صدی کے طبیعیاتی احیا کو یونانی عہد کے مشہور اسکندری علم موالید کے ماہرین کی تصنیفات کے انکشاف سے نمایاں ترقی ہوئی بالخصوص جب فن طباعت کی نشوونما نے ان تصنیفات کی اشاعت خاص و عام میں ممکن کر دی + ٹولمی کی ہیئت نے کوپرنیکس (۱۴۷۳ء تا ۱۵۴۳ء) کے دل میں شوقِ علم کی وہ گدگدی پیدا کی کہ اُس نے بالآخر نظامِ شمسی کی درست ساخت کا پتہ لگا لیا + اسی طرح قدیم جغرافیہ داں ایرے ٹاستھنیز کی کتاب کی طباعت سے ٹوسکنیلی کو ترغیب ہوئی کہ وہ اپنا مشہور نقشۂ دنیا مرتب کرے (۱۴۷۴ء) اور پھر کولمبس کو اپنے شہرۂ آفاق بحری سفر کرنے کا خیال پیدا ہؤا۔

۲۴
جغرافی انکشافات کا زمانہ

جغرافی انکشافات میں تاخیر کی وجہ۔ جب ۱۴۹۲ء میں کولمبس نے نا دریافت شدہ بحرِ اوقیانوس کے پار اپنا سفر کرنے کا تہیہ کیا اُس وقت مغرب کے رہنے والوں کو صرف دنیا کے ایک تہائی حصے کا علم تھا + امریکہ اور آسٹریلیا سے آگاہی نہ رہی تھی قطبِ شمالی و جنوبی کے برِاعظموں تک ابھی کسی کی رسائی نہ ہوئی تھی وسط و جنوبی امریکہ کا بھی سوائے ساحل کے کسی کو علم نہ تھا اور یہ بھی محض پرتگالیوں کی گذشتہ ساٹھ سال کی مساعی کا نتیجہ تھا +

اگر ہم پوچھیں کہ کیا وجہ ہے کہ اتنی مدت تک بحرِ متوسط کے تمدن والوں کو دنیا کے ایسے ایسے وسیع حصوں کا علم تک نہ تھا تو جواب یہ ہوگا کہ اول تو باوجود قبلِ مسیح کے اسکندری جغرافیہ دانوں کے انکشافات کے زمین کی شکل کے متعلق ابھی تک غلط خیالات رائج تھے۔ عام خیال تھا کہ زمین چپٹی طشتری کی طرح کا ایک دائرہ ہے جس کا مرکز کہیں مشرقی بحرِ متوسط میں ہے۔ اس لئے بحرِ اوقیانوس کی نسبت خیال تھا کہ وہ ایک بحری رودبار ہے جو آباد حصۂ زمین کی آخری حدود کو گھیرے ہوئے ہے اور جس سے پرے اژدہاؤں، ڈائنوں اور چھلاووں اور خوفناک اوہام کا مسکن ہے + دوسری وجہ یہ تھی کہ قدیم اور

متوسط زمانہ کے جہاز سمندروں کے بڑے بڑے اسفار کے قابل نہ تھے، چھوٹے اور بے مستول جہاز جو محض چپوؤں سے چلتے تھے اور جن میں زیادہ سامانِ خورد و نوش بھی نہ لے جایا جا سکتا تھا۔ بحر زخار کی مسلسل تکالیف و مصائب کے لئے قطعی ناموزوں تھے، تیسرے بحری اسفار کے آلات رہنمائی قابلِ اطمینان نہ تھے۔ کمپاس۔ سدس۔ اور ساعتِ فلکیہ کے نہ ہوتے ہوئے ملاح خشکی سے زیادہ دُور جاتا ڈرتا تھا، بحری اسفار زیادہ تر ساحلی اسفار ہوتے تھے۔ اگر ایک جہاز دُور سمندر میں چلا جاتا تو بجز اجرامِ فلکی کے اُن کا کوئی رہنما نہ تھا اور پھر اگر طوفانِ باد و باراں اُسے آلیتا تو کسی بندرگاہ تک پہنچ سکنا بھی اُس کے لئے اک امرِ محال ہو جاتا، آخری وجہ یہ تھی کہ قدیمی اور وسطی زمانہ کے لوگوں کی مصروفیتیں بہت تھیں۔ اُنہیں خیالی جمہول کے لئے مہلت نہ ملتی تھی، اُن کے وسائل تھوڑے اور اُن کی زندگی اپنے بے شمار دشمنوں کے خلاف لڑنے بھڑنے میں گذر جاتی تھی، اور جب کبھی انہیں امن و حفاظت کے درمیانی وقفے نصیب ہو جاتے تو وہ پرانی طے شدہ تجارتی راہوں سے آنا جانا ہی غنیمت سمجھتے، غرض ان سب وجوہ کی بنا پر بحرِ متوسط کی قومیں گھر بار سے زیادہ دور آوارہ گردی کو تضیع اوقات سمجھتی تھیں۔

پندرھویں صدی کے نئے حالات۔ پندرھویں صدی تک حالات میں معتد بہ تغیر پیدا ہو گیا، چنگیز خاں اور اُس کے جانشینوں کے منگولی حملوں سے تجارتِ وسطیٰ کو صدمہ پہنچا۔ کچھ نئے رستے کھل گئے لیکن پرانی راہیں بند ہو گئیں، یہ درست ہے کہ قوبلائی خاقان کی سلطنت کا اُس کی وفات (۱۲۹۴ء) کے بعد خاتمہ ہو گیا لیکن اُس کے مختلف حصص میں تقسیم ہو جانے سے تجارت کی وہ حالت بھی نہ رہی جو قیامِ سلطنت کے دنوں میں تھی، بالخصوص اُس کے اُس حصے نے جس میں ترکستان شامل تھا اور جس کا دارالسلطنت سمرقند تھا تیمور لنگ (۱۳۳۶ء تا ۱۴۰۵ء) کے زمانہ میں مغربی دنیا کے لئے نہایت خطرناک صورت اختیار کر لی،

اور تاتاریوں کے علاوہ ترکوں سے یورپ اور بھی زیادہ خوف زدہ تھا، بحیرۂ لیوانت کے سارے رستوں پر اُن کا قبضہ ہو گیا، بتدریج تجارت کے سارے بڑے بڑے مرکز، قسطنطنیہ طرابزون انطاکیہ سکندریہ اُن کی قلمرو میں شامل ہو گئے۔ اور انہوں نے تجارت پر محصول عائد کرنے شروع کر دیئے، عیسائی دنیا کے لئے یہ امر لابدی ہو گیا کہ وہ اپنی اُس نہایت اہم و نفع رساں تجارت کے لئے جو ایران ہندوستان ملایا اور چین سے ہوا کرتی تھی نئے رستے تلاش کرے،

پندرھویں صدی تک اس تلاش کے لئے سامان بہم پہنچ گیا، ایک تو اسکندری جغرافیہ دانوں (بالخصوص ایرےیس کی تصنیف جس کی کتاب ۱۴۵۲ء میں چھپی) کی تصنیفات کی اشاعت سے زمین کی اصلی شکل کا راز کھلا اور یہ ظاہر ہوا کہ ایشیا میں ایک مغربی رستے سے جا پہنچنا ممکن ضرور ہے، دوسرے بالخصوص وینس اور جنوا کے امیر کبیر تاجروں کی کوششوں سے جہاز

نہایت اعلیٰ درجے کے بننے لگے۔ یہ جہاز زیادہ بڑے تھے ان پر مستول بنائے جاتے تھے وہ بخوبی مسلح تھے اور ان میں سے بعض کُلّاً یا جزءً بادبان کے ذریعے سے چلتے تھے + تیسرے کمپاس کو جس کا علم مغرب کو عربوں اور تاتاریوں کے ذریعے سے ہوا اطالویوں نے ایک نہایت قابلِ اعتبار آلۂ جہازرانی بنا دیا + چوتھے سدس اور ساعتِ فلکیہ کی ترقی و عمدگی کے باعث مشاہدہ کرنے والے کے لئے عرض البلد اور طول البلد کا دریافت کرنا آسان کام ہو گیا + پھر ایک اور بات یہ بھی تھی کہ یورپ میں قومی حکومتوں کے قیام سے انکشاف و دریافت کی بحری مہمات کے لئے پُر ہوس بادشاہوں اور متمول تاجروں کی مالی امداد حاصل ہو گئی +

علمبرداران انکشاف ۔ انکشافی مہمیں پہلے پہل پرتگالیوں نے شروع کیں + علی الخصوص ہنری "ملاح" بادشاہ جون اول کا بیٹا اور انگریزی جون آف گانٹ کا پوتا ایک بڑا بحری سیاح تھا + اس کے کام کی ابتداء یوں ہوئی کہ وہ افریقہ کے باشندوں میں سلطنتِ مسیح کو وسعت دینے کا بے حد تمنائی تھا لیکن اس کام میں ہندوستان کو ایک نئے رستے سے پہنچنے کی سبیل بھی نکل آئی + وہ زیادہ تر مہموں کا تلاش کرنے والا تھا خود "ملاح" نہ تھا لیکن جہاز جو اُس نے تیار کر کے روانہ کئے ۱۴۴۵ء میں راس ورڈ تک اور اس کی وفات کے سال (۱۴۶۰ء) میں راس ورڈ کے جزائر تک جا پہنچے۔ بعد میں پرتگالی مکتشفین ۱۴۸۴ء میں کانگو کے دہانے تک اور ۱۴۸۶ء میں راس امید تک پہنچ گئے + اس کے بارہ سال بعد ۱۴۹۸ء میں واسکو ڈی گاما نے جس کا نام صفحۂ تاریخ پر ہمیشہ ثبت رہے گا راس امید سے لے کر ممباسا تک ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہاں سے سیدھے مشرق کی طرف نامعلوم سمندر کے پار ہندوستان (کالی کٹ) کا رخ کیا + دو سال بعد ایک اور پرتگالی ملاح جس کا ارادہ راس امید کے گرد ہو کر ہندوستان پہنچنے کا تھا اپنے مجوزہ رستے سے بھٹک کر بے جانے بوجھے برازیل کے ساحل پر جا پہنچا اور اس سرزمین پر اُس نے اپنے بادشاہ کا حق قائم کر دیا۔ (۱۵۰۰ء)

لیکن اس سن سے پہلے سپین انکشافات کے سمندر میں اپنے جہاز ڈال چکا تھا اور نئی دنیا میں ایک اپنا دائرۂ اثر قائم کر رہا تھا + پہلے کرسٹوفر کولمبس کے متعلق خیال تھا کہ اولیت کا سہرا اُس کے سر ہے لیکن حال کے انکشافات نے اُس کی شہرت کو کم کر دیا ہے اور اولیت کی عزت دوسروں کو بخشی ہے + بہرحال اُس نے بحرِ اوقیانوس کے پار چار بحری سفر کئے جو تاریخ دنیا میں ہمیشہ یادگار رہیں گے کہ انہیں بحری اسفار کی وجہ سے بحرِ متوسط کی فوقیت کا خاتمہ ہو گیا + اس نے متمدن دنیا کا مرکزِ ثقل ہٹا کر اوقیانوس میں جما دیا جس سے سپین فرانس ہالینڈ اور انگلستان کے لئے دولت و قوت کے راستے کھل گئے + ۱۴۹۲ء میں خطا پہنچنے کا ارادہ کرتے ہوئے وہ بہاما پہنچ گیا + ۱۴۹۳ء میں وہ ہیٹی پہنچا + ۱۴۹۸ء میں وہ ٹرنیڈیڈ پہنچا اور اُس نے جنوبی امریکہ کے ساحل کی بھی ایک جھلک دیکھ پائی۔ آخر میں ۱۵۰۲ء میں وہ پاناما کے قریب برِ اعظم کی سرزمین پر جا پہنچا لیکن اس کے آئندہ سال وہ بغیر

یہ جانے کہ اُس نے ایک نئے برِاعظم کے ڈھونڈ پانے کی حیرت انگیز دریافت کر لی ہے مر گیا + سب سے پہلا شخص جس نے یہ تحیر خیز بات سمجھی امیریگو ویسپوچی تھا جو کولمبس کا ایک ہمعصر تھا + اسی لئے کولمبس کو چھوڑ کر اُس کے نام پر نئے براعظم کا نام امریکہ رکھا گیا +

نئی دنیا ۔ دونوں نومعلوم شدہ براعظموں پر پہلا بحری انکشاف کرنے والی قوموں پرتگالیوں اور سپینیوں نے اپنا حق جمالیا + ایک پاپائی منشور میں اس دعوے کو تسلیم کیا گیا (۱۴۹۳ء) اور معاہدہ ٹورڈیسلاس (۱۴۹۴ء) کے ذریعے سے دونوں مملکتوں نے اپنے اپنے دوائر اثر و حکومت کو متعین کر لیا + ۴۶ درجہ مغربی طول البلد کے قریب ایک خط شمالاً جنوباً قائم کیا گیا جس سے جنوبی امریکہ میں برازیل باقی ماندہ حصص سے علیحدہ ہو گیا ۔ خطِ متعینہ کے مشرق کی طرف کی دنیا پرتگال والوں کو دی گئی اور مغربی سپینیوں کو +

پرتگالی چونکہ زیادہ تر ہندی تجارت میں منہمک رہے اس لئے وہ اپنے برازیلی مقبوضات سے کچھ فائدہ نہ اُٹھا سکے لیکن سپینیوں نے بڑے جوش و خروش اور بے انتہا ظلم و ستم سے اُن وسیع قطعات کو مسخر و آباد کرنا شروع کیا جو اُن کے حصے میں آئے ہرنینڈو کورٹز (۱۵۱۹ء تا ۱۵۲۱ء) کی فتح میکسیکو اور پزارو برادران کی تسخیر پیرو (۱۵۳۱ء تا ۱۵۳۲ء) کے حالات الف لیلہ کے قصے معلوم ہوتے ہیں بجز اس کے کہ ان لوگوں کے جور و ظلم اور شیطنت کی مثال شاید بھوتوں بریتوں کے ہاں بھی مشکل سے ملے گی + سخت مقامِ افسوس ہے کہ یہ فتوحات اُن لوگوں نے انجام دیں جو جاہل متعصب خونخوار اور زر پرست تھے + کیونکہ میکسیکو اور پیرو در اصل ایک قدیمی عجیب و غریب تمدن کے گہوارے تھے جو اُس نام نہاد "حجری شمسی" تمدن سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا جو مسیح سے ہزاروں سال پہلے بحرِ متوسط کی دنیا میں قائم تھا + اُن خیالات و ادارت کی جھلک دیکھ پانے کا جو عیسائی خیالات و ادارات سے قطعی مختلف تھے یہ ایک نادر موقع تھا + یہ موقع ہمیشہ کے لئے جاتا رہا کیونکہ ان وحشی حملہ آوروں کو صرف اپنی لوٹ مار اور قتل و غارت کا خیال تھا اور بس!

تقریباً ایک صدی تک پرتگالی اور سپینی اقتدار ان نومعلوم شدہ ملکوں اور سمندروں میں بے کھٹکے قائم رہا + لیکن سولھویں صدی کے اخیر میں ڈچ فرانسیسی اور انگریز جہازران مداخلت کرنے لگے + ان میں سے بعض بالخصوص نیوفاونڈلینڈ کے قرب و جوار میں ماہی گیر بن کر گئے ۔ بعض مکتشفین بن کر چلے کہ بحرِ منجمد شمالی کے رستے سے ہندوستان اور خطا کا کوئی نیا راستہ نکالیں ۔ بعض تاجر تھے جن کا مدعا سپینی اور پرتگالی نوآبادیوں سے تجارتی تعلقات استوار کرنا تھا ۔ بعض لٹیرے اور قزاق تھے اور بعض نوآباد تھے جو سمندر پار نئی بستیاں بسانے کے خواہاں تھے +

ڈچ اور انگریز جہازرانوں کے سپینی جہازوں پر حملہ کر کے انہیں لوٹنے اور ڈچ اور انگریزی نوآبادوں کے اوقیانوس پار آباد ہونے کی خواہش کی ایک وجہ سولھویں صدی کا وہ مذہبی انقلاب تھا جو اس وقت یورپ میں برپا تھا + عظیم الشان مذہبی اصلاح کی تحریک کا دور دورہ ہو چکا تھا +

۲۵

اصلاحِ مذہبی

کلیسا کی شکست و ریخت ۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ چودھویں صدی میں عیسائیت وسطیٰ میں انتشار کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ پوپ بونی فیس ہشتم نے جو صدی کے شروع میں پاپائی تخت پر جلوہ آرا تھا ایک عالمگیر اقتدار حاصل کرنے کے لئے ایسے دینی و دنیوی دعاوی پیش کئے جو اُس کے کسی پیشرو نے نہ کئے تھے + علاوہ بریں اُس عظیم الشان جشن کے موقع پر جو اُس نے ۱۳۰۰ء میں روما میں منعقد کیا نہ صرف اُس کی اپنی طاقت اپنے انتہائی نقطے پر پہنچی ہوئی معلوم ہوتی تھی بلکہ عیسائیت کا اتحاد و یک جہتی اُن متقی زائرین کے کثیر مجمع میں ظہور پذیر تھی جو ملک ملک سے اس اجتماعِ مذہبی میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے + لیکن اس دکھلاوے سے اصلیت ظاہر نہ ہوتی تھی + عین اس جشن کے وقت انگلستان و فرانس کے بادشاہ پاپائی احکام کی گستاخی اور کامیابی کے ساتھ نافرمانی کر رہے تھے اور اس میں اُن کی قومیں اُن کی موید تھیں + حقیقت یہ ہے کہ عیسائیت کو قومیت کا نیا تیزاب تحلیل کر رہا تھا + یہ بات دنیا کے سامنے اظہر من الشمس ہو گئی جب فرانسیسی بادشاہ کے کارندوں نے بونی فیس کی طاقت کا باوجود اس کے سارے رعب و داب کے انگنی کے مقام پر خاتمہ کر دیا۔

پاپائیت کی بابلی قید سے جو اس کے بعد ۱۳۰۹ء سے ۱۳۷۶ء تک جاری رہی کلیسا کے فرمانرواؤں کی عالمگیری اور نصفت پسندی کی نسبت لوگوں کا یقین کمزور پڑ گیا + پوپ جو بمقام آوینیوں مقیم رہے تمام فرانسیسی تھے + کارڈنیلوں کی انجمن سب انہیں کے ہم قوموں کی تھی اور اسقفی حکمت عملی ہمیشہ فرانس کی طرف مائل تھی +

انگلستان جو اس وقت فرانس کے خلاف جنگِ صد سالہ میں برسرِ پیکار تھا بیزار ہو گیا ۔ اور اُس نے پہلے سالانہ خراج کے بند کر دینے سے (۱۳۳۴ء) اور پھر "انتہاہ" و "وسائل" کے مسوداتِ قانون منظور کرنے سے (۱۳۵۱ء و ۱۳۵۳ء) پوپ کے خلاف اپنے غصہ و رنجش کا اظہار کیا + جرمنی اس سے بھی زیادہ کھلے طور پر رنجیدہ ہو گیا ۔ بویریا کی شاہنشاہ لوئی اور پوپ جون بیست و دوم کے درمیان علانیہ عداوت تھی ۔ اس کا نتیجہ زمانۂ وسطیٰ کی ایک فرانسیسی جرمن جنگ میں ظاہر ہوا جس میں دونوں طرف رنج وکدورت کی تندیاں اور بے معنی سیاسی نظریات کی نمائش ہوئی + اطالیہ بھی پاپائیت کے رعب و داب اور فوائد سے بیگانہ ہو کر باغی ہو گیا ۔ چنانچہ تھوڑی ہی مدت کے لئے ریئنزی کے تحت میں روما کی جمہوریہ کا اعلان کیا گیا (۱۳۴۷ء تا ۱۳۵۴ء) + اطالیہ جرمنی اور انگلستان کے اس رویے کا آخر یہ اثر ہوا کہ پاپائیت پھر روما میں منتقل ہو گئی (۱۳۷۶ء) + اس کا فوری نتیجہ کلیسا کا افتراقِ عظیم تھا (۱۳۷۸ء تا ۱۴۱۷ء) جس میں اوینیوں اور روما کے دو حریف مخالف پوپوں اور اُن کے ساتھ مخالف مذہبی

انجمنوں مخالف مذہبی عمائدین سے عیسائی دنیا کی قومیں کچھ عرصے کے لئے تباہ کن خانہ جنگیوں میں مصروف ہوگئیں۔

جرمنی میں اصلاحِ مذہبی ۔ پندرھویں صدی میں امکانی کوششیں ہوئیں کہ کسی طرح یہ مہلک افتراق رفع ہو کلیسا کے سرکردہ اوراس کے متعلقین میں اصلاح ہو اور وہ متعدد لا مذہب فرقے مٹا دیئے جائیں جو اس بے اطمینانی کے وقت میں جابجا پیدا ہو رہے تھے ۔ کونسٹینس کی بڑی مذہبی انجمن (۱۴۱۵ء تا ۱۴۱۸ء) کی سعی سے کلیسا ایک نئے پوپ مارٹن پنجم کے تحت میں ظاہرہ طور پر متحد ہوگیا لیکن اُس نے اُس وقت کی شرمناک خرابیوں کے دور کرنے کی طرف کچھ توجہ نہ کی اور اگرچہ اُس نے مشہور ملحد جون ہس کو جلوا دیا لیکن الحاد کا عام طور پر قلع قمع کرنے کی اُس نے کوئی سود مند ترکیب نہ سوچی ۔

پوپ روما میں واپس آکر پھر اُسی طرح شہر اور جزیرہ نما کی سیاسی انجمنوں میں پڑ گئے ۔ اُن کا درجہ اطالوی شہزادوں کا سا ہوگیا اور پرہیزگاری یا نیک خصالی میں وہ نشاۃ الثانیہ کے اُن "نئے کافروں" سے کچھ بہتر نہ تھے جن کا کچھ عرصہ سے بول بالا ہو رہا تھا ۔ وہ کھوئی ہوئی پاپائی ریاست کو پھر حاصل کرنے اور بڑھانے میں مصروف رہتے ۔ وہ اپنے بھتیجوں کے لئے جو اکثر اُن کے اپنے بیٹے ہوتے تھے ریاستیں اور متمول لڑکیاں ڈھونڈتے رہتے ۔ وہ جتھے بناتے اور لڑائیاں کرتے ۔ اور بعض اوقات بذاتِ خود زرہ پہن کر میدانِ جنگ میں شریک ہوتے ۔ وہ نئے عہد کے علما اور نقاشوں کی حوصلہ افزائی کرتے اور اُن کے شرمناک فسق و فجور اور مسیحیت پر اُن کے علانیہ حملوں پر مسکراتے ۔ روما کو انہوں نے از سرِ نو تعمیر و آراستہ کیا اور اپنے اس شوق کو پورا کرنے میں انہوں نے ملک ملک کے دین دار عیسائیوں سے نذرانے وصول کئے ۔

۱۵۰۶ء میں پوپ جولیس دوم نے جو فنون کا ایک بلند حوصلہ مربی تھا سینٹ پیٹر کے عظیم الشان گرجا کی بنیاد رکھی ۔ برامانت اُس کا میرِ عمارت اور مائیکیل انجیلو اور رافیل اُس کے آراستہ کرنے والے تھے ۔ جولیس دوم کی وفات کے بعد لیو دہم نے (جو مشہور فلارنسی مدیسی خاندان کا ایک رکن تھا) تعمیر کا کام جاری رکھا ۔ اس کے بے انتہا مصارف کے لئے عیسائی دنیا کے طول و عرض میں چندوں کے لئے خاص طور پر کوششیں کی گئیں اور اس مطلب کے لئے مراعات کی فروخت کا سلسلہ جس سے گناہوں کی سزا معاف ہو جاتی تھی جاری کیا گیا۔

جرمنی میں جہاں پہلے سے بے چینی پھیلی ہوئی تھی مراعات کی فروخت سے علانیہ بغاوت ہوگئی ۔ ۱۵۱۷ء میں مارٹن لوتھر نے جو ایک آگسٹینی راہب اور وٹن برگ کے دار العلوم کا ایک پروفیسر تھا مراعات کے سارے نظریہ کو اپنے پچانوے نظریات سے لغو و بے معنی ثابت کردیا ۔ اس مبارز طلبی کا نتیجہ وہ ہوا جس نے دنیا کو اور خود اُسے بھی حیرت میں ڈال دیا ۔ ساری کی ساری جرمن قوم جوش و خروش سے اُس کی اعانت کو اُٹھ کھڑی ہوئی ۔ پاپائیت نے اُسے کلیسا سے خارج کرا دیا (۱۵۲۰ء) اور حکومت نے حکمِ امتناعی جاری کیا (۱۵۲۱ء) لیکن یہ سب مساعی بے کار گئیں ۔

جرمنی کا بیشتر حصہ لُوتھر کے ساتھ پرٹسٹنٹیّت کا دلدادہ ہوگیا۔ جرمن پرٹسٹنٹیّت ایک بغاوت تھی ٹیوٹن قوموں کی لاطینی قوموں کے اقتدار کے خلاف۔ دنیا داروں کے نفس کا بلوہ مذہبی حکومت کے خلاف۔ کفایت شعار کی صدلئے احتجاج بے پروا اسراف کے خلاف عقلِ آزاد کا رنج وغصہ احتسابی ظلم و تعدی پر۔ فردِ بشر کی برگشتگی ایک بندشیں عائد کرنے والی ملت سے۔ اور سب سے بڑھ کر ایک پابندِ اخلاق قوم کا ردِعمل ایک ایسے دستور یعنی فروختِ مزاعات کے خلاف جس کی آڑ میں بآسانی بیسیوں شرمناک کارروائیاں ہوسکتی تھیں۔

"اصلاح" کا دور دورہ۔ جرمنی میں اصلاحی جدوجہد کا خاتمہ آگزبرگ کے صلح نامہ پر (۱۵۵۵ء) ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی دو حصوں پر اٹسٹنٹ حصہ شمال اور کیتھلک حصہ جنوب میں منقسم ہوگیا۔ یہ پہلی بار تھی کہ کلیسائے الحاد کے دور نہ کرسکنے میں ایک صریح شکست کھائی۔ عیسائیت کی سالم عبا کے دو الگ الگ ٹکڑے ہوگئے۔

لیکن یہ افتراق محض جرمنی تک محدود نہ رہا۔ بہت جلد یہ سوئٹسان میں پھیل گیا یعنی اُن چند شہروں اور اضلاع میں جو رسمی طور پر سلطنت میں شامل رہے تھے لیکن جنہوں نے چودھویں صدی میں ایک "متفقہ" حکومت قائم کرکے عملی طور پر آزادی حاصل کرلی۔ ۱۵۱۹ء ہی میں ذونگلیس نے زیورکہ میں ایک ایسے مذہب کی تلقین شروع کردی جس کا اصل الاصول یہ تھا کہ صرف انجیل کا فیصلہ آخری اور مسلّمہ ہے اور عیسائیوں کو اُسی سادہ و بےلوث زندگی کی طرف رجوع کرنا چاہئے جس کا سبق انجیل میں دیا گیا ہے۔ ۱۵۳۶ء میں ایک اس سے بھی زیادہ حریت پسند اور خوفناک مصلح جون کیلون جو ایک فرانسیسی پناہ گزین تھا جنوا میں سکونت پذیر ہوا اور اس شہر کو اُس نے ایک ایسے مذہب اور ایک ایسے نظام کا صدر مقام بنایا جو کچھ عرصے کے لئے سارے شمالی یورپ یعنی انگلستان سکوٹستان نیدرلینڈز سکینڈے نیویا اور تھوڑی سی دیر کے لئے فرانس میں بھی پھیل گیا۔ کیلونیّت نے مشیتِ ایزدی کی قادریت، انسان کی ازل سے طے شدہ قسمت، اور کفاروں زیارتوں نجاتوں اور رعایتوں کی جو غیر فانی روح کی تقدیر کو بدل سکنے کی مدعی ہیں لغویت پر زور دیا۔

فرانس تھوڑے عرصے کے لئے (۱۵۱۹ء تا ۱۵۲۹ء) لُوتھریّت کی طرف مائل ہوا تھا۔ شاہِ فرانسس اول ہر اُس شے کا جو جرمنی میں رخنہ اندازی کی ضامن ہوسکے اور جو اُس کے دشمن شاہنشاہ چارلس پنجم کو ایذا پہنچاتے معاون ہونے کو تیار تھا۔ لیکن زیادہ دیر نہ گذرنے پائی تھی کہ جرمنی میں کاشتکاروں کی بغاوت نے اُسے چوکنا کردیا اور ۱۵۲۹ء میں جو پاپائی اعانت کی سخت ضرورت اُسے لاحق ہوگئی اس سے وہ مجبور ہوگیا کہ الحاد سے اپنی چہ میگوئیاں چھوڑ دے۔ تقریباً ۱۵۳۹ء کے بعد سے کیلونیّت فرانس میں نفوذ کرنے لگی لیکن اس کی رسائی شاہی دربار تک نہ ہوئی

بلکہ وہ اُن جاگیری امرا میں پھیلی جو کیلون کے جمہوری اصولوں کو جو اُس نے اپنے "ادارات" میں بیان کئے اور جنوا میں اُن پر عمل کر دکھایا تھا شاہی دست درازی کے خلاف استعمال کرنے کے خواہاں تھے۔

اسی طرح سکوٹستان میں امرا نے کیلونیّت کو اس لئے اختیار کیا کہ وہ اُن کی جنگِ آزادی میں اُن کے کام آئے۔ انگلستان میں کیلونیت سٹوئرٹ بادشاہوں کے "پاکباز" مخالفین کا مذہب بنی۔ ہالینڈ میں وہ ڈچ لوگوں کے کام آئی جو سپین کا جوا اتار پھینکنے کے متنائی تھے۔ ہر جگہ کیلونیّت باغیوں جمہوریوں اور نراجیوں کا مذہب بن گئی۔

"جوابی اصلاح" سولھویں صدی کے وسط میں کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اصلاح اپنی مختلف صورتوں میں کیتھلیّت کو یورپ کے کونے کونے میں ملیامیٹ کر دے گی۔ براعظم کا شمالی حصہ تقریباً قطعی طور پر پراٹسٹنٹ ہو چکا تھا اور جنوب میں بھی آسٹریا بویریا لینگوئڈوک سپین اور اطالیہ تک خطرے میں پڑ گئے تھے لیکن اس وقت دو نہایت اہم باتیں وقوع میں آئیں جنہوں نے صورتِ حالات قطعی طور پر تبدیل کر دی ایک تو پراٹسٹنٹیّت کی اصلی کمزوریاں ظاہر ہونے لگی تھیں دوسرے کیتھلیّت کے اندر نیست ونابود ہو جانے کے ڈر سے اور اپنی محافظت کی خاطر مختلف اصلاحیں ہونی شروع ہوئیں۔

پراٹسٹنٹیّت کا جوہر اُس کی خود پرستی تھی وہ محاکمہ مذہبی کے خلاف آزادیٔ خیال اور دستور کے خلاف ضمیر کی موید تھی وہ خدا سے ایک ذاتی تعلق پیدا کرنے کی حامی تھی بخلاف ایک ایسے تعلق کے جو پادریوں اور ولیوں عشائے ربانی کی رسموں اور شفاعتوں کے واسطے سے حاصل کیا جائے۔ لیکن اس انفرادیت میں اس کی خوبیوں ہی سے برائیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اختلافِ رائے کے گناہ کا ارتکاب اس سے عام ہو جاتا ہے۔ پراٹسٹنٹیّت اتنے ہی گروہوں میں منقسم ہو جاتی ہے جتنے اس میں پراٹسٹنٹ ہیں۔ سولھویں صدی میں لوتھر کے "عیسائی آدمی کی آزادی" کے دعوے کے بعد صدہا جھگڑالو اور بیہودہ فرقے پیدا ہو گئے۔ بے انتہا فضول اور ملحدانہ نظریات پھوٹ نکلیں اور کئی شرمناک لغویات اور شیطانی خرافات جابجا رونما ہو گئیں۔ عیسائیت کی اخلاقی حس اور ضمیرِ عامہ ان باتوں کو دیکھ دیکھ کر محجوب و محذوش ہو گیا۔ اصلاح کا مدعا یہ نہ تھا کہ پاپائی خرابیوں کی اصلاح میں فتنہ پردازوں کو جگایا اور ابلیس کو بھڑکایا جائے۔

ان حالات میں جو ردِ عمل کے معاون تھے کیتھلیت اصلاح پانے اور اپنے کھوئے ہوئے علاقے پر قبضہ جمانے لگی۔ نئی مذہبی انجمنیں بن عیسوی کی حمایت میں بن گئیں جن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر یسوعیوں کا حلقہ تھا جس کا بانی مبانی اگنیشیس لوئلا تھا (۱۵۴۰ء) نئی وضع کے پوپ کلیسا کی فرماں روائی کے لئے منتخب ہوئے جو پرہیزگاری نیک عمل اور ارادی قوت کی تصویر تھے۔ ٹرنٹ کی مذہبی مجلس (۱۵۴۵ء تا ۱۵۶۳ء) نے عادات و اطوار کی درستی اور

کیتھالیت کے اعتقادات کی توضیح کا کام کیا + محکمۂ احتساب پوپ کی ہدایات کے موافق الحاد کا قلع قمع کرنے لگا۔ "ضمیمہ" سے ایمانداروں کو یہ بتایا جانے لگا کہ فلاں فلاں کتابیں اُن کے پڑھنے کے قابل نہیں ہیں (سنہ ۱۵۴۶ء) + یورپ کے بعض بادشاہوں مثلاً سپینی فلپ ثانی انگریزی ملکہ میری اور فرانسیسی ہنری ثانی نے کلیسائی طاقت کو "جوابی اصلاح" میں مختلف طریقوں سے امداد دی +

اس کے نتائج حیرت انگیز تھے + سپین نے الحاد کو تیغ و آتش کے زور سے نیست و نابود کر دیا۔ اطالیہ میں نشاۃ الثانیہ اور اصلاحِ مذہبی دونوں کو دبا دیا گیا۔ فرانس میں سینٹ بارتھولومیو کے قتلِ عام (سنہ ۱۵۷۲ء) اور مذہبی لڑائیوں کے سلسلے نے کیلونی (ہیوگنی) تنظیم کو تتر بتر کر دیا +

صرف ٹیوٹنی ملکوں شمالی جرمنی سکینڈے نیویا ڈچ نیدرلینڈ انگلستان جنوبی سکوٹستان میں جوابی اصلاح ناکام رہی +

بشیر احمد

بلاوا

رات اندھیری تھی جب وہ چلی گئی اور لوگ سوتے رہے !

رات اب بھی اندھیری ہے اور میں اُسے بلا رہی ہوں ،، آجا میری لاڈلی آجا۔ دنیا ساری سو رہی ہے اور کوئی نہ جانے گا اگر تُو ایک لمحہ کے لئے آجائے جب کہ تارے یوں تاروں کو تک رہے ہیں " +

وہ چلی گئی جب درختوں پر ابھی کلیاں تھیں اور بہار کا ابھی آغاز ہی تھا +

اب پھول خوب کھل گئے ہیں اور میں پکارتی ہوں " آجا میری لاڈلی آجا " بچّے اکٹھے ہو کر بے پروائی سے چاروں طرف پھول بکھیر رہے ہیں اور اگر تُو آکر ایک چھوٹا سا شگوفہ اٹھائے گی تو کسی کو اُس کا پتہ بھی نہ چلے گا "

وہ جو کھیلا کرتے تھے وہ اب بھی کھیل رہے ہیں۔ ایسی مسرف ہے زندگی +

میں اُن کا شور و غل سنتی ہوں اور پکار اٹھتی ہوں " آجا میری لاڈلی آجا کہ ماں کا جی محبت سے بالکل بھر چکا ہے اور اگر تُو اُس سے ایک چھوٹا سا بوسہ لینے کو آجائے گی تو کوئی بھی اسے برا نہ مانے گا "

گلچیں

حقائق

ہے علم کیا؟ جنوں ہے، حقیقت یہی تو ہے
رہ بے خبر، کہ راہِ سلامت یہی تو ہے

دھوکا ہے سب مجاز و حقیقت کا امتیاز
اے بے خبر سُراغِ حقیقت یہی تو ہے

وہ اِس سے بے نیاز ہے یہ اُس سے بے خبر
انسان اور خدا کی محبّت یہی تو ہے

دنیا نگار خانۂ جنّت ہے سر بہ سر
ذوقِ نظر تجھے نہیں، حیرت یہی تو ہے

غافل فریبِ وعدۂ فردا ہیں مر گئے
یارب وہ باغِ خلد، وہ جنّت یہی تو ہے

ہے ذرّہ ذرّہ روئے حقیقت پہ غازہ بند
محرم نہیں ہے تو ہی، مصیبت یہی تو ہے

پہلو میں اِک جہان کو ہم لے کے مٹ گئے
یہ حشر دل کا، آہ قیامت یہی تو ہے

حامدؔ یہی ہے آپ کی منزل خدا گواہ
حضرت یہی ہے کوئے ملامت یہی تو ہے

حامد علی خاں

رنگ اور اوہام

رنگ نے ہمیشہ انسان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا ہے بلکہ اکثر حیوانوں کو بھی اُس نے اپنا گرویدہ کرلیا ہے۔ شہد کی مکھیوں پر تجربات ہوچکے ہیں اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ وہ رنگ کا احساس رکھتی ہیں۔

دوسری طرف ہمیں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ موجودہ زمانہ میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جن میں رنگ کی حس موجود نہیں ہوتی۔ اُن کے لئے دنیا کی ہر چیز ایک دھندلا سا رنگ لئے ہوئے ہے۔ کم از کم وہ اشیا کے رنگ کو بیان اسی طرح پر کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ رنگ کی حس سے بے بہرہ ہوتے ہیں اس لئے معلوم نہیں کہ جس کو وہ دھندلا کہتے ہیں وہ دراصل کیا ہوتا ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ وہ بے رونق سا سبزی مائل سلیٹی رنگ ہوتا ہوگا۔

لیکن جب ہم نے یہ جان لیا کہ رنگ کی حس ہمیں ورثہ کے طور پر نہیں ملتی تو یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ انسان مدت ہائے دراز تک زندگی کی مسرتوں میں سے اس عظیم الشان مسرت سے محروم رہا ہوگا۔ اُس قدیم زمانے میں حیوانی زندگی رنگ کے معاملہ میں بلاشبہ ہاتھی، گینڈے۔ گھڑیال اور دریائی گھوڑے سے مشابہ تھی اور نباتات بڑی بڑی جھاڑیوں اور گھاسوں پر مشتمل تھی۔ غالباً آسمان بھی نیلا نہیں تھا کیونکہ اُس وقت تپش زیادہ ہوگی اور نمکین شور زدہ دلدلوں سے اوپر کی فضا دھندلی ہوگی۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ سب سے پہلے آسمان نمایاں ہوا، کیونکہ انسان نے ہمیشہ نیلے رنگ کو سب رنگوں سے زیادہ مبارک جانا ہے گو سفید کو بھی ہمیشہ سے مقدس سمجھا ہے۔

رات کے دوران میں، اگر وہ رات آرام کی رات ہو، فطرت بہت بڑا اصلاحی عمل کرتی ہے۔ اسی لئے غالباً تمام قدیم اوہام میں سیاہ رنگ کو شفا بخش خاصیت کا حامل سمجھا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر گوہیری پر کالی بلی کی دُم رگڑی جائے تو آرام ہوجاتا ہے۔ یا اگر کان میں درد ہو تو کالی بھیڑ کی اون کان میں رکھنے سے یہ درد جاتا رہتا ہے اور اسی طرح کالے گھوڑوں، کتوں، کووں اور دوسرے پرندوں کے متعلق بہت سے اوہام مشہور ہیں۔

کالے رنگ کے گھوڑے کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ پریوں اور دوسری نظر نہ آنے والی پُراسرار ہستیوں

کو دیکھ سکتا ہے۔ اسی طرح کوے کا تعلق ہمیشہ کالے جادو سے وابستہ سمجھا گیا ہے، شاید اس لئے کہ گھوڑے کی طرح اُس کی نسبت بھی یہ خیال ہے کہ وہ اپنے جادوگر مالک کے غیر مرئی دوستوں کو دیکھ سکتا ہے۔

بدی کے لئے رات کے تاریک گھنٹے مخصوص ہیں اسی لئے ہزارہا سال سے ہمارے بچوں کے دلوں میں رات کا خوف جاگزین ہے۔ بلکہ بڑوں کے دلوں میں بھی ایک وہم سا موجود ہے۔ سفیدی کو مقدس سمجھا گیا ہے اور اسی لئے ہندوستان کے بعض بازاروں میں دوکان وار شام کے بعد سفید چیز فروخت نہیں کرتے، کیونکہ وہ اس مقدس رنگ کی تجارت کو تاریکی سے آلودہ نہیں کرنا چاہتے۔

ولایت میں دلہن کے لئے سفید لباس کی مقبولیت کی بھی غالباً یہی وجہ ہے۔ اُسے پہلے چوبیس گھنٹے تک کوئی دوسرا رنگ پہننے نہیں دیا جاتا۔ اس کے بعد کسی رنگ کی پابندی نہیں ہے کیونکہ شاید اس سے آگے وہم کی رسائی نہیں ہوئی۔ ہزارہا سال تک لوگوں کا یہ پختہ عقیدہ رہا کہ ہر رنگین چیز جو دلہن پہنتی ہے اُس کی زندگی میں مصیبت کے ایک سال کا اضافہ کرتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ مصیبت معاً اُس کی شادی کے بعد شروع ہو جائے، نہیں، بلکہ ان مصیبتوں کو مستقبل کے دھندلکوں میں چھپی ہوئی تصور کیا جاتا تھا۔

سفید جانوروں کو ہمیشہ مقدس سمجھا گیا ہے، جیسے گھوڑا، لیکن تعجب ہوتا ہے کہ الّو اور تیتری بھی اسی ذیل میں ہیں۔

چین میں سفید رنگ ماتم کے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے لیکن یقینی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تقدس کی وجہ سے ہے یا اس لئے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ رنگ ہمیں بدروحوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھے گا۔

اسی سلسلہ میں پرانے لوگوں کا یہ عقیدہ ظاہر کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اگر ایک چوڑا سا سفید پٹکا جسم کے گرد لپیٹ لیا جائے تو نقرس کی بیماری دور ہو جاتی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مریض اُن بدروحوں کی نظر سے جو اُس کی ہڈیوں کو ایذا پہنچا رہی تھیں اوجھل ہو گیا ہے۔

رومیوں کے زمانے میں سیاہ رنگ کا لباس ادنیٰ درجہ کے نوکروں کے لئے مخصوص تھا، اور سب سے پہلے رومیوں ہی نے اسے ماتم کے طور پر پہنا۔ یہ عجز و انکسار کا ایک نشان تھا جس کے معنی یہ تھے کہ ہم موت کی عظمت کے مقابلہ میں اپنی ہیچ میرزی کو محسوس کرتے ہیں۔ اس لئے سیاہ نشان پہننے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ یہ مرنے والے کے احترام کی ایک صورت ہے گو اکثر لوگ یہی سمجھتے ہیں۔

نپولین اعظم سیاہ رنگ سے بہت ڈرتا تھا۔ اسی لئے اُس نے کبھی اپنے آدمیوں کو یہ رنگ نہ پہننے دیا تھا۔ ایک دفعہ

اُس نے ملکہ سے کہا "جاؤ اور اچھا سا لباس پہن کر آؤ"۔ درحقیقت اُس کا مطلب یہ تھا کہ یہ سیاہ پوشاک اتار دو جو تم نے پہن رکھی ہے۔ اور یہ سرزنش ملکہ کو مجمعِ عام میں ہوئی۔ بچے بھی طبعی طور پر سیاہ رنگ کو بڑی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن سکھوں میں یہ رنگ بے حد مقبول ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ دنیا کی بے ثباتی کو ہر وقت پیشِ نظر رکھنا چاہتے ہیں۔

نجوم میں بھی مختلف رنگوں سے مختلف اوہام وابستہ ہیں۔ ہر سیارہ کا ایک خاص رنگ مانا گیا ہے جو شخص جس سیارے کے اثر کے ماتحت پیدا ہوا ہے اُس کے لئے اُسی رنگ کا استعمال جاری رکھنا مفید ہے اور کوئی شک نہیں یہ خیال بھی اتنا ہی معقول اور قیمتی ہے جتنے دوسرے اوہام ہیں۔ نہ کم نہ زیادہ۔

لیکن عجیب بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ موجودہ علمِ طب نے رنگوں کو امراض کے علاج کی حیثیت سے اہمیت دی ہے خصوصًا اعصابی اور دماغی امراض میں انہیں مفید تسلیم کیا گیا ہے۔

بیج نیلی اور کاسنی شعاعوں کے نیچے جلد اُگتا ہے لیکن مکھیاں اور دوسرے کیڑے ان رنگوں کو پسند نہیں کرتے۔

خاموش اور محزون طبیعتیں سرخ رنگ کے زیرِ اثر باتونی اور خوش ہو جاتی ہیں۔ رنگ درحقیقت تعدادِ ارتعاش کا معاملہ ہے۔ بعض لوگوں کی اعصابی قوتیں خاص دماغی زور صرف کئے بغیر بعض رنگوں کی کثرتِ ارتعاش کی تاب نہیں لاسکتیں۔ نیلے رنگ کے لئے جس قدر ارتعاش کی ضرورت ہے سرخ کے لئے اُس سے نصف ارتعاش کام دے جاتا ہے۔ اس لئے کمزور و محزون طبیعتوں میں جو تبدیلی واقع ہوتی ہے وہ آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔

قدیم انسان کا عقیدہ تھا کہ سرخ گلاب کا سونگھنا خوش بختی کی نشانی ہے لیکن سفید گلاب کا نہیں! اس عجیب و غریب عقیدے کی یقینًا کوئی وجہ ہو گی۔ یا تو پہلے پہل سرخ گلاب بالکل کم دستیاب ہوتے ہونگے کیونکہ معمولی جنگلی گلاب شاذ و نادر ہی رنگین ہوتا ہے یا قدیم سفید گلاب خوشبو سے معرا ہوتے ہونگے۔ اس خیال کو تقریبًا یقین کا درجہ حاصل ہے کہ سرخ رنگ آغازِ فطرت میں نایاب تھا۔ ایک قدیم خیال ہے کہ نیلا رنگ خیر و برکت کو سبز صحت کو پیازی کسی غیر معمولی بات کو اور سرخ دولت کو ظاہر کرتا ہے۔

پیازی رنگ درحقیقت اُن ایام میں جب موسم تقریبًا ہمیشہ تاریک رہتا تھا ایک پُر فضا دن کی علامت تھا۔ اور پھر اس کے معنی یہ تھے کہ آج نعمت خانہ میں تازہ گوشت پکے گا اور گھر والی کو اگر وہ اس درجہ کو پہنچ گئی ہے پہننے کے لئے نئے کپڑے ملیں گے یہ خوشگوار شگون ابھی تک پیازی رنگ سے لیا جاتا ہے۔

سبز رنگ روح پرور ہے۔ غالبًا اس لئے کہ غاروں میں رہنے والا قدیم انسان پھر میدانوں اور سبزہ زاروں کی کھلی

ہوا میں نکل جانا چاہتا ہوگا۔ اُس زمانے کے غار عمدہ نہیں ہوا کرتے تھے۔ غار کے دہانے کے قریب ہی ہری بھری ٹہنیوں سے مسلسل آگ جلا کرتی تھی اور اُس میں اَور کوئی روزن نہیں ہوا کرتا تھا۔ اس سے ہم باآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ انسان سبز رنگ کو کیوں رُوح پرور تصور کرتا تھا۔

شمالی امریکہ کی ایک قوم سی اور سو سبز رنگ کو ماتم کے موقع پر استعمال کیا کرتی تھی۔ مگر غم کے اظہار کے لئے نہیں کیونکہ اُن کا تو پختہ عقیدہ یہ تھا کہ مردے زندوں سے بہت زیادہ خوش ہیں، بلکہ امید اور مسرت کی علامت کے طور پر کیونکہ یہ فطرت کا رنگ تھا، بہار کے خوبصورت نئے پتوں کا رنگ۔

نیلا رنگ آسمان کی نمائندگی کرتا ہے اور غالباً پہلا رنگ ہے جس پر دھندلی فضا کی یک رنگی سے اچٹ کر انسان کی نگاہ پڑی۔ اسے ہمیشہ مبارک رنگ سمجھا گیا ہے اور یہی ایک رنگ ہے جس کے پہننے کی ایک دلہن کو اجازت ہوتی ہے۔ بنی اسرائیل میں نیلا رنگ وفا کا رنگ تھا۔

سرخ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے دولت کا رنگ ہے اور اسے ہمیشہ شاہی رنگ کا رتبہ حاصل رہا ہے۔ اس رنگ کو اشتعالِ جذبات کے ساتھ بھی خاص نسبت رہی ہے۔ اسی لئے پرانے زمانے میں ایسے موقع پر فصد کھلوایا کرتے تھے۔

چین میں بد روحوں سے حفاظت کے لئے جو مختلف قسم کے گنڈے تعویذ لکھے جاتے ہیں انہیں سرخ دھاگے سے باندھا جاتا ہے۔ کبھی انہیں سرخ کاغذ پر لکھا جاتا ہے اور کبھی ان کے لئے سرخ روشنائی استعمال کی جاتی ہے۔ بچے کے جھولے کو سرخ دھاگا بھی اسی لئے باندھتے ہیں اور کلائی میں سرخ چوڑی بھی اسی لئے پہناتے ہیں۔

جزیرۂ آدم کے لوگوں کا خیال تھا کہ پریاں زرد رنگ سے دور دور رہتی ہیں۔ گو اسے وہ برا بھی نہیں سمجھتے تھے لیکن اچھا بھی نہیں جانتے تھے۔ جن کو یہ رنگ پسند ہوتا تھا اور وہ اپنے باغ میں سورج مکھی گیندا وغیرہ لگاتے تھے تو کسی الگ کونے میں لگاتے تھے تاکہ پریوں کی بے ضرر اور پاکیزہ تفریح کے لئے کافی جگہ بچ رہے۔

ترکی میں کاسنی رنگ ماتم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ دراصل ارغوانی اور کاسنی وہ رنگ ہیں جن کی خوبی کو بعض آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ اُن کو یہ رنگ سیاہ نظر آتے ہیں اور اسی لئے وہ رومیوں کی طرح اس رنگ سے بھی سیاہ کا سا سلوک کرتے ہیں۔ ان گہرے رنگوں کو روحانی، پراسرار اور نامعلوم ہستیوں کا ایک نقاب تصور کیا جاتا ہے۔ اُن لوگوں کے لئے جن کی نظر باریک بین ہے ارغوانی اور کاسنی نہایت شگفتہ رنگ ہیں۔

سکاٹ لینڈ میں سبز رنگ کو اچھا نہ جانتے تھے، شاید اس لئے کہ اُن کے ملک کی پہاڑیاں بے طرح جھاڑیوں

سے ڈھنپی ہوئی تھیں اور وہ ایک جنگ جُو قوم تھے لیکن دوسرے اکثر ملکوں میں یہ ایک اچھا رنگ تھا۔ گو کہیں بھی اس سے شاید مبارک شگون نہیں لیتے تھے لیکن تاہم ایک دیانت دار محنتی کے لئے جو دن بھر کام کرتا رہا ہو یہ آرام وسکون کا پیغام تھا۔ حقیقت میں حسّاس طبیعتوں اور مصروف ہستیوں کے اعصاب و دماغ کو یہ رنگ بڑی تسکین دیتا ہے۔

قدیم ترکی میں نیلا رنگ ماتم کا اظہار کرتا تھا۔ وہاں کے لوگوں کے نزدیک یہ غم کا نہیں بلکہ رومیوں کی طرح امن کا یا عجز کا نشان تھا۔

زرد قدرتاً ایک تقویت بخش رنگ ہے۔ قدیم ایام میں اسے آفتاب کی علامت خیال کرتے تھے۔ اسی لئے شاید یہ سمجھا گیا کہ پریاں جنہیں صبح و شام کی ملاحت پسند ہے اس رنگ کے قریب نہیں آتیں۔

خاکی ہمیشہ سے الوپ رنگ مانا گیا ہے۔ غالباً موجودہ زمانے کے فوجیوں کی طرح جو خاکی رنگ کو دشمن کی نظر سے چھپنے کے لئے بہترین سمجھتے ہیں قدیم جادوگروں نے بھی اس کی اس خاصیت کو محسوس کر لیا ہو، کیونکہ یہ رنگ پہن کر عموماً کم از کم فاصلہ سے بھی انسان نظر نہیں آتا۔

(ماخوذ)

نور احمد

جس طرح تم کسی دوست کا امتحان لے رہے ہو اسی طرح بہت ممکن ہے کہ وہ بھی تمہارا امتحان لے رہا ہو۔

اور جس طرح تم ایک حقیقی دوست کی تلاش میں ہو ممکن ہے کوئی اور بھی اسی تلاش میں ہو۔ تلاش کرنے سے پہلے اپنے آپ میں تلاش کئے جانے والوں کی صفات بھی پیدا کر لو۔

لوگوں کے چال چلن اور اوضاع واطوار کے مطالعہ کے لئے شاید سب سے عمدہ کتابیں خود یہی لوگ ہیں۔ یہ کتابیں لاکھوں کی تعداد میں مفت تقسیم ہوتی ہیں۔ ہم خود بھی ایک ایسی ہی مفت کی کتاب ہیں جس پر اکثر لوگ ریویو کیا کرتے ہیں۔

"اگر تم ترقی کی جدوجہد نہیں کرتے تو سمجھو کہ تم مر چکے ہو"

"تم اگر فرشتوں سے بہتر انسان" نہیں ہو تو مضائقہ نہیں مگر یہ بھی کتنا ظلم ہے کہ تم انسان ہی نہ ہو"

"مصیبتوں کی یاد سے نعمتوں کی یاد اچھی ہے"

"بلند خیالی ہی انسانیت ہے"

گمنام

بزمِ یگانہ

(۱)

جی چاہے تو دل لگا کے بسم اللہ
آشوب کوئی اٹھا کے بسم اللہ
دل کیا ویرانہ ہے یاہو کا عالم کیوں ہے
سوتے فتنے جگا کے بسم اللہ

(۲)

چارہ نہیں کوئی جلتے رہنے کے سوا
سانچے میں فنا کے ڈھلتے رہنے کے سوا
اے شمع تری حیاتِ فانی کیا ہے
جھونکا کھا کے سنبھلتے رہنے کے سوا

(۳)

ان مُردہ پرستوں کا یہ مذہب کیسا
ہر حال میں ہر حال اپنا مشرب کیسا
کل تک تو اسی کل سے آزردہ تھے
گزرے ہوئے کل کا ذکر اب کیسا

(۴)

مہمان ہے تو صاحبِ خانہ ہوں میں
آئینۂ حسن ہے اور دوانہ ہوں میں
ہے کیا کوئی دوسرا نہ کوئی مجھ سا
یکتائے جہاں تو ہے یگانہ ہوں میں

میرزا یگانہ لکھنوی

عشق اور حقیقت

افسانہ نویس عام طور پر اپنے ہیرو اور ہیروئن کی باہمی شادی تک کے واقعات قلمبند کر کے قصہ ختم کر دیتے ہیں تاکہ کتاب سے رخصت ہوتے وقت زردہ اور فرنی کی مٹھاس پڑھنے والے کے منہ میں اور باجے کے سہانے سر کانوں میں باقی رہ جائیں۔ شادی کے بعد کے حالات جن میں اس خوش آئند واقعہ کے اصل مزے یا بدمزگیاں ہوتی ہیں بیان نہیں کئے جاتے ہم فطرتِ انسانی کی حقیقت کے طلبا ہیں اس لئے یہ دیکھنا مقصود ہے کہ وہ فقرہ یا مفہوم جس پر واقعی یا اشارۃً افسانے کو ختم کیا جاتا ہے یعنی "اس کے بعد وہ عیش و خوشی میں زندگی بسر کرتے" کہاں تک سچائی لئے ہوئے ہے +

ہم یورپ یا امریکہ کے باشندے نہیں ہیں اور نہ ان ممالک کے باشندوں یا اُن کے مقلدین سے مخاطب ہیں اس لئے ہندوستان کے درمیانی طبقہ کے حالات پر غور کریں گے جن میں شادی کے معنی محض گرجا میں چند احباب کے سامنے زیادہ تر منافقانہ قول و قرار کسی ہوٹل کے انتظام سے ایک مختصر سا ڈنر اور اس کے بعد طویل ماہ العسل یا ہنی مون ہی نہیں ہوتے بلکہ اپنے ملک کے حالات اور طرزِ معاشرت کے مطابق زندگی کے بہت سے شعبوں میں کھلبلی اور اُن کے نئے سرے سے ترتیب دیئے جانے کی ضرورت پیدا ہو جاتی ہے۔

سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ خود دولہا دلہن اور اُن کے گھر والوں کی شادی کے بعد کیا حالت ہوتی ہے۔ نزدیکی عزیز بیچارے جن کے ساتھ عام طور پر دولہا بھی شامل ہوتا ہے کئی دنوں اور راتوں کی متواتر تگ و دو سے کوفتہ و بجیتہ ہو کر نستعلیق سے شکستہ کی صورت اختیار کر چکے ہوتے ہیں۔ والدین غریب کچھ حسبِ حیثیت کچھ اپنے زیادہ فارغ البال اعزہ و احباب کی دیکھا دیکھی کچھ ضرورتاً کچھ ناک کٹنے کے خوف سے غیر ضروری مصارف کے بار سے سراسیمہ و مالیدہ ہو کر مہینوں برسوں بلکہ بعض اوقات عمر بھر میں سبکدوش ہونے کی فکر لگا رہے ہوتے ہیں۔ دولہا اگر برسرِ کار ہے تو خیر، ورنہ دست نگری کی وجہ سے اپنے والدین کی جا و بے جا فرمانبرداری اور بیوی کے حقوق کی حفاظت کا جوڑ نبھانے کی ادھیڑ بن میں مبتلا ہوتا ہے۔ اور دلہن جس نے پیدا ہونے کے دن سے آج تک صرف ایک ہی ماں باپ کو دیکھا تھا اب یکلخت دوسرے ماں باپ بنانے اور ایک تیسری اجنبی ہستی کو اپنے ماں باپ بہن بھائیوں سے نزدیک تر اور عزیز تر بنا سکنے کی ممکنات پر غور کر رہی ہوتی ہے۔

چند دن اسی طرح گذر جاتے ہیں اور اس نئے گھرانے کا ہر فردِ بشر نئے حالات اور تعلقات کا مطالعہ کرنے

ہوئے رفتہ رفتہ اپنی نئی حیثیت کے ساتھ مانوس ہو جاتا ہے۔ لیکن اس حالت میں کہ ہر فرد دنیا کی ضروریات کو مدِنظر رکھ کر ایک کافی حد تک سمجھدار ہو۔ ورنہ وہی پرانا قصّہ چھڑ جاتا ہے۔ یعنی ماں چاہتی ہے کہ بیٹا میرا ہو کر رہے، بہنوں کی خواہش ہوتی ہے کہ اُن کی رائے کے مقابلہ میں بھائی کسی اور کی رائے کو مقدم نہ سمجھے، بیوی قدرتی طور پر اُس کو حق کے لئے اپنے ماں باپ بہن بھائیوں کو چھوڑ کر آئی ہوتی ہے اپنی اور صرف اپنی واحد ملکیت خیال کرتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر دولہا میں سب کو اپنی اپنی جگہ رکھنے اور ایک دوسرے کے حقوق پامال کرنے سے روکنے کا مادہ قدرتی طور پر موجود نہ ہو تو اس کشمکش میں محبت کے نازک رشتے زخمی ہو کر کچھ عرصہ کے لئے بالکل ٹوٹ جاتے ہیں۔

اس کے بعد ہمیں زن و شو کے باہمی رشتہ کو خوردبینی نگاہ سے مطالعہ کرنا ہے۔ اب اسے ہماری خوش قسمتی کہئے یا بدقسمتی فی الحال ہندوستان کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے الفت، محبت، عشق، ہجر و فراق، وفا و جفا وغیرہ کے مراحل طے کرنے کا یہی وقت ہے۔ یورپ والے اس سے پہلے ایک نہیں کئی کئی مرتبہ ان دشوار گذار منزلوں کو عبور کر چکے ہوتے ہیں اور شاید یہ منازل اُس آب و ہوا میں دشوار گذار بھی نہیں ہوتیں۔ لیکن ہم ہندوستانیوں کے لئے پہلی مرتبہ اس لق و دق صحرا میں قدم رکھنا ہوتا ہے جس میں خال خال چشمہ ہائے شیریں اور بہشتی مرغزاروں کے دوش بدوش لاتعداد خارِ مغیلاں سے (جن کو ڈاکٹر بوس کی تحقیقات نے راہِ عشق پر چلنے والوں کے پاؤں کے جاندار اور اس لئے عمداً دشمن ثابت کر دیا ہے) سابقہ پڑتا ہے۔

اب اگر معاملہ "یا کسی کا ہو کر رہے، یا کسی کو اپنا کر لے" تک رہا تو غنیمت ہے، اور آپ نے دیکھا ہو گا کہ اکثر ایسے جوڑے ہی سب سے زیادہ خوش رہتے ہیں جن میں بیوی یا خاوند دوسرے کی کامل اطاعت اختیار کر لے ---- پرانے دستور اور احکامِ مذاہب میں تو بیوی کی اطاعت کو لازمی قرار دیا گیا تھا لیکن نئی روشنی کے مذہب نے دونوں کو برابر کا درجہ دے دیا ہے ---- ورنہ اگر بدقسمتی سے زن و شو میں بجلی کا بٹن دبانے سے روشنی ہو جانے کی طرح فوراً یا یونانی حکما کے طرزِ علاج کی طرح بتدریج عشق کا مرض پیدا ہو گیا تو گویا اُن کے خوشی سے زندگی بسر کرنے کی امید اُس روز سے منقطع ہو گئی۔ عشق کے دیوتا کو چوری چوری آنکھ مچولی کھیلنے میں مزا آتا ہے۔ جہاں اُس نے دیکھا کہ دونوں کے ملنے ملانے میں کوئی زیادہ رکاوٹ کا سامنا نہیں ہے تو تاک میں رہا اور کسی روز چپکے سے اپنی کمان سنبھال ترکش کندھے پر ڈال فرار ہو گیا۔ تاکہ کسی اور بھولے بھالے دل کو زخمی کر کے اُس کے تڑپنے اور تلملانے کا مزا دیکھے۔

اصل بات یہ ہے کہ جہاں باہمی محبت اعتدال سے زائد ہوتی ہے وہاں ہر ایک دوسرے کو محاسن کا خزانہ اور معمولی انسان سے جو خطا اور نسیان کا پتلا ہے بہت کچھ بالاتر سمجھتا ہے۔ دوری ہجر اور جدائی میں اس خیال کو تقویت

ہوتی رہتی ہے۔ لیکن گھر کی بے تکلف زندگی میں ہر وقت اکٹھا رہنے سے دونوں طرف کے عیوب اور خامیوں کا اظہار ہونے لگتا ہے جس سے پہلا خیالی چمکدار ملمع رفتہ رفتہ دور ہو کر اصلیت نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ اصلیت اُس دماغی تصویر سے جو پہلے دل میں تھی اس قدر مختلف ہوتی ہے کہ اگر انسان سمجھدار اور پختہ مغز نہ ہو تو پہلی محبت کا فوراً اسی قدر نفرت سے بدل جانا تعجب کی بات نہیں۔

اب گھر کے نظام کی صرف ایک شکل باقی رہ گئی۔ یعنی جہاں یورپ کی طرح میاں بیوی دونوں خود مختار ہوتے ہیں، گویا برٹش گورنمنٹ اور سوراج مخلوط۔ اپنا اپنا پروگرام اپنی اپنی کمائی اور اپنا اپنا ٹائم ٹیبل۔ بات بات پر جوتی پیزار ـــــــ یا شاید مجھے بوٹ گرگابی (اونچی ایڑی والی) کہنا چاہیئے ـــــــ ہو جانا معمولی بات۔ ضابطہ کی زندگی۔ سچی محبت اور دلی انس کے جذبات کا خون۔ گو یہ بات آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ جب دونوں کی حیثیت برابر ہے تو روزمرہ کے معاملات میں عورت کو ترجیح کیوں دی جاتی ہے۔ یعنی عورت باہر سے آئے تو مرد کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جگہ تنگ ہو تو عورت کو بٹھایا جاتا ہے مرد کھڑا رہتا ہے۔ باہمی طلاق کے بعد مرد کا قصور ہو تو اُس پر عورت کے گذارے کے لئے رقم مقرر کر دینا لازم آتا ہے وغیرہ۔ یہ کیوں؟ یہ تو اُن پرانے وقتوں کے رواج ہیں جب عورت صنفِ نازک کہلاتی تھی۔ اب وہ برابر کے حقوق رکھتی ہے۔ پہلے صرف مرد عورت کو طلاق دے سکتا تھا۔ اب ٹرکی تک میں عورت مرد کو طلاق دے سکتی ہے۔ اس لئے جب عورت کا قصور ہو تو اُسے مرد کو ہرجانہ دینا چاہیئے۔ ہندوستان اور اسلامی ممالک میں مہر کی بجائے حقوقِ زوجیت دونوں کی طرف سے ہونا چاہئیں۔ مجلسہائے واضعِ قوانین کو اس امر کی طرف ابھی سے توجہ کی ضرورت ہے ورنہ آئندہ جب ان میں کثرت رائے اناث کی ہو گئی تو قوانین کی تبدیلی ایک مشکل امر ہو جائے گا۔

اِس لئے ہم اپنے ملک کے نوجوان طبقۂ ذکور و اناث کو مخلصانہ مشورہ دیتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں جو کچھ بھی چاہیں کریں لیکن شعرا کی باتوں پر ہرگز اعتبار نہ کریں۔ روزانہ اخبارات کا ضرور مطالعہ کیا کریں اور سیاسی امور میں ہر موقع پر حفظِ امن کی پالیسی مدِّ نظر رکھنے کے ممکنات و ذرائع پر غور کریں تاکہ آئندہ آنے والی گھر کی گورنمنٹ کے اسی قسم کے مسائل کو حل کرنے میں زیادہ دقت نہ اٹھانی پڑے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ گھر کی عملداری میں خواہ عورت ہوم گورنمنٹ ہو خواہ مرد فریقِ ثانی کے لئے اول تو اطاعت اور یہ نہ ہو سکے تو ڈومینین سٹیٹس سے بہتر کوئی طرزِ حکومت نہیں۔ مکمل آزادی گھر ہو یا ہندوستان اول تو حاصل کرنا مشکل ہے اور اگر حاصل ہو بھی گئی تو نباہنا ناممکن۔

عطاءالرحمٰن

الٰہی تری جستجو

مسرّت

نہ آبِ رواں تُو نہ کوہِ گراں تُو ۔۔۔ نہ صحرا نہ وادی نہ بحرِ رواں تُو
زمیں بھی نہیں ہے نہ ہے آسماں تُو ۔۔۔ نہ سورج نہ تارا نہ ہے کہکشاں تُو

بتا اپنے مسکن کا ہم کو نشاں تُو
کہاں تجھ کو ڈھونڈیں ملے گا کہاں تُو

نہ تُو ابرِ تر ہے نہ برقِ تپاں تُو ۔۔۔ نہ سروِ چمن ہے نہ ہے گلستاں تُو
نہ گل ہے نہ غنچہ نہ بادِ وزاں تُو ۔۔۔ کہاں تجھ کو ڈھونڈیں کہاں ہے نہاں تُو

سنا ہے تُو پنہاں بھی ہے اور عیاں ہے
سنا ہے مکاں بھی ترا لامکاں ہے

قیامت سے پہلے قیامت ہے یارب ۔۔۔ چھپی ہم سے کیوں تیری صورت ہے یارب
ترے بن ہمیں جو مصیبت ہے یارب ۔۔۔ نہیں اس کے سہنے کی طاقت ہے یارب

زمانہ یمِ غم میں بہتا ہے دن بھر
تڑپتا ہے بیتاب رہتا ہے دن بھر

ترے واسطے بے قراری ہے دن بھر ۔۔۔ زمانے میں اک آہ و زاری ہے دن بھر
گھٹا غم کی ہر دل پہ طاری ہے دن بھر ۔۔۔ فضول اک تگ و دو سی جاری ہے دن بھر

مسرّت کو کتنا چھپایا ہے تُو نے
نشاں اس کا کیسا مٹایا ہے تُو نے

کسی کو تلاش اس کی علم و ہنر میں ۔۔۔ کسی کو تلاش اس کی لعل و گہر میں
کوئی ڈھونڈتا ہے اسے مال و زر میں ۔۔۔ کوئی ڈھونڈتا ہے اسے بحر و بر میں

کوئی ڈھونڈتا ہے اسے جامِ جم میں
کسی کو تلاش اس کی روئے صنم میں
ہمیشہ رہی سب سے پنہاں مسرّت رہی سب سے اکثر گریزاں مسرّت
چھپائے گئی روئے خنداں مسرّت ہوئی آگے آگے خراماں مسرّت
سبب اصل یہ ہے کہ تُو ہے مسرّت
الٰہی تری آرزو ہے مسرّت
طلب ہے تری ایک کانِ مسرّت رضا تیری صد گلستانِ مسرّت
تری آرزو ہے نشانِ مسرّت تری جستجو اِک جہانِ مسرّت
ہمیں تُو اِسی جستجو میں مٹا دے
سبق ہم کو صبر و رضا کا پڑھا دے

ح-ب

تاثرات

مجھے پروا نہیں گر ہے مخالف آسماں اپنا میں اپنے دل کے اندر دیکھتا ہوں اک جہاں اپنا
فلک پر ماہ و انجم سُن رہے ہیں میری باتوں کو بنایا تھا ازل سے میں نے جن کو رازداں اپنا
نہیں اس کی ہمیں خواہش کہ ہو گلشن میں آرائش مٹایا دل ہی جب ہم نے تو پھر کیا گلستاں اپنا
کبھی رنج و الم کی قید سے آزاد جو دل تھا وہ دل اب ہو چکا ہے مٹ کے بے نام و نشاں اپنا
میں کیونکر صورتِ پروانہ جل کر خاک ہو جاؤں
ابھی ہونا ہے دنیا میں بہت کچھ امتحاں اپنا

ر-ب

تین سائے

میں نے نظر اُٹھائی اور تمہاری آنکھیں دیکھیں
تمہارے بالوں کے سائے میں
جیسے ایک مسافر چشمہ کو دیکھتا ہے
جنگل کے سائے میں
اور میں نے کہا میرا افسردہ دل ترستا ہے
آہ! وہاں آرام کرنے کو اور خوب سیراب ہو کر سو جانے کو
اس خوشگوار تنہائی میں۔

میں نے نظر اٹھائی اور تمہارا دل دیکھا۔
تمہاری آنکھوں کے سائے میں
جیسے کوئی جویا سونا دیکھتا ہے۔
چشمے کے سائے میں
اور میں نے کہا "آہ! کونسی حکمت ہے
جو اس غیر فانی خزانے کو فتح کرے
جس کی احتیاج زندگی کو سرد اور بہشت کو ایک کھوکھلا خواب بنا سکتی ہو۔

میں نے نظر اٹھائی اور تمہاری محبت دیکھی
تمہارے دل کے سائے میں
جیسے ایک غوطہ خور موتی کو دیکھتا ہے
سمندر کے سائے میں
اور میں نے اپنے چڑھتے ہوئے سانس میں آہستہ سے کہا:
"آہ! تم محبت کر سکتی ہو، نیک لڑکی!
کیا تمہاری محبت میرے لئے ہے؟"

(روزیٹی)

محسن

خدمتگار

بہادر سردار فلسطین سے مقدس لڑائی لڑ کر واپس آرہا تھا۔ اُس کے نوجوان خدمتگار کا گھوڑا اُس کے پیچھے پیچھے تھا، وہ دونوں اپنے گھوڑوں پر سوار اس طرح خاموش سر جھکائے ہوئے جارہے تھے جیسے کوئی زاہد تسبیح میں مشغول ہوکر آس پاس کی تمام چیزوں کو فراموش کرچکا ہو۔

دفعتہً سردار نے اپنے گھوڑے کی رفتار ہلکی کردی۔ یہاں تک کہ اُس کے خدمتگار کا گھوڑا بالکل اُس کے قریب پہنچ گیا۔ سردار نے گردن پھیر کر اُس کو مخاطب کیا اور کہا "اے نوجوان! تیری شرافت اور شجاعت میرے دل پر گہرا نقش کرچکی ہے۔ اس عرصہ میں کئی بار تُو نے میرے لئے اپنی پیشانی کو خون آلود کیا۔ تُو اپنے سنہرے بال خاک و خون میں آلودہ کرنے سے کبھی نہیں گھبرایا۔ تین بار تو نے مجھے قاتلانہ حملوں سے بچایا، ایک دفعہ خیمے میں جب دشمن کی ناپاک تیغ میری زندگی کو ختم کرنے کے لئے جھک چکی تھی اور دو دفعہ میدانِ جنگ میں جب میری ڈھال ٹوٹ ٹوٹ کر ٹکڑے ہورہی تھی"۔

خدمتگار نے اپنا جھکا ہُوا سر اوپر کو اٹھایا اور کہا "بہادر آقا! ہم نے جب سے اپنے گھروں کو چھوڑا ہے اور جب سے میدانِ جنگ میں آئے ہیں یہی کشت و خون کا ذکر ہماری زبان پر رہا ہے۔ لیکن اس سبزہ زار کی پُر سکون فضا میں جہاں ہمارے جذبات بھی سکون پذیر ہوچکے ہیں یہ ذکر بالکل ہی اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ ہمارا لشکر ابھی ہم سے بہت دُور ہے۔ اور جنگل کی یہ خاموشی مجھے بالکل نئی معلوم ہورہی ہے۔ شبنم گرتی ہے اور اس کے ساتھ ہی میں محسوس کرتا ہوں کہ دُور بہت دُور آسمان کے نازک اور شفاف پردوں کو چیر کر نور کے کسی جھلملاتے ہوئے چشمہ سے میری روح پر ایک ابدی ایک ہمیشہ رہنے والی رحمت نازل ہورہی ہے۔ آسمان کے یہ سنہرے اور گلابی رنگ اور سبزہ زار کا یہ حسن میرے خیال کو انگلستان میں لے جاتا ہے۔ وہاں کے درخت اور مرغزار مجھے یاد آرہے ہیں، اور فلسطین کی وہ چڑیاں جو درختوں پر بیٹھی ہوئی ہماری خون آلود تلواروں کی جھنکار سنا کرتی تھیں۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہوتا ہے گویا عرش میری بات سننے کے لئے جھک رہا ہے"

خدمتگار نہایت دلجمعی اور اطمینان سے بول رہا تھا اُس کی گفتگو ایک تہذیب یافتہ اور ذکی الحس انسان کے مانند تھی۔ شاید وہ یہ محسوس کررہا تھا کہ قدرت کے وسیع دل میں اس وقت خود اُس کے دل کو بھی کتنی آزادی حاصل ہے۔

سردار نے نگاہ اُوپر کو اُٹھائی اور اُس کے چہرے کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور کہا "اچھے نوجوان! معاف کرنا اس وقت

میری گفتگو کا مقصد یہ نہ تھا کہ قتل و خون کی باتیں کر کے تمہارے شاعرانہ جذبات کو پامال کروں۔ میں جنگ کی باتیں کر کے تمہارے دل کی لطیف کیفیات کو ٹھیس نہیں لگانا چاہتا۔ لیکن یہ تم بھی جانتے ہو کہ ایک نائیٹ خواہ کہیں بھی ہو اُس کے حالات کیسے ہوں، خزاں ہو یا موسم بہار، جنگل کی گھاس خشک ہو کر اُس کے گھوڑے کے سموں تلے روندی جا چکی ہو یا سرسبز و شاداب جھاڑیاں اور جنگلی پھول پتے اُس کا راستہ روکے کھڑے ہوں۔ ایک نسوانی چہرے کا ذکر ضرور کر سکتا ہے۔ میں یہ کہنے والا تھا کہ جب میری بیوی تمہارا خیر مقدم کرے گی تو اُس کا چہرہ ایک ایسی مسرت سے چمک رہا ہوگا جو سراپا تمہارے احسان کے شکر و سپاس سے معمور ہوگی۔ جس طرح ایک جنگجو کی بیوی کا چہرہ اپنے شوہر کے وفادار اور بہادر خادم کو دیکھ کر جگمگا اُٹھتا ہے اُسی طرح اُسی مسرت کے نور سے اُس کا چہرہ بھی منور ہوگا۔ اور اگر وہ تمہیں دیکھ کر مسرور نہ ہوئی تو وہ میری بیوی ہی نہ رہے گی۔

"لیکن مجھے خطرہ ہے کہ شاید تم اُس کے گھر کو پسند نہ کر سکو گے۔ خیمے میں بھی اور میدانِ جنگ میں بھی جہاں تک میں نے تم کو دیکھا تم بہت ہی کم گفتگو کرتے رہے۔ تمہاری خاموش اور متین زبان شاید عورت کی متجسسانہ اور باتونی فطرت کو اتنا خوش نہ کر سکے جتنا تمہارے ہاتھ ایک سنگین بھالے کو اٹھا کر ایک جنگجو کو خوش کر سکتے ہیں۔"

آہستہ آہستہ ممنونیت کے انداز میں خادم نے اپنا سر جھکا لیا اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک پنہاں مسکراہٹ جھلک اُٹھی لیکن اس مسکراہٹ نے دفعتہً اُس کے گالوں کو سرخ کر دیا یہ سرخی ایک گھر میں رہنے والی دوشیزہ کے چہرے کی سرخی سے بھی فزوں تر تھی۔ پھر اُس نے دھیمی اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا "مہربان آقا! آپ کی بیگم کا کاشانہ دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہوگی اور وہ مجھے بہت ہی پسند آئے گا!"

دریا کے اُس پار تقریباً ایک مِیل کے فاصلے پر سینٹ میری کے گرجے سے ماتمی راگ کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ لیڈی ایبس مر چکی تھی اور گرجے کی راہبہ عورتیں مل کر ایک افسردہ اور ماتم خیز آواز میں گا رہی تھیں۔

"اے خدا اے قادرِ مطلق! مرنے والوں پر تیری رحمت ہو"

یہ آواز دریا کی تیز رَو موجوں پر تیرتی ہوئی آگے بڑھتی تھی اور سبزہ زار کی خاموش فضا میں ایک مبہم سی افسردگی کو چھوڑ کر گم ہو رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ دریا کے اُس پار کی ہوا اس آواز کے ساتھ ہی سینٹ میری کے رب کی قربان گاہ کی پچاس ماتمی شمعوں کو اور کمسن سال راہبہ کے تابوت کو اور خود اُن نوجوان راہبہ عورتوں کو بھی چشمِ تصور کے سامنے لا رہی ہے جنہیں آج سے ایک ہفتہ پہلے وہ برکت دیا کرتی تھی۔ گانے والیوں کی آوازیں ایک خاص اثر تھا لفنا کے الم انگیز تاثرات میں شاید وہ لاش کو بھلا چکی تھیں اور اُن کے خیالات موت و زیست کے دشوار گزار ساحل سے ٹکرا رہے تھے۔

متواتر اور آہستہ آہستہ اُن کے گانے کی یہ منین اور افسردہ آواز اُٹھتی تھی:

"اے خدا، اے قادرِ مطلق! مرنے والوں پر تیری رحمت ہو"

اور یہ تمام الم انگیز نقشہ جس کو صرف آواز آنکھوں کے سامنے لا رہی تھی ہوا پر تیرتا ہوا آتا تھا کبھی چٹانوں سے ٹکراتا ہوا آگے بڑھتا اور کبھی پھر پیچھے ہٹ جاتا۔

دریا کے کنارے، جھکے ہوئے درختوں کی چوٹیوں پر سورج کی سرخ اور تیز کرنیں اپنے فطری سوز کا آخری پرتو ڈال رہی تھیں جب ایک ڈوبتی ہوئی آواز پھر سطحِ آب سے اوپر اُبھری:

"مرنے والوں پر تیری رحمت ہو"

ابھی تک نوجوان خدمتگار کے چہرے پر ہلکی سی سرخی موجود تھی۔ سردار نے یہ سب کچھ سنا لیکن خدمتگار کچھ نہ سُن سکا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے اپنے آقا سے کہا "جناب گو آپ ایک معزز سردار ہیں اور میں ایک خادم لیکن اگر میں نے کبھی آپ کی کوئی خدمت کی ہے تو میں اُس کے معاوضے میں آپ سے ایک سوال کرنے کی اجازت چاہتا ہوں، میرے لئے یہ آپ کی بیش بہا عنایت ہوگی" سردار نے اُسے سوال کرنے کی اجازت دی۔

خدمتگار نے کہا "کیا آپ کی بیگم کا چہرہ حسین ہے؟ کیا اُس کا چہرہ پیارا ہے؟ یا معمولی عورتوں کی طرح اُس میں کوئی بھی حسن نہیں"۔

دفعتہً سردار کے چہرے پر تاریکی چھاگئی ایک لمحہ تک وہ بالکل خاموش رہا اور اس ایک لمحہ میں خدمتگار کے چہرے پر عجیب اضطرابی کیفیت پیدا ہوگئی۔ لیکن پھر سردار نے اُسے مخاطب کرکے کہا "تم نے بیٹوں کی طرح میری خدمت کی ہے اگر تمہاری بجائے کوئی اور شخص مجھ سے یہ سوال کرتا تو میں کبھی اس کا جواب نہ دیتا۔ لیکن اس وقت جو کچھ تم پوچھتے ہو اُس کے بتانے کے لئے چاہئے تھا کہ میں اُس عورت سے محبت کرچکا ہوتا یا کم از کم اُسے پہلے سے جانتا ہی ہوتا۔ مگر اب یہ ایک بہادر کی شان کے خلاف ہے کہ وہ بخشش کا وعدہ کرچکا ہو اور پھر اُسے پورا نہ کرے جو کچھ میں جانتا ہوں وہ تم سے کہنے میں دریغ نہ کروں گا۔

سنو! میں نے دل اور جان کا وہ گراں بہا ہدیہ نہایت خاموشی کے ساتھ ادا کردیا۔ جس ہاتھ نے مجھ سے یہ ہدیہ طلب کیا تھا اُس نے میرے باپ کی عزت کو بچایا تھا اور میں اپنی عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اُس نے یہ ہدیہ بجا طور پر حاصل کیا۔ ارل الٹر میرے مرحوم باپ کا دوست ایک ضعیف العمر اور شریف الطبع شخص تھا۔ میں جس زمانے میں جنگ وجدل کی تیاریوں میں مصروف تھا اور مجھے معلوم نہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے ایک گستاخ نے میرے مرے ہوئے باپ پر

کوئی بہتان باندھا اور اُس کی شان میں نازیبا کلمات استعمال کئے۔ میرا باپ سنگِ مزار کے نیچے خاک ہو چکا تھا البتہ اُس کی قبر پر سنگ مرمر کا بُت ابھی تک دعا مانگ رہا تھا۔

اُس گستاخ نے سراسر جھوٹ بولا اور بہتان باندھا۔ اس لئے کہ میرے باپ کی تلوار اب پتھر کی ہو چکی تھی اور اُس کے قوی ہاتھ کی بجائے مرمر کے ایک بے حس مجسمہ کے ہاتھ میں تھی۔

ارل والٹر میرے باپ کی حمایت کے لئے اٹھا، والٹر کی تلوار ابھی خود اُس کے بہادر ہاتھ میں تھی پتھر کی نہیں بلکہ فولاد کی چمکتی ہوئی تلوار جس نے گستاخ دشمن کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لیکن افسوس بہادر ارل زخم کھا کھا کر بالکل ناتوان ہو چکا تھا۔ دفعتہً اُس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور آن کی آن میں اُس کا بے جان جسم دشمن کی لاش پر گرا ہوا تھا۔

آہ! کاش یہ لڑائی میرے ہی ہاتھوں لڑی جاتی، کاش میری ہی تلوار دشمن کے خون سے رنگین ہوتی اور وہ تمام زخم میرا ہی جسم برداشت کرتا جن سے ہمارا دوست جان بر نہ ہو سکا۔ ایک دوست کی ہلاکت اور جبری شادی کی انگشتری پہننے سے یہ کہیں بہتر ہوتا کہ میری لاش دشمن کی لاش کے ساتھ خاک و خون میں تڑپتی ہوتی۔

ارل والٹر کے گھر میں ماتم کا شور برپا تھا لیکن اُس کی نیک دل بیوی کی آنکھ سے کوئی آنسو نہ نکلا۔ اُس کی زبان بالکل خاموش تھی مگر اُس کی یہ حسرتناک خاموشی نالہ و بکا سے کہیں بڑھ کر جگر دوز تھی۔

اُس کے شوہر کا جنازہ تیار ہو چکا تھا آخر وہ بولی "جاؤ جس قدر جلد تم جا سکتے ہو اور اُس کے بیٹے کو، میرے شوہر کے دوست کے بیٹے کو، جہاں کہیں بھی وہ ہو بلا کر لے آؤ۔ میرے شوہر کی لاش میرا انتظار کر رہی ہے۔ لیکن میری بچّی کا خیال آہ! وہ مجھے جانے سے روکتا ہے۔"

جب مَیں اُس کے سامنے حاضر ہوا اُس نے کہا تمہارے پیارے باپ کی عزت کو بچانے کے لئے جب تم یہاں نہیں تھے میرے شوہر نے جان دے دی۔ اب میں خود بھی مر رہی ہوں اُس کی روح میری روح کو اُن پُراسرار زنجیروں سے اپنی طرف کھینچتی ہے جن کا ہر حلقہ محبت کے لفظ سے تعمیر کیا گیا تھا لیکن مرنے سے پہلے میں تم سے ایک اقرار لیتی ہوں تمہارے باپ کے ننگ و نام کی حفاظت کے لئے ایک لڑکی یتیم ہو گئی میرے بعد وہ بالکل بے کس و تنہا ہو گی تم اُس سے شادی کر لو اور جب وہ تمہاری بیوی ہو جائے گی تو میں اطمینان سے جان دے سکوں گی۔

میں نے کہا میرا گھوڑا میرے انتظار میں قلعے کے نیچے ہنہنا رہا ہے اور میری کشتی دریا کے کنارے پانی میں ہل رہی ہے میں مقدس لڑائی لڑنے کی قسم کھا چکا ہوں اور اب اس عہد کو توڑ نہیں سکتا۔ مجھے واپس جانے کی جلدی ہے۔

بہت جلد انگشتری لائیے اور پادری بھی بلوایا جائے اور لڑکی کو بھی ـــــــ جب میں فلسطین کے میدان جنگ میں لڑ رہا ہوں گا وہ میرے محل اور قلعے کا انتظام کرے گی۔

لڑکی ایک ایسے کمرے میں تھی جس کی دھندلی سی روشنی کو تاریکی ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اے نوجوان! تُو جانتا ہے کہ میں وہاں کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا اور اُس وقت میرے تمام خیالات پر صرف جنگ کا شوق محیط تھا۔ میرا گھوڑا کئی بار ہنہنایا اور پادری اب نکاح پڑھ کر جلد جلد دعا مانگ رہا تھا۔ اُس کی ماں مسکرائی اور یہ دائمی مسکراہٹ تھی جیسے زندگی کی کوئی تلخی اب اُس کے لبوں سے جدا نہ کرسکتی تھی۔ دلہن نے آہستہ آہستہ اپنی مری ہوئی ماں کے پلنگ پر جُھک کر اُس کا منہ چوما۔"

سردار نے مڑ کر اپنے خدمتگار کے چہرے پر نگاہ ڈالی اور گھبراہٹ کے لہجے میں کہا "میرے خدمتگار میرے اچھے خدمتگار! تمہیں کیا تکلیف پہنچی کہ تمہاری آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں۔

خدمتگار نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "آہ میرے آقا! بالکل اسی طرح میری بہن کی سرگذشت بھی ہے لیکن اُس نے اپنا عروسی جوڑا اتار دیا اور خدمتگار کے بھیس میں اپنے شوہر کے پیچھے چلی گئی" خدمتگار رونے لگا لیکن سردار بے پروائی سے ہنسا اور کہنے لگا "تمہاری بہن کے لئے شاید یہ درست ہو لیکن یہ بات ایک نائیٹ کی بیوی کے شایانِ شان نہیں۔ کم از کم میں کبھی گوارا نہ کرسکتا کہ میری بیوی ایک ذرا سی بات پر بزدلی کر کے اپنی نسوائیت کو یوں چھوڑ دیتی۔ جو عورت اپنی نسوائیت کو چھوڑ دے خواہ وہ خوبصورت ہو خواہ بدصورت میں اُسے اپنی محبت کے قابل نہیں سمجھتا"

خدمتگار ایک خشک ہنسی ہنسا اور اُس نے کہا "شاید آپ کی دانست میں نسوانیت یہی ہے کہ زرتار لباس اور جگمگاتے زیور پہن لئے جائیں۔ لیکن نسوانیت محض رنگین لباس اور سنہرے زیور پہن لینا نہیں۔ نسوانیت سچی محبت، وفا، اور جاں سپاری کا نام ہے۔ نسوانیت یہ ہے کہ انسان دوسرے کے لئے اپنی جان سے گذر جائے"

پھر اُس کے آنسو اُس کی آنکھوں میں جذب ہوگئے اور وہ کرخت ہنسی اُس کے ہونٹوں سے غائب ہوگئی۔ چند لمحوں تک وہ خاموش رہا اور پھر بالکل متین آواز میں یوں کہنے لگا "جب خیمے میں سب سوئے ہوتے وہ عورتوں ہی کی طرح راتوں کو جاگ کر اپنے شوہر کے لئے دعائیں مانگا کرتی تھی اور اُس وقت عورتوں ہی کی طرح اُس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے جو اُس کی نسوائیت کو اور زیادہ پاکیزہ کر دیتے تھے۔ میدانِ جنگ میں جب وہ اپنے شوہر کو دشمن کی فوج میں گھرا ہوا دیکھتی تو عورتوں ہی کی طرح فکر و تشویش کے مارے اُس کا رنگ اپنے خود کے نیچے زرد پڑ جاتا تھا"

سردار نے کہا "تم نے بہت اچھا افسانہ سنایا اگر اس قصہ کو ایک افسانہ سمجھ کر سنا جائے تو یہ نہایت ہی دلچسپ

افسانہ ہوگا۔ لیکن میرے خیال میں خود اپنی بیوی کے لیئے کوئی شخص اس قسم کا خیال بھی گوارا نہیں کرسکتا۔ تمہاری بہن شاید اسی کو بہترین وفاداری سمجھتی ہو۔ لیکن میں اپنی بیوی کی وفاداری، بہادری اور خدمت گذاری سب اسی میں سمجھتا ہوں کہ وہ گھر میں رہ کر میرے لئے دعا مانگے۔ اور میری محبت میں اُس کا چہرہ زرد ہو نہ کہ میدانِ جنگ میں مجھے دشمن کے ساتھ نبرد آزما دیکھ کر۔ میں چاہتا ہوں کہ اُس کے نسوانی آنسو سپاہیانہ خود کی بجائے نسوانی نقاب ہی میں بہیں۔ اور اُس کا نسوانی غرور کبھی اُسے گھر سے نکلنے کی اجازت نہ دے۔"

خدمتگار نے کہا "اچھا فرض کیجئے آپ کی بیوی آپ کے مزاج سے ناواقف ہوتی اور اس طرح بھیس بدل کر آپ کے پیچھے چلی جاتی اور جب اُسے معلوم ہوتا کہ آپ اُس کی اس بات کو اچھا نہیں سمجھتے تو وہ آپ کے پاؤں پر گر جاتی اور اپنے قصور کی معافی چاہتی۔ جس طرح ایک مجرم جاں بخشی کے لئے التجا کرتا ہے وہ بھی اپنا قصور معاف کرانے کے لئے آپ سے التجا کرتی تو کیا آپ اُسے معاف کر دیتے؟"

سردار نے کہا "ہاں میں اُسے ضرور معاف کر دیتا لیکن پھر کبھی اُس سے اپنی بیوی کی حیثیت سے محبت نہ کرسکتا میں اُس سے محبت کرتا لیکن ویسی ہی محبت جیسی ایک آقا اپنے وفادار غلام سے کرتا ہے"۔ پھر سردار نے نظر اُٹھا کر اوپر دیکھا جہاں آسمان پر ایک سفید اور چمکیلا بادل تیر رہا تھا۔ اُس نے کہا "دیکھو وہ سفید اور تنہا بادل آسمان پر کس قدر خوشنما اور پیارا معلوم ہوتا ہے اسی طرح بلند، اسی طرح پاکیزہ، اور اسی طرح الگ تھلگ عورت کی عزت ہونی چاہیئے۔"

خدمتگار نے نظر اٹھا کر دیکھا بادل واقعی سفید اور چمکیلا تھا لیکن اُس کی نظر کے سامنے غم کا ایک تاریک بادل حائل ہو رہا تھا۔ اُس نے اپنی آنکھیں نیچی کرلیں اور پھر پہاڑی کی طرف غور سے دیکھا اُس نے دل میں کہا یہ کیا ہے؟ لیکن جلد ہی وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ عرب سوار بڑھے چلے آرہے تھے۔ اُس کے آقا نے کچھ نہ دیکھا اور نہ وہ کچھ سمجھ سکا۔

خدمتگار نے نہایت مطمئن اور ہلکی آواز میں کہا "میرے آقا! اپنے گھوڑے کو ذرا زیادہ تیزی سے چلایئے اس سے پہلے کہ اندھیرا ہو جاتے آپ کو منزل پر پہنچ جانا چاہیئے ذرا تیز تیز چلیئے"۔ سردار نے کہا "ہاں اور تم بھی ذرا تیزی سے چلو اب تاریکی بڑھ رہی ہے"۔

خدمتگار نے کہا "آپ چلیئے میں ذرا اپنے خود کو ٹھیک کر کے باندھ لوں، یہ ڈھیلا ہوگیا ہے اور بار بار گھوڑے کی پیٹھ کو لگتا ہے۔ دوسرے میں اس جگہ دعا مانگنا چاہتا ہوں ایک ایسے شخص کے لئے جسے میری دعا کی بے انتہا ضرورت ہے اور میں اُس سے وعدہ کرچکا ہوں۔ آپ اپنے گھوڑے کو تیز لے جایئے، رات ہونے سے پہلے میں بھی آپ سے آملوں گا۔

جس طرح وہ روحیں جنہیں مفارقت کی تاب نہ ہو محبت کی زنجیروں میں جکڑی اپنے محبوب کے ساتھ وابستہ رہتی ہیں۔
سردار خدمتگار کی اس دل لگی پر ہنسا اور اپنا گھوڑا وادی میں تیز دوڑانا شروع کیا۔ اگر وہ اپنے خدمتگار کے چہرے کو دیکھتا تو اُسے وہاں کوئی مسکراہٹ نظر نہ آتی اور وہ اُسے یوں تنہا چھوڑ کر کبھی نہ جاتا۔ اگر وہ مڑ کر ایک نظر بھی اس محزوں چہرے پر ڈال دیتا تو وہ ضرور واپس لوٹ آتا۔

نوجوان کے چہرے پر شدید غم والم طاری ہو گیا تھا اُس کی ایک ایک حرکت سے عجیب وحشت برستی تھی جب وہ اپنا خود وغیرہ زین پر ڈال رہا تھا اور اپنے گھوڑے کو میدان میں کھلا چھوڑ رہا تھا۔

سردار کا گھوڑا آگے بڑھ گیا اور خدمتگار تنہا زمین پر بیٹھا ہوا اُسے دیکھ رہا تھا۔

اُس نے اپنے ہاتھوں کو زور سے بھینچا شاید وہ اپنی روح کی تکلیف کو اسی طرح کم کرنا چاہتا تھا بے اختیار اُس کی زبان سے یہ جملے نکلنے لگے۔

"آہ میں نے اپنی نسوانیت کو تمہاری زوجیت پر قربان کر دیا۔ تمہاری یہ آخری جھلک مجھے نظر آ رہی ہے، اب میری آنکھیں اس زندگی میں تمہیں کبھی نہ دیکھ سکیں گی۔ جاؤ خدا تمہارا حافظ و ناصر ہو اور تمہیں ایک ایسی ہی بیوی ملے جیسی تم چاہتے ہو جس میں نسوانی غرور بہت زیادہ ہو۔ خواہ وفا اُس سے آدھی ہو جسے تم پیچھے چھوڑ رہے ہو۔ اور خدا مجھے اپنی طرف اٹھا لے اگرچہ میں کبھی اُس سے اتنی محبت نہیں کر سکی جتنی میں نے ایک انسان سے کی ہے"!

زمین پر ہر طرف اُسے مایوسی ہی مایوسی نظر آئی اور عجیب بے بسی کے عالم میں اُس کی نگاہ آسمان کی طرف اُٹھ گئی۔ ابھی تک وہ بادل جس کا ذکر اُس کے شوہر نے کیا تھا۔ آسمان پر ویسے ہی تیر رہا تھا ویسا ہی تنہا، ویسا ہی الگ تھلگ ویسا ہی پاکیزہ۔ پھر اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور اُس کی لمبی اور سیاہ پلکوں سے دو شفاف آنسو نکل کر اُس کے رخساروں پر بہنے لگے۔

گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز اب قریب سے سنائی دے رہی تھی۔ عرب نزدیک آ گئے تھے اور یہ آواز سن کر بے وفا خدمتگار جو اپنے آقا کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ چکا تھا یا وفادار عورت جو اپنے شوہر پر اب اپنی زندگی کو بھی قربان کر رہی تھی بالکل خاموش ہو گئی وہ اُن کے درمیان بالکل ساکت وصامت کھڑی تھی۔

ایک دل جس کو محبوب نے توڑ دیا ہو خوفناک سے خوفناک دشمن کے مقابلے کے لئے بھی تیار ہو جاتا ہے۔

ایک عرب نے بڑھ کر کہا "او نصرانی غلام! تیرے پاس بھیڑیں ہیں یا شراب پلا کر کھڑا ہے"!

اُس نے نہایت دلجمعی سے سکون آمیز آواز میں جواب دیا "میں اپنے آقائے نامدار کے لئے لڑنے اور جنگ کرنے

کے لئے تیار ہوں نہ کہ بیہودہ دعوتیں دینے کے لئے۔ اگر میرا بہادر آقا سر ارہیوبرٹ یہاں ہوتا میرا پیارا آقا! تو تمہیں کھڑے ہوکر سوال کرنے کی جرأت بھی نہ ہوسکتی۔"

عرب نے کہا "مغرور غلام تیرا آقا کہاں ہے جلد بتا تاکہ ہم اُس کی مشکیں کس لیں یا ہمارے برچھے ابھی تیری آنکھوں کے سامنے اُسے کیفرِ کردار کو پہنچا دیں۔"

اُس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا "ادھر اُدھر کہیں مرغزار میں ڈھونڈلو اگر تم تلاش کرسکتے ہو تو کرلو۔ اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ تمہارے کافر سردار اُس کے پیچھے بھاگنے سے اُس کے سامنے زیادہ تیزی سے بھاگتے ہیں۔"

عرب نے کہا "جھوٹے بے ایمان غلام چپ رہ تجھے جان سے مار ڈالیں گے۔"

اُس نے کہا "میری تلوار جو نیچے پڑی ہے اگر میرے ہاتھ میں ہوتی تو مجھ سے بھی اچھی طرح تمہاری بات کا جواب دیتی۔"

عرب ٹوٹ پڑے وہ اُس کے بال کھینچتے تھے اور اُسے مارتے تھے۔

فرشتوں کی سی بے لوث اور پاکیزہ محبت کرنے والی، خاموشی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو رہی تھی۔ ایک نیزہ چمکا اور ہلکی سی جھنکار سنائی دی۔ اُس کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی اور ایک نور جس سے مرتے وقت معصوم چہرے جگمگا اُٹھتے ہیں اُس کے چہرے پر نظر آیا ——— اور پھر ہر طرف خاموشی چھاگئی۔

سینٹ میری کے گرجے سے اب بھی ماتمی راگ کی آواز سنائی دے رہی تھی:-

"تیرے لئے ہمارے دل اندوہ گین ہیں اور ہم تیرا ماتم کرتے ہیں، آہ ہم تیرا ماتم کرتے ہیں۔"

یہ متین اور افسردہ آواز دریا کی موجوں پر تیرتی ہوئی جنگل اور مرغزار کی طرف بڑھتی چلی آرہی تھی اور اس آواز کے ساتھ ہی سینٹ میری کے گرجے کا پورا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ رہا تھا۔ پچاس روشن ماتمی شمعیں، اور خود بوڑھی راہبہ سیاہ کفن پہنے اپنے تابوت کے اندر پڑی تھی اور غم و اندوہ میں ڈوبی ہوئی راہبہ عورتیں گا رہی تھیں۔

یہ ماتمی راگ اُس عورت کے لئے گایا جارہا تھا جس کی لاش کفن میں تابوت کے اندر پڑی تھی لیکن یہی راگ ہوا ایک بے گور و کفن خدمتگار با وفا شعار عورت کی لاش تک پہنچا رہی تھی جس کی پیشانی پر شبنم کے قطرے گر رہے تھے۔

ہر طرف عجیب حسرت چھا رہی تھی اور دور دراز کے فاصلے طے کرتی ہوئی ایک دھیمی پُرالم آواز آتی تھی۔

"تیرے لئے ہمارے دل اندوہ گین ہیں اور ہم تیرا ماتم کرتے ہیں، آہ ہم تیرا ماتم کرتے ہیں۔"

ترجمہ ز۔ب

کسی خیال میں

عرصۂ عالم پہ خاموشی سی چھا جاتی ہے جب
اور سو جاتا ہے مغرب کی لحد میں آفتاب
منہ چھپا لیتا ہے تاریکی کے پردے میں جہاں
اور پہن لیتی ہے دنیا ظلمتِ غم کی نقاب

اُس سکوتِ شام اُس خاموشیٔ پُر کیف میں
کرتی ہے آ آ کے تیری یاد دل کو بے قرار
تھام لیتا ہوں جگر کو کھینچ کر اک آہِ سرد
یاد پر کرتا ہوں تیری اشک کے گوہر نثار

آہ وہ میری محبّت اور وہ تیری سادگی
عشق اپنے حسن اپنے حال میں مستانہ تھا
عشق نوکِ خارِ بے تابی سے تھا ناآشنا
حسنِ بے پروا ابھی مشقِ ناز سے بیگانہ تھا

یہ سرِ پُر شور تھا بیگانۂ جوشِ جنوں
اور دلِ وحشی کو شوقِ دشت پیمائی نہ تھا
تُو بھی ناواقف تھا احساسِ نگاہِ شوق سے
مائلِ جور و جفا محوِ خود آرائی نہ تھا

دل میں پھر ہوتا ہے دریائے محبّت موج زن
اور سرور و کیف کی موجوں میں کھو جاتا ہوں میں
چپکے چپکے یاد پھر کرتا ہوں تجھ کو بار بار
لب پہ تیرا نام ہوتا ہے کہ سو جاتا ہوں میں

اثر صہبائی

سرگوشیاں

ہماری کوتاہیوں پر دنیا ہمیں کیا شرمائے گی کہ غلطیوں کے اعتراف پر ہی ہماری محبت کا انحصار ہے!
خدا نہ کرے کہ ہم لغزشوں کی پردہ پوشی کئے جائیں، خدا نہ کرے کہ یوں ہماری محبت کی بیخ کنی ہوتی جائے،
خدا نہ کرے کہ ہم کہیں کچھ اور اور کریں کچھ اور!

اگر دنیا مجھے تجھ سے ملنے نہ دے گی تو میں اپنے جی کو اداسی سے بھر لوں گا!
میری نگاہیں آسماں کی طرف اٹھ جائیں گی اگر دنیا مجھے تجھ سے ملنے نہ دے گی!
اگر دنیا مجھے تجھ سے ملنے نہ دے گی تو میں دنیا میں ہر ایک سے ملنے کے لئے چل نکلوں گا!

اے خدا! ہمیں دکھ دے تاکہ ہم سکھ پائیں!
اے خدا! ہمیں رلا کہ ہم مسکرا سکیں!
اے خدا! ہمیں اک دوسرے سے جدا کر دے تاکہ آخر کار ہم مل جائیں!

پاؤں لڑکھڑا رہے ہیں جسم کانپ رہا ہے آہیں اٹھتی ہیں اور آنسو گرتے ہیں ـــــــ محبت قوت چاہتی ہے اور میری کمزوریوں کی انتہا نہیں!
زندگی! تو جو محبت کے لطف اٹھانا چاہتی ہے موت کے دکھ میں سے ہو کر گزر کہ تجھے محبت کی صورت نظر آجائے!

کروڑوں ساعتوں میں وہ ایک ساعت کس قدر مرغوب و محبوب ہے جب بچھڑے ہوئے دل اک دوسرے سے مل جائیں!
جدائی اپنے کروڑوں آنسوؤں سے وہ لعل تیار کرتی ہے جس کا نام دیدِ دوست ہے!

جلیس

مرگِ حسرت

ستمبر کی ایک سرد اور تاریک رات کا ذکر ہے کہ ایک کنبہ انگیٹھی کے گرد بیٹھا ہوا باتوں میں مصروف تھا۔ کمرہ خوب روشن اور گرم تھا۔ انگیٹھی میں وہ لکڑیاں ڈالی جا رہی تھیں جو انہوں نے سہ پہر کے وقت ندی کے کنارے پر سے چنی تھیں۔ وہ سب بہت خوش تھے۔ ماں اور باپ کے چہروں سے اطمینان و شادمانی کے آثار ہویدا تھے۔ بڑی لڑکی جس کی عمر سترہ برس کے قریب ہوگی مسرت کی ایک حقیقی تصویر معلوم ہوتی تھی۔ بچوں کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے۔ ان کی بوڑھی دادی کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی ہوئی اپنے بچوں کو مسرور دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ غرض کہ یہ سب اپنی اپنی جگہ اس قدر خوش اور مطمئن تھے۔ جیسے انہیں ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ آگئی ہے۔ وہ ایک ویران اور تنہا مقام پر رہتے تھے جو شہروں کی آبادی سے کوسوں دُور تھا۔ موسمِ سرما میں دن بھر پہاڑوں پر سے ہوا کے سرد جھونکے آآکر اُن کی جھونپڑی کو یخ کی طرح سرد بنا جاتے۔ ان کا مکان بہت خطرناک مقام پر تھا۔ کیونکہ وہ ایک بہت بڑے پہاڑ کے نشیب میں واقع تھا جس پر سے ہر وقت پتھر لڑھک لڑھک کر نیچے گرتے رہتے اور اکثر آدھی رات کے وقت بھی کوئی بڑا سا پتھر گرتا اور ان کی پُر سکون نیند میں خلل انداز ہو کر انہیں چونکا دیا کرتا۔

اثنائے گفتگو میں بڑی لڑکی نے کوئی مذاق کی بات کی جس پر سب ہنس پڑے۔ اس وقت پہاڑ پر سے ہوا کا ایک سرد جھونکا آیا اور اُن کی جھونپڑی کے دروازے کو غم انگیز سرسراہٹ سے کھٹکھٹاتا ہوا گذر گیا۔

ایک لمحے کے لئے اُن سب کے دلوں پر افسردگی طاری ہوگئی۔ لیکن جلد ہی وہ پھر خوش ہوگئے۔ کیونکہ ایک شخص نے دروازہ کھولا جس کے قدموں کی چاپ وہ ہوا کی سسکیاں بھرتی ہوئی آواز کی وجہ سے نہ سن سکے تھے۔

اکثر تاجر اور مسافر وغیرہ جو دُور و دراز کا سفر کرتے ہوئے آتے بعض اوقات ان کی جھونپڑی میں رات بسر کیا کرتے تھے۔ اور ایک شہر سے دوسرے شہر کو جانے والی گاڑیاں جب اُن کے مکان کے سامنے سے گذرتیں تو اکثر ان کے دروازے پر کسی ضرورت کے لئے رکا کرتی تھیں۔ وہ تنہا سفر کرنے والے مسافر جن کی رفیق صرف لکڑی کی ایک چھڑی ہوتی تھی اپنی تنہائی کی کلفت کو کم کرنے کے لئے چند گھنٹے اس خوش و خرم کنبے کے پاس گذار جاتے تھے۔ یہ لوگ بہت مہمان نواز تھے۔ اگرچہ وہ مسافروں سے اُن کے کھانے وغیرہ کا معاوضہ لے لیا کرتے مگر گھر کا ہر فرد اس تھوڑے سے معاوضہ کے بدلے میں نہایت خلوص اور تن دہی سے مہمان کی تواضع میں مصروف رہتا۔ اور اسے گھر سے بھی زیادہ آرام

پہنچایا جاتا۔

اس اجنبی کو دیکھ کر وہ سب اس طرح اُٹھ بیٹھے گویا پہلے ہی سے اس کے منتظر تھے۔ نوجوان کے چہرے پر سردی اور رات میں تنہا سفر کرنے کی وجہ سے افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ مگر اپنا پُرخلوص خیر مقدم دیکھ کر جلد ہی اس کے چہرے سے پژمردگی کے آثار دور ہو گئے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل خود بخود ان لوگوں کی طرف کھنچا جا رہا ہے۔

لڑکی کی ایک خلوص آمیز نگاہ اور مسکراہٹ نے اُس کے لئے اجنبی کے دل میں ایک معصوم سی بے تکلفی پیدا کر دی۔ مسافر نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ آگ مجھے اس وقت بہت خوشگوار معلوم ہو رہی ہے۔ بالخصوص جب ایسے اچھے لوگ اس کے گرد جمع ہیں۔ صاحب خانہ نے ایک کرسی اس کے سامنے پیش کی۔ وہ بیٹھ گیا اور بولا میں سردی سے ٹھٹھر رہا ہوں، باہر کی سرد ہوا میرے جسم میں خون کو جمائے دیتی تھی، اس لئے میں رات بسر کرنے کے لئے یہاں آ گیا ہوں۔ میں ساکو کی وادی کی طرف سے آرہا ہوں اور صبح اٹھ کر برلنگٹن کو چلا جاؤں گا"

اتنے میں باہر سے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ سب نے اپنے سانس روک لئے کیونکہ وہ حقیقت سے آگاہ تھے۔ اجنبی نے بھی اُن کی تقلید کی۔ صاحب خانہ نے مسکراتے ہوئے کہا کہن سال پہاڑ نے ہم پر پتھر پھینکا ہے تاکہ ہم اسے بھول نہ جائیں۔ وہ کبھی کبھی یوں ہی سر ہلا کر ہمیں ڈرا دیا کرتا ہے۔ مگر خیر ہم نے بھی اس سے بچنے کے لئے ایک ایسا مقام تجویز کر رکھا ہے جہاں خطرہ کے وقت جا کر محفوظ ہو جائیں۔

اب اجنبی نے اپنا کھانا اور بھنا ہوا گوشت ختم کر لیا اور مسرت آمیز لہجہ میں ان سے گفتگو کرنے لگا۔ اس نے بہت سے ملکوں کی سیر کی تھی اور تن تنہا دور دراز کے سفر کر چکا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ایک تنہا زندگی بسر کر رہا تھا، اور ان لوگوں سے ہمیشہ الگ رہنے کی کوشش کرتا جو اُس کے بے تکلف دوست ہو سکتے تھے۔ اُس کی طبیعت میں بہت خودداری اور شرافت تھی۔ اس کی عادت تھی کہ وہ کسی سے زیادہ بے تکلف نہ ہوتا مگر ان سیدھے سادے لوگوں میں خدا جانے وہ کون سی بات تھی جس نے اُس کے دل میں ان کی طرف سے ایک یگانگت کا جذبہ پیدا کر دیا۔ اُس نے ان سادہ دل پہاڑیوں کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ اور وہ لوگ بھی اپنے گھر کی باتیں نہایت بے تکلفی سے اس کے سامنے کرنے لگے۔ وہ یوں گفتگو کر رہے تھے جیسے برسوں کے دوست ہوں۔ نوجوان کو ان لوگوں میں ایک خاص شعریت نظر آتی تھی۔ یہ غالباً اُن تاثرات کا نتیجہ تھی جو انہوں نے ان پہاڑوں، غاروں اور آبشاروں سے مستعار لئے تھے۔

نوجوان کے حوصلے بہت بلند تھے اُس کی تمنا تھی کہ دنیا میں اس کا نام زندۂ جاوید ہو جائے۔ اور اسے کامل یقین تھا کہ وہ اپنے اس مقصد کے حصول میں کامیاب ہو کر رہے گا۔ اس کا خیال تھا کہ زندگی میں خواہ دنیا والے میری قدر

نہ پہچانیں مگر میرے بعد وہ دن آئے گا۔ جب لوگ میرا نام نہایت عزت و احترام سے لیں گے۔ اس خیال نے اس کے دل میں ایک امید پیدا کر دی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس سفر ہی میں مجھ پر شہرت اور ناموری کا کوئی آفتاب طلوع ہوگا اور میری زندگی میں خواہ کوئی اس سے واقف نہ ہو مگر آئندہ نسلیں جب ماضی کی طرف نظر دوڑائیں گی تو انہیں میرے پائے رفتہ کے نقوش میں ایک ایسی روشنی نظر آئے گی جو بزم ہستی کو جگمگا دے گی اور انہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ دنیا میں ایک شاندار اور قابل ہستی کبھی رہ چکی ہے۔ اس نے اپنے میزبانوں کے سامنے ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کیا۔ اگر میں اب مر جاؤں تو دنیا والے مجھے اتنا بھی نہ جانیں جتنا کہ آپ جانتے ہیں یعنی یہ کہ ایک شخص رات کے وقت ساکو کی وادی کی طرف سے آیا تھا اور صبح برنگٹن کو چلا گیا۔ مگر نہیں ابھی مجھے زندہ رہنا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میں اُس وقت تک ہرگز نہ مروں گا جب تک اپنا کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا لوں۔ مجھے دنیا میں اپنی ایک زبردست بنیاد قائم کرنی ہے۔ اور مجھے پوری امید ہے کہ میں ضرور کامیاب ہوں گا۔

گھر کے سب آدمی حیرت سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے نوجوان کے اُن خیالات کو سن کر جوان کے لئے بالکل انوکھے تھے وہ سخت متعجب تھے کہ یہ کیسا آدمی ہے۔ نوجوان یہ دیکھ کر بولا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ مجھ پر ہنستے اور مجھے احمق خیال کرتے ہونگے اور میری یہ باتیں آپ کو ایسی ہی معلوم ہوتی ہونگی جیسے کوئی یہ چاہے کہ میں رات کے وقت کسی بلند پہاڑ کی چوٹی پر جا بیٹھوں اور جب وہاں برف اور سردی کی وجہ سے جم جاؤں تو لوگ مجھے دیکھیں اور میری تعریف کریں کہ میں کیسی بلند جگہ پر بیٹھا ہوں۔

لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا میں تو اس پُرسکون اور پُرامن مکان میں آگ کے سامنے بیٹھنا زیادہ پسند کرتی ہوں خواہ مجھے کبھی کوئی نہ جانے۔

اس کا باپ بولا "جو کچھ یہ نوجوان کہہ رہا ہے وہ صحیح ہے۔ اگر میں اپنی طبیعت کو اس طرف متوجہ کرتا تو میرے دل میں بھی ایسے ہی خیالات پیدا ہوتے جو اس کے دل میں موجزن ہیں (اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر) اس لڑکے کی باتوں نے آج میرے دل میں بھی ایسے خیالات پیدا کر دیئے ہیں جن کے پورا ہونے کا ذرا بھی امکان نہیں"۔

وہ بولی "شاید ہو ہی جائے۔ کیا وہ یہ سوچ رہا ہے کہ اگر میری بیوی مر جائے تو میں کیا کروں گا" اس کا شوہر اس بات سے بہت شرمندہ ہوا۔ اور بولا "نہیں نہیں وہ یہ نہیں کہہ رہا تم اس کی بات کو نہیں سمجھیں۔ لیکن جب میں تمہاری موت کا خیال کرتا ہوں تو ساتھ ہی مجھے اپنی موت کا خیال بھی آجاتا ہے"۔ اس کے بعد وہ بولا "میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ کبھی ہمارا کوئی ایسا کھیت ہوتا جو خطرہ کی جگہ واقع نہ ہوتا۔ لوگ مجھے رئیسِ بلدہ کہتے اور میں شہر میں جا کر اپنے گاؤں کی نمائندگی

کیا کرتا اور جب میں بوڑھا ہو کر مرنے لگتا تو تم سب اس وقت میرے آس پاس ہوتے۔ اور میری قبر پر ایک پتھر نصب کرکے اُس پر میرا نام لکھا جاتا۔ خواہ وہ ایک معمولی پتھر ہوتا یا سنگ مرمر۔"

اجنبی بولا "دیکھا یہ بات انسان کی فطرت ہی میں داخل ہے کہ وہ ضرور دنیا میں اپنی یادگار باقی رکھنا چاہتا ہے خواہ لوحِ مزار پر خواہ انسانوں کے دلوں میں وہ اپنی عزت و عظمت کا غیر فانی نقش چھوڑ جانا چاہتا ہے۔"

یکایک عورت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ غمناک آواز میں بولی "آہ معلوم نہیں آج ہم سب کو کیا ہو گیا ہے کہ ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ جب اس قسم کی باتیں ہوا کرتی ہیں تو ضرور کوئی نہ کوئی مصیبت آتی ہے۔" اُس کے شوہر نے گفتگو کا رخ بدل دیا اور وہ سب چھوٹے بچوں کی باتیں کرنے لگے۔ سب بچے اپنے اپنے بستر میں لیٹ چکے تھے۔ وہ بھی آج اپنے بڑوں کی گفتگو سے متاثر ہو کر اسی قسم کی باتیں کر رہے تھے کہ ہم جب بڑے ہو جائیں گے تو کیا کیا کریں گے۔

ایک بچہ اپنے بھائی بہنوں کو چھوڑ کر اپنی ماں سے مخاطب ہو کر بولا "اماں اس وقت میرا جی چاہتا ہے کہ یہ اجنبی اور ہم سب گھر سے باہر نکل جائیں اور پہاڑ پر چڑھ کر اُس چشمے سے جو پہاڑ کی چوٹی پر سے نیچے کو بہتا ہوا آتا ہے پانی پی آئیں۔"

بچے کی اس نرالی خواہش پر سب ہنس پڑے۔ جو اس روشن کمرے اور اپنے گرم بستر کو چھوڑ کر باہر تاریکی اور برف کی سی سرد ہوا میں جانے کا آرزو مند تھا۔

باہر سے ایک گاڑی کے چلنے کی آواز آئی جو اُن کے دروازے پر آ کر رک گئی۔ لڑکی نے اپنے باپ سے کہا کہ وہ دروازہ کھول کر اُن سے دریافت کرے شاید وہ اسے بلا رہے ہیں۔ لیکن اُس نے جواب دیا اگر انہیں اندر آنا ہوگا تو خود ہی آ جائیں گے۔ میں نہیں جاتا اس طرح وہ سمجھیں گے کہ میں اس بات کا حریصانہ طور پر خواہشمند ہوں کہ وہ ہمارے ہاں ٹھہریں۔ لیکن انہوں نے گھوڑے کو ایک چابک لگایا اور گاڑی آگے چلی گئی۔ وہ بچہ پھر بولا۔ اماں یہ گاڑی ہمیں چشمے پر لے جا سکتی ہے۔ سب اس بات پر ہنس پڑے مگر لڑکی پر یکایک افسردگی چھا گئی۔ بے اختیار اُس نے ایک سرد آہ بھری لیکن ساتھ ہی اُس کے چہرے پر شرم سے سرخی آگئی۔ کیونکہ وہ دوسروں سے اپنی آہ کو چھپانا چاہتی تھی۔ مگر نہ چھپا سکی۔ اس نے ندامت آمیز نگاہ سے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کسی نے سنا تو نہیں۔

اجنبی نے اُس سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ وہ ہنسی اور اُس نے جواب دیا کہ "کچھ نہیں۔ یوں ہی مجھے اس وقت تنہائی سی محسوس ہوئی تھی۔"

سادہ دل پہاڑی لڑکی اور مہذب اور شریف اجنبی کے دل میں جو وہاں صرف ایک رات گذارنے کے لئے آیا تھا اور صبح وہاں سے ہمیشہ کے لئے چلا جانے والا تھا۔ شاید محبت کا ایک نہایت ہی لطیف اور پاکیزہ جذبہ پیدا ہو رہا تھا جس کی نشوونما شاید جنت ہی کی فضا میں جا کر ہوتی۔ کیونکہ اُن کی شاہراہ حیات ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھی۔

اتنے میں باہر زور سے ہوا چلنے لگی۔ اجنبی بولا "ہوا کی سائیں سائیں اس وقت یوں معلوم ہو رہی ہے جیسے اُن مرے ہوئے لوگوں کی روحیں جو کبھی ان پہاڑیوں میں رہا کرتے تھے مل کر گا رہی ہیں"۔

تھوڑی دیر بعد کہیں دُور سے رونے کی آواز آنے لگی۔ جو ہوا کی غمناک راگنیوں کے ساتھ مل کر ایک وحشت ناک اور غم انگیز سماں پیدا کر رہی تھی۔

شاید کوئی جنازہ جا رہا تھا۔ اُن کے دلوں پر اِس آواز سے ایک عجیب پژمردگی سی چھا گئی۔ انہوں نے انگیٹھی میں صنوبر کی لکڑیاں ڈالنی شروع کیں تاکہ اُن کے جلنے کی آواز ہی سے اداسی کچھ کم ہو۔ جب لکڑیاں جلتی تھیں تو ان میں سے قسم قسم کی آوازیں اور چنگاریاں نکل نکل کر اوپر کو جاتی تھیں۔ بچوں کے معصوم اور پیارے پیارے چہرے اپنے اپنے بستر میں سے یہ تماشا دیکھنے کے لئے جھانک رہے تھے۔

ان کی بوڑھی دادی نے اپنے کام سے سر اٹھایا اور بولی "بوڑھوں کے خیال بھی الگ ہی ہوتے ہیں تم لوگوں کی باتوں سے میرے دل میں بھی عجیب خیالات پیدا ہو رہے ہیں۔ اور میں تمہیں بتاتی ہوں کہ موت کی منزل پر پہنچنے کے لئے جس کو ایک قدم ہی اٹھانا باقی رہ گیا ہو وہ کیا سوچتا ہے۔ اور اگر میں نے یہ بات ظاہر نہ کی تو مجھے سخت تکلیف ہوتی رہے گی"۔

سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے وہ بولی "میں نے مرنے کے بعد پہننے کے لئے ایک نہایت عمدہ کپڑوں کا جوڑا بنا رکھا ہے جیسا کہ میں نے اپنی شادی کے دن کے بعد کبھی نہیں پہنا۔ اور جو شاید میرے عروسی جوڑے سے بھی بدرجہا اچھا ہے لیکن میں نے یہ سنا ہے کہ جب مردہ کو دفن کر دیا جاتا ہے اگر اُسے لباس پہنانے میں ذرا سا نقص بھی رہ جائے تو مرنے والے کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور بار بار وہ لباس درست کرنے کے لئے اپنا ہاتھ باہر نکالتا ہے"۔

لڑکی کانپ اٹھی اور اس نے اپنی دادی کو منع کیا کہ وہ ایسی باتیں نہ کرے۔ بوڑھی عورت ہنس کر بولی "میرے بچو میں چاہتی ہوں کہ جب مجھے وہ کپڑے پہنائے جائیں تو تم میں سے کوئی میرے سامنے آئینہ کر دے تاکہ میں بھی دیکھ سکوں کہ میرا لباس درست ہے یا نہیں"۔

بوڑھی عورت کی بات سننے میں سب اس قدر مستغرق تھے کہ کسی نے اُس خوفناک آواز کو محسوس نہ کیا جو لحظہ بہ لحظہ تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ آخر تمام گھر اور اُس کی بنیادیں زور زور سے کانپنے لگیں۔

دفعتہً سب کے چہرے زرد ہو گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے پر تشویش انگیز نگاہیں ڈالیں۔ ایک لمحہ تک وہ سہمے رہے پھر یکایک سب کے منہ سے نکلا "پہاڑ کا بہت بڑا تودہ نیچے آرہا ہے" انہوں نے بچوں کو بستروں میں سے کھینچ کر باہر نکالا اور بدحواسی کی حالت میں بھاگتے ہوتے اُس جگہ جا چھپے جو انہوں نے پہلے سے مقرر کر رکھی تھی۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا الفاظ اُس کا نقشہ کھینچنے سے قاصر ہیں۔

افسوس وہ اپنے محفوظ مکان کو چھوڑ کر تباہی کے غار میں آپھنسے۔ پہاڑ کا وہ بڑا سا ٹکڑا شور کرتا ہوا نہایت تیزی سے اُن کے مکان کی طرف آرہا تھا۔ جب وہ مکان کے قریب پہنچا تو ایک اور قیامت خیز گونج پیدا ہوئی پہاڑ درمیان سے پھٹ کر گرا اور آس پاس کے تمام علاقہ کو تباہ کر دیا لیکن اُن کے مکان کو ذرا سا صدمہ بھی نہ پہنچا۔

ابھی یہ دہشت ناک گونج بند بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ موت کا درد و کرب برداشت کر چکے تھے اور اُن کی بے گور و کفن لاشیں ہمیشہ کے لئے بے نشان ہو چکی تھیں۔

صبح کے وقت جھونپڑے سے ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا اور انگیٹھی میں ابھی تک آگ سلگ رہی تھی۔ انگیٹھی کے اردگرد خالی کرسیاں پڑی تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس گھر کے رہنے والے ابھی ابھی اٹھ کر باہر کی ہولناک تباہی و بربادی کا نقشہ دیکھنے گئے ہیں۔

ان سب نے یادگار کے طور پر اپنا کوئی نہ کوئی نشان چھوڑا جس پر اُن لوگوں نے جو اس خاندان کے دوست تھے آکر آنسو بہائے۔ دور و نزدیک گھر گھر میں اس حادثہ کا چرچا ہوا۔ اور پہاڑی علاقے میں اب تک اُن کا نام لیا جاتا ہے۔ کیونکہ رات کے وقت جب مائیں اپنے بچوں کو لے کر بستر میں لیٹتی ہیں تو وہ انہیں ستم زدہ لوگوں کی کہانی سنایا کرتی ہیں۔ شاعروں نے اس حسرتناک واقعہ کو شعروں میں لکھ لیا ہے۔

چند آدمیوں نے قرائن سے یہ خیال کیا کہ اس رات اس گھر میں کوئی اجنبی بھی موجود تھا جو اس تباہی و بربادی میں اُن کا شریک بنا۔ لیکن بعض لوگوں نے اس خیال کی مخالفت کی کہ اس بات کا ہمارے پاس کوئی پورا ثبوت نہیں ہے۔

افسوس ہے اُس بلند خیال نوجوان کی حالت پر جو دنیا میں غیر فانی ہونے کا خواب دیکھ رہا تھا مگر اُس کا انجام اس قدر حسرتناک ہوا کہ اب اُس کا نام اُس کے مقاصد، اور یہاں تک کہ اُس کی موت اور زندگی بھی مشکوک حالت میں ہیں۔

ظاہر ہے کہ موت کا درد و کرب اُس کے لئے سب سے زیادہ ناقابل برداشت ہوگا۔

(ماخوذ از انگریزی)

ع ب

غزل

نوحۂ غم نہ سازِ عشرت ہے ایسے جینے میں کوئی لذت ہے

جذبۂ عشق اک گناہ سہی آپ کے حسن کی بدولت ہے!

راہِ مہر و وفا میں مر جانا یہ بھی اک زندگی کی صورت ہے

دل بھی اشکوں میں بہ گیا ہوگا ایک قطرے کی کیا حقیقت ہے!

عرصۂ حشر ہو کہ ہو دنیا تم جہاں ہو وہیں قیامت ہے

جانے کیا قدرِ آشیاں صیّاد چار تنکے نہیں یہ دولت ہے

میرے مرنے میں ہوگا عالم کیا میرا جینا ہی درسِ عبرت ہے

وہ تو سب کچھ ہیں اُن کا ذکر ہی کیا ہم بھی کچھ ہیں یہی غنیمت ہے

اس طرف دل ہے کائنات اُدھر کوئی کہہ دے یہ دل کی قیمت ہے؟

چشمِ تر اور گدازِ دل زیبا
دے جو اللہ ایک دولت ہے

زیبا
ردولوی

بقا

مدتیں گزریں جب دنیا ابھی کمسن تھی، اُس قدیم زمانے میں، جب صبح کے ستارے مل کر گاتے تھے تو اُن کے گیت صاف سنائی دیتے تھے کیونکہ دنیا بالکل خاموش تھی اور آسمانوں کی موسیقی میٹھے میٹھے سروں میں پہاڑیوں اور وادیوں میں سے ایک آبجو کی طرح بہتی ہوئی دنیا کو اپنے زمزموں سے بے کھٹکے سیراب کرتی تھی کہ ایک ننھے سے انسانی بچے نے اپنی آنکھیں کھولیں اور چلانے لگا۔ اُس نے دنیا کی طرف دیکھا اور حیران ہو گیا، اُس نے آسمان کی نیلی نیلی وسعتوں پر نگاہ دوڑائی اور اپنی تنہائی کو محسوس کیا۔ اُس نے چاہا کہ وہ کسی تاریک غار میں گھس جائے یا جنگل کے گھنے گھنے درختوں کے نیچے چھپ جائے، کیونکہ وہ ڈر رہا تھا، لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیوں ڈر رہا ہے۔

پھر خدا نے اس بچے کو آواز دی، اور وہ اب ڈرتا نہیں تھا، اور اُس کے دل میں تاریک غار یا گھنے جنگل میں چھپنے کی خواہش بھی اب نہ رہی تھی، لیکن اُس نے جواب نہ دیا کیونکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ جواب کیوں کر دیتے ہیں۔

اور خدا نے کہا،

"تجھے ایک سبق سیکھنا ہے۔ اپنا پہلا سبق پڑھ اور دن بھر اس کو یاد کرتا رہ۔ اور جب رات کے سائے اُس راہ پر پڑنے لگیں جس پر تُو گامزن ہو اور تُو تھک جائے اور چل نہ سکے تو میں تجھے سلا دوں گا۔ پھر تو دیر تک آرام کرتے رہیو، اور جب تو جاگے گا تو میں تجھے دوسرا سبق دوں گا۔

بچے نے خدا کے ہاتھ سے سبق لے لیا اور یہ آسمان کے تاروں کی طرح چمک رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کو یہ ایک بابِ زریں کی طرح نظر آیا جو چوپٹ کھلا ہوا ہو، لیکن دُور، دُور، بہت دُور ——— اتنی دُور کہ کوئی ستارہ بھی اتنی دُور نہ ہوگا۔ اور اُس دروازے میں سے اُسے ایک اجلی اجلی روشنی نظر آئی، اور ایک عجیب و غریب طریقے سے بچے کے دل نے محسوس کیا کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور وہاں پہنچ کر رہے گا۔ نظارہ آہستہ آہستہ اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا مگر سبق اُس کے پاس ہی رہا۔

اور وہ سبق یہ تھا، "میں میں ہوں"

یہ سبق بڑا سخت تھا، اور بچے نے گھنٹوں اس پر صرف کر دیئے۔ وہ اس میں اتنا منہمک تھا کہ اُسے معلوم بھی نہ ہوا کہ دن دوپہر سے ڈھل چکا ہے اور روشنی کم ہوتی جا رہی ہے۔ وہ اپنا وہ عظیم الشان سبق یاد کرتا رہا جو اُسے خدا نے دیا تھا یہاں تک کہ سورج ڈوب گیا اور وہ تھک کر چُور ہو گیا لیکن اب وہ چھوٹا بچہ نہ رہا تھا، کیونکہ دن بہت لمبا تھا، اور عمر کی وجہ سے

اُس کا جسم نحیف ہو کر جھک گیا تھا، اُس کے بال سفید ہو چکے تھے، اُس کے ماتھے پر جھرّیاں نمودار ہو گئی تھیں اور وہ کہہ رہا تھا "میں بہت تھک گیا ہوں"۔

اور خدا نے مسکرا کر کہا،

"اب سو جا اور آرام کر"۔

انسان سو گیا اور پھر اٹھا؛ مگر اس دفعہ وہ ڈر نہیں رہا تھا نہ اُسے اپنے آپ کو چھپانے کی خواہش تھی۔ اُس نے اپنے اوپر نیلے آسمان کو دیکھا اور اُس کی طرف اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔ کیوں؟ آہ، یہ اُسے معلوم نہ تھا۔ وہ کچھ سننے کا منتظر تھا!

اور خدا نے کہا،

دیکھ یہ تیرا دوسرا سبق ہے؛ اسے پڑھ اور جب شام ہو اور تُو تھک جائے تو یہاں آنا میں تجھ پر پھر نیند طاری کر دوں گا"

اور بچّے نے خدا کے ہاتھ سے سبق لے لیا اور دنیا میں چلا گیا وہ دنیا کے درختوں اور پھولوں کو اور اُس کی زندہ مخلوقات کو دیکھتا رہا اور ساتھ ساتھ اپنا سبق بھی یاد کرتا رہا کیونکہ یہ پہلے سبق سے زیادہ دشوار تھا۔

دوسرا سبق یہ تھا "تو تُو ہے"

اُس دن کے لمحے بھی تیزی کے ساتھ گزر گئے، کیونکہ جب اُس نے یہ سبق پڑھا تو اُسے آسمانی دنیاؤں کی موسیقی اور صبح کے ستاروں کے نغمے سنائی دینے لگے، اور جب اُس کے پاؤں نئی نئی دنیا کو چھوتے تھے اور جوں جوں وہ اپنے سبق کو دہراتا تھا تو شاید یہ عظیم الشان کائنات کے نغمے کی صدائے بازگشت تھی یا شاید اُس کے اپنے دل کی کہ وہ پھولوں اور سبزے میں سے موسیقی بن کر نکلتی تھی۔ اُس وقت وہ پہلی مرتبہ مسرت سے آشنا ہوا، اور خوشی اُس کے دل میں پیدا ہوئی۔ لیکن ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ شام کے سائے اُس کے راستے میں پڑنے لگے، اور سورج غروب ہو گیا تب انسان نے اپنا چہرہ آسمان کی طرف اٹھایا اور مسکرا کر کہا،

"اے خدا، ہم بہت تھک گئے ہیں"۔

اور خدا نے کہا،

سو جا اور آرام کر، کل میں تجھے اور سبق پڑھاؤں گا"۔

اور تیسرے دن بچہ جاگا، اُس نے انگڑائی لی اور اپنی آنکھیں ملیں لیکن اُس نے اوپر کو نہ دیکھا نہ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلائے۔ اُس نے اپنے آس پاس نگاہ ڈالی اور کہا،

"وہ کہاں ہے، میرا ساتھی"

پھر خدا نے اُسے تیسرا سبق دیا، اور آہ! یہ مشکل ترین سبق تھا، اور جب اُس نے اس کو دیکھا تو اُسے چند لمحوں کے لئے غش آگیا! پھر ایک عجیب لرزہ اُس کے بدن پر چھا گیا، اور اپنی چھڑی ہاتھ میں لے کر وہ نکل کھڑا ہوا۔
تیسرا سبق تھا "یہ نہ کر۔ وہ نہ کر"

شام کے وقت جب سورج چھپ چکا تو وہ بہت پژمردہ، بہت افسردہ ہو گیا تھا، اور اُس کے بال برف جیسے سفید ہو گئے تھے۔ شاید یہ اُس کے بالوں کی سفیدی تھی یا شاید یہ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرن تھی، مگر ایک روشنی تھی جو اُس کے ہونٹوں اور اُس کی بھووں پر کھیل رہی تھی۔ وہ سو گیا اور اپنی نیند میں ایک چھوٹے بچے کی طرح مسکراتا رہا۔

دن کے بعد دن گزرتا گیا اور جب صبح ہوتی اور بچہ جاگتا تو اُس کی آنکھ ایک نئی دنیا پر پڑتی، لیکن کبھی اُس کے دل میں یہ سوال پیدا نہیں ہوا کہ اب اُسے خوف کیوں معلوم نہیں ہوتا۔ وہ اپنے بھائی بندوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا رہا اور جواب میں وہ بھی مسکراتے رہے، لیکن انہیں کبھی خیال نہ آیا کہ کیوں۔

لیکن چند روز بچہ اپنے سبق سے غافل ہو گیا، خدا ہر روز اُسے سبق دیا کرتا تھا مگر چند دن وہ سبق لینا بھول گیا اور اپنی بھول میں وہ اُس سیدھے راستے سے بھٹک گیا جو روشنئ جاوداں اور رباب زریں کی طرف جاتا تھا، وہ مرغزاروں میں سنہری تنیتریوں کے پیچھے بھاگتا رہا یا شہابہ کی چمک کے پیچھے دوڑتا رہا۔ پھر جب رات ہوئی تو وہ مسکرا نہ سکا وہ سو گیا، اور جاگا، اور اُس نے پھر وہی سبق دہرانا شروع کر دیا۔

کچھ روز وہ اپنی راہ سے بھٹکا رہا پھر اُس نے الٹے پاؤں صعوبتوں اور تکلیفوں میں سے گزر کر راہ کو ڈھونڈھ لیا، کیونکہ انسان ہمیشہ آزاد تھا۔ کیا اُس نے اپنے پہلے ہی سبق میں پڑھا نہ تھا "میں میں ہوں"

للی ایلین

منصور احمد

ہمیشہ یہ سمجھو کہ اگر وہ کام جو تمہیں انجام دینا ہے، ممکن ہے تو آسان بھی ہے۔ اس صورت میں تمہیں اس کام پر ضرورت سے زیادہ قوت خرچ نہیں کرنی پڑے گی۔ اگر تم اسے مشکل سمجھتے رہے تو تم کو اس پر اس قوت سے دس گنی بیس گنی قوت خرچ کرنی پڑے گی جتنی اُس کے لئے درکار ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنی قوت کو ضائع کرو گے ——— (کوئے)

عبدالعزیز

چاندی کی کان

سویڈن کا بادشاہ گستاف سوئم ڈیلیکاریا کے علاقہ میں سفر کر رہا تھا، گھوڑے سرپٹ جا رہے تھے اور راستہ بجلی کی سرعت کے ساتھ طے ہو رہا تھا۔ سڑک پتھریلی ہونے کی وجہ سے گاڑیوں کے پہیوں سے ایک عجیب آواز پیدا ہو رہی تھی مگر اس پر بھی اُس کی خواہش تھی کہ سفر اور تیزی سے کیا جائے۔ اِس لئے اُس نے کھڑکی سے سر نکال کر گاڑی بان سے کہا "جلدی چلو، کیا تم سمجھتے ہو کہ سڑک پر انڈے بچھے ہوئے ہیں جو ٹوٹ جائیں گے .... ذرا اور تیزی سے ہانکو!

گاڑیاں ناہموار دیہاتی سڑکوں پر باد رفتاری سے جا رہی تھیں۔ اور یہ ایک معجزہ ہی تھا کہ گاڑیاں اور گھوڑے صحیح سلامت تھے۔ آخر ایک ڈھلوان پہاڑی کے دامن میں شاہی گاڑی کا دھرا ٹوٹ گیا۔ بادشاہ نیچے اتر کر سڑک کے کنارے ایک بڑے سے ہموار پتھر پر بیٹھ گیا۔ مصاحبوں نے گاڑی بان کو کوسنا شروع کر دیا مگر اس سے کیا حاصل تھا؟ یہ ظاہر تھا کہ جب گاڑی کی مرمت نہ ہو لے سفر جاری رہنے کا کوئی امکان نہیں۔

مصاحبوں نے اِدھر اُدھر کسی ایسی چیز کی تلاش شروع کی جس سے گاڑی کے درست ہونے تک بادشاہ کا دل بہل سکے۔ کچھ فاصلہ پر درختوں کے پیچھے انہیں ایک گرجا کا مخروطی مینار نظر آیا۔ انہوں نے بادشاہ کو صلاح دی کہ آپ کسی مصاحب کی گاڑی میں بیٹھ کر گرجا کی طرف چلیں اور چونکہ اتوار کا دن ہے اس لئے وعظ میں شامل ہو کر یہ خالی وقت گزاریں۔

بادشاہ نے اس تجویز کو پسند کیا، اور گرجا کی طرف چل پڑا۔ وہ کئی گھنٹوں سے گھنے تاریک جنگلوں میں سفر کر رہا تھا، اور افسوس کر رہا تھا کہ اُس کے ملک کا کس قدر حصہ غیر آباد پڑا ہے مگر یہ علاقہ خوب سرسبز و شاداب تھا اس علاقہ میں دلفریب مرغزاروں اور خوبصورت بستیوں کے علاوہ ڈال ندی جھاڑیوں کی گھنی قطاروں میں سے آہستہ آہستہ گنگناتی ہوئی بہتی تھی۔

لیکن وعظ کے بابرکت مجمع میں شامل ہونا بادشاہ کی قسمت میں نہ تھا کیونکہ جب وہ گرجا کے سامنے پہنچا تو گھنٹہ بجانے والے نے اختتام کا اعلان کر دیا اور لوگ باہر نکلنے شروع ہو گئے۔ بادشاہ ایک پاؤں گاڑی میں اور دوسرا پائدان پر رکھے کھڑا تھا لوگ اُس کے پاس سے گذرنے لگے۔ وہ اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا اور انہیں غور سے دیکھتا

رہا۔ وہاں کے باشندے جوان اور خوبصورت تھے اُن کے قد غیر معمولی طور پر لمبے اور چہرے مسرور اور مطمئن تھے۔ عورتیں بھی حسین اور دراز قامت تھیں*

سارا دن بادشاہ اپنی سلطنت کے بنجر اور غیر آباد علاقوں کی کثرت پر افسوس کرتا رہا تھا۔ وہ بار بار مصاحبوں سے کہتا "مجھے یقین ہے کہ اس وقت میں اپنی سلطنت کے مفلس ترین حصہ میں سفر کر رہا ہوں!" لیکن اب جو اُس نے ان لوگوں کو دیکھا جو بہترین دیہاتی لباس پہنے ہوئے تھے تو اُسے ملک کی غربت کا خیال بھول گیا۔ اُس کا دل از سرِ نَو مسرت سے لبریز ہو گیا اُس نے اپنے دل میں کہا: "سویڈن اتنا غریب نہیں جتنا اُس کے دشمن خیال کرتے ہیں۔ جب تک میری رعایا کی حالت ایسی اچھی ہے میں مذہب اور ملک دونوں کی بخوبی حفاظت کر سکتا ہوں"!

اُس نے مصاحبوں کو حکم دیا کہ وہ لوگوں پر ظاہر کر دیں کہ یہ اجنبی جو اُن کے درمیان کھڑا ہے اُن کا بادشاہ ہے، تاکہ وہ اُس کے گرد جمع ہو جائیں۔ اور جو کچھ اُسے کہنا ہے سن سکیں*

لوگ بادشاہ کا نام سن کر اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ بادشاہ نے گرجا کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر ایک نہایت مؤثر تقریر کی جس میں اُس نے اُن افسوسناک حالات کا نقشہ کھینچا جن میں سلطنت مبتلا تھی۔ اُس نے بتایا کہ سویڈن کو اہلِ ہالینڈ اور روسی ڈرا دھمکا رہے ہیں، اور اس حالت کو فوج کے بعض افسروں کی غداری نے اور خطرناک بنا رکھا ہے۔ موجودہ فوج پر اس کو اعتبار نہیں رہا اور اس لئے وہ اب مجبور ہوا ہے کہ خود دور و دراز کی آبادیوں میں جا کر اپنے ملک کے باشندوں سے دریافت کرے کہ کیا وہ مصیبت اور جنگ کے وقت میں اپنے بادشاہ کی مدد کریں گے، تاکہ مادرِ وطن دشمنوں کی دستبرد سے محفوظ رہ سکے*

کسان بادشاہ کی باتوں کو نہایت سکون کے ساتھ سنتے رہے۔ مگر اُن پر کچھ اثر نہ ہوا، کیونکہ جب اُس نے تقریر ختم کی تو وہ ٹس سے مس نہ ہوئے*

بادشاہ کا خیال تھا کہ اُس کی تقریر نہایت پُر اثر ہے کیونکہ بولتے وقت کئی مرتبہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے لیکن جب کسان دیر تک کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے تو بادشاہ کا دل غم و غصہ سے لبریز ہو گیا۔

کسان اس حقیقت کو تاڑ گئے۔ اور آخر ایک شخص ہجوم میں سے باہر نکلا۔ اور بادشاہ کے سامنے آکر کہنے لگا:۔ "در شہنشاہ! آپ کو معلوم ہے ہمیں آج گرجا میں شاہی سواری کی آمد کی توقع نہ تھی، اس لئے ہم آپ کو فوراً جواب دینے سے قاصر ہیں ہماری گزارش ہے کہ آپ گرجا میں جائیں اور ہمارے پادری سے ملیں۔ اس اثنا میں ہم اُس اہم معاملہ پر جو آپ نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے آپس میں مشورہ کرتے ہیں"*

بادشاہ نے اپنے دل میں اس بات کی معقولیت کا اعتراف کرتے ہوئے سوچا کہ واقعی کسانوں کو سوچنے کا موقع دینا چاہئیے۔اور خود پادری کی ملاقات کے لئے گرجا کی طرف چل پڑا۔

جب وہ گرجا کے اندر داخل ہوا تو اُسے سوائے ایک آدمی کے جو ایک عام کسان معلوم ہوتا تھا اور کوئی نظر نہ آیا یہ شخص بلند قامت اور مضبوط ساخت کا تھا۔اُس کے ہاتھ بڑے بڑے تھے جنہیں محنت اور مشقت نے سخت کر دیا تھا۔اُس نے عام لوگوں کے مانند صرف ایک چمڑے کا پاجامہ اور لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔

جب بادشاہ داخل ہوا تو اس نے نہایت ادب سے جھک کر سلام کیا۔

بادشاہ نے کہا "میرا خیال ہے کہ پادری صاحب مجھے یہیں ملیں گے"۔

کسان کے چہرے پر سرخی کی ایک ہلکی لہر دوڑ گئی۔اُس نے سوچا کہ اب جب کہ اُسے غلطی سے ایک معمولی کسان سمجھ لیا گیا ہے مناسب نہیں کہ وہ بادشاہ پر ظاہر کرے کہ گرجا کا پادری وہی ہے۔اس لئے اُس نے جواب دیا:

"ہاں آپ جب چاہیں پادری سے مل سکتے ہیں"۔

بادشاہ ایک آرام کرسی پر جو اس وقت پاس ہی پڑی تھی بیٹھ گیا۔وہ کسانوں کی بہتری میں بہت دلچسپی لیتا تھا اس لئے اس نے تھوڑی دیر کے بعد پوچھا "کیا اس گرجا کا پادری اچھا آدمی ہے"؟

بادشاہ کے اس سوال پر پادری نے محسوس کیا کہ اُسے اپنی شخصیت ظاہر نہ کرنی چاہئیے، اور اپنے تئیں ایک معمولی کسان ہی ظاہر کرنا چاہئیے، اس لئے اُس نے جواب دیا کہ پادری کافی اچھا انسان ہے۔عمدہ تعلیم دیتا ہے، اور جو کچھ کہتا ہے اس پر خود بھی عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

بادشاہ بظاہر اس تعریف سے خوش ہوا۔مگر ساتھ ہی کہنے لگا۔"تمہاری گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ تم پادری سے پورے طور پر مطمئن نہیں ہو"

پادری نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ اگر بعد میں بادشاہ کو معلوم ہو گیا کہ پادری میں ہوں تو وہ خیال کرے گا کہ پادری اپنی تعریف آپ ہی کر رہا تھا۔اس لئے اُس نے اپنے میں نقص نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ہاں، وہ ذرا خود مختار سا ہے۔یہاں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ پادری یہ چاہتا ہے کہ گاؤں میں اُس کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہ ہو"۔

بادشاہ نے پوچھا "تو کیا اُس نے ہر موقع پر تمہاری صحیح رہنمائی کی ہے"؟

مگر بادشاہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ کسان اُس شخص کے خلاف کوئی شکایت کا لفظ اپنی زبان سے نکالے جو مرتبہ

میں اُس سے اعلیٰ ہے۔ اس لئے اُس نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے گفتگو کا رخ بدل کر کہا "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیک عادات اور سادگی یہاں کے لوگوں کا دستور ہے!"

پادری نے کہا "ہاں لوگ اچھے ہیں، لیکن اُس وقت تک جب تک وہ افلاس اور تنگ دستی میں رہیں، جب دنیا کی لذتیں اُن کے قریب آجائیں تو بس پھر خدا ہی حافظ ہے"!

بادشاہ نے سر ہلا کر کہا "لیکن یہاں تو اس بات کا کوئی خطرہ نہیں"۔

بادشاہ نہایت بیتابی سے کسانوں کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے خیال کیا یہ کسان اپنے بادشاہ کی مدد کے لئے تیار نہیں۔ بہتر ہو کہ گاڑی تیار ہوتے ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں!"

پادری بھی دل ہی دل میں بحث کر رہا تھا کہ کس طرح اس اہم معاملہ کا فیصلہ کرے۔ وہ خوش تھا کہ اُس نے بادشاہ پر اپنی شخصیت ظاہر نہ کی تھی۔ کیونکہ اب وہ اُن معاملات پر بھی دل کھول کر گفتگو کر سکتا تھا جو ابھی پیش نہیں ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے اس مہر سکوت کو توڑا اور بادشاہ سے پوچھا "کیا واقعی دشمن حملہ آور ہو رہے ہیں اور ملک خطرہ میں ہے؟"

اس کے جواب میں بادشاہ نے صرف یہ کیا کہ ایک نگاہ اس پر ڈالی اور چپکا ہو رہا۔

پادری نے پھر کہا "میں یہ صرف اس لئے پوچھتا ہوں کہ میں یہاں گرجا میں کھڑا تھا اور آپ کی تقریر کو اچھی طرح نہ سن سکتا تھا۔ لیکن اگر یہ بات درست ہے تو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس جگہ کا پادری آپ کے لئے اس قدر دولت مہیا کر سکتا ہے جو شاید آپ کی تمام ضروریات کے لئے کافی ہو"۔

"مگر تم نے ابھی ابھی کہا تھا کہ یہاں کے لوگ غریب ہیں؟"

پادری نے جواب دیا "ہاں یہ بالکل درست ہے، اور پادری کے پاس بھی دوسروں سے کچھ زیادہ نہیں لیکن اگر آپ ایک لحہ کے لئے میری طرف متوجہ ہوں تو میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ کس طرح پادری آپ کی مدد کر سکتا ہے"۔

بادشاہ نے کہا "اچھا کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ تم الفاظ کو زبان سے نکالنے میں زیادہ مستعدی سے کام لیتے ہو۔ مگر تمہارے گاؤں والوں نے ابھی تک مجھے کوئی جواب نہیں دیا"۔

"بادشاہ کو جواب دینا آسان کام نہیں! یہ بوجھ بھی بیچارے پادری ہی کو اٹھانا پڑے گا!"

بادشاہ نے ایک ٹانگ دوسری پر رکھ لی۔ اور سر کو ایک طرف جھکا کر کہا "ہاں شروع کرو"

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اس علاقہ کے پانچ آدمی ہرن کے شکار کے لئے نکلے۔ اُن میں سے ایک ہمارا پادری

تھا اور باقی چار میں سے دو سپاہی اولف اور ارک نامی تھے۔ چوتھا اس علاقہ کی سرائے کا مالک اور پانچواں اسرائیل ایک کسان تھا ——"

بادشاہ نے ذرا تندی سے کہا: "اتنے نام لینے کی زحمت نہ کرو"

"یہ پانچوں بہت عمدہ شکاری تھے اور قسمت ہمیشہ ان کے ہمرکاب رہتی تھی، مگر اُس دن وہ دیر تک شکار کی تلاش میں پھرتے رہے اور آخر ناکامی کی کوفت اور تھکن سے چُور ہو کر انہوں نے شکار کا ارادہ ترک کر دیا اور زمین پر بیٹھ کر سستانے اور باتیں کرنے لگے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ تمام جنگل میں کوئی ایسی جگہ نہیں جو کھیتی باڑی کے کام آسکے، کیونکہ یہ تمام علاقہ یا تو پہاڑی ہے یا دلدل سے بھرا پڑا ہے۔

"اُن میں سے ایک نے کہا۔ 'خدا نے ہمیں ایسی بُری زمین دے کر انصاف نہیں کیا'۔

"دوسرے نے کہا 'دوسرے مقامات کے لوگ خوش ہیں۔ صاحبِ دولت و ثروت ہیں، لیکن ہم ہیں کہ سارا دن محنت و مزدوری کرتے ہیں اور پھر بھی نانِ شبینہ کے محتاج ہیں'۔"

پادری ایک لحہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ بادشاہ سو گیا ہے اور اُس کی بات نہیں سن رہا۔ لیکن بادشاہ نے اپنی انگلی ہلائی تاکہ اُسے معلوم ہو جائے کہ وہ جاگ رہا ہے۔

"وہ اس معاملہ پر بحث کر رہے تھے کہ پادری نے اپنی بندوق کے کندے سے ایک پتھر کے ساتھ جس پر کائی جمی ہوئی تھی کھیلنا شروع کر دیا۔ مگر پادری کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ بندوق کی ٹھوکروں سے کائی کے جھڑ جانے پر پتھر چمکنے لگ گیا ہے۔ اُس نے ایک اور پتھر کو اسی طرح ٹھوکریں لگائیں اور وہ بھی چمک اُٹھا۔

"اُس نے اپنے ساتھیوں کو وہ پتھر دکھاتے ہوئے کہا 'ممکن ہے یہ سیسہ ہو'۔

"یہ دیکھ کر اُس کے ساتھی بھی اچھل پڑے اور پتھروں کو اپنی بندوقوں کی ٹھوکروں سے چھیلنے لگے۔ جلد ہی انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ سارے پہاڑ میں کچی دھات کی لکیریں موجود ہیں۔

"پادری نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا: 'تمہارا اس کے متعلق کیا خیال ہے؟'

"اس کے جواب میں وہ سب بول اُٹھے 'یہ ضرور سیسہ ہے! اور تمام پہاڑ اس سے بھرا پڑا ہے'!

"مگر سرائے کے مالک نے کہا 'اگر سیسہ نہیں تو جست تو ضرور ہے'!"

جب پادری یہاں تک پہنچا تو بادشاہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اُس کی آنکھیں اچھی طرح کھل گئیں۔ اُس نے پوچھا "کیا تمہارا خیال ہے کہ وہ لوگ کچی دھات کے متعلق کچھ جانتے تھے؟"

"بالکل نہیں!"

بادشاہ کا سر جھک گیا اور دونوں آنکھیں بند ہوگئیں +

"پادری اور اس کے ہمراہی بہت خوش ہوئے۔ اُن کا خیال تھا کہ انہوں نے ایک ایسی چیز دریافت کر لی ہے جو انہیں اور اُن کی اولاد کو فکرِ معاش سے آزاد کر دے گی +

"ایک نے کہا" اب مجھے زیادہ کام نہ کرنا پڑے گا"

"اور دوسرا بول اٹھا" اب میں سارا ہفتہ کچھ نہ کیا کروں گا، اور اتوار کو سونے کی رتھ میں بیٹھ کر گرجا جایا کروں گا"

"ہر چند وہ عقلمند انسان تھے لیکن اس عظیم الشان دریافت نے اُن کا سر پھرا دیا تھا، وہ بچوں کی سی باتیں کر رہے تھے لیکن پھر بھی اُن میں اتنی عقل ضرور موجود تھی کہ جاتی دفعہ انہوں نے وہ پتھر مٹی تلے چھپا دیئے اور اس مقام کو بغور پہچان کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ جدا ہونے سے پیشتر قرار پایا کہ پادری اس دھات کے چند چند نمونے لے کر شہر فالن میں جائے اور کسی معدنیات کے ماہر سے دریافت کرے کہ دھات کس قسم کی ہے اور جس قدر جلد ممکن ہو واپس آئے۔ اس کے بعد انہوں نے قسم کھائی کہ یہ راز کسی پر افشا نہ کریں گے کہ دھات کا مخزن کہاں ہے"

بادشاہ نے پھر سر اٹھا کر پادری کی طرف دیکھا، مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب اُسے کچھ کچھ یقین ہونے لگا ہے کہ یہ آدمی واقعی کوئی اہم بات کہنا چاہتا ہے۔

دوسرے ہی روز پادری دھات کے چند ٹکڑے جیب میں ڈال کر فالن کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ بھی دوسروں کی طرح امیر کبیر بننے کے خیال سے خوش تھا وہ گرجا کو جو اس وقت ایک غریب کسان کے جھونپڑے سے بہتر نہ تھا از سرِ نو تعمیر کرنے کے خیال سے مسرور ہو رہا تھا۔ کبھی وہ خیال کرتا کہ وہ بڑے پادری کی حسین لڑکی سے، جو اسے بہت محبوب تھی شادی کرے گا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ غربت کی حالت میں شاید اُسے قیامت تک اس روزِ سعید کا انتظار کرنا پڑے۔

"پادری دو دن میں فالن پہنچ گیا۔ وہاں اسے دو دن اور انتظار کرنا پڑا کیونکہ معدنیات کا ماہر کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ جب وہ واپس آیا تو پادری نے اُسے پتھر کے وہ چمکدار ٹکڑے دکھائے۔ اس نے اُن کو پہلے الٹ پلٹ کر اور پھر کچھ دیر تک خوردبین سے دیکھا" پادری نے اُسے ان ٹکڑوں کے ملنے کا حال بتانے کے بعد پوچھا" کیا یہ سیسہ ہے؟"

"نہیں یہ سیسہ نہیں ہے"

"تو پھر جست ہوگا؟"

" نہیں یہ جست بھی نہیں۔"

"یہ سُن کر پادری کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ وہ عمر بھر میں اتنا افسردہ کبھی نہ ہوا تھا۔

" آخر ماہر نے اُس سے پوچھا ' کیا اُس پہاڑ پر ایسے اور بھی بہت سے پتھر ہیں '؟

' ایک پہاڑ کا پہاڑ ہے '۔

" ماہر پادری کے قریب آ گیا اور رازدارانہ انداز میں کہنے لگا ' اگر یہ واقعی درست ہے تو میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں، کیونکہ یہ چاندی ہے۔ مگر آپ سے میری ایک درخواست ہے کہ آپ اسے محض نفس پروری میں نہیں بلکہ ملک اور قوم کے فائدہ کے لئے صرف کریں '

" پادری نے حیرت سے پوچھا ' واقعی ——— کیا یہ واقعی چاندی ہے '؟

" ماہر نے اسے بتایا کہ وہ کس طرح اس پہاڑ کے لئے کان کے حقوق حاصل کرے۔ اور اس کے علاوہ بہت سی عمدہ تجاویز بتائیں لیکن پادری نے جو بالکل ایک عالمِ بے خودی میں کھڑا تھا ایک بات بھی نہ سنی۔ وہ اسی خیال میں غرق تھا کہ اُس کے بنجر علاقہ میں چاندی کا ایک پہاڑ موجود ہے! ——— "

بادشاہ نے اس سرعت سے اپنا سر اٹھایا کہ پادری چُپ ہو گیا۔

بادشاہ نے کہا " اور جب پادری نے واپس آ کر کان کو چلایا تو اُسے معلوم ہو گیا کہ ماہر نے اُسے دھوکا دیا تھا! "

" نہیں ماہر ایک دیانت دار آدمی تھا، اور جو کچھ اُس نے کہا تھا حرف بحرف درست نکلا "

اس پر بادشاہ نے کہا " ہاں تو کہتے جاؤ " اور خود زیادہ اچھی طرح سننے کے لئے کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا +

جب پادری گھر واپس پہنچا تو اُس نے خیال کیا کہ اس مژدہ کی سب سے پہلے اپنے رفیقوں کو اطلاع دینی چاہیے اور جب وہ سرائے والے کے مکان کے دروازہ میں داخل ہوا تو اُس نے دیکھا کہ سب لوگ ماتمی لباس پہنے ہوئے ہیں۔ اُس نے ایک لڑکے سے جو کہ مکان کے کٹہرہ کے ساتھ کھڑا تھا پوچھا کہ وہاں کون فوت ہوا ہے۔

" لڑکے نے جواب دیا ' سرائے والا ' اور یہ کہہ کر اُس نے پادری کو تمام قصہ بتایا کہ کس طرح سرائے والے نے پچھلے ہفتہ میں شب و روز اس قدر شراب پی کہ تمام عمر میں بھی اتنی نہ پی ہوگی۔

" پادری نے حیرت سے پوچھا ' مگر اس کی وجہ؟ ۔ سرائے والا اس قدر شرابی تو نہیں تھا '۔

" لڑکے نے کہا ' آہ! وہ کہتا تھا کہ اُس نے ایک کان دریافت کی ہے، اور وہ بہت امیر کبیر ہو گیا ہے، اور اُسے سوائے پینے کے اور کوئی کام نہیں۔ کل رات وہ سیر کو باہر گیا، اُس کی گاڑی الٹ گئی اور وہ مر گیا '

"پادری یہ خبر سن کر بہت غمگین ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ آہ جب وہ قصبہ میں داخل ہوا تھا تو کس قدر خوش تھا اور اپنے دوستوں کو خبر سنانے کے لئے کس قدر بے قرار ہو رہا تھا! وہ چند ہی قدم آگے بڑھا ہو گا کہ اُس نے اسرائیل کو آتے ہوئے دیکھا اس لئے پادری نے دل ہی دل میں کہا شکر ہے کہ دولت کا خبط اس کے سر میں نہیں سمایا۔ میں اُسے یہ خبر سنا کر مسرور کر دوں گا کہ اب وہ ایک امیر کبیر ہے"

"اسرائیل پادری کو دیکھ کر لپکا اور سلام کر کے پوچھنے لگا۔ کیا تم ابھی ابھی فالن سے آرہے ہو"

"پادری نے کہا "ہاں۔ اور تمہارے لئے ایک بہت بڑی خوشخبری لایا ہوں۔ میرے سفر کا نتیجہ توقع سے بہت بڑھ چڑھ کر نکلا ہے۔ معدنیات کے ماہر نے بتایا ہے کہ جو دھات ہم نے دریافت کی ہے۔ کچی چاندی ہے!"

"یہ سنتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ اسرائیل کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہے۔ اُس نے نہایت بے قراری سے پوچھا "تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا واقعی یہ چاندی ہے"

"پادری نے جواب دیا "ہاں۔ اب ہم سب امیر کبیر بن جائیں گے اور شریف آدمیوں کی سی زندگی بسر کریں گے!"

"اسرائیل نے نہایت حسرت بھری آواز میں ایک سرد آہ بھر کر کہا "آہ یہ چاندی ہے!" اور اُس کی آنکھوں سے دو گرم گرم آنسو بہ نکلے۔

"پادری نے کہا "ہاں، ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ چاندی ہے۔ تمہیں یہ خیال ہرگز نہیں ہونا چاہئے کہ میں تمہیں دھوکا دے رہا ہوں۔ مگر یہ تم رو کیوں رہے ہو؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے!"

"اسرائیل نے کہا "خوش! میں کیا خوش ہوں؟ میرا خیال تھا کہ یہ صرف کسی معمولی چیز کی چمک تھی، اس لئے میں نے اپنا حصہ اولف کے پاس سو ڈالر میں بیچ دیا"

"جب پادری اُس سے جدا ہوا تو وہ سڑک کے کنارے کھڑا رو رہا تھا"

"پادری نے گھر پہنچ کر اولف اور اُس کے بھائی ارک کو بلا بھیجا تاکہ انہیں بتائے کہ جو دھات انہوں نے دریافت کی ہے چاندی ہے۔ اور چونکہ وہ اُن سے نئے گرجا کی تعمیر کے متعلق مشورہ بھی کرنا چاہتا تھا اس لئے اُس نے یہی مناسب خیال کیا کہ انہیں اپنے پاس بلائے"

"شام کے وقت جب پادری اپنے مکان سے باہر تاریکی میں ایک ٹیلے پر تنہا کھڑا سوچ رہا تھا تو مسرت کا طوفان پھر اسے اپنی موجوں میں بہا کر لے گیا۔ وہ نئے گرجا کی تعمیر پر غور کرنے لگا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ وہ اُسے بڑے پادری کے گرجا کی مانند بڑی خوش اسلوبی سے آراستہ کرے۔ وہ بہت دیر تک وہاں کھڑا تصور جماتا رہا کہ کان سے بیش بہا دولت

برآمد ہوگی۔ اس لئے بیرونجات سے بے شمار لوگ یہاں آکر آباد ہو جائیں گے اور اسی طرح ایک دن کان کے گرد ایک بارونق شہر آباد ہو جائے گا۔ اور پھر وہ اپنے پرانے جھونپڑے کی جگہ ایک عالی شان محل تعمیر کرے گا۔ جس میں اُس کی دولت کا کافی حصہ صرف ہو جائے گا۔ وہ اس سے بھی مطمئن نہ تھا۔ بلکہ وہ خیال کر رہا تھا کہ جب اُس کا گرجا تیار ہو جائے گا تو بادشاہ اور لاٹ پادری اُس کے افتتاح کے لئے آئیں گے اور بادشاہ گرجا کو دیکھ کر بہت خوش ہوگا! ——"

عین اس وقت بادشاہ کا ایک مصاحب دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور کہنے لگا "عالی جاہا! شاہی گاڑی تیار ہو گئی ہے"۔

پہلے تو بادشاہ اٹھنے کے لئے تیار ہوا لیکن کسی خیال کے آتے ہی اُس نے ارادہ بدل دیا اور پادری سے کہنے لگا "اپنا قصہ جلد ختم کرو، ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پادری نے کیسے کیسے ہوائی قلعے تعمیر کئے ہونگے۔ اور کیا کیا خواب دیکھے ہونگے!"

پادری نے کہا "لیکن پادری انہیں خیالات میں محو تھا کہ پیغام آیا کہ اسرائیل نے خودکشی کر لی ہے۔ کان کے بیچ دینے سے جو صدمہ اُسے پہنچا وہ اُس سے جانبر نہ ہو سکا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ ہر روز اُس دولت کو جسے وہ محض اپنی حماقت کی وجہ سے کھو بیٹھا تھا۔ دوسروں کے پاس دیکھ کر برداشت نہ کر سکے گا"۔

بادشاہ اَور سیدھا ہو بیٹھا۔ اُس نے دونوں آنکھیں کھول کر کہا "اگر میں پادری ہوتا تو اس کان کا خیال ترک کر دیتا!"

پادری نے جواب دیا "بادشاہ بادشاہ ہے۔ اُس کے پاس دولت کی فراوانی ہے، مگر ایک غریب پادری کا معاملہ اَور ہے۔ اُس نے یہ دیکھ کر کہ اس مہم میں خدا کی برکات اُس کے شاملِ حال نہیں ارادہ کر لیا کہ وہ اس دولت سے ذاتی نفع اور شہرت حاصل نہیں کرے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس بے بہا دولت کو زمین ہی میں مدفون نہیں رہنے دے گا۔ اُس نے غربا اور مساکین کی امداد کے لئے کان میں کام شروع کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اور اسی لئے وہ ایک دن اولف کے مکان کی طرف گیا، تاکہ اُس سے اور اُس کے بھائی سے دریافت کرے کہ انہیں کان کے متعلق کیا کارروائی کرنی چاہیئے۔ جب وہ فوجیوں کی بارکوں کے پاس پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ چند مسلح کسان ایک نوجوان کو جس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہیں پابہ زنجیر لئے آرہے ہیں۔

"جب پادری اُن کے پاس پہنچا تو اُس نے پہچان لیا کہ مجرم اولف ہے وہ لوگوں کی منتیں کر رہا تھا کہ اُسے پادری سے چند باتیں کر لینے دیں۔

"پادری اور نزدیک ہوگیا۔ مجرم نے اس کی طرف متوجہ ہوکر کہا "اب صرف آپ ایک شخص ہیں جنہیں کان کے راز کا علم ہے"۔

"پادری نے حیرت زدہ ہوکر پوچھا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"اس نے کہا "جب سے ہمیں یہ معلوم ہوا تھا کہ ہم نے چاندی کی کان دریافت کی ہے میرے اور میرے بھائی کے تعلقات اچھے نہ رہے تھے۔ ہم متواتر جھگڑتے رہتے۔ کل ہم اس بحث میں پڑ گئے کہ ہم پانچوں میں سے کون تھا جس نے سب سے پہلے کان دریافت کی، اور آخر ہم دھینگا مشتی پر اتر آئے۔ اسی جھگڑے میں میں نے دولت کے نشہ سے اندھا ہوکر اپنے پیارے بھائی کو مار دیا۔ اب میں ضرور پھانسی پر لٹکا دیا جاؤں گا اور پھر بس آپ ہی کو کان کا علم ہوگا اس لئے میری ایک آخری خواہش ہے جو امید ہے کہ آپ منظور فرمائیں گے،

"پادری نے کہا "کہو تم جو کچھ کہو گے میں کروں گا،

"آپ جانتے ہیں کہ میں کئی ننھے ننھے بچے چھوڑ رہا ہوں"

"اوہو تم اُن کا کچھ فکر نہ کرو۔ تمہارا حصہ انہیں کو ملے گا!

"اولف نے کہا "نہیں نہیں بلکہ میں چاہتا ہوں کہ آپ انہیں ہرگز ہرگز کوئی حصہ نہ دیں۔ اگر آپ نے میرے ساتھ اس بات کا پکا وعدہ نہ کیا تو میں چین سے جان نہ دوں گا،

"پادری نے کہا "ہاں میں وعدہ کرتا ہوں"

"لوگ قاتل کو کشاں کشاں لے گئے اور پادری وہیں سڑک پر خیالات میں غرق دیر تک اکیلا کھڑا رہا۔ گھر لوٹتے وقت اُس کے دل میں خیالات کا ہجوم تھا۔ کیا دولت اور گناہ لازم ملزوم ہیں! کیا یہ واقعی درست ہے کہ یہ لوگ دولت کی خوشی کو برداشت نہیں کرسکے؟ چار شخص جو قصبہ بھر میں باعزت اور خوش خلق خیال کئے جاتے تھے برباد ہوچکے ہیں۔ کیا باقی تمام باشندوں کے لئے بھی چاندی کی یہ کان یکے بعد دیگرے تباہی کا باعث بن جائے گی؟ اُس نے اپنے جی میں ٹھان لی کہ وہ اس کان کا خیال جو تمام گردونواح کی بربادی کا باعث بننے والی ہے بالکل ترک کر دے گا"۔

یکایک بادشاہ کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا "تمہارے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور افتادہ بستی کا پادری واقعی ایک مرد ہے!"

پادری نے کہا "یہ تو ابھی ابتدا ہے۔ کیونکہ جونہی کان کی خبر کسانوں میں پھیلی انہوں نے سب کام چھوڑ دیا اور بیکار بیٹھ گئے اور اُس وقت کے انتظار میں گھڑیاں گننے لگے جب انہیں کان سے بیش بہا دولت ہاتھ لگے گی۔ انہوں

نے شراب نوشی شروع کر دی۔ ہر طرف بدکاری کا دور دورہ ہو گیا۔ بہت سے لوگ جنگل میں کان کی تلاش میں سرگردانی کرنے لگے۔ اور جس وقت پادری اپنے مکان سے باہر نکلتا لوگ اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتے تاکہ معلوم کریں کہ وہ کہیں کان کی طرف تو نہیں جا رہا۔

"جب واقعات کی رفتار یہاں تک پہنچ گئی تو پادری نے ایک دن تمام کسانوں کو جمع کر کے انہیں وہ تمام منحوس واقعات سنائے جو اس کان کی دریافت سے وقوع پذیر ہوئے تھے۔ اُس نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ بھی اپنے تئیں برباد کرنا چاہتے ہیں + اُس نے انہیں صاف طور پر کہہ دیا کہ وہ اپنے روحانی پیشوا سے یہ امید ہرگز نہ رکھیں کہ وہ اُن کی بربادی میں اُن کی کسی قسم کی مدد کرے گا۔ اور اب اُس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ یہ راز کسی پر افشا نہ کرے گا پھر اُس نے اُن سے کہا کہ اگر وہ کان کی تلاش کو جاری رکھیں گے اور دولت کی ہوس میں گرفتار رہیں گے تو وہ کہیں دُور چلا جائے گا تاکہ اُن کی تباہی و بربادی کی خبر اُس کے کانوں تک نہ پہنچ سکے، لیکن اگر وہ یہ خیال ترک کر دیں گے اور پہلے کی طرح اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جائیں گے تو وہ اُن کے ساتھ رہے گا۔ اور آخر میں اُس نے کہا۔ جو راستہ چاہو اختیار کر لو، لیکن یہ یاد رکھو کہ میرے منہ سے چاندی کی کان کے متعلق کبھی ایک لفظ بھی سننے نہ پاؤ گے!

بادشاہ نے کہا "خوب پھر انہوں نے کیا جواب دیا؟"

"عین اپنے پیشوا کی خواہش کے مطابق! وہ سمجھ گئے تھے کہ اُس کا ارادہ نیک ہے، کیونکہ وہ خود بھی ان کی طرح غریب رہنا چاہتا تھا + اور پھر انہوں نے پادری کو صلاح دی کہ وہ دھات کی لکیروں کو سبزی یا مٹی سے ڈھانپ دے تاکہ وہ بھولے سے بھی اسے دریافت نہ کر سکیں!!"

بادشاہ نے پوچھا "اور اُس وقت سے پادری غریبانہ زندگی بسر کر رہا ہے"

"ہاں یہیں دوسرے لوگوں کی مانند رہتا ہے"

"کیا اُس نے شادی کی یا کوئی نیا مکان بنایا؟"

"نہیں اُس بیچارے میں شادی کرنے یا مکان بنانے کی طاقت کہاں تھی وہ اب تک اُسی پرانی جھونپڑی میں رہتا ہے"

بادشاہ نے چند لمحوں کے بعد کہا "بے شک تم نے ایک عمدہ کہانی سنائی ہے! کیا تم اس وقت اسی چاندی کی کان کے متعلق سوچ رہے تھے جب تم نے کہا تھا کہ پادری میرے لئے اتنی دولت مہیا کر سکتا ہے جو میری تمام ضروریات کے لئے کافی ہوگی؟"

"ہاں"

"لیکن تم کس طرح خیال کرسکتے ہو کہ ایک شخص جس نے اپنے محبوب اور اپنی زندگی کی تمام آسائشوں کو تیاگ دیا ہو مجھے کان کا راستہ بتا دے گا؟"

"لیکن یہ معاملہ مختلف ہے ممکن ہے کہ مادرِ وطن کی ضرورت کو محسوس کرکے وہ اس بات پر آمادہ ہو جائے۔"

"کیا تمہیں پورا پورا یقین ہے؟"

"ہاں"

"لیکن کیا وہ اس بات کی بھی پروا نہیں کرے گا کہ اُس کے کسانوں کا کیا حشر ہوگا؟"

"یہ معاملہ خدا کے ہاتھ میں ہے!"

بادشاہ اُٹھ کر کھڑکی کی طرف گیا اور لوگوں کے گروہ کو کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ مسکرانے لگا۔ اُس نے پادری سے کہا "تم میری طرف سے پادری کا شکریہ ادا کرنا اور کہہ دینا کہ سویڈن کے بادشاہ کو ان طاقتور نوجوانوں کے دیکھنے سے بڑھ کر اور کوئی خواہش نہیں۔"

اس کے بعد وہ کھڑکی سے پلٹا اور پادری کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہنے لگا "کیا یہ واقعی سچ ہے کہ یہاں کا پادری اس قدر غریب ہے کہ وعظ کے بعد فوراً اپنا چغہ اتار لیتا ہے اور کسانوں کا سا لباس پہن لیتا ہے؟"

پادری نے کہا "ہاں وہ اتنا ہی غریب ہے،" اور اُس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

بادشاہ اس وقت عجیب کشمکش کی حالت میں تھا آخر اُس نے کہا "تم اب اس کان کو یونہی رہنے دو۔"

پادری نے پوچھا "لیکن اگر سلطنت خطرہ میں ہو تو؟"

"سلطنت کی مدد دولت سے نہیں بلکہ آدمیوں سے ہوسکتی ہے۔" یہ کہہ کر بادشاہ نے پادری سے الوداع کہی اور گرجا سے باہر نکل گیا۔

لوگ باہر چپ چاپ کھڑے تھے۔ جب بادشاہ سیڑھیوں سے نیچے اترا تو ایک کسان اُس کی طرف بڑھا اور کہنے لگا "کیا آپ نے ہمارے پادری سے گفتگو کی ہے؟"

بادشاہ نے کہا "ہاں، ہم نے اُس سے گفتگو کی ہے"

"تو پھر بلاشبہ آپ کو ہمارا جواب مل گیا ہوگا۔ ہم نے اسی لئے کہا تھا کہ آپ ہمارے پادری سے گفتگو کرکے ہمارا جواب معلوم کرلیں۔"

بادشاہ نے کہا "ہاں مجھے جواب مل گیا ہے!"

سراج الدین احمد نظامی

طلسمِ حق

طلسمِ حق ہے اے جاں یہ محبت باہمی اپنی
نظر آئی اس آئینے میں ہم کو ہر کمی اپنی

ہماری کج روش تقدیر ہے تدبیر نیکی کی
عیاں ہے درد کی تنویر سے تصویر نیکی کی

گلِ امید مایوسی نے دل کو کر دیا یکسر
تہی دستی نے خوشیوں کا خزانہ بھر دیا یکسر

طلسمِ حسن ہے اے جاں محبت کا چمن اپنا
گل و بلبل کے افسانوں کا مسکن ہے وطن اپنا

محبت کے لئے پیدا ہوئے ہیں میں بھی اور تو بھی
مروت کے لئے پیدا ہوئے ہیں میں بھی اور تو بھی

محبت کی کہانی آنکھوں میں تجھ سے تو مجھ سے
مسرت کی کہانی آنکھوں میں تجھ سے تو مجھ سے

مرے پیارے کریں خلوت میں آ مل کر دعا دونوں
ہمیشہ ہم رہیں یک جان و یک دل اے خدا دونوں

طلسمِ علم و قوت ہے مری جاں یہ محبت بھی
فلک کی روشنی کا آشیاں ہے اس کی ظلمت بھی

محبت کی مشقت بھی ہے اک گلشن مسرت کا
ہمیشہ خوش ہے جادو چل گیا جس پر محبت کا

مروت جس کے دل میں ہے، اُسے غم میں بھی راحت ہے
محبت جس کے دل میں ہے اُسے دوزخ بھی جنت ہے

خدا کا شکر ہے جس نے دیا الفت کا غم ہم کو
یہ غم دے کر کیا ہے بے نیازِ بیش و کم ہم کو

خدا کا شکر ہے الفت کو یوں زندہ کیا جس نے
چراغِ عشق سے ظلمت کو تابندہ کیا جس نے

ہوس ہے موت دل کی اور محبت زندگانی ہے
محبت کی جھلک شمعِ حیاتِ جاودانی ہے

محبت میں ہماری جانِ من نیکی ہو خدمت ہو
پیامِ صد مسرت ہم کو اوروں کی مسرت ہو

جفا کاروں کی دنیا میں وفا سے کام ہو ہم کو
تصورِ خالقِ الفت کا صبح و شام ہو ہم کو

فضا میں چار سُو رنگینیوں کا ابر چھا جائے
محبت کے چمن میں حق ہمیں جلوہ دکھا جائے

بہار

قدرتی اشکال میں خم

کسی شخص کو اس حقیقت سے انکار نہیں ہو گا کہ وہ تمام اشکال جن کا حسن و جمال مسلم ہے کلیۃً خطوطِ منحنی سے بنی
جو چیز اس جگہ خاص طور پر ثابت کرنی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ تمام قدرتی اشکال میں خواہ وہ کسی قسم کی
ازک خم ناگزیر طور پر موجود ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ قلعیں اور بعض کوہستانی اشکال جو رفعت و عظمت اور تضاد
منے کے لئے تصویریں شریک کی جاتی ہیں (جیسے ملبہ کی ڈھلوان سطح) روشنی کی کرنیں، ساکن پانی اور ہموار میدان
تی کے چند نامیاتی مظاہر اگر مستثنیٰ کر دیئے جائیں تو قدرت کا کوئی خط یا سطح ایسی نہیں جس میں انحنا نہ ہو، اگرچہ بادلو
افق کے قریب ان کے زیریں خطوط ہیں، اور بڑے بڑے وسیع میدانوں میں اکثر خطوطِ مستقیم کا گمان ہوتا ہے
جود نہیں ہوتے۔ ان کے بغیر وہ گھیرے اور خم جو متضاد کیفیت پیدا کرتے ہیں، ہمارے حواس کو صحیح طور پر متاثر
ہماری نظر قدرتی اشکال میں اگرچہ زیادہ تر انحنا کی اُس پاکیزگی سے لطف اندوز ہوتی ہے جس کی نقل کسی صناع
تار سکتا لیکن وہ سطحیں جو محض تضاد پیدا کرنے کی خاطر استعمال کر لی جاتی ہیں، ان کو خوبصورت بنانے کے
مہیا کئے جاتے ہیں جیسے پانی میں انحنائے سطح کی اُس کیفیت کو منعکس کر کے جس سے پانی خود عاری ہوتا ہے۔
جسے قدرت کو ابھی اپنے سانچے میں ڈھالنے کا موقع نہ ملا ہو، کانوں اور گڑھوں میں جن کی کھدائی سے
نہیں ہوتا۔ غرض زمین کے تمام غیر طبعی صدمات اور اُن کے آثار میں اور عام طور پر بربادی اور مرض کی
غائب ہو جاتے ہیں اور بے ہنگم بے جوڑ شکستہ اور بے معنی لکیریں اُن کی جگہ لے لیتی ہیں۔

حمید احمد خاں

تلاشِ حق

ہے دلِ انساں میں پیدا اُس کی جاں میں ہے — تلاش و جستجو تیری مگر کون و مکاں میں ہے
مجھ کو سینے میں تری خاطر ہوں سرگرداں — عجب کچھ لطف میرے "تُو کہاں اور میں کہاں" میں ہے
میں ہے لاتقنطوا کا شور موجوں میں — مجھے کیا غم جو کشتی میری بحرِ بے کراں میں ہے
مٹا کر اپنی ہستی کاش تجھ میں جا کے مل جاؤں
بڑی مشکل جو ہے مجھ کو وہ عمرِ جاوداں میں ہے

الہ داد خاں وداد

محفلِ ادب

مالن کا گیت

یہ گیت سنسکرت کے ایک چھند "کراونچ پدا" میں ہے۔ اس بحر میں ہندی اور بنگالی زبانوں میں بہت ہیں مگر اردو میں شاید اب سے پہلے کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی۔

جی دکھتا ہے کیسے توڑوں
چھوٹی چھوٹی ننھی ننھی پیاری پیاری کلیاں
لے کانٹے میں سچ سچ کہہ دوں
تیرے سارے پتے وتے میری ساری کلیاں
یا اللہ میں صبح کو پاؤں
ٹہنی ٹہنی اچھی اچھی بھاری بھاری کلیاں
گیت افسر کا ایسا گاؤں
جیسے میرے پودوں والی نیاری نیاری کلیاں

"پیامِ روح"

جاپانی شاعری

دنیا میں سب سے چھوٹی نظمیں اگر کسی زبان میں پائی جاتی ہیں تو وہ جاپانی ہے۔ جاپانی زبان میں کوئی نظم تین چار زیادہ نہیں ہوتی۔ مگر ان تین چار شعروں میں بہترین جواہر ریزے پائے جاتے ہیں۔ ذیل میں جاپان کے مشہور شاعر اکؔ کی چند بہترین نظموں کا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے،

(۱) میرے دل تک پہنچنے کے لئے ہزاروں سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ میرا عاشق ابھی تو شاید ایک یا دو ہی طے کر سکا ہے۔

(۲) میری عیادت کے لئے مصیبت کے وقت آنا کیونکہ تصدیقِ محبت کا یہی دن ہے۔

(۳) میں پھول گھر کا وہ تختہ نہیں ہوں جس پر ہمیشہ پھول کھلتے رہتے ہیں۔

(۴) میرے دل کے مانند جو تیرا منتظر ہے گلدستہ آج شب تک مرجھا جائے گا۔

(۵) میرے سوا ایک اور شخص ہے جس کے لئے تو بیقرار ہے مگر جس کو دیکھ کر میں خونِ جگر پیتا ہوں۔

(۶) یہ عجیب بات ہے کہ محبت کرتے ہوئے دلوں کو تو دو سمجھتا ہے جب کہ وہ ایک ہو چکے ہیں۔

(۷) عورت کی مصیبتیں دنیاوی مصیبتوں سے پہلے موجود تھیں۔

(۸) رات ہوگئی اور شبنم پڑ رہی ہے مگر آہ اس وقت یہ رونے کی آواز کہاں سے آنے لگی۔

(۹) آج شب کو ہوائیں تندی سے چل رہی ہیں اور میرے گیسوؤں سے سرگوشیاں کر رہی ہیں۔

(۱۰) تم نے مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ رات کو کھیت میں ملو گے۔ جب میں اسی امید میں کھیت میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں ماہِ کامل چمک رہا ہے۔

(۱۱) بہار نے یہ ممکن کر دیا ہے کہ ہم ایک دوسرے کا احوالِ دل سن سکیں۔

"نیرنگِ خیال"

یونانِ قدیم اور شاعری و موسیقی

قدیم اہلِ یونان کی زندگی میں شاعری کی اہمیت اور اس کے ساتھ موسیقی اور دیگر فنون کی اہمیت معلوم کرنے کے لئے افلاطون کا ایک اقتباس بہت دلچسپ اور مفید ثابت ہوگا۔

"جب بچہ معمولی نوشت و خواند سیکھ لے اور اس لائق ہو جائے کہ عبارت کو اس طرح سمجھنے لگے جس طرح وہ سننے سے سمجھ لیتا تھا تو اُس کے ہاتھ میں جلیل القدر شعرا کی تصانیف دی جاتی تھیں جن کو وہ مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ یہ تصانیف کئی ہدایتوں، کہانیوں، مشاہیرِ سلف کی مدح سرائی اور تعریفوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ تاکہ وہ اُن کو پڑھے اور اکابر و مشاہیرِ سلف کا ہمسر یا اُن سے برتر بننے کی کوشش کرے۔ اس کے بعد بربط نواز اساتذہ بھی حزم و احتیاط سے کام لیتے تھے۔ اور اسی فکر میں لگے رہتے تھے کہ اپنے شاگردوں کو توازن اور اعتدال میں رکھیں اور غلط کاری و گمراہی کا شکار نہ ہونے دیں۔ وہ اپنے شاگردوں کو بلند پایہ جذبات نگار مطرب شعرا کی لطیف نظموں سے روشناس کراتے۔ ان نظموں کو موسیقی کے سروں میں گاتے اور ان کے وزن و بحر سے بچوں کی روح کو آشنا کر دیتے تاکہ بچے زیادہ شریف، اعتدال پسند اور سنجیدہ مزاج ہو جائیں اور اس طرح ان کے قول و فعل میں بھی ایک توازن و توافق اور اعتدال پیدا ہو جائے اس لئے کہ انسانی زندگی کا ہر شعبہ توازن و اعتدال کا محتاج ہے۔"

"ریاست"

قدرت کی بھیّا دوج

(بھیّا دوج یعنی کاتک کا دوسرا دن۔ یہ ایک تہوار ہے جس میں بھائی اپنی بہنوں کو اپنی محبت کی نشانی کے طور پر تحفے دیتے ہیں۔)

"بھیا دوج کا یہ پُرطرب تہوار تمام شہروں، جنگلوں اور تمام روئے زمین پر منایا جا رہا ہے تمام بہن بھائی خوشی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

دھرتی اس جشن کو منانے کے لئے گذشتہ چار ماہ سے تیاریاں کر رہی ہے اور بادلوں سے جو کچھ اُسے لینا تھا، سب لے کر اُس نے ایک رنگ برنگ کی نہایت زریں اور بھڑکیلی پوشاک پہنی ہے۔ اُس نے اُن خوبصورت پھولوں کا سنگار کیا ہے، جن کی تیاری کے لئے عناصر یعنی پانی روشنی اور ہوا نے لگاتار محنت کی ہے۔ اپنی خوشی کی ترنگ میں وہ کسی خاص سنگار کو ترجیح نہیں دیتی۔ قدرت کی اور دوسری ہستیاں اُس کے چھوٹے بھائی ہیں جن کو اُس نے اِس تہوار کی خوشی منانے کے لئے بلایا ہے۔

ندی اپنے بھائیوں۔ کنارے کے درختوں کو اپنی موجوں کے ہلکوروں سے آرتی لیتی ہے اور وہ اس کو دو ایک پھول نذر کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض، جن کے پاس دینے کو کچھ بھی نہیں، صرف اپنی شاخوں کو خوشی سے ہلا ہلا کر اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں اس ہدیۂ محبت کو ندی ہنس کر قبول کرتی ہے کیونکہ یہ تہوار بے لوث محبت کا تہوار ہے، تحائف کے قیمتی نہ ہونے کی اس روز کچھ پروا نہیں کی جاتی۔

لہریں اپنے چھوٹے بھائی جھاگ کو سروں پر بٹھا کر کھیلتی اور اُن کو پیار کرتی ہیں۔

یہ بھیا دوج بہن بھائی کی محبت کا نمونہ ہے، اے بیل! مجھے بتا، تیرا پیارا بھائی کون ہے؟ کیا یہ خوش نصیب درخت تیرا بھائی ہے جسے اپنی گودی میں لئے ہوئے تو ہمیشہ نہال رہتی ہے؟ بیل نے کہا "یہ جو سنا کرتے تھے کہ شاعر دیوانے ہوتے ہیں، اس کا ثبوت آج ملا، کیا تم نے کسی نیک بخت عورت کو ہمیشہ اپنے ماں باپ اور بھائیوں کے ہاں رہتے دیکھا ہے تم ایک شاعر ہو اس لئے شوہر اور بھائی میں تمیز نہیں کر سکتے"۔ میں نے پوچھا "تو پھر بھونرا تیرا بھائی ہے"۔ بیل نے منہ بنا کر کہا "ارے وہ تو صرف ایک بھکاری اور خوشامدی ہے، وہ مجھ سے بے لوث محبت رکھنے والا بھائی کیسے ہو سکتا ہے۔ اسی طرح سے سورج، ہوا، بادل یہ بھی میرے بھائی نہیں ہو سکتے۔ وہ تو خدا کے فرشتے ہیں اور میں رشیوں کی طرح اُن کی عزت کرتی ہوں" میں نے کہا کہ آخر پھر تُو ہی بتا کہ تیرا بھائی کون ہے؟ بیل نے خوش ہو کر چند پھول مجھ پر برسائے اور کہا "مجھے گا گا کر کون سنایا کرتا ہے؟ وہ شاعر ہے اور وہی میرا بھائی ہے"۔

"زمان" کے بچے دن اور رات بھی اس تہوار کو مناتے ہیں۔ بھائی بہت محنتی ہے اور بہن انتہا درجے کی پُرسکون۔ بھائی اور بہن دن میں دو مرتبہ ملتے ہیں، انہوں نے اس تہوار کے منانے کی کیا تیاریاں کی ہیں؟ فیاض بھائی (دن) نے اپنا سب کچھ جو خصوصیت کے ساتھ اُس کا ہے اپنی بہن رات کو دے دیا، رات آتشبازی کے چھٹنے اور مکانوں کو روشن کرنے کی وجہ سے دن کے مانند روشن ہوگئی ہے تمام رنگ رلیاں رات ہی کے لئے اٹھا رکھی جاتی ہیں۔ ایک بھائی اپنی بہن کے لئے اس سے زیادہ اور کیا کرسکتی ہے۔

"اردو"

چینی زبان

چینی زبان خیالات کے اظہار کے لئے کافی صلاحیت نہیں رکھتی اس زبان میں جو حرفی الفاظ زیادہ ہیں۔ ہر لفظ کے لئے ایک جداگانہ علامت معیّن ہے جو شاید ابتداءمیں کسی خیال کی عکاسی کے لئے ایجاد ہوئی تھی۔ ساتویں صدی کے آخر میں شاہی احکام کے بموجب ایک عظیم الشان چینی لغت تیار کی گئی تھی اس میں پینتالیس ہزار اسی طرح کے علاماتِ لفظی جمع کئے گئے تھے۔ ان میں سے بیشتر کا تلفظ ایک ہی سا ہے۔ ایک دوسرے کے معانی کا فرق محض زبان کے مختلف لہجوں سے کیا جاتا ہے۔ خیالات اور زمانہ کی ترقی کے ساتھ اس لغت میں اب بہت کچھ اضافہ ہوگیا ہے۔ لیکن حقیقتًا چند ہزار ہی الفاظ ایسے ہیں جو عام طور پر زبان پر مشتمل ہیں۔ چینی عبارات تحریر کرنے میں علاماتِ لفظی اوپر سے نیچے کی جانب لکھے جاتے ہیں۔ جب ایک مرتبہ ان علامات کی شناخت اور استعمال میں مہارت پیدا ہوجاتی ہے تو پھر قومی زبان میں رسل ورسائل کے لئے کوئی دقت واقع نہیں ہوتی لیکن یہ طرزِ تحریر کانوں کی بہ نسبت آنکھوں کو زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے۔

چونکہ لہجوں کے ذرا ذرا سے اختلاف سے لفظوں میں مختلف معانی پیدا ہوجاتے ہیں۔ اس لئے لازمی طور پر لوگوں کی بول چال میں بڑا فرق ہے۔ یہاں تک کہ شمالی صوبوں کے باشندے جنوبی صوبوں کے باشندوں کی زبان اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی اپنے مافی الضمیر کی توضیح تحریر میں صراحت کے ساتھ کرنی پڑتی ہے۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگوں میں عدالتی زبان ہی عام طور پر مروج ہے۔ اس زبان میں معلومات و مہارت بہم پہنچانا بہت دشوار ہے۔ لیکن غیر ممالک کے لوگ جو چین میں رہتے ہیں یا تجارت وغیرہ کے سلسلہ میں وہاں آتے جاتے ہیں دوسری زبانوں سے بگڑی ہوئی چینی استعمال کرتے ہیں۔ اکثر بندرگاہوں پر غیر ممالک کے تجار کی آمد و رفت و قیام سے ایک مخلوط زبان پیدا ہوگئی ہے۔ خصوصًا پرتگالی و انگریزی الفاظ بہت کثرت سے ملکی زبان میں شامل ہوگئے ہیں۔

"مبصّر"

تبصرہ

طبقات الامم مصنفہ قاضی ابوالقاسم صاعد بن احمد اندلسی دنیا کی مختلف قوموں اور خصوصاً مسلمانوں کے علوم و فنون کی تاریخ ہے۔ قاضی ساعد اندلس کے اسلامی عہد کے قابل ترین علما میں سے گزرے ہیں اور یہ کتاب اُن کی ایک عظیم الشان علمی یادگار ہے۔ اس میں قرونِ وسطیٰ کے علوم و فنون کے حالات درج ہیں اور اقوامِ عالم کے متعلق بہت سی مفید اور کارآمد باتیں اختصار اور جامعیّت کے ساتھ لکھی ہیں۔ اردو زبان میں اس کتاب کا ترجمہ قاضی احمد میاں صاحب اختؔر جوناگڑھی نے کیا ہے۔ ترجمہ نہایت اچھا ہے۔ مترجم نے حواشی لکھ کر کتاب کو اور بھی مفید بنا دیا ہے۔ کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ ہے۔ حجم ۲۵۰ صفحات اور قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ہے۔ مطبع معارف اعظم گڈھ سے طلب فرمائیے۔

خزائن الفتوح۔ حضرت امیر خسرو دہلوی نے نثر کی دو کتابیں لکھی ہیں۔ اعجازِ خسروی اور خزائن الفتوح۔ خزائن الفتوح سلطان علاؤالدین خلجی کی لڑائیوں کی ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی مختصر تاریخ ہے جو سلطان موصوف ہی کے عہدِ حکومت میں لکھی گئی اور جسے ایک ایسے شخص نے لکھا جو خود فنِ سپہ گری کا ماہر تھا۔ اب تک صرف چند کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے موجود تھے اور تاریخ کے طلبا عام طور پر اس سے استفادہ نہیں کر سکتے تھے ہمیں سلطانیہ انجمن تاریخ کا ممنون ہونا چاہئے کہ انہوں نے برٹش میوزیم کے مسودۂ کتاب سے دو ایک مسودوں کا مقابلہ کر کے تصحیح کے خاص اہتمام کے ساتھ اُسے شائع کر دیا ہے۔ حجم دو سو صفحات سے زیادہ ہے۔ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ، انجمن تاریخ جامعۂ اسلامیہ، علی گڈھ

پیامِ روح جناب حامد اللہ صاحب افسؔر بی اے کے کلام کا مجموعہ ہے جو تین حصوں پر مشتمل ہے (۱) نغمات الصغر میں اوائلِ عمر کا کلام ہے۔ (۲) روحِ جذبات میں ۱۹۱۹ء سے لے کر اس وقت تک کی نظمیں ہیں اور (۳) پرتوِ افکار میں فلسفیانہ اور فکری شاعری ہے۔ کتاب کی طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ ہر صفحہ سرخ جدول سے مزین ہے کاغذ عمدہ اور دبیز ہے اور حجم اڑھائی سو صفحات سے زیادہ ہے۔ بعض نظموں کے ساتھ رنگین تصویریں بھی شامل کی گئی ہیں۔ چنانچہ ساری کتاب میں ہندوستانی مصوری کے چھ خوبصورت نمونے ہیں۔

جناب افسؔر نوجوان شعرا میں بہت اچھا لکھنے والوں میں سے ہیں۔ موسیقی، جدتِ خیال اور سلاستِ بیان ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں، حبِ وطن اخلاق اور روحانیت سے اُن کا کلام پُر ہے اور ان کے اشعار میں قناعت غم اور یاس کے ساتھ ساتھ عمل، مسرت اور امید کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

نغمات الصغر کی بعض نظموں میں گو اتنی بلندی اور پختگی نہیں جتنی بعد کے کلام میں ہے لیکن اس میں بھی افسر کی طبیعت کا اصل جوہر موجود ہے۔ حمد میں پہاڑوں کی بلندی کے متعلق یہ کتنا انوکھا خیال ہے:

بلندی پہاڑوں کو دی اس قدر کہ تھکتی ہے چوٹی پہ جا کر نظر

وطنیت کے جذبے کے علاوہ ان اشعار میں کتنی دلکشی ہے:

پیارے پھول اور پھل بھارت کے پیارے سب جنگل بھارت کے
پیارے آج اور کل بھارت کے پیارے جل اور تھل بھارت کے

بھارت پیارا بھارت پیارا

روح جذبات میں دولت سند جوگی، سائل، شاعر، لوری، خضر کا کام اور تربلینی بہت اچھی نظمیں ہیں خلق خدا کی محبت اور نیکی کی تڑپ ہر انسان کے دل میں ہونی چاہئے افسر نے اس جذبہ کو کس قدر موثر پیرایہ میں لکھا ہے۔

درد جس دل میں ہو اُس دل کی دوا بن جاؤں کوئی بیمار اگر ہو تو شفا بن جاؤں
دکھ میں جلتے ہوئے لب کی میں دعا بن جاؤں
اُف وہ آنکھیں کہ ہیں بینائی سے محروم کہیں روشنی جن میں نہیں نور جن آنکھوں میں نہیں
میں اُن آنکھوں کے لئے نور وضیا بن جاؤں
دور منزل سے اگر راہ میں تھک جائے کوئی جب مسافر کسی رستے میں بھٹک جائے کہیں
خضر کا کام کروں راہ نما بن جاؤں

پر تو افکار میں حکمت اور فلسفہ ہے لیکن اس خشک موضوع کو بھی افسر نے اکثر دلآویز انداز میں بیان کیا ہے مندرجہ ذیل اشعار اس کا ثبوت ہیں:

رہبر خود گمراہ ہوئے ہیں آج زمانہ ایسا ہے ہر اک گام پہ منزل ہوگی وہ بھی زمانہ آئے گا
دولت ہے نیکی میں داخل آج زمانہ ایسا ہے دولت جرم میں داخل ہوگی وہ بھی زمانہ آئے گا
آج اندھیرا ہے ہر گھر میں آج زمانہ ایسا ہے جگ مگ جگ مگ محفل ہوگی وہ بھی زمانہ آئے گا

کتاب کی قیمت ایک روپیہ مقرر کی گئی ہے۔ انڈین پریس الہ آباد سے طلب فرمائیے۔

دلچسپ۔ ایک ماہوار رسالہ ہے جو چھوٹی تقطیع پر لاہور سے پنڈت نند کشور صاحب شائق کی ادارت میں گزشتہ فروری سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس کے دو نمبر ہم دیکھ چکے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ رسالہ واقعی اسم بامسمی ہے۔ فروری کے پرچے میں میاں حفظ الرحمن صاحب کا مختصر مقالہ انٹارٹیکا، لالہ جسونت رام صاحب کا مضمون بچوں کی تربیت اور بابو شوبرت لال صاحب کا افسانہ سیدھے لال اور ٹیڑھے لال خوب ہیں اور مارچ کی اشاعت میں میرزا فہیم بیگ صاحب کا افسانہ محمدی بوا تاثیر سے بھرا ہوا اور دلچسپ ہے۔ کارپردازان رسالہ نے میرزا صاحب موصوف کے بلند پایہ مضامین حاصل کرنے کا خاص انتظام کیا ہے۔ کتابت طباعت اور کاغذ معمولی ہے حجم ۸۰ صفحات اور قیمت دو روپے سالانہ ہے۔ پتہ منیجر رسالہ دلچسپ، اسجد یو بلڈنگ چوک متی لاہور۔

فہرستِ مضامین

جلد ۱۵ — نمبر ۶

بابت ماہِ مئی ۱۹۲۹ء

تصویر: تعلیم، ایک سنگتراش کے تصور میں

پھولوں کے دن

پھولوں کے دن
جھولوں کے دن
کھیلوں کے دن
میلوں کے دن
یہ دن یہ راتیں کب تلک؟ میٹھی سی باتیں کب تلک؟
آئے گی آخر وہ گھڑی
ٹوٹے گی جاں کی جب لڑی
چھوٹے کا سب کا ساتھ جب
چل دیں گے خالی ہاتھ جب
یہ رنگ رلیاں پھر کہاں؟ یہ پھول کلیاں پھر کہاں؟

گیتوں کے دن
پریتوں کے دن
چاہت کے دن
راحت کے دن
مل کر یہ گانا کب تلک؟ ہنسنا ہنسانا کب تلک؟
یہ راحتیں ہیں چار دن
یہ چاہتیں ہیں چار دن
باہم یہ چاہت پھر کہاں؟ باہم یہ راحت پھر کہاں؟

اِک خواب سے جیسے کبھی
پیدا ہوئی تھی زندگی
اک خواب کے اندر کبھی
ویسے ہی پھر کھو جائے گی!

ورڈزورتھ

ب

جہاں نما

چین میں مرد عورتوں سے کیوں زیادہ ہیں

یورپین محققین کے نزدیک چین کی آبادی کا یہ ایک حیرت انگیز پہلو ہے کہ اس میں بالغ مردوں کی تعداد بالغ عورتوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ چین کے ہر پانچ نوجوانوں میں جو شادی کے قابل ہیں ایک شخص کو بیوی کے بغیر زندگی بسر کرنی پڑتی ہے اور جب اس امر کو مد نظر رکھا جائے کہ چین کے بہت سے زراعت پیشہ خاندانوں کے پاس کاشت کے لئے کافی زمین نہیں ہوتی تو پھر یہ حقیقت زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ چینی مرد کیوں سپہ گری یا قزاقی کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں؟ اس وقت چین میں قریباً بیس لاکھ ایسے آدمی ہیں جن کی نہ کوئی جورو ہے نہ کوئی گھر۔ چین کی فوجی جمعیت بھی آج قریب قریب اسی قدر ہے۔ چینی سپاہیوں کی رجمنٹ یا پلٹن کو توڑنے سے پہلے حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان کے لئے کسی جگہ آباد ہونے کے وسائل بہم پہنچائے۔ انہیں اپنے آبائی گھروں کی طرف بھیجنا بے فائدہ ہے کیونکہ وہاں بیوی نہیں جو اپنے خاوند کا خندہ پیشانی کے ساتھ خیر مقدم کرے گی۔ نہ کوئی زمین کا ٹکڑا ہے جس میں وہ ہل چلا سکے گا۔ نہ کوئی تجارت ہے جس سے وہ نفع اٹھائے گا غرض کہ شہروں میں خدا کی اس مخلوق کے لئے کوئی دلبستگی، کوئی کشش نہیں۔ حکومت اپنی رعایا کے لاکھوں افراد کی بے کاری کے مسئلہ کو صرف اسی طریقہ سے حل کر سکتی ہے کہ اُن کے لئے ایک وسیع پیمانہ پر کام مہیا کرے۔

"سچائنا جرنل" اس اہم مسئلہ کے متعلق لکھتا ہے۔ چین میں مردوں کی زائد تعداد کے لئے بیویوں کے بہم پہنچانے کا سوال ایسا نہیں ہے جو بہت جلد حل ہو سکے۔ درحقیقت اس مسئلہ کا تعلق چین کی تعلیمی ترقی اور دماغی نشوونما سے ہے۔ عورتوں کی کمی کے دو بڑے اسباب ہیں۔ ایک یہ کہ چین میں لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکیوں کو بہت حقیر خیال کیا جاتا ہے۔ اس ذہنیت کا یہ نتیجہ ہے کہ بچپن میں لڑکیوں کی غور و پرداخت پر کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ زراعت پیشہ اور مزدور پیشہ جماعتوں میں قدیم الایام سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالا جاتے لیکن لڑکوں کے متعلق والدین کے سینوں میں یہ وحشیانہ اور قاتلانہ جذبہ نہیں پایا جاتا۔ دختر کشی کی یہ قبیح اور ناپاک رسم بتدریج مٹ رہی ہے مگر اس میں کلام نہیں کہ جو ننھی لڑکیاں بڑی ہو کر چینی فوج کے موجودہ نوجوان سپاہیوں کی بیویاں بننے والی تھیں وہ پیدا ہوتے ہی والدین کی جہالت اور وحشیانہ پن کا شکار ہو گئیں۔ عورتوں کی قلت کا دوسرا سبب یہ ہے کہ لڑکیوں کو

بہت بُری حالت میں رکھا جاتا ہے۔ کسی چینی گاؤں میں آپ چلے جائیے وہاں آپ کو ایک والدین کے دو بچوں کی پرورش اور تربیت میں جن میں سے ایک لڑکا ہے اور دوسری لڑکی یا ایک بھائی ہے اور دوسری بہن ایک نمایاں فرق نظر آئے گا۔ لڑکے کو بہترین خوراک دی جاتی ہے لیکن اس کی بدقسمت بہن کو بچے کھچے ٹکڑوں پر گذارا کرنا پڑتا ہے لڑکے کی پرورش اور تربیت پر خاص توجہ کی جاتی ہے لیکن لڑکی اس توجہ کی مستحق نہیں سمجھی جاتی۔ لڑکی اپنے والدین کے گھر میں مصیبت اور جفاکشی کی زندگی بسر کرتی ہے۔ جب وہ شادی کے بعد اپنے خاوند کے گھر جاتی ہے تو وہاں بھی اس کی زندگی میں کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ خاوند کے گھر میں اسے اپنی ساس کے جور و جفا کا تختۂ مشق بننا پڑتا ہے۔ وہ گھر کی مالکہ نہیں بلکہ لونڈی ہے جسے ہر قسم کی محنت و مشقت برداشت کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے چین کی مزدور پیشہ جماعتوں میں اس امر کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ عورتوں کے حقوق کا احترام کیا جائے۔ جب چین کی نسوانی دنیا میں انقلاب پیدا ہو جائے گا۔ اور چینی والدین اپنی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کو ویسا ہی ضروری سمجھیں گے جیسا کہ لڑکوں کی تعلیم و تربیت کو تو پھر ایک نسل کے بعد چین کی آبادی میں عورتوں کی کمی کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ اس وقت چین میں مردوں کی غیر معمولی زیادتی خود چین کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔ لیکن اگر چینی سپاہی اُن برکتوں سے بہرہ اندوز ہو جو صرف گھر اور گھر والی کی بدولت حاصل ہو سکتی ہیں تو یہ خطرہ خیر و برکت میں منتقل ہو سکتا ہے"

چین کی موجودہ نسوانی تحریک جو بڑے بڑے شہروں میں بسرعت تمام پھیل رہی ہے بہت امید افزا ہے مغربی تہذیب اور زمانہ کے انقلابات نے چینی گھرانوں میں بیداری اور ترقی کی ایک نئی روح پیدا کر دی ہے۔ لوگ پرانی رسموں کو ترک کر رہے ہیں اور یورپین وضع اختیار کر رہے ہیں۔ عورتوں کے پاؤں اس قدر چھوٹے اور کمزور ہوتے تھے کہ وہ تیز قدم اٹھانے سے بالکل معذور تھیں۔ ان کے پیروں کی نشو و نما کو ایک خاص طریقہ سے روک دیا جاتا تھا۔ مگر اب یہ وحشیانہ رسم حرفِ غلط کی طرح مٹ رہی ہے۔

جرمنی کے سائنس دانوں نے جنگ کے قیدیوں سے کیا کام لیا

جب اتحادیوں کے قیدی جرمنی میں پہنچے تو وہاں کے سائنس دانوں نے ہندوستانی قیدیوں کے اُس اجتماع کو جو مختلف فرقوں اور جماعتوں پر مشتمل تھا اپنی علمی تحقیقات کے لئے غنیمت سمجھا۔ وہ اپنے معملوں سے نکل کر قیدیوں کے کیمپ میں پہنچ گئے جہاں انہوں نے نہ صرف قیدیوں کی عکسی تصویریں اتاریں بلکہ ان کی زبان اور رسم و رواج

کے متعلق بھی پوری تحقیقات کی۔ انہوں نے ان کی بولی اور گیتوں کو فونوگراف کے ریکارڈوں میں بھر لیا، جو آج جامعہ برلن کے "شعبۂ علم تلفظ" کی نہایت قیمتی جائداد خیال کئے جاتے ہیں۔ جرمنی اپنے اس دعوے میں بالکل حق بجانب ہے کہ دنیا کی کسی قوم یا حکومت کے پاس ہندوستان کی ملکی زبانوں کا اس قدر مکمل ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ جرمنوں کی روشن خیالی اور علم دوستی کی یہ ایک روشن مثال ہے کہ انہوں نے جنگ کے ہندوستانی قیدیوں کی بدولت اپنی معلومات میں اضافہ کیا۔

انگریزی دیہات میں تعلیم

سر مائیکل سیڈلر نے جو تعلیم کے ایک بہت بڑے ماہر ہیں رسالہ "انگلش ریویو" میں انگلستان کے دیہات کی تعلیمی ضروریات کے متعلق حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے:۔

وقت آگیا ہے کہ انگلستان کے بعض دیہات میں ساسٹن کے دیہاتی کالج کی طرح چھوٹے چھوٹے دیہاتی کالج قائم کئے جائیں۔ ساسٹن کے دیہاتی کالج کی تعمیر کا سہرا کیمبرج شائر ایجوکیشن کمیٹی کے سکرٹری مسٹر ہنری مارس کے سر ہے جنہوں نے جب اس کام کا بیڑا اٹھایا تو بہت سے روشن خیال اور فیاض آدمی اُن کا ہاتھ بٹانے کے لئے آمادہ ہوگئے۔ انگلستان کے لوگوں میں موسیقی اور آرٹ سے بہرہ اندوز ہونے کی خواہش ان شعبوں میں ملک کی ترقی کے آثار ظاہر کرتی ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ معاشرتی تعلقات میں مسرت کے سامان بہم پہنچائے جائیں۔ دیہاتی علاقہ کے دلآویز مناظر اور شہروں میں فن تعمیر کے اعلیٰ نمونوں کے متعلق ان کی دلچسپی کو بڑھایا جائے تاکہ اُن کے دماغ روشن ہوں۔ تمدن اور تہذیب کا دائرہ زیادہ وسیع کیا جائے۔ دیہات میں ایسی عمارتوں کا سلسلہ قائم کرنے کے لئے جلد عملی تدابیر اختیار کی جائیں جو اس جدید تہذیب کا مرکز اور گھر ہوں۔ ان عمارتوں میں موسیقی کے آلات، تصویریں، نقشے اور مجسمے ہوں۔ نفیس لیکن سادہ وضع کا سامان خانہ داری پارچات اور ظروف ہوں۔ کتابیں ہوں (جن میں فرضی قصے بھی شامل ہوں)۔ کتابوں کے انتخاب کے متعلق مشورہ کا انتظام ہو۔ باقاعدہ مطالعہ اور علم کی تحریص و ترغیب کے لئے جماعتیں قائم کی جائیں اور لیکچر ہوں۔ ہم ان تمام ضروریات کو پہلے سے زیادہ محسوس کرتے ہیں، اور چونکہ ہمیں ان میں زیادہ مسرت معلوم ہوتی ہے اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں یہ تمام چیزیں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ہمارے خیال میں زندگی کا اور ان چیزوں کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے جس سے جماعتی اتحاد کا ایک نیا جذبہ مترشح ہوتا ہے اور جس سے صرف ہماری

انفرادی زندگی کی آرائش ہی مقصود نہیں۔ بالغوں کی تعلیم کے لئے آلۂ نشرِ صوت کا استعمال، گراموفون، عمدہ کتابوں کے سستے ایڈیشن، دیہاتی علاقوں میں کتب خانوں کے لئے کارینگی ٹرسٹ کا نظام، انگلستان کے مختلف حصوں میں موسیقی کی تقریبیں، برطانیہ کے نوجوان مصوروں اور نقاشوں کے کارناموں کی نمائش آرٹس لیگ آف سروس کی سرگرم کوششیں، تقریریں اور یونیورسٹیوں اور مزدوروں کی تعلیمی انجمن کی نمایندہ مشترکہ کمیٹی کے زیرِ اہتمام تعلیمی سرگرمیاں - یہ تمام ایسی باتیں ہیں جو رائے عامہ کے نزدیک ایک زبردست تحریک کی علامات ہیں"۔

"لاسلکی" اور موسم

بعض لوگوں کا یہ خیال کہ موسم پر "لاسلکی" کا اثر ہوتا ہے درحقیقت بالکل بے بنیاد ہے۔ موسم کے اختلاف کی وجوہ فضا میں "لاسلکی" کی موجودگی کے مقابلہ میں بے اندازہ طور پر طاقتور اور اہم ہیں۔ مثال کے طور پر صرف بارش کے لئے جتنی توانائی کی ضرورت ہوتی ہے اُس کا تصور بھی ہم نہیں کرسکتے۔ ایک مربع میل کے رقبے میں ½ انچ بارش کے لئے جتنی حرارت کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس توانائی کے برابر ہے جو ایک کروڑ گھوڑوں کی طاقت والے انجن سے آدھے گھنٹے کے اندر پیدا ہو۔ بمقابلہ اس کے وہ برقی مقناطیسی توانائی جو تمام دنیا کے مقامات انتشار سے پیدا ہوتی ہے محض بے حقیقت ہے۔ ذرا تصوّر تو کیجیے کہ اگر ایک مربع میل کے رقبہ پر ½ انچ بارش کے لئے اس قدر توانائی کی ضرورت ہے تو اُن عالمگیر بارشوں پر کتنی توانائی صرف ہوتی ہوگی جن سے جل تھل ہو جاتے ہیں۔

مے نوش کہ عمرِ جاودانی اینست
خاصیّتِ روزگارِ فانی اینست
ہنگامِ گل و لالہ و یاراں سرمست
خوش باش دمے کہ زندگانی اینست

حافظ

تعلیم

(۱) تعلیم کو روح سے وہی نسبت ہے جو سنگ تراش کو مرمر سے ہے ——— ایڈیسن

(۲) تعلیم کتاب حیات کی ابجد ہے ——— ایمرسن

(۳) دنیا کی زندگی کا مدار مدرسے کے بچوں کے انفاس پر ہے ——— طالمود

(۴) تاریخ انسان کو حکمت سکھاتی ہے، شعر فطانت، ریاضی تیز فہمی، فلسفہ اسے عمیق، اخلاقی اور متین بناتا ہے اور منطق اور فصاحت اس میں مناظرانہ قابلیت پیدا کرتے ہیں ——— بیکن

(۵) دلیر انسان پیدا کرنے کے لئے دلیری سے تعلیم دو ——— رچر

(۶) ہر شخص کی تعلیم کا بہترین اور اہم ترین حصہ وہ ہے جو وہ خود اپنے آپ کو دیتا ہے ——— گبن

(۷) اس ملک میں تعلیم کا ایک لقمہ تو سب کو مل جاتا ہے لیکن پیٹ بھر کر کھانا کسی کسی کو میسر آتا ہے ——— تھیوڈور پارکر

(۸) تعلیم غریب کا سرمایہ اور امیر کا منافع ہے ——— ہوریس مین

تعلیم، ایک سنگتراش کے تصور میں

یہ مجسمہ مشہور ماہر فن سنگتراش البرٹ ٹافٹ کی صناعی کا نتیجہ ہے۔ سنگتراش نے اس مجسمہ میں تعلیم کے متعلق اپنے دل آویز تصور کو متشکل کیا ہے۔ سائنس، آرٹ اور ادبیات اُس کے نزدیک تعلیم کے اصل الاصول ہیں چنانچہ ان سب کے لئے مختلف علامات مجسمہ میں موجود ہیں۔ استاد کے ہاتھ میں ایک قدیم تحریر ہے جسے علم تاریخ کی علامت سمجھا گیا ہے کیونکہ تاریخ اس لحاظ سے کہ وہ قدیم اور جدید علوم و فنون کے سلسلہ میں بطور ایک حلقۂ مشترک کے ہے بلاشبہ تعلیم کا ایک نہایت ہی اہم رکن ہے۔ گزشتہ نسلیں تاریخ ہی کے ذریعہ سے اپنے علوم و فنون اور اپنا تجربہ آئندہ نسلوں کے لئے ترکہ کے طور پر چھوڑ جاتی ہیں۔

استاد کا دستِ شفقت شاگرد کے ذہنی و روحانی ارتقا کے لئے جس قدر ناگزیر ہے وہ ظاہر ہے۔ وہ کمالات علم و فضل کی اُس امانت کو جو گزشتہ نسلوں سے دست بدست اُسے ورثہ میں پہنچی ہے اپنے شاگرد کے ذریعہ سے آئندہ نسلوں تک پہنچا رہا ہے۔

منصور احمد

گلیلیو

ہزار ہا سال گزر جائیں گے اور دنیائے ہیئت گلیلیو کے نام کو نہ بھولے گی۔ اس نامور حکیم نے علم ہیئت کو بڑی ترقی دی۔ ستاروں کی دوربین کی ایجاد کا فخر اسی کو حاصل ہوا جس نے مہندسان روزگار کے آگے انکشافات جدیدہ کے انبار لگا دیئے۔ دنیا بھر کی رصد گاہوں کی بڑی سے بڑی دوربینیں بھی آج اسی کا علم بلند کیے ہوئے ہیں اور تمام عالم کے ہیئت دانوں نے اسی کی قابل قدر ایجاد سے بہرہ اندوز ہو کر آج آسمان کے چپے چپے کی رصد کر لی اور اس طرح علم ہیئت کو آسمان پر پہنچا دیا۔

یہ بے نظیر ہیئت دان ۱۵۶۴ء میں شہر پیسہ میں پیدا ہوا اور اُس کا نام گایلیو ڈی گلیلی رکھا گیا۔ اس ہونہار بچے نے جو ہوش سنبھالا تو والدین نے طبابت کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے اُس کو شہر پیسہ کی یونیورسٹی میں داخل کر دیا لیکن گلیلیو کو اس فن سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ علوم ریاضی کا استاد بننے کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔ چنانچہ علم طب میں مہارت حاصل کرنے کے بجائے اُس نے ریاضی دیکھنی شروع کر دی۔ اُدھر باپ نے یہ معلوم کر کے کہ طب کی طرف اس کا رجحان خاطر نہیں ہے ریاضی سیکھنے میں روک ٹوک نہیں کی اور ادھر اس عقلمند ہونہار فرزند نے کمسنی ہی میں اپنی سیّال طبیعت کے جوہر دکھانے شروع کئے۔

گلیلیو ابھی بیس سال کا بھی نہ تھا کہ اُس نے ایک قابل قدر ایجاد کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ اس نے دیکھا کہ گرجا کی چھت پر ایک لٹکا ہوا لیمپ حرکت کر رہا ہے۔ اس نے ایک عجیب بات یہ دیکھی کہ حرکت میں خواہ وہ لمبی ہو یا چھوٹی وقت ایک ہی جتنا صرف ہوتا ہے۔ نبض پر ہاتھ رکھ کر اُس نے پہلے یہ بات معلوم کی کہ لیمپ کی حرکت نبض کے مطابق ہے پھر اُس نے یہ سوچا کہ اسی طرح پتھر یا کوئی وزنی شے اگر ڈوری میں لٹکائی جائے تو اُس کی حرکت ڈوری کی لمبائی کی مناسبت سے رہے گی۔ بس یہی خیال تھا جو گھنٹے[۵۱] کا لنگر[۵۲] بنانے کا متحرک ہوا۔

---

۵۱ گھنٹے اور گھڑی کا اطلاق ایک آلۂ معروف پر ہوتا ہے جس سے وقت معلوم ہو لیکن گھنٹا زبان اردو میں اُس آلۂ مقیاس کو کہتے ہیں جس میں لنگر ہو اسی کو انگریزی میں کلاک کہتے ہیں اور گھڑی اُس کو کہتے ہیں جس میں لنگر نہ ہو خواہ وہ گھڑی جیبی ہو خواہ میز پر رکھنے کی۔

۵۲ لنگر پنڈولم جو گھنٹوں میں لٹکتا ہے بعض لوگ اسکو لٹکن بھی کہتے ہیں لیکن زبان اردو میں لٹکن اُس لوہے کی تپائی کو کہتے ہیں جس پر صراحی مٹکا یا ٹھلیا رکھی جاتی ہے۔ لفظ لنگر کا استعمال رسالہ النظامیہ لکھنؤ جلد ۳ نمبر ۲ بابت ماہ اپریل ۱۹۱۷ء مضمون روز وماہ وسال میں ملاحظہ ہو۔

گلیلیو کی عمر پچیس سال کی تھی کہ وہ سائنس اور ہیئت کا فارغ التحصیل ہوگیا اور اُس کی مہارت فن کی اتنی شہرت بڑھی کہ فرڈی نینڈ ڈیوک آف ٹسکنی نے اس کو ۱۵۸۹ء میں پیسہ کی یونیورسٹی میں ریاضی کا پروفیسر مقرر کر دیا۔ یہاں پہنچ کر اُس نے تحقیقات کی کہ کسی بلند مقام سے گرنے والی شے پہلے سیکنڈ میں ۱۶ فیٹ دوسرے سیکنڈ میں ۴۸ فیٹ اور تیسرے سیکنڈ میں ۸۰ فیٹ گرتی ہے۔ گویا اس طرح گرنے والی شے کی رفتار ہر سیکنڈ میں ایک خاص تناسب کے ساتھ بڑھتی رہتی ہے۔ اس انکشاف نے یہ بھی سمجھا دیا کہ اگر ہوا نہ ہو اور ایک بھاری اور ایک ہلکی شے بلندی سے گرائی جائے تو زمین پر دونوں ایک ہی ساتھ پہنچیں گی۔

گلیلیو کی ایسی تحقیقات اور اس قسم کے خیالات نے لوگوں کو ناخوش کردیا اور وہ خواہ مخواہ اس سے بگڑ بیٹھے کیونکہ ان خیالات کو تسلیم کرنے کے لئے وہ تیار نہ تھے۔ انہوں نے گلیلیو کو تکلیف دینی شروع کی، اس کو ناراض کردیا۔ آخر کار ۱۵۹۲ء میں تنگ دل ہوکر اُس نے ترکِ وطن کا ارادہ کرلیا اور پیڈوا[51] کو چل دیا۔ یہاں آکر اُس نے یہ تحقیقات کی کہ طاقت کی ایک مقدار اگر چار پونڈ وزن کو دو فیٹ اونچا اٹھا سکتی ہے تو وہی مقدار دو پونڈ وزن کو چار فیٹ بلند اٹھا سکتی ہے۔ گلیلیو نے یہ بھی دریافت کیا کہ آواز ہوا سے ٹکر کھانے والے جسم کی لرزش کا نتیجہ ہے لرزشیں جس قدر زیادہ ہوں گی آواز بھی اُتنی ہی اونچی ہوگی۔ اگر آواز اونچی نہ ہو تو سمجھنا چاہئے کہ لرزشیں کم تھیں۔

اب سترھویں صدی شروع ہوگئی تھی اگر دیکھا جائے تو فنِ ہیئت میں اہلِ یورپ کی اصلی ترقی اسی صدی سے شروع ہوتی ہے اور گلیلیو کی دوربین کے ذریعے سے ثوابت و سیار کی عجیب عجیب کیفیات مشاہدہ کی جاتی ہیں

گلیلیو اپنے فن کا امام تھا۔ وہ جہاں جاتا ذی شعور لوگ اس کی ضرورت سمجھتے تھے۔ چنانچہ اہلِ پیڈوا نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے ہاں کی یونیورسٹی میں ریاضی کی پروفیسری پر مقرر کردیا۔ یہاں رہ کر گلیلیو نے کوپرنیکس[52] کے

ف ۵۱ وینس سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر اٹلی کے جانب شمال ایک خوبصورت شہر ہے۔

ف ۵۲ کوپرنیکس پولینڈ کے قصبۂ تھورن میں ۱۴۷۳ء میں پیدا ہوا۔ سائنس کا نہایت دلدادہ تھا ڈاکٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ شہر روما میں ریاضی کا پروفیسر مقرر کیا گیا لیکن ۱۵۰۰ء میں واپس آیا پھر شہر فرونبرگ میں منسٹری کی خدمت قبول کرلی اسی خدمتِ مذہبی کی انجام دہی کے زمانے میں اس نے بطلیموس کے قائم کردہ نظام کی تحقیق شروع کی جس میں زمین مرکزِ کائنات بتائی گئی ہے۔ لیکن اس کی تشفی نہ ہوئی تو فیثاغورث کے اصول پر گہری نظر ڈالی جو آفتاب کو مرکزِ کائنات اور تمام سیاروں کو اس کے اطراف گردش کرنے والا بتاتا ہے۔ یہ رائے اس کو قرینِ قیاس معلوم ہوئی۔ مزید اطمینان کے لئے اُس نے اپنے ایجاد کردہ آلہ ربع دائرہ سے کام لیا۔ جو زاویہ ناپنے کے کام آتا ہے۔ کوپرنیکس کو فیثاغورث کے اصول کی تحقیق میں اس آلے

(دیکھو صفحہ ۳۹۶)

اُس نظام کی تحقیقات شروع کی جو باتباعِ حکیم فیثاغورث[1] قائم کیا گیا تھا۔ فیثاغورث وہ حکیم ہے جس نے مسیح سے ساڑھے پانسو سال قبل اپنی رائے ظاہر کی تھی کہ سیارے مع زمین فضائے غیر متناہی میں آفتاب کے اطراف گردش کر رہے ہیں لیکن فیثاغورث کا نظام بہت جلد ٹوٹ گیا اور اُس کی جگہ نظامِ بطلیموس[2] نے لے لی۔ بطلیموس کا خیال تھا کہ زمین مرکزِ کائنات ہے اور سورج اور دیگر سیارے اس کے گرد گردش میں ہیں۔ اگرچہ مسیح سے تین سو برس پہلے حکیم اسٹارخس[3]

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹۵) سے بڑی مدد لی اور اُس نے کہا حق یہی ہے کہ آفتاب مرکزِ کائنات ہے۔ اُس نے اپنی کتاب حرکاتِ اجرامِ فلکی کے ذریعہ سے دورِ ارض اور مرکزِ شمس کی تعلیم دی لیکن ساٹھ سال تک جب تک کہ گلیلیو نے اپنے معلومات کو شائع نہیں کیا اس کی کتاب کی بڑی بے قدری رہی۔ کوپرنیکس (۷۰) سال کی عمر پاکر سنہ ۱۵۴۳ء میں فوت ہوگیا۔

[1] فیثاغورث یونانی حکما میں نہایت نامور اور فاضل شخص گذرا ہے سنہ ۵۶۶ قبل مسیح پیدا ہوا اور سنہ ۴۷۰ قبل مسیح فوت ہوا ملک مصر میں بہت دنوں تک علومِ طبعیہ کی تعلیم پائی، پھر اطالیہ کے شہر مارنٹیم میں بود و باش اختیار کی دنیا میں سب سے پہلے اسی نے بتایا ہے کہ زمین ساکن نہیں بلکہ مثل اور سیاروں کے آفتاب کے گرد پھر رہی ہے علم الارض کی بہت سی باتیں تحقیق کیں۔ اسی نے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر بتایا کہ ایک زمانہ گذرنے کے بعد خشکی پر سمندر آجاتے ہیں اور سمندر کی جگہ خشکی لے لیتی ہے۔ اسی حکیم نے قدرتی انقلابوں کو نہایت تجسس اور باریک بینی کے ساتھ دیکھا اور یہی پہلا عالم و فاضل تھا جس کو فیلسوف کا خطاب دیا گیا۔ موسیقی میں سارنگی اسی کی ایجاد ہے۔

[2] بطلیموس کی تاریخ پیدائش و وفات کا صحیح حال معلوم نہیں ہو سکا بہرحال یہ حکیم سنہ ۱۵۰ء میں گزرا ہے۔ یہ ایک زبردست ہیئت دان تھا۔ اس نے اپنا ایک مستقل اور باقاعدہ نظام قائم کیا تھا جس کی تحقیقات اور اصول نہایت پیچیدہ ہیں۔ اس نے ایک کتاب مجسطی نامی لکھی جس میں آفتاب، اور ثوابت و سیار کا ذکر ہے۔ اس کتاب میں اُس نے زمین کو ساکن اور مرکزِ کائنات تسلیم کیا ہے۔ اس کے اصول کچھ ایسے مدلل اور اطمینان بخش تھے کہ چودہ سو برس تک ہیئت دان اس کے قائل رہے، یہاں تک کہ کوپرنیکس نے ثوابت و سیار کی اصلی اور صحیح حرکتیں دریافت کرکے اس کے مذہب کو باطل کردیا۔
اسی حکیم نے علمِ جغرافیہ پر ایک باوقعت کتاب لکھی تھی جو ڈیڑھ ہزار برس تک مدارس میں پڑھائی جاتی رہی اُس نے اپنے زمانے کی دنیا کا ایک نقشہ تیار کیا تھا اور عرض البلد و طول البلد بھی قائم کئے تھے۔ انگریز اس حکیم کو کلاڈیس بطلیمی کہتے ہیں۔

[3] اسٹارخس مسیح سے قریباً تین سو برس پہلے گزرا ہے۔ اس کا مولد شہرِ ساموس تھا۔ اس نے اسکندریہ میں تعلیم پائی۔ فیثاغورث کے مانند اس حکیم نے بھی دریافت کیا کہ زمین آفتاب کے اطراف گردش کر رہی ہے اور جب وہ اپنے مدار کا چوتھائی حصہ طے کرلیتی ہے اور قطبِ شمالی آفتاب کی طرف ہوتا ہے تو گرمیوں کا موسم ہوتا ہے اور جب قطبِ جنوبی (دیکھو صفحہ ۳۹۷)

نے بھی یہ تعلیم دی تھی کہ زمین آفتاب کے گرد ایک دائرے پر اس طرح حرکت کرتی ہے کہ اُس کا محوُر اُس پر عمود نہیں بلکہ جھکا ہوُا رہتا ہے جس سے موسم بدلتے ہیں اور محوری گردش سے دن رات پیدا ہوتے ہیں لیکن فیثاغورث کی طرح لوگوں نے اسے بھی کافر ٹھیرایا اور یہی وجہ تھی کہ ان حکما کے معلومات سینہ بسینہ منتقل ہوتے تھے اور ان کے اصول کی تلقین ان کے خاص خاص احباب تک ہی محدود رہتی تھی۔ بہرحال بطلیموس کی کتاب مجسطی نے اپنا سکّہ جمایا اور تقریباً پندرہ سو برس تک اُس کی رائے کی تقلید کی گئی اور اکثر ہیئت دان زمین کو مرکزِ کائنات سمجھتے رہے وہ شخص جس نے سب سے پہلے اس نظام کے خلاف آواز بلند کی اور فیثاغورث اور اسٹارخس کی تعلیم کو زندہ کیا وہ حکیم کوپرنیکس تھا جس نے دونوں فریقوں کی رائے اور اصول کا مطالعہ کیا اور بطلیموسی نظام کو مشاہدات و تجربات کے خلاف پاکر فیثاغورث کی رائے کو تسلیم کیا اور اپنی کتاب "حرکاتِ اجرامِ فلکی" میں لکھ دیا کہ زمین آفتاب کے گرد پھر رہی ہے لیکن بدقسمتی سے اس کے خیالات بھی حقائقِ الہامی کے خلاف سمجھے گئے اور پاپائے[۵۲] پال ثالث نے اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹۶) آفتاب کیطرف ہوتا ہے تو سردی ہوجاتی ہے لیکن جب دوسرا چوتھائی حصہ طے کرتی ہے تو قطبِ جنوبی میں موسم بہار اور قطبِ شمالی میں موسمِ خزان ہوتا ہے اور جب اپنے مدار کا تیسرا چوتھائی حصہ طے کرتی ہے تو قطبِ شمالی میں جاڑا اور قطبِ جنوبی میں گرمی ہوتی ہے اور جب اور چوتھائی حصہ طے کرتی ہے تو شمالی قطب میں موسمِ بہار اور جنوبی قطب میں موسمِ خزان ہوتا ہے۔ اسی حکیم نے بتایا کہ یہ موسمی تبدیلیاں زمین کے اپنے محور پر آفتاب کے گرد ترچھی ہوکر گھومنے سے پیدا ہوتی ہیں اور اس مسئلہ کی بھی اسی حکیم نے تحقیق کی کہ دن اور رات زمین کی محوری گردش سے پیدا ہوتے ہیں اور موسمی تبدیلیاں سالانہ گردش سے وقوع میں آتی ہیں۔

۵۱ یہ کتاب ۱۵۰۷ء میں لکھی گئی لیکن ۱۵۴۳ء میں شائع ہوئی کوپرنیکس نے ۳۶ سال تک اس کتاب کو اس خوف سے مخفی رکھا کہ شائع ہوتے ہی خدا جانے کیا آفت ٹوٹ پڑے لیکن اپنے دوست پادری شومبرگ کے اصرار پر اُس نے کتاب مطبع میں بھیجی افسوس کہ کتاب کا ایک نسخہ چھپ کر کوپرنیکس کے پاس اُس وقت پہنچا جب وہ بسترِ مرگ پر پڑا تھا۔ کتاب کا وہی حشر ہوُا جس کا دھڑکا تھا یعنی شائع ہونے کے بعد کتاب ملحدانہ قرار دی گئی اور اُس کی نسبت کہا گیا کہ یہ باطل فیثاغورثی مذہب کتبِ مقدسہ کی ضد ہے۔

۵۲ اصلی نام ایلی سیانڈرو فارنسی تھا ۲۸ فروری ۱۴۶۸ء میں پیدا ہوُا معزز خاندان کا شخص تھا لیکن نہایت آزاد اور عیاش طبیعت تھا۔ اس کی ترقی اور ناموری کا باعث اس کی معشوقہ تھی جو الگزنڈر ششم کی بہن تھی۔ پوپ کلیمینٹ ہفتم کی وفات کے بعد ۱۳ اکتوبر ۱۵۳۴ء میں اس نے اُس گروہ کی قوت کو شکست دی جو مذہبِ عیسوی کی (دیکھو صفحہ ۳۹۸)

کی تحقیقات کو ملحدانہ قرار دے کر اس کتاب کا پڑھنا داخلِ جرم بتایا، لیکن بادشاہت ہمیشہ سچائی نے کی ہے جب کوپرنیکس بسترِ مرگ پر پڑا دم توڑ رہا تھا تو وہ کہہ رہا تھا کہ زمین آفتاب کے گرد پھر رہی ہے۔

گلیلیو پیدا ہؤا اور علوم طبعیہ کے سچّے اصول نے اہلِ مذہب کے غلط اور جابرانہ اصول کو شکست دی۔ اس نے دوربین کی ایجاد کی، زہرہ و عطارد کو ہلال و بدر کی صورت میں دکھایا اور تمام دنیا کو یقین دلا دیا کہ فیثاغورث، اسٹارخس اور کوپرنیکس کے سچے اصول کتنے صحیح تھے لیکن پادریوں کے طرزِ تعدّی سے جس کا ذکر ہم آیندہ کرنے والے ہیں اُس نے بھی نجات نہ پائی۔

دوربین کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ زیکریس جانسن نامی اور ہنری لپرشی نامی دو چشم ساز رہتے تھے۔ جانسن کے بچے ایک دن دو شیشے کے ٹکڑوں سے کھیل رہے تھے۔ اور اُن کے گھر کے سامنے ایک گرجا تھا۔ انہوں نے ان دونوں ٹکڑوں کو پاس پاس رکھ کر گرجا کے مینار کو دیکھا تو وہ ان شیشوں سے بڑا اور نزدیک دکھائی دیا۔ بچوں کے لئے دلچسپی کا یہ ایک مشغلہ تھا جانسن کو خبر ہوئی اُس نے بھی یہ تجربہ کیا۔ چونکہ یہ ایک نئی بات تھی جانسن نے ان دونوں ٹکڑوں کو ایک نئے میں سلیقہ کے ساتھ جوڑ کر ناسو کے شہزادے کے پاس بطور نذر گزرانا ۱۹۰۶ء میں جانسن اور پرشی نے اسی طرح کے اور کھلونے بھی بنائے لیکن وہ کیا جانتے تھے کہ یہ کھلونے کِس کام آنے والے ہیں اور اُن سے آسمان کی کیسی دلچسپ سیر ہوگی۔ کہتے ہیں کہ ایک کھلونا گلیلیو کے ہاتھ لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس سے وہ راز دریافت ہوسکتے ہیں جو آج تک نہیں معلوم ہوسکے۔ بہرحال گلیلیو نے بلّور کے دو بڑے بڑے ٹکڑوں کو ایک خاص طریقے سے جوڑ کر ایک آلہ بنایا جس سے دور کی چیزیں بڑی ہوکر نظر آنے لگیں۔ اسی ایجاد کا نام فلکی دوربین ہے۔

سب سے پہلی دوربین جو اُس نے بنائی اس میں اشیا تگنی ہوکر نظر آتی تھیں۔ اس کو گلیلیو نے اور بھی ترقی دی اور ایسی دوربین بنائی جس کے ذریعے سے اشیا اپنی اصلی حالت سے آٹھ گنی بڑی ہو جاتی تھیں اور سب سے آخر میں وہ دوربین جس کے ذریعہ سے اُس نے بڑے بڑے انکشافات کئے ایسی تھی جو کسی شے کے اصلی حجم سے تیس گنا بڑا بتاتی تھی۔

سب سے پہلے اُس نے چاند کا معائنہ کیا۔ اس کُرے کی سطح پر اُس نے بڑے بڑے پہاڑ اور تاریک غار دیکھے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹۷) کمزوریوں کو دیکھ کر اصلاح کے درپے تھا۔ یہ سخت مذہبی آدمی تھا۔ اس نے اپنے عہد میں کارِ نمایاں یہ کیا کہ سب سے پہلے وہ مذموم رسم بند کر دی جو اٹلی اور دوسرے ممالک میں غلاموں کی بیع و شرا کے متعلق رائج تھی۔ یہ سائنس کا بڑا ماہر گذرا ہے شہرِ روم کی موجودہ تمام تزئین و آرائش اسی پوپ کے فنونِ لطیفہ سے گہری دلچسپی لینے کا باعث ہے ۱۵۲۹ء میں فوت ہؤا۔

اور زمین کی طرح اُس پر وسیع وادیاں اور میدان پائے، لیکن ان وادیوں کو اُس نے سمندر خیال کیا۔ پہاڑوں کا سایہ بھی اُسے نظر آیا۔ اب گلیلیو نے اُس روشنی کی تحقیق کی جو ہلال یا تربیع کے وقت چاند کے تاریک حصّے میں دھندلی سی دکھائی دیتی ہے اور جس کو منعکس روشنی کہتے ہیں۔ اُس نے فوراً تاڑ لیا کہ یہ دھندلی روشنی بھی آفتاب کی وہ شعاعیں ہیں جو زمین پر آکر چاند پر منتقل ہو جاتی ہیں۔ اگر مطلع صاف ہو اور چاند بصورتِ ہلال یا تربیع ہو تو ماہتاب کے تاریک حصّے میں روشنی کا ایک ہلکا سا خاکہ دکھائی دے گا، جس سے یہ ثابت ہوگا کہ ہلال ایک گول اور تاریک جسم کا روشن حصّہ ہے۔

اس منعکس روشنی کی تحقیق کے بعد گلیلیو نے اپنی دوربین خوشۂ پروین کی طرف پھیر دی جس کو عرب ثریّا کہتے ہیں اور ہندوستان کے بچے "بچوں والی مرغی" کے نام سے پہچانتے ہیں۔ زمانۂ سابق سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس گچھے میں سات ستارے ہیں لیکن گلیلیو نے دوربین کے ذریعے سے اس میں چالیس ستارے دیکھے۔ اسی طرح جس طرف اس کی نظر اُٹھ جاتی تھی نئے نئے تارے نظر آتے تھے۔ اسی کو یہ کہنے کا فخر حاصل تھا کہ ان ثوابت کو سب سے پہلے میری آنکھوں نے دیکھا۔ اس غیر متوقع کامیابی سے جو مسرت اس کو حاصل ہوئی ہوگی وہ نہایت حوصلہ افزا ہوگی۔

اُس نے روشن کہکشاں کے مشہور و معروف پٹکے کی طرف بھی دوربین پھیر دی اور اُس کے بعض گچھوں کی رصد کی جس کے متعلق قدیم زمانے سے یہ خیال چلا آتا تھا کہ یہ مختلف ستاروں کا مجموعہ ہوگا جس کے کواکب اپنی دوری اور چھوٹے پن کے سبب سے ہم کو جدا جدا نہیں نظر آتے بلکہ باہم مل کر ایک روشن بادل کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔

گلیلیو نے اپنی دوربین کے ذریعے سے قدما کے اس خیال کو درجۂ یقین تک پہنچا دیا کہ اس کو کہکشاں میں بے انتہا ایسے چھوٹے تارے نظر آئے جو اُس کو روحانی سرور بخشتے تھے۔

اب کی بار گلیلیو نے سیارۂ مشتری کا امتحان کیا، ۷ جنوری ۱۶۱۰ء میں رات کو اسے ایک ستارہ مشتری کے مغربی جانب اور دو چھوٹے چھوٹے ستارے اُس کے مشرقی جانب دکھائی دیئے۔ دوسری رات کو بھی وہ تینوں اسی کے اطراف معلوم ہوئے لیکن جو ستارے پہلی رات میں مشرقی جانب دکھائی دیتے تھے اب وہ مغربی جانب نظر آ رہے تھے اور زیادہ قریب قریب پائے جاتے تھے۔ اسی طرح دو چار روز کی رصد نے اُسے یقین دلا دیا کہ وہ مشتری کے گرد گردش کر رہے ہیں۔ چند روز کے بعد مشتری کے اطراف پھرنے والے تاروں میں ایک اور تارے کا اضافہ ہوا۔ اس طرح اُس نے ان چار چاندوں کو مشتری کے اطراف گھومتا ہوا دیکھا اور یہ معلوم کر لیا کہ یہ مشتری کے چار اقمار ہیں۔ گلیلیو کی اس تحقیق نے آسمانِ ہیئت کو چار چاند لگا دیئے۔

مشتری اور اس کے اطراف پھرنے والے چاندوں کی دریافت نظامِ کوپرنیکس کی سچائی کا ایک ثبوت تھا۔ اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے معلوم کیا کہ اب وہ اس قابل ہے کہ کوپرنیکس کی قابلِ قدر رائے کی صداقت کو ظاہر کرے اور مخالفین کو آنکھ سے دکھائے کہ زمین بھی اسی طرح آفتاب کے گرد گردش کر رہی ہے۔ فیثاغورث اور اُس کے دو ہزار برس بعد پیدا ہونے والے کوپرنیکس کا نظریہ آج سچّا ثابت ہوا اور اُن لوگوں کو بھی جو آج تک زمین کو کل کائنات کا مرکز قرار دے کر تمام سیّار و ثوابت کو اس کے اطراف گھما رہے تھے زمین کو متحرک مان لینے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔

گلیلیو کے تجربے نے جب یہ ثابت کر دیا کہ مشتری بھی ایک سیارہ ہے اور ایک جداگانہ نظام رکھتا ہے اور اس کے چاند اس کو روشنی پہنچاتے ہیں تو وہ خیال کرنے لگا کہ زمین بھی گھومنے والے سیاروں میں سے ایک ہوگی۔ یہ وہ دن تھا جب کہ پندرہ سو برس تک بادشاہت کرنے کے بعد بطلیموسی نظام ٹوٹ گیا اور تمام دنیا کو فیثاغورث کی مظلوم رائے کا تابع ہونا پڑا لیکن بطلیموس کا جادو اس قدر زوردار تھا کہ بعض نے ان چاندوں کو بذریعہ دوربین دیکھنے سے صرف اس لئے انکار کر دیا کہ وہ انہیں دکھائی دے جائیں گے اور انہیں لامحالہ سرِ تسلیم خم کرنا پڑے گا۔

مذہبی دنیا میں ان خیالات نے بڑی ہل چل ڈال دی۔ پادریوں کا خیال تھا کہ چاند اور ستارے صرف اس غرض سے آسمان پر بنائے گئے ہیں کہ وہ رات کے وقت انسان کو روشنی پہنچائیں۔ وہ کیا جانتے تھے کہ یہ بے شمار ثوابت جو ذروں کے مانند آسمان پر پھیلے ہوئے ہیں ان سے خدا کی کچھ اور ہی غرض ہے۔ وہ اس سے واقف نہ تھے کہ کروڑوں ستاروں میں سے ہر ستارے کے اطراف زمین جیسی کتنی کئی زمینیں گردش کر رہی ہیں۔ مذہبی طور پر اُن کا عقیدہ تھا کہ زمین ساکن ہے اور آفتاب اور دوسرے تمام سیارے محض اس کے خادم ہیں۔ گلیلیو نے ان کے عقائد کو سخت صدمہ پہنچایا اس لئے اُن کے مذہب کا خدا ہی حافظ تھا۔

کوپرنیکس نے کہہ دیا تھا کہ زہرہ و عطارد زمین کے اطراف اسی طرح گردش کر رہے ہیں جس طرح کہ آفتاب کے اطراف گردش میں ہیں اور اُن کے مدار زمین کے مدار کے اندر واقع ہیں۔ جب اس پر اعتراض کیا گیا کہ اگر وہ مدارِ زمین کے اندر ہیں تو اُن کی شکلیں چاند کی طرح بڑھتی اور گھٹتی کیوں نہیں تو اُس نے گو جواب دیا لیکن اس کا معائنہ نہ کرا سکا۔ اس الزام سے کوپرنیکس کو چھڑانے کے لئے گلیلیو نے اپنی دوربین زہرہ کی طرف پھیر دی اس نے دیکھا کہ وہ گول نظر آ رہا ہے۔ اس سیارے کی پھر ایک دن اُس نے رصد کی تو دیکھا کہ وہ اب ہلال کے مانند دکھائی دے رہا ہے۔ اسی طرح کئی راتیں مسلسل وہ امتحان کرتا رہا اور جب تک (۲۲۵) دن میں زہرہ کا آفتاب کے گرد ایک دورہ نہ ہو لیا

گلیلیو نے اُس کی رصد ختم نہیں کی۔

اسی رصد سے اُس نے یہ تحقیق کی کہ زہرہ میں بھی فی الحقیقت تمام تبدلات موجود ہیں اور چاند کی طرح زہرہ بھی بڑھتے بڑھتے بدر اور گھٹتے گھٹتے ہلال ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ زہرہ کسی اور مرکز کے گرد نہیں بلکہ زمین کے مانند آفتاب کے گرد گردش کر رہا ہے۔

کوپرنیکس کا نظریہ سچا ثابت ہوا اور مخالفین کو اُس کی رائے نے یہاں بھی شکست دی۔ اس فیلسوف کے ذہن رسا کا لوگوں نے اعتراف کیا اور اس کی عظمت دلوں میں بیٹھ گئی۔ اسی ضمن میں ایک اور امر کی بھی تحقیق ہو گئی یعنی کوپرنیکس کے زمانے سے پہلے یہ خیال تھا کہ سیاروں کی روشنی مکتسبہ نہیں ہے بلکہ بذاتِ خود منور ہیں لیکن عطارد و زہرہ کے مدارج تنویر نے ثابت کر دیا کہ ان کی چمک آفتاب کی روشنی کا عکس ہے وہ بذاتہٖ منیر نہیں بلکہ مستنیر ہیں۔

گلیلیو کی اس دوربین نے ایک اور خیالِ باطل کی بھی اصلاح کی۔ ارسطو اور اُس کے مقلدین کا خیال تھا کہ اجسامِ سماوی فساد پذیر نہیں۔ لیکن جب چاند میں پہاڑ اور وادیاں، سورج میں دھبے اور شعلے دیکھے گئے تو اس عقیدہ سے بھی دست بردار ہونا پڑا۔

گلیلیو نے زحل کا بھی معاینہ کیا لیکن اس کی دوربین زیادہ طاقتور نہیں تھی، زحل کے دونوں جانب اس کو کوئی چیز متصل نظر آئی اُس نے خیال کیا کہ دو چھوٹے چھوٹے تارے ہونگے لیکن اصل میں وہ زحل کے حلقے تھے جو اس کی سطح کو ہزاروں میل کی بلندی پر گھیرے ہوئے ہیں گو اس رصد میں اُس کو ناکامی رہی تاہم آنے والی نسلوں کے لئے زحل کی رصد کو اُس نے خاص طور پر اہمیت دی اور اس سیارے کے معاینہ کو قابلِ توجہ امر بنا دیا۔

گلیلیو ۱۶۱۱ء میں پیڈوا سے سفر کر کے روم پہنچا اور ایک باغ میں اپنی دوربین لگا کر اُس نے آفتاب کے سیاہ داغ دیکھے۔ اس نے یہ مشاہدہ کیا کہ وہ ایک ہی شکل پر کبھی قائم نہیں رہتے بلکہ دو چار داغ مل کر ایک داغ بن جاتا ہے اور کبھی ایک داغ ٹوٹ کر اس کے کئی داغ بن جاتے ہیں۔ ان داغوں کی نسبت اگرچہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آفتاب کا روشن مادہ اُوبن کر نکلنے کے وقت سطحِ آب پر گہرے گڑھے کر دیتا ہے جو ہم کو سیاہ داغ کی شکل میں دکھائی دیتے ہیں اور پھر وہ مادہ رفتہ رفتہ اپنی جگہ کو بھر لیتا ہے اور داغ مٹ جاتا ہے تاہم اس کی تحقیق اطمینان بخش نہیں ہے اور اہلِ ہیئت اب تک اس کا پورا حال نہیں بیان کر سکتے۔

گلیلیو نے دوربین کے ذریعے سے اس قدر بتایا کہ یہ داغ آفتاب کے چہرے پر ایک طرف گردش کرتے ہوئے دوسری طرف غائب ہو جاتے ہیں اور کچھ عرصے بعد دوسری طرف دکھائی دیتے ہیں۔ یہ دورہ اٹھائیس دن میں پورا ہوتا

ہے اس تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی کہ آفتاب اپنے محور پر بھی گردش کر رہا ہے جو چھبیس دن آٹھ گھنٹے میں پوری ہوتی ہے۔ اور جیسا کہ آج کل خیال کیا جا رہا ہے اگر آفتاب کا بھی مرکز ہو اور یہاں تن و توش اس کو بھی پھرنا پڑتا ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ آفتاب میں دن ساڑھے بارہ روز اور رات ساڑھے بارہ روز کی ہوتی ہوگی۔ گلیلیو نے کیسی کیسی تحقیقات کیں۔ کیسے کیسے انکشافات کئے۔ علمی دنیا میں اس نے مسائلِ ہیئت کا مشاہدہ کرا دیا اور فیثا غورثی نظام کی صحت کو پایۂ ثبوت پر پہنچا دیا۔

اگرچہ روم میں آکر گلیلیو نے بڑی قدر و منزلت حاصل کی اور ہزار روپیہ ماہوار کی پنشن بھی پائی مگر مذہبی عدالت کے حکام اس سے ناخوش تھے۔ ان کا یہ قول تھا کہ گلیلیو کا عقیدہ کتبِ مقدسہ کے بالکل خلاف ہے وہ زمین کو تمام کائنات کا مرکز نہیں مانتا گویا خدا کی زمین کی اُس نے وقعت کھو دی ہے۔ وہ زمین کو چھوٹا سا سیارہ بنا کر آفتاب کے اطراف پھراتا ہے۔ مقدس گروہ کے خیالات میں گلیلیو نے سخت تشویش و اضطراب پھیلا دیا۔ جاہل بزرگانِ مذہب نے تو ان حقیقی انکشافات کو مکر و فریب کا خطاب دیا۔

اس قابلِ قدر ہیئت داں پر اب سختی کی جانے لگی، ذاتی خیالات و انکشافات کی بدولت اس پر الحاد و زندقہ کا الزام لگایا جا رہا تھا۔ پس اس کے لئے ضروری ہوا کہ اپنی بے گناہی کا اظہار کرے۔ چنانچہ اُس نے پادری کیسٹیلی کے نام بدیں مضمون ایک خط لکھا کہ کتبِ مقدسہ کی تنزیل کا یہ منشا نہیں ہے کہ علمی مسائل میں ان سے استناد کیا جائے۔ وہ صرف انسان کی اخلاقی حالت کو درست کرنے کے لئے نازل کی گئی ہیں۔ اس خط کو دیکھ کر مقدس محکمۂ احتسابِ عقائد اور بھی غضبناک ہو گیا۔ آخر کار ۱۶۱۹ء میں مذہبی عدالت میں اسے بلایا گیا اور سختی کے ساتھ فہمائش کی گئی کہ وہ ان ملحدانہ خیالات سے باز آئے، زمین کی حرکت کی تعلیم دینے سے زبان کو روک لے اور کوپرنیکس کے اصول کی تائید و تلقین کرنے سے توبہ کرے۔ گلیلیو نے مصلحتِ وقت کو دیکھ کر وعدہ کیا کہ وہ ان ملحدانہ عقائد کو چھوڑ دے گا۔ سولہ سال تک گلیلیو کو اپنی زبان بند رکھنی پڑی اور کلیسا کو آرام ملا، لیکن ۱۶۳۲ء میں اُس نے ایک کتاب موسوم بہ "نظامِ عالم" شائع کی جو کوپرنیکس کی تائید میں تھی اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ مذہبی عدالت میں بحیثیتِ مجرم گرفتار ہو کر آیا۔ اس پر الزام قائم کیا گیا کہ وہ آفتاب کے گرد زمین کے گھومنے کا دعوےٰ کرتا ہے آخر کار اسے ایک توبہ کرنے والے شخص کا سا لباس پہنا کر اور گھٹنوں کے بل کھڑا کر کے انجیل اُس کے ہاتھ میں دی گئی اور اس سے کہلوایا گیا کہ زمین آفتاب کے گرد نہیں گھومتی۔ پھر یہ قسم لی گئی کہ وہ اس کفر کی اشاعت زبانی یا تحریری یا کسی اور طرح پر کبھی نہیں کرے گا اور فیصلہ صادر کیا گیا کہ بصورتِ خلاف ورزی اس کے لئے سخت سے سخت سزا تجویز

کی جائے گی۔

یہ عجیب عبرت ناک نظارہ تھا کہ ایک قابلِ تعظیم انسان جو اپنے فن میں بے نظیر ہے جس نے انکشافات کے دریا بہا دئے جس کا نام نامی تا دورِ فلک لوگوں کی زبان پر رہے گا اور علمائے ہیئت کی گردنیں جس کی ہمیشہ زیر بارِ احسان رہیں گی اُس کو موت کی دھمکی دی جا رہی ہے اور اس بات پر اصرار کیا جا رہا ہے کہ اُن واقعات کا انکار کرے جن کی صحت کو وہ خود ہی تسلیم نہیں کر رہا بلکہ اُس کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے بھی اپنے دل میں تسلیم کرتے ہیں۔

بہر حال گلیلیو نے وعدے کئے اور قسمیں کھائیں لیکن اس کے بعد ہی اُس نے اپنا عصا زمین پر مارا اور ایک دوست سے آہستہ کہہ دیا کہ "ہاں ہاں زمین گروش کر رہی ہے"۔ اس طرح اُس کی سرکشی ظاہر ہوتی رہی چنانچہ چند ہی روز کے بعد وہ اپنے وطن کو بھیج دیا گیا، جہاں سے بلا اجازت اُس کو کہیں جانے کی ممانعت تھی۔ زندگی کے باقی دس سال اس نے سختیوں اور عقوبتوں میں کاٹے تاہم اس نے اپنا مشغلہ جاری رکھا اور اکثر مفید انکشافات کئے ۱۶۳۷ء میں اس کی بینائی کم ہونے لگی اور تھوڑے ہی عرصہ میں قوتِ بصارت بالکل زائل ہو گئی۔ آخر کار اس نامور شخص نے زندگی کے اٹھتر سال گزار کر ۱۶۴۲ء میں اپنی شیریں جان، جاں آفریں کو سونپ دی لیکن مقدس گروہ گلیلیو کی طرف سے کچھ ایسا خار کھائے ہوئے تھا کہ اُس کی لاش مسیحی قبرستان میں بھی دفن نہ ہو سکی

گو مذہبی دنیا نے اس شد و مد کے ساتھ اس پر سختی کی لیکن آخر کار سچائی کی فتح ہو کر رہی۔ تمام مہذب دنیا میں آج گلیلیو کا نام وقعت اور ادب کے ساتھ لیا جاتا ہے اور مقدس گروہ استحقار اور استہزا کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

گلیلیو نے دوربین کی ایجاد سے نظامِ کوپرنیکس کو ایسی مسلمہ کامیابی بخشی کہ تھوڑے ہی دنوں بعد ہر ہیئت دان نے اُس کے نظریہ کو تسلیم کر لیا اور آفتاب کے مرکزِ عالم ہونے اور اُس کے گرد زمین کے گردش کرنے میں کوئی شبہ باقی نہ رہا۔

فیثاغورث کے نظام کو بطلیموس نے توڑ دیا تھا۔ اس کے ہزار ہا سال بعد گلیلیو ہی وہ شخص پیدا ہوا ہے جس نے نظامِ بطلیموس کو درہم برہم کر دیا اور بتا دیا کہ سچائی کیونکر ظاہر ہوا کرتی ہے۔

عبدالرب کوکب

نکات

(۱)

جنت کی کھلی ہے راہ میرے دل میں
ہر رات ہے عکسِ ماہ میرے دل میں
ہوتی نہیں جو خنجرِ ترکی سے محسوس
پیوست ہے وہ نگاہ میرے دل میں!!

(۲)

ہمراز ہے کون گلستاں کا اے دل
انداز نرالا ہے یہاں کا اے دل
کہتا ہے جسے داغ تو قلبِ گل میں
دراصل تصور ہے خزاں کا اے دل!!

(۳)

جب رات کو چھوٹتے ہیں بادل کالے
ظلمت میں ٹپکتے ہیں جگر کے چھالے
قرباں ترے اس وقت کی تاریکی میں
انگشتِ حنائی سے دل کو چھونے والا!!

(۴)

گلشن میں کہاں سے یہ اثر آتا ہے
تمثیل کا ہر نقش ابھر آتا ہے
ادھر ہوتے ہی کلی سی ڈالی کی گوری شوخ
خوشبو میں ہتھیلی کی نظر آتا ہے!!!

جوش
ملیح آبادی

اردو کے چند ہندو بنگالی شعرا

آج کل جب کہ لوگوں کا عام خیال یہ ہے کہ بعض زبانیں خاص خاص جماعتوں کا حصہ ہیں، اس مضمون کی سرخی ہی عجیب و غریب معلوم ہوگی۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ زبانِ اردو محض مسلمانوں کی زبان ہے اس لئے کہ مسلمانوں ہی نے اس کے حصول میں امتیاز حاصل کیا ہے مگر اس خیال کی بنیاد غلط فہمی پر دال ہے۔ بجنسہ یہی حالت ہندی اور بنگالی زبانوں کی بھی ہے۔ عوام کا خیال ہے کہ ان زبانوں کے استعمال کا حق محض ہندوؤں کو حاصل ہے اور صرف ہندوؤں کو ان میں شہرت و مہارت حاصل ہوسکتی ہے لیکن اس کلیہ میں خامی نظر آتی ہے۔

کسی ملک کی زبان اور اُس کا لٹریچر، انسانی اکتساب اور محنت کا ماحصل ہوتا ہے۔ بلا امتیازِ شخصیت و جماعت کسی زبان پر قدرت حاصل کی جاسکتی ہے مگر اس کے اکتساب میں کافی توجہ کی ضرورت ہے۔ اگر بحیثیتِ مجموعی دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بنگالی اپنے قوائے ذہنی کے لئے ممتاز ہیں۔ جب مسلمان بنگال میں حکمران تھے تو عدالت کی زبان فارسی تھی۔ اس لئے ہندو عمال کو اپنے فرائضِ منصبی ادا کرنے کے لئے فارسی کی تعلیم حاصل کرنی پڑی اور چند بنگالیوں نے اس میں کمال بھی پیدا کر دکھایا۔ راجہ رام موہن رائے انہیں ممتاز ہستیوں میں سے ہیں۔ فارسی کی کتاب "تحفۂ موحدین" انہیں کی فکر و کاوش کا نتیجہ ہے۔ منشی مدن موہن زبان فارسی کے ماہر اور زبردست خوشنویس تھے مگر جب عنانِ حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے انگریزوں کے ہاتھ میں آئی تو عدالت کا طرزِ تحریر بدل گیا اور زبان نے بھی کروٹ لی یعنی بنگال کی عدالتوں میں فارسی کی جگہ انگریزی زبان نے اپنا سکہ بٹھا دیا۔ زبانِ اردو گو کبھی عدالتی زبان نہ تھی تاہم چند ہندوؤں نے اس کے مطالعہ میں نہایت دلچسپی سے حصہ لیا اور بعض نے ایسی مہارت حاصل کی کہ اردو میں شعر کہنے لگے جو اب تک چند تذکروں میں کمال احتیاط کے ساتھ محفوظ ہیں۔ (مثلاً سخن شعرا از نساخ، تذکرۂ شعرائے ہنود از دیبی پرشاد صاحب اور خمخانۂ جاوید از لالہ سری رام صاحب) لہٰذا بطورِ مثال بہت مختصر الفاظ میں چند بنگالی ہندوؤں کے حالات، جنہوں نے اردو شاعری کی خدمت کی ہے، ذیل میں ہدیۂ ناظرین ہیں اور ساتھ ہی ان کے کلام کا نمونہ جتنا دستیاب ہوسکا پیش کیا جاتا ہے۔

ارمان راجہ جنم جے متر جو راجہ پتمبر متر کے پوتے تھے اور جن کا مسکن کلکتہ کے قرب و جوار مقام سونری میں تھا

ا؎ سخن شعرا از نساخ صفحہ ۲۱ اور تذکرہ شعرائے ہنود صفحہ ۵۔

وہ حافظ اکرام احمد صاحب ضیغمؔ کے شاگرد تھے اور حضرتِ ناسخ سے راہ و رسم رکھتے تھے۔ حکیم حبیب الرحمٰن خاں صاحب کا جو ڈھاکہ کے رہنے والے ہیں، یہ خیال ہے کہ ارمان صاحب ایک تذکرہ کے مصنف تھے جو بہارِ دلکشا کے نام سے مشہور ہے۔ وہ ۱۸۷۴ء میں اس دنیا سے اٹھ گئے۔ ان کے دو شعر زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ گئے ہیں۔

کام اپنا نہ کبھی تجھ سے مری جاں نکلا   تن سے جاں نکلی مگر دل کا نہ ارماں نکلا
رات بھر نالے کیا کرتا ہوں گریہ دن کو   پوچھتے کیا ہیں حقیقت مرے اوقات کی آپ

منشی[۵۱] اتواری لال شہر کلکتہ کے باشندے تھے ان کا تخلص ذرّہ تھا۔ ناسخ ان کو اپنے دوستوں میں شمار کرتے تھے۔ یہ ۱۲۸۱ء تک زندہ رہے ان کا محض ایک شعر سینہ بہ سینہ ہم لوگوں تک پہنچا ہے۔

دلدار کی خاطر سے دلِ زار بھی چھوڑا   الفت میں سمن رویوں کے گلزار بھی چھوڑا

راجہ[۵۲] کشن راجہ نبکشن بہادر کے لڑکے تھے جو شہر کلکتہ کے ایک بڑے ذی اثر مشہور و معروف آدمی تھے۔ یہ ایک ضخیم دیوان چھوڑ گئے جو اب نایاب ہے۔ صرف ایک شعر اب تک محفوظ ہے۔

گر شب کو نہ تم پاس مرے آؤ گے صاحب   تو مجھ کو سحر تک نہ یہاں پاؤ گے صاحب

بابو[۵۳] کشن چند رگھوش کا تخلص کشن تھا۔ یہ شہر کلکتہ کے رہنے والے تھے اس کے علاوہ ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ ان کا ایک شعر یہ ہے۔

صدف اپنے گوہر کو بے آب سمجھے   یہ دنداں تمہارے دہن میں جو دیکھے

کنور[۵۴] راجہ اپوراب کشن بہادر راجہ راج کشن بہادر کے بیٹے تھے۔ یہ اپنے مشہور و معروف باپ کی طرح اردو کے شاعر تھے اور انہیں کے شاگرد بھی تھے ایک ضخیم دیوان چھوڑ گئے ہیں جو اب کمیاب ہے۔ یہ حقیقی معنوں میں ایک اچھے شاعر تھے۔ ان کے دو شعر درجِ ذیل ہیں۔

شیدا ہے عشق میں ترے دل شیخ و شاب کا   قالب تہی ہے یاد میں تیری حباب کا

---

۵۱ نساخ صفحہ ۱۶۵۔ خمخانۂ جاوید جلد اول صفحہ ۲۴۵۔ تذکرہ شعرائے ہنود صفحہ ۵۵۔

۵۲ نساخ صفحہ ۱۷۴۔ تذکرہ شعرائے ہنود صفحہ ۶۳۔ خمخانۂ جاوید جلد تیسری صفحہ ۲۹۸۔ لالہ سری رام فرماتے ہیں کہ راجہ صاحب مرزا جان طپش دہلوی کے شاگرد تھے۔

۵۳ نساخ صفحہ ۳۹۸۔ تذکرہ شعرائے ہنود صفحہ ۱۱۵

۵۴ نساخ صفحہ ۳۹۹۔ تذکرہ شعرائے ہنود صفحہ ۱۲۱۔

نہ پوچھو گذری ہے جو مجھ پہ بے قراری رات — مثالِ شمع کٹی روتے روتے ساری رات

راجہ[1] جادو کشن بہادر کا تخلص مشفقؔ تھا۔ یہ بھی راجاؤں کے برگزیدہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک ضخیم دیوان ان کی یادگار ہے جو اب نایاب ہے یہ مولوی ظہور النبی محزوںؔ (جو ایک زمانہ میں کلکتہ کے اعلیٰ طبقہ کے ایک مشہور شاعر تھے) کے شاگرد تھے فرماتے ہیں۔

خفتگانِ خاک ہیں قربان اس رفتار پر — ہے قیامت کا گماں سب کو قدِ دلدار پر
نیند تو آتی نہیں جو خواب میں دیکھوں اُسے — حیف آتا ہے مجھے اس دیدۂ بیدار پر

بابو جگن ناتھ پرشاد ملک کا تخلص ملکؔ تھا۔ یہ میر باسط علی محویؔ الہ آبادی کی ہمت افزائی سے شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے۔ ناسخ نے اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر اپنے دوستوں کے ضمن میں کیا ہے۔

دل پہ اک سانپ سا لہراتا ہے اُس وقت ملکؔ — زلفِ جاناں کی صبا سے کے جو بُو آتی ہے

موہنؔ[2]۔ بابو ہری موہن داس اردو کے ایک شاعر تھے جو ڈھاکہ کے جگن ناتھ کالج میں اردو فارسی کے پروفیسر تھے۔ ان کا تخلص موہنؔ تھا۔ ڈھاکہ کے قدیم باشندے تھے۔ بیس سال سے زیادہ ہوئے کہ انہوں نے انتقال کیا۔ ذیل کے چند اشعار سے اُن کی شاعری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

میرے شفیق منشی عالی خیال طپش — شعر و سخن میں ہے انہیں سب طرح کا کمال
تقریر جو لکھی ہے یہ نو طرز و دل فریب — ہے شاہدانِ باغِ سخن کا نیا جمال
ظاہر ہے خوبی اس کی نہیں حاجتِ بیاں — تعریف اس کی میں جو کروں میری کیا مجال
تاریخ اس کی لکھتا ہوں موہنؔ بشوقِ دل
ہے یہ نیا کھلا ہوا گلدستۂ خیال

سید محمد حفیظ

---

[1] ناسخ صفحہ ۴۳۸۔ تذکرہ شعرائے ہنود صفحہ ۱۲۱۔
[2] ناسخ صفحہ ۴۵۴۔ تذکرہ شعرائے ہنود صفحہ ۱۲۳۔
[3] ناسخ صفحہ ۴۵۴۔ تذکرہ شعرائے ہنود صفحہ ۱۲۳۔

گوداوری

دریائے گوداوری دکن میں سب سے بڑا دریا ہے جو ضلع ناسک (احاطہ بمبئی) کے پہاڑوں سے نکل کر تقریباً (۹۰۰) میل کا فاصلہ پچھم سے پورب کی طرف طے کر کے بحرِ ہند سے جا ملا ہے۔ ہمارے ہندو بھائی اس دریا کو متبرک مانتے ہیں۔

اے دکن کی سندری، اے کوہِ ناسک کی پری
اللہ اللہ کیا تری آمد ہے اے گوداوری

ذوقِ فطرت جس کو ہے دیکھے وہی عالم ترا
کتنا دل آویز ہے اللہ پیچ و خم ترا

اک مقدس پاک دریا ہے ہمارے واسطے
تُو ہی گنگا تُو ہی جمنا ہے ہمارے واسطے

تیرا پانی سب کو پیارا تُو ہے ہر اک کو عزیز
تیرا رکنا روح پرور، تیرا بڑھنا لطف خیز

تیری موجیں فرحت افزا، تیری لہریں خوش نما
تیرا اُٹھنا تیرا مڑنا، تیرا گرنا دل کشا

تھا ابھی کچھ رنگ اور عالم ابھی کچھ ہو گیا
انقلابِ دہر ہے یہ یا کہ جزر و مد ترا

جھٹ پٹے کے وقت کیا انداز ہے پیارا ترا
کس قدر وقتِ سحر دلکش ہے نظارا ترا

ہیں کہیں بگلے، کہیں سارس، کہیں مرغابیاں
ان کے قدموں میں بچھی ہے چادرِ آبِ رواں

کوئی جاتا ہے اُدھر آتا ہے کوئی اس طرف
اک سماں دلکش نظر آتا ہے دیکھو جس طرف

لہر سی اک دوڑتی ہے قلبِ پُر آلام میں
تیرے نغموں کو سنے کوئی سکوتِ شام میں

کیسی پیہم آ رہی ہے آبشاروں کی صدا
یا مگر یہ سازِ سرمد کے ہے تاروں کی صدا

اہلِ دل کو وجد ہے تیرے خرامِ ناز پر
دھن رہے ہیں اپنا سر عارف تری آواز پر

اپنے منبع کے قریں چھوٹی سی تُو اک نہر تھی
بڑھتے ہی راہِ طلب میں بڑھ گئی وسعت تری

جس طرح آ کر ملیں تجھ میں ہزاروں ندیاں
تو بھی ہے ذوقِ فنا میں رات دن یوں ہی رواں

شوق ایسا ہے کہیں دم بھر ٹھہر سکتی نہیں
صبح ہوتی ہے کسی جا، شام ہوتی ہے کہیں

گرمی و سردی ہو یا ہنگام ہو برسات کا
کم نہیں ہوتا مگر تیرا سفر دن رات کا

گاہ میداں میں کبھی جنگل میں ہے تیرا گزر
وادی و کہسار میں ہے تو کبھی گرمِ سفر

شوق ملنے کا بھلا ایسا بھی ہوتا ہے کہیں
جارہی ہے خاک پر گھستی ہوئی اپنی جبیں

راہ کی تنگی سے جب ساحل پہ چڑھ جاتی ہے تو
اضطرابِ شوق کا اک جوش دکھلاتی ہے تو

یک بہ یک غاروں میں گرجاتی ہے اوپر سے کہیں
اور اپنے سر کو ٹکراتی ہے پتھر سے کہیں

کیسی جلدی ہے سمندر میں سمانے کے لئے
کیسی جد و جہد ہے خود کو مٹانے کے لئے

سعی کا تیری سکونِ دائمی انجام ہے
ملتے ہی قلزم سے بس آرام ہی آرام ہے

بحرِ بے پایاں سے مل کر کیا سے تو کیا ہوگئی
کس نہ گوید بعد ازیں او دیگر و تو دیگری

اپنی ہستی کو مٹا تو بھی تلاشِ یار میں
پھر سراپا نور بن جا جلوۂ انوار میں

میر سعادت حسین نجیب

غزل

کس فراغت سے وقت کٹتا ہے
میں ہوں اور حیرتِ تماشا ہے

غم نصیبوں کی زندگی اُف اُف
ہر نفس ایک حشر برپا ہے

آنکھ کیونکر ہو منکرِ دیدار
ذرّے ذرّے میں کس کا جلوہ ہے

خود فراموشیوں کی اک تصویر
زندگی اس کو کون کہتا ہے

تیرے جلووں کی انتہا ہی نہیں
جس نے دیکھا ہے اُس نے دیکھا ہے

بجز اک اضطرابِ پیہم کے
اور کیا زندگی میں رکھا ہے

اس جگہ صبر کا سوال نہیں
حسن اک منظرِ تمنا ہے

دل کی گنجائشیں کسے معلوم
نہیں معلوم اس میں کیا کیا ہے

عشق کے بھی عجب کرشمے ہیں
دردِ دل گھٹ کے اور بڑھتا ہے

زندگی تیری خواب ہے ہادی
اپنی ہی آنکھ کا تو دھوکا ہے

ہادی مچھلی شہری

تاریخِ دنیا پر ایک نظر

دُنیائے حاضرہ

۲۶

قومی نظامِ مملکت

اصلاح کے بعد۔ سولہویں صدی کے اخیر سے مغربی عیسائیت دو مستقل گروہوں کیتھلک اور پرٹسٹنٹ
میں منقسم ہوگئی جو اُس وقت سے لے کر آج تک ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ چلے آتے ہیں + سرسری طور پر
کہا جاسکتا ہے کہ لاطینی زبانیں بولنے والے لوگ جو روما کی روایات کے وارث تھے وہ بدستور کیتھلک رہے اور ٹیوٹن
زبانیں بولنے والے جو شمالی روایات کے وارث تھے پراٹسٹنٹ ہوگئے + اس میں کچھ شبہ نہیں کہ نسلی میلان
اور سیاسی تعصّبات کا مذہبی اختلافات کے معاملے میں بہت کچھ اثر پڑا + مثلاً اطالیہ کی شاہنشاہی اور عالمگیری
روایات کے ہوتے اس کا کیتھلیت سے علیحدہ ہو جانا ناممکن تھا اور یہی وجوہ تھیں کہ آسٹریا اور بویریا بدستور
اطاعت گذار رہے + سپین میں کیتھلیت قومی اتحاد اور شاہی اقتدار سے وابستہ تھی + پندرھویں صدی میں فرڈینینڈ
اور ازبلا کے وقت میں جاکر اس غیر مامون ملک کو ایک مرکزی حکومت نصیب ہوئی اور اُس وقت بھی یہاں
لوگوں کو جو رشتہ باہم وابستہ کئے ہوئے تھا وہ ایک مشترک مذہب اور موروں اور یہودیوں کے خلاف ایک
مشترک عداوت تھی + لہٰذا وفادار سپینیوں کے لئے جن میں وطنیت کی روح سرایت کرچکی تھی پراٹسٹنٹیت صرف
قومیت کے خلاف ایک بالکل نئی قسم کی فریب کارانہ بے وفائی تھی + فرانس میں ہیوگونو مسلک زوال پذیر
جاگیرداری خیالات، اشرافی مخصوص حقوق، انگریزوں اور جرمنوں کے ساتھ بدخواہ سازش، جماعتی خانہ جنگی،
پُرامن حکومت اور قومی یک جہتی کی مخالفت سے تعبیر ہونے لگا + اس لئے ایک وطن پرست فرانسیسی کے
لئے جو ملکی شان و وسعت کا تمنائی ہو پراٹسٹنٹیت محض ایک قسم کی قوم شگاف اور بے حس کن تحریک تھی +
اُدھر پراٹسٹنٹیت کے معنی جرمنوں کے لئے اطالوی گرفت سے رہائی، ڈچوں کے لئے سپینی پنجے سے

آزادی، سکوٹوں کے لئے فرانس کے رعب وداب سے بچاؤ، سوئیڈیوں کیلئے ڈینی تحکم سے چھٹکارا اور انگریزوں کے لئے یہ تھے کہ اُن کا ملک ایک ایسی سلطنت بن جائے جو ہر قسم کی غیر ملکی دست اندازی سے محفوظ رہے +

قصّہ کوتاہ سولھویں صدی میں مقامی سیاسیات مذہبی انقلابات سے اس درجہ پیچ درپیچ طور پر ملی ہوئی تھیں کہ بہ قول پادری فِگس کے یہ کہنا دشوار ہے کہ آیا اصلاحِ مذہبی کا سب سے بڑا کارنامہ موجودہ قومی مملکت تھا یا اس کے برعکس یہ کہ موجودہ قومی مملکت کا پہلا کارنامہ اصلاحِ مذہبی تھا +

مذہبی لڑائیاں ۱۵۵۹ء سے لے کر ۱۶۴۸ء تک مغربی یورپ میں خوفناک لڑائیوں کا ایک سلسلہ جاری رہا جنہیں مذہبی لڑائیاں کہا جاتا ہے + بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان میں ایک طرف اصلاح پسند فریق اپنی آسانی سے حاصل کی ہوئی چیزوں پر قابض رہنے پر مصر ہے اور دوسری طرف جوابی اصلاح والا فریق اپنی کھوئی ہوئی چیزوں کو پھر حاصل کرنے پر تلا ہوا ہے + حق یہ ہے کہ (اگر مذہب کو لڑائی سے کوئی واسطہ ہو بھی سکتا ہے تو) یہ مذہبی لڑائیاں نہ تھیں + اصلی ما بہ النزاع وہ سیاسی مسائل تھے جو عیسائیتِ وسطیٰ کے انتشار اور نتیجۃً مطلق العنان اور حریص بادشاہوں کے ماتحت قومی مملکتوں کے بن جانے سے خود بخود پیدا ہو گئے تھے + سب سے مشہور و اہم تین لڑائیاں وہ تھیں جو نیدرلینڈز فرانس اور جرمنی میں برپا ہوئیں۔

نیدرلینڈز کے سترہ صوبے جن میں دس بلجیئن تھے اور سات ڈچ بوجہ اُن شاہانہ ازدواجی اتحادوں اور مدبرانہ سیاسی معاہدوں کے جن میں باشندوں سے قطعاً کوئی مشورہ نہ لیا گیا تھا ۱۵۵۵ء میں شاہِ سپین کے قبضے میں آ گئے + شاہِ سپین وہ بدنام و بدخصال فلپ دوم اُن کی آزادی چھیننے اُن کے خصوصی ادارات مٹانے اور نوخیز کلونیت کو دبا دینے کے لئے فوراً تیار ہو گیا + دستوری ذرائع سے دادرسی حاصل کرنے کی بے سود مساعی کے بعد ۱۵۶۵ء میں انہوں نے باقاعدہ مزاحمت شروع کی جس نے ۱۵۷۲ء میں کھلی بغاوت کی شکل اختیار کر لی + ایک خونریز جنگ برپا ہوئی جس کے اختتام پر سپین کو اس کے بلجیئن صوبے واپس دے دیئے گئے (۱۵۷۹ء) اور ڈچ لوگوں نے اپنی مکمل آزادی حاصل کر لی۔ جو اگرچہ ۱۶۰۹ء میں عملی طور پر مان لی گئی لیکن رسمی طور پر ۱۶۴۸ء میں جا کر تسلیم کی گئی +

اس اثنا میں فرانس میں چھتیس سال (۱۵۶۲ء تا ۱۵۹۸ء) تک خونریز لڑائیاں ہوا کیں جن میں ہیوگونو امرا اپنے حقوق و طاقت کے بچاؤ کے لئے جرمن لوتھریوں ڈچ کیلونیوں اور انگریزی ارسمیوں سے اور دوسری طرف کیتھلک بادشاہ اور اُن کے وزرا پاپائیت اور یسوعیوں اور سپینیوں سے مدد حاصل کئے ہوئے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے یہ جنگ جس میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں آخر سینٹ بارتھولومیو کے دن کے قتلِ عام پر جا کر (۱۵۷۲ء میں) ٹھہری اور اس

کا باقاعدہ اختتام مشہور "نانت کے شاہی فرمان" کے ساتھ (۱۵۹۸ء میں) ہوا۔ بوربون شخصی حکومت آخر ہنری چہارم کی شکل میں فائز المرام ہوئی۔

ان ڈچ اور فرانسیسی لڑائیوں سے زیادہ خوفناک و شرمناک جرمنی کی "تیس سالہ جنگ" (۱۶۱۸ء تا ۱۶۴۸ء) تھی + دراصل یہ ہیپسبرگی استبداد اور مقامی خود اختیاری کا مناقشہ تھا اور فرانسیسی جنگ کے برعکس اس کا نتیجہ جرمن میں ہر قسم کی مرکزی حکومت کا قطعی انہدام ہوا + معاہدۂ ویسٹ فیلیا (۱۶۴۸ء) شاہنشاہی اقتدار کا پروانۂ مرگ تھا +

سپین کا تفوق۔ اُن تمام بڑی مذہبی لڑائیوں میں جن کا ذکر ابھی ہوا ہے کیتھلیت کو شکست ہوئی اور کیتھلیت کی شکست سپین کی شکست تھی + علاوہ بریں اگر جیسا کہ معلوم ہوتا ہے ان مذہبی لڑائیوں میں ہم ۱۵۸۸ء میں انگلستان پر آرمیڈا (یعنی سپینی جنگی بیڑے) کے حملوں کو بھی شامل کرلیں تو سپین کی کیتھلیت کے سب سے بڑے حامی ہونے کی حیثیت کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے + سپین ہی تھا جس کے خلاف ڈچ قوم باغی ہوئی۔ سپین ہی پر بالآخر فرانس کا بادشاہ ہنری چہارم غالب آیا اور تیس سالہ جنگ میں آسٹروی ہیپسبرگوں کیساتھ سپینی ہیپسبرگوں نے بھی زک اٹھائی + دوسرے لفظوں میں اصلاح و جوابی اصلاح کی صدی میں سپین یورپ کی سب سے بڑی طاقت تھی اور مذہبی لڑائیوں کے اختتام نے سپینی اقتدار کے خاتمے کا اعلان کردیا +

اس لئے یہ ضروری ہے کہ پیشتر اس کے کہ ہم آنے والے واقعات کو بیان کریں ہم ایک لمحہ کے لئے اُس عظیم الشان لیکن "تاریک حکومت" پر ایک نظر ڈالیں جس کی طاقت زمانۂ حالیہ کی اُس طوفانی صبح پر جو نشاۃ الثانیہ کے گلابی مطلع پر طلوع ہوئی نحوست بن کر چھائی ہوئی تھی + سب سے پہلی بات جو ہمیں تعجب انگیز معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ سپین جو یورپ کے عہدِ وسطیٰ میں کچھ حیثیت نہ رکھتا تھا اور سترھویں صدی کے وسط میں پھر کم مایہ ہوگیا ۱۴۹۲ء سے لے کر ۱۶۴۸ء تک کی مختصر سی مدت کے دوران میں مغربی دنیا کی سب سے شاندار سلطنت تھا + اس معمے کی توجیہ معلوم کرنا کچھ زیادہ دشوار نہیں + سپین کی عظمت اُس کے اپنے وجود پر مبنی نہ تھی بلکہ اپنے مقبوضات کے وجود پر + مختلف طریقوں سے زیادہ تر شاہانہ ازدواجی اتحادوں سے سپینی ہیپسبرگوں نے نیدرلینڈز، فرانش کونتے، ملان، نیپلز، سسلی اور پرتگال اور اس کے وسیع مشرقی متعلقات اور سب سے بڑھ کر اوقیانوس کے پرے کی نئی دنیا پر قبضہ پالیا + اُس بے شمار مال و زر سے جو اُس نے اپنی محکوم قوموں سے اکٹھا کیا اُس نے اپنے وہ بحری بیڑے اور بری فوجیں تیار کیں جن سے کچھ عرصے کے لئے اُس نے ایک دنیا کو مرعوب کردیا +

لیکن سپین کے سوا اور سب ملکوں میں سپینی حکومت ناقابلِ برداشت تھی + نخوت ظلم جہالت تعصب ان سے

اک عام بغاوت پیدا ہوگئی اور جیسے ہی سپین کی سلطنت اُس کے ہاتھوں سے نکلی وہ بلاتوقف ہمیشہ کے لئے اپنی طاقت کی چوٹیوں سے اوندھے منہ نیچے کو گرا + نیدرلینڈز کی بغاوت (۱۵۷۲ء)، آرمیڈا کی شکست (۱۵۸۸ء) فرانس کے ساتھ معاہدۂ وروین (۱۵۹۸ء)، ڈچ کے ساتھ ۱۶۰۹ء کی ہنگامی صلح، پرتگال کی بغاوت (۱۶۴۰ء) معاہدۂ ویسٹ فیلیا (۱۶۴۸ء) وہ واقعات ہیں جو یکے بعد دیگرے اس کے انحطاط کے مدارج ظاہر کرتے ہیں +

فرانس کا عروج۔ وہ طاقت جو سپین کی خالی کی ہوئی گدی پر جلوہ گر ہوئی فرانس تھی جس کے تخت پر اب ایک بوربون کا نیا شاہی خاندان متمکن تھا +

اپنی مذہبی لڑائیوں کے دوران میں فرانس یورپی سیاسیات میں ایک ناقابلِ ذکر طاقت تھی + بلکہ ایک وقت میں تو یہ بات کچھ زیادہ غیر اغلب نہ معلوم ہوتی تھی کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر سپینیوں جرمنوں ہوگیونیوں اور انگریزوں میں منقسم ہوجائے + لیکن اس کی بحالی اور زورِ قوت کا زمانہ شروع ہوگیا جب ۱۵۸۹ء میں ہنری سوم کے قتل پر والوا شاہی خاندان کے مٹ جانے پر بوربون خاندان کے ایک رکن ہنری آف نوار نے جو کبھی ہوگونیوں کا سرکردہ تھا روما کے ساتھ صلح کرلی اور ہنری چہارم بن کر ساری فرانسیسی قوم کو تمام غیر ملکی اثرات کے خلاف مربوط و متحد کردیا (۱۵۹۳ء) + ہنری چہارم نے اپنے عہدِ حکومت کے باقی ماندہ سترہ برس کی مدت میں (۱۵۹۳ء تا ۱۶۱۰ء) اپنے مشہور وزیر ڈیوک آف سلی کی اعانت سے یورپ میں ایک ایسے فرانسیسی اقتدار کی بنیاد ڈالی جو دو صدیوں تک استوار رہا اور جو لوئی چاردہم کے عہد میں ۱۶۸۴ء کے قریب اپنے نصف النہار پر تھا۔ ہنری چہارم نے اپنے رواداری فرمانِ نانت (۱۵۹۸ء) سے قوم کے مذہبی تفرقے کو مٹادیا۔ سرکش جاگیری امرا کی بخوبی سرکوبی کی۔ زراعت کو ترقی دی۔ صنعت و حرفت اور تجارت کو فروغ دیا۔ مالیات کی اصلاح کی اور بالآخر اپنی قوم سے یہ کہہ کر کہ سپین اور آسٹریا کے ہیپس برگوں کو زک دے کر وہ فرانس کے قدیمی و فطری حدود رائین ایلپس اور پرینیز پر پھر قابض ہوجائے اُس نے فرانسیسیوں کے سوئے ہوئے ملکی جوش کو یکسر بیدار کردیا +

۱۶۱۰ء میں اُس کے قتل ہوجانے سے اُس کا "مقصدِ عظیم" تکمیل کو نہ پہنچ سکا لیکن اُس کی حکمتِ عملی کو اُس کے جانشین لوئی سیزدہم (۱۶۱۰ء تا ۱۶۴۳ء) کے شہرۂ آفاق وزیر کاردینل رشلو نے اپنی وسیع نظری اور دانشمندی سے کامیابی کے ساتھ جاری رکھا + وہ کہنے کو تو ہمہ گیر کیتھلک کلیسا کا ایک شہزادہ تھا لیکن اس کے باوجود اُس کے مقاصد قومی تنگ خیالی کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے + رشلو نے یہ کام اپنے ذمے لیا کہ اول تو ہیوگونیوں کے تمام امتیازی سیاسی حقوق سلب کرکے فرانسیسی قوم کے اتحاد کو مکمل کیا جائے۔ دوسرے امرا

کو قطعی طور پر مغلوب کر کے بادشاہ کی فرمانروائی کو مضبوط تر بنایا جائے تیسرے ہیپسبرگوں اور پاپائیت کو کمزور کر کے یورپ میں فرانس کا سکہ بٹھایا جائے + اس کی ہدایت پر فرانس جنگِ سی سالہ میں پراٹسٹنٹوں کا حامی بنا اور صلحِ ویسٹ فیلیا (۱۶۴۸ء) میں اُس نے جس طرح چاہا شرائطِ صلح منوالیں +

لیکن ۱۶۴۸ء میں رشلو کو مرے چھ سال سے زائد مدت گذر چکی تھی۔ صلح نامہ ویسٹ فیلیا کی شرائط کے طے کرنے کا کام اُس کے قابل شاگرد و جانشین و دورفہم و نکتہ رس کاردینل مازریں نے کیا جن کی رو سے فرانس کو میتز تول اور وردیں کے عظیم الشان سرحدی قلعے حاصل ہوئے اور گیارہ سال بعد اُس نے سپین کے ساتھ پرنیز کا معاہدہ کیا جس کی رو سے سیلوں سروان اور آرتوآ فرانسیسی مملکت میں شامل ہو گئے (۱۶۵۹ء) +

۲۷

توازنِ قوت

لوئی چاردہم کا زمانہ۔ کاردینل مازریں ۱۶۶۱ء میں مر گیا اور اُس وقت سے فرانسیسی حکمت عملی کی باگ ڈور نوجوان بادشاہ لوئی چاردہم نے خود اپنے ہاتھوں میں سنبھال لی + وہ ۱۶۳۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۴۳ء میں تخت پر بیٹھا۔ ابھی اُسے برابر ۱۷۱۵ء تک حکومت کرنی تھی + اپنے عہد کے بہتر سالوں میں لیکن بالخصوص ۱۶۶۱ء سے لے کر ۱۷۱۱ء تک کی نصف صدی میں فرانس نہ صرف یورپ میں سیاسی اور فوجی حیثیت سے قوی ترین طاقت بن گیا بلکہ اُسی زمانے میں اُس نے لاجواب عقلی و جمالیاتی کمال حاصل کر لیا + یہ تھا زمانہ مولیئر اور راسین کا۔ بوسوئے اور فینیلوں کا۔ پاسکل اور طبیعیات کا +

۱۶۶۱ء سے ۱۶۷۲ء تک کولبیئر کی مفید صحبت سے متاثر ہو کر لوئی نے مالی اصلاح حرفت و تجارت اور ایک زبردست بحریہ کے فروغ دینے کی طرف توجہ کی + لیکن نوجوان بادشاہ کے ذاتی رجحانات گردن فرازی توسیع سلطنت اور جنگ و جدال کی طرف تھے اور ان رجحانات کو بعض خوشامدیوں اور مفسدہ پرداز مشیروں نے جن میں لووآ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے خوب بھڑکایا + ان کے اثر سے فرانسیسیوں نے جنگجویانہ حملوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا جن کا مقصد بلجیم (ہسپینی نیدرلینڈز) کی فتح ڈچ جمہوریہ کی تسخیر رائین تک کے جرمنی کا الحاق ہیپسبرگوں کی تباہی بلکہ سارے یورپ پر اپنی قلمرو کا پھیلا دینا تھا +

لوئی چاردہم کی اس حرص وظلم سے ڈچوں بلجینئوں جرمنوں اور سپینیوں کے خطرے میں پڑ جانے کے باعث شاہِ فرانس کے خلاف وسیع اتحادوں کا ایک سلسلہ یکے بعد دیگرے قائم ہوا + ان تمام اتحادوں کی روح ورواں ولیم شہزادۂ اورینج تھا جس نے ۱۶۷۲ء میں ہالینڈ پر ایک زبردست فرانسیسی حملے کی خوب روک تھام کرکے بڑی طاقت وشہرت حاصل کرلی + ۱۶۸۹ء میں جب جیمز ثانی کے ترکِ تخت وتاج پر اُسے انگلستان کا بادشاہ بننے کی دعوت دی گئی تو اُس کا اثر بے انتہا بڑھ گیا + جنگِ اتحادِ آگز برگ (۱۶۸۹ء تا ۱۶۹۸ء) اور جنگِ تخت وتاج سپین (۱۷۰۲ء تا ۱۷۱۳ء) سے لوئی چاردہم کے مقاصد کا سدِّباب ہُوا اور فرانسیسی تحکم کا خطرہ اٹھ گیا + "توازنِ قوت" کا اصول وضع ہوکر عائد کیا گیا +

توازنِ قوت کا اصول جس کا سب سے بڑا شارح اور مجسم نمونہ ولیم آف اورینج تھا فقط یہ ہے کہ اگر کوئی ایک طاقت عالمگیری حکومت کا خواب دیکھنے لگے تو دوسری طاقتیں جن کی آزادی اس سے خطرے میں پڑجائے اپنے تئیں تباہی سے بچانے کے لئے آپس میں اتحاد کریں اور معمولی مساواتِ دول کی حالت کو پھر قائم کردیں +

انقلابِ انگلستان - وہ طاقت جس سے ولیم آف آرینج بالآخر لوئی چاردہم کے تشدد کا سدِّباب کرکے یورپ میں توازن قائم کرسکا انگلستان اور بالخصوص اُس کی بحری قوت تھی +

فرانسیسی تفوق کے زمانے میں انگلستان میں ایک ایسا دستوری سانحہ وقوع پذیر ہورہا تھا جسکا نتیجہ ایک طرف تو اُس کی حکومت کا قطعی طور پر منقلب ہوجانا اور دوسری طرف برِاعظم پر رعب واثر حاصل کرنے نو آبادیات کو وسعت دینے اور تجارت کا اجارہ لینے کے لئے اُس کے اور فرانس کے مابین ایک مہلک وخوفناک جنگ کا چھڑ جانا ہوا جسے دوسری جنگِ صد سالہ (۱۶۸۹ء تا ۱۸۱۵ء) کہنا ناموزوں نہ ہوگا +

انگریزی بادشاہ چارلس اول فرانسیسی بادشاہ لوئی سیزدہم کا سالا تھا اور اُس زبردست وہشیار شخصی حکومت کا بڑا دلدادہ تھا جو رشلو نے ہر دلعزیز "مجلسِ عوام" اور ہیوگونی جماعت پرستی کو توڑ کر قائم کی تھی + اُسے خود انگلستان میں ایک جھگڑالو پارلیمنٹ اور ہاکباز ورکے ایک صندی جتھے سے واسطہ پڑا تھا جو اُس کے خیال کے مطابق اس "حقِ الہٰی" سے حاصل کردہ موروثی شاہی اختیارات کی راہ میں محض شیطانی رکاوٹیں تھیں + اس لئے اُس نے رشلو کے انداز کے وزرا ٹامس وینٹورتھ ارل آف سٹریفرڈ اور ولیم لاڈ صدر اسقفِ کینٹربری کی حوصلہ افزائی واعانت سے ایک ایسی جنگ چھیڑ دی جس کا انجام پہلے اُس کے ان وزرا کا اور پھر اُس کا اپنا قتل ہُوا (۱۶۴۹ء) + یہ سترھویں صدی کی تاریخ دنیا کا سب سے مشہور واہم واقعہ تھا + اس سے شخصی حکومت کے انحطاط اور جمہوریت کے ابتدائے کمال کا ڈنکا بج

گیا۔ چارلس اول کے قتل کے بعد انگلستان کو جمہوریہ بنا دینے کی ایک قبل از وقت اور ناکام کوشش کی گئی۔ ۱۶۶۰ء میں انتظامی ہلچل کے رفع کرنے کی بہترین ترکیب یہی سوچی گئی کہ چارلس اول کے بیٹوں کو پھر ملک میں آنے کی دعوت دی جائے۔ لیکن جب وہ آئے تو اُن کے رویے سے ظاہر ہوگیا کہ انہوں نے اپنے باپ کے انجام سے کما حقہٗ عبرت حاصل نہیں کی۔ چنانچہ ۱۶۸۸ء میں انہیں پھر تخت سے اتارنا پڑا۔ جیمز ثانی ملک بدر کیا گیا۔ اس نے فرانس میں جا کر رہائش اختیار کر لی جہاں وہ اپنی عمر کے آخری تیرہ سال لوئی چاردہم کا وظیفہ خوار بنا رہا۔

اس کے بعد جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ولیم آف آرینج بادشاہ بن گیا۔ لیکن وہ ایک نئی وضع کا بادشاہ تھا۔ اُس کا حقِ حکومت موروثی حقِ الٰہی نہ تھا بلکہ رعایا کا عطیہ تھا جس میں موضوعہ شرائط موجود تھیں۔ وہ ایک معاہدہ پر مبنی تھا اور پارلیمنٹ کے ایک قانون نے اس کی تشریح کر دی تھی۔ لیکن اُدھر اس کے مقابل میں انگریزوں اور ڈچ کے درمیان صدی کا بیشتر حصہ جو ایک جنگ جاری رہی تھی اُس کا بھی خاتمہ بالخیر ہوگیا۔

ڈچ بحری قوت۔ سترھویں صدی کے آغاز میں ڈچ قوم کے آزادی حاصل کرنے کے بعد اس کے لئے عروج وقوت کا پُرشوکت زمانہ شروع ہؤا۔ سپین پر ڈچوں کے غالب آجانے کا سب سے بڑا سبب اُن کی مضبوط بحری طاقت تھی جو سپین سے فوجوں کے آنے جانے میں حارج ہوئی۔ دوسرے اِس سے ڈچوں نے ایک وسیع غیر ملکی تجارت قائم کر لی جس کے منافع سے انہوں نے اس جنگ کو جاری رکھا۔ اور تیسرے اس سے ایک خاصی بڑی ڈچ نوآباد سلطنت کی داغ بیل پڑی جس کی نوآبادیاں شمالی امریکہ جنوبی افریقہ ہندوستان مصالحہ خیز جزائر آسٹریلیا نیوگنی اور نیوزیلینڈ میں قائم ہوگئیں۔ تھوڑی مدت کے لئے تو (اندازاً ۱۶۰۹ء تا ۱۶۷۲ء) یہ ڈچ لوگ ترقی یافتہ تمدن کے دھنی تھے تجارت اور مالیات میں سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ حرفت و زراعت میں انہوں نے نمایاں ترقیاں کیں۔ مذہب اور فلسفہ میں وہ ممتاز تھے اُس شعبے میں آرمینئس اور اس میں سپینوزا کا نام مشہور ہے۔ قانون میں ان کی شہرت گروٹیئس کی خداداد قابلیت سے چمکی اور ادب میں ملٹن کے پسندیدہ مصنف فونڈل سے۔ اور فنونِ لطیفہ میں روبنز اور ریمبرینٹ کی اختراعاتِ فائقہ نے اُن کی عزت میں چار چاند لگا دیئے۔

لیکن بدقسمتی سے اُن کی ترقی کی راہیں انگریزوں سے ملتی جلتی تھیں جس کا نتیجہ دونوں کا تصادم ہؤا۔ ان دونوں قوموں میں بہت کچھ مشترک تھا۔ وہ ہم نسل تھے۔ اُن کے مذاہب ایک دوسرے کے مماثل تھے اُن کے سیاسی خیالات ایک دوسرے سے مشابہ تھے سپین کی طاقت کے توڑنے میں انہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ بٹایا تھا۔ بات یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے اس قدر ملتے جلتے تھے کہ اُن کا ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کے رہنا ناممکن تھا۔

وہ دونوں شکست خوردہ سپینیوں کے زروال اور مقبوضات کو سمیٹنے پر تلے ہوئے تھے۔ دونوں نوآبادِ سلطنتیں قائم کرنے کے خواہاں تھے۔ دونوں اپنی تجارتی مہموں کو کامیاب بنانے میں چست وتند ہو رہے تھے اور دونوں بحری فوقیت حاصل کر لینے کے درپئے تھے +

اس کا نتیجہ تین خوفناک ڈچ بحری لڑائیاں ہوئیں پہلی "دولتِ عامہ" کے دور میں ۱۶۵۲ء سے ۱۶۵۴ء تک۔ دوسری اور تیسری چارلس ثانی کے عہد میں ۱۶۶۵ء تا ۱۶۶۷ء اور ۱۶۷۲ء تا ۱۶۷۴ء + ان لڑائیوں کا فیصلہ آخر انگلستان کے بہتر وسائل کی بدولت اُس کے حق میں ہوُا + ڈچ تجارت بالکل مختصر رہ گئی۔ ڈچ نوآبادِ سلطنت کا بیشتر حصہ ملحق کر لیا گیا + خوش قسمتی سے ولیم آف آرنج کے ذاتی اتحاد سے (۱۶۸۹ء تا ۱۷۰۲ء) دونوں قوموں میں پھر مقابلہ ہو جانے کی نوبت نہ آئی +

سپینی تخت و تاج کا مسئلہ۔ ولیم کی موت کے وقت "توازنِ قوت" کے قیام کے لئے ایک نئی اور ہیبت ناک یورپی جنگ شروع ہو رہی تھی اور اس جنگ کے اجرانے انگریزوں اور ڈچ کو دس بارہ برس ایک ہی مضبوط اتحاد میں متحد کئے رکھا + ۱۷۰۰ء میں سپینی ہیپس برگوں کی ناکارہ نرینہ شاخ ختم ہو گئی اور لوئی چاردہم جس نے ۱۶۵۹ء کے معاہدہ پرینیز کے بموجب ایک سپینی شہزادی سے شادی کی تھی ایک فرانسیسی شہزادے کے حق میں قلمرو کا دعوے دار ہوا + یورپ کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ بوربونوں کی سلطنت میں جو پہلے ہی سے اس قدر وسیع ہو چکی تھی سپین مغربی جزائرِ ہندی بلجی نیدر لینڈز ملان نیپلز سسلی اور دیگر زرخیز و غایت درجہ نفع رساں علاقوں کو شامل ہوتا دیکھ سکے + اس لئے آسٹروی ہیپس برگ انگریز ڈچ پرشین پرتگالی سیوو ئی اور دیگر چھوٹی طاقتیں فرانس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لئے ایک اتحادِ عظیم میں منسلک ہو گئیں + اس دفعہ لوئی چاردہم کی گردن فراز طاقت کی قرارِ واقعی سرکوبی کی گئی۔ ۱۷۰۶ء تک بوربونوں نے اپنا سر جھکا دیا اور ہر طرح صلح کرنے پر آمادہ ہو گئے + انگریزی ڈچ بحری بیڑا چاروں طرف سمندر میں بے تابانہ پھرتا تھا اور فرانسیسی سپینی محروسات کو ان سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ انگریزی جنرل مارل برو (جنگِ بلنہائیم ۱۷۰۴ء اور رمیلیز ۱۷۰۶ء) اور یوجین (نیورن ۱۷۰۶ء) کی فتوحات اور اتحادیوں کے جبرالٹر (۱۷۰۴ء) بارسلونا (۱۷۰۵ء) اور میڈرڈ (۱۷۰۶ء) پر قبضہ کر لینے سے بوربون زور ٹوٹ گیا وہ رعب مفقود ہو گیا اور وہ خود اعتمادی بھی جاتی رہی۔

یہ لڑائی ۱۷۰۶ء میں جب اتحادی قطعی طور پر کامیاب ہو چکے تھے اور لوئی چاردہم بالکل ذلیل ہو چکا تھا ختم ہو جانی چاہئے تھی اور ہو بھی جاتی + لیکن اتحادی بدلہ لینے کے خواہاں تھے اور اُن کا ارادہ تھا کہ اپنے قدیمی دشمن کو اُس کے غرور و نخوت کا مزا چکھائیں اور برباد کر دیں + اس لئے انہوں نے شاہِ فرانس کا چند شرائط پر ہتھیار ڈال دینا منظور نہ کیا اور

لڑائی ۱۷۱۳ء تک جاری رکھی۔ اُن کی اس نخوت کی انہیں خوب سزا ملی۔ اور یوٹریکیٹ اور راسٹاٹ پر انہیں ایسی شرائط قبول کرنی پڑیں جن سے بہتر شرائط وہ سات سال پہلے نامنظور کر چکے تھے +

یوٹریکیٹ اور راسٹاٹ (۱۴-۱۷۱۳ء) کے معاہدوں کے بموجب (۱) لوئی چاردہم کا پوتا فلپ آف انجو سپین کا بادشاہ ہوا (۲) آسٹرو ہیپس برگی شاہنشاہ چارلس ششم کا بلجی نیدرلینڈز ملان نیپلز اور سارڈینیا پر قابض ہوا (۳) ڈچوں کو نامور تورنے اور اسی پرے کے سرحدی قلعے دیئے گئے (۴) سسلی ڈیوک آف سیووتے کو دی گئی جو اس سے شاہ سسلی بن گیا (۵) پرشیا کو ایک بادشاہت تسلیم کیا گیا اور اُس کو تھوڑا سا علاقہ اور دیا گیا (۶) انگلستان کو جو سکوٹستان کے ساتھ متحد ہو کر ۱۷۰۷ء میں برطانیۂ عظمیٰ بن چکا تھا اپنی شدید جدوجہد کے بدلے میں جبرالٹر منورقہ نیوفونڈلینڈ نووا اسکوشیا اور خلیج ہڈسن کا علاقہ اور سپینی نوآبادیات میں کچھ تجارتی امتیازی حقوق دیئے گئے + (۱۷۲۰ء میں آسٹریا اور سیووتے نے سارڈینیا اور سسلی کا تبادلہ کر لیا جس سے خاندانِ سیووتے کا حکمران شاہِ سارڈینیا بن گیا +)

۲۸
یورپ کی توسیع

صلح نامۂ یوٹریکیٹ کے نتائج۔ متحدہ نیدرلینڈز اور برطانیۂ عظمیٰ کی دو بحری طاقتوں میں سے جنہوں نے جنگِ تختِ سپین میں حصہ لیا تھا مقدم الذکر کو اپنی فتوحات یا تحصیلات سے کچھ فائدہ نہ ہوا + اپنی مساعی سے چُور ہو کر یہ اور مال و زر کھو کر وہ سیاسی دنیا میں اپنا مرتبہ کھو بیٹھی اور اُس کی تجارت اور نوآباد سلطنت کا بیشتر حصہ دوسروں کے ہاتھوں میں منتقل ہو گیا +

برطانیۂ عظمیٰ کی حالت اس کے بالکل برعکس تھی + یہ درست ہے کہ اس جنگ سے اُس پر تیس کروڑ چالیس لاکھ قرضہ ہو گیا جو اُس زمانے میں ایک بھاری رقم سمجھی جاتی تھی لیکن اس کے ساتھ وہ سمندروں کا سردار بن گیا۔ اس کے محروسات میں وسیع اور بیش قیمت قطعات کا اضافہ ہوا اور اسے نہایت نفع رساں تجارتی حقوق عطا ہوئے جن سے سپینی نوآبادیات اور جنوبی سمندروں میں اُس نے ایک فائدہ مند تجارت کا سلسلہ قائم کر لیا + ۱۷۱۴ء سے کر ۱۷۳۹ء تک کی پچیس سالہ مدت صلح میں جو یوٹریکیٹ کے معاہدے کے بعد نصیب ہوئی والپول اور وہگوں کی آرام پسند حکومت کے دور میں برطانیہ "مال دار اور خوش حال بن گیا گو ساتھ ہی عشرت پسند مائل بہ مادیت بددیانت اور غیر روحانی بھی ہو گیا" کرۂ ارض

کے ایک طرف ایسٹ انڈیا کمپنی اپنی مدراس بمبئی اور کلکتہ کی بڑی تجارتی بستیوں میں اپنے گماشتوں اور ناظموں کے لئے کثیر زر
ومال جمع کر رہی تھی دوسری طرف خلیج ہڈسن والی کمپنی نے شمالی امریکہ کے شکاریوں اور صیادوں سے ایک فائدہ مند تعلق پیدا
کرلیا۔ یورپ میں مسوسکووی اور مشرقی کمپنیوں نے بحیرۂ ابیض اور بالٹک سے تجارت جاری کی اور لیوانت اور گنی کی
کمپنیوں نے بحرِ متوسط اور جنوبی اوقیانوس کے پانیوں میں اپنے جہاز دوڑائے۔ بحیرۂ جنوبی کی کمپنی معاہدۂ یوٹریکٹ سے
فیض یاب ہوئی اور اس دوران میں کمپنی کے علاقے کے شمال کی طرف اوقیانوسی ساحل پر انگریزی نوآبادیاں آبادی و
خوشحالی میں دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگیں۔

برطانیہ کی تجارت اور نوآبادیانہ سلطنت کی ترقی کو دونوں بوربون طاقتوں نے حسد اور عداوت کی نظروں
سے دیکھا۔ بالخصوص فرانس ہندوستان میں انگریزی کمپنی کے دائرۂ اثر کو بڑھتا نہ دیکھ سکا اُدھر سپین کفِ افسوس
ملتا رہا اور اس کوشش میں رہا کہ کسی طرح اُن امتیازی حقوق کو جو ۱۷۱۳ء میں اُس نے برطانیہ کو دیئے تھے واپس لے لے۔
بوربون فرمانرواؤں کی اس روز افزوں عداوت کا اظہار ۱۷۳۳ء میں فرانس اور سپین کے درمیان ایک خاندانی معاہدہ کے
قیام کی شکل میں ہوا۔ انگریزی بوربونی تعلقات بد سے بدتر ہوتے گئے یہاں تک کہ ۱۷۳۹ء میں کھلم کھلا لڑائی ٹھن
گئی اور لڑائی نے بتدریج برطانیہ اور فرانس کے مابین بحری طاقت اور سلطنت کے لئے اینچا تانی کی صورت اختیار کرلی۔

انگریزی فرانسیسی دنگل۔ اٹھارہویں صدی کی مشہور لڑائیاں تاریخ میں اپنی نوع میں بالکل نئی تھیں۔ وہ وسعت
میں عالمگیر تھیں اور دو قابلِ غور خصوصیات رکھتی تھیں۔ اول اُن سے یہ ظاہر ہوا کہ ساری انسانی نسل اب از سرِ نو مربوط
و متحد ہو رہی ہے اور ایشیا، افریقہ، امریکا اور آسٹریلیشیا تمام ایک ہی عالمگیر سیاست کے اندر کھچے چلے آئے ہیں۔ دوم اُن
انسانی نسل کے کاروبار میں یورپی لوگوں کی مسلمہ سیادت اظہر من الشمس ہوگئی۔ یہ ایک دماغی اخلاقی اور مادی سیادت
تھی۔ دماغی بوجہ ایک اعلیٰ تر تجسس کارپردازی علم ایجاد اور عقلیت کے۔ اخلاقی بوجہ ایک برتر ہمت ویقین اور زیادہ
مضبوط سیرت کے۔ اور مادی بوجہ کثیر مال و دولت بے شمار ساز و سامان، آلاتِ حرب اور ایک عام تنظیم کے۔

ہرنشا کہتا ہے کہ فیصلہ طلب امر صرف یہ تھا کہ کونسی یورپی قوم متحدہ نسل ہائے انسانی کی قائد و رہبر قرار پائے۔
(اس سے یہ مراد نہیں کہ دنیا کے غیر یورپی تمدنوں یا وحشی معاشرتوں میں کوئی اور شاید زیادہ اہم خصوصیات ایسی نہ
تھیں جن سے یورپی لوگ عاری تھے۔ مدعا صرف یہ ہے کہ اٹھارہویں صدی میں یورپین لوگ کس حد تک دنیا میں اوروں
پر فائق ہو رہے تھے) سولہویں صدی کی پانچ نوآبادکن قوموں میں سے تین پرتگال سپین اور ہالینڈ مقابلے میں بالکل پیچھے
رہ گئے تھے۔ صرف فرانس اور برطانیہ میدان میں باقی تھے۔ ان کے درمیان ۱۷۴۰ء میں وہ مشہور جنگ شروع ہوئی

جسے "آسٹروی تخت و تاج کی جنگ" کہا جاتا ہے + یہ جنگ سمندروں پر ہندوستان میں امریکہ میں اور جزائر شرق الہند میں برپا ہوئی + ایکس لاشاپل کا صلح نامہ (۱۷۴۸ء) فیصلہ کن نہ تھا + حقیقت یہ ہے کہ طرفین کے مدبرین میں سے شاید بہت کم نے سمجھا کہ اس لڑائی کے نتائج کیا اور کتنے اہم ہیں۔

البتہ دو شخصوں نے اس بھید کو تاڑ لیا۔ انگلستان میں ولیم پٹ (بزرگ) نے اور فرانس میں ڈیوک آف شوازل نے + ان دونوں میں پٹ کو پہلے موقع مل گیا اور اُسے اپنی قوم و حکومت سے مدد بھی خوب ملی اور ملتی گئی + اس لئے اُس نازک مقابلے میں جو یورپ میں جنگِ ہفت سالہ (۱۷۵۶ء تا ۱۷۶۳ء) کہلایا برطانیہ نے ایک قطعی فتح حاصل کی اور فرانس کی بحری و نوآبادی طاقت ٹوٹ گئی + صلح نامۂ پیرس (۱۷۶۳ء) کی رو سے جس پر جنگ کا خاتمہ ہؤا (۱) فرانس نے شمالی امریکہ خالی کر کے کینیڈا برطانیہ کے حوالے کر دیا (۲) ہندوستان میں فرانسیسیوں کا اثر ملیامیٹ ہو گیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کرناٹک اور بنگال میں برسرِ اقتدار ہو گئی۔ ہوک کی خلیج کوبرون اور بوسکیون تز دیگوس کی مشہور بحری فتحوں سے (جو دونوں ایک ہی روز ۲۰ نومبر ۱۷۵۹ء کو حاصل ہوئیں) برطانیہ کو کامل بحری فوقیت حاصل ہو گئی + برطانیہ کا رعب و اقتدار اس سے پہلے کبھی اتنے زوروں پر نہ تھا نہ اس سے پہلے کبھی اُس کی قلمرو اس قدر وسیع ہوئی تھی +

ریاستہائے متحدۂ امریکہ کا قیام ۱۷۶۳ء میں شمالی امریکہ سے فرانسیسی حکومت کے قطعی طور پر اُٹھ جانے سے انگریزی نوآبادیات کو جو خطرہ اک مدت سے چلا آ رہا ہے وہ ہٹ گیا + یہ نوآبادیاں اب تعداد میں تیرہ تھیں۔ ان میں بارہ سترھویں صدی میں آباد ہوئی تھیں اور جورجیا ۱۷۳۲ء میں + وہ اوقیانوس کے ساحل کے ساتھ ساتھ ایک ہزار میل تک ۳۰ اور ۵۰ درجے عرض البلد کے درمیان پھیلی ہوئی تھیں + کینیڈا اور لوزیانا کی ایک دوسرے سے دور افتادہ فرانسیسی آبادیاں بحری نہ تھیں بلکہ دریائی تھیں۔ پہلی دریائے لارنس کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی جھیلوں تک پھیلی ہوئی تھی اور دوسری دریائے مسس سپی کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی براعظم کے اندرونی حصے تک پہنچتی تھی + فرانسیسیوں کی اس کوشش کا نتیجہ کہ کسی طرح ان کی یہ دو جداگانہ آبادیاں اوہایو کی وادی کے ذریعہ سے باہم متصل ہو جائیں اور یوں انگریزی ساحلی بستیاں بھی براعظمی سرزمین سے منقطع رہیں وہ خونریز جنگ ہوئی جو ایلیگینی پہاڑوں کے مغرب کی طرف ۱۷۴۴ء سے ۱۷۶۰ء تک برابر جاری رہی + پٹ کی عاقبت اندیشی قوتِ ارادی اور دوربینی کا سب سے بڑا کارنامہ وہ تھا جس کا انجام کوئبک کی تسخیر (۱۷۵۹ء) اور مونٹریل کا قبضہ (۱۷۶۰ء) ہؤا جب ۱۷۶۳ء میں صلح ہو گئی تو جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آتے ہیں برطانیہ کو کینیڈا ملا + لوزیانا سپین کو دے دیا گیا۔

اب انگریزی نوآبادیوں کو برطانیہ کی حفاظت کی ضرورت نہ رہی +نتیجۃً اب انہوں نے پہلے سے بہت زیادہ توجہ اور دلیری کے ساتھ اُس قدیمی نوآبادی کے طریق نظم ونسق کی بندشوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جو اُن کی نشو ونما کے رستے میں حائل ہو رہا تھا + برطانوی حکومت اُن کی اس بظاہر شرمناک احسان فراموشی پر چیں بہ جبیں ہو گئی اور اُس نے اُن کی شکایات پر کان دھرنے سے صاف انکار کردیا + محصولات کے متعلق مخصوص اختلافات کی وجہ سے جلد ایک جھگڑا شروع ہؤا اور ۱۷۷۵ء میں لڑائی چھڑ گئی +

نوآبادلوگ باوجود اپنی قابلیت وعزم کے ضرور پس پا ہو جاتے لیکن فرانس اور سپین کی اعانت نے کایا پلٹ دی + بوربون حکومتوں نے دیکھا کہ اب خوب موقع ہے کہ وہ اپنے قدیمی دشمن سے بدلہ لیں + انہوں نے فوج اور زرو مال سے باغیوں کی مدد کی - برطانیہ کی بحری نقل وحرکت منقطع کردی اور اس طور سے امریکیوں نے اپنی آزادی حاصل کرلی (۱۷۸۳ء) +

نیز باغی نوآبادیوں نے بہت بحث وتمحیص کے بعد اپنے تئیں ایک "متفقہ جمہوریہ" میں مربوط کرلیا (۱۷۸۷ء) نئی مملکت کی فوری خوشحالی اور آبادی اور دولت اور علاقے میں اُس کی روزافزوں ترقی سے گویا ثابت ہو گیا کہ نوآبادوں کی بغاوت حق بجانب تھی +

انقلاب فرانس کی تقریب - فرانسیسی حکومت نے باغی نوآبادوں کو مدد دے کر سلطنت برطانیہ کو ضعف تو پہنچایا لیکن اُسے اپنی اس انتقامی خوشی کا سخت خمیازہ اُٹھانا پڑا + دراصل اس فضول خرچ کرنے سے پہلے ہی وہ دیوالیہ ہو چکی تھی + لوئی چاردہم کی مضمحل کن لڑائیوں نے فرانسیسی مالیات کو مستقل طور پر کمزور کر دیا تھا - ذلیل ومکروہ لوئی پانزدہم کے بے پروا اسراف سے ان حالات کی بہتری تقریباً ناممکن ہو چکی تھی + جب لوئی شانزدہم ۱۷۷۴ء میں تخت نشین ہؤا تو خوشحالی کا واحد ذریعہ بے نہایت کفایت اور سارے نظام محصول گیری کی پوری پوری اصلاح وتغییر تھی + مشکل یہ تھی کہ کفایت شعاری اُس کی نوعمر رنگیلی ملکہ ماری آنتوانت کے حسب دلخواہ نہ تھی - اور ادھر امریکی فرانسیسی خزانے پر ہاتھ صاف کر رہے تھے + روپیہ بہم پہنچانے کے لئے بڑے بڑے قرضے لئے گئے - ان قرضوں کا سود ادا کرنے کے لئے اور قرضے لینے پڑے اور نوبت بایں جا رسید کہ ۱۷۸۹ء کا انقلاب عظیم ملک پر قیامت بن کر ٹوٹ پڑا -

ایک اور طریق سے بھی امریکی جنگ نے انقلاب فرانس کے لئے رستہ صاف کر دیا + بہت سے فرانسیسی مثلاً شہرۂ آفاق لافایت اوقیانوس پار باغی نوآبادوں کو مدد دینے کے لئے گئے تھے + جب وہ واپس آتے تو وہ پکے جمہوریے ہو چکے تھے - وہ اپنے ساتھ ٹامس پین کی تصنیف "عقل سلیم" اور اسی طرح کی اور کتابیں لاتے جو اگرچہ یوں تو جارج سوم

کی حکومت کی مخالفت میں لکھی گئی تھیں لیکن ان کے بیان کردہ اصول عام طور پر شخصی حکومت کے خلاف عائد ہوتے تھے فرانسیسی اور بالخصوص فرانسیسی تعلیم یافتہ متوسط طبقے کے نفس کی سرزمین جمہوری تخم کی نشوونما کے لئے خوب تیار تھی۔ مونتسکیو کی تصنیفات نے "شاہوں کے حق آلہی" کے مسئلے کو باطل کر دکھایا اور سیاسی ادارات کی اضافیت پر زور دیا۔ والٹیر کی دلچسپ ہجویں اور صاحبانِ مجمع العلوم کی قدامت سوز علمیت نے کیتھلک کلیسا اور مسیحی مذہب کے اقتدار کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ روسو کے پُرجوش مقولات نے انسانی مساوات اور جمہوریت کے خیالات کی ملک کے کونے کونے میں اشاعت کی اور امرا کے امتیازی حقوق اور بادشاہوں کی دعوے داریوں کے دھوئیں بکھیر دیئے۔

اس لئے جب ۱۷۸۹ء میں لوئی شانزدہم نے اپنے خزانے کو بالکل خالی دیکھ کر مملکت کی مجلسِ عوام" کو جو ۱۶۱۴ء سے کبھی مدعو نہ کی گئی تھی کچھ روپیہ حاصل کرنے کی غرض سے بلایا تو طبقۂ سوم کے نائبین جو ۵ مئی کو بمقام ورسائی جمع ہوئے سب اس بات پر متفق و یک زبان تھے کہ نری مالی اصلاح ناکافی ہے اور جس اصلاح کی ضرورت ہے اُس کا نفاذ اب قطعی ضروری ہو گیا ہے۔

بشیر احمد

محبّت

سب سے پاک محبت وہی ہے جو آنسوؤں کے پردے میں نہاں ہو۔ — بائرن

محبت حاصل کر کے کھو دینا محبت نہ کرنے سے بہتر ہے۔ — ٹینی سن

محبت اگر دل میں گھر نہیں کر سکتی تو آہستہ آہستہ رینگنے لگتی ہے۔ — ویبسٹر

وہ محبت سچی محبت نہیں جو دوست کی تبدیلی سے تبدیل ہو جائے یا محبت کرنے والے کے اختیار میں ہو۔ — شکسپیئر

محبت وہ ہمیشہ قائم رہنے والا مضبوط ستون ہے جسے ہلا دینا طوفان کی طاقت سے بھی باہر ہے۔ — شکسپیئر

نایاب موتی یا خوبصورت پھول سے سچی محبت کی نگاہ کا تحفہ زیادہ قیمت رکھتا ہے۔ — ؟

اعتماد کے نہ ہونے سے ہی محبت قائم نہیں رہتی، اور نہ محبت لازوال ہے۔ — ؟

کیشو داس عاقل

آنکھیں

بگڑتے آپ ہم سے اور بدلتے گو ہزار آنکھیں — مگر تیور یہ کہتے ہیں کہ آخر ہونگی چار آنکھیں

کوئی کیا جانے یہ کس داستاں کی شرح کرتی ہیں — تمہاری شرمسار آنکھیں ہماری اشکبار آنکھیں

بہت دیکھا ہے ہم نے خوبروؤں کو ان آنکھوں سے — تجھے جو دیکھ لیں وہ بھی تو دے پروردگار آنکھیں

دو آنکھوں سے مرا ذوقِ نگہ تسکیں نہیں پاتا — یہ رنگا رنگ جلوے مانگتے ہیں صد ہزار آنکھیں

یہ توبہ آپ کی توبہ نہیں ہے حضرتِ واعظ! — بدل جاتے ہیں پل کی پل میں رندِ میگسار آنکھیں

سکندر اور جم کی یادگاریں تو بہت ہونگی
مگر عاشق ترا چھوڑے گا اپنی یادگار آنکھیں

مصطفیٰ خاں

نواہائے راز

راہِ طلب میں ہمتِ مردانہ چاہیئے — اظہارِ شوقِ دید کلیمانہ چاہیئے

ہنگامِ نائے و نوش ہے یہ ساقیٔ بہار! — ہر شاخِ گل کے ہاتھ میں پیمانہ چاہیئے

ہے کفر میرے پاس نہ ایمان، کیا کروں — پیرِ مغاں کے واسطے نذرانہ چاہیئے

پھر ہو چلا خمارِ خودی پیرِ میکدہ! — پھر دستِ حق پرست سے پیمانہ چاہیئے

اے اہلِ بزم رقص میں اک بادہ خوار ہے — اُٹھو، لحاظِ لغزشِ مستانہ چاہیئے

اک سعیِ مستقل پہ مدارِ حیات ہے — یعنی کہ دل میں جوشِ حریفانہ چاہیئے

اب حسن میں وہ جذبۂ شورش ہے عشق میں
پھر ابتدا سے چھیڑنا افسانہ چاہیئے

ابو الفاضل راز
چاندپوری

ایک انسان مطلوب ہے

انسان مطلوب ہیں! محض معقول و شاندار طور طریقے مطلوب نہیں، نہ ایمان و اعتقاد کے جدید نقطہ ہائے نظر، نہ زر و دولت کے انبار جو پہاڑوں کی چوٹیوں کے برابر ہوں، نہ وہ طاقت جو متین اور پُر جلال تبسم لئے ہوئے ہو حتیٰ کہ زبردست قلم بھی نہیں بلکہ صرف انسان مطلوب ہیں ـــــــ انسان!

تمام دنیا چلا رہی ہے کہ وہ انسان کہاں ہے جو ہمیں نجات دلائے گا ہم ایک انسان کی جستجو میں ہیں! تم اس انسان کے لئے دور دور نگاہیں نہ دوڑاؤ، کیونکہ وہ انسان تو تمہارے سامنے موجود ہے۔ یہ انسان تم ہو، مَیں ہوں، بلکہ ہم میں سے ہر ایک ہے!.....

کیا کوئی شخص انسان بن سکتا ہے؟ اور اگر وہ نہ بننا چاہے تو اس سے زیادہ کوئی چیز مشکل نہیں لیکن اگر کوئی انسان بننے کا عزم کر لے تو اس سے زیادہ آسان کوئی بات نہیں۔ (الگزنڈر ڈوماس)

قدیم ایتھنز کی گلیوں میں دن دہاڑے چراغ ہاتھ میں لے کر دیو جانس ایک کامل دیانت دار اور امین انسان کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا، مگر بے کار۔ آخر کار وہ چوک میں آیا اور بلند آواز سے چلّایا، "او انسانو! میری سنو، میری طرف آؤ" بہت سے لوگ اُس کے ارد گرد جمع ہو گئے تو اُس نے ملامت آمیز انداز سے کہا "میں نے تو انسانوں کو بلایا ہے ٹھنگنوں اور بونوں کو نہیں بلایا!"

دنیا کے ہر ایک پیشے اور ہر ایک فن، ہر ایک موقعے اور ہر ایک دعوت کے دروازے پر یہی نہ مٹنے والا اعلان چسپاں ہے کہ "ایک انسان مطلوب ہے"۔ مطلوب ہے، وہ انسان جو کسی دعوت کسی مجمع میں بھی اپنی انفرادیت کھو نہ دے، وہ انسان جو اپنے یقین واثق کے ساتھ ساتھ جسارت اور جرات بھی رکھتا ہو، جو اُس وقت "نہیں" کہتا ہوا خوف زدہ نہ ہو جب کہ ایک دنیا "بجا" و "درست" اور سر تسلیم خم کے نعرے لگا رہی ہو۔

وہ انسان مطلوب ہے جو اگرچہ ایک عظیم المرتبت مقصد کے لئے جد و جہد کر رہا ہو، مگر اس کے باوجود وہ اس بات کا روادار نہ ہو کہ وہ مقصد اُس کی کسی ایک بڑی قابلیت و اہلیت کو ادنیٰ یا اپاہج کر کے اُس کی انسانیت کو عیب دار کر دے۔

مطلوب ہے، وہ انسان جو اپنے فن اور پیشہ میں نمایاں ہو۔ جو اپنے عہدے کو اُس وقت کم قیمت سمجھتا ہو جب اُس کا اندازہ صرف حصولِ زر کے مقصد کو سامنے رکھ کر لگایا جائے۔

مطلوب ہے، وہ انسان جو اپنے نشو و ارتقا، تعلیم و تربیت، باقاعدگی نظم اور مشق، چلن اور انسانیت کو اپنے عہدے میں مدِ نظر رکھے

ایک ایک مذہبی فرقے میں ہزاروں منبر خالی پڑے ہیں، درانحالیکہ ہزاروں اعظ ایک ایک چوک میں بیکار کھڑے مکھیاں مار رہے ہیں۔ ادھر ہزاروں لوگوں نے چپہ چپہ بھر زمین کو انسانوں کی جستجو میں چھان مارا ہے کہ وہ آئیں اور ان خالی ممبروں کو آن کر زینت دیں، لیکن ڈھونڈنے والوں کی کوششیں بے کار جارہی ہیں۔ یہ بڑا ثبوت ہے اس بات کا کہ زمانہ میں مواقع بہت ہیں اور انسانوں یا اچھے انسانوں کے لئے دنیا بیتاب ہے۔ اس لئے مطلوب ہے ایک باجرات و بسالت انسان جو اپنی فطرت کے کسی پہلو میں بھی بزدل نہ ہو۔

مطلوب ہے ایک انسان جس میں توازن و موزونیت اعلیٰ پیمانہ پر ہو جس پر کسی نقص یا کمزوری کی لعنت کا سایہ بدنہ پڑا ہو وہ سایہ جس نے اُس کی نفع رسانی کو ناقص بنا دیا ہو اور اُس کی طاقتوں کو ایک طرف جھکا دیا ہو۔ مطلوب ہے وہ انسان جو با قرینہ و باسلیقہ ہو، اپنی نشوو ارتقا میں یک رُخہ نہ ہو جس نے اپنی ہستی کی تمام استعدادوں کو کسی ایک ہی تنگ اور مختصر امتیاز میں لگا کر اپنی زندگی کی دوسری تمام شاخوں کو چھوڑ نہ دیا ہو کہ پژمردہ اور افسردہ ہو جائیں۔

مطلوب ہے وہ انسان جو فراخ حوصلہ اور وسیع الخیال اور بلند نظر ہو، جو معاملات کا ایک ہی رخ نہ دیکھتا ہو، وہ انسان جو اپنے نظریات کے ساتھ ساتھ عام سوجھ بوجھ کو بھی ملاتا ہو جس نے دارالفنون کی تعلیم کو اپنی عملی اور روزانہ زندگی برباد نہ کرنے دی ہو، وہ انسان جو اپنی ہستی کو آپ منصۂ شہود پر لاتا ہو، اور جو اپنی نیک نامی کو اپنے لئے ایک بیش بہا خزانہ سمجھتا ہو۔

مطلوب ہے، وہ انسان جو دنیا سے کھویا ہوا سا دھوا اور رہا تمانہ ہو، بلکہ زندگی اور آگ سے پُر انسان۔ اس کے جذبات ایسے سدھے ہوئے ہوں کہ بڑے سے بڑے مضبوط ارادے کا تعاقب کر سکیں جو پاک ضمیر کا خادم ہو، جو تمام محاسن کی پرستش کرنا جانتا ہو خواہ وہ محاسن فطرت کے ہوں یا فن وصنعت کے۔ وہ جو ہر قسم کی نابکاریوں سے متنفر ہو اور دوسروں کی اپنی ذات ہی کی طرح عزت کرتا ہو۔ دنیا اُس انسان کی تلاش میں ہے جو ہر حیثیت میں تعلیم و تربیت یافتہ ہو، جس کے اعصاب کو دانائی کی قوت عطا کی گئی ہو، جس کا دماغ مہذب، طرار اور وسیع ہو جس کے ہاتھ کار آشنا ہوں، جس کی آنکھیں تیز معقول شناس اور غور بین ہوں، جس کا قلب نرم، جوانمرد اور صادق ہو

تمام دنیا ایک ایسے ہی انسان کی جستجو میں ہے۔ اگرچہ لاکھوں انسان پڑے بے کار مارے مارے پھر رہے ہیں۔ تاہم یہ بات تقریباً ناممکن سی ہے کہ کسی شعبہ میں بھی ایک معقول و موزون انسان ڈھونڈ نکالا جائے۔ اور پھر طرفہ یہ ہے کہ ہم ہر جگہ یہ اعلان و اشتہار بھی دیکھ رہے ہیں کہ ایک انسان مطلوب ہے!

روسو اپنے اُس مشہور و معروف مقالہ میں جو مسئلہ تعلیم پر ہے کہتا ہے: "فطرت کے قانون کے مطابق سب انسان برابر ہیں، ان سب کو "فنِ انسانیت" سکھانے کی ضرورت ہے، اور جس نے ایک انسان کا فرض ادا کرنا خوب اچھی طرح سیکھ لیا ہو وہ اُن تمام

شعبوں اور صیغوں میں جو اُسے تفویض کئے جائیں اپنی جگہ بطریق احسن پُر کرسکتا ہے۔ اس لئے یہ مسئلہ میرے لئے چنداں اہم نہیں کہ میرا شاگرد فوج میں جانے کی تیاری کررہا ہے یا مذہبی منبر پر جگہ لینا چاہتا ہے یا قانون کو اپنی زندگی کا مقصد بنانے کے درپے ہے۔ کیونکہ جو مقام ہمارے لئے مقدر ہے وہ فطرت نے پہلے ہی سے ہمارے لئے تجویز کر رکھا ہے زندہ رہنا ایک فن ہے اور یہی فن میں اسے سکھاؤں گا۔ جب میں نے اپنا فرض ادا کردیا تو گو یہ سچ ہے کہ وہ نہ تو سپاہی ہوگا نہ قانون دان نہ مذہبی مگر ہاں آپ اسے پہلے انسان بن جانے دیجئے پھر قسمت جیسا چاہے گی اسے ایک درجہ سے دوسرے درجہ میں آپ سے آپ لے جائے گی، اور وہ ہمیشہ اپنے درجہ اور مقام پر پایا جائے گا"

ایمرسن کہتا ہے کہ ٹالیرینڈ کسی شخص کے متعلق کبھی یہ نہیں پوچھا کرتا تھا کہ کیا وہ دولت مند ہے؟ کیا وہ مجرا ہے! کیا وہ نیک طینت ہے؟ کیا وہ فلاں فلاں قابلیت رکھتا ہے؟ کیا وہ فلاں خاندان میں سے ہے؟ بلکہ ان سوالات کی بجائے وہ یہ سوال کیا کرتا تھا کہ کیا وہ کچھ ہے بھی، کیا وہ کچھ کام کر بھی سکتا ہے؟ اگر کرسکتا ہے تو اپنی قسم کا بہترین انسان ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ باتیں ہیں جو کسی شخص کے متعلق ہمیں معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔

جس وقت گارفیلڈ ابھی کم عمر لڑکا ہی تھا اُس سے پوچھا گیا کہ وہ کیا ہونا چاہتا ہے؟ اُس نے جواب دیا سب سے پہلے میں اپنے آپ کو انسان بناؤں گا۔ اگر میں اس مقصد میں کامیاب نہ ہوا تو پھر میں کسی مقصد میں بھی کامیاب نہ ہوں گا"

مانٹین کہتا ہے "ہمارا صرف یہ کام نہیں کہ ہم تنہا روحانی تربیت ہی کریں اور نہ صرف یہ کہ جسم کی تربیت ہی کی جائے بلکہ ہم ایک انسانی تربیت کرنا چاہتے ہیں"

آج دنیا کو سب سے بڑی احتیاج ایسے مردوں اور عورتوں کی ہے جو "اچھے حیوانات" ہوں اور جو ہمارے ساکن و جامد تمدن کی سختیوں کو برداشت کرسکیں تاکہ آئندہ مردوں اور عورتوں کے جسم اعلیٰ درجہ کے ہوں اور اُن میں "حیوانی روح" کی بھی بہتات ہو۔

اُس عظیم الشان انسانیت سے بڑھ کر جس میں غیر معمولی صحت کی زندگی بخش تابشیں ہوں اور کون سی چیز جلیل القدر ہوسکتی ہے! لیکن یہ نظارہ کس قدر مایوس کن اور افسوسناک ہے کہ بڑے بڑے تعلیمی مراکز جن کا تنہا مقصد یہ تھا اور ہے کہ جوانمرد آزاد اور اپنی حمایت آپ کرنے والے انسان پیدا کریں ان میں سے ہر سال ایسے ہزاروں طالب علم منتہی اور فارغ التحصیل ہو ہو کر نکل رہے ہیں جو بجائے تناور شاہ بلوط ہونے کے معمولی پودے۔ بجائے اپنے مددگار آپ ہونے کے دوسروں کے محتاج۔ بجائے مضبوط ہونے کے کمزور و ناتوان، بجائے تیر کی طرح تنے ہوئے ہونے کے کمان کی طرح خمیدہ اور جھکے ہوئے ہیں"۔ آہ ایسے بے امید بند جانے والے نوجوانوں میں سے ایک بھی مکمل انسان نہیں نکلتا"۔ حالانکہ سیرت کی ہمدردیاں بغیر سوچے سمجھے جسم کی

اعلیٰ بناوٹ ہی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ایک چڑچڑا، بڑبڑانے والا روگی انسان ایسی مضبوط سیرت کا مالک کبھی نہیں ہو سکتا جیسی ایک صحت ور قوی ہیکل اور شادان و فرحاں انسان کے لئے ممکن ہے۔

جب مد کا وقت ہوتا ہے تو سمندر کی ایک موج ساحل پر اتنی آگے نکل جاتی ہے کہ اس سے پہلی امواج کی وہاں تک رسائی نہیں ہوئی ہوتی۔ اس کے بعد وہ موج پیچھے ہٹ جاتی ہے اور تھوڑی دیر کے بعد تو یہ عالم ہوتا ہے کہ آخری موج کا قدم بھی پہلی موج کے بنائے ہوئے نشان تک پہنچ جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح کبھی کبھی ایک انسان اپنے ہمجنسوں میں نمایاں ہو کر آتا ہے، اور دکھا دیتا ہے کہ فطرت نے اپنے معیار اور اسوہ کو اس کی تکمیل میں فراموش نہیں کیا۔ اور پھر تو ایسا نظر آنے لگتا ہے کہ ایک معمولی درجہ کا انسان بھی بحرِ انسانیت کی بلند ترین موج ہے جس کا ابھی تک دنیا کو انتظار تھا۔

ایپلیس اپنی مشہور و معروف حسین ترین و مکمل ترین عورت کی تصویر کے لئے برسوں تمام ملکِ یونان کی حسین عورتوں کے نکات حسن کا مطالعہ کرتا رہا۔ یہاں سے حسین آنکھ، وہاں سے جمیل ماتھا، ادھر سے نازک ستوان ناک اُدھر سے نسوانی شکوہ و جلال اور یہاں سے حسن کی ایک ادا اور وہاں سے دوسری شان لیتا پھرا۔ آخر انہی تخیلات اور مطالعۂ حسنِ نسوانی کے مجموعہ نے مکمل ہو کر دنیا کو مسحور کر لیا۔ اسی طرح یہ مطلوب انسان بھی بہت سے انسانوں کا مجموعہ ہوتا ہے یہ اپنے اندر دوسرے انسانوں کی کمزوریوں اور حماقتوں کی بجائے ان کی قوت اور نیکیاں جذب کرتا ہے وہ اپنا مرکز آپ اور اپنا آقا آپ ہوتا ہے۔ اُس کا فہم و فراست اور اصول خواہشاتِ نفس کے غلبہ سے تباہ و برباد شدہ نہیں ہوتا۔

تعلیم و تربیت کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ آدمی کے اندر انسان بننے کی استعداد پیدا کر دے جس طرح ایک ہرے بھرے پودے میں تناور درخت بننے کی استعداد ہوتی ہے اور پھر اُس کی لکڑی سے ہزاروں اعلیٰ درجہ کی اشیا بنائی جا سکتی ہیں اور اس پر عمدہ کھدائی کی جا سکتی ہے اسی طرح تربیت، تعلیم اور تجربہ کے ذریعہ سے طفولیت کا پودا شدید ذہنی اخلاقی اور جسمانی ہوانسانی چوب بن جایا کرتا ہے۔

اگر کوئی نوجوان اس عزمِ صمیم کے ساتھ اپنی زندگی شروع کرے کہ ہر ایک بات جو اس کی زبان سے نکلے گی وہ صدقِ خالص اور ہر ایک وعدہ جو وہ کرے گا نوشتۂ تقدیر کی طرح اٹل ہوگا اور اُس کی طرف سے ہر ایک تعین و تقرر کو نہایت امانت اور سختی کے ساتھ دوسرے لوگوں کے وقت کا پورا احترام کرتے ہوئے نباہا جائے گا اور اس طرح اگر وہ اپنی شہرت اور نیک نامی کی ایک بیش بہا خزانہ کی طرح حفاظت کرے گا تو وہ محسوس کرے گا کہ دنیا کی نگاہیں اُس پر ہیں۔ اور جب لوگوں کو یہ یقین ہو گا کہ وہ بال برابر بھی صداقت و حقیقت سے انحراف نہیں کرتا یا نہیں کرے گا تو وہ سر اس شخص کا جو اسے جانتا ہے محلِ اعتماد ہو کر رہے گا محلات و قصور اور لاؤ لشکر کیا ہیں، اگر کوئی شخص کسی پورے برِ اعظم کا مالک بھی ہو جائے یا ایک سمندر اُس کے تجارتی جہازوں سے

بھرا پڑا ہو تو بھی اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ ان تنعمات کا مقابلہ ایک صادق ضمیر سے کیجئے اور اُس چہرے سے جو کسی الزام دینے والے کی آواز پر زرد نہیں پڑ جاتا اور ایک ایسے سینہ کے ساتھ جو راز فاش ہو جانے کے خوف سے نہیں دھڑکتا اور ایک ایسے دل کے ساتھ جو اگر چیر کر پہلو سے باہر نکالا جائے تو اُس کی عزت و وقار پر کوئی داغ دھبا نہ ہو۔

تم کسی انسان سے بری طرح پیش نہ آؤ کسی ایسے کاغذ پر دستخط نہ کرو جس کے لئے کوئی آسمان کا مقرب ترین فرشتہ گواہ اور مصدق نہ ہو چلو پھرو اور رہو سہو ایسے طریق سے کہ کوئی نہ بہکا سکے۔ اور اُس چیز سے پرے رہو جو تمہاری ملک نہ ہو تمہاری خواہش اور تمہارے مقصد میں سوائے راستی اور قانون کے کوئی چیز حائل نہ ہونی چاہئے۔ انسان عالم میں ایک بزرگ و برتر ہستی ہے۔

ایک حکومت کے فرائض جو وہ انجام دے کیا کیا ہیں؟ نہ تو اونچی اونچی مورچہ بندیاں، نہ چوڑی اور مضبوط فصیلیں، نہ اونچے مناروں والے دروازوں اور کلسوں والے بروج سے سجے ہوئے شہر، نہ کھاڑیاں، نہ ایسی وسیع اور مسلح بندرگاہیں جن میں متمول اور طاقت ور بیڑے کھڑے طوفان پر قہقہہ لگا رہے ہوں، نہ آراستہ و پیراستہ جگمگاتے ہوئے دفاتر کی بھرمار جہاں جھکی ہوئی کمینہ بھویں آدمی کو غرور و نخوت کی طرف لے جاتی ہیں، ان میں سے کچھ بھی نہیں بلکہ انسان اور بلند حوصلہ وسیع قلب انسان مہیا کرنا حکومت کا فرض ہے جن میں وہ طاقتیں ہوں جو کاہل حیوانوں کی طاقتوں سے بہت ارفع ہوں، ان حیوانوں سے جو صحراؤں جنگلوں اور کچھاروں میں رہتے ہیں جو ٹھنڈی چھاؤں اور جھاڑیوں میں رہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ انسان جو اپنے فرائض ادا کریں۔ ہاں وہ انسان جو اپنے حقوق کو جانتے ہوں اُن میں جرات ہو کہ اپنے حقوق کو قائم رکھ سکیں اور سمجھے بوجھے ہوئے حملوں کی روک تھام کر سکیں۔ اور ظالم کو کچل سکیں اور زنجیروں کو توڑ سکیں۔ (ولیم جونس)

اینن کا قول ہے کہ "خدایا ہمیں وہ انسان دے جو مضبوط قلب والے بڑے دل والے، راسخ الاعتقاد اور چلتے ہاتھ والے ہوں۔ وہ انسان جنہیں دفاتر کی خاک دھول ہلاک نہ کر سکے۔ وہ انسان جنہیں محکموں کی "بالائی" آمدنیاں خرید نہ سکیں۔ وہ انسان جو اپنی رائے اور ارادے کے آپ مالک ہوں وہ انسان جو جھوٹ نہ بولنے والے انسانوں کی عزت کریں وہ انسان جو بڑے سے بڑے نطّاق و حرّاف کے مقابلے میں کھڑے رہ سکیں، اور اس کے فریب کارانہ بڑھاوؤں کی بغیر ذرہ برابر خوف کے مذمت کر سکیں۔ بلند قامت انسان جن کا تاج آفتاب ہو جو فرض منصبی ادا کرتے ہوئے سپہر رفعت پر قائم رہیں اور وہیں پر زندگی گذار دیں۔"

(مستفاد)

مہر محمد خاں شہاب

پیغام

قیسِ اُلفت ہے تو یادِ رخِ لیلیٰ بھی نہ کر تُو محبت کے لئے ہے تو تمنا بھی نہ کر

ظلمتِ شامِ جدائی سے جو مانوس ہے تُو ارتکابِ ہوسِ صبحِ نظارا بھی نہ کر

گر خدا کے لئے دنیا سے ہؤا ہے بیزار تو خیالِ طلبِ راحتِ عقبےٰ بھی نہ کر

زینتِ دہر اک آرائشِ باطل ہی سہی نگہِ شوق کو محرومِ تماشا بھی نہ کر

تُو اگر محرمِ اسرارِ عبودیت ہے! امتیازِ حرم و دیر و کلیسا بھی نہ کر

موجِ آوارہ اگر ہے تو نہ تک ساحل کو ڈوبنا ہے تو ابھرنے کی تمنّا بھی نہ کر

تُو اگر مستِ مئے عشرتِ امروز نہیں دلِ خود دار! خیالِ غمِ فردا بھی نہ کر

محرمِ رازِ محبّت ہے اگر دل تیرا تو خدا کے لئے! اس راز کو رسوا بھی نہ کر

جس نے پیغامِ محبت سے نوازا ہے تجھے اُس نگاہِ طرب انگیز کو رسوا بھی نہ کر

اگر آسودگیٔ روح کی حسرت ہے روشؔ
ساحلِ گنگ کو محدودِ نظارہ بھی نہ کر

روشؔ صدیقی

قاصدِ محبّت

وایولا (ایک لڑکے کے لباس میں) حسین خاتون، میرے مالک اور آقا کو تجھ سے محبت ہے!

ایسی محبت کہ اگر تیرے سر پر یکتائیِ حسن کا تاج بھی ہو تو وہ اُس کا معاوضہ ہو سکتی ہے!

اولیویا۔ اُس کی محبت کیسی ہے؟

وایولا۔ اُس کی محبت میں پرستش ہے، شاداب آنسو ہیں، اُس کے نالوں میں محبت کی بجلیاں گرجتی ہیں اور اُس کی آہوں سے آگ کے شعلے برستے ہیں۔

اولیویا۔ تمہارے آقا کو میرے دل کی بات کی خبر ہے، میں اُس سے محبت نہیں کر سکتی؛

پھر بھی میں اُسے نیک سمجھتی ہوں، شریف جانتی ہوں، وہ بڑی جاگیر کا مالک ہے، اُس کی جوانی شگفتہ اور بے داغ ہے؛

وہ آزاد، عالم اور بہادر مشہور ہے اور اُس کی فطرت سراپا جود و کرم ہے!

مگر پھر بھی میں اُس سے محبت نہیں کر سکتی؛ میرا جواب وہ مدتوں پہلے سمجھ چکا ہوگا۔

وایولا۔ اگر میرے دل میں تمہاری محبت اُس طرح شعلہ زن ہوتی جس طرح میرے آقا کے دل میں ہے، وہی درد و کرب اگر مجھے بھی برداشت کرنا پڑتا، وہی موت آگیں زندگی اگر مجھے بھی بسر کرنی پڑتی تو میں بھی تمہارے انکار میں کوئی مفہوم نہ پاتا؛

میں اسے کبھی نہ سمجھتا۔

اولیویا۔ کیوں، تم کیا کرتے؟

وایولا۔ میں پھونس کی ایک کٹی تمہارے دروازے کے سامنے بناتا، اور میری روح تمہارے گھر میں آ آکر میری محبت کا تقاضا کرتی؛

میں اپنی حقیر محبت اور وفا کے نغمے لکھتا، اور آدھی آدھی رات کو بھی انہیں بلند آواز سے گاتا؛ گونجنے والی پہاڑیوں میں تمہارے نام کا شور پیدا کرتا اور ہوا کے باتونی لبوں سے کہلواتا کہ اولیویا ہوا اور زمین کے عناصر میں رہ کر تمہیں مجھ پر رحم کئے بغیر کیونکر قرار آتا ہے؟

شیکسپیئر

منصور احمد

افسانہ نگار

امریکہ یا انگلستان کا کوئی ٹام، ڈک یا ہیری دن بھر کھیتوں یا کارخانوں میں کام کرنے کے بعد شام کو آگ کے سامنے بیٹھ کر کسی اہم سیاسی معاملہ پر بحث مباحثہ یا کسی نئی کتاب پر دل کھول کر نکتہ چینی کرے تو کرے مگر ایک ہندوستانی کسان زید عمرو بکر کے لئے کم از کم بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں یہ رسم رائج نہیں۔ اس لئے یوسف کا اپنی قلیل آمدنی کا ہر قلیل پس انداز ماہوار ادبی رسائل کے خریدنے میں صرف کرنا اگر کوئی عجوبہ نہ تھا تو نئی بات ضرور تھی۔ اخبارات سے البتہ اسے دلچسپی نہ تھی۔ قومی لیڈروں کے آئے دن کے جھگڑے، کسی خاص پارٹی کے برسرِ اقتدار ہونے اور بڑھ کر پھر گھٹ جانے سے اُسے کوئی سروکار نہ تھا، اور نہ اِن معاملات پر غور کرنے کی اُسے فرصت ہی تھی۔ ان معاملات میں وہ حافظِ شیراز کے فلسفۂ گوشہ نشینی کا قائل تھا۔

اُس شاداب پھول کے مانند جو بستی کے ہنگاموں سے دور کسی چشمہ کے کنارے یا جھاڑی کے آغوش میں آنکھیں کھولتا ہے اور اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کرتا ہے، گاؤں کی پُرسکون فضا میں یوسف بھی اپنے آپ کو بالکل اکیلا پاتا تھا۔ اُس کا کوئی ہم مذاق نہ تھا۔ وہ ادبی دلچسپیوں کا دلدادہ تھا اور اسی لئے کئی ایک رسائل کا خریدار، مگر جن امنگوں سے وہ ہر نئے پرچہ کو کھولتا، جن ترسی ہوئی بھوکی نظروں سے وہ اُس کا ہر لفظ پڑھتا اور پھر جس ترش روئی سے پیشانی پر بل دے کر وہ اُسے پھینک دیتا، اُس سے صاف ظاہر تھا کہ جس بات کی تلاش اُسے ان پرچوں میں رہتی ہے وہ ان میں موجود نہیں ہوتی۔ بارہا اُسے خیال آتا کہ یوں بے دریغ ان فضولیات میں پیسے برباد کر کے وہ اپنے اہل و عیال پر ظلم کر رہا ہے مگر ایک امید پر کہ شاید کسی آئندہ پرچے میں کوئی کارآمد بات نکل آئے وہ اپنی دھن ترک نہ کر سکتا، مگر اُس کی یہ آرزو کبھی بر نہ آئی۔ ہر مطالعہ کے بعد وہ اسی نتیجہ پر پہنچا کہ مالکانِ رسائل رہزن ہیں گرہ کٹ ہیں اور وہ خس و خاشاک کے بدلے غریبوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے اپنی جیبیں گرم کرتے ہیں۔

"ادبِ لطیف" میں ایک اعلان شائع ہوا۔

ناظرین کرام کو مژدہ۔ جنابِ اختر الہ آبادی کی ممتاز شخصیت تعارف کی محتاج نہیں، آسمانِ ادب کا وہ درخشاں ستارہ ہے جس نے اگر ایک طرف اپنی ضیا پاشی سے عروسِ ادب کے محلِ زیبا میں چار چاند لگا دیئے تو دوسری جانب جذباتِ لطیف کی ترجمانی میں بھی وہ اپنا ثانی نہیں رکھتا آیندہ

نمبر میں جنابِ اختر کا ایک دل گداز افسانہ چھپنے والا ہے جس کی اشاعت دنیائے ادب میں تہلکہ ڈال دے گی ـــــــ ناظرین انتظار کریں۔"

یوسف کی آنکھیں فرطِ مسرت سے چمک اٹھیں "دل گداز افسانہ۔ دل گداز افسانہ" اُس نے یہ الفاظ آواز بلند دہرائے "بس، بس ایک ماہ کا انتظار اَور...... اور میرے تمام انتظار کا ثمرہ مل جائے گا۔ میری تمام قیمت وصول ہو جائے گی۔ جذباتِ لطیف..... دل گداز افسانہ..... بس انہی کے لئے اتنے دنوں تک صرفہ اور رکابت کی کلفت برداشت کی ہے، انہیں کے انتظار میں مہینوں آنکھیں پھوڑی ہیں۔

اُس کی خوشی ارشمیدس کی خوشی سے کہیں زیادہ تھی۔ پرچہ ہاتھ میں لے کر "دیکھو۔ دیکھو" چلاتا ہوا وہ اپنی بیوی کے پاس پہنچا" دیکھو۔ تم مجھے رسالوں کی خریداری سے منع کیا کرتی ہو۔ اُس نے اعلان والا صفحہ کھول کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔ اپنی خوشی میں اُسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اُس کی بیوی پڑھنا نہیں جانتی اور اعلان کے الفاظ اس کے لئے سفید کاغذ پر بجز کالے داغوں کے اور کوئی معنی نہیں رکھتے۔

جس وقت "ادبِ لطیف" کا وہ پرچہ جس کے انتظار میں یوسف نے دن رات ایک کر دیئے تھے آیا، وہ ڈاکخانہ ہی میں موجود تھا۔ آہ اُس کی وہ عریاں بے تابی جو کسی شاعر کے جذبات کو بھڑکا دینے کے لئے کافی تھی! یکدم اس کا ہاتھ پرچہ پر پڑا جیسے منڈلاتی ہوئی چیل کا پنجہ گوشت کے لوتھڑے پر پڑتا ہے۔

اُس نے پرچے کو اپنی جگہ جگہ ادھڑی ہوئی شیروانی کے نیچے چھپا لیا۔ ہاں یہ بے بہا خزانہ شیروانی ہی کی آغوش کے سپرد کیا جا سکتا تھا جو باوجود کامل بیس برساتیں دیکھنے کے آج بھی رسمِ مروت و رفاقت ادا کر رہی تھی۔

تیز قدم اٹھاتا ہوا وہ مکان تک پہنچا۔ آنگن میں آکر اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ شام ہو گئی تھی۔ چاندنی کی روشنی میں اُس نے پرچہ نکال کر مضامین کی فہرست دیکھی۔

جذباتِ دل	حضرتِ اختر الہ آبادی	۱۳

وہ ہفت اقلیم کی سلطنت کا مالک تھا اور منزلِ مقصود اُس کے زیرِ قدم "چراغ لاؤ۔ چراغ لاؤ" اُس نے زور سے کہا اور چاند کی خفیف سی روشنی میں صفحہ ۱۳ اُس کی بھوکی نظروں کو للچا رہا تھا۔

گھر والے اُس کا دیوانہ پن دیکھنے کے لئے ارد گرد جمع ہو گئے۔ صفحہ پر نظریں گاڑ کر اُس نے پڑھنا شروع کیا۔ لیکن جوں جوں اُس کی نظریں سطروں کے زینے کو طے کرتی گئیں، اُس کے چہرے کی بشاشت اور سرخی رُوپوش ہوتی گئی جس طرح ناٹک کا کوئی دلفریب منظر آہستہ آہستہ نظروں سے پنہاں ہو جاتا ہے، جس طرح ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں بڑھتی

ہوئی تاریکی کی وسعت میں گم ہوجاتی ہیں اسی طرح مضمون ختم ہوتے ہوتے اُس کی مسرت، امید و لولہ سب ہی رخصت ہو گئے۔ اُس کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہوگئیں۔

"افسوس۔ صد ہزار افسوس" اُس نے دل ہی دل میں کہا "یہ ہیں ہمارے زمانہ کے ادیب جلیل۔ یہ ہیں وہ جن پر دنیائے ادب ناز کرتی ہے"! اور ساتھ ہی اُس نے "ادبِ لطیف" کے پرچہ کو جھنجھلا کر دور پھینک دیا۔ "لفاظی محض لفاظی" اُس نے آسمان کی جانب آتش بار نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا "جسم بغیر روح، لفظ بغیر خیال، پھول بغیر خوشبو دل بلا جذبہ۔ یہ سب مضمون نگار ترقی کی بجائے تنزل کے راستہ پر بھٹک گئے ہیں اور ذوقِ ادب رکھنے والے بھی ان کے ساتھ ساتھ ہیچ و پیش چلے جا رہے ہیں سراب کے چشم فریب منظر نے ان کی آنکھیں چندھیا دی ہیں اور یہ حقیقت کے ابلتے ہوئے چشمے سے کوسوں دور ہیں۔ اصلیت کی عمیق گہرائیوں تک ان جذبات نویسوں کی پہنچ نہیں ہوسکتی سطح پر ہی جو سیپ گھونگے ہاتھ آگئے ہیں انہیں پر نازاں ہیں، اصلی موتیوں سے بے خبر......"

اور اب وہ پھر خاموش ہوگیا۔ سامنے رکھا ہوا چراغ ٹمٹما ٹمٹما کر تاریکی سے عہدہ برا ہونے کی کوشش کر رہا تھا اُس نے انگلی سے اس کا گل جھاڑا اور ایک عجیب اندازِ بے خیالی سے اس کی لَو کی جھلملاہٹ کو دیکھنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی نگاہیں اِس ارتعاشِ نور میں جذب ہوکر رہ گئی ہیں۔

بچوں نے عمر بھر میں یوسف کو اتنا غضبناک کبھی نہ دیکھا تھا۔ غریب سہم کر ادھر اُدھر بھاگ گئے۔ سب سے چھوٹا بچہ ایک چیخ مار کر ماں سے چمٹ گیا۔ حمیدہ نے بلا حرکتِ ارادی اُسے سینہ سے لگا لیا مگر خاوند کے چہرے پر سے نظریں نہ اُٹھائیں۔ دفعتہً تیر کے مانند ایک خیال حمیدہ کے دل و جگر کو چیرتا ہوا نکل گیا۔ کیا واقعی محلہ والوں کے قول کے مطابق یوسف پاگل ہوگیا ہے؟ اور بے ساختہ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں ان آبدار موتیوں کو حمیدہ نے بچے کی نظریں بچاتے ہوئے مٹھی کی پشت پر لے لیا اور انتہائی ضبط و ہمت سے کام لے کر شوہر کے قریب گئی اور اُس کا شانہ ہلا کر کہنے لگی "کھانا تو کھا لیتے"!

حمیدہ کی التجا اُن کانوں سے ٹکرائی جن کی قوتِ سماعت جا چکی تھی۔ البتہ اُس کے ہاتھ کے مس سے وہ چونکا اور مجنونانہ حالت میں بولا۔

"ہیں۔ میں ایک جاہل شخص ہوں۔ بے شک مجھے اس گاؤں کے ابتدائی مدرسہ کے علاوہ اور کوئی دوسری تعلیم نصیب نہیں ہوئی۔ مگر میں ایک دل رکھتا ہوں اور اُس میں جذبات، ایک سر رکھتا ہوں اور اُس میں سودا، ایک دماغ رکھتا ہوں اور اُس میں تخیل اور اِن خشک ادیبوں سے بدرجہا بہتر۔ کاش گویائی میرے پروازِ تخیل کا ساتھ دیتی، میرے جذبات

کی ترجمان ہوتی اور دل آویزی کے ساتھ انہیں صفحاتِ کاغذ پر ترتیب دے سکتی۔ اُس وقت میں جذباتِ دل لکھتا اور یقیناً دنیائے ادب میں کھلبلی ڈال دیتا۔ مگر میں مجبور ہوں فطرت کے اس عمیق راز سے، قدرت کی اس ستم ظریفی سے کہ جن کے دل جذبات سے معمور ہیں اُن کے لبوں پر خاموشی کی مُہر ثبت ہے، مگر جن کے دل و دماغ ظرفِ تہی کی طرح خالی ہیں اور جو فطرت کے اس گراں قدر عطیہ سے یکسر محروم ہیں۔ ان کی زبان میں گویائی ہے سلاست ہے روانی ہے اور وہ ایک دلکش اندازِ بیان پر قادر ہیں...... لغویات کو حسین لفظوں کا لباس پہنا دینا ان کے ادبی کمال کی انتہا ہے اور اسی روش پر خلق کا مدار ہے۔ لفظوں کی بھول بھلیاں میں پھنس کر دنیا اس حقیقت سے غافل ہو چلی ہے کہ دنیا میں کچھ اور بھی چیزیں ہیں جو قدر کی نگاہوں سے دیکھے جانے کے قابل ہیں...... ہاں ہاں تم شاہد رہو اس بات کی، کہ اگر ایک شخص بھی ایسا پیدا ہوا جو دل کے جذبات کو لفظی شکنجوں میں گرفتار کرنے کے قابل ہو گیا تو اُس شخص کو ادبی دنیا میں حیاتِ دائمی نصیب ہو گی۔ وہی قابلِ قدر ادیب ہو گا۔ شہرت کی دیوی اُس کے آگے سرِ نیاز خم کرے گی اور دنیا اُس کا لوہا مانے گی...... اور یہ...... یہ کیا ہے...... یہ اُس تعلیم یافتہ شخص کی جس کے پڑھنے کے لئے یہ مضامین لکھے گئے ہیں صریح توہین ہے۔ یہ فنا ہو جانے والی عبارتیں ہیں۔ یہ ادب نہیں ہے۔ ادب کی نقل ہے۔ دیکھو دیکھو تمہیں بتاتا کہ یہ مضمون اس قابل بھی ہے کہ اس کے لئے کوئی روز ڈاک گھر دوڑے؟ اور اتنا کہتے کہتے اُس نے "ادبِ لطیف" کے پرچہ کو پھر اُٹھا لیا۔ تیرہواں صفحہ کھولنا چاہتا تھا مگر کھولا تو یوسف کی نظر ایک نئے ہی صفحہ پر پڑی۔

یہاں جلی قلم سے ایک دوسرا اعلان چھپا تھا۔ اُس کی توجہ فطرتاً اعلان کی طرف مائل ہو گئی اور بیوی کو مضمون سنانے کی خواہش جاتی رہی۔ وہ کچھ دیر تک غور سے اعلان کو دیکھتا رہا اور پھر ایک نفرت آمیز قہقہہ کے بعد جس میں غم و غصہ کا عنصر بھی شامل تھا، اُس نے کہا "یہ دیکھو!" اور پھر بلند آواز سے اعلان کو پڑھا۔

"پانچ سو روپے کا انعام، سب سے اچھے افسانے کے لئے"

"یہ دوسری ستم ظریفی ہے، پھر چند دنوں کے بعد کسی رذیل نویس کو پانچ سو روپے کی گراں قدر رقم دے کر، اس کی شہرت کا ڈنکا پیٹ دیں گے اور شہر سے دور دیہات کے کسی خلوت نشین شائقِ ادب کے دل کو میری طرح پاش پاش کر دیں گے اور انہیں خبر بھی نہ ہو گی۔ افسوس۔ افسوس!!" اور پھر اُس نے اپنی پیشانی پر زور زور سے ہاتھ مارا "کاش۔ کاش مجھ میں یہ قوت پیدا ہو جاتی۔ میں دنیا کو ایک بڑی ناامیدی سے بچا لیتا......"

وہ پھر خاموش ہو گیا اُس کے چہرے پر ایک رنگ آنے اور ایک رنگ جانے لگا۔ پیشانی پر گہری گہری جھریاں

پڑ گئیں جن کی درزوں میں سے پسینہ کی ننھی ننھی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ اور پھر اُس نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں خواہ کچھ ہو، میں لکھوں گا۔ اس لئے نہیں کہ مجھے انعام کا لالچ ہے، نہ اس لئے کہ میں شہرت کا بھوکا ہوں، بلکہ اس لئے اور صرف اس لئے کہ میں دنیا کو ایک بڑی غلط فہمی سے بچا لوں۔ میں اس حقیقت کو بے نقاب کر دینا چاہتا ہوں کہ لفاظی اور چیز ہے اور جذبات کی مصوری اور چیز۔"

"میں جاہل ہوں، بلا سے۔ میری زبان شگفتہ نہیں، نہ ہو۔ بیان میں تسلسل نہیں، نہ سہی۔ قادرِ مطلق نے ہر کس و ناکس کے دل میں جذبات پیدا کئے ہیں۔ یہ صرف شہر والوں کی، اونچی حویلی کے مالکوں کی، بڑے بڑے عالموں فاضلوں کی میراث نہیں ہے۔ میں ان عالموں سے ان سکانِ شہر سے بہ ہمہ وجوہ بہتر ہوں کہ میں نے علم پڑھ کر علم کو پامال نہیں کیا۔ میں دنیا والوں کی دلشکن ایجاداتِ صرف و نحو، قیودِ انشا پردازی، ترتیبِ خیال، بندشِ الفاظ سے بالکل آزاد ہوں کون نہیں جانتا کہ یہ قیود انسان کے دل کو مردہ کر دیتی ہیں۔ وہ جذبہ ہی کیا جو ساون بھادوں کی جھڑی کی طرح غم آشنا آنکھوں کے آنسوؤں کی طرح آزادانہ طور پر ظاہر نہ ہو سکے۔ وہ خیالات ہی کیا جن کے لئے گوشۂ دماغ میں فرسودہ و غیر موزون الفاظ کی تلاش کی جائے۔ جن کے لئے لُغت کی ورق گردانی کرنی پڑے، جن کے لئے اور ایسی ایسی ناہموار وادیوں اور سنگلاخ میدانوں کی صحرانوردی کی جائے۔ میرا یقین ہے کہ ہر دلآویز خیال اپنی جداگانہ شکل و صورت رکھتا ہے اور اپنی ادا کے لئے خاص اندازِ بیان، ورنہ یوں بظاہر شیریں لیکن غیر موزون ترکیبیں کانوں کو خوشگوار معلوم ہوں تو ہوں روح کو فرحت نہیں پہنچا سکتیں۔"

سالہا سال کے خفتہ آتش فشاں دل کے اندر بھڑک اُٹھے، وہ آتش فشاں جن کے شعلے اُس کے دل و دماغ میں ایک زلزلہ برپا کئے رکھتے اگر وہ اُن کو نکالنے کی، انہیں ٹھنڈا کرنے کی تدبیریں نہ کرتا۔ پس وہ تُل گیا، ناممکن کو ممکن کر دکھانے کے لئے، برسوں کی روحانی تشنگی کو دور کرنے کے لئے ـــــ اپنا افسانۂ دل لکھنے کے لئے وہ تُل گیا۔

اُس نے لکھنا شروع کیا۔ دل کے اندر ایک تلاطم برپا ہو گیا۔ صدیوں کے بھولے بسرے واقعات جن میں اُس کی روح نے حصہ لیا تھا آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگے۔ دل کی نامعلوم گہرائیوں سے بخارات اٹھ اٹھ کر دماغ کی آخری سطح پر آ گئے اور نکل جانے کے لئے بیتاب ہو گئے جس طرح ابلتے ہوئے پانی کا ہر بلبلہ سطح پر آ کر پھوٹ جانے کے لئے بیتاب ہو جاتا ہے۔ جذبات کا ہجوم اور اُن کی مصوری کے لئے ایک لرزتا ہوا ہاتھ! ایک جنگ تھی جس کا نظارہ صرف عالمِ تخیل میں ہو سکتا ہے!

گھنٹوں کی جان توڑ کاوش کے بعد وہ صرف چند سطریں لکھنے میں کامیاب ہو سکا مگر جس طرح کسی مشین کا انجن

کچھ دیر آہستہ آہستہ چلنے کے بعد تیز ہو جاتا ہے اسی طرح اُس کے قلم میں بھی روانی آ گئی۔ اُس کی داستانِ غم بطن
کے نامعلوم چشمہ سے ابل ابل کر مترنم الفاظ کے دریا میں بہنے لگی ـــــ الفاظ جن میں شباب کی امنگیں تھیں، شراب
کی مدہوشی تھی اور شعلوں لپٹ تھی + محبت زندگی کی سب سے زبردست قوت ہے عشق کے لطیف ترین جذبات
جو ایک عالمِ خواب میں پڑے ہوئے تھے یک لخت جاگ اُٹھے اور ربابِ ہستی سے دلکش و شیریں نغموں کا ایک دریا چلنے لگا۔

رات آہستہ آہستہ ماضی کے بحرِ بے کراں میں ڈوب گئی، انجم کی فوج نے کئی رخ بدلے لیکن یوسف لکھتا گیا
ـــــ خاموش اور خود فراموش اُس شمع کے مانند جو اُس کے جذباتِ دلی کی تنہا رازداں تھی۔ اُس کے قلم میں قلمِ
ازلی کا زور تھا، جو لکھتی ہے اور لکھ کر بڑھتی چلی جاتی ہے اور جس کی عبارت کا ایک حرف بھی زاہدِ شب زندہ دار
کی عبادت، یا خوفِ جزا سے رونے والی آنکھوں کے آنسوؤں سے نہیں مٹایا جا سکتا۔

صبح ہو گئی، سورج کی کرنوں کے پہلے سیلاب سے کمرہ دھل گیا۔ اُس وقت اُس کا لکھنا بند ہوا۔ اُس نے
رات بھر محنت کی تھی مگر اُس کے جسم میں ذرہ برابر بھی تکان نہ تھی۔ اس کی رگ رگ میں ایک آسمانی پھرتی سرایت کئے
ہوئے تھی، وہ اب بھی تازہ دم تھا!

اُس نے اپنے افسانے کی کوئی صاف کاپی نہ بنائی۔ اور نہ اُسے دوبارہ پڑھ کر دیکھا۔ بس جیسے کا تیسا لپیٹ کر
ڈاک میں چھوڑ آیا۔

مشہور و معروف ادیب طلعت کمال جو اس فسانہ نگاری کے مقابلہ کے لئے منصف قرار دیئے گئے تھے
دو چار روز سے نہایت پریشان تھے۔ کوئی ڈاک ایسی نہ ہوتی جس میں مختلف مقامات سے سو پچاس افسانوں کی
رجسٹریاں نہ ہوتیں۔ رجسٹری شدہ پیکٹوں کے رسیدوں پر ہی دستخط کرتے کرتے وہ بیزار ہو گئے تھے، چہ جائے کہ ان بے
شمار "ادبی جواہر ریزوں" کی جانچ پڑتال اور ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتے۔ یہ ایک ایسا سخت مرحلہ تھا جس کے
تصور سے اُن کی روح کانپ اٹھتی تھی اور وہ بے اختیار پکار اٹھتے تھے

ما بوئے مست و ساقی پُر دہد پیمانہ را

آج جو کئی روز کے بعد ٹوٹے پھوٹے حرفوں میں ایک غیر رجسٹری شدہ پیکٹ ملا تو انہیں قدرے خوشی ہوئی۔
کوئی خانگی ڈاک سمجھ کر پہلے اسی کو کھولا۔ مگر یہ کیا؟ ٹیڑھے سیدھے حروف، پُر پیچ سطریں، بدنما روشنائی اور کاغذ پر بیسیوں
جگہ داغ! آخر یہ ہے کیا بلا!

پڑھنے لگے تو مقابلہ والے افسانہ کی سرخی اور پہلے ہی لفظ کا املا غلط۔ "افوہ آپ کو بھی مضمون نگاری کا شوق

چرایا اور پانچ سو روپیہ جیتنے کی ہوس ہوئی"۔ طلعت کمال نے افسانہ ردی کی ٹوکری میں پھینکتے ہوئے کہا۔
شام کو طلعت کمال صاحب کے ایک عزیز دوست اُن کے ہاں آئے اور کہنے لگے "کہو بھئی، اس انبار میں کوئی پڑھنے کے قابل چیز بھی ہے؟"
طلعت کو صبح والا مضمون یاد آگیا، فوراً ٹوکری سے نکال کر دوست کے حوالے کیا اور ازراہِ تمسخر بولے "ہاں ہاں کیوں نہیں، ملاحظہ فرمائیے مگر شرط یہ ہے کہ پُورا پڑھئے"۔
دوست کچھ سمجھے کچھ نہ سمجھے مگر انہوں نے مسکراتے ہوئے کاغذات طلعت سے لے لئے نظر پڑتے ہی اپنے دوست کے مزاحیہ جملے کا مطلب بخوبی سمجھ گئے مگر کہنے لگے،
"آخر اس بھلے آدمی نے لکھا کیا ہے یہ بھی تو دیکھوں"۔
اٹک اٹک کر دو ایک سطریں پڑھیں، طلعت کا دھیان دوسری طرف تھا، مگر جب چند فقرے ان کے کانوں میں پڑے تو وہ چونک کر بولے "کیا کیا؟ ذرا پھر پڑھئے نا؟"
اُن فقرات کو انہوں نے دوبارہ پڑھنا شروع کیا، دونوں کی آنکھیں فرطِ انبساط سے چمک اٹھیں "اِس لکھت کے اندر ایسے الفاظ" انہوں نے جھک کر پرچے کو دیکھتے ہوئے کہا "ہاں، اور آگئے"۔
اور پھر یوسف کا ہر فقرہ ہر لفظ ہر حرف پڑھا گیا۔ آہ کیا الفاظ تھے اور ان کے اندر کیا کیا جذبات پوشیدہ تھے۔ ہر حرف ایک تیر تھا جگر دوز، ہر لفظ ایک شعلہ تھا دل افروز، وہ پُرکیف جملے اور اس پر اندازِ بیان کی سحر آفرینی! گودڑیوں کے اندر لعل، خس و خاشاک کے انبار میں موتیوں کا خزانہ" طلعت کمال نے نیم بے خودی کے عالم میں کہا "یہ الہامی تحریر ہے ان الفاظ میں غیبی آواز کی گونج ہے جس کو انسانی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ .... مجھے اسے پھر پڑھ لینے دو۔ اس نے میری روح کو تڑپا دیا ہے، میرے جسم میں ایک نئی گرمی پیدا کر دی ہے ......"

ہر چھوٹے بڑے پرچہ میں یوسف کے الہامی افسانے کی دھوم مچ گئی، وہ ہر جگہ جلی قلم اور سنہری حروف میں چھاپا گیا۔ یوسف کے نام پانچ سو روپیہ کا انعام بھیجا گیا، مگر نہ تو ادبی دنیا میں وہ اپنی شہرت سُن سکا، اور نہ اس گرانقدر رقم سے اپنے ہاتھ سینک سکا۔ دنیا نے ہمیشہ اپنے بہترین افراد کی ناقدر شناسی میں ناقابلِ معافی تاخیر سے کام لیا ہے پھر یوسف کیوں اس کلیہ سے مستثنیٰ ہوتا؟ فضائے ادب میں اُس کا نام مہر و ماہ بن کر چمکا مگر کب؟ اُس وقت جب خود اُس کی شمعِ حیات گل ہو چکی تھی۔ اُس کی شہرت کا چمن بہار کی شادابیوں سے ہم آغوش

ہوا۔ مگر آہ کس وقت؟ اُس وقت جب کہ خود اُس کے گلزارِ ہستی کا پتہ پتہ تاراجِ خزاں ہو چکا تھا! اُس کی زندگی شہاب کی اُس نورانی کشتی کے مانند تھی جو تاریکی کے بسیط سمندر میں یکایک نمودار ہوتی ہے اور اپنی ظلمت افروز تجلّی سے فضائے عالم کو منور کرنے کے بعد آنِ واحد میں پھر تاریکی کی بے پایاں گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہے یہ واقعہ ہے اور دل گداز حقیقت کہ یوسف، وہ یوسف کہ جس نے اپنی فوق الفطرت قابلیت سے دنیائے ادب میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا تھا اپنے الہامی افسانے کی تحریر کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد اس معمورۂ آب و گل کو خیرباد کہہ چکا تھا۔

علمی حلقوں میں یہ دلخراش خبر آگ کی طرح پھیلی اور ہر ایک نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس مرگِ ناگہاں کی تاویلیں کیں۔ ڈاکٹروں نے اُس کے مرنے کا سبب یہ ظاہر کیا کہ اُس کے دل میں ناسور ہو گیا تھا جس سے خون رسنے لگا تھا۔ چنانچہ اُس کی موت خون کے ضائع ہو جانے کے باعث واقع ہوئی۔

مگر خشک ڈاکٹروں کو کیا خبر تھی کہ اُس کے خون نے چمنستانِ ادب میں کیا کیا لالہ کاریاں کی تھیں۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ اپنے خون کا ہر قطرہ اُس نے دنیا والوں کی آنکھیں کھولنے میں صرف کیا تھا، اُس نے اپنا دلگداز افسانہ خونِ دل سے لکھا تھا!

سیّد ممتاز اشرف قادری

میری بیڑیاں کٹ گئیں۔ میرے قرض ادا ہو گئے میرا دروازہ کھل گیا۔ اب میں ہر جگہ جاتا ہوں +

وہ اپنے کونے میں دبک کر بیٹھے ہیں اور اپنی زرد ساعتوں کا جال بُنے جاتے ہیں۔ وہ خاک پر بیٹھے ہوئے اپنے سکے گنتے ہیں اور مجھے کہتے ہیں کہ واپس آ جا +

لیکن میری تلوار تیز ہو چکی ہے میں نے اپنی زرہ پہن لی ہے اور میرا گھوڑا گرمِ جولاں ہونے کا متمنّی ہے بس اب میں اپنی سلطنت کو جیت لوں گا +

گلچیں

شامِ شباب — کچھ چند آنسو

دُور سے دردِ محبت میں نہ تڑپاؤ مجھے	 پاس آ کر کسی تدبیر سے سمجھاؤ مجھے

مجھ کو اس حال کی ایک ایک گھڑی ہے بھاری	 تم کو اس رنج میں لازم ہے مری دلداری

فرصتِ پرسشِ احوال نہیں اب بھی اگر	 یہی کہہ دو کہ ہے مجھ کو تری حالت کی خبر

اک طرف درد کا طاری ہے دل و جاں پہ سرور	 اک طرف فطرتِ انساں ہے مہیا بہ قصور

تم جو چاہو تو بڑھا دو ابھی ہمت میری	 موت کو ضد ہے کہ مٹ جائے یہ لذت میری

مار کر تم نے کیا تھا کرمِ خاص عیاں	 اب جلا لو تو یہ ہے اُس سے گراں تر احساں

دولتِ یاس بہم کی ہے بڑی مشکل سے	 اِس بھرے گھر کو میں لٹواؤں بھلا کس دل سے

وہ بھی دن تھے کہ مجھے موت کی خواہش تھی مدام	 اب تمنا ہے کہ اس زیست کو حاصل ہو دوام

کچھ تو ساماں سے پئے بیمارِ الم فرماؤ	 اذن دے دو مرے جینے کا کرم فرماؤ

میں نے مانا کہ مسرت تو ہے اک وہمِ حیات	 لذتِ غم کو تو بخشو مری دنیا میں ثبات

بارِ ہستی تھا غمِ آغازِ محبت میں مگر	 مجھ کو اے کاش اُسی عہد میں ہوتی یہ خبر

کہ جو آغازِ محبت ہے وہی ہے انجام	 اور اسی بار کا ہے راحتِ جاں بھی اک نام

آہ کس وقت کیا تم نے حقیقت سے دوچار	 سازِ تدبیر کا جب ٹوٹ چکا ہے ہر تار

ہائے کب مجھ پہ کھلے معنیِ عنوانِ حیات	 جب کہ بجھنے کو ہوئی مشعلِ سوزانِ حیات

اے محبت ترے انداز و ادا پر قرباں
ترے اس غمکدۂ دل پہ ہیں کیا کیا احساں

محمود اکبرآبادی

ہیرو

جب میں میڈیکل کالج کلکتہ سے ڈاکٹری کا آخری امتحان پاس کرکے اپنے گاؤں نرسنگھ پور میں آیا تو اس وقت میری عمر بائیس سال کی تھی۔ چونکہ موروثی جائداد بہت کافی تھی اس لئے نوکری کی مجھے ضرورت محسوس نہ ہوئی بلکہ میں نے ارادہ کیا کہ اپنے گاؤں ہی میں ایک چھوٹا سا مطب کھول کر غریبوں کا مفت علاج کیا کروں تاکہ میری طبیعت بہل جائے۔

ڈاکٹر بننے کا مجھے کوئی خاص شوق نہ تھا ہاں اس کے بجائے میری دلی خواہش تھی کہ میں ایک "ناول کا ہیرو" بن جاؤں۔ لڑکپن ہی سے ناول پڑھنے کا مجھے بہت شوق تھا اور شاید یہ اسی کا اثر تھا کہ ہیرو بننے کے لئے میں ہمیشہ بے تاب رہتا تھا۔ لیکن جب کبھی میں اپنی شکل دیکھتا تو میرا دل گواہی دیتا کہ مجھ میں ہیرو بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ مگر خدا کی شان مجھے ہیرو بننے کا بہت جلد موقع مل گیا۔

مطب کے لئے دوائیں خریدنے کلکتہ گیا اور وہاں اپنے ایک دوست کے یہاں ٹھہرا۔ خیال تھا کہ دو چار دن کے بعد گھر واپس ہو جاؤں گا۔ صبح کے وقت اشنان کرنا میرا معمول تھا۔ چنانچہ کلکتہ میں بھی علی الصباح اٹھتا اور کندھے پر انگوچھا اور دھوتی ڈال کر گنگا نہانے چلا جاتا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ جب میں نہا کر گھاٹ سے واپس ہونے کی تیاری کر رہا تھا تو ایک بابو صاحب نے میرے قریب آکر پوچھا "کیا تم مہاراج ہو؟"

میرے برہمن ہونے میں تو کوئی شک نہ تھا لیکن اس سے پیشتر مہاراج کے خطاب سے مخاطب کئے جانے کا مجھے کبھی فخر حاصل نہ ہوا تھا۔ میں نے سوچا شاید بابو صاحب نے غلطی سے مجھے مخاطب کیا ہے۔ مجھے خاموش دیکھ کر بابو صاحب نے پھر کہا "عجیب آدمی ہو جواب کیوں نہیں دیتے، کیا تم مہاراج نہیں ہو؟"

اب مجھے خیال آیا کہ شاید میری صورت "ہیرو" کی بجائے کسی "رسوئیا" سے ملتی جلتی ہے اور بابو صاحب "رسوئیا" کی تلاش میں ہیں۔ میری زبان سے نکل گیا ــــــ "جی ہاں"

"کہیں نوکر ہو؟"

"جی نہیں"

"نوکری کرو گے؟"

"بڑی خوشی سے"
"کھانا پکانا اچھی طرح جانتے ہو؟"
"جی ہاں یہ تو میری ذات کا پیشہ ہے اس کو بھلا میں نہ جانوں گا"
"گھر کہاں ہے؟"
"جبیشور"
"نام؟"
"ہری دھن مکھوپادیہ"
"کتنے دنوں سے کلکتہ میں ہو؟"
"مجھے یہاں آئے چار پانچ دن ہوئے ہیں"
"نوکری کی تلاش میں آئے ہو گے؟"
"اور نہیں تو کیا ناٹک دیکھنے آیا ہوں"
بابو صاحب کچھ بگڑ کر بولے "تم کو تو بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں ہے۔ بڑے گستاخ معلوم ہوتے ہو بھلے آدمیوں سے کیا اسی طرح باتیں کی جاتی ہیں؟"
میں دل ہی دل میں بہت خوش ہوا میں نے سوچا ہیرو بننے کا یہی موقع ہے رسوئیا بن کر ان کے گھر دو چار روز کام کروں گا تو کچھ نہ کچھ تجربہ ہو جائے گا۔ میں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا "حضور دیہات کا رہنے والا ہوں کچھ جانتا نہیں معاف کیجئے گا"
بابو صاحب نرم ہو گئے اور بولے "تو کیا تم سچ مچ برہمن ہو یا یوں ہی خواہ مخواہ بن گئے ہو۔ آج کل گلے میں جنیئو ڈال کر بہت سے لوگ برہمن بن رہے ہیں"
میں نے سوچا "ہائے کیا میری صورت سے لوگوں کو بھنگی یا چمار ہونے کا شبہ ہوتا ہے" میں نے مسکرا کر جواب دیا "حضور میں آپ کو دھوکا نہیں دے سکتا"
اس کے بعد بابو صاحب نے مجھ سے گائتری منتر پوچھا اتفاق سے مجھے یہ منتر بخوبی یاد تھا۔ اس سے بابو صاحب کا اطمینان ہو گیا اور وہ بولے "کیا تنخواہ لو گے؟"
میرے کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں جو برہمن کھانا پکاتا تھا وہ پانچ روپے ماہوار اور خوراک پر نوکر تھا۔ میں

نے وہی کہہ دیا۔ بابو صاحب نے کہا۔ "میرے یہاں تو چار روپے اور خوراک ملے گی۔ اس کے علاوہ سال میں دو دھوتیاں اور دو کرتے بھی دیا کروں گا۔ کہو منظور ہے"

میں نے سر کھجلا کر کہا۔ مالک چار روپے میں کیسے گذر ہو گا۔ بہت بڑا کنبہ ہے ان کو کیسے کھلاؤں گا"۔

"تمہارے کنبہ میں کتنے لوگ ہیں"۔

"ماں باپ اور بھائی ۔۔۔۔۔۔"

بابو صاحب نے قطع کلام کر کے کہا۔ "رسوئیا کی نوکری کر کے ماں باپ اور بھائی کو کیسے کھلاؤ گے ؟ میں سو روپے ماہوار پاتا ہوں لیکن بڑی مشکل سے گذر ہوتا ہے ۔۔۔۔۔ میرے خیال میں تو ایک روپیہ تم اپنے پاس رکھنا اور تین روپے اپنی استری کو بھیج دینا"۔

"مالک میرا بیاہ ابھی نہیں ہوا"۔

"اب تک کیوں نہیں ہوا؟ کیا کوئی "دوش" (نقص) ہے؟"

"دوش ۔۔۔۔۔ غریبی کا دوش ہے۔ ایسے غریب کو اپنی لڑکی کون دے گا"۔

"تم نے بہت عقلمندی کی جو اب تک بیاہ نہیں کیا۔ صاحب لوگ بھی جب تک خوب کمانے نہیں لگتے بیاہ نہیں کرتے۔ افسوس ہے کہ تم انگریزی نہیں جانتے۔ ورنہ کتابوں میں ان کا حال پڑھتے۔ میرے دفتر ہی میں ایک صاحب ہیں جن کی چالیس برس کی عمر ہو گی، ایک ہزار تنخواہ پاتے ہیں، لیکن انہوں نے اب تک بیاہ نہیں کیا"۔

میں چار روپے پر راضی ہو گیا۔ بابو جی نے کہا اگر تم کام اچھا کرو گے تو سال بھر کے بعد تنخواہ بڑھا دوں گا اسی وقت میرے گھر پر چل کر بھوجن تیار کرو، میرا رسوئیا بھاگ گیا ہے، گھر والی بیمار ہے سخت تکلیف کا سامنا ہے"۔

۲

اس طرح سے رسوئیا بن کر ایک بابو کے ہمراہ چل پڑا۔ سوچنے لگا کہ "بڑی مشکل سے قسمت آزمائی کا موقع ملا ہے، دیکھوں کیا تجربہ حاصل ہوتا ہے"۔

بابو جی کا نام کالی کانت رائے تھا۔ بالی گنج میں رہا کرتے تھے ان کے گھر میں جا کر دیکھا تو چھوٹے سے آنگن میں آم کی گٹھلیاں، بھات، ترکاری اور پتلون کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ ایک کونے میں پانی کا نل لگا تھا جس میں بانس کا ایک پھٹا ہوا ٹکڑا کپڑے سے بندھا تھا اور اس سے پانی بہ کر ایک چھوٹے سے حوض میں گر رہا تھا

بابو صاحب نے آنگن میں کھڑے ہو کر پکارا۔ "پری یہاں آ"

آواز سُن کر کوٹھے کے چھجّے پر ایک لڑکی آ کر کھڑی ہو گئی اور بولی "بابا چلّاؤ نہیں، ماں سو رہی ہیں"

میں نے اس لڑکی کی طرف دیکھا ——— رومیو اور جولیٹ کا نظارہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا ——— بکھرے ہوئے بالوں والی خوبصورت جولیٹ نے کوٹھے پر سے دیکھا کہ کندھے پر انگوچھا ڈالے اور ہاتھ میں بھیگی دھوتی لئے حسرت نصیب رومیو رسوئیا کا بھیس بدلے کھڑا ہے ——— جولیٹ کی عمر چودہ برس کی تھی، میری جولیٹ کی بھی اتنی ہی عمر ہوگی

کالی کانت بابو نے اس کو دیکھ کر پھر کہا "پری نیچے آجا"

"پری" "پریتما" یا "پری بلا" ایک ہیروئن کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی نام نہیں ہو سکتا۔

پاؤں کے لچھّوں سے ایک عجیب پیاری صدا نکلی اور وہ چھم چھم کرتی ہوئی نیچے اتر آئی۔ بابو صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے اُس سے کہا "رسوئیا آگیا ہے اس کو سب کام سمجھا دو"

لڑکی میرے وہم و خیال سے بھی زیادہ خوبصورت تھی میں سوچنے لگا "کیا اس کے نازک دل میں ایک رسوئیا جگہ پا سکے گا؟"

میرے خیالات کا سلسلہ بابو جی نے یہ کہہ کر منقطع کر دیا۔ آٹھ بج چکے ہیں، مجھے ½ ۹ بجے دفتر جانا ہے کیا اِس سے پہلے کھانا پکا لوگے؟"

میں نے کہا "مالک کوشش کروں گا"

بابو جی نے کہا "تھوڑا سا بھات اور دال پکا لینا میں بازار سے مچھلی لینے جا رہا ہوں گھر میں ترکاری موجود ہے"

بابو جی کے جانے کے بعد پری نے مجھے رسوئی گھر میں پہنچا دیا۔ میں نے اندر جا کر دیکھا تو اس وقت تک آگ بھی نہ جلی تھی میں نے کہا "مصرانی کہاں ہے ذرا چولہے میں آگ جلا دے؟"

پری نے جواب دیا "مصرانی ہمارے یہاں نہیں ہے ایک نوکرانی تھی وہ بھی ایک مہینہ ہوا کام چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہے۔ ماں کہتی ہے کہ اب نوکرانی رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں ہی سب کام کرتی ہوں۔ لاؤ آگ جلا دوں"

"نہیں، نہیں، تم تکلیف نہ کرو، میں خود آگ جلائے لیتا ہوں" یہ کہہ کر میں اس تھوڑے سے کوئلے سے جو چولہے کے پاس پڑا تھا آگ سلگانے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ کام کتنا مشکل ہے یہ مجھے پہلے سے معلوم نہ تھا۔ پری کھڑی میری حالت پر مسکراتی رہی، آخر مجبور ہو کر اُس نے کہا "کہیں اس طرح سے کوئلے میں آگ لگ سکتی ہے"

میں نے بڑی حسرت سے کہا "تو اچھا تمہیں بتا دو کہ میں کیا ترکیب کروں"

"اچھا ہٹو، میں خود آگ جلاؤں گی۔ تم مچھلی میں ڈالنے کے لئے آلو کاٹ ڈالو۔"

پری کو اس تکلیف دہ کام میں لگانا مجھے بہت شاق گذرا لیکن مجبور تھا کیونکہ یہ فکر بھی تھا کہ ۹ بجے تک کھانا تیار ہو جانا چاہئے ورنہ بابو جی ناراض ہو گئے۔ پری آگ سلگانے میں لگ گئی اور میں آلو کاٹنے لگا۔

چولہا سلگا کر پری میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور گالوں پر ہاتھ رکھ کر بولی ـــــ "واہ! خوب! یہ کیا؟"

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "کیا بات ہے؟"

"کیا تم مچھلی میں ڈالنے کے لئے آلو کاٹ رہے ہو؟"

"جی ہاں"

"تم تو گول گول آلو کاٹ رہے ہو اس طرح تو ساگ اور ترکاری میں ڈالے جاتے ہیں مچھلی میں ڈالنے کے لئے آلو کے چار ٹکڑے کرنے چاہئیں۔"

میں نے شرمندہ ہو کر کہا "اوہو! بڑی غلطی ہوئی۔"

پری نے کہا "لاؤ میں کاٹوں" میں سرک گیا اور چولہے کی سلگتی آگ پر پنکھا جھلنے لگا۔

پری نے مسکرا کر پوچھا "کھانا پکانا جانتے ہو یا وہ بھی اسی طرح ـــــ"

میں نے کلیجہ تھام کر جواب دیا "بس اسی طرح"

"اسی طرح ـــــ معلوم ہوتا ہے تم نے کبھی اس کام کو نہیں کیا۔"

"جی ہاں"

"پھر نوکری کیوں کی"

میں نے نوکری کیوں کی ـــــ یہ راز کھول دوں تو ابھی سب معاملہ خراب ہو جائے۔ میں خاموش تھا پری نے میری خاموشی کا مطلب کچھ اور ہی سمجھا اُس کا چہرہ اداس ہو گیا وہ ہمدردانہ لہجہ میں بولی۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تم بہت غریب ہو۔"

میں نے نیچی نظر کر کے سر جھکا لیا اور غمگین آواز میں جواب دیا ـــــ "میں تو کچھ نہیں جانتا۔ بابو جی کو جب یہ معلوم ہوگا تو وہ مجھے ضرور نکال دیں گے۔"

ڈھارس دے کر پری نے کہا "میں یہ بات کسی سے نہ کہوں گی، بلکہ تم کو آہستہ آہستہ سب کام سکھا دوں گی۔ تم ہشیار معلوم ہوتے ہو، جلد سیکھ جاؤ گے۔"

"کیا تمہاری ماں کو نہ معلوم ہو جائے گا؟"

"میری ماں دائم المرض ہیں۔ کسی دن سر میں تو کسی دن کہیں اور درد ہی ہوا کرتا ہے، بڑا چڑچڑا مزاج ہے ہر وقت بکتی جھکتی رہتی ہیں، لیکن کوٹھے سے نیچے نہیں اترتیں کیونکہ ان کا دم پھولنے لگتا ہے۔"

"شاید ان کے بکنے جھکنے سے ہی یہاں کوئی رسوئیا نہیں ٹکتا؟"

اس بات سے پربھا کچھ شرمندہ سی ہوگئی میں نے بات ٹالنے کے لئے کہا "تمہارا پورا نام کیا ہے"؟

"پرتیما"

"پرتیما! بڑا پیارا نام ہے۔"

پرتیما نے لاج سے سر نیچا کر لیا۔

"تمہارے کتنے بھائی ہیں؟"

"حقیقی بھائی تو صرف ایک ہے، اس ماں سے دو بھائی اور ایک بہن ہے۔"

اب میں نے سمجھ لیا کہ گھر والی پرتیما کی سوتیلی ماں ہے —— نوکرانی کیوں نہیں رکھی گئی یہ بھی معلوم ہوگیا۔ پرتیما کے لئے میرے دل میں رحم اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوگئے۔ اس عرصہ میں بابو صاحب مچھلی لے کر آگئے اور باہر ہی سے پوچھا "کھانا پکنے میں کیا دیر ہے"؟

میں نے کہا "مالک اب کچھ دیر نہیں ہے"

"ہاں ہاں جلدی ہی ہونی چاہئے۔ سمجھ گئے کہ نہیں؟ زیادہ پھیلاؤ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس وقت صرف دال بھات ہی کھاؤں گا۔ جب میں دفتر چلا جاؤں گا تو پھر اطمینان سے مچھلی بنانا۔" یہ کہہ کر بابوجی اوپر چلے گئے۔

۳

پہلے سوچا تھا کہ دو چار دن رسوئیا کا کام کرکے گھر بھاگ جاؤں گا لیکن ایک مہینہ ہوگیا اور بابوجی کے یہاں سے میرا جانا نہ ہوسکا پرتیما کی محبت کی زنجیر میرے پاؤں میں پڑ گئی۔ پرتیما گو مجھے رسوئیا ہی سمجھتی تھی لیکن میرے ساتھ اس کا برتاؤ بہت شریفانہ تھا۔ پرتیما کچھ لکھ پڑھ بھی سکتی تھی۔ میں نے اسے کئی اچھی اچھی کتابیں لا کر دیں۔ جہاں وہ نہ سمجھتی میں سمجھا دیتا۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ "تم تو بہت تعلیم یافتہ معلوم ہوتے ہو رسوئیا کے بجائے اگر تم کسی اسکول کے ماسٹر ہوتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔"

میں نے کہا "ماسٹری کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں جب تمہاری شادی ہو جائے گی تو میں یہ نوکری چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں گا"

پریتما کی اب تک کہیں شادی نہ ہوئی تھی۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ بابوجی سستا بر ڈھونڈتے تھے اور اس میں ان کو اب تک کامیابی نہ ہوئی تھی۔ مجھے جب سے یہ معلوم ہوا تھا میں نے سوچ لیا تھا کہ ایک دن بابوجی پر اپنا حال ظاہر کرکے شادی کی درخواست کروں گا۔

پریتما کے ساتھ میری محبت بڑھتی جاتی تھی۔ بھادوں کے مہینہ میں ہمارے یہاں بیاہ نہیں ہوتا سوچ رکھا تھا کہ کوآر میں بابوجی سے کہوں گا اور پریتما کو بیاہ کر اپنے گھر لے جاؤں گا۔ کبھی کبھی یہ بھی سوچتا تھا کہ اگر بابوجی نے میری درخواست نامنظور کردی تو میری زندگی تباہ ہو جائے گی۔

بابوجی کے مکان کے قریب ہی میں نے ایک اچھا سا مکان لے رکھا تھا لیکن بابوجی کو یہ حال نہ معلوم تھا۔ رات کو میں اسی مکان میں رہتا تھا ایک دن علی الصباح جب میں اپنے کام پر آیا تو پریتما کو کمبل اوڑھے دیکھا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ رات کو جاڑے سے بخار ہو گیا تھا اور اب بھی سردی لگ رہی ہے۔ دوسرے دن بھی اُس کا یہی حال ہوا۔ پریتما کو بہت کام کرنا پڑتا تھا۔ برتن مانجنا، کپڑے دھونا، بچوں کو کھلانا، غرض کہ اسی طرح کے اس کو بہت سے کام کرنے پڑتے تھے۔ بخار میں آرام نہ ملا تو اس سے اُس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ ایک دن میں نے بابوجی سے کہا ''پری کا جی اچھا نہیں ہے اوپر کے کام کے لئے اگر ایک نوکرانی مل جاتی تو اچھا ہو''

بابوجی نے منہ بنا کر جواب دیا، ''تم تو یہ کہہ کر فرصت پا گئے لیکن تم نے یہ نہ سوچا کہ تھوڑے دن کے لئے یہاں نوکرانی نہیں مل سکتی''

مجھے رنج کے ساتھ ہی بہت غصہ معلوم ہوا میں نے کہا ''اگر آپ حکم دیں تو میں تلاش کروں''

بادلِ ناخواستہ بابوجی نے ''ہاں'' کہا اور اوپر چلے گئے۔ میں نے اُس دن نوکرانی کی بہت تلاش کی لیکن بدقسمتی سے مجھے کہیں نہ ملی۔

ایک مصیبت اور آئی پری سے روٹی نہیں کھائی جاتی تھی، میں نے جب اس سے پوچھا کہ کیا کھانے کو جی چاہتا ہے تو اُس نے جواب دیا ''انار اور انگور'' میں نے بابوجی سے کہا تو انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا ''انار اور انگور بخار میں نقصان کرتے ہیں میں ایسی چیزیں ہرگز نہ منگاؤں گا'' میں خاموش ہو گیا لیکن یہ خیال کرکے بہت رنج ہوا کہ کچھ دن ہوئے بابوجی کے چھوٹے بچے کو بخار آیا تھا تو انہوں نے انار اور انگور کے ڈھیر لگا دیئے تھے۔ دل میں ارادہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو آج شام کو پری کے لئے میں خود کوئی چیز لاؤں گا چنانچہ جب میں شام کو اپنے کام پر آیا تو اپنے ساتھ ایک پٹاری انگور کی کچھ انار اور بسکٹ لیتا آیا۔ لیکن اس دن پری کوٹھے سے نیچے نہ اتری۔ اس کے حقیقی بھائی سوشیل چندر

سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بہت زور کا بخار چڑھا ہے۔ کام کرکے جب گھر واپس ہوا تو ساری رات میں نے تڑپ تڑپ کر گذاردی۔ دوسرے دن میں نے سوشل سے پوچھا "اب تمہاری دیدی کی طبیعت کیسی ہے؟"

دیدی ساری رات پانی پانی چلاتی رہیں، رات بھر نہیں سوئیں، بدن بہت گرم ہے، اس وقت کچھ نیند آگئی ہے۔"

"رات کو اُن کے پاس کون رہا"

"میرے سوا کوئی بھی ان کے پاس نہ تھا۔ میں دیدی کے پاس ہی سویا کرتا ہوں۔"

"تمہاری ماں اور بابوجی دیدی کو دیکھنے نہیں آتے؟"

"بابا شام کو ایک دفعہ دیکھنے آئے تھے۔ بہت رات تک جب دیدی ماں! ماں! کہہ کر چلاتی رہیں تو ماں بھی ایک دفعہ اُٹھ کر آئیں لیکن کمرہ کے باہر سے ہی کھڑی ہو کر بولیں "اتنا شور کیوں مچا رہی ہے، سونے کیوں نہیں دیتی، منہ جلی چپ چاپ پڑی رہ"۔ ماں کی ڈانٹ سن کر دیدی چپ ہوگئیں اور ڈر کے مارے پھر رات بھر پانی نہیں مانگا" میں اوپر کبھی نہیں گیا تھا۔ کوئی کہاں رہتا ہے یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ گھر کی "مالکن" کا کھانا اوپر ہی جاتا تھا لیکن یہ کام پریتما کرتی تھی۔ صرف کل شام کو بابوجی کھانا لے گئے تھے۔

میں نے سوشل سے پوچھا "تمہاری دیدی کہاں سوتی ہے؟"

"سیڑھی کے قریب ہی اُس کا کمرہ ہے۔"

میں نے دل میں ارادہ کرلیا کہ آج جب کام سے فرصت پاؤں گا تو پریتما کو ضرور دیکھنے جاؤں گا سوشل سے کہا "آج تم اسکول نہ جانا۔ تمہاری دیدی بیمار ہیں انہیں کے پاس رہنا۔"

جب تک پریتما بیٹھے بیٹھے کام کرسکی کرتی رہی، اُس وقت تک کوئی نوکرانی نہ ملی، لیکن آج نوکرانی مل گئی۔ اگر یہ انتظام پہلے سے ہو جاتا تو پریتما کی طبیعت اتنی خراب نہ ہوتی۔ میرے دل میں بابوجی کی طرف سے نفرت پیدا ہوگئی میں نے سوچا "کیا دوسری شادی کرنے سے انسان اپنی اولاد سے اتنا غافل ہو جاتا ہے؟ پریتما بیمار ہے لیکن اس کا کوئی علاج کرنے والا نہیں۔ اگر اُس کی ماں زندہ ہوتی تو کیا بابوجی اتنی بے رخی سے کام لے سکتے تھے؟" میں نے سوچا کہ آج اوپر جاکر پریتما سے ضرور ملوں گا۔ میں خود ڈاکٹر ہوں اُس کا خوب جی لگا کر علاج کروں گا۔"

اپنے وقت پر بابوجی دفتر چلے گئے تو میں "مالکن" کا کھانا اوپر رکھ آیا اور جب سب کاموں سے فرصت ہوگئی تو میں نے سوشل سے کہا "چلو تمہاری دیدی کو دیکھ آؤں۔"

سوشل کے ساتھ اوپر گیا اور پریتما کے کمرہ میں داخل ہوا۔ ایک میلا پھٹا پرانا بستر فرش پر پڑا تھا اور اسی پر پریتما لیٹی ہوئی کراہ رہی تھی۔ میں پاس جاکر زمین پر بیٹھ گیا اور اُس کا ہاتھ تھام کر پوچھا "پری کیسی طبیعت ہے؟"

پری نے آنکھیں کھولیں اور میری طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ کر بولی "مہاراج میرا سر پھٹا جا رہا ہے کیا کروں"

میں نے نبض پر ہاتھ رکھا تو بہت زور کا بخار معلوم ہوا۔ میں یہ کہہ کر "گھبراؤ نہیں میں دوا لینے جا رہا ہوں" کوٹھے سے اترا اور دوڑتا ہوا ایک ڈاکٹر کی دوکان سے چار خوراک "ایسپرن" کی لایا اور فوراً ایک خوراک پریتما کو کھلا دی اور اُس کا سر دابنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے پوچھا "اب طبیعت کیسی ہے"

پری نے محبت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مہاراج اب تو درد میں کچھ کمی ہو گئی ہے"

اس کے بعد میں نے پری کو اچھی طرح سے دیکھ کر نسخہ لکھا اور بازار سے دوا لاکر اُس کو پلا دی۔ اُس دن اس کی طبیعت بہت اچھی رہی اور رفتہ رفتہ وہ روبصحت ہونے لگی۔ میں نے پہلے دن سوچا تھا کہ مجھ کو دوا وغیرہ لاتے دیکھ کر بابو جی ضرور خفا ہونگے لیکن ایسا نہ ہوا۔ پری کے باپ سے اس کی ان کو کچھ پروا نہ تھی۔

۴

پری کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ روک ٹوک نہ ہونے سے میرا دوپہر کا سارا وقت اُسی کے پاس گذرنے لگا بھادوں کا مہینہ اور دوپہر کا وقت تھا گرمی بہت تھی۔ پری کی پیشانی پسینہ سے تر دیکھ کر میں آہستہ آہستہ اُسے پنکھا جھلنے لگا۔ پری کو نیند آ گئی۔ بہت دنوں سے سر میں تیل نہ لگنے سے اُس کے نازک بال چپک گئے تھے۔ میں کچھ دیر تک اُس کی موہنی صورت کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا اور پھر محبت کے جوش میں میں نے اُس کی روشن پیشانی کو چوم لیا ——— سر اٹھا کر دیکھا کہ ایک عورت کمرے سے باہر کھڑی مجھے گھور رہی تھی لیکن نظر ملتے ہی وہ ہٹ گئی میں نے سمجھ لیا کہ "مالکن" ہیں۔ اسی دن کا ذکر ہے کہ جب میں کھانا پکا رہا تھا تو بابو جی نے زور سے مجھے آواز دی۔ میں سمجھ گیا کہ میری طلبی کیوں ہوئی ہے۔ دل ہی دل میں ہنستا ہوا اُن کے پاس پہنچا۔ ان کے کمرہ میں میرے اور بابو جی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ بابو جی لال پیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے گرجے ——— "یہ تم نے کیا کیا ———"

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا"

تم نے کچھ نہیں کیا؟ خوب، مجھے بیوقوف بناتے ہو، میں نے تو تم کو نیک چلن سمجھ کر بیماری کے دنوں میں

— ۔

پریتما کی سیوا کرنے پر کوئی اعتراض نہ کیا اور تم نے ——— " بابو جی اسی طرح بہت دیر تک معموں میں گفتگو کرتے رہے اور میں چپ چاپ سنتا رہا۔ اخیر میں انہوں نے صاف صاف کہہ دیا "مہاراج اب تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ تم پریتما کے ساتھ بیاہ کر لو۔"

یہ تو میں پہلے ہی سے سمجھتا تھا کہ پری کو بابو جی گھر سے کسی نہ کسی بہانے سے نکالنا چاہتے ہیں۔ ان کی نئی بیوی کا دلی منشا تھا کہ جس قدر بھی جلد ممکن ہو سوت کی لڑکی کسی غریب برہمن کو سونپ دی جائے۔ میں نے دکھانے کو پہلے تو بہت انکار کیا، اپنی غریبی کا رونا رویا، لیکن آخر اپنی منظوری دے دی۔

بابو جی بولے "بہت اچھا ہوا کہ تم نے مان لیا ورنہ میں تم کو پولیس کے حوالے کر دیتا اب میں درگا پوجا میں چھٹی لے کر مادھو پور یا دیو گھر گھومنے کے بہانے سے چلوں گا، تم بھی میرے ساتھ ہو گے، کہیں نہ کہیں کسی پروہت کو بلا کر بیاہ کر دوں گا۔"

"اتنی دُور جانے کی کیا ضرورت ہے یہ کام تو کلکتہ ہی میں ہو سکتا ہے۔"

رسوئیا کے ساتھ اپنی لڑکی کا بیاہ کر کے میں اپنا منہ برادری میں کیسے دکھا سکتا ہوں۔ نہیں میں کلکتہ میں رہ کر ایسی جرأت ہرگز نہیں کر سکتا۔ دُور جا کر بیاہ کرنے سے کسی کو اصلیت کا پتہ نہ چلے گا۔ یہاں واپس آکر مشہور کر دوں گا کہ ایک اچھا لڑکا مل گیا تھا، بیاہ کر آیا ہوں۔"

آہ کیا دنیا میں ہر باپ اپنی پہلی بیوی کی اولاد سے ایسا ہی سلوک کرتا ہے۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

۵

درگا پوجا کی چھٹی ہوئی۔ بابو جی نے اپنے بال بچوں کو اور مجھے ہمراہ لے کر "دیو گھر" کی یاترا کی۔ اب تک پریتما کو اس کی کچھ خبر نہ تھی، کیونکہ اُس کے ماں باپ نے یہ تمام کارروائی اُس سے پوشیدہ رکھی تھی۔

"دیو گھر" پہنچ کر بابو جی نے پریتما کے ساتھ میرا بیاہ کر دیا۔ میں نے اسی دن اپنے ایک دوست کو جو مادھو پور میں وکیل تھے اور جن کو میں کلکتہ سے بھی اکثر خط لکھا کرتا تھا اطلاع دی کہ میں مادھو پور آرہا ہوں ایک اچھے مکان کا انتظام کر لینا اور خود پریتما کو ساتھ لے کر "دیو گھر" سے روانہ ہوا۔ میرے خسر نے بڑی مہربانی سے دو تھرڈ کلاس کے ٹکٹ "دیو گھر" سے "مادھو پور" تک کے دلا دیئے۔ مادھو پور میں پہنچ کر میں نے پریتما سے اصلی حال کہہ دیا۔ خیال تھا کہ وہ بہت متعجب ہو گی لیکن بخلاف اس کے اُس نے بڑی متانت سے کہا "یہ تو مجھے پہلے

ہی سے معلوم تھا"

"تم کو یہ کیسے معلوم ہوا؟"

"صرف مجھ کو نہیں بلکہ پتا جی کو بھی معلوم تھا اور انہوں نے اپنے ایک دوست کے ذریعہ سے تمہارے خاندان کا حال بھی معلوم کر لیا تھا۔ تم نے میرے پتا جی کو سمجھا کیا ہے؟"

میں نے بڑی حیرت سے کہا "یہ سب کیسے ہوا صاف صاف بتاؤ؟"

تم نے میری بیماری میں ٹیگور بابو کی ایک کتاب مجھے پڑھنے کو دی تھی، یاد ہے؟

"خوب یاد ہے"

"اسی کتاب میں بابو جی کو اتفاق سے تمہارے کسی دوست یا عزیز کا ایک خط مل گیا اس میں لکھا تھا "یہ تمہارا کیسا پاگل پن ہے۔ زمیندار کے لڑکے ہو کر ۔۔۔۔ ڈاکٹری پاس کر کے رسوئیا کا کام کرتے ہو" اسی طرح کی اور بھی باتیں لکھی تھیں۔

اب مجھے یاد آگیا کہ یہ خط مادھوپور والے وکیل صاحب کا تھا انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ اگر مالک کی لڑکی سے پریم ہو گیا ہے تو فوراً اپنا حال ظاہر کر کے بیاہ کر لو۔ رسوئیا بن کر بیاہ کرنے سے کیا فائدہ ہو گا۔

میں دھوکا کھا گیا۔ سمجھ رہا تھا کہ میں نے بابو کالی کانت کو بے وقوف بنایا ہے لیکن اب میں خود بیوقوف بن رہا تھا۔ انہوں نے اتنے دنوں تک رسوئیا کا کام بھی کرایا اور بغیر "کنیا دان" دیئے پرتیما کے ساتھ بیاہ بھی کر دیا یہ خوب ہوئی۔ میں نے پرتیما سے کہا ۔۔۔۔ "اُس خط میں اور کیا تھا؟"

پرتیما نے لجا کر اپنا سر نیچا کر لیا اور کہا "جاؤ ۔۔۔۔ میں نہ بتاؤں گی"

میں نے اس کو بہت تنگ کیا پھر بھی اُس نے نہ بتایا آخر کار میں نے خود کہا "مجھے تم سے محبت ہے یہ بات تم کو اس خط سے معلوم ہو گئی ہو گی"

پرتیما آنکھیں نیچے کئے ہوئے مسکرانے لگی میں نے کہا "تم نے بڑی بے انصافی کی"

"وہ کیسے"

"غیر کا خط پڑھ لیا"

"میں تم کو غیر نہیں سمجھتی تھی"

"اُس وقت تک تو بیاہ نہیں ہوا تھا، یہ بھی تم کو معلوم نہ تھا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ ایسی حالت میں

کیا میں غیر نہیں تھا۔"

پرتیما نے کہا "ہم نے جب سے جنم لیا تھا اُسی وقت سے بھگوان نے بیاہ ہونا قسمت میں لکھ دیا تھا۔ یہ بات جب میں نے تم کو پہلی بار دیکھا تھا اُسی وقت مجھے معلوم ہوگئی تھی۔ تم کہو گے کس طرح؟ میرے دل نے بتا دیا تھا ـــــــ"

مادھوپور سے ہیرو بنا ہوا اپنی ہیروئن کے ساتھ جب میں اپنے گھر پہنچا تو میری ماں نے کہا "کلکتہ سے دوا لے آئے"

میں نے پرتیما کو ماں کے چرنوں پر گرا کر جواب دیا "کلکتہ پہنچ کر مجھے دل کی بیماری ہوگئی تھی اسی کی آج دوا لایا ہوں ـــــــ کیوں ماں! کیا اس سے بڑھ کر بھی دنیا میں اور کوئی دوا ہوسکتی ہے؟"

میری ماں ہنسنے لگی پرتیما نے لجا کر سر نیچا کر لیا اور میری طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھنے لگی گویا وہ زبانِ حال سے کہہ رہی تھی ـــــــ "تم بڑے شریر ہو"

(ماخوذ از پربھات کمار)

اعظم کریوی

تُو میرے دل کے مرکز میں تھا اس لئے جب میرا دل اِدھر اُدھر گھومتا رہا تو تُو اُسے نہ مل سکا۔ تُو نے اپنے تئیں میری محبتوں اور میری امیدوں سے چھپائے رکھا کیونکہ تُو ہمیشہ ان کے اندر ہی موجود تھا +

تُو میرے شباب کے کھیل کی درونی خوشی تھا اور جب میں کھیل میں زیادہ ہی مشغول ہو جاتا تھا تو یہ خوشی مجھے بھول جاتی تھی +

تُو زندگی کی نشاط و انبساط میں میرے لئے گاتا رہا لیکن آہ! میں تیرے لئے گانا بھول گیا۔

جب تُو اپنا چراغ آسمان پر تھامے ہوتا ہے تو اُس کی روشنی میرے چہرے پر آ پڑتی ہے اور اُس کا سایہ تجھ پر ہوتا ہے۔

جب میں محبت کا چراغ اپنے دل میں تھامے ہوتا ہوں تو اُس کی روشنی تیرے چہرے پر جا پڑتی ہے اور میں پیچھے سائے میں کھڑا رہ جاتا ہوں!

گلچیں

تنِ تنہا ہوں

تنِ تنہا ہوں تنہا دونوں ہو جائیں گے آ تُو بھی
تصوّر میں ترا چہرہ ہے آ چہرہ دکھا تُو بھی

تنِ تنہا ہوں تنہائی سے آ کر لطف اُٹھا تُو بھی
مجھے بھی دیکھ اور اپنا چاند سا مکھڑا دکھا تُو بھی

کہوں جب تجھ سے میں اے جاں مجھے الفت تجھی سے ہے
مجھے بھی پیار ہے تجھ سے فقط مجھ کو بتا تُو بھی

مرے دل میں تو کر دی ہے بپا تُو نے قیامت سی
اُٹھا ہے تیرے دل میں بھی جو محشر وہ دکھا تُو بھی

غرض کی دُھن میں سب اپنی خوشی کا راگ گاتے ہیں
مری جاں! راگنی اپنی مروّت کی سنا تُو بھی

وفا کا باغ ہے اور پھول ہیں تیری محبّت کے
ہو منظورِ نظر آنکھوں کو نا منظر یہ آ تُو بھی

وہ کیسا حسن ہے جس میں محبّت کی نہ ہو خوشبو
چمن میں ناز سے پھولوں کو حُسن اپنا دکھا تُو بھی

کہیں تیرے تصوّر میں کوئی محوِ ترنّم ہے
کسی کی آرزو میں راگ اک الفت کا گا تُو بھی

گلِ نیکی سے حسن و عشق کی خلوت کو مہکا دے
ہماری بزم میں شامل ہو اے میرے خدا تُو بھی

بہار آیا ہے گلشن میں ترے تیرے نظارے کو
کبھی آیا کر اُس کے دشت میں اے باوفا تُو بھی

بہار

ویرے کی رُوح

چوک والی سرائے کی لڑکی نے مجھ سے پوچھا "کیا تم نے اُس لڑکے کو دیکھا ہے جو ہر وقت اپنے راگ کی دھن میں محو گلیوں میں گھومتا پھرتا ہے؟" میں اُس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ تین روز سے میں ویرے میں مقیم تھا مگر اب تک اس وضع کا کوئی شخص مجھے وہاں نظر نہ آیا تھا "میرے اللہ!" میں نے اپنے دل میں کہا "کیا ویرے میں کوئی ایسا احمق بھی ہے جو اس جنوں میں مبتلا ہے؟ موسیقی کو یہاں کون سنتا ہے؟ اکثر گھروں کے دروازے بند ہیں۔ شاذو نادر ہی کوئی بوڑھا یا کوئی بڑھیا یا کوئی خوبصورت لڑکی اُس افتادہ وضع کی ٹوپی پہنے جس کے دونوں رخوں پر جھومر لٹکتے ہیں کسی کھڑکی میں کھڑی نظر آتی ہے۔ اُس کے نغموں کو کون سنتا ہوگا! ویرے کے اس عجیب و غریب چھوٹے سے گاؤں میں یہ سب لوگ ممیوں کی طرح نظر آتے ہیں جو اپنے سبز اور نیلے شیشوں میں نمائش کے لئے رکھی گئی ہوں"

یہ ہے میرا خیال اس جگہ کے متعلق۔ اگر میں اتفاقاً اُس لڑکے سے کہیں ملتا تو میں اپنی انگلی کو اپنے ہونٹوں پر رکھ کر اسے متنبہ کرتا کہ دیکھو وہ سکوت جو ان گھروں کے کونے کونے پر محیط ہے تمہارے راگ کی آواز سے ٹوٹ جائے گا! آفتاب خود یہاں محوِ خواب رہتا ہے۔ اُس کی دھوپ سونے کی ٹکلیوں کی طرح سنسان گلیوں میں بکھری رہتی ہے۔ وہ اِس بستی کو جگا جگا کر تھک گیا ہے جو کبھی زندہ تھی اور اب ایک گہری نیند میں پڑی سوتی ہے۔ اُس کی روشنی مکانوں کی دہلیزوں پر اُس سائل کے قدموں کے نشانوں کی طرح ماند پڑ جاتی ہے جو ہر روز صبح آکر ایک ایسے دروازے کو کھٹکھٹاتا ہے جسے کوئی نہیں کھولتا۔ ان گھروں کے دروازوں کو اندرونی ظلمت نے زنجیریں ڈال رکھی ہیں۔

اگر میں سو سال بھی زندہ رہوں تو میں ویرے کی اس گلی کو اور اُن چھوٹے چھوٹے مکانوں کو نہ بھولوں گا جو سڑک پر اس طرح باہر کو نکلے ہوتے ہیں جیسے کوئی ہاتھ جوڑ کر دعا مانگ رہا ہو۔ زندگی اس مقام سے اتنی دور ہے کہ بعض اوقات انسان خود اپنی ہستی پر شک کرنے لگتا ہے۔ اس کے آگے آگے ایک دھندلا سا سایہ چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ وہ نہیں جان سکتا کہ یہ اسے کہاں لے جائے گا، مگر یہ گرجا کی طرف لے جاتا ہے جہاں اور سب لوگ جا چکے ہیں۔ اس سے آگے فصیل کے پار سمندر موجیں لے رہا ہے اور جہاز کھڑے ہیں۔ آسمان کا گنبد بادلوں کے بوجھ سے سمندر کی وسعت پر جھکا پڑتا ہے۔ اس مقام پر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں خود بخود مر رہا ہوں، جیسے میرا کمزور دل ٹھیرا جا رہا ہے، مگر میری انگلیاں سورج کی طرف ایک نامعلوم سا اشارہ کرتی تھیں۔

مَیں نے اپنے دل میں کہا "یا تو یہ شریر لڑکی میری سادگی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے اور یا اُس نے کسی ایسی بات کا تذکرہ کیا ہے جسے واقع ہوتے مدتیں گزر چکی ہیں، جب ابھی یہاں سب زندہ تھے!"

اسی وقت گھنٹے کی دھیمی اور سریلی آواز میرے کان میں پڑی۔ یہ آواز نہایت سست رفتار کے ساتھ گھنٹہ گھر سے نیچے اتراتر کر مجھے محزون و مغموم کئے دیتی تھی۔ مجھے یوں معلوم ہوا جیسے میں نے یکایک ایک ایسا راگ سن لیا ہے جو دیرے کی آخری گھڑیوں کے کرب و اضطراب کی کہانی سنا رہا تھا۔

چوک ہی میں ایوانِ بلدیہ کی خوبصورت عمارت تھی، جسے نایاب موتیوں کی ڈبیا کی طرح سجایا گیا تھا۔ خوبصورت طاقوں میں بادشاہوں اور اولیا و صلحا کے بلند قامت مجسمے رکھے تھے میں سمجھتا ہوں ——— لیکن اب دیرے کی تاریخ کون جانتا ہے؟ —— مجھے یقین ہو گیا کہ شاید یہی گھنٹہ ہوگا جس کی نسبت اس عجیب و غریب آنکھوں والی لڑکی نے مجھ سے کہا تھا۔ اور میرے دل میں اُن قدیم جسموں کی نسبت نفرت کے جذبات پیدا ہونے لگے جو یوں بے باکانہ ہر وقت سمندر کی طرف ٹکٹکی باندھے رہتے تھے۔ انہیں یہاں کھڑے صدیاں ہو گئی تھیں اور وہ اپنی اکڑی ہوئی گردنیں اٹھائے ہوئے کسی اُس واقعہ کے منتظر تھے جو کبھی وقوع میں نہ آیا تھا۔ شاید ان کی اندھیری آنکھیں جو پتھر کو تراش کر بنائی گئی تھیں، اُن بیڑوں کی واپسی کا انتظار کر رہی تھیں جنہوں نے مدتیں ہوئیں ایک دن اس بندرگاہ سے لنگر اٹھایا تھا۔ چوک کے قریب ہی ایک قدیم گرجا کا مینار تھا جس کی کنجیوں کو سمندر کی تہ میں سوتے ہوئے زمانے گزر گئے تھے۔

زمانے کی نیرنگی پر میں ذرا مسکرایا۔ اس بستی کو سب چھوڑ گئے تھے، اور شہر پناہ کے باہر سمندر کے کنارے جا بسے تھے۔ صرف چند لوگ پیچھے رہ گئے تھے ——— وہ عمر رسیدہ لوگ جن کی ناکوں کے نیچے اس قسم کی میل نمایاں تھی جیسے موت کی پھپوندی لگی ہو لیکن پتھر کے بت ہاتھوں میں تلواریں اور بادشاہی عصا تھامے ہوئے کھڑے تھے جیسے وہ اب بھی لوگوں پر حکومت کر رہے ہیں۔

میں گرجا کے دروازے پر گیا اور اسے تین دفعہ زور زور سے کھٹکھٹایا! میں نے یہ حرکت محض بسبیل تمسخر کی تھی ورنہ میں جانتا تھا کہ خدا کے اس قدیم گھر میں میری دستک کو سننے والا کوئی نہیں۔ میں حیران رہ گیا جب یکایک دروازہ کھلا اور اُس میں سے ایک عجیب و غریب آنکھوں والا سجیلا نوجوان نمودار ہوا۔ اُس نے چاندی کے ہکوں والی مخمل کی ایک چھوٹی سی جاکٹ پہن رکھی تھی جیسی عام طور پر زی لینڈ کے لوگ پہنتے ہیں۔ اُس کے پاس ایک بربط تھا جیسا عموماً بندرگاہ کی دکانوں میں فروخت ہوتا ہے اور جسے جہازی ملاح بجاتے ہیں اور شام کی تیرہ فامی کو اُس کے سہمیں سروں سے روشن کر دیتے ہیں۔ کبھی اس میں سے ایک تھرتھراتا ہوا نغمہ پیدا کرتے ہیں اور کبھی ایک ہی لمبی تان سے سننے والوں کو مست کر دیتے ہیں۔ نوجوان کی صورت سے ایسا ظاہر ہوتا تھا جیسے اسے گہری نیند سے زبردستی بیدار کر دیا گیا ہے۔ متعجب ہو کر میں نے خیال کیا، کیا یہی وہ لڑکا ہے جس کے متعلق مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ ہر وقت اپنے راگ کی دھن میں محو گلدوں میں چھترا رہتا ہے؟

میری طرف دیکھے بغیر وہ میرے ساتھ ہولیا اور ہم تیت کی کانوں کی گلابی دیواروں، پرانے شیشے کی لمبی لمبی کھڑکیوں اور گوبھی اور پیاز کے چھوٹے چھوٹے باغوں کے پاس سے گزرتے چلے گئے۔ چپ چاپ وہ چوک سے آگے نکل آیا۔ اسی وقت ایک مرتبہ پھر

جرس کی بلوریں آواز ویرے کے آخری کرب و اضطراب کا اداس گیت گاتی ہوئی سنائی دی۔ ہوا نہایت نرمی سے اس نغمے کو منتشر کرتی ہوئی سمندر کی جانب مکانوں کی چھتوں پر اڑاتی پھری۔ انوکھے نوجوان نے بربط کو اپنے کندھے کا سہارا دے لیا اور اُس کی انگلیاں بربط کے تاروں پر رقص کرنے لگیں مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نغمے کے معنی صرف اُس کے لئے ہیں اور کسی کے لئے نہیں۔ اُس نے اپنے سر کو جھکا کر بربط کے قریب کر لیا اور کچھ اس انداز سے مسکرایا کہ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے اب اُس کو اس دنیا کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری روح کے عمق عمیق میں کوئی کہہ رہا ہے کہ اس لڑکے کی عقل و ہوش پر کسی نامعلوم صدمہ کا اثر ہے، اور ویرے کے گاؤں کا راز بھی اس سے کچھ تعلق رکھتا ہے لیکن یہ احساس مجھ پر ناقابلِ بیان طور پر طاری تھا۔

پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے مجھے سخت تکلیف ہوئی۔ نوجوان نے نظر اُٹھائی اور اُن عظما و ابطال کی طرف دیکھا جو اپنی بلند کرسیوں پر کھڑے تھے اور پھر ایک نگاہ سمندر کی دوریوں پر ڈالی۔ اُس کی آنکھیں اس طرح روشن تھیں جیسے ان میں کسی اور دنیا کی روشنی چمک رہی ہے۔ بربط زیادہ تیزی اور تندی سے بجنے لگا، اُس کی آواز میں دیوانگی سرایت کر گئی اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے بستی کی قدیم روح اس نوجوان کی چاتر انگلیوں کے نیچے یکایک مرتعش ہو کر رہ گئی ہے وہ ایک جہازی ملاح کی بین کی طرح اپنے ساز کو ایک عجیب رقص کے ساتھ بجاتا ہوا گلیوں سے گزرتا گیا۔ وہ زمین کو اپنے پاؤں کے پیچھے اپنی ایڑیوں سے دہلاتا تھا، اپنے بربط کو سر سے اونچا اٹھا کر گھماتا ہوا اس تیزی سے نیچے لاتا تھا کہ وہ زمین کو چھونے لگتا تھا اور پھر یکایک شاندار متانت کے ساتھ ایک جگہ کھڑے ہو کر، آنکھیں بند کر کے چہرے پر ایک پُر تکلف تبسم پیدا کرتا تھا، جو ہمیشہ اُس کے اُس پُرسوز رقص و سرود کا ہم آہنگ ہوتا تھا جس میں ایک قاتل یا عاشق کا شوق تباہ تڑپ رہا ہوتا۔

پھر اُن چھوٹے چھوٹے گھروں میں بتدریج جان پڑنے لگی اور زندگی جو بند دروازوں کے اوجھل مدتوں سے سوئی پڑی تھی از سرِ نو بیدار ہونے لگی جیسے وہ صرف اس زرد رو بربط نواز نوجوان کے لئے چشم براہ تھی۔ کھڑکیوں میں اُن نوجوان لڑکیوں کے ہنسی سے کھلے ہوئے چہرے نظر آنے لگے جن کے سروں کے لباس پر زیبائش کے لئے عجیب قسم کی پُرپیچ دھاریاں بنی تھیں جیسے ہرن کے سینگ ہوں۔ ویرے کی تمام حسین لڑکیاں ڈوری دار پردوں کے پیچھے منہ کھولے ہوئے یوں آ کھڑی ہوئیں جیسے گلاب کے پھول شہد کی مکھیوں کے دل بادل میں سے نظر آ رہے ہوں۔ انہیں یوں تر و تازہ چہروں کے ساتھ موت کی گہری تاریکیوں میں سے نکل کر کھڑکیوں کے پاس آتے ہوئے دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ یہ گھر درحقیقت گڑیوں کے مکان ہیں جن میں سحر کے ذریعہ سے زندگی کے آثار پیدا ہو گئے ہیں ـــــ ویرے کی اُن گڑیوں کے گھر جن کی باہیں حسین و ملیح ہیں، جن کے بڑے بڑے ابھرے ہوئے لہنگے ہیں، جن کے رنگین سر اور سمندر کی سی نیلی آنکھیں ہیں۔

نوجوان سازندہ یوں ہی گلیوں میں پھرتا رہا، اپنے وحشی راگ کی مغموم و محزون گتیں بجاتا ہوا جن کو سن کر آنکھوں میں آنسو بھر آئیں۔ کیا یہ ویرے کی روح تھی جو اپنی کھوئی ہوئی محبت پر خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی اور اُن لڑکیوں کے لئے تاسف انگیز آہیں بھر رہی تھی جو اب اپنی قبروں میں سو رہی تھیں اور اُن نوجوان مردوں کے لئے جنہوں نے اپنے جہاز سمندر میں ڈالے اور پھر کبھی واپس نہ لوٹے؟ آخر بربط کی یہ آواز دور سمندر کے ریتیلے ساحل میں جاکر جذب ہوگئی۔

جب میں واپس ہوٹل میں آیا تو میں نے اس لڑکی سے کہا "تم نے درست کہا تھا یہاں ایک لڑکا ہے جو اپنے راگ کی دُھن میں محو گلیوں میں گھومتا پھرتا ہے۔ بے شک وہ ایک روح ہے عذاب میں مبتلا۔ کیا یہاں کوئی جانتا ہے کہ اس پر کیا مصیبت پڑی ہے؟" اس گربہ چشم شریر لڑکی نے ایک قہقہہ لگایا اور پھر ایک شخص کی طرف اشارہ کیا جو کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔

"اُس سے پوچھو" اُس نے کہا "وہ مجھ سے بہتر طریق پر تمہیں بتا سکے گا"

کہانی بالکل معمولی تھی ایک دن یہ لڑکا اُن گڑیا سی لڑکیوں میں سے ایک کے دام محبت میں گرفتار ہوگیا جو آب آ آکر کھڑکیوں میں کھڑی ہوتی ہیں۔ ایک شام کا ذکر ہے کہ یہ اپنا بربط لئے ہوئے ناچنے گانے کے لئے اُس لڑکی کے گھر آیا۔ اور لڑکے بھی اس گھر میں آیا کرتے تھے اور اُن کو بھی اس لڑکی سے انس تھا لیکن اُس کو یہ ناگوار تھا اس لئے جب وہ رشک رقابت سے رونے لگا تو لڑکی نے کہا "تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ مجھے تم سے محبت ہے مگر مجھے اُس سے بھی محبت ـــ ـــ اُس لڑکے سے جس کے گھر کا دروازہ ہمارے دروازے کے ساتھ ہے، اور مجھے اُس لڑکے سے بھی محبت ہے جو تمہارے جانے کے بعد یہاں آتا ہے ...... مجھے یہ سب اچھے لگتے ہیں!" ایک دفعہ ایک جھاڑی کے پیچھے سے اُس نے دیکھا کہ وہ اُس نوجوان کی آغوش میں ہے جو اس سے پہلے یہاں پہنچ چکا ہے اُس نے جھٹ چاقو نکالا اور دونوں کو مار ڈالا

"اور اُس دن سے اب تک وہ گلیوں میں اپنا بربط بجاتا پھرتا ہے۔ وہ کسی کو کچھ نہیں کہتا بچے اس پر پتھر پھینکتے ہیں اور لڑکیاں ہنستی ہیں۔ وہ اُن کی طرف دیکھتا تک نہیں" اُس شخص نے کہا جو کہانی سنا رہا تھا۔

لیکن مجھے اس بیان پر پوری طرح یقین نہ آیا۔ اشیا کا ظاہر ہی حقیقی معلوم ہوتا ہے ورنہ بڑے بڑے حقائق کے پردے میں بھی کچھ پوشیدہ معانی ہوتے ہیں۔ انہیں کی جستجو کرنی چاہئے، کیونکہ یہ ظاہر سے زیادہ خوبصورت ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ لڑکا ویرے کی روح ہے۔ اب میں سمجھ گیا ہوں کہ وہ کیوں گرجا کے دروازے سے نمودار ہوا ۔ تو اے ویرے کی بستی اور یہ نیم مجنون لڑکا ایک ہی جنون خاموش کا شکار ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سمندر کی ہواؤں نے تمہارے سر پھیر دیئے ہیں تم کسی ایسی چیز کو کھو چکے ہو جو اب کبھی تمہیں نہ مل سکے گی۔ وہ چیز جس کے نوحے تمہارا جرس گاتا ہے اور جس کی زاریاں اس بربط کی ہچکیوں میں ہم سنتے ہیں۔ ویرے میں ایک نوجوان شخص ہے جو عموماً ساحل کے ریتیلے ٹیلوں کی طرف جاتا ہے اور سمندر کی غیر متناہی وسعتوں کے نظارے میں محو ہو جاتا ہے۔

(لی موینیر)

منصور احمد

محفلِ ادب

اُلفت کا اظہار

(ایک گیت)

میرے دل کا باغ

پیاری میرے دل کا باغ

مَیں ہوں دل کے باغ کا مالی لایا ہوں پھولوں کی ڈالی

نازک نازک پھول ہیں جیسے اُجلے اور بے داغ ایسا ہی بے داغ ہے پیاری میرے دل کا باغ

پیاری میرے دل کا باغ

میں ہوں دل کے باغ کا مالی لایا ہوں پھولوں کی ڈالی

اُلفت کا احساس

پیاری اُلفت کا احساس

اُلفت ہے پھولوں کا گہنا خوشبوؤں میں رہنا سہنا

مدھم ہلکی، بھینی بھینی ان پھولوں کی باس میٹھا میٹھا درد ہو جیسے الفت کا احساس

پیاری الفت کا احساس

اُلفت ہے پھولوں کا گہنا خوشبوؤں میں رہنا سہنا

اُلفت کا اظہار

پیاری اُلفت کا اظہار

میری ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں تیری یہ حیران نگاہیں

ان پھولوں کی ہر ڈالی ہے اک گلشن بے خار ان پھولوں کی رنگت جیسے الفت کا اظہار

پیاری الفت کا اظہار
میری ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں — تیری حیران نگاہیں

حفیظ

"مخزن"

شعر عرب کی قدامت

عربوں کی شاعری قدیم ہے کیونکہ اقوام سامیہ (سام بن نوح کی اولاد) میں عرب سب سے زیادہ عالم خیال سے دلچسپی رکھتے تھے اور اسی لئے اعتقاد توحید اور غیر محسوس اشیا پر ایمان لانے والوں میں وہ سب سے مقدم تھے۔ امم سامیہ کا سب سے قدیم شاعرانہ اثر تورات کے متعدد ابواب سے ظاہر ہے۔

لامک نے اپنی بی بی عاوہ اور صلہ سے جو گفتگو کی تھی وہ بھی نظم کا ایک ٹکڑا ہے اور عبرانی شعر کی یہ نہایت قدیم مثال ہے۔ تکوین ۴ - ۲۳ (۲۴) سفر ایوب، سفر اشعیا اور مزامیر داؤد میں بھی تصور شعری کی مثالیں موجود ہیں۔

"علی گڈھ میگزین"

محبوبۂ نصرت

محبوبہ نے مسکراتے ہوئے کہا قسم ہے تم کو میری محبت کی تم ہتھیاروں سے سجے ہوئے کیسے بھلے معلوم ہوتے ہو۔ تمہارا مردانہ حسن اس وقت پورے شباب پر ہے۔ میرے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ میں تمہارے لب نازک کو اپنے لبوں سے مس کروں یا تمہاری خوبصورت تلوار کو بوسہ دوں لیکن میں یہ کہتی ہوں کہ تم اس وقت اس درجہ حسین ہو کہ میں نے تمہیں اتنا حسین کبھی نہیں دیکھا۔ کیسا دلکش اور نظر فریب وہ وقت ہوگا جب تم میدان جنگ سے فتح حاصل کرکے واپس آ رہے ہوگے تمہارے زخموں سے میری محبت کا رس بہ رہا ہوگا۔ اس وقت میں تمہیں اپنے زانو پر لٹاؤں گی اور تمہارے لئے ایک ادنیٰ نرس بن جاؤں گی

عاشق نے محبوبہ کی دلفریب داستان سنی اور اُس نے کہا کہ پیاری تم حسین ہو اور بلا کی حسین ہو۔ لیکن میدان جنگ میں جب میں سینہ سپر ہوکر بڑھتا ہوں تو فتح کی دیوی تم سے بھی زیادہ حسین معلوم ہوتی ہے۔ میں اس کے رنگ روپ میں تمہیں دیکھتا ہوں۔ اور تم مجھے اس کے رنگ روپ میں دکھائی دیتی ہو جب میں گولیوں کی بوچھاڑ میں بے باکانہ بڑھتا ہوں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں تمہیں حاصل کرنے کے لئے بے چین ہوں کیونکہ میرے نزدیک محبوبہ اور فتح دو چیزیں نہیں ہیں میں جاتا ہوں اور رخصت ہوتا ہوں مبارک ہے تمہارا خیال جو میدان جنگ میں میری رگوں میں جرأت کی روح دوڑا دیتا ہے۔

(نرگی ڈراما)

"دین و دنیا"

تبصرہ

"شبستان" جنوری ۱۹۲۹ء سے اس نام کا ایک ماہوار رسالہ سینما کے متعلق لاہور سے شائع ہو رہا ہے۔ زیر تنقید اس رسالہ کا دوسرا نمبر ہے جو صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے نہایت دل آویز ہے۔ مضامین ۵۶ صفحات پر مشتمل ہیں اور ایک سہ رنگی اور درجن سے زیادہ یک رنگی تصاویر شریک اشاعت ہیں۔

یوں تو پرچے کے سب مضامین دلچسپ اور پر از معلومات ہیں لیکن "محبوبۂ عالم میری پکفرڈ" "شیخ کا بیٹا" "سینما کے رشتے اور پردے کے اُس پار" خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان سے ایکٹروں کی زندگی اور سینما کے اسرار اور فن کے متعلق ایسی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن سے سینما کا ذوق رکھنے والے حضرات کا واقف ہونا ضروری ہے۔

اپنی طرز و وضع اور اغراض و مقاصد کے اعتبار سے "شبستان" پہلا اور بہترین رسالہ ہے۔ ہمیں امید ہے کہ فلم کمپنیاں اسے کامیاب بنانے میں خاص طور پر متوجہ ہونگی کیونکہ ایک لحاظ سے یہ اُن کے مقاصد کی نشر و اشاعت کا کام انجام دے رہا ہے سالانہ چندہ چار روپے اور ایک پرچے کی قیمت چھ آنے ہے۔ دفتر رسالہ "شبستان" دار الاشاعت پنجاب لاہور سے طلب فرمایئے۔

"مخزن" اردو کے اس قدیم رسالے نے حضرت حفیظ جالندھری کے زمانۂ ادارت میں بڑی ترقی کی ہے مارچ ۲۹ء کا مخزن سالگرہ نمبر ہے۔ جو سرورق، کاغذ، کتابت، طباعت غرض کہ ہر اعتبار سے اس مرتبہ نہایت دلکش شائع ہوا ہے چار تصویریں ہیں اور منتخب و متنوع مضامین کے ۸۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ بہت سے مضامین پڑھنے کے قابل ہیں لیکن جناب حفیظ کا ایک گیت جسے ہم ہمایوں کی محفل ادب میں نقل کر رہے ہیں اور حضرت ملا رموزی کا سفرنامہ علی گڈھ اس رسالہ کی بہترین چیزیں ہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ مخزن کی روش متین اور باوقار ہے اور مذاق عامہ کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ اس روش کو نباہ رہا ہے قیمت ایک روپیہ مقرر ہے۔ پتہ منیجر مخزن بھاٹی گیٹ لاہور۔

پارچہ بافی مولفہ ایم ایچ بھٹی بی، اے بی ٹی۔ اس کتاب میں دیسی کرگہ اور فلائی شٹل پر کپڑا تیار کرنے کے آسان طریقے بتائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اُن تمام معلومات کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے جن کی واقفیت سوت سے لے کر کپڑا بننے تک کے مدارج میں ضروری ہے ہمارے خیال میں فن پارچہ بافی پر اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے۔ لیکن اس کے باوجود نہایت مکمل اور کارآمد ہے۔ کھانے کے بعد پہننا ہی سب سے بڑی ضرورت ہے اس لئے اقتصادی حیثیت سے بھی اس فن کی اہمیت ظاہر ہے حجم ۱۷۰ صفحات اور قیمت دو روپے ہے۔ عبد المجید صاحب مالک کتب خانہ ناشر العلوم، بیرون اکبری دروازہ لاہور سے طلب فرمایئے۔

دنیا بھر میں

خلاف تحریر ہو تو واپس

اس نو ایجاد کے سب سے پہلے کارخانہ کی تیار کردہ پیتل کی خوبصورت پالش شدہ
پائیدار منٹوں میں سیروں نفیس ولذیذ روالی سیویاں تیار کرنے والی مشہور عالم
مقبول عام وخاص نو ایجاد

پائدار مختصر و مضبوط

مشین سیویاں

معززناظرین! اشتہاری اشیار فی زمانہ اس قدر بدنام ہو چکی ہیں۔ کہ پبلک کو کسی اشتہار پر یقین نہیں ہو سکتا
مگر ہم "خلاف تحریر ہو تو واپس" کی شرط پر ناظرین سے اس
نو ایجاد کے خریدنے کی درخواست کرتے ہیں۔ تجربہ
انشاءاللہ ہماری تحریر کی تصدیق کرے گا۔ ایک مشین منگوا کر
ایک اسلامی کارخانہ کی صداقت کا امتحان کریں۔
قیمت فی مشین پیتل مع چھلنی دو عدد (سوراخ ۲،۱)
عدد صرف آٹھ روپے۔ علاوہ محصول ڈاک وغیرہ

بچہ چلا سکتا ہے

ہینڈل

مینجر کارخانہ مشین سیویاں قادیان پنجاب

فہرستِ مضامین

جلد ۱۵ — نمبر ۶

بابت ماہِ جون ۱۹۲۹ء

تصاویر:- ۱- مادام لابراں - ۲- مادام لابراں اور اُس کی بیٹی

شاعری اور زندگی

آج میں مضمحل ہوں! کس لئے؟ ـــــــ میں نہیں جانتا کس لئے لیکن آج میں مضمحل ہوں اور ساری دنیا میرے ساتھ مضمحل ہو رہی ہے! پہاڑ کا مقام ہے اور شملہ کا شہر، میدانی گرمی سے محفوظ ہوں، ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں، سورج کی نرم و نازک کرنیں چلی آتی ہیں، ہر طرح کا آرام میسر ہے، ہر طرح کا سامان مہیا ہے لیکن اس پر بھی طبیعت میں اک اضمحلال دل میں اک اضطراب! کتاب اُٹھاتا ہوں تو جی نہیں لگتا بلکہ سرے سے کتاب ہی نہیں اٹھائی جاتی اور اٹھائی کیونکر جائے کتابوں کی قطار میں سے جو میری الماری پر سجی ہیں کوئی کتاب چنی تک نہیں جاتی اور چنی کیا جائے دماغ میں خیال پراگندہ دل میں جذبات پریشاں! ـــــــ بہار کا سماں بے لطف امیری کے سامان بے مزہ ہر شے سے شکوہ ہر شخص سے کنارہ ملاقات سے پرہیز کام کو دُور سے سلام ـــــــ اچھا یہی سہی کام نہ کروں آرام ہی کروں لیکن اس پر بھی اطمینان تو ہو کچھ اسی سے جی ٹھکانے لگے ـــ لیکن نہیں! اچھا یہی اپنے سے پوچھوں کہ یہ اضحلال کیوں ہے یہ بے تابی کس لئے ہے مزاج کیوں حاضر نہیں؟

میں جو دوسروں کو لکچر دینے گھر سے نکلا ہوں ذرا گھر ہی میں اپنا حال بھی تو دیکھوں کچھ کر تو لوں پھر ذرا کچھ کہہ بھی سکوں مگر سچ یہ ہے کہ منہ سے بات نہیں نکلتی قلم سے فقرہ تک نہیں لکھا جاتا کہ دل ہی خود ڈھلمل یقین ہو رہا ہے۔ کچھ دنوں سے جب سے یہاں آیا ہوں اپنا یہی انداز دیکھتا ہوں کہ کمرہ کمرہ پھرتا ہوں کتاب کتاب کو دیکھتا ہوں باہر باغ میں پھول ہی پھول ہیں ان میں ٹہلتا ہوں بچوں کو گود میں لیتا ہوں اور اُن سے غوں غاں کرتا ہوں مہمانوں کی خاطر مدارات بھی کرنے لگ جاتا ہوں اور اِدھر اُدھر کی بے معنی باتوں میں مصروف ہو کر گویا ہوش میں آجاتا ہوں لیکن تھوڑی دیر گذری اور پھر میرا وہی حال ہوا ـــــ کچھ تھکن سی کچھ بیزاری سی اور وہی کچھ دل کی کس مپرسی کی حالت!

آخر یہ سب کچھ کس لئے؟ ـــــ میں نہیں جانتا کس لئے! نہیں جانتا تو نہ جانوں یہ دل کچھ ہے ہی ایسی چیز کہ اس سے زیادہ لاڈ کیا تو یہ الٹا اپنے ہی گلے کا ہار ہوا۔ چھوڑوں یہ سوچنے کا دھندا ورنہ یہ دماغ میرے سر چڑھ جائیگا ـــــ گھر میں سچ کسی نے کہا تھا کچھ دن ہوئے کہ شاعر کے ساتھ رہنا آسان کام نہیں جب خود شاعر ہی بعض دفعہ اپنے آپ سے یوں تنگ آجاتا ہے تو خدا جانے بیچارے دوسروں کا کیا حال ہوتا ہوگا!۔

"شاعر"

جہاں نما

شرعِ اشتراکیت کے دس احکام

اخبار "لٹریری ڈائی جسٹ" نے "اشتراکی شریعت" کے مندرجہ ذیل دس احکام شائع کئے ہیں اور لکھا ہے کہ مذہب کے آئندہ امام کو مشہور دس خداوندی احکام کے ساتھ اُن کو بھی شامل کر لینا چاہیے :-

۱

مَیں تیرا خداوند خدا ہوں، مگر تُو یاد رکھ کہ میں تمام دنیا کا خدا بھی ہوں۔ کوئی قوم میری منظورِ نظر نہیں ہے حبشی اور ہندو، چینی، جاپانی، روسی اور میکسیکن سب میرے پیارے بچے ہیں۔

۲

تجھے کسی شہر کی عظمت کا اندازہ صرف اُس کی آبادی اور دولت سے نہیں کرنا چاہیے بلکہ اُس کے بچوں کی قلتِ اموات، اُس کے گھروں، کھیل کے میدانوں، کتاب خانوں، مدرسوں، شفاخانوں، بدکرداری، چوری اور قتل کو مدِنظر رکھ کر کرنا چاہیے۔

۳

یاد رکھ کہ کوئی تہذیب سطحِ عام سے محض عورتوں کی عزت اور اُن کے عیبوں کی وجہ سے بلند نہیں ہو سکتی

۴

اپنے گناہوں پر نظر رکھتے ہوئے تجھے انتقام اور تعزیر کے لئے قید خانے تعمیر نہ کرنے چاہئیں بلکہ روح اور اُس کے اخلاقی امراض کے لئے عدالتوں اور قید خانوں سے شفاخانوں کا کام لینا چاہیے۔

۵

تجھے یاد رکھنا چاہیئے کہ صنعت کی پیداوار اشیا اور منافع نہیں ہے بلکہ اس قسم کے مرد اور عورتیں ہیں جن کی زندگیاں اُس صنعت میں ڈھلی ہوئی ہوں۔

۶

سیاسی جمہوریت سے صنعتی جمہوریت کی طرف بڑھے جا، یہ ملحوظ رکھتے ہوئے کہ کوئی ایک آدمی اتنا اچھا اور

انناد انشمند نہیں کہ کسی دوسرے آدمی پر بغیر اُس کی رضامندی کے حکومت کرسکے، اور یہ کہ ہر آدمی جن حالات کے ماتحت وہ کام کررہا ہے اُن کے استقلال کے متعلق اپنے دل میں تیقن پیدا کرلے کے لئے عام مزدوری کے علاوہ اپنے دل میں ایک معقول حصہ حاصل کرنے کی خواہش بھی رکھتا ہے۔

۷

تجھے جنگ کو خلافِ قانون سمجھتے ہوئے اپنے ہمسایوں کو اپنی بحری طاقت اور فوجی طیاریوں کی طرف اشارے کرکر کے ڈرانا نہیں چاہئیے۔

۸

تجھے صرف سیرت اور خدمت کو مدنظر رکھ کر لوگوں کی عزت کرنی چاہئیے اور رنگ نسل اور گزشتہ محکومی کی وجہ سے کسی کی تحقیر نہیں کرنی چاہیئے۔

۹

تجھے کینہ ورانہ اشتہار یا رنگ آمیز خبروں یا توہین آمیز ناموں کے ذریعہ سے اپنے ہمسایہ کے خلاف کوئی جھوٹی شہادت نہیں دینی چاہیئے۔

۱۰

تجھے یاد رکھنا چاہئیے کہ جب تیرے اپنے آباواجداد وحشی اور جاہل تھے دوسرے لوگ اُن کے لئے تہذیب وشائستگی کی بشارت لائے۔ اب تو دولت مند اور کامیاب ہے، خبردار ہو مبادا تو ایشیا اور افریقہ میں صرف اپنا علم وکمال، اپنے جنگی جہاز، سامان اور متحرک تصاویر ہی لے جائے اور اُس بشارت کو اور اُس کی روح کو اپنے ساتھ لے جانا بھول جائے۔

ریاستہائے متحدہ اور حادثات

ریاستہائے متحدہ امریکا میں حادثات سے نقصانِ جان کی رفتار جنگِ عظیم کی بہ نسبت ڈھائی گنا بڑھی ہوئی ہے۔ حفاظت کے وسائل پر غور کرنے کے لئے ایک انجمن حال ہی میں قائم کی گئی ہے جس کے سامنے گزشتہ سال کے نقصانات کے مندرجہ ذیل شمار واعداد پیش کئے گئے ہیں:-

حادثات کی وجہ سے اموات ۹۵۰۰۰

حادثات میں زخمی ہوئے ۱۰۰۰۰۰۰

صنعت و حرفت کے کارخانوں میں حادثات بتدریج کم ہو رہے ہیں لیکن پچھلے سال کے نقصانات حسبِ ذیل ہیں:-

اموات ۲۳۰۰۰

زخمی ۳۰۰۰۰۰۰

ان حادثات کی وجہ سے مال کا بھی بہت نقصان ہوا۔ کل نقصان کا اندازہ ۱۰۰۰۰۰۰۰۰ پونڈ کیا جاتا ہے۔ لیکن صریح نقصان کا تخمینہ یہ ہے:-

مزدوری جو زخمی ہونے کی وجہ سے ضائع ہوئی ۱۶۵۰۰۰۰۰۰ پونڈ

علاج کا خرچ ۳۷۴۰۰۰۰۰ پونڈ

ان حادثات کی ذمہ داری زیادہ تر موٹر کار پر عائد ہوتی ہے، خصوصاً بچوں کے معاملہ میں۔ گزشتہ سال ریاستہائے متحدہ میں مدرسہ کی عمر کے بیس ہزار بچے حادثات سے مر گئے۔

یورپ میں بدھ مذہب کی تحریک

مسٹر اے اتچ۔ پرکنس نے برطانیہ اور آئرلینڈ کی سٹوڈنٹس بدھسٹ ایسوسی ایشن کے سالانہ ڈنر پر "یورپ میں بدھ مذہب کی تحریک" کے عنوان سے جو سبق آموز تقریر کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں اس تحریک کو جاری ہوئے کوئی تیس یا چالیس سال کا زمانہ گذر چکا ہے جب سر ایڈون آرنلڈ نے "لائیٹ آف ایشیا" کے نام سے ایک قابلِ قدر کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب نے پہلے پہل اہلِ مغرب کو بدھ مت کی حقیقت اور اُس کی تعلیم سے آگاہ کیا۔ اسی کتاب کی بدولت مغرب کے بہت سے آدمیوں نے بدھ مذہب کے بانی مہاتما بدھ کے ساتھ اپنی دلی ارادت اور عقیدت کا اظہار کیا۔ ۱۸۹۶ء میں عظمت مآب انگاریکا دھرم پال شکاگو سے جہاں مذاہب کی کانگریس منعقد ہوئی تھی انگلستان تشریف لے گئے۔ آپ نے بھکوا نند امیٹا کیلئے مشن کا راستہ صاف کر دیا جنہوں نے ۱۹۰۹ء میں اپنے وطن میں پہنچ کر بدھسٹ سوسائٹی آف گریٹ برٹن اینڈ آئرلینڈ" قائم کی۔ مسٹر فرانسس جے پین اس سوسائٹی کے ایک نہایت مستعد اور سرگرم کارکن ہیں جنہوں نے مغرب میں بدھ مت کے عقائد کی اشاعت میں اس قدر حصہ لیا ہے کہ اور کوئی شخص ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا

مسٹر پین کے بعد مسٹر جے ایف میک کچاٹن کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے انھوں نے ادبی پہلو سے مغرب میں بدھ مذہب کی تحریک کو فروغ دیا ہے۔ انھوں نے اس مذہب کی خوبیوں کے متعلق کوئی بیس کتابیں لکھی ہیں۔ اور بدھ مذہب کے مقدس صحیفوں کے بعض حصوں کا چوپالی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ مسٹر پین نے ڈاکٹر ڈھالکے آنجہانی کی کتابوں کا بھی ترجمہ کیا ہے۔

ڈاکٹر ڈھالکے نے جرمنی میں بدھ مذہب کی اشاعت میں تحریر اور تقریر کے ذریعہ سے نمایاں حصہ لیا ہے۔ جرمنی کے علمی حلقوں نے ڈاکٹر موصوف کے انتقال پر رنج اور افسوس کا اظہار کیا۔ اس وقت برطانیہ میں بدھ مذہب کی اشاعت کے لئے تین انجمنیں کام کر رہی ہیں۔ بدھسٹ لاج مہابدھی سوسائٹی اور سٹوڈنٹ بدھسٹ ایسوسی ایشن۔ ان میں آخرالذکر انجمن سب سے چھوٹی ہے۔ لیکن سب سے چھوٹی ہونے کے باوجود یہ اپنے تبلیغی فرائض کو سرگرمی سے انجام دے رہی ہے۔

تصحیح

مئی کے ہمایوں میں میاں بشیر احمد صاحب کی ایک نظم "پھولوں کے دن" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی اس نظم کے دوسرے بند کا ایک شعر شائع ہونے سے رہ گیا ہے۔ یہ شعر اور اس کے پہلے اور بعد کا ایک ایک شعر یہاں درج کیا جا رہا ہے ناظرین تصحیح فرمالیں۔

یہ راحتیں ہیں چار دن
یہ چاہتیں ہیں چار دن
اک دن بلائے جائیں گے
آخر سُلائے جائیں گے

باہم یہ چاہت پھر کہاں ۔۔۔ باہم یہ راحت پھر کہاں

مادام لابراں

مادام لابراں ملکِ فرانس کی ایک حسین اور باکمال مصورہ تھی۔ اپنی تصاویر بنانے میں اُسے خاص شغف تھا مقابل کی تصاویر اُس کے اپنے موقلم کے دو نقوش ہیں جو دنیائے مصوری میں بڑی شہرت اور قبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

مادام لاپراں

مادام لاپراں اور اُس کی بیٹی
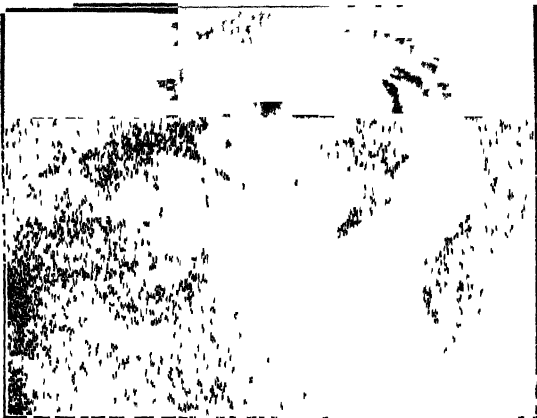
اقوالِ زرّیں

ادب (لٹریچر) کی قدر نہ کرنا انسانی جوہر کی تذلیل ہے۔

جس وقت چاند نکل آتے اور آفتاب ابھی افقِ مغرب ہی پر جلوہ فگن ہو، تم اپنے گرد نظر ڈالو کہ اور بھی زیادہ حسین ودلربا منظر نظر آئیں گے۔

جب کبھی دو آدمی یکجا ہونگے اُن کا نگران کوئی نہ کوئی ضرور ہوگا۔

اُدھر آفتاب نے باغ کی مشرقی دیوار پر سے جھانکا، اِدھر لالہ وگل شبنم سے منہ دھوکر اور سنہری غازہ مل کر آموجود ہوئے اُس وقت باغ کسی بشاش ماں کے دل کی طرح شگفتہ ہوجاتا ہے۔

ہر تصویر اپنے مصوّر کا عکس ہے۔

بے خبری سرّازلی کا سایہ ہے۔

ماضی کی دولت کا اندازہ حال کی روشنی ہی میں کیا جاسکتا ہے۔

انسان کا نہایت قدیم اور لاعلاج مرض اُس کا ایسی چیزوں کے ساتھ ہتک آمیز برتاؤ کرنا ہے جو اس سے زیادہ عظمت رکھتی ہیں۔

تنہائی کا غلبہ صرف اُس وقت ہوتا ہے جب ہم یہ فراموش کرجاتے ہیں کہ ہر خیال اور احساس کے دو پہلو ہیں۔

کسی کی روح کا اندازہ اُس کے سن کی درازی سے نہ کرنا چاہیئے بلکہ درحقیقت خود اُس شخص کا اندازہ اُس کی روح سے کرنا چاہیئے۔

بعض کی عظمت ان کے نصب العین کی وجہ سے ہے جس کی تکمیل میں وہ کوشاں ہیں اور بعض گلہائے سرِراہ کے مانند دلکش ہیں۔

انہوں نے اپنی عقل ودانش کے عین کمال میں تیرا تمسخر کیا لیکن تیری سادگی کی روشنی میں اُن کے چراغ گل ہوگئے۔

پھول ہوں یا جواہرات ۔۔۔۔ داد ودہش نہیں بلکہ اس کا احساس ہے جو دل پر نقش ہوجاتا ہے۔

اُن تاریکیوں میں سے جو تجھ پر چھائی ہوئی ہیں بعض اس لئے ہیں کہ تجھے دوسروں کی نظروں سے پوشیدہ رکھیں اور بعض اُس حقیقت کو چھپانے کے لئے ہیں جس سے تجھے آگاہ کرنا منظور نہیں۔

کوئی شخص نہ ایسی آنکھوں سے جن کو مایوسی نے دھندلا کردیا ہو کائنات کی حقیقت کا اندازہ کرسکتا ہے اور نہ ایسی آنکھوں سے جو گھمنڈ میں سرشار ہوں ۔۔۔۔ پھر بھی ان مناظر کی تجلیاں کس قدر بیش بہا ہیں۔

علو لذت کا معیار یہ ہے کہ چار کو چکھنے سے اُس نیتری کے رنگ کا پتہ لگالیا جائے جس نے اُس کی پتیوں کا طواف کیا تھا

(ای ای سپیٹ)

عزیز احمد خاں

نواہائے راز

شوخی ہے کس کے ناز کی ہر موجِ آب میں
تمکیں ہے کس کے حُسن کی ریگِ سراب میں

سینا کا ذرّہ ذرّہ بنا جس سے آفتاب
حیراں ہوں مَیں وہ نُور ہے اب کس حجاب میں

تجھ سے حکایتِ دلِ بےتاب کیا کہوں
ڈرتا ہوں مر نہ جاؤں کہیں اضطراب میں

ہے ذرّہ ذرّہ میں غمِ پنہاں عیاں مرا
ہوں داغ ماہتاب میں سوز آفتاب میں

اہلِ ریا سے ہے تجھے چشمِ وفا اگر
ٹھیرا اس قدر کہ موج رواں ہو سراب میں

اب تک فریب جوہر اشیا نہ کُھل سکا
ہے حسنِ بے نقاب بھی کس حجاب میں

حامد علی خاں

رابرٹ لوئی سٹیون سن

قمیصیں گریبانوں سے پھٹی ہوئی تھیں، چہروں پر سیاہی چھا رہی تھی اور بال جھلسے ہوئے تھے لیکن جنگل میں یہ مختصر سی دلیر جماعت اپنے اُس بے رحم اور خطرناک دشمن (آگ) کے ساتھ برسرِ پیکار تھی جس سے کیلیفورنیا کی خوش گوار سرزمین کے رہنے والوں کو اکثر سابقہ پڑتا تھا۔

آگ کے آخری شعلے ابھی بھڑک رہے تھے کہ کسی کے خشک گلے کی بیٹھی ہوئی آواز آئی سو یکھو! دیکھو! اُدھر اور آگ لگ گئی"۔ جہاں وہ کھڑے تھے اُس جگہ سے تھوڑے ہی فاصلہ پر آسمان دھوئیں سے سیاہ ہو رہا تھا۔ ایک ہی نظر کافی تھی اور پھر اس مختصر سی فوج نے اپنی کلہاڑیاں اٹھائیں اور اپنے تھکے ہارے اعضا کو ایک نئی مہم پر آمادہ کرتے ہوئے اس طرف دوڑ پڑے۔ تباہی و بربادی کے اس منظر کے قریب پہنچ کر اُن کی حیرت زدہ آنکھوں نے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ دو درختوں سے شعلے نکل رہے تھے اور مخمل کی جاکٹ پہنے ایک بلند قامت شخص مجنونانہ انداز سے سلگتی ہوئی گھاس پر اپنی سوٹی مار رہا تھا۔ آگ کے ساتھ جنگ کرنے والے گروہ نے فوراً آگے بڑھ کر دونوں درختوں کو کاٹ ڈالا اور شعلوں پر جلد ہی قابو پا لیا گیا۔

پھر وہ اس بلند قامت مخمل پوش شخص کی طرف بڑھے تاکہ دریافت کریں کہ آگ کیونکر شروع ہوئی اور وہ وہاں کیوں کھڑا ہے۔ اُن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ ایک ہی پُرخطر لمحے میں انہیں اپنے تمام سوالات کا جواب مل گیا۔ بلند قامت اجنبی کے پاؤں میں آدھی کھلی ہوئی دیا سلائی کی ایک ڈبیا پڑی تھی اور کچھ تیلیاں اِدھر اُدھر بکھری تھیں۔ یہ اس بات کا کافی ثبوت تھا کہ اجنبی نے جان بوجھ کر درختوں کو آگ لگائی ہے۔ یہ خیال ایک بجلی کی طرح لوگوں کے دماغوں میں پھر گیا۔ وہ اندھادھند اس پر ٹوٹ پڑے اور نہایت وحشیانہ طور سے انہوں نے اپنے پنجے اُس پر جما لئے۔

یہ ایک ایسا وقت تھا جب دنیا اپنے اُس عظیم ترین ادیب کو کھو دینے کے قریب پہنچ گئی تھی جس کی تحریروں نے چھوٹوں بڑوں کو ہمیشہ یکساں طور پر خوش کیا ہے۔ ابدیت کی سرحد پار کرنے میں ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا کہ خوش قسمتی سے لوگوں نے اُس کا بیان سن لیا۔ اور اُس کی جان لینے سے رک گئے۔

معلوم ہوا کہ سٹیون سن جو کچھ دنوں کے لئے کیلی فورنیا آیا ہوا تھا یہاں کے جنگلوں میں آگ کے سرعت کے ساتھ پھیل جانے کی وجوہ پر غور و فکر کر رہا تھا آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ آگ کو بڑھنے میں وہ کاہی مدد دیتی ہے جو کثرت

کے ساتھ درختوں کے تنوں سے لپٹی رہتی ہے۔ اس سے خالی الذہن ہو کر کہ اگر یہ نظریہ صحیح نکلا تو اس کے نتائج و عواقب کیا ہونگے خوبصورت خوابوں اور خیالوں میں محو رہنے والے شاعر نے جیب سے دیا سلائی نکالی اور بھڑک اُٹھنے والی کاہی کو دکھادی۔

اس عظیم الشان انسان کی زندگی کا یہ واقعہ خوب ظاہر کر رہا ہے کہ وہ اپنے تخیلات کی رَو میں کس آسانی سے بہ جایا کرتا تھا کہ زندگی کی حقیقتیں اور ذمہ داریاں اس کے سامنے ہیچ ہو کر رہ جاتی تھیں۔

رابرٹ لوئی سٹیون سن اڈنبرا میں ۱۸۵۰ء کے زبون ترین مہینے کی منحوس ترین تاریخ تیرھویں نومبر کو پیدا ہوا۔ لیکن وہ تمام روشنی اور گرمی جو اُس کے سالگرہ کے دن سے دریغ رکھی گئی تھی اُس کے قلب کو عطا ہوئی۔ سٹیون سن کی رگوں میں سکاتی خون دوڑتا تھا۔ اپنی محبوب ماں سے اسے ایک کریمانہ طبیعت ملی تھی اور باپ سے وہ رومانی اور شاعرانہ تخیل ورثہ میں پہنچا تھا جس نے بعد میں اس نوجوان کو انجنیری چھڑا کر قلم کاری کا فن اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

سٹیون سن کی پیدائش کے دو سال بعد تین افراد کے اس چھوٹے سے کنبے نے اپنا مکان بدل لیا لیکن اس تبدیلی کا اثر بچے کی صحت پر کچھ اچھا نہ پڑا جو اپنی دوسری سالگرہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ایک خطرناک قسم کی کھانسی میں مبتلا ہو کر سخت کمزور ہو گیا۔ اس مرض نے اور بھی بہت امراض کے لئے راستہ کھول دیا۔ اگلے برس میں نمونیا، پھیپھڑے کی سوجن، سردی کے بخار اور اسی طرح کے کتنے ہی امراض کے پے در پے اُس پر حملے ہوتے۔

ان ابتلاآت میں بھی اُس نے اپنی طبیعت کی شگفتگی کو نہ کھویا۔ بلکہ بستر میں لیٹے ہی لیٹے وہ نئے نئے کھیل اختراع کیا کرتا۔ آخر یہ مکان اُس کی صحت کے لئے خطرناک سمجھ کر چھوڑ دیا گیا اور اب وہ جس مکان میں آئے وہاں تیرہ سال تک اُن کا رہنا مقدر ہو چکا تھا۔

لوئی کی زندگی پر اُس اخلاقی تعلیم کا بڑا اثر تھا جو اُسے اپنے ماں باپ اور اپنی کھلائی الیزن کننگھم یا لوئی کی اپنی زبان میں "کمی" سے حاصل ہوئی۔ کمی کتنی محتاط تھی کہ بچے کے اثر پذیر دل پر سوائے روح کو بلند کرنے والی اور جلا دینے والی چیزوں کے کسی دوسری چیز کا اثر نہ ہو۔ یہ سٹیون سن کے اُن الفاظ سے ظاہر ہو گا جو اُس نے اس امر کے متعلق لکھے ہیں:-

"میری تربیت کا سلسلہ "فیملی پیپر" کی کہانیوں سے ہوئی تھی، لیکن وہ خاتون جس کی مروت مجھے یہ کہانیاں سناتی تھی بڑے حساس ضمیر کی مالک تھی۔ "فیملی پیپر" پر اسے اعتماد تھا کیونکہ اُس کی کہانیاں گھرانوں کی کہانیاں ہوتی تھیں۔ ناول نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود پڑھتے پڑھتے اُس کی نفیس اور حساس طبیعت عموماً

رک جاتی تھی اور وہ یہ بے بنیاد خوف ظاہر کردیا کرتی تھی کہ اب "آگے یہ کہانی ناول کی وضع کی ہوتی جارہی ہے" اور "فیملی پیپر" میری معصوم منظوری سے بند کردیا جاتا تھا۔ تاہم نہ وہ اور نہ میں خشک زاہد تھے، اور جب ہفتہ کا دن ہوتا تو ہم کتابوں والی دوکان پر جاتے اور آیندہ اشاعتوں میں سے چھپ چھپا کر اپنے پسندیدہ افسانوں کے بقیہ واقعات پڑھ لیا کرتے۔"

۱۸۵۶ء کے اختتام کے قریب قریب پہلی دفعہ لوئی کے دل میں مصنف بننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس کے چچا ڈیوڈ سٹیون سن نے اپنے بچوں اور بھتیجوں سے حضرتِ موسیٰ کی بہترین کہانی لکھنے والے کو انعام دینے کا وعدہ کیا لوئی خود تو بہ آسانی نہ لکھ سکتا تھا، اسے اجازت دی گئی کہ وہ اپنی کہانی اپنی والدہ سے لکھوالے۔ اس کاوش اور محنت کے لئے جو اُس نے اس کام کو انجام دینے میں صرف کی اُسے ایک خاص انعام دیا گیا۔ اُسی دن سے لڑکے کے دل میں مصنف بننے کا شوق پیدا ہوگیا۔

لوئی کی مکتب کی زندگی مزاحمتوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ اُس کی صحت اسے باقاعدہ حاضری سے روکتی تھی۔ ایک دن اگر اُسے ذرا سی سردی لگ جاتی تو دوسرے دن وہ زکام بن جاتا۔

ایک مدتِ معینہ کے لئے جب اُس کی ماں گھر میں موجود نہ تھی اسے آئیل ورتھ کے ایک اقامتی مدرسہ میں بھیج دیا گیا، لیکن ۱۸۶۴ء میں اُسے اڈنبرا کے ایک اور مدرسے میں تبدیل کردیا گیا جہاں اُس کی حاضری ایک حد تک باقاعدہ رہی، یہاں تک کہ وہ تین سال کے بعد اڈنبرا یونیورسٹی میں داخل ہونے کے قابل ہوگیا۔

اوائلِ عمر ہی میں سٹیون سن کو ادبیات سے ایک گہرا شغف تھا۔ خواہ وہ مدرسے میں ہوتا خواہ گھر میں مختلف قسم کے رسائل اس کے ہاتھ میں رہتے۔

وہ افسانے جن میں اُس کا نوآموز ہاتھ صاف پہچانا جاسکتا ہے ایک ایسے قلم سے لکھے ہوئے نظر آتے ہیں جو اُس وقت بھی جرات و مردانگی کے واقعات کو ادا کرنے میں تھرتھری اور سنسنی پیدا کرنے کی غیر معمولی قابلیت رکھتا تھا۔ ایک افسانہ کا نام "ریکر" تھا۔ ریکر اُس شخص کو کہتے ہیں جو تباہ شدہ جہاز کا مال لوٹے۔ اس میں دو آدمیوں کا ذکر ہے جو نارتھ بروک کے ساحل پر کھڑے ہیں:۔

"دونوں میں سے قوت اور عمر میں بڑھا ہوا ایک لمبا ٹڑنگا بدنما سا شخص تھا جس کے بال خاکستری رنگ کے تھے اور ناک سرخ تھی۔ وہ ایک ماند اور بے رونق سا سنہری فیتے والا انیلا کوٹ، ایک سرخ واسکٹ اور پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ دوسرا کوئی ماہی گیر معلوم ہوتا تھا گو اس کی جاکٹ کی ہر جیب میں سے ایک پستول باہر نکلا ہوا تھا۔ یہ اپنے

دوسرے ساتھی سے زیادہ شریر اور مفسد پرداز نظر آتا تھا۔ پہلے نے کہا "ڈین، وہ مستول سی کیا چیز لٹک رہی ہے؟"
دوسرے نے جواب دیا "میرا خیال ہے یہ کوئی ملاح ہے بہتر ہو کہ اسے جا کر پکڑ لو"
اس کے بعد دل میں ہیجان برپا کرنے والے اور بدن میں تھرتھری پیدا کرنے والے واقعات شروع ہوتے ہیں جن کو پڑھ کر بہت سے لڑکے ڈرتے ڈرتے اپنے بستروں میں لیٹے ہونگے۔

جب لوئی سولہ سال کا ہوا تو اُسے اپنی چند تحریریں مطبوعہ صورت میں دیکھنے کا مسرت انگیز موقع پیش آیا۔ پینٹ لینڈ کی بغاوت پر اُس نے ایک ناول لکھا۔ یہ ۱۸۶۶ء میں شائع تو ہو گیا لیکن اس صورت میں کہ حجم گھٹ کر ایک مختصر سا رسالہ بن چکا تھا جس کا نام ناشر نے "۱۶۶۶ء کی تاریخ کا ایک ورق" رکھا۔ اس کی بہت سی جلدیں خود اس کے باپ نے خریدیں۔

جب مدرسے سے سٹیون سن کے فارغ ہونے کا وقت آیا تو اُس کے باپ کے دل میں فطرۃً یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ بھی ایک ایسا ہی مشہور و معروف انجنیر بنے گا جیسا کہ میں خود ہوں۔ اسی لئے بعد کے ساڑھے تین برس اُس کے آئندہ پیشے کے لئے تیاری میں صرف کر دیئے گئے۔

سند کے حصول کے لئے جامعہ اڈنبرا میں داخل ہونے کے علاوہ سٹیون سن نے ساحلی کارخانوں میں ایک عملی نصاب بھی لے لیا۔ ۱۸۷۱ء میں سٹیون سن نے رائل سکاٹش سوسائٹی آف آرٹس کے سامنے اپنے فن کے متعلق پہلا اور آخری خطبہ پڑھا۔ اس کے بارہ دن بعد اُس کے جادۂ حیات کا رُخ بالکل تبدیل ہو گیا۔ اُس نے اپنے باپ کو بتایا کہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے اب میں اُس فن کے مطالعہ کو جاری نہ رکھ سکوں گا جو اب تک بظاہر میرا مطمح نظر رہا ہے۔ میرا دل تصنیف کے کام کو چاہتا ہے۔ باپ کو اس سے یقیناً بہت بڑا صدمہ ہوا ہوگا کیونکہ اُن کا گھرانہ کئی پشتوں سے انجنیری کے فن میں کمال پیدا کر رہا تھا، لیکن اُس نے سوچا کہ بیٹے کو ایسا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کرنا جو اُس کے مذاق کے خلاف ہے تباہ کن ثابت ہوگا اس لئے اُس کی خواہش کو منظور کر لیا گیا۔ اُس نے انجنیرنگ چھوڑ کر قانون کا مطالعہ شروع کر دیا کیونکہ اُس کے باپ نے اُسے بتایا کہ اگر تم ایک "ناکام مصنف" ثابت ہوئے تو یہ تمہارے لئے اچھا نہ ہوگا۔

قانون کے ابتدائی امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد سٹیون سن نے ایک وکیل کے دفتر میں کام کرنا شروع کیا، لیکن اُس ڈائری سے جو ان دنوں میں وہ لکھا کرتا تھا ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ دفتر کی بے کیف زندگی سے اُس کی روح کتنی بیزار تھی اور آزادی اور کھلی فضا کے لئے اُس کا دل کتنا بے قرار تھا۔

تعطیل کے کچھ دن اُس نے جرمنی میں گزارے اور بلیک فارسٹ کے ایک پیدل سفر نے اُس کے سیاحت کے شوق کو اور زیادہ کر دیا۔ انہیں سفروں کا ایک قابلِ ذکر نتیجہ اُس کی کتاب "ٹریولز وِد اے ڈنکی" ہے۔

جب وہ تئیس برس کا ہُوا تو اسے دو ایسے دوست ہاتھ لگے جو شہرت کے بلند مقام تک پہنچنے کے لئے اُس کے واسطے بہت بڑی مدد ثابت ہوئے۔ ان میں سے ایک مسز سیٹ ویل تھی جس کا انتقال ۱۹۲۴ء میں ہوا اور دوسرا سر سڈنی کالون جو جامعہ میں فنونِ لطیفہ کا پروفیسر مقرر ہوا اور جس نے بعد میں اول الذکر سے شادی کر لی۔ سٹیون سن اب دوستوں سے گھرا ہوا تھا اور یہ ایک ایسی صورتِ حالات تھی جس کی ہمیشہ اُس کو خواہش رہی۔ ایک دفعہ اُس نے اپنے دل کی سب سے بڑی خواہشات کو قلمبند کیا۔ وہ یہ تھیں: اچھی صحت (۲) تھوڑی سی فراغت اور (۳) دوست!

ایک طبیب کے کہنے پر کہ اُسے جنوبی فرانس میں جانا چاہئے وہ اپنی زندگی کے ایک ایسے دور میں داخل ہُوا جس میں اسے بہت سی آوارہ گردی کرنی پڑی "آرڈرڈ سوتھ" میں اُن جذبات کا اظہار ہے جو اُس کے دل میں اپنا محبوب وطن بادلِ نخواستہ چھوڑنے پر پیدا ہوئے۔

۱۸۷۹ء تک کے زمانہ کا اکثر حصہ اُس نے فرانس، لنڈن اور اڈنبرا میں گزارا، اور آہستہ آہستہ افسانے لکھنے شروع کئے۔ اٹھائیس سال کی عمر میں اُس کی پہلی تصنیف "ان لینڈ وائج" شائع ہوئی اور پھر اُس کی مسلسل تصنیفات "نیو اریبین نائیٹس" اور "پکچر سک نوٹس آن اڈنبرا" نکلنی شروع ہوئیں۔ بہت جلد ایک خوش انداز مصنف کی حیثیت سے اس کی شہرت ہونے لگی اور اُس نے بھی اس کے حصول کے لئے اپنی تمام کوششیں وقف کر دیں۔ ادبی دنیا میں بہت جلد اُس نے ایک نمایاں جگہ حاصل کر لی

اگست ۱۸۷۹ء میں سٹیون سن لنڈن سے نیویارک کے لئے جہاز میں سوار ہوا اور وہاں سے کیلیفورنیا پہنچا۔ یہاں وہ مسز اوسبورن سے ملا جسے اُس کی زندگی کے کھیل میں بہت بڑا حصہ لینا تھا۔ آنے والے سال میں اُس نے اس سے شادی کر لی اور یوں اپنے لئے ایک ہمدرد اور غمگسار مددگار حاصل کر لیا۔

سٹیون سن کو اُس کی کمزور چھاتی اور سل کا خوف الپس، ریویرا، بورن موتھ اور ریاستہائے متحدہ میں لئے لئے پھرا۔ آخر کار اُس نے جنوبی سمندروں کی آب و ہوا کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا اور جون ۱۸۸۸ء میں وہ بحر جنوبی کے جزائر کے سفر کے لئے چل کھڑا ہوا جو تقریباً تین سال تک جاری رہا۔ سٹیون سن اُپالو کی دلفریبی سے خاص طور پر متاثر ہوا، جو ساموئی جزائر میں سے ایک جزیرہ ہے۔ یہاں شہر ایپیا سے تین میل دور کی پہاڑیوں پر سٹیون سن

نے اپنا گھر بنایا اور اُس کا نام "ویلما" رکھا جس کے معنی ساموئی زبان میں پانچ پانیوں کے ہیں۔ یہ نام اس مقام کی جائے وقوع کی مناسبت سے رکھا گیا۔ مکان سراسر لکڑی کا بنا ہوا تھا جس میں آرائش و آسائش کا تمام ضروری سامان موجود تھا اور نصف درجن ملکی ملازمین خدمت کے لئے حاضر رہتے تھے۔ سٹیون سن نے اپنے گھر کو ایک قبیلہ وارانہ حکومت کی طرح چلانا چاہا اور خدمت گاروں کے دلوں میں یہ جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی کہ وہ گھر کے انتظام و انصرام میں فخر محسوس کریں۔

شام کے وقت بڑے کمرے میں کھانا چنا جاتا تھا اور اُس کھانے میں تمام ملازمین شامل ہوتے تھے۔ یہاں مختلف تجاویز پر بحث ہوتی تھی یا سٹیون سن سب کو کچھ پڑھ کر یا بانسری بجا کر سناتا تھا۔ بانسری کا وہ بہت مشتاق تھا۔

تمام دیسی لوگ سٹیون سن کو "داستان گو" کہتے تھے۔ وہ اُس کی بڑی عزت کرتے تھے، اور وہ اُن کی عزت کا مستحق بھی تھا۔ اُس مصیبت کے وقت میں جب بحرِ جنوبی کے جزائر کی حکومت مسئول بن رہی تھی اور دیسیوں میں بے چینی زور شور سے پھیلی ہوئی تھی سٹیون سن نے ساموئی قوم کا معاملہ دنیا کے سامنے پیش کرنے میں اپنی ساری کوششیں صرف کردیں۔ وہ ایک اولوالعزم انسان تھا اور دیسیوں نے اُس کی مہربانیوں کو کبھی فراموش نہ کیا۔ انہوں نے اس کی اتنی عزت کی جتنی اُن کے تصور میں آ سکتی تھی۔ انہوں نے نشیب و فراز کو ہموار کر کے اُس کے گھر تک ایک سڑک بنادی اور اُس کا نام "محبت کرنے والے دل کی راہ" رکھا۔

سالگرہ کی وہ دعوت جو نومبر ۱۸۹۴ء میں اُس کے اعزاز میں منعقد ہوئی آخری ثابت ہوئی۔ تیسری دسمبر کو سٹیون سن نے اپنی صحت کو بہتر محسوس کیا اور لیکچر دینے کی غرض سے امریکا کے سفر کے متعلق باتیں کرتا رہا۔ پھر وہ شام کے کھانے کی تیاری میں اپنی بیوی کو مدد دینے کے لئے برآمدہ میں آیا۔ یکایک اُس کے منہ سے نکلا "وہ کیا ہے؟" اور اُس نے اپنے سر کو ہاتھوں سے تھام لیا۔ "کیا میں عجیب سا نظر آرہا ہوں؟" اُس نے پوچھا۔ ایک لمحہ بعد وہ گھٹنوں کے بل گر پڑا۔ چند گھنٹوں میں "داستان گو" کو سکون مل چکا تھا اور اُس کی خانہ بدوشی ختم ہو چکی تھی۔

ر ف ل   منصور احمد

لاہور کی ایک شام

شامِ عید

(۱)

میری نظروں میں ہے وہ انجمنِ برہمِ حسن
وہ جنونِ تپشِ عشق وہ خوئے رمِ حسن

بزمِ ہستی پہ ہی چھایا ہوا اک عالمِ حسن
ذرہ ذرہ نظر آتا ہے مجھے محرمِ حسن

ایک مہتابِ لطافت کی جھلک دیکھی ہے
حسن دیکھا ہے کہ پھولوں کی مہک دیکھی ہے

اُس کی آنکھوں سے ہی سرمستیٔ صہبائے بہار
اُس کے جلووں سے ہی رنگینیٔ گلہائے بہار

روحِ تنویر ہے وہ انجمن آرائے بہار
سامنے اُس کے اگر آئے تو شرمائے بہار

اُس کی باتوں سے محبت کا فسانہ رنگیں
اُس کی اک برقِ تبسم سے زمانہ رنگیں

عشقِ پامال کہاں حسنِ سرافراز کہاں
دامنِ عرش پہ ہو خاک کی پرواز کہاں

میری تقدیر میں وہ انجمنِ ناز کہاں   اتفاقات یہ ہوتے ہیں خدا ساز کہاں

فلکِ حسن کے تارے سے محبّت ہے مجھے

اپنی تقدیر کی رفعت سے شکایت ہے مجھے

(۲)

نہ کر سکوں گا نہ ہو سکے گا بیاں ترے حسنِ دلنشیں کا   نظر ہی یا بیخودی کا ساغر جبیں ہی یا چاند چودھویں کا

عرق عرق ہو گیا ہی چہرہ تمام گلہائے نازنیں کا   نسیمِ گلشن سنا رہی ہی فسانہ گیسوئے عنبریں کا

فلک پہ تارے دمک رہے ہیں کہ تُو نے افشاں چنی ہوئی ہی   زمیں پہ تاروں کا نور ہے یہ کہ تیری آرائشِ جبیں کا

وہ آنکھ سے آنکھ کیا ملائیں وہ جلوۂ ناز کیا دکھائیں   کہ نوجوانی کی شوخیوں پر نقاب ہے چشمِ شرمگیں کا

چراغ ہیں آفتاب و مہتاب آپکی چشمِ دلبری کے   بہشت اک نقشِ رنگ پرور ہی آپکے روئے آتشیں کا

فروغِ تنویرِ صبح ہے یا جبیں کسی شوخِ ماہرو کی   بہارِ لیلائے شام ہی یا سیاہ آنچل کسی حسیں کا

نثار ہیں مہر و ماہ و انجم تمہارے دامانِ گوہریں پر   ضیا فروزِ نظر ہے عالم تمہارے دامانِ گوہریں کا

لگائے ہیں چار چاند تُو نے دیارِ لاہور کی زمیں کو

کہ ذرہ ذرہ چمک رہا ہے دیارِ لاہور کی زمیں کا

عابد

کلیاں

میں ایک چھوٹی بچی سے ملی - اُس کے ہاتھوں میں بہت سے پھول تھے بعض پھولوں کے ساتھ تیز تیز کانٹے بھی تھے - اور اُس کے ہاتھ زخمی اور لہو لہان ہو رہے تھے - میں نے دیکھا کہ اُس کے چہرے پر آنسوؤں کے ہلکے ہلکے نشان بھی ہیں جیسے وہ ابھی ابھی رو کر چُپ ہوئی ہے - بچے روتے ہیں اور رو کر انہیں سکون مل جاتا ہے لیکن بڑے خون کے آنسو روتے ہیں اور اُن کا ہر آنسو جو گرتا ہے پارہ ہائے دل کو اپنے ہمراہ لاتا ہے -

میں نے کہا "ننھی بچی! کیا میں تیرے لئے کچھ کر سکتی ہوں؟"

اُس نے جواب دیا "نہیں، کچھ نہیں، کوئی بھی میری مدد نہیں کر سکتا -

میں نے کہا "میری جان مجھے بتا کہ تجھے کیا دکھ ہے شاید میں تیری مدد کر سکوں"

اُس نے کہا "میری چھوٹی بہن پچھلے ہفتے مر گئی تھی اور یہ پھول لے کر میں اُس کی قبر پر جا رہی ہوں" اور آنسو اُس کی آنکھوں سے پھر بہنے لگے -

میں نے کہا "پھر تو ننھی بہن خوش ہو جائے گی، کیونکہ وہ تمہیں اپنے جنت کے گھر سے دیکھے گی اور اب وہ تم سے بڑا پیار کرتی ہے"

"جاؤ جاؤ" بچی نے کہا "تم میری بات نہیں سمجھیں - آخری مرتبہ جب میں نے اپنی چھوٹی بہن کو دیکھا تو اُس نے مجھ سے میری گڑیا پیار کرنے کو مانگی تھی مگر میں نے انکار کر دیا ـــــ آہ، تم اب بھی نہیں سمجھیں! میں اب اُس کو اپنی گڑیا کبھی نہیں دے سکوں گی -

---

قریب قریب اندھیرا ہو چکا تھا اور میرا راستہ قبرستان میں سے ہو کر گزرتا تھا ـــــ خدا کی چپ چاپ دنیا میں سے ہو کر + ایک فوری جذبہ نے مجھے عام راستے سے ہٹا کر ایک طرف کر دیا اور وہاں قبروں کے پیچھے میں نے ایک آدمی کو دیکھا - اُس کا چہرہ زرد اور ملول تھا اور اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں -

"کیا تم بیمار ہو؟ میں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا، کیونکہ اُس کے خاموش رنج اور یاس میں کچھ ایسا اثر تھا جس نے میرے دل کو پگھلا دیا تھا -

اُس نے کہا "میرا جسم تندرست ہے لیکن میرا دل بیمار اور میری روح علیل ہے، کیونکہ مٹی کے اس سرسبز ڈھیر کے نیچے وہ عورت سوتی ہے جسے مَیں اپنی جان کی طرح عزیز رکھتا تھا مگر ــــــ میں نے اُسے یہ کبھی نہ بتایا"

مَیں نے اپنا سر خاموش دلسوزی میں جھکا لیا اور اپنے راستے پر چل دی۔ میں کیا کہہ سکتی تھی؟ کیوں، آہ کیوں، میری بہنو اور میرے بھائیو، ہم اپنے جذبات کو اپنے سینوں میں دبائے رکھتے ہیں، یہاں تک کہ وہ جن کے ساتھ یہ وابستہ ہوتے ہیں اس دنیا سے چل بستے ہیں؟ کیوں ہم اپنی محبت کو اُس وقت تک چھپائے رکھتے ہیں جب اس کے اظہار کا وقت گزر چکتا ہے؟ کیوں؟ آہ کیوں؟

للی ایلن — عبدالعزیز خاں

درد جانکاہ تھا جب تار درست ہو رہے تھے میرے آقا!
اب اپنا راگ چھیڑ اور مجھے اُس درد کو بھول جانے دے۔
اب جو کچھ اُن بے رحم دنوں میں تیرے دل میں مستور تھا مجھے حسن میں محسوس کر لینے دے+
کم ہوتی ہوئی روشنی میرے دروازے پر آ کھڑی ہے۔ اُسے گیتوں میں رخصت ہونے دے۔
اپنا دل میری زندگی کے تار تار میں بھر دے میرے آقا! میرے ہر تار کو ایسی راگنیوں سے بھر دے جو تیرے تاروں سے نازل ہؤا کرتی ہیں!

وہ دن جو میرے تیرے درمیان حائل ہے اپنی رخصت کا آخری آداب بجا لاتا ہے۔
رات اپنے چہرے پر اپنا نقاب ڈال لیتی ہے اور اُس ایک چراغ کو جو میرے کمرے میں جل رہا ہے چھپا دیتی ہے
تیرا تاریک خادم دبے پاؤں آتا ہے اور عروسی قالین بچھا دیتا ہے کہ وہاں اُس ہُو کی خاموشی میں تو میرے ساتھ تنہا بیٹھے یہاں تک کہ رات تمام ہو جائے!

گلچیں

رجائیت اور ...

رجائی فلسفی ریلف والڈو ٹرائین اپنی ایک کتاب کا آغاز ان عجیب الفاظ سے کرتا ہے :-
"ایک رجائی دس منزلہ مکان سے گرا، جو ہر منزل پر بلند آواز سے یہ کہتا سنائی دیا کہ اب تک تو خیر ہوں"
ٹرائین اتنا لکھ کر پوچھتا ہے، "کیا وہ گرنے والا دیوانہ تھا؟" پھر خود ہی اس کا جواب دیتا ہے کہ "وہ ہوشیار تھا اور دانش مند تھا۔ ہاں وہ رجائی تھا۔ رجائین کا شیوہ صبر و سکون ہوتا ہے، چاہے وہ آماجگاہِ بلیات ہی کیوں نہ بن جائیں۔"

رجائی کون ہے۔ دنیا نے رجائیت کا مفہوم غلط سمجھ رکھا ہے۔ رجائی قطعاً اُس شخص کو نہیں کہتے جو دنیا کے نشیب و فراز اور رموزِ حیات سے ناآشنا اور نابلد ہو۔ اس قطع و قماش کے لوگوں کو تو غافل اور بیوقوف کہا جاتا ہے۔
رجائیت کا مفہوم بہت ارفع اور بلند ہے۔ رجائی اپنی زندگی کا ثبوت ہمیشہ عمل ہی سے دیتا ہے۔ خارزارِ زندگی کے وہ تمام خوفناک مصائب و نوائب جن کا سامنا ہر ایک انسان کو کرنا پڑتا ہے ایک رجائی کے لئے ہمت شکن اور ہراس انگیز نہیں ہوتے۔

اول تو وہ تدبیر ہی سے سنگِ حوادثِ روزگار کا جواب دیتا ہے، اگر کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی تو اُس کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے لیکن وہ اس کشمکشِ حیات میں رونا تو درکنار کڑھنا بھی گناہ سمجھتا ہے اور ہمیشہ خنداں پیشانی رہتا ہے"
یہ ہے رجائیت کا مفہوم جو کرنل ہارٹ نے رسالہ "صحت اور تندرستی" میں ظاہر کیا ہے۔ رجائیت کا اصل الاصول دنیا میں خوش رہنا ہی ہے۔ اس حقیقت با بہرہ سے ہر ایک ذی عقل آشنا ہے کہ جو مرض مزمن ہو اس کے درد و کرب کو طوعاً و کرہاً برداشت کرنا پڑتا ہے پھر اس سے کیا فائدہ کہ مریض افسردہ خاطر اور پژمردہ دل بن کر رہے اور اُس کی پیشانی پر غم و الم کے نشان نمایاں رہیں۔
"تاثراتِ غم واقعی انسان کے لئے سمِ قاتل کا کام کرتے ہیں لیکن خوش رہنا تریاق ہے اور خوش طبعی سو دواؤں سے بہتر دوا ہے۔"

زہرِ غم۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ موسمِ خزاں میں درخت ٹنڈ منڈ ہو جاتے ہیں۔ مگر جاڑے کی سرد ہوا درختوں کی چھال ہی پر اثر انداز ہوتی ہے اور درختوں میں جوہرِ حیات باقی رہتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح شجرِ زندگی کا معاملہ ہے۔

سیلِ حوادث کے ریلوں میں اُس کی صوری حالت تو بہت کچھ بدل جاتی ہے لیکن نشو و نما میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا، ہاں اگر دیمک لگ جائے تو درخت بھی گر جاتے ہیں اور شجرِ زندگی بھی کوئی دن میں زمین پر بچھ جاتا ہے۔ آپ پوچھیں گے کہ شجرِ زندگی کے لئے دیمک کیا چیز ہے۔

سنو! ——— غمِ روزگار میں خوف و یاس کا پیدا ہونا قاطعِ حیات ہے۔ شیکسپیر غمِ روزگار کو حیاتِ انسانی کے لئے سب سے بڑی مضرت سمجھتا ہے، اسی طرح بعض دوسرے مشاہیر کا بھی یہی خیال ہے۔ مجھے غمِ روزگار کی مضرت سے انکار نہیں لیکن یہ دقیق راز ایک عربی روایت میں پنہاں ہے۔ وہ روایت یہ ہے کہ ایک سیاح "طاعون" سے ملا اور اُس سے پوچھا کہ "کہاں جا رہے ہو؟" طاعون نے جواب دیا "بغداد میں پانچ ہزار اشخاص کی جانیں لینی ہیں وہاں جا رہا ہوں"۔ اتفاق سے سیاح اور "طاعون" کا پھر واپسی پر ملنا ہوا۔ سیاح نے تنک کر کہا: "ظالم! شاید جھوٹ بولنا بھی تمہاری سرشت میں ہے۔ پانچ ہزار جانوں کے بجائے پچاس ہزار جانیں لے لیں؟" طاعون نے متانت اور سنجیدگی سے جواب دیا "مجھے واقعی پانچ ہزار اشخاص کی جانیں لینی تھیں لیکن پینتالیس ہزار جانیں خوف و یاس نے موت کے گھاٹ اُتار دیں"۔

قلب کی قوت ۔ قلبِ انسان میں وہ وہ زبردست قوتیں اور محیر العقول طاقتیں پوشیدہ ہیں کہ اُن سے کام لیا جائے تو تقدیریں بدل سکتی ہیں۔ مسٹر کوئے نے قلبِ انسان کی ان قوتوں اور طاقتوں کا صحیح طور پر اندازہ کر کے ہر ایک بیماری کی علت دل ہی کو بتایا ہے۔ واقعات اور تجربات شاہد ہیں کہ آئے دن اُس کے شفا خانہ میں اعجاز کے کرشمے دیکھنے میں آتے ہیں۔

مدت ہوئی کہ لورپول کے ایک پادری نے جس کو بے خوابی کے مرض نے ستا رکھا تھا کسی محکمہ میں ملازمت کر لی۔ ابھی اُس نے ملازمت کا جائزہ نہ لیا تھا کہ اُس کے دل میں یہ شک پیدا ہو گیا کہ میں اس موذی مرض کے سبب اپنے فرائض تندہی سے سرانجام نہ دے سکوں گا۔ آخر وہ سوچ سوچ کر اس نتیجہ پر پہنچا کہ ملازمت کا خیال ہی دل سے نکال دیا جائے۔ قریب تھا کہ وہ استعفےٰ دے دیتا لیکن پھر کچھ سوچ کر سیدھا ڈاکٹر کے پاس گیا اور اُس سے مشورہ لیا۔ ڈاکٹر نے ہدایت کی کہ چند دن ٹھیر کر میرا علاج کرو، میں ایک مجرب سفوف دیتا ہوں اس کے استعمال سے امید ہے کہ تمہارا مرض جاتا رہے گا۔

یہ سُن کر پادری کے دل میں خیال گزرا کہ ایک مزمن مرض کے لئے صرف سفوف کا استعمال کیا فائدہ دے گا۔

اسی اثنا میں ڈاکٹر نے سفوف کی شیشی اُٹھا کر پادری کو دینی چاہی لیکن اُس کی ہیجر مچر سے ڈاکٹر نے تیور بھانپ لئے اور وہ سفوف دینے سے انکار کردیا۔ پادری نے سفوف کے حصول کے لئے بے حد اصرار کیا لیکن ڈاکٹر نے اس کی التجاؤں کو ٹھکرا دیا۔ آخر پادری کبیدہ خاطر ہوکر چلا گیا۔ جب ڈاکٹر سے اس کی کج ادائی کے متعلق پوچھا گیا تو اُس نے مسکرا کر کہا کہ پادری کے دل پر یہ نقش ہوچکا ہے کہ میں ایک مزمن مرض میں مبتلا ہوں، اس حال میں میں نے اُسے سفوف دینا مناسب نہیں سمجھا، کیونکہ یہ فوری علاج اُسے کچھ بھی فائدہ نہ دیتا، اور وہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے بدظن ہوجاتا۔ قلبِ انسان کی قوتیں نہ صرف جسدِ انسانی پر اثر انداز ہوتی ہیں بلکہ اُس کے تمام تر حسیات اور جذبات بھی اُس سے متاثر ہوتے ہیں۔ مثلاً جب سائنس والوں نے ایک مجرم کے عرقِ انفعال کے قطروں کا اور معمولی پسینے کے قطروں کا کیمیائی طور پر تجزیہ کیا تو دونوں میں بین فرق نکلا۔ تم نے قے تو کئی بار کی ہوگی لیکن کبھی اس کی وجہ بھی سمجھی ہے، قے عموماً اشتعالِ جذبہ کے ماتحت کی جاتی ہے۔ یرقان شدتِ غیض و غضب اور خوف و خطر کے سبب ہوتا ہے۔ تم نے سمجھ لیا کہ جسدِ انسانی ہر ایک جذبہ کے ماتحت جدا جدا طور پر متاثر ہوتا ہے۔ گویا تاثرات اور جذبات ہی قصرِ حیات کی تعمیر و تخریب کے ذمہ دار ہیں۔

رجائیین کا مسلک۔ رجائیین کے قلوب میں ہمیشہ فرحت و انبساط کے خیالات، محبت و شفقت اور بردباری کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ ہر حال میں خوش رہنا رجائیت کا اصولِ اساسی ہے۔

تم نے دیکھ لیا کہ رجائیت کیا ہے اور رجائی کسے کہتے ہیں؟ پھر سنو! ——— رجائی وہ ہے جس کو خیالات اور خواہشات پر قابو ہو، ورنہ تخیل کی بے راہ روی اور خیال کی بغاوت قصرِ حیات کو ڈھا دیتی ہے۔ رجائیین کا مسلک یہ ہے کہ جب وہ حادثاتِ دہر اور بلیاتِ آسمانی کا شکار ہوں تو چپ نہ بول دیں بلکہ اُن کا بخندہ پیشانی مقابلہ کریں۔ جو شخص غم و الم کی گھڑیاں ہنس کر گزار دے اُس کی صحت ہمیشہ اچھی رہتی ہے

صادق ایوبی

شکوۂ بیداد

اے کاش! تم یکایک مجھ کو نہ بھول جاتے
اے کاش! یہ اچانک مجھ پر ستم نہ ڈھاتے

اے کاش! دل کی آہیں یوں بے اثر نہ رہتیں
اے کاش! شب کے نالے یوں رائگاں نہ جاتے

سابق کرم کا صدقہ، اتنا تو سوچئے گا
اتنا نہیں ستاتے، اتنا نہیں جلاتے

لاعلمِ جُرم رکھ کر تعزیر کب روا ہے
مانا، مری خطا تھی لیکن مجھے جتاتے

قبل از ثبوت کافی حکمِ سزا نہ دیتے
تحقیقِ جرم کر کے کچھ فیصلہ سناتے

الزام کو سمجھ کر انصاف کو پہنچتے
انصاف کو پہنچ کر توفیقِ خیر پاتے

احسان تو یہی تھا تم مجھ کو بخش دیتے
ارمان تو یہی تھا، تم مجھ پہ رحم کھاتے

لیکن اگر سراسر ظلموں کی ٹھان لی تھی
اظہارِ وجہ کر کے دل کی خلش مٹاتے

تم خضر سے بھی بڑھ کر بیداد کوش نکلے
کشتی ڈبو کے بھی تو باعث نہیں بتاتے

آزادِ بے گنہ پر ناحق ستم کہاں تک
بندہ نواز! یوں تو بندہ نہیں بناتے

حکیم آزاد انصاری

تاریخِ دُنیا پر ایک نظر

دُنیائے حاضرہ

۲۹

جمہوریّت اور قومیّت

جدید یورپ۔ وہ یورپ جس پر انقلابِ فرانس کا طوفان ٹوٹ پڑا اٹھارھویں صدی کے دوران میں بعض اہم تغیرات میں سے ہو گذرا تھا + اُن دولِ یورپ میں سے جو اس زمانے کے شروع میں طاقتور تھیں چار صریح طور پر زوال پذیر ہو چکی تھیں ۔ فرانس جو لوئی چاردہم کے عہد میں عالمگیر قوت کا مدعی تھا اب اپنی عظمت کھو چکا تھا۔ سپین اپنے نئے بوربون فرمانرواؤں کے تخت میں ایک قلیل عرصے کے لئے فروزاں ہو کر ہمیشہ کے لئے نقاہت وگمنامی کی تاریکی میں چھپ گیا۔ سویڈن جو اپنے چندروزہ شان والے بادشاہ چارلس دوازدہم (۱۶۹۷ء تا ۱۷۱۸ء) کے عہد میں ایک بالٹکی سلطنت قائم کرنے پر تلا ہوا تھا اُس نے پھر اپنی عزلت نشینی اختیار کرلی۔ ڈچ جمہوریہ اپنی بحری اور نو آبادی سیادت کھو کر سیاست سے کنارہ کش ہو گئی اور حسبِ سابق اپنے کاروبار میں مصروف ہوئی +

ان کمیوں کو پورا کرنے کے لئے چار دوسری مملکتیں اثر و قوت بڑھا رہی تھیں + برطانیہ عظمیٰ باوجود امریکی بغاوت کے دھماکے کے اپنی بحری قوت اور زر و مال کے بل بوتے پر بہ نسبت ملکہ این کے عہد کے بے انتہا درجہ زیادہ طاقتور ہو چکا تھا۔ آسٹریا نے اپنی جلیل القدر ملکہ میریا ٹریزا (۱۷۴۰ء تا ۱۷۸۰ء) کی خردمندانہ سرکردگی میں برِ اعظم میں اپنے مرتبے کو خاصا بلند کرلیا تھا۔ پرشیا فریڈرک اعظم (۱۷۴۰ء تا ۱۷۸۶ء) کی غایت درجہ دوربین لیکن انتہا درجہ بے لگام حکومت کی مساعی سے ایک اعلیٰ درجہ کی فوجی مملکت بن گیا تھا۔ اور پھر روس نے جو اٹھارھویں صدی کے شروع میں بجائے ایک یورپی طاقت کے ایک ایشیائی مملکت تھی بحیرۂ بالٹک کی طرف اپنا منہ موڑا اور دائرۂ مغرب میں قدم رکھا +

پرشیا کا عروج آسٹریا اور فرانس دونوں کو نہایت ناگوار گذرا اور اس لئے انہوں نے دوسری طاقتوں کے ساتھ مل کر اُسے کمزور بنانے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا - جنگِ ہفت سالہ (۱۷۵۶ء تا ۱۷۶۳ء) نے اس کشمکش کا فیصلہ کیا + اس جنگ سے پرشیا زیادہ تر برطانوی اور ہینوویری امداد کے باعث فتح مند ہو کر نکلا + اُس کی فوجیں جن کا ناظم و قائد فریڈرک تھا یورپ میں قوی ترین خیال کی جاتی تھیں -

یورپی حلقۂ دول میں روس کی آمد "توازنِ قوت" کے لئے نہایت خلل انداز ثابت ہوئی + روس کے رویے میں یہ تبدیلی کہ وہ مشرقی حکومتوں کی سب سے مغربی مملکت کے بجائے اب مغربی حکومتوں کی سب سے مشرقی مملکت بن گیا پیٹر اعظم (۱۶۸۹ء تا ۱۷۲۵ء) کا کام تھا + وہی تھا جو بالٹک میں سویڈن کی فائق ترین قوت کے مقابل میں آیا اور ۱۷۰۳ء میں اُس مقام پر جو اُس وقت تک سویڈی علاقے میں شامل تھا اُس نے سینٹ پیٹرز برگ کا شہر بسایا + اٹھارھویں صدی میں روس زیادہ تر جرمنوں سے مغربی عادات و اطوار سیکھنے میں مصروف رہا + ۱۷۷۲ء میں اُس نے پرشیا اور آسٹریا کے ساتھ مل کر پولینڈ کی تقسیم میں (جو ۱۷۹۳ء اور ۱۷۹۵ء میں تکمیل کو پہنچی) جو حصہ لیا اُس سے ظاہر ہو گیا کہ اُس کی تعلیم تقریباً مکمل ہو چکی ہے +

انقلابِ فرانس - اٹھارھویں صدی ہمہ وطنیت کا زمانہ تھا جب تمام وضع دار اپنے تئیں فرانسیسی تمام بازی پسند انگریز تمام جمہوریت پسند امریکی اور تمام فلسفی اپنے آپ کو جرمن سمجھتے تھے - لیکن پولستان کی تقسیم اور خاتمے سے قومیّت کا وہ سویا ہوا جذبہ بیدار و متہیج ہو گیا جو انیسویں صدی میں ہمہ وطنیت کو اپنے طوفان میں غرق کرنے والا اور نوعِ انسان کے مدارج کا غالب ترین اصول بننے والا تھا +

علاوہ بریں اٹھارھویں صدی ایک "اشرافی" زمانہ تھا جس میں امرا رؤسا افسر پادری اور دوسری خاص حقوق رکھنے والی جماعتیں ایسے عیش و آرام سے محظوظ ہوتی تھیں جن سے عوام الناس محروم تھے اور ایک ایسے تمدن سے فیض یاب تھیں جس کی بنیاد اسفل طبقوں کی غلامی پر رکھی گئی تھی +

لیکن یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ جب "فرانسیسی مجلسِ عوام" کا ۱۷۸۹ء میں اجلاس شروع ہوا تو کوئی غیر معمولی واقعہ ہونے والا تھا + زیادہ سے زیادہ یہ توقع تھی کہ شاہی دربار کو اپنے مصارف کچھ کم اور متمول طبقات کو کچھ محصول زیادہ دینے پڑیں گے + جب طبقۂ سوم نے قدیمی دستور کی بیڑیاں توڑ کر اپنے تئیں (مع دوسرے طبقوں کے بعض حساس افراد کے) "مجلسِ قومی" میں تبدیل بھی کر لیا تو کسی شخص نے یہ نہ سمجھا کہ یہ تحریک انگریزی نمونے کی ایک نرم رَو اور طبقۂ متوسط کی ایک تحریک سے زیادہ کچھ حیثیت رکھتی ہے + لیکن پیرسی انبوہ کے قید خانۂ

باستیل کے سر کر لینے" اور ایک ماہ بعد چڑیلوں کے قصر ورسائی پر چڑھائی" کرنے سے یہ امر طشت از بام ہوگیا کہ معاشرتی گہرائیوں میں آتش افشانی شعلے بھڑک رہے ہیں اور شیطانی قوتیں اپنا الّو سیدھا کرنے کے لئے طرح طرح کی کارستانیاں کر رہی ہیں۔

ملک میں جاگیرداری نظام کی فوری موقوفی کے باعث معاشی ہلچل، امرا اور کلیسائی عمائدین کا سرحد پار گریز، شاہی خاندان کے ملک سے بھاگ نکلنے کی کوشش (جون ۱۷۹۱ء)، آسٹریا اور پرشیا کے فرانس پر حملہ کرنے اور انقلابی تحریک کو دبا دینے کی مساعی ان سب اور دیگر اسباب کے باعث اسفل طبقہ انتہائی جوش و خروش سے مغلوب الغضب ہوگیا اور فرانس میں کچھ عرصہ کے لئے "آشوب کی حکومت" کا ڈنکا بجنے لگا (۹۴-۱۷۹۳ء)۔

اُدھر فرانس دشمنوں کے ایک زبردست جتھے سے برسرِ پیکار ہوگیا۔ آسٹریا پرشیا سارڈینیا سپین برطانیہ عظمےٰ ہالینڈ سب مل کر فرانس کے پیچھے پڑ گئے۔ ملک کے اندر خونریز خانہ جنگیاں، اور باہر کے خطرناک پے در پے حملوں کا منظر دیکھ کر اہلِ فرانس نے ایک مربوط و پختہ کار حکومت قائم کی۔ ایک "مجلسِ تحفظِ عامہ" اپریل ۱۷۹۳ء میں بنائی گئی۔ یہ نو ارکین پر مشتمل تھی جنہیں مستبدانہ اختیارات دیئے گئے۔ اکتوبر ۱۷۹۵ء میں اس کی جگہ پانچ اشخاص کی ایک "نظامت" نے لی۔ ۱۷۹۹ء میں اس کے بجائے تین اشخاص کی ایک "قنصلیت" نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی اور آخر میں یہ قنصلیت خاموشی کے ساتھ نپولین بونا پارٹ کی شاہنشاہی سلطنت میں مبدل ہوگئی (۱۸۰۴ء)۔

نپولین بونا پارٹ۔ یہ قسمت کا ایک کھیل تھا کہ نپولین بونا پارٹ جو شاید دنیا کا سب سے بڑا فوجی اور سیاسی مدبر تھا ایک فرانسیسی ہوکر پیدا ہوا۔ ۱۷۶۹ء میں جب وہ پیدا ہوا تو کارسیکا کے جزیرے کو جہاں اس کے ماں باپ کی رہائش تھی وہاں کے حکمران جنوا والوں نے نیلام کیا۔ برطانیہ اُسے لینے کا مشتاق تھا لیکن شوازل کی عجلت اپنے ملک کے کام آئی اور اُس نے اسے فرانس کے لئے حاصل کر لیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو غالباً نپولین جارج سوم کی رعایا ہوکر پیدا ہوتا اور شاید انگلستان جا کر ملاحی کا کام سیکھتا۔

لیکن جو ہونا تھا ہؤا۔ نپولین فرانس میں ایک فوجی مدرسے میں تعلیم پانے کے لئے گیا جب لڑائی چھڑی تو وہ انقلابی فوجوں میں شریک ہؤا جہاں اُس نے اعلیٰ درجے کی فوجی قابلیت اور قوتِ ارادی دکھائی۔ ۱۷۹۶ء میں اسے "فوجِ اطالیہ" کی قیادت عطا ہوئی اور اُس نے بہت جلد یکے بعد دیگرے اپنی حیرت انگیز فتوحات سے یورپ کی کایا پلٹ دی۔ اُس کی فوجی فضیلت سے اُسے ۱۷۹۹ء میں فرانس کی سیاسی تنظیم میں اپنی فیصلہ کن

رائے دینے کا موقع مل گیا۔ وہ اُن تین قنصلوں میں کا ایک ہوگیا جو مطلق العنانی کے ساتھ فرانس پر حکومت کرنے لگے۔ ۱۸۰۲ء میں اُسے تاحینِ حیات "قنصلِ اول" مقرر کیا گیا اور خود مختارانہ اختیارات دے دیئے گئے صلح نامہ آمیاں کے بعد جب کچھ عرصے کے لئے جنگ ختم ہو گئی تو اُس نے اپنی حیرت انگیز قوتیں فرانسیسی حکومت کے اندرونی نظم ونسق میں صرف کردیں۔ شعبہ ہائے حکومت، قانون، مالیات، مذہب، تعلیم، تعمیراتِ عامہ اور ہزاروں اور چیزوں میں اُس نے فرانس کو اور کا اور بنا دیا۔

۱۸۰۳ء میں جنگ کے دوبارہ چھڑ جانے سے اُسے یورپ بھر کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کا موقع ملا۔ اس زریں موقع کو اس نے ہاتھ سے نہ دیا لیکن تبدیلیاں جو اُس نے زندگی کے ہر شعبے میں کیں اس قدر تیز اثر تھیں کہ قومی ردِعمل کا ایک عام طوفان اُس کے خلاف برپا ہوگیا جو بالآخر اُس کی لاثانی قوتوں کے لئے بھی ناقابلِ برداشت ثابت ہوا۔ بالخصوص جرمنی اور اطالیہ میں جہاں ابھی عہدِ وسطیٰ کی گڑبڑ مچی ہوئی تھی اُس نے باضابطہ حکومت کے لئے میدان صاف کردیا۔ اُس نے "مقدس سلطنتِ روما" کے خس وخاشاک کو پھونک دیا اور جرمنی کو تین بڑے حصوں میں منقسم کردیا ایک آسٹریا دوسرا پرشیا اور تیسرا رائین کا "علاقہ منفقہ" جو بلا واسطہ فرانسیسی حکومت کے تحت میں تھا۔ اسی طرح اطالیہ میں اُس نے پاپائیت کی دنیاوی طاقت کا صفایا کردیا اور خود بادشاہ کا لقب اختیار کرکے فی الواقع سارے جزیرہ نما کو اپنی ذاتی حکومت کے تحت میں متحد کردیا اگرچہ یہاں بھی تین انتظامی حصے برابر قائم رکھے گئے۔ اپنے ایک بھائی کو اُس نے ہالینڈ کا بادشاہ بنا دیا دوسرے کو سپین کا۔ لیکن سپین میں اُس کا پانسہ الٹا پڑا کیونکہ یہیں پہلے پہل وہ جنگ شروع ہوئی جس میں نپولین پوری طرح کامیاب نہ ہوسکا۔ اس "جزیرہ نمائی جنگ" میں انگریزوں کا سپہ سالار ولنگٹن تھا اور سپینی پرتگالی اور انگریز تینوں قومیں پہلو بہ پہلو نپولین کے خلاف صف آرا تھیں۔ ۱۸۰۹ء میں نپولین کا زوال شروع ہوگیا تھا۔

ردِّعمل "جزیرہ نمائی جنگ" کی سست رفتار و مضمحل کن لڑائیوں نے براعظم یورپ کی قوموں کو برانگیختہ کیا کہ وہ یکبارگی اٹھیں اور نپولین کا جوا کندھوں سے اتار پھینکیں۔ آسٹریا روس سویڈن پرشیا اطالیہ یکے بعد دیگرے فرانس کے خلاف میدان میں اتر آئے۔ کارسیکی جنگجو نے اپنی سلطنت کو برقرار و استوار رکھنے کے لئے ہر قلیزی کوششیں کیں لیکن اس دشوار کام کا سرانجام کرنا اب انسان کی طاقت سے بالکل باہر تھا۔ ۱۸۱۲ء میں روس کے وحشت اثر حملے میں اُس نے اپنے بہترین جنگجو کھو دیئے۔ لائپزگ کی سہ روزہ لڑائی (۱۸۱۳ء) میں اُسے شکستِ فاش ہوئی۔ اُسے فرانس کی طرف دھکیل دیا گیا جہاں وہ ہتھیار ڈالنے اور تخت سے دست بردار

ہو جانے پر مجبور ہو گیا (۱۸۱۴ء) + آئندہ سال نپولین نے ایلبا کے جزیرے سے نکل کر پھر اپنی قوت قائم کرنے کی کوشش کی لیکن ۱۵ جون ۱۸۱۵ء کو بمقام واٹرلو اُسے پھر شکست ہوئی اور تھوڑے دنوں بعد وہ انگریزوں کے ہاتھ میں قید ہو کر سینٹ ہیلینا کے جزیرے کو سدھارا جہاں مرتے دم تک وہ محبوس رہا + نپولین کی آخری لڑائیوں سے جرمنی اور اطالیہ میں قومیت کے وہ جذبات بھڑک اُٹھے جو اس سے پیشتر صرف پولوں ہی کے دل میں پائے جاتے تھے +

بلاشبہ قومیت اور جمہوریت وہ دو موثر و قوی ترین اصول تھے جو ۱۷۸۹ء سے ۱۸۱۵ء تک کی ربع صدی میں رونما ہوئے + ظفرمند اتحادیوں کے فرمانرواؤں اور وزرا کے نزدیک جو پہلے پیرس میں اور پھر ویناؔ میں (۱۸۱۴-۱۵ء) یورپ کے غیر منتظم برِاعظم کو از سرِ نو ترتیب دینے کے لئے جمع ہوئے تھے یہ دونوں اصول ایک لفظ "انقلاب" میں شامل تھے اور "انقلاب" کا نام سن کر وہ کانپ اُٹھتے تھے + لہٰذا معاہدۂ ویناؔ (۱۸۱۵ء) میں ربّا سوں اور مدبروں نے تابحدِ امکان انقلابی و نپولیانی زمانوں کی یادگاروں کو ایک ایک کر کے مٹانے اور ۱۷۸۹ء سے پیشتر کی حالت کے بحال کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا +

فرانس سپین پرتگال سارڈینیا سوئٹسان میں انہیں خاصی کامیابی حاصل ہوئی + لیکن جرمنی اور اطالوی کٹھ پتلیوں میں پھر جان ڈالنا انسان کے بس کی بات نہ تھی + جرمنی کو انتالیس اراکین کی ایک پوپلی سی "متفقہ حکومت" کی صورت میں منظم کیا گیا + اطالیہ میں قومی اتحاد کے روکنے کے لئے آٹھ ریاستیں جن سب کا ماسوائے ایک کے بالواسطہ یا بلاواسطہ آسٹریا پر انحصار تھا قائم کر دی گئیں + ہالینڈ اور بلجیم کو خاندان اورنج کے ایک شہزادہ کے تحت متحدہ نیدرلینڈز کی بادشاہت میں یکجا کر دیا گیا +

انقلابی تحریکات کا سدِ باب کرنے کے لئے یورپ کے سب بڑے بڑے فرماں رواؤں نے ایک "اتحادِ مقدس" قائم کیا (ستمبر ۱۸۱۵ء) اور نظامِ معاہدات کو استوار رکھنے کے لئے ایک چہار گانہ معاہدہ آسٹریا پرشیا روس اور برطانیہ کی حکومتوں کے مابین نومبر ۱۸۱۵ء میں قرار پایا۔

۱۸۱۵ء سے ۱۸۴۸ء تک آسٹروی وزیر شہزادہ میٹرنکھ کے زیرِ اثر ردِّ عمل کا سایہ یورپ میں دور دورہ رہا لیکن اس مدت کے دوران میں بھی بالخصوص ۱۸۳۰ء میں انقلابی تحریک کی چنگاریاں کبھی کبھی چمکتی رہیں آخر ۱۸۴۸ء میں ایک ہیبت ناک و عالمگیر طوفان کی تاریکیوں میں جمہوریت اور قومیت کی ظفرمندانہ پیش قدمی شروع ہو گئی +

۳۰

قومیت اور شاہنشاہیت

میکانی انقلاب - قدامت پسندی اور ردِّ عمل کے وقت میں بھی جمہوریت اور قومیت کے اصولوں نے بعض جزوی سی کامیابیاں حاصل کیں + نہ صرف ریاستہائے متحدہ امریکہ نے اپنے علاقے زر و مال اور آبادی میں حیرت انگیز تیزی کے ساتھ ترقی کی بلکہ دنیائے قدیم میں بھی جس پر مقدس اتحاد کی کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی برطانیۂ عظمٰی نے اپنا قانونِ اصلاحِ انتخاب (۱۸۳۲ء) اور فرانس نے اپنا "اورلیانی دستور" (۱۸۳۰ء تا ۱۸۴۸ء) حاصل کرلیا + لیکن اس عہد میں جمہوریت سے زیادہ با اثر قومیت کا اٹھتا ہوا جذبہ تھا وہ جذبہ جس کا تقاضا تھا کہ تمام لوگ جو اپنے تئیں ایک "قوم" تصور کریں ایک خود اختیارانہ مملکت قائم کرلیں + ۱۸۲۲ء میں برازیل نے پرتگال سے خود مختاری کا اعلان کردیا ۲۵-۱۸۲۴ء میں کولمبیا میکسیکو بیونس ایرز (آرجنٹینا) پیرو بولیویا چلی کی ہسپانوی نوآبادیات اور وسطِ امریکہ کی بہت سی چھوٹی چھوٹی آبادیاں خود مختار جمہوریات بن گئیں + ۱۸۳۰ء میں بلجیم نے ہالینڈ سے علیحدہ ہوکر معاہدۂ وئینا اور اُس کے کفیلوں کے احکام کو ٹھکرا دیا اور ایک خود اختیاری بادشاہت بن گئی + ۱۸۳۲ء میں یونان نے روس فرانس اور برطانیہ کی اعانت سے ترکی فرمانروائی سے بخوبی وہ آزادی حاصل کرلی جس کے لئے وہ متواتر دس سال مصروفِ پیکار رہا اور آٹو بیویروی کے ماتحت اپنی حکومت قائم کرلی +

لیکن ادھر سامنے دنیا کی تماشا گاہ پر جمہوریے اور قوم پرست قدامت پسندوں سے لڑتے بھڑتے تھے تو اُدھر پسِ منظر نوعِ انسان کے بعض حالات میں ایسی تبدیلیاں ہو رہی تھیں جن کا اثر انسانی تاریخ پر بہت زیادہ اہم و نتیجہ خیز ہونے والا تھا + انیسویں صدی نمایاں طور پر طبیعیات کا زمانہ تھا + خالص خیال کے دائرے میں تجربات اور حیاتیات نے زمانے کی غیر متناہی مدتوں کا انکشاف کیا جیسے کہ سولھویں صدی میں کوپرنیکی ہیئت نے فضا کے غیر متناہی فاصلوں کو طشت ازبام کیا تھا۔ ان انکشافات سے ارتقاءِ زمین کی تاریخ میں انسان کی اصلی حیثیت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہونے لگا + اس کے ساتھ ہی عملی طبیعیات کے حلقے میں ایک میکانی انقلاب جاری تھا جو دور دراز ملکوں کے درمیان ذرائعِ آمد و رفت کے تیز و آسان تر کرنے میں نوعِ انسان کے زیادہ متحد ہونے کا باعث ہوا - یہ وہ اتحاد تھا جس کے نتائج فی زمانہ ابھی ظاہر ہونے شروع ہوتے ہیں + ریلیں، دخانی جہاز، ڈاک، تار، اور ان کے بعد ٹیلیفون، موٹریں، ہوائی جہاز، اور آخر کار لاسلکی پیغامات سے مدتوں کی منقطع شدہ قومیں اور انسانی

تمدن رُو بہ رُو ایک دوسرے کے مقابل آئے + روشنی اور حرارت دونوں وسیع پیمانے پر پیدا کی گئیں + ابھی یہ حکم لگانا ناممکن ہے کہ اس ترقی کا قریبی نتیجہ روشنیٔ طبع ہوگا یا تاریکیٔ فطرت!

یورپ کی نئی توسیع۔ میکانی انقلاب مغرب والوں کا اور بالخصوص برطانیۂ عظمیٰ جرمنی فرانس اطالیہ اور ریاستہائے متحدۂ امریکہ کا کام تھا + علاوہ بریں مغرب نے نہ صرف ایسے ذرائع وضع کئے جن سے وہ دنیا کے دورترین قطعات میں آن کی آن میں نامہ و پیام بھیج سکتا اور جن سے وہ باشندوں اور مال و اسباب کو بعجلت وہاں پہنچا سکتا تھا۔ بلکہ اس نے نئے آلاتِ حرب تندو تیز بارود قوی ہیکل توپیں ناقابلِ نفوذ زرہیں گولی انداز کشتیں بھی ایجاد کیں جن سے بآسانی جس خطۂ زمین کے لئے بھی اُس کا جی للچاتا وہ اس پر اپنا قبضہ جمالیتا۔ اس طرح مغرب نے اپنی تجارت میں مصروف اپنے اکتشافات میں منہمک اور اپنی جدت پسندیوں میں مشغول رہ کر زمین کے بیشتر حصص پر اور جابجا اپنی طاقت کے جھنڈے مضبوطی سے گاڑ دیئے (۱) ریاستہائے متحدہ نے ۱۸۰۳ء میں لوزیانہ اور ۱۸۴۵ء میں ٹیکسس خرید کر اور ۱۸۴۶ء میں کیلیفورنیا کو فتح کر کے تھوڑے عرصے میں اپنی قلمرو کو بہت وسعت دی یہاں تک کہ بحرالکاہل کی قدرتی حد تک اُس کی رسائی ہوگئی + (۲) روس مشرق کی طرف بڑھا اور اُس نے سائبیریا کے وسیع خطے کو اپنے زیرِ قلم کر کے ۱۸۵۹ء میں مشرقی سمندر کے ساحل پر ولیڈی ووسٹک کی بستی قائم کی + (۳) برطانوی سلطنت نے اٹھارھویں صدی کی ناکامی سے سبق لے کر اور اپنے نوآبادی خیالات میں ضروری ترمیمات کر کے بسرعت جلد جلد قدم بڑھائے یہاں تک کہ کینیڈا کی ساری سرزمین آسٹریلیا کا سارا برِاعظم جنوبی افریقہ کے لق و دق میدان اور ہندوستان کی متعدد ریاستیں اور قومیں سب اُس کی قلمرو میں شامل ہوگئیں + (۴) فرانس نے بھی نوآبادی سرگرمی دکھائی اور بتدریج الجیرا (۱۸۳۰ء) طونس (۱۸۸۱ء) آئی وری ساحل (۱۸۹۱ء) ڈہومی (۱۸۹۲ء) مدغاسکر (۱۸۹۵ء) اور مراکش (۱۹۰۴ء) کو اپنے حلقۂ حکومت میں شامل کر لیا لیکن انیسویں صدی کے اخیر سے پہلے صورتِ حالات میں دو عناصر کا ظہور ہؤا + اول تو جرمنی اور اطالیہ نے قومی اتحاد پا کر اپنی مدت کی آرزو پوری کر لی اور دونوں جلد جلد سمندر پار ہاتھ پاؤں مارنے لگے + ان کی جلد بازی اور اس قدرتی خواہش سے کہ انہیں بھی سورج میں نشستیں ملیں جن میں بہت ہی کم باقی رہ گئی تھیں قابض دول کو اپنی حاصل کردہ و مطلوبہ نشستوں کی فکر پڑ گئی جس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ ۱۸۸۴ء میں افریقہ اور ۱۹۰۰ء میں اوشنیا کو "حلقہ ہائے اثر" میں باقاعدہ طور پر تقسیم کر لیا گیا + لیکن اس آسان و دل خوش کن اصولِ تقسیم کو جب چین کی وسیع سرزمین پر عاید کرنے کی تجویزیں ہوئیں تو دوسرا مخالف عنصر رونما ہوگیا + نہ صرف خود چین نے "غیر ملکی شیطانوں" کی ابتدائی کارروائیوں پر غصہ

ظاہر کیا اور مزاحمت شروع کی بلکہ جاپان بھی ایشیائی حقِ خود اختیاری کی حمایت میں میدان میں اتر آیا اور ایک معجز نما طریقے سے مغربی وضع کی ایک اعلیٰ ترین فوجی اور بحری طاقت بن کر اُس نے روسی جاپانی جنگ میں یورپ کی ظفرمندانہ پیش قدمی کو مشرقِ اقصیٰ میں قطعی طور پر روک دیا (۵-۱۹۰۴ء)

قومیت کا بول بالا - جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں انیسویں صدی کے آخری تیس سالوں میں دنیا کی سیاسیات میں خلل اندازی کا سبب وہ نئی قومیں تھیں جو سورج میں نشستیں حاصل کرنے کی خواہاں تھیں + یہ کون تھیں اور کس طرح ظہور میں آئیں؟ ۱۸۴۸ء کی یورپی ہلچل سے عارضی طور پر جمہوریت کے نام کو بٹہ لگ گیا تھا + لیکن اس سے اسی نسبت سے قومیت کا بول بالا بھی ہو گیا اُس لئے کہ اس کی وجہ سے اب بین قومی سیاسیات کی باگ ڈور نرم دل جمہور کے ہاتھ میں نہ رہی تھی بلکہ بزمارک سے "خونی و فولادی آدمیوں" کا وِور سے مشاق مدبروں اور نپولین سوم سے قسمت والوں کے ہاتھ میں تھی -

نپولین سوم (شہرۂ آفاق کارسیکی کا ایک بھتیجا) جو ۱۸۴۸ء میں گمنامی کے پردے سے نکل کر فرانس پر پہلے بطورِ صدرِ جمہوریہ اور پھر بطورِ شاہنشاہ ۱۸۷۰ء تک ایک آفت خیز تزک و احتشام کے ساتھ حکمران رہا اصولاً قومیت کی داد دینے کا گویا وعدہ کر چکا تھا + اس سے وہ بڑی دقت میں پڑ گیا کیونکہ اس سے فرانس میں اسے شان و شوکت کی جستجو میں رہنا پڑا - لیکن پولستان میں اس کے باعث روس سے اس کی ان بن ہو گئی - اطالیہ میں اس کی وجہ سے پوپ کے ساتھ اُس کے تعلقات بگڑ گئے - اور جرمنی میں وہ مجبور ہو گیا کہ اتحاد کے اصول پر اپنی منظوری ظاہر کرے حالانکہ وہ جانتا تھا کہ یہ امر اُس کے اور اس ملک کے لئے خوف و خطر کا سبب ہوگا -

اُدھر جرمنی میں بزمارک نے بغیر فضول تامل کے ۱۸۱۵ء کی کمزور و کم مایہ جرمن متفقہ حکومت کو ۱۸۷۱ء کی مربوط و قوی پرشین سلطنت میں تبدیل کر دیا + مولٹکے اور رُون کی مدد سے پرشین فوج کو از سرِ نو منظم و مسلح کر کے وہ غور و خوض سے اپنی ترکیبوں کو عمل میں لایا اور تین زبردست جنگوں میں اُس نے ڈنمارک (۱۸۶۴ء) آسٹریا (۱۸۶۶ء) اور فرانس (۱۸۷۰ء) کو مغلوب و پسپا کیا + پرشیا کی قیادت میں ایک متحدہ جرمنی کا اعلان ورسائی کے فرانسیسی قصرِ شاہی میں کیا گیا + (۱۸ جنوری ۱۸۷۱ء)

اطالیہ کا اتحاد بہ نسبت جرمنی کے زیادہ دیر اور زیادہ مشکل سے جا کر ہوا + اس کا آغاز ۱۸۵۹ء میں ہوا جب شاہ سارڈینیا نے نپولین سوم کی مدد سے آسٹریوں کو ملان سے باہر نکال دیا اور لومباردی اور پارما کو ملحق کر لیا + اس کا انجام ۱۸۷۰ء میں ہوا جب اسی فرماں روا نے جواب اپنے تئیں شاہ اطالیہ کہتا تھا ظفرمند پرشیا سے متحد ہو کر روما پر

قبضہ جمالیا اور پاپائی ریاستوں کو اپنے علاقے میں شامل کرلیا +

وہی قومی تحریک جس کے باعث جرمنی اور اطالیہ کا اتحاد عمل میں آیا سلطنتِ ترکیہ کے لئے ایک تحلیل کن قوت بن گئی + طول طویل کدوکاوش کے بعد سرویا اور رومانیا کو جنگِ کریمیا کے انجام پر اصلیتہً خودمختار ریاستیں تسلیم کرلیا گیا اور اسی طرح روسی ترکی جنگ کے خاتمے پر معاہدۂ برلن کی رُو سے بلغاریہ اور مونٹی نیگرو کو بھی خود مختار مان لیا گیا +

جنگِ عظیم اور مابعد۔ ۷۸-۱۸۷۶ء کی روسی ترکی جنگ اور معاہدۂ برلن سے بلقانی مناقشات کا خاتمہ نہ ہوًا + عثمانی ابھی نہ صرف قدیمی بازنطینی سلطنت کے دارالسلطنت پر قابض تھے بلکہ ابھی تھریس اور مقدونیہ کے علاقے جن میں بہت سے عیسائی آباد تھے اُن کی قلمرو میں شامل تھے + یہ عیسائی رعایا غیر مطمئن آزادی پرست بغاوت کی خوگر اور تعصب سے آلودہ تھی اور یورپ کی اکثر طاقتیں اُن کی پشت پر تھیں + ادھر ترک جن کا نظم و نسق اب کچھ عرصے سے خراب و خستہ حالت میں تھا بہت سے علاقے کھو کر غم و غصہ سے لبریز تھے + عیسائیوں نے جب موقع پایا بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ ترکوں نے ان کی سرکوبی کرنی چاہی۔ دولِ یورپ اپنے ان چہیتوں کی مدد کو آ دھمکیں۔ اس طرح ترکی سلطنت کے حصّے بخرے ہونے شروع ہوئے +

بلقان میں شورش کے جراثیم کہنہ و مزمن ہو گئے اور بدقسمتی سے اُن کے اثرات دور دور تک پھیلنے لگے + آسٹریا اور روس (ترکی کے متفرق ٹکڑے ہضم کرنے کی خواہش میں) جلد جوع الارض کے مرض میں مبتلا ہو گئے +

پیچیدگیاں بڑھتی گئیں۔ آسٹریا نے جرمنی اور اطالیہ کے ساتھ مل کر ایک زبردست اتحادِ ثلاثہ (۱۸۸۲ء) قائم کیا۔ جس کا سدِباب کرنے کے لئے روس نے فرانس (۱۸۹۷ء) اور برطانیۂ عظمیٰ (۱۹۰۷ء) کے ساتھ ایک ائتلافِ ثلاثہ قائم کرلیا +

بہت سے خطرے اور دغدغے اٹھے اور کئی دفعہ بلقانی جھگڑوں سے ایک بڑی جنگ کے چھڑ جانے کا احتمال ہوًا + ۱۹۰۹ء میں بلقانی ریاستوں نے مل کر بلاوجہ ترکی پر حملہ کر دیا اور ۱۹۱۲ء میں اطالیہ نے طرابلس پر بڑی دیدہ دلیری سے جھپٹا مارا + اس کے علاوہ دولِ عظمیٰ میں غلط فہمی اور باہمی شکایت کے دوسرے اس سے بھی زیادہ شدید اسباب پیدا ہو گئے جس کی بڑی وجہ مالی حسد و عداوت اور شاہنشاہی حرص و ہوا تھی + ۲۸۔ جون ۱۹۱۴ء کو سیراجیوو میں ایک آسٹروی آرچ ڈیوک کا قتل وہ بلقانی چنگاری تھی جس سے بین قومی شرانگیز جذبات کی بارود میں آگ لگ گئی اور اُس کے شعلے اُٹھ اُٹھ کر آسمان سے باتیں کرنے لگے + فرانس ۱۸۷۱ء کی لڑائی میں آلساس

اور لورین کے علاقے کھو کر جرمنی کا جانی دشمن بن چکا تھا- انگلستان جرمنی کی پھیلتی ہوئی تجارت اور بڑھتی ہوئی حرص سلطنت سے خائف ہو رہا تھا- اکھڑ دہقانی روس فہیم و دور اندیش جرمنی کی چالاکی کو دیکھ دیکھ کر غصے سے بے تاب ہو رہا تھا- اُدھر جرمنی ان تینوں سلطنتوں (فرانس کو بھی ہم نے "سلطنت" کہا ہے کیونکہ اگرچہ بظاہر وہ ایک جمہوریہ تھی لیکن اُس کی قلمرو کی وسعت و نوعیت ایک سلطنت کی وضع کی تھی) کی وسعت اور خوشحالی پر خار کھائے بیٹھا تھا اور اپنے علم و ہنر کے باعث اپنے تئیں زیادہ زر و مال اور ایک وسیع سلطنت کا حق دار سمجھتا تھا- آسٹریا اُس کا پروردہ تھا اور اطالیہ بھی بظاہر اس کے حلقۂ اتحاد میں شریک ہو چکا تھا + جنگ کا آغاز ہم- اگست ۱۹۱۴ء کو ہُوا- جرمنی فرانس کے علاقے میں یلغار کرتا ہُوا گھس گیا اور اگرچہ وہ پیرس پر قابض نہ ہو سکا لیکن اتحادیوں کی کثیر التعداد فوجیں اُسے فرانس اور روس کے بعض حصوں سے چار سال تک نہ نکال سکیں- یکے بعد دیگرے دنیا کی اکثر طاقتیں جرمنی کے خلاف صف آرا ہو گئیں- آخر جنگ کا فیصلہ بہتر و وسیع تر ذرائع کی بدولت اتحادیوں کے حق میں ہُوا + قیصر تخت سے اتار دیا گیا اور جرمنی ایک جمہوریہ بن گئی + چار سال تک (اگست ۱۹۱۴ء سے نومبر ۱۹۱۸ء تک) ایک ایسی ہیبت ناک اور تباہ کن جنگ یورپ اور دنیا کے اور بہت سے حصوں میں برپا رہی کہ نوعِ انسان نے کبھی دیکھی سنی نہ تھی- یہ تھے میکانی طبیعیات کی ترقیوں اور نام نہاد "انسانی اتحاد" کے پہلے شاندار نتائج!

۱۹۱۹ء میں بمقام ورسائی صلح نامے پر اقوامِ "مہذب" کے نمائندوں نے اپنے اپنے دستخط ثبت کئے اور ایک انجمنِ اقوام بھی مرتب کی گئی جس کے قیام کی غرض بظاہر یہ تھی کہ وہ مختلف حکومتوں پر اپنا اقتدار قائم کرے بین قومی مناقشات کو عقل و انصاف سے طے کرے اور نوعِ انسان کے باہمی جھگڑوں جھمیلوں کا ہمیشہ کے لئے سدِ باب کر دے +

ریاستہائے متحدہ کے صدر ولسن نے دنیا کے آگے اپنے چودہ اصول پیش کئے جن میں قوموں کے مابین رواداری خود اختیاری اور عدل و انصاف قائم کرنے کی تلقین کی گئی تھی + محکوم قومیں سمجھیں کہ ہمارا نصیبہ جاگا اور ہماری ترقی کے دن آ گئے + لیکن یہ اُن کی نادانی تھی کیونکہ تاریخ ہمیں بارہا یہ زریں سبق دے چکی ہے کہ

"انسان بغیر کوشش کے کچھ نہیں پاتا"

بشیر احمد

بیزاری

نہ دے شکستہ دلوں کو فریبِ آزادی
دکھا نہ عشرتِ فردا کا خواب، رہنے دے
نہ پھونک عشق نوازی کا روحِ پُر افسوں
نہ چھیڑ دل کا شکستہ رباب، رہنے دے
اب التفاتِ فراواں کی مجھ پہ چال نہ چل
دکھا یہ اور کسی کو سراب، رہنے دے

نہیں ہے دل کو محبت کی تاب، رہنے دے
یہ لطف، ایہ کرم، بے حساب رہنے دے

جو مجھ پہ گذری ہے اب پوچھنے سے کیا حاصل؟
فضول ہیں یہ سوال و جواب، رہنے دے
ستم جو تُو نے کئے اُن کا اعتراف نہ کر
نہ لے وفاؤں کا میری حساب رہنے دے

جھنجھوڑ کر نہ جگا فتنہ ہائے خوابیدہ
مرے نصیب کو مصروفِ خواب رہنے دے

اسیرِ عشق کو یوں ہی خراب رہنے دے
نہ کر جفاؤں سے اب اجتناب رہنے دے

بُھلا چکا ہُوں جو پچھلا سبق، نہ یاد دلا
نہ کھول درسِ وفا کی کتاب، رہنے دے
بہت ہے بادۂ حرماں الم نصیبوں کو
لگا نہ لب سے خوشی کی شراب رہنے دے
تجھے قسم ہے جوانی کے عہدِ رنگیں کی
مری حیات کو ناکامیاب رہنے دے!

نشانۂ ستم بے حساب رہنے دے
خرابِ حالِ وفا کو خراب رہنے دے

ذوقی

پچیس[۲۵] اور تیس[۳۰]

ان دو میں یوں تو صرف پانچ سال کا فرق ہوتا ہے مگر مجھ سے پوچھو جو تیس[۳۰] ہوں! مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ تیس منفی پچیس پانچ نہیں پچاس ہیں۔ ان کمبخت پانچ سالوں نے کیا کچھ نہ بدلا۔ یوں تو اب بھی خوشی کے وقت ایک کی بجائے دو دو سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر خواب گاہ کی طرف لپکتا ہوں مگر . . . . مگر . . . . .
(داو سچ! خدا کرے تو مرجائے خدا کرے تیرا جنازہ نکلے!) قدرے قلیل ہانپتا ہوا۔ پچیس میں ہانپنا کہاں تھا؟ ہائے پچیس! ہائے وہ دن کہ شیطان علیہ اللعنتہ ہانپتا ہوا پیچھے اور ہم کوسوں آگے!! مگر اب تو ایک نہیں دو بچے ہیں اور اُف غضب کہ جب بیگم بہت کس کر ساڑھی باندھے تو کچھ پہلی سی جھلک دکھائی دیتی ہے مگر اس غریب کا کیا قصور؟ خود میری پچیس والی پتلون مجھے . . . . نہیں مگر سچ جائے جہنم میں یہ بات نہ لکھوں گا۔ ہاں مگر میرے لندن والے درزی کی وہ تاسف آمیز نگاہ مجھے نہ بھولے گی جب اس سال اُس نے مجھے کمر کے گرد ناپا اور کمبخت نے یہ بھی کہہ دیا کہ "جناب اب تو آپ مضبوط ہو رہے ہیں" ہائے اس کمبخت انگریزی زبان کی وسعت تو دیکھو کہ بھدّے کو مضبوط کس خوبصورتی سے کہا!

جی میں آتا ہے کہ کسی طرح وقت کو الٹا پھاند جاؤں۔ کاش کہ ۲۵ کے آگے ۲۴ ہوتا اور پھر ۲۳ اور اس طرح اب میں ۲۰ کے لگ بھگ ہوتا مگر اس کمبخت ملک میں ماں باپ کی خوشی کے لئے باپ بننا ضروری ہے خدا جانے ماں باپ کو بچوں سے اس قدر نفرت کیوں ہے کہ بچے یا بچی کو ماں یا باپ بنا کر چھوڑتے ہیں۔ اللہ میاں کاش تیری کمر موٹی ہوتی اور تجھے وہ سوگ ہوتا جو مجھے ہے! پھر تو تُو ہندوستان کے اماں باوا کی آنکھیں کھولتا کہ بچوں کو اور سو طرح سے مارو مگر شادی سے حلال نہ کرو۔ مگر اللہ میاں کو کوسنے سے کیا ہوتا ہے! وہ ہندوستان میں ہے ہی کہاں؟ یہاں تو مسٹر گاندھی ہیں یا بم والے اور ان کمبختوں کو کسی کے دکھ درد سے کیا مطلب؟ ان کا تو اوڑھنا بچھونا انگریزی حکومت ہے۔ انگریزی حکومت نہ ہو تو خدا جانے یہ کہاں کی مکھیاں ماریں۔

تیس! تیس!! ارے کہاں کے تیس؟ آج کمبخت سال گرہ ہے۔ سچ پوچھو تو تیس بھی محض خواب و خیال ہے۔ کیا اب حسین لڑکیاں کبھی میری نکٹائی جرابیں نہ دیکھیں گی؟ یہ سالگرہ کیا جھریوں کا پیش خیمہ ہے؟
ہاں خوب یاد آیا! اُس کمبخت بڈھے کو تو دیکھو! خدا جانے کئی سو پشت مجھ سے بڑا ہے مگر کل مسکرا کر کہہ رہا

تھا کہ ۲۲ سال کی پرانی پتلون پہنے ہوں اور میری بھولی بیگم کس قدر تعجب سے مسکرا کر اسے کہہ رہی تھی کہ جھوٹ کے تو آپ نپولین ہیں۔ بائیس سال پہلے تو زس آپ کا منہ دھلاتی ہوگی۔" وہ داڑھی مونچھ منڈا بڈھا اس تعریف سے پھولا نہ سمایا۔ چالیا کہیں کا! ایسے فقرے اسے یاد ہیں کہ سچ بولتا ہے اور کوئی اسے باور نہیں کرتا۔ مجھ سے لڑکوں میں لڑکا بنا رہتا ہے، مگر میں کیا اب لڑکا ہوں! ارے او خانہ خراب گذشتہ تیس! تو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ کیا اب جھریاں آئیں گی؟ مگر اس بڈھے کے چہرے پر تو ایک بھی جھری نہیں۔ ممکن ہے آج سے بیس سال بعد میری بھی وہی حالت ہو۔ کس طرح اس چالیے کا مرید بن جاؤں اور اس سے لازوال شباب کا نسخہ حاصل کروں۔ جب سنو یہی سنو کہ وہ بڈھا اُس لیڈی کے ساتھ سیر کو گیا اُس مس کے ساتھ تھئیٹر گیا فلاں حسینہ میم کے ساتھ ٹینس کھیلا فلاں بزم کا وہ روح رواں تھا۔ خدا جانے اس کے پاس کیا جادو ہے؟ جب کوئی لڑکی پاس نہ ہو تو خود میرا دل اس کی طرف کھچا جاتا ہے۔ ضرور اس کا مرید بنوں گا۔

مگر آخر سوچوں تو سہی کہ اس میں بات کیا ہے؟ یونہی میں اُس سے جلتا ہوں یا کوئی بات بھی ہے؟ گمان ہوتا ہے کہ اگر کوئی بات ہے تو صرف یہ کہ اُس نے چالاکی سے پچیس سال کی عمر میں عہد کر لیا ہوگا کہ مس مسجد کی بجائے مس کلیسا کا دم بھرے۔ ہو نہ ہو بات یہی معلوم ہوتی ہے کیونکہ مسجد میں علاوہ درازیٔ ریش کے ضعفِ پیری بھی ہے اور اس کے برعکس مس کلیسا شہید شباب ہے۔ اللہ میاں کاش ہماری مس مسجد بھی مس کلیسا کی طرح پوڈر کریم اور لپ سٹک (Lipstick) کو شرمندۂ احسان کرے۔ پھر تو شاید ہم بھی کبھی بوڑھے نہ ہوں کس مزے سے ہفتے میں ایک دفعہ بھول کر تیری عبادت کریں۔ پھر تو ہماری زندگی سے بھی یہ سالگرہ کی ڈائن شاید دور ہو۔ مگر بچے! بچے!!! پچیس اور ایک نہیں بلکہ ہم خود بچے اور تیس اور دو بچے!! اللہ میاں یہ کیا ستم ہے؟ خدا کے لئے تو بھی اپنی عادت بدل ڈال۔ مجھ پر اور میری اس غریب نیک بخت پر رحم کر! کیا تجھے انگریزی حکومت نظر نہیں آتی؟ ساری دنیا پوچھتی ہے کہ مسلمانوں کو کس نے پیسا؟ کوئی کہتا ہے مولویوں نے کوئی کہتا ہے بنیوں نے۔ ایسے عقل کے اندھے ہیں کہ اس سیدھے سے سوال کا جواب نہیں سوجھتا۔ مسلمانوں کو کس نے پیسا؟ بچوں نے! جسے باور نہ ہو امان اللہ سے پوچھ لے۔ ایک بچہ سقاؤ نے۔

تیس بلکہ اکتیس! اے میرے دادا نانک کے خدا! کیا تو مسلمان نہیں؟ اور اگر تو ہے تو تجھے کیوں حساب آتا ہے؟ اب اکتیس شروع ہے؟ میں مسلمان ہوں، زبان سے، دل سے۔ مجھے گھاٹے کا بیع منظور ہے۔ اپنے تیس لے لے میرے پچیس مجھے دے دے۔ جو یہ منظور نہیں تو کچھ اور کم کر دے۔ میرے باوا کو وہ اُس کا ہونہار الڑھ سا بچہ دے دے۔

فلک پیما

رنگِ بہار

پھر بہار آئی بیاباں گلستاں ہونے لگے
پھر گلستاں رو کشِ رنگِ جناں ہونے لگے

محفلِ انجم میں سازِ سرمدی بجنے لگا
محوِ رقصِ بےخودی پھر آسماں ہونے لگے

کوہ و صحرا کی فضائیں عطر بیں بننے لگیں
رشکِ تاتار و ختن سب بوستاں ہونے لگے

عارضِ حورِ سحر خلدِ نظر ہونے لگا
گیسوئے لیلائے شب عنبر فشاں ہونے لگے

دامنِ صحرا بھی رنگیں ہے کہ گلہائے بہار
جلوہ فرما کارواں در کارواں ہونے لگے

بزمِ ہستی پھر غریقِ بیخودی ہونے لگی
پھر شرابِ حسن کے دریا رواں ہونے لگے

میکشوں پر رازہائے دو جہاں کھلنے لگے
جلوہ ہائے عالمِ بالا عیاں ہونے لگے

عشق پھر گرنے لگا، سجدوں میں پھر گرنے لگا
پھر حسیں ہونے لگے دامن کشاں ہونے لگے

حسن کے مضراب نے چھیڑا ربابِ عاشقی
نغمہائے عاشقی پھر جاوداں ہونے لگے

چومتا پھرتا ہوں پھر گلہائے رنگا رنگ کو
آپ کے جلوے گلوں میں پھر عیاں ہونے لگے

پھر دلِ مہجور سے اک ہوک سی اُٹھنے لگی
داغہائے سینہ پھر آتش فشاں ہونے لگے

اے بہارِ روح جب تُو ہی نہیں آغوش میں
جلوہ ہائے فصلِ گل آزارِ جاں ہونے لگے

اثر صہبائی

وہ نوجوان نازک بدن اور خوبصورت تھا۔

کون سی چیز تھی جو اُسے حاصل نہ تھی؟

..... مسرت .....

ہمیشہ، ہر وقت، ہر جگہ تمنا ایک سایہ کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے رہتی تھی .... بے تاب تمنا۔ دن بھر اُس کا لگاتار چلنے والا دل اُس کی گرفت میں رہتا تھا اور اُس کی تمنا سے بھری ہوئی نگاہیں فضا میں نامعلوم سرزمینوں کے لئے آوارہ رہتی تھیں۔

اور وہ کیا چاہتا تھا؟

... کچھ ... سب کچھ!

بلبل کلی کو سینے سے لگا کر پُردرد گیت گانے لگی اور اُس کی ایک ایک گٹکری صبح کی ہلکی نسیم کی طرح دور دور پہنچنے لگی۔

ہر چیز خاموش ہوگئی، تمام سننے والوں نے اپنی سانس روک لی۔ اور آسمان اور تارے اور چاند تک مسحور ہو کر یہ نغمہ سننے لگے۔

وہ سن رہے تھے اور کیف اور محبت کے جوش سے بے خود ہو رہے تھے۔

کبھی کبھی جب بلبل ذرا ٹھہر جاتی تھی تو کیف اور پُرشوق آرزو کی ایک آہ کائنات میں گونج جاتی تھی۔

"آہ!" زمین کے منہ سے نکلا۔ اور یہ آہ درختوں تک، گھاس تک، ستاروں تک اور چاند تک پہنچ گئی، اور دور پہاڑوں کی چوٹیوں سے اس کی ایک دھیمی سی گونج سنائی دی۔

ہر چیز اس خوابِ سحر میں مدہوش آہیں بھر رہی تھی، اور ان آہوں میں محبت زدہ تمنا چھپی ہوئی تھی۔

بلبل گاتی رہی... چھٹکی ہوئی پُرکیف چاندنی نے گلاب کی جھاڑیوں کو اور بلبل کو اپنی نرم نرم آغوش میں لے رکھا تھا۔ اور ستارے محبت کے راگ کو سن رہے تھے اور ایک نازک تبسم اُن کے ہونٹوں پر کھیل رہا تھا اور وہ کہتے تھے "گائے جا، پیاری بلبل، گائے جا!"

بلبل اپنے لطیف نغموں میں ڈوبی ہوئی محبت کے سوز میں مگن تھی۔ اور گلاب کی کلی کو اپنے سینے سے لگا لگا کر کہہ رہی تھی: "کھل اے محبوب! مجھے بس ایک دفعہ اپنی اچھوتی خوشبو سے اپنا مشام جان معطر کر لینے دے! بس ایک مرتبہ میرا سر اپنی سرخ سرخ پنکھڑیوں میں بس جانے دے! ......"

یوں ہی بلبل منتیں اور التجائیں کرتی رہی اور گاتی رہی یہاں تک کہ بہت سی رات گزر گئی۔ اور پھر اس کے کھنکھناتے ہوئے نغمے دھیمے پڑنے شروع ہوئے۔ اُس کی بلند سے بلند تر ہونے والی آواز میں ناسکون پذیر تمنا سسکیاں بھرنے لگی یہاں تک کہ آخر یہ مغنیہ ایک لمبی آہ بھر کر خاموش ہوگئی۔

اور اس آہ میں سے جو دیر تک گلاب کے پودوں کے اوپر منڈلاتی رہی آرزو، ناکام آرزو کے آنسو ٹپکتے رہے۔

نوجوان دیر تک بلبل کا گانا سنتا رہا۔ بلبل خاموش ہوگئی مگر وہ وہاں سے نہ ہلا۔ بے خواب رات کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے وہ کھڑا رہا۔

آرزو کا کھوکھلا کر دینے والا گھن اُس کی روح کی گہرائیوں میں اترتا جاتا تھا اور اُس کے قلب میں اپنی گرفت مضبوط کرتا جاتا تھا......

جنگل کے قدیم درختوں کے سائے میں سبز سبز گھاس کے اوپر وہ دن رات پڑا رہا۔ اُس کی نظریں صاف آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہیں۔

کہیں سے نسیم کا ایک جھونکا آیا، ابھی وہ باغ کے پتوں سے پوری طرح چھوا بھی نہ ہوگا کہ گھاس کی ننھی ننھی کونپلوں کو ہلکی ہلکی گدگدی کر کے گزر گیا۔

بڑے بڑے درخت اور موٹی موٹی ٹہنیاں بے حس و حرکت کھڑی رہیں۔ اُن کے تنفس کے ساتھ قدیم نیند باہر نکلتی تھی کیونکہ وہ گہری نیند سو رہے تھے اور اُن کے سرمدی خواب میں عظیم الشان اسرار پوشیدہ تھے۔ سبک رَو نسیم چلتی تھی تو وہ بھی اُن کے پتوں کو تھپکاتی ہوئی گزر جاتی تھی کہ کہیں ان کے سکونِ استراحت میں خلل نہ پڑ جائے۔

مگر یہ مُردوں کی سی گہری نیند ان پر کیوں طاری تھی؟

شاید اس لئے کہ اُن کے خوابِ مسحور میں اس نوجوان کو اپنی آرزو کا حل تلاش کرنا تھا؟

وہ پہاڑی ندی کے سرود کو سنتا رہا۔

ندی پہاڑوں کی اُن چوٹیوں پر سے نیچے اتر رہی تھی جہاں برف کے تودے کبھی نہیں گلتے۔ یہ غراتی شور

مچاتی، گول گول پتھروں سے دست و گریباں ہوتی، ٹیلوں ٹیکروں کو گراتی، ڈھلوان پہاڑ کے سینے کو چھیل چھیل کر گھائل بناتی ہوئی چلتی تھی اور اس کی کف آلود لہریں چٹانوں کے ٹکڑے اڑا اڑا کر دیوانہ وار ایک دوسرے سے ٹکراتی تھیں۔

ندی کہاں جاتی تھی؟

اُسے خود خبر نہ تھی . . . . .

ابد سے وہ یوں ہی دیوانہ وار بہ رہی تھی، اپنی منزل سے ہمیشہ بے خبر۔ وہ سمندر میں جا کر ملے گی یا کسی بڑے دریا میں یا کسی وسیع ریگستان میں جذب ہو جائے گی، ندی کو یہ معلوم نہیں۔

اور اس کا شور وغل؟ . . . کیا یہ کسی نامعلوم کے لئے اُس کا غصہ ناتواں نہیں ہے؟ . . . . . .

آرزو!

آرزو کے بارِ گراں سے نوجوان کی پشت دہری ہوگئی۔ اب اس کا تھامے رکھنا اُس کی قوت سے باہر تھا!

اور اس لئے مسرت کی جستجو میں اُس نے دنیا کو طے کرنا شروع کیا۔

بہت دفعہ آفتاب طلوع ہؤا اور غروب ہوگیا۔ دن راتوں سے تبدیل ہوئے اور وقت کی ندی میں سالوں کی لہریں بہتی چلی گئیں۔

اور نوجوان پھر بھی دنیا کی خاک چھانتا پھرا!

بہت سے گاؤں اُس نے دیکھ ڈالے۔ ایک گاؤں میں ایک دفعہ اُس نے مشقت سے تھکے ہوئے کسانوں کو گہری نیند سوتے ہوئے دیکھا چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں پر اندھیرا گھپ چھا رہا تھا۔ قبرستان جیسا سکون۔ خاموشی خوف طاری کر رہی تھی . . . . . اور یہ عالم تھا کہ کتوں کے بھونکنے کی آواز بھی کوئی بمشکل سنتا تھا۔

"مسرت! تو کہاں ہے؟" نوجوان نے چلا کر کہا۔

کوئی جواب نہ ملا۔

وہ ایک جھونپڑی کے دروازے پر پہنچا۔ اُس کا دل کسی نامعلوم اندیشہ سے دھک دھک کرنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد دروازے کے اندر سے اُسے پہلے ایک دبی ہوئی ہائے کی آواز اور پھر ایک مایوس آہ سنائی دی۔

شاید یہ مسرت تھی جو اتنی رات گئے اس سنسان جھونپڑی کی تاریکی میں پڑی کراہ رہی ہے۔

نوجوان مغموم ہو کر وہاں سے چل دیا۔

اُس نے دریاؤں، جھیلوں، وادیوں کو طے کر ڈالا بلکہ ایک بلند پہاڑ پر بھی چڑھ گیا۔

وہاں اُس نے دیکھا کہ ایک چرواہا اپنے ریوڑ کو چرا رہا ہے چھوٹی چھوٹی سخت گھاس پر اوس کے قطرے چمک رہے تھے۔ ہوا بھیڑوں کی اون کے ساتھ اٹکھیلیوں میں مصروف تھی اور بھیڑیں جو صبح کی سردی سے کانپ رہی تھیں چڑھتے ہوئے سورج کی کرنوں سے اپنے آپ کو گرمانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

چرواہا جو ایک نوجوان شخص تھا اور جس کی پیٹھ پر ایک تھیلا لٹک رہا تھا ایک چٹان پر بیٹھا ہوا بانسری بجا رہا تھا اور اپنے خیالات میں گم نیلی دوریوں کو دیکھ رہا تھا۔ سورج کی پہلی پہلی کرنوں کی سی ہلکی ہلکی میٹھی راگنیاں جن میں کسی حسینہ کی آنکھوں کا کیف ملا ہوا ہو اُس کی بنسی میں سے نکلتی تھیں اور ہوا کے کندھوں پر سوار ہو کر دور پہاڑوں کی سفید کہر میں مل جاتی تھیں ۔۔۔ اور اسی طرح ۔۔۔ گھاس پر، پہاڑیوں پر اور جنگلوں پر رینگتی پھرتی تھیں۔

چرواہے کا ریوڑ بھی اُس کے راگ کو سنتا تھا۔

"بتاؤ، مجھے بتاؤ، یہ تم کس کے لئے گا رہے ہو؟"

"کس کے لئے؟ کیا ہوا بھی کسی کے لئے گاتی ہے؟ میں تو اس لئے گاتا ہوں کہ میں موسیقی کے بغیر رہ نہیں سکتا ۔ ۔ ۔ آہ افسوس! ۔ ۔ ۔ میں اُس کے لئے گاتا ہوں جو نہیں ہے۔"

"کیا تم مسرت کو جانتے ہو؟"

"مسرت؟ اپنی ان پہاڑیوں میں مجھے وہ کبھی نہیں ملی۔ یہاں میں ہوں یا میری بھیڑیں ہیں جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو اور کچھ یہ برف اور کہر ہے ۔ ۔ ۔ مسرت یقیناً کوئی جنگل کی پری تو نہیں ہے ۔۔۔ اُن کو میں جانتا ہوں ۔۔۔ ہر ایک کو ۔ ۔ ۔ لوگ کہتے ہیں اس طرف دور ۔۔۔ دور، دیکھتے ہو؟ ۔۔۔ ایک نہایت خوبصورت شہر ہے۔ شاید مسرت وہاں رہتی ۔ ۔ ۔ مگر میں نہیں جانتا ۔ ۔ ۔ ۔ میں ابھی وہاں نہیں گیا ۔ ۔ ۔"

نوجوان کی خواہش اور تیز ہو گئی اور وہ پہاڑ سے اتر کر اس حیرت انگیز شہر کی طرف چل دیا۔

شہر واقعی حیرت انگیز تھا۔ اُس نے اس کی نظیر کہیں نہ دیکھی تھی۔ عظیم الشان عمارتیں، کھلے بازار، تجارت کے مرکز، تماشا گاہیں، باغات، محلات ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ سب آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دینے والی روشنی میں نہائے ہوئے تھے۔ دولت، شوکت اور حشمت ہر جگہ جگ مگ جگ مگ کر رہی تھی۔

ایک بازار سے نکل کر وہ دوسرے بازار میں داخل ہوا۔ ایک پُر فضا باغیچے کے جنگلے کے پاس ایک ننھا سا فقیر لڑکا کھڑا سردی سے کانپ رہا تھا اور اندوہگین آواز کے ساتھ خیرات مانگ رہا تھا۔

نوجوان وہاں سے بڑھ گیا ۔ ۔ ۔

ایک تماشاگاہ کے باہر کھڑے ہوکر کھڑکی سے اُس نے اندر کی طرف جھانکا۔ حاضرین نے ایک نوجوان حسن کار کے کام پر ایک نامختتم جوش کے ساتھ تحسین و آفرین کا ایسا شور برپا کر رکھا تھا جیسے یہ اُن کی کوئی دیوی تھی۔ اور وہ بھی کچھ عجیب کریمانہ انداز سے جھکی اور ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کی مسکراہٹ میں سے مسرت کی کرنیں نکل رہی ہیں۔

لیکن چند لمحوں کے بعد ہی وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ ایک کسل مند انداز سے اُس نے اپنے آپ کو ایک کرسی میں گرا دیا، مایوسانہ طریق سے اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے سے بجایا اور ملول ہوکر رونا شروع کردیا۔

نوجوان نے اس شاندار شہر کو خیرباد کہی اور اُس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

ننھے فقیر کی غم انگیز سسکیاں اور تماشائیوں کی ممدوح دیوی کا مایوسانہ گریہ اُسے آگے ہی آگے لئے جاتا تھا مدتوں وہ آوارہ و سرگرداں رہا۔ آخر وہ ایک تنگ سے پہاڑی درے میں آکر کھڑا ہوگیا جہاں کچھ دشوار گزار ٹیلوں کے درمیان ایک گہرے غار کے اندر ایک قدیم جوگی رہتا تھا۔ لوگوں سے دور اور خدا کے قریب . . . .

اُس نے غار کے اندر جاکر نہایت نرمی کے ساتھ بوڑھے حکیم سے پوچھا "بابا کیا تمہیں معلوم ہے مسرت کہاں رہتی ہے؟"

بوڑھا اپنے آس پاس قدیم تاریخی تحریروں کے ڈھیر لگائے ہوئے قرنوں اور صدیوں کی دانش و حکمت کے موتی رول رہا تھا۔ مدتیں ہوگئیں وہ زمین پر بسنے والے اِس نوجوان کے بے حاصل اور عبث سوال کا جواب دے چکا تھا۔ اُس نے اپنا سفید سر اوپر اٹھا کر اپنی بے نورسی آنکھیں نوجوان کی آنکھوں میں ڈال دیں اور ایک تلخ تبسم اُس کے اترے ہوئے چہرے پر نمودار ہوا۔

کیا اُسے اپنی گذری ہوئی جوانی کا خیال آرہا تھا؟

"مسرت؟ تمہارے لئے؟" پیرِ دانا نے پوچھا اور شک اُس لہجے میں لرز رہا تھا۔

پھر وہ بحرِ خیال میں غرق ہوگیا . . . . .

جب اُس نے اپنا سر اُٹھایا اُس کے لہجے میں درشتی پیدا ہوچکی تھی۔

"دھوکا، آہ دھوکا! . . . مسرت کہیں بھی نہیں ہے! سب ایک خواب ہے!"

نوجوان رونے لگا۔

"پھر مجھے زندگی کی کیا ضرورت ہے؟ یہ مصائب و آلام میں کس لئے برداشت کر رہا ہوں؟ میرے اس آنے

طویل سفر کا حاصل کیا ہے؟"

بوڑھے حکیم کا دل نرم ہوگیا۔ اُسے نوجوان خیال پرست پر رحم آگیا۔

مُت رو، جس راہ کی تجھے تلاش ہے وہ یہ ہے! جا! تُو ابھی جوان ہے! اس راہ سے اب تک کوئی واپس نہیں آیا۔ اگر تُو واپس آگیا تو دنیا میں تُو مسرت سے کرآئے گا!"

اور نوجوان چلا گیا۔ اس کے طویل سفر کی سب کلفت دور ہوگئی، کیونکہ اُس کے دل میں امید پیدا ہوگئی اور ہر روز آرزو کے ساتھ ساتھ بڑھنے اور پرورش پانے لگی۔

وہ دشوار گزار راستوں سے بلندیوں پر چڑھتا گیا . . . . اُس کے آس پاس کی بھوری چٹانیں ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری شعاعوں میں عجب منحوس انداز سے چمک رہی تھیں۔ بلندیوں پر موت منڈلا رہی تھی اور اپنے سانس سے ہواہیں تلاطم پیدا کر رہی تھی۔ زندگی یا جوانی کا یہاں ذکر تک نہ تھا۔ ہر چیز پر ایک بھیانک خاموشی طاری تھی جیسے لعنتِ ابدی کا بادل مسلط ہو رہا ہو۔

نوجوان کی راہ میں جلد ہی ایک قعرِ عمیق آگیا۔ وہ اس سے چند قدم کے فاصلہ پر رک گیا اور اُس کے دل پر تحیر اور خوف کی ایک پُراحترام کیفیت طاری ہوگئی۔

قعر پہاڑ کے اندر ایک بہت بڑی درز کی وجہ سے بنا تھا جس کی گہرائی پہاڑ کی چوٹی سے لے کر اُس کی جڑ تک پہنچتی تھی۔ یہ کچھ زیادہ چوڑا نہ تھا۔ ایک کنارے سے دوسرے تک پھاندنے کے لئے صرف ذرا سی کوشش درکار تھی۔

اس کے عمق میں سے ایک دھندسی اٹھتی تھی اور تحت الارض نہروں اور ندیوں کا شور و غل اپنی گونج کے ساتھ الجھ کر اُس کی تہ سے اوپر آتا تھا جس سے ہوا پُرہیبت اور خوف انگیز ہو جاتی تھی۔

اور غار کے منہ پر کھڑا ہونے والا سنتا تھا کہ کس طرح پردۂ ظلمت کے نیچے عناصر اپنی دہشت انگیز دیوانگی میں ابلتے اور جوش کھاتے ہیں۔

مگر ان میں سے کوئی بات بھی نوجوان کو ڈرا نہ سکی۔

دوسرے کنارے ایک کائی سے ڈھنپی ہوئی بھوری چٹان پر اپنے بازو کے سہارے ایک جنگلی پری لیٹی ہوئی تھی۔

ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنوں میں اُس کے سنہری بال چوکھے سونے کی طرح چمک رہے تھے۔ نوجوان نے

دیکھا کہ اُس کے بلورین جسم میں سے خون کی روانی صاف نظر آرہی ہے، اُس کی چھاتیوں میں ایک نہایت متوازن ومتناسب تموج برپا ہے اور اُس کی نیم وا آنکھوں میں سے پُر اسرار اور مسحور کن نگاہوں کے تیر چھوٹ رہے ہیں۔

نوجوان کے پاؤں اسی جگہ گڑ گئے۔ اُس نے بے قراری سے اپنے ہاتھ اس کی طرف پھیلا دیئے۔ دفعتہً اس پر منکشف ہؤا کہ بلبل کیوں گاتی ہے، پہاڑی ندیاں اس تیزی سے کدھر جاتی ہیں، قدیم اشجار پر پُراسرار خاموشی کیوں چھائی رہتی ہے اور چرواہے کی بانسری کی راگنیاں کہاں کی دعوت دیتی ہیں۔

وہ ملتجیانہ انداز میں اس کے سامنے جھکا ہؤا تھا اور اُس کی مسحور آنکھیں اُس کے رخ سے نہ ہٹتی تھیں —— اس مسرتِ ارضی کے رخ سے!

جنگل کی اس دیوی کی اوٹ میں موت بیٹھی ہوئی تھی۔ بد اندیشانہ وہ اپنے ٹوٹے پھوٹے ہولناک دانت نکال نکال کر منہ چڑاتی تھی اور اپنے تیز خنجر کو قعر کے اُوپر گھماتی تھی۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنیں اس کی چمکتی ہوئی دھار پر پڑتی تھیں اور اُن کا ہلکا سا پرتو اُس گہرے بادل پر باقی رہ جاتا تھا جو قعر میں سے اٹھ رہا تھا۔

بن دیوی وہیں لیٹی ہوئی ہاتھ کے اشارے سے اُسے بلاتی تھی، آنکھوں سے اُسے مسحور کرتی تھی اور اپنے اچھوتے حسن سے اسے مسرور و مدہوش بناتی تھی۔

خنجر ہاتھ میں لئے ہوئے موت ہنستی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ اور خنجر کی آب ہر لمحہ بڑھتی جاتی تھی۔

۔ ۔ ۔ ۔ احمق! ۔ ۔ ۔ ۔ کدھر جاتا ہے؟

نوجوان نے جو اتنی مدت تک مسرت کی جستجو میں مصائب برداشت کرتا رہا تھا اُس کے حسن سے مسحور ہو کر، ایک نظر میں قعر کی پہنائی کا اندازہ کیا اور کود پڑا ۔ ۔ ۔ ۔ مسرت کی آغوش میں نہیں بلکہ موت کے خنجر کی دھار پر۔

اُس دن سے لوگ اس قعر کو قعرِ مسرت کہنے لگے۔

(ماخوذ) منصور احمد

خمارِ دوشین

مآلِ شب سے طلوعِ سحر کا ہے آغاز
ستارہ صبح کا رقصاں ہے والہانہ ہنوز

اسیرِ خوابِ شبستاں میں تھی کوئی شہناز
گلوں کی سیج میں تھا جذبِ ساحرانہ ہنوز

طلسمِ خواب میں آسودہ چشمِ افسوں ساز
ہوئی تھی صبح کی آہٹ سے نیم وانہ ہنوز

خموشیوں کے حجابوں میں تشنۂ آواز
چھپا ہوا تھا کہیں صبح کا ترانہ ہنوز

ذرا سی جنبشِ مژگاں سے تھی وہ نرگس باز
تلاش کرتی ہے جو نیند کا بہانہ ہنوز

اُس انکھڑی میں جو ہے کیفِ خواب کی غماز
جھلک رہی ہے وہی مستیٔ شبانہ ہنوز

جبینِ ناز پہ بکھری ہوئی ہے زلفِ دراز
اِس انتشار کو ہے انتظارِ شانہ ہنوز

برنگِ زلفِ پریشاں خرام کا انداز
خمارِ خواب سے ہے لااُبالیانہ ہنوز

لطیفی

مارواڑی گیت

گیت کسی زبان کے ہوں اپنے اندر ایک خاص اثر رکھتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا مشہور ہندی رسالہ "سرستی" میں ایک مارواڑی گیت شائع ہوا تھا اس کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

کاٹھیاواڑ میں دستور ہے کہ چاندنی راتوں میں وہاں کی عورتیں ایک پُرفضا میدان یا باغ میں جمع ہو کر حلقہ بناتی ہیں اور تالیاں بجا بجا کر اک عجیب انداز سے گیت گاتی ہیں اور ان گیتوں میں اپنا دل کھول کر رکھ دیتی ہیں۔ مندرجہ ذیل گیت کاٹھیاواڑ میں بہت مشہور ہے +

اعظم کریوی

(۱) عورت اپنے شوہر سے کہتی ہے "پریتم پیارے! تم نے جو بیل لگایا تھا وہ اب خوب سایہ دار ہو گیا ہے جب اس کے سایہ میں بیٹھنے کا وقت آیا تو تم پردیس جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ اے میری نیک اولاد والی ساس کے لختِ جگر! تم کمانے کے لئے پُورب نہ جاؤ۔

(۲) تم نے جس سندری سے بیاہ کیا تھا وہ نشۂ شباب سے متوالی ہو رہی ہے جب عیش و آرام کا وقت آیا تو تم پردیس جا رہے ہو۔ اے میری پیاری نند کے بھائی کمانے کے لئے پورب نہ جاؤ۔

(۳) اے میرے مالک، میرے سرتاج! تمہارا گھوڑا کس نے کس دیا، اس پر زین کس نے رکھی، تم کس کی اجازت سے پردیس جا رہے ہو۔ اے میرے ہردیشور (جانِ من) تم کمانے کے لئے پردیس نہ جاؤ"

(۴) شوہر نے جواب دیا "میرے بھائی نے گھوڑا کسا اور ساتھیوں نے اس پر زین رکھی۔ میں پتا جی کی اجازت سے کمانے جا رہا ہوں"

(۵) عورت نے پھر کہا "اے میرے پریتم پیارے! میں تمہارے لئے روپے بن جاؤں گی۔ میں تمہارے لئے پیلی پیلی اشرفیاں بن جاؤں گی (اپنی محنت مزدوری سے روپے اور اشرفیوں کا ڈھیر لگا دوں گی) اے میرے پران دھن! جب ضرورت پڑے تم اسے کام میں لانا۔ اے میری سیج کی زینت پریتم! تم اپنی پیاری کو بھی پردیس لے چلو"

اتنی خوشامد پر بھی شوہر پردیس چلا گیا اور عرصہ تک اُس کی کوئی خیریت نہ معلوم ہوئی اس پر برہ کی ماری مہجورِ الم عورت اپنے شوہر کو خط لکھتی ہے:-

(۶) "اے میرے سوامی تم نہ تو میرے لئے مٹھائی ہی لائے اور نہ کبھی مجھے کھلایا ہی۔ تم نے تو کبھی میرے دل

کی بات ہی نہیں پوچھی۔ اے میری چنچل نند کے بھائی تمہارے بغیر تمہاری گوری کو ایک پل بھی چین نہیں پڑتا۔
(۷) نہ تم کبھی ستلی لاتے اور نہ تم نے کبھی پلنگ بنا جس پر ہم دونوں بیٹھ کر پریم کی باتیں کرتے۔ پریتم اب جلدی گھر آؤ تمہاری پیاری تمہارا انتظار کر رہی ہے۔
(۸) تمہارے پتا جی کو تو بہت دولت چاہیئے اور تمہاری ماں کپڑے کی لالچی ہے لیکن تمہاری گوری سیج کی زینت چاہتی ہے۔ وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ تم کو بلانے کے لیئے وہ کوا اڑا کرتی ہے۔ تمہاری کمائی سے میں باز آئی۔ تم جلدی گھر آؤ"
(۹) شوہر نے اس خط کا یوں جواب دیا "پریتم پیاری! اس مرتبہ مٹھائی لا کر تمہیں پیار سے کھلاؤں گا۔ گھر واپس آکر تمہارے دل کی باتیں بھی سنوں گا۔
(۱۰) اب کی میں ستلی بھی لاؤں گا۔ پلنگ خود بنوں گا اور اس پر ہم دونوں بیٹھ کر محبت کی کہانی سنائیں گے"
(۱۱) عورت پھر لکھتی ہے۔ "پرمیشور۔ میری طرح مست شباب ایم ایک خوبصورت چرخا، ایک رنگین پیڑا اور اچھے لوہے کا تکوا خرید لیں گے اور بیکانیر سے روئی کی پونی لا کر کاتیں گے۔
(۱۲) اے میرے سرتاج! میں چرخا کات کر روپے اور اشرفیاں جمع کر لوں گی تم میرے کاتے ہوئے سوت سے کپڑے بننا یہی کاروبار ہم کریں گے۔ اے میری شوخ نند کے بھائی جلدی گھر آؤ مجھے اب کسی وقت چین نہیں ملتا۔"
(۱۳) شوہر نے اس خط کا یہ جواب دیا "عورت کی کمائی کوئی کاہل اور نکما آدمی یا کوئی عطر فروش یا منہار ہی کھائے گا۔ میں تو ساہوکار کا بیٹا ہوں۔ اے میری پران پیاری! عورت کی کمائی سے کام نہیں چلے گا"
(۱۴) عورت نے لکھا "ساون میں تم نے کھیت بوئے اور بھادوں میں ان کو نہرایا اب کاٹنے کا وقت آگیا اور تم پردیس میں ہو۔ اے میرے ست کمانے والے راجا اب تو گھر آجاؤ تمہاری پیاری کو کسی طرح چین نہیں پڑتا۔
(۱۵) میرے پریتم! گاؤں اجڑ کر پھر بس جاتا ہے۔ غریب امیر ہو سکتا ہے لیکن گئی ہوئی جوانی پھر واپس نہیں آتی۔ اے میرے پران پیارے میں تم کو بار بار کہتی ہوں آؤ! آؤ! جلدی گھر واپس آجاؤ تمہاری پیاری اکیلی ہے۔
(۱۶) ہر دیشور! جوانی ہمیشہ یکساں نہیں رہتی یہ بادل کے سایہ کی طرح ہے وقت پر بویا ہوا کھیت موتی اگلتا ہے۔ میرے دل کے مندر کے دیوتا! تمہاری پیاری تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ جلدی گھر آؤ"

یہاں پر یہ گیت ختم ہو جاتا ہے۔ عورت کا یہ لکھنا کہ میں چرخا کات کر روپیہ جمع کروں گی اور اس پر شوہر کا یہ جواب کہ نکما آدمی ہی عورت کی کمائی کھانے کو تیار ہوگا۔ کتنا سبق آموز ہے۔

اعظم کریوی

بھال کے لئے چلا گیا۔ ننھے خوشحال نے بھی جانا چاہا لیکن وہ جگہ جہاں جنگئی کاٹ کر ریوڑ کے لئے جگہ بنائی گئی تھی بہت دور تھی اور یہ ضروری تھا کہ گھر کی خبر گیری کے لئے کوئی نہ کوئی ٹھہرے۔ اس لئے باپ نے اسے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا۔ اور شاید اس انکار کی وجہ سے بعد میں اُسے پچتانا پڑا۔

دلاور خاں کو گئے چند ہی گھنٹے ہوئے تھے۔ ننھا خوشحال نہایت آرام سے دھوپ میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کی نظریں دور نیلی نیلی پہاڑیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں اس مسرت انگیز خیال سے خوش ہو رہا تھا کہ آئندہ جمعہ کے روز اُسے کوہاٹ شہر میں اپنے حولدار چچا کے گھر جانا ہے۔ وہ انہیں خیالات میں محو تھا کہ یکایک کسی بندوق کے سر ہونے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اُس نے اُٹھ کر اُس طرف نظریں دوڑائیں جس سمت سے آواز آئی تھی۔ اس کے بعد کئی مرتبہ آواز آئی اور ہر مرتبہ یہ آواز نزدیک تر ہوتی گئی۔ آخر اُس راستہ پر جو میدان کی طرف سے دلاور خاں کے گھر کو آتا تھا ایک پہاڑی شخص نمودار ہوا۔ اُس کا چہرہ ڈاڑھی سے ڈھنپا ہوا تھا اور جسم پر چیتھڑے لٹک رہے تھے۔ وہ نہایت مشکل سے اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا اپنی بندوق کا سہارا لئے چلا آتا تھا ابھی ابھی ایک گولی اُس کی ران میں لگی تھی۔

یہ شخص ایک مفرور قاتل تھا جو رات کے وقت شہر سے بارود لینے گیا تھا لیکن بدقسمتی سے پولیس والوں نے اُسے پہچان لیا۔ وہ نہایت ہمت سے مقابلہ کرتا ہوا پسپا ہو رہا تھا۔ ہر ٹیلے پر ٹھہر کر وہ اپنے دشمنوں پر گولیاں سر کرتا۔ لیکن اب سپاہی اُس کے بہت قریب پہنچ چکے تھے اور اُس کی ران کا زخم اسے گرفتاری سے قبل جنگئی تک پہنچنے سے روک رہا تھا۔ آخر وہ خوشحال خاں تک پہنچ گیا اور پوچھا "تم دلاور خاں کے بیٹے ہو؟"

"ہاں"

"میں اکبر خاں ہوں۔ سرخ پگڑی والے میرا تعاقب کر رہے ہیں۔ مجھے کہیں چھپا دو کیونکہ اب مجھ سے ایک قدم بھی نہیں چلا جاتا۔"

"اور میرا باپ کیا کہے گا اگر میں نے تمہیں اس کی اجازت کے بغیر چھپا دیا؟"

"وہ کہے گا کہ تم نے بہت اچھا کام کیا"

"تمہیں کیسے معلوم ہے؟"

"مجھے جلد چھپاؤ کیونکہ وہ پہنچا ہی چاہتے ہیں"

"میرے باپ کے گھر آنے تک انتظار کرو"

بدبخت لڑکے میں کس طرح انتظار کرسکتا ہوں۔ چند ہی لمحوں میں وہ یہاں پہنچ جائیں گے۔ مجھے جلد چھپاؤ ورنہ میں تمہیں مار ڈالوں گا"

خوشحال نے نہایت اطمینان سے جواب دیا "تمہاری بندوق خالی ہے اور تمہاری پیٹی میں ایک بھی کارتوس نہیں"

"میری پیش قبض میرے پاس ہے"

"لیکن کیا تم میرے جیسا تیز دوڑ سکو گے؟" یہ کہتے ہوئے وہ ایک ہی چھلانگ میں اُس کی زد سے باہر ہو گیا۔

"تُو دلاور خاں کا بیٹا نہیں ہے۔ کیا تو اپنے گھر کے سامنے مجھے گرفتار ہو جانے دے گا؟"

بچے کا دل کچھ پسیجا۔ اور نزدیک آتے ہوئے بولا "اچھا اگر میں تمہیں چھپا دوں تو تم مجھے کیا صلہ دو گے؟"

باغی نے اپنے چمڑے کے بٹوے کو ٹٹولا جو اُس کی پیٹی سے لٹک رہا تھا اور ایک اٹھنی نکالی جو اُس نے بارود خریدتے وقت بچا لی تھی۔ خوشحال چاندی کے سکے کو دیکھ کر ہنسا اور اُس کے ہاتھ سے سکہ اچک لیا۔

"اب کسی بات کا فکر نہ کرو"

آناً فاناً اُس نے گھاس کے اُس بڑے ڈھیر میں گڑھا کر دیا جو گھر کے نزدیک ہی پڑا تھا۔ اکبر خاں اُس میں بیٹھ گیا۔ لڑکے نے اس خوبی سے اُسے ڈھک دیا کہ وہ بغیر تکلیف کے سانس لے سکتا تھا۔ اور دیکھنے والے کو شبہ تک نہ ہو سکتا تھا کہ اس میں کوئی انسان چھپا بیٹھا ہے۔ لڑکے نے کچھ دیر اور سوچا اور جلدی سے ایک بلّی اور اُس کے بچے لا کر ڈھیر پر بٹھا دیئے تاکہ ظاہر ہو کہ گھاس دیر سے نہیں ہلایا گیا۔ پھر اُس نے خون کے دھبوں کو جو اُس کے گھر کے نزدیک زمین پر تھے مٹی سے ڈھک دیا۔ اور پہلے کی طرح مطمئن ہو کر دھوپ میں آرام سے لیٹ گیا۔

چند ہی ساعت بعد پولیس کے چھ سپاہی اور ایک افسر دلاور خاں کے دروازے پر کھڑے تھے یہ افسر دلاور خاں کا ایک دور کا رشتہ دار شیر اللہ خاں تھا۔ اس کی مستعدی اور بہادری نے یہاں کے باغیوں کے دلوں کو مرعوب کر دیا تھا۔ بیسیوں کو یہ اب تک گرفتار کر چکا تھا۔

"السلام علیکم ننھے بھائی! ماشا اللہ اب تو تم جوان ہو گئے ہو۔ تم نے ابھی ابھی کوئی آدمی ادھر سے گذرتا دیکھا ہے؟"

"وعلیکم السلام۔ لیکن بھائی جان ابھی میں آپ جیسا جوان نہیں ہوا" لڑکے نے نہایت بے پروائی

سے جواب دیا۔

"تم جلدی ہی جوان ہو جاؤ گے۔ اچھا یہ بتاؤ کوئی آدمی ادھر سے گذرتا ہوا دیکھا ہے"

"اگر دیکھا ہو تو؟"

"ہاں ہاں ایک آدمی جس کے سر پر سیاہ سی ٹوپی تھی اور ایک کا مدار واسکٹ پہنے ہوئے تھا"

"سیاہ ٹوپی اور کا مدار واسکٹ؟"

"ہاں ہاں۔ جلد بتاؤ۔ میرے سوالوں کو دہرانے کی ضرورت نہیں"

"آج صبح مولوی صاحب اپنے گھوڑے پر سوار ادھر سے گذرے تھے۔ انہوں نے میرے باپ کی خیریت پوچھی اور میں نے کہا ــــــ"

"خبیث بچے تم مجھے دھوکا دینا چاہتے ہو، جلد بتاؤ اکبر کس طرف گیا ہے۔ ہم اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اسی گھر کی طرف آیا ہے"

"کیسے معلوم ہے؟"

"مجھے معلوم ہے۔ اور اچھی طرح معلوم ہے کہ تم نے اسے دیکھا ہے"

"کیا نیند میں انسان گذرنے والوں کو دیکھ سکتا ہے؟"

"بدمعاش بچے، تم نیند میں ہرگز نہ تھے۔ بندوقوں کی آواز نے تمہیں جگا دیا تھا"

"خوب! تو تمہیں اس بات کا احساس ہے کہ تمہاری بندوقیں بہت شور مچاتی ہیں۔ اس لحاظ سے میرے باپ کی بندوق کو ان پر تفوق حاصل ہے"

لعنتی لڑکے تمہیں شیطان لے جائے مجھے پورا یقین ہے کہ تم نے اکبر کو دیکھا ہے اور شاید تمہیں نے اسے چھپایا ہے۔ آؤ دوستو! اس گھر میں داخل ہو جاؤ اور اپنی اسامی کو نکال لاؤ۔ وہ صرف ایک پاؤں پر چل سکتا تھا اور بدمعاش میں اتنی سمجھ ضرور ہے کہ اس حالت میں جنگل تک پہنچنے کی کوشش کرنا بے سود ہے نیز خون کے نشان یہیں ختم ہو جاتے ہیں"

خوشحال نے حقارت سے کہا "اور میرا باپ کیا کہے گا۔ میرا باپ کیا کہے گا جب اسے معلوم ہو گا کہ اس کی غیر حاضری میں اس کے گھر کی تلاشی لی گئی ہے؟

افسر نے خوشحال کو کان سے پکڑ لیا اور کہا "نابکار لڑکے میں تیری گفتگو کا لہجہ بدل سکتا ہوں۔ شاید یہیں ہی

کوڑے کھا کر تم سیدھے ہو جاؤ گے۔

خوشحال نے اسی حقارت سے دیکھتے ہوئے اپنے الفاظ پر زور دیتے کر کہا "میرا باپ دلاور خان ہے۔"

"ننھے شیطان تم خوب سمجھ لو کہ میں تمہیں زبردستی کوہاٹ لے جاؤں گا۔ میں تمہیں پھوس کے بستر پر قید خانہ میں بند کر دوں گا، تمہارے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دوں گا۔ اور اگر پھر بھی تم نے نہ بتایا تو تمہیں پھانسی بھی دے دوں گا۔"

بچہ ان تمام دھمکیوں کو سن کر ہنس دیا اور کہا، "میرا باپ دلاور خان ہے۔"

ایک سپاہی آہستہ سے افسر کے پاس آیا اور کہا "آقا ہمیں دلاور سے خواہ مخواہ جھگڑا مول نہ لینا چاہئے۔" افسر شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ ان سپاہیوں سے گفتگو کی جو گھر کے اندر دیکھ آئے تھے۔ انہیں کچھ دیر نہ لگی تھی کیونکہ گھر صرف ایک کمرے ایک برآمدے اور صحن پر مشتمل تھا۔

اس اثنا میں خوشحال نہایت اطمینان سے بیٹھا اپنی بلی کو تھپکیاں دیتا رہا۔ اور پولیس والوں کی پریشانی پر خوش ہوتا رہا۔

ایک سپاہی گھاس کے تودے کے پاس آیا۔ بلی کو دیکھا اور اپنی سنگین گھاس میں چبھو دی۔ گھاس میں کوئی حرکت نہ ہوئی سپاہی اپنی بے وقوفانہ احتیاط پر ہنسا اور چلا گیا۔ بچے کے چہرہ پر ذرا سی گھبراہٹ بھی ظاہر نہ ہوئی۔

افسر اور اس کے سپاہی اپنی قسمت کو رو رہے تھے۔ اور واپسی کے خیال سے میدان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ معًا افسر نے سوچا کہ دلاور خان کے بیٹے پر اگر دھمکیاں اثر نہ کر سکیں تو پیار اور تحفے ضرور اثر کریں گے۔

"ننھے بھائی۔ تم ضرورت سے زیادہ روشن دماغ ہو۔ تم دنیا میں ضرور کامیاب ہو گے۔ لیکن میرے ساتھ اس وقت تم ایک بہت برا کھیل کھیل رہے ہو۔ اگر مجھے اپنے بھائی دلاور کا خیال نہ ہوتا تو خدا کی قسم میں تمہیں ضرور گرفتار کر کے لے جاتا۔"

"خوب!"

"لیکن جب دلاور آئے گا تو تمام قصہ اس سے کہوں گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ مارے چابکوں کے تمہاری چمڑی ادھیڑ دے گا۔"

"اچھا؟"

"ورنہ تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔ لیکن تم بڑے اچھے لڑکے ہو۔ ٹھہرو۔ میں تمہیں کچھ انعام دیتا ہوں"۔
بھائی جان میں آپ کو نیک مشورہ دیتا ہوں۔ اگر تم زیادہ دیر تک اسی جھگڑے میں پڑے رہے تو اکبر جنگلی تک پہنچ جائے گا اور پھر اسے پکڑنے کے لئے تم سے زیادہ پھرتیلے آدمی کی ضرورت ہوگی"۔
افسر نے اپنی جیب سے ایک قیمتی چاندی کی گھڑی نکالی۔ اور یہ دیکھ کر کہ خوشحال کی آنکھیں اُس کے نظارے سے چمک اٹھی ہیں گھڑی کو زنجیر سے لٹکاتے ہوئے کہا "بے وقوف، کیا تم نہیں چاہتے کہ یہ خوبصورت گھڑی تمہارے گلے کی زینت ہو اور تم نہایت شان سے کوہاٹ کی گلیوں میں پھرو۔ اور لوگ تم سے وقت پوچھیں گے۔
"جب میں بڑا ہونگا تو میرا حوالدار چچا مجھے گھڑی خرید دے گا"۔
"لیکن تمہارے چچا کے بیٹے کے پاس ابھی سے ایک گھڑی موجود ہے۔ اگرچہ عمر میں وہ تم سے چھوٹا ہے"
لڑکے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔
"ننھے بھائی، لو یہ گھڑی تمہاری ہے"۔
خوشحال گھڑی کی طرف کنکھیوں سے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کسی بلی کو سالم مرغی دے دی جائے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اس کے ساتھ مذاق کیا جا رہا ہے اور اسے پنجے مارنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ وہ بار بار پیچھے اور ہونٹ چاٹتی ہوئی نظریں پھیر لیتی ہے کہ اُس کا دل للچا نہ جائے۔ اور اپنے مالک کو یہ کہتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ یہ کیا ستم ظریفی ہے
لیکن پولیس افسر نہایت سنجیدگی سے اپنا تحفہ پیش کر رہا تھا۔ خوشحال نے لینے کے لئے ہاتھ نہ بڑھایا لیکن زہر خندہ کر کے بولا "تم مذاق کرتے ہو"۔
"واللہ میں مذاق نہیں کرتا۔ صرف اتنا بتا دو کہ اکبر کہاں ہے اور گھڑی کو اپنا سمجھو"۔
خوشحال ہنس پڑا۔ اُس نے اپنی سیاہ آنکھیں افسر کی آنکھوں میں ڈال دیں جیسے اُس کا دلی منشا پڑھ لینا چاہتا ہے۔ اور دیکھتا ہے کہ اُس کی آنکھیں بھی اُس کے الفاظ کی تائید کرتی ہیں یا نہیں۔
افسر نے کہا "لڑکے میرے ساتھی اس وعدہ کے گواہ ہیں۔ ان کی موجودگی میں اپنے وعدہ سے پھر نہیں سکتا"۔ یہ کہتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ گھڑی کو بچے کی طرف بڑھاتا گیا یہاں تک کہ گھڑی بچے کے چہرے سے چھونے لگی۔ بچے کے چہرہ کی زردی صاف بتا رہی تھی کہ اُس کے سینہ میں لالچ اور مہمان نوازی کے درمیان جنگ ہو رہی ہے۔ اندرونی جذبات کے اثر سے اُس کا سینہ ابھر رہا تھا اور سانس رکا جاتا تھا۔ اس اثنا میں

گھڑی اس کے رخساروں کے پاس ہل رہی تھی اور بعض اوقات اس کے گالوں سے چھُو جاتی تھی۔ آخر کار اُس کا دایاں ہاتھ آہستہ آہستہ اٹھا۔ انگلیوں کے سرے گھڑی سے جالگے اور پھر تمام گھڑی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن افسر نے ابھی تک زنجیر کو نہ چھوڑا تھا۔ گھڑی پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہی تھی اور دھوپ میں اس کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کئے دیتی تھی۔

تحریص زبردست تھی خوشحال نے اپنا بایاں ہاتھ اٹھایا اور اپنے کندھے پر سے تودے کی طرف اشارا کردیا۔ افسر فوراً سمجھ گیا۔ اُس نے زنجیر چھوڑ دی اور خوشحال گھڑی کا واحد مالک بن گیا۔ وہ ہرن کی سی چستی کے ساتھ اُٹھا اور گھاس کے تودے سے دس قدم کے فاصلہ پر جا کھڑا ہوا جسے سپاہی اب الٹ پلٹ کر رہے تھے۔

گھاس میں حرکت ہوئی اور خون میں لت پت ایک انسان ہاتھ میں خنجر لئے ظاہر ہو گیا۔ اُس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اُس کی اکڑی ہوئی ٹانگ نے بوجھ نہ سنبھالا اور وہ گر پڑا۔ افسر نے ایک ہی جست میں اُسے جا دبوچا اور اُس کا خنجر چھین لیا۔ باوجود شدید مدافعت کے لحظہ بھر میں اُس کی مشکیں کس لی گئیں۔

اکبر نے جو لکڑیوں کے گٹھے کی طرح بندھا ہوا زمین پر پڑا تھا۔ اپنا منہ خوشحال کی طرف پھیر کر کہا "۔۔۔ کے بچے"، ان الفاظ میں غصے کے بجائے نفرت اور حقارت تھی۔

خوشحال نے چاندی کا سکہ اُس کی طرف پھینک دیا۔ اُسے احساس ہو رہا تھا کہ اب وہ اس کا حق دار نہیں ہے۔ اکبر نے اس حرکت پر قطعاً کوئی توجہ نہ کی اور افسر سے مخاطب ہو کر بولا "شیر اللہ خاں! اب میں اپنے پاؤں پر چل نہیں سکتا۔ اس لئے یہی مناسب ہے کہ مجھے اٹھا کر شہر میں لے چلو"۔

"ابھی ابھی تو تم گھوڑے سے بھی تیز بھاگ رہے تھے۔ لیکن خاطر جمع رکھو میں تمہاری گرفتاری سے اس قدر خوش ہوا ہوں کہ تمہیں اپنی پیٹھ پر اٹھا کر دس میل تک لے جا سکتا ہوں۔ دوستو! اس کے چغے میں دو ڈنڈے لگا کر ڈولی بنا لو اور پھر ہم نزدیک ترین چوکی سے گھوڑے لے لیں گے"۔

قیدی نے کہا "میں ممنون ہوں۔ لیکن اس قدر اور نوازش کرنا کہ ڈولی میں تھوڑی سی گھاس رکھ لینا تاکہ میں زیادہ آرام سے سفر طے کر سکوں۔"

بعض سپاہی اکبر کے زخموں کی مرہم پٹی کر رہے تھے اور بعض ڈولی بنانے کے اہتمام میں تھے کہ جنگل سے آنے والے راستے میں ایک موڑ پر دلاور خاں اور اُس کی بیوی نمودار ہوتے۔ عورت جنگلی ناشپاتیوں کا ایک بھاری بوجھ اُٹھائے بمشکل چل رہی تھی اور دلاور خاں ایک بندوق ہاتھ میں اور دوسری کندھے سے لٹکائے ٹہلتا ہوا

لیکن دلاور خاں نے سوائے اس کے حرکت تک نہ کی کہ اپنا ہاتھ پیشانی پر رکھ لیا، جیسے کوئی چندھیا گیا ہو۔

خوشحال باپ کی آمد پر گھر کے اندر چلا گیا تھا۔ لیکن اب وہ ایک دودھ کا پیالہ لئے ہوئے نکلا اور آنکھیں جھکائے ہوئے اکبر کو دینے لگا۔

"میری نظروں سے دور ہو جاؤ" اکبر نے چلا کر کہا اور سپاہیوں کی طرف پھر کر کہا "دوستو مجھے پانی پلاؤ"

ایک سپاہی نے اپنی پانی کی بوتل اُس کے ہاتھوں میں دے دی اور اکبر نے اُس شخص کے ہاتھ سے پانی پیا جس کے ساتھ چند منٹ پہلے وہ گولیوں کا تبادلہ کر رہا تھا۔ اور پھر استدعا کی کہ اُس کے ہاتھ بجائے پیٹھ کی طرف باندھنے کے سینہ پر باندھے جائیں۔

"میں چاہتا ہوں کہ آرام سے لیٹا رہوں۔"

سپاہیوں نے اُس کی اس خواہش کو بھی فوراً پورا کر دیا۔ اور پھر افسر نے روانگی کا حکم دے کر دلاور کو سلام کیا لیکن وہ بغیر جواب دیئے میدان کی طرف چلا گیا

قریباً دس منٹ کے بعد دلاور کی زبان کھلی۔ لڑکا اپنی بے قرار آنکھوں سے کبھی ماں کی طرف دیکھتا اور کبھی باپ کی طرف جو بندوق کا سہارا لئے اپنے تمام غصہ کو ایک ہی نقطہ پر مرکوز کئے کھڑا تھا۔

"تمہاری اٹھان اچھی ہے" دلاور نے نہایت دھیمی اور پُرسکون آواز میں کہا۔ لیکن جو لوگ اُس کی طبیعت سے واقف تھے جانتے تھے کہ اس میں کس قدر قہر و غضب پنہاں ہے۔

لڑکا روتا ہوا باپ کے پاؤں پر گر پڑا لیکن دلاور نے غضب ناک ہو کہا "دور ہو جاؤ"

لڑکا سسکیاں بھرتا ہوا باپ سے چند قدم کے فاصلہ پر کھڑا ہو گیا۔ وہ خاموش تھا۔

دلاور کی بیوی نے خوشحال کی جیب سے گھڑی کی زنجیر لٹکتی ہوئی دیکھی اور نزدیک آ کر نہایت سختی سے پوچھا "یہ گھڑی تم نے کہاں سے لی ہے؟"

"شیر اللہ نے دی ہے"

دلاور نے گھڑی چھین کر ایک چٹان پر اس زور سے دے ماری کہ اُس کے ہزاروں ٹکڑے ہو گئے۔

"بیوی۔ کیا یہ لڑکا میرا ہے؟"

بیوی کے رخسار شرم سے سرخ ہو گئے "تم کیا کہہ رہے ہو، خاوند تمہیں معلوم ہے تم کس سے گفتگو کر رہے ہو؟"

"بہت اچھا، لیکن ہماری نسل میں یہ پہلا غدار پیدا ہوا ہے"۔

خوشحال باپ کی خوفناک نظروں تلے پسا جاتا تھا۔ آخر دلاور نے اپنی بندوق سے زمین کو ٹھکرایا اور پھر اسے کندھے پر رکھ کر خوشحال کو پیچھے آنے کے لئے کہا اور جنگل کی طرف چل دیا۔ اُس کی بیوی نے دوڑ کر دلاور کو بازو سے پکڑ لیا اور کہا "یہ تمہارا بیٹا ہے" اُس کی آواز کانپ رہی تھی اُس نے اپنی خوبصورت سیاہ آنکھیں اپنے خاوند کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ وہ اس کا عندیہ معلوم کرنا چاہتی تھی۔

"عورت! میری بات میں دخل نہ دے۔ میں اس کا باپ ہوں"۔

عورت نے بیٹے کو زور سے گلے لگایا اور روتی ہوئی گھر میں داخل ہوگئی۔ اُس نے اپنے آپ کو قبلہ رخ سجدہ میں گرا دیا اور نہایت خضوع و خشوع سے دعا مانگنے لگی۔ اسی اثنا میں دلاور تقریباً دوسو گز راستہ پر چلا گیا۔ پھر ایک بلند ٹیلے پر چڑھ کر اپنی سنگین سے زمین کو ذرا سا کھودا اور اسے حسب منشا نرم پاکر مطمئن ہوگیا۔

"خوشحال! اس بڑے ٹیلے کے نزدیک چلے جاؤ"۔

لڑکے نے حکم کی تعمیل کی اور وہاں کھڑے ہو کر سر جھکا دیا۔

"دعا مانگ لو"

"باپ! باپ!! خدا کے لئے مجھے نہ مارو"

"دعا مانگ لو" دلاور نے خوفناک آواز میں چلّا کر کہا۔

لڑکے نے رکتے رکتے اور سسکیاں بھرتے ہوئے قرآن مجید چند دعائیں پڑھیں۔ ہر آیت کے آخر پر باپ آمین کہتا تھا۔

"لڑکے! کیا اتنی ہی دعائیں تمہیں یاد ہیں!"

"ابّا۔ مجھے مولوی صاحب نے سورۃ یٰسین بھی حفظ کرا رکھی ہے"۔

"یہ تو بہت لمبی ہے، لیکن خیر کچھ مضایقہ نہیں"۔

لڑکے نے نہایت دھیمی آواز میں سورت ختم کی۔

"ختم کر چکے؟"

"ابّا مجھ پر رحم کرو۔ مجھے معاف کردو۔ میں پھر کبھی ایسی حرکت نہ کروں گا۔ میں شیر اللہ سے کہہ کر اکبر کو چھڑا دوں گا"۔

لڑکا ابھی بول رہا تھا کہ دلاور نے بندوق سیدھی کی اور نشانہ لیتے ہوئے کہا "خدا تجھے معاف کرے"
لڑکے نے ایک آخری کوشش کی کہ دوڑ کر اپنے باپ کے گھٹنوں سے چمٹ جائے۔ لیکن وقت گذر چکا تھا۔ دلاور نے بندوق داغ دی اور خوشحال کی لاش گر پڑی۔

دلاور خاں بغیر نعش کی طرف دیکھے کدال لینے کے لئے گھر کو پلٹا تاکہ اپنے بیٹے کی لاش کو دفن کر دے راستہ میں بیوی اس سے ملی، جو بندوق کی آواز سن کر گھبرائی ہوئی دوڑی آتی تھی۔

"تم نے کیا کیا ہے؟"

"انصاف!"

"میرا بچہ کہاں ہے؟"

"باہر ٹیلے کے پاس ہیں اسے دفن کرتے لگا ہوں۔ الحمدللہ کہ وہ مسلمان مرا ہے۔ اس پر جنازہ کی نماز پڑھی جائے گی۔ اپنے داماد گل خاں کو بلا بھیجو۔ وہ ہمارے ساتھ رہے گا"

مظفر احمد

موت

موت ایک دروازہ ہے، جس میں سے ہر ایک کو گذرنا پڑتا ہے۔ (سعدی)

موت ایک میٹھی نیند ہے، جو سوتا ہے بیدار نہیں ہوتا۔ (خسرو)

موت ایک نیک آدمی کی خوبیاں بڑھاتی ہے اور برے آدمی کی برائیاں کم کرتی ہے۔ (جانسن)

موت ایک اچھا استاد ہے، جس سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ (لینن)

موت ایک مٹی کا کھلونا ہے جو ٹوٹ جانے پر بن نہیں سکتا۔ (مارٹن لوتھر)

موت سے ڈرنا بزدلی ہے۔ (بابر)

زندگی ختم ہو جاتی ہے، مگر موت جیتی رہتی ہے۔ (ملٹن)

موت کی یاد انسان کو نیک بناتی ہے۔ (سعدی)

عبدالحق سلیم

گفتگوئے نیم شب

میں نہ بھولوں گا کبھی وہ گفتگوئے نیم شب
وہ محبت وہ وفا وہ آرزوئے نیم شب

اشکِ عصمت کی تری آنکھوں میں وہ ننھی جھلک
وہ تری نیکی میں گویا آبروئے نیم شب

زندگی میری تری اک پھول بن کر کھل گئی
وہ مسرت کا چمن وہ رنگ و بوئے نیم شب

بارگاہِ حق میں وہ معصوم الفت کی دعا
وہ خلوصِ قلب وہ تیرا وضوئے نیم شب

زندگی کے دشت میں راہِ حقیقت کی تلاش
نورِ فطرت کے لئے وہ جستجوئے نیم شب

مجھ کو ہے روحِ رواں اے جانِ من تیرا خیال
گام زن رہتی ہے میری زیست سوئے نیم شب

شورشیں ہوتی ہیں سب دنیا کی مدہوش و خموش
چھیڑتا ہے راگنی جب خوش گلوئے نیم شب

پتیاں ہیں کس گلِ رعنا کی اس پر منتشر
بہ رہی ہے آسماں پر آبجوئے نیم شب

زندگی کے روئے دلکش کا طلسمِ حسن ہے
گیسوئے شب میں جو ہے مستور موئے نیم شب

ہو گئے ہیں گیت اس سے میرے جذباتِ بہار
بھول سکتا ہوں میں کب وہ گفتگوئے نیم شب

بہار

دو آنسو

افق کے سنہرے اور رنگین کنارے جب دن کو الوداعی پیغام دے رہے تھے اور دن بھر کا تھکا ماندہ آفتاب اپنے گوشۂ عافیت میں سکون پذیر ہوچکا تھا، مسرور اور فرخندہ رُو زائرین نے مغرب کی نماز ادا کی۔ خلائے بسیط میں دھندلکا طاری ہوچکا تھا۔ جہاز کی روشنیاں سمندر کی موجوں میں نہایت بے پروائی سے کھیلنے لگی تھیں۔ زائرین لمبی لمبی قباؤں اور عمدہ عمدہ ملبوسات میں آراستہ پُرکیف شام کے نظارہ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انہوں نے نہایت بے چینی سے اب تک غروبِ آفتاب کا انتظار کیا تھا۔

اب رات ہوچکی تھی۔

اس وقت کا خاموش سماں، تنہا جہاز، سمندر کی پُرشور موجیں اور تاروں بھرا آسمان اُن کے لئے ایک لامتناہی فرحت کا گہوارہ بنا ہوُا تھا۔ وہ اس وقت خالق عالم کو ان پُرسکون مگر معنی خیز مناظر میں جلوہ فگن پا رہے تھے ——— جلوہ فگن اور اس قدر روشن جیسے کسی کا چہرہ آئینہ میں صاف نظر آتا ہے۔ ان میں سے ایک نے جوشِ مسرت سے کہا "سبحان اللہ، کیا دلکش منظر ہے!" اور اس کے بعد وہ اپنے حجرے کی طرف چلا گیا۔ دوسرے زائرین نے بھی یکے بعد دیگرے اپنے اپنے کمروں کا راستہ لیا۔

۲

اس وقت تمام فضا موت کی سی نیند میں بے حس و حرکت پڑی تھی۔ تمام جہاز پر بلا کا سناٹا چھایا ہوُا تھا۔ آدھی رات گذر چکی تھی۔ رات کی اس وحشتناک اور بھیانک تاریکی میں ایک انسانی سایہ جہاز کے ایک گوشۂ عزلت سے نمودار ہوُا اور اُس کمزور بچے کی طرف بڑھا جو اپنی ماں کی آغوش سے لپٹا ہوُا سو رہا تھا۔ اس کے ہشاش بشاش چہرے پر معصومیت کی ایک مسکراہٹ چمکنے لگی۔

"کتنا اچھا بچہ ہے!"

اُس شخص نے کہا اور اُس کے نورانی چہرے پر اب ایک تبسم مسلط ہوگیا ——— ایک معصوم تبسم جس میں محبت تھی، جس میں درد تھا، جس میں ہمدردی تھی۔ اُس نے بچے کو اپنی بلورین انگلیوں سے مس کیا ——— "سرد" ——— نہیں۔ اُسے یقین نہ آیا اُس نے سمجھا کہ اس کے اپنے ہاتھ ٹھنڈے ہیں۔ اُس نے دونوں ہاتھوں کو ملا۔ کچھ حرارت محسوس

ہوئی تو اُس نے پھر بچے کو ہاتھ لگایا۔ وہ برف کی طرح سرد تھا۔ اُس نے مضطربانہ اُس کی نبض دیکھی، اس میں کوئی حرکت نہ تھی۔ اُس نے زیادہ گھبرا کر اُس کے قلبِ معصوم پر ہاتھ رکھا مگر وہ بھی آسمان کی طرح چپ تھا ۔۔۔۔ چپ اور بالکل غیر متحرک۔

بچے کی روح پرواز کر چکی تھی اور وہ اب ہمیشہ کے لئے خاموش تھا۔

اب وہ نہایت بے چین اور بے قرار کھڑا تھا۔ اس کے چہرہ سے پریشانی اور بدحواسی کے آثار ظاہر ہو رہے تھے ۔۔۔۔ ظاہر ہو رہے تھے اور اس طرح نمایاں تھے جیسے پانی برسنے سے پہلے آسمان پر بادل چھا جاتے ہیں وہ ایک کشمکش لاینحل میں گرفتار ہو گیا، اس کی عقل سمجھنے سے قاصر تھی، اُس کا دماغ کوئی تدبیر نہ بتا سکتا تھا۔ کہ اسے اب کیا کرنا چاہئے۔ کیا وہ اس معصوم کی ماں کو اس کے خوابِ غفلت سے بیدار کر دے اور اُس سے اِس واقعہ کا اظہار کر دے؟ اُس نے سب سے پہلے یہ سوچا۔

۳

وہ ایک زائر تھا ۔۔۔۔ وہ ایک زائرہ تھی ۔۔۔۔ نیک اور پاک باطن ۔۔۔۔ جوان اور ناتجربہ کار۔ جو حج بیت اللہ کی غرض سے حجازِ مقدس کا سفر کر رہی تھی ۔۔۔۔ تنہا اور غم نصیب۔ اثنائے سفر میں بچہ بیمار ہو گیا۔ زائرہ کی اس مصیبتناک کیفیت نے اس نیک دل زائر کو اس کی ہمدردی کے لئے مجبور کر دیا تھا ۔۔۔۔ اور وہ ہر طرح اپنی اس زائرہ بہن کی خدمت کے لئے تیار ہو گیا تھا۔

"وہ تنہا کیوں تھی؟"

وہ اس دنیا میں اکیلی اور بے مونس و غمخوار تھی۔ اُس کا شوہر اس عالمِ فانی سے کوچ کر چکا تھا۔ وہ ایک غریب مگر ایماندار، مذہب پرست اور نمازی کسان تھا۔ وہ کھیتی باڑی کرتا تھا اور دن کو کھیت کے ایک گوشۂ سکوں میں جو اُس نے اسی غرض سے بنا لیا تھا نمازیں پڑھا کرتا تھا۔ جب مغرب کا وقت آتا تو وہ ہل اور بیل لے کر اپنے گھر آ جاتا اس کے کپڑوں اور ڈاڑھی پر گرد پڑی ہوتی اور وہ بہت تھکا ہوا ہوتا۔ کھانا کھانے اور عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ اکثر اپنی نیک سیرت، پاک باطن، وفا شعار اور خدمت گذار بیوی سے رسولِ کریم کے عہدِ فرخندہ صفات کے واقعات اور قصے بیان کیا کرتا۔ امام حسین کی قابلِ احترام و بےمثل قربانیوں کا ذکر کیا کرتا جو انہوں نے مذہب کے لئے کی تھیں، یہاں تک کہ دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔

ایک دن اُس نے اپنی بیوی پر اپنا ایک راز افشا کیا ۔۔۔۔ ایک پُرجوش اور محبت آگین راز جو عرصۂ دراز

سے اُس کے زہد آمیز اور مذہب پرست سینے کی زرخیز کھیتی میں نشوونما پا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں نورانی تجلیاں موجیں لے رہی تھیں۔ اس کے اعضا اور چہرے پر انتہائی سنجیدگی موجود تھی اور اُس کی آواز میں ایک جوش پنہاں تھا ——— ایک ایسا جوش جسے الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جا سکتا ——— جوش میں احترامِ مذہب مخفی تھا اور وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

"میری زندگی کی ایک اور آخری آرزو یہ ہے،" اُس نے اپنی منور آنکھیں اٹھا کر اپنی بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا "کہ میں حج کروں تم آج مجھ سے وعدہ کرو اور قسم کھاؤ کہ ہم دونوں اس فرض کو ادا کرنے میں حتی الامکان کوشش کریں گے اور خواہ کیسی ہی مصیبت اور ضرورت کیوں نہ درپیش ہو، اس اہم کام کی تکمیل ضرور انشا اللہ کریں گے ——— آہ مجھے پیغمبر صاحب کے سبز گنبد کو دیکھنے کی کتنی تمنا ہے! ——— ہم چل کر مدینہ کے کھجوروں کے درختوں کے سایہ میں بیٹھیں گے اور قرآنِ پاک کی تلاوت کریں گے ——— جہاں پیغمبر صاحب نے مراقبے کئے اور نمازیں ادا کیں اُن مقدس مقامات پر خدا کی عبادت کرنا جن گلیوں اور راستوں کو پیغمبر صاحب کے قدم مبارک چومنے کا شرف حاصل ہوا اُن گلیوں میں پھرنا دنیا میں ہمارے لئے ایک جنت سے کم نہ ہوگا" اُس کی آواز رک گئی۔ ان خیالات سے وہ بے حد متاثر ہو گیا۔

"میری عزیز بیوی، مجھ سے وعدہ کرو اور قسم کھاؤ ——— کہ اگر میں مر جاؤں تو تم میرے اس معصوم بچے کو وہاں لے جاؤ گی۔ اور اس طرح میری اس آخری آرزو کی تکمیل کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرو گی" ———

"اگر میں مر جاؤں،" اُس نے ان غمناک اور جگر خراش الفاظ کو اپنے خیال میں دہرایا اور بہت مضطرب ہو گئی اُس کی سرمئی اور روفا نواز آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس طرح گرنے لگے جیسے آسمان سے موتیوں کی بارش ہو رہی ہو اُس نے باقلبِ مضطرب وعدہ کر لیا اور قسم بھی کھا لی۔

۴

اُس کے شوہر کی یہ حسرت پوری نہ ہوئی اور اُس کا انتقال ہو گیا۔ بیوی کو اپنے وعدے کے ایفا کا خیال دن رات بے چین رکھنے لگا ——— بے چین اور متفکر بھی۔ اُس وقت اس کے پاس صرف دو سو روپے تھے یہ اُس کی تمام زندگی کا سرمایہ تھا جو اُس نے کفایت شعاری سے پس انداز کیا تھا۔ اُس نے اپنے تمام کھیت اور زمین فروخت کر دی۔ اور اس طرح اُس کو دو ہزار روپے سے کچھ زیادہ رقم وصول ہو گئی جسے لے کر وہ اس دور دراز سفر پر روانہ ہوئی تھی۔ اُسے اب اپنے وطن واپس آنے کی خواہش نہ تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ مدینہ ہی میں سو دو سو ایکڑ

زمین لے کر اس کی آمدنی سے اپنی زندگی کے باقی دن پورے کرے گی۔ وہاں کھجور کے درختوں کے نیچے بیٹھ کر وہ قرآن پاک کی تلاوت کرے گی اور اپنے شوہر کی روح کو ثواب پہنچائے گی جس کی ایک اور آخری آرزو یہی تھی کہ وہ خود بھی وہاں تک پہنچ جائے۔

۵

اُس نے اپنی زندگی کی یہ ساری داستان اپنے ساتھی اور ہمدرد بھائی زائر سے بیان کر دی تھی۔ اس وقت وہ وہاں بطور ایک ناظر کے تھا جس نے اس المیہ کو سب سے پہلے دیکھا جب کہ حقیقی ایکٹر اس حادثۂ جانکاہ سے بالکل ناواقف تھا ــــــ ناواقف جیسے ملّاح طوفان کی آمد سے ناواقف ہوتے ہیں وہ گم سم کھڑا تھا۔ روشنی اس کے تمام جسم پر پڑ رہی تھی۔ زائرہ، غم زدہ اور دل شکستہ زائرہ کی درد انگیز اور اضطراب زا زندگی اُس کی آنکھوں میں ایک کتاب کی عبارت کی طرح گردش کر رہی تھی۔

بچے کو مدینہ لے جانے کی قسم اور وعدہ ــــــ حج ادا کرنے کا وعدہ جو اُس نے اپنے شوہر سے کیا تھا، اب اپنے مرکز سے بعید اور بعید تر ہو گیا تھا۔ گرہ کھل گئی تھی اور اجزا منتشر ہو کر خاک کے ذروں اور ہوا کے جھونکوں میں مل چکے تھے"!

اُسے کیا کرنا چاہیئے؟ ــــــ "خدا جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے" اُس نے اپنے آپ سے کہا اور نہایت مجبوری اور بے دلی سے اُس نے اپنا ہاتھ اُس کے بازوؤں پر رکھ کر انہیں ہلایا۔ یک لخت وہ چونک پڑی اور ہوشیار ہو کر بیٹھ گئی۔ پھر مستفسرانہ انداز سے اُس نے زائر کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی "بہن" اُس نے کہا "بچہ" ــــــ "یہ بچہ" اُس کی آواز قائم نہ رہ سکی اور فرطِ غم سے بھرا گئی۔

اُس نے گھبرا کر بچے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ سرد تھا، اولے کی طرح ٹھنڈا۔

موت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔

بچہ، جس کی نورانی مسکراہٹ اور جس کے گلابی رخسار ایک کائناتِ ارمان تھے، جن رخساروں کو فرشتے بوسے دیا کرتے تھے۔ جنہیں وہ خود چومتی تھی جنہیں اس کا باپ اپنے دل سے لگایا کرتا تھا۔ اُسے یقین نہ آیا کہ وہی بچہ دنیا کو اس قدر جلد خیرباد کہہ چکا ہے ــــــ نہیں اُسے ہرگز یقین نہ آیا۔ اُس نے بچے کو اُس کا نام لے کر پکارا ــــــ پکارا ــــــ پکارتی چلی گئی۔ متعدد بار اور طرح طرح کے پیارے پیارے ناموں سے، لیکن وہ سب ہوا کی بے باکیوں کی آماجگاہ بن کر ناپید ہوتے گئے۔ اس نے بچے کی درخشاں اور سرد پیشانی پر اپنے دونوں گرم ہونٹ رکھ

دیئے۔ اس کے مرتعش اور کمزور اعضا میں اضطراب کی ایک لہر دوڑ گئی اور اُس کی آنکھوں کے سامنے آنسوؤں کا ---- خون آلود آنسوؤں کا ایک ابر سا چھا گیا۔ اس سے ضبط نہ ہو سکا اس کے ہوش و حواس رخصت ہو گئے قلب کی زوردار دھڑکن خاموش فضا کو متلاطم کر رہی تھی وہ خود بے ہوش ہو چکی تھی۔

۶

چند لمحوں میں قدموں کی چاپ زور زور سے سنائی دینے لگی۔ زائرین آکر بچے کو لے گئے اور تجہیز و تکفین کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ آخر کار انہوں نے بچے کو ایک تختے پر لٹا دیا وہ تختے کو جہاز کے پیچھے لٹکانے والے تھے کہ زائرہ ---- حسرت نصیب زائرہ اپنے سکونِ غم سے بیدار ہوئی اور آہستہ آہستہ چلنے والی ہوا کی طرح وہاں جا پہنچی ---- وہاں جہاں ایک معصوم کی نعش، مادرِ آب کی بے قرار گود کے سپرد ہو جانے والی تھی وہ جا پہنچی ---- جہاں ایک الم زدہ ماں کی تمام آرزوؤں اور امیدوں کا مرکز ابدی نیند سلایا جانے والا تھا ---- وہ جا پہنچی ---- اُس قربان گاہ پر ---- جہاں ایک ماں کے سینے پر غم اور رنج کے خونی تیر چلنے والے تھے ---- وہ جا پہنچی ---- جہاں ایک لال کو اُس کی عشرت گاہ سے زبردستی جدا کر کے، نہ دیکھ سکنے والی آنکھوں کے سامنے بے روک ٹوک اُس بے رحم ہستی کے ہاتھوں میں دے دیا جانے والا تھا جس پر کسی آدمی کا قابو نہیں، جس سے کوئی اسے چھڑا نہیں سکے گا ---- وہ جا پہنچی ---- جہاں ایک دکھیاری ماں کے سینے سے اُس کا دل نکال کر اُسے ویران کر دیا جانے والا تھا ---- وہ جا پہنچی ---- اُس کا چہرہ زرد تھا اور فرطِ غم سے مغموم ---- تاہم وہ ضبط سے کام لے رہی تھی اُسے اپنے جذبات پر کامل دسترس حاصل تھی۔

اب تک خاموشی تھی ---- اب طوفان آنے والا تھا۔

تختے کی رسیاں رفتہ رفتہ ڈھیلی کی جانے لگیں اور تختہ آہستہ آہستہ اپنے مرکزِ مقصود سے قریب اور قریب تر ہونے لگا۔

"تختہ سمندر کی سطح سے مس کرنے لگا۔ چاند کا چہرہ غبارِ الم سے دھندلا اور بے رنگ ہو گیا۔ ستارے اپنی حسین آنکھوں سے معصوم کی جدائی پر اشک بہانے لگے" تختہ پانی میں غائب ہو گیا ---- ایک زوردار لہر آئی اور پھر کچھ بھی نہ تھا ---- فضا خاموش تھی اور ساری کائنات ساکن "معصوم کے آبی مزار پر ماں کے دو گرم گرم آنسو ٹپک پڑے"

محشر عابدی

محفلِ ادب

یورپ کا فرض

جو لوگ یورپ کو مذہب اور روح کا دشمن سمجھتے ہیں اور جن کے لئے روس اور امریکہ بھی اسی طرح 'یورپ' ہیں جیسے خود یورپ، وہ جرمنی کے مشہور فلسفی کاونٹ کیزرلنگ کی نئی کتاب 'یورپ' کو بڑی حیرت آمیز دلچسپی سے پڑھیں گے۔ وہ اس کتاب میں ایک جگہ کہتا ہے۔ "آج یورپ کے ذمہ جو فرض عاید ہوتا ہے اس سے بڑا فرض اس پر کبھی عاید نہیں ہوا تھا۔ روح کی جو تاریک اور طولانی رات اس وقت انسانیت کے سامنے نظر آتی ہے اس میں روح کے مقدس شعلہ کی حفاظت کرنا اور اُسے بجھنے سے بچانا یورپ کے اور صرف یورپ کے سپرد کیا گیا ہے۔" جدید یورپ کے اہلِ نظر میں اس وقت دو متضاد مذاہب کا پتہ چلتا ہے، ایک وہ ہیں جو وضاحت اور عقلیت پر اصرار کرتے ہیں، دوسرے وہ جو انسان کے وجدانِ ابتدائی پر مصر ہیں اور چاہتے ہیں کہ عقل کو جبلت و وجدان کے تاریک لیکن صحت بخش اور روح پرور چشمۂ حیات کے پانی سے بپتسمہ دیں۔

جرمن مورخ اشپنگلر بتا چکا ہے کہ بربریت سے چل کر انحطاطِ تمدن تک کا چکر جو ہر تمدنی زندگی کو پورا کرنا ہوتا ہے وہ یورپ کے لئے قریب الختم ہے اور اب کیزرلنگ بتاتا ہے کہ بالشوزم ایک نئے دور کا بربری آغاز ہے جس کا پہلا کام یہ ہے کہ مشرق کے انسانوں کو مادی تہذیب کی بلند ترسطح پر پہنچا دے۔ امریکہ میں بھی اسے یہی چیز دکھائی دیتی ہے یعنی تمامتر توجہ کا مادی اور جماعتی مقاصد پر مرکوز ہونا اور شخصیت و امارت کی طرف سے ہٹا ہونا۔ اس طرح امریکہ بھی اُس کے نزدیک ایک نئے دورِ تہذیب کا بربری آغاز ہے اور یورپ ان دو عظیم الشان رقیبوں کے درمیان آپھنسا ہے جن میں صدیوں تک روحانی مقاصد اور قدریں نظر انداز کی جائیں گی۔ بعض جدید ماہرینِ نفسیات کا خصوصاً آدلر کا ذکر کر کے کیزرلنگ کہتا ہے کہ اس نئے فلسفہ اور اس نئی امریکی حقیقت دونوں کا مطمحِ نظر در اصل وہی ہے جو روسی اشتراکیت کا ہے یعنی "انسان اپنی انفرادی شخصیت کو جماعت میں پھر گم کر دے۔"

لیکن اگر امریکہ اور روس اس مقدس شعلہ کے صحیح وارث بننا چاہیں اور ایک نئی اور عظیم الشان تہذیب پیدا کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں تو اُن کے لئے لازمی ہے کہ وہ ابھی جماعتی جذبہ اور مادی تنظیم ہی پر توجہ کریں اور اس عرصہ میں بقول

کیزرلنگ یورپ پر اس مقدس شعلہ کی حفاظت کا فرض عاید ہوتا ہے مگر یہ یاد رہے کہ اگر اس شعلہ کے بجھنے کا اندیشہ اس وجہ سے ہے کہ کہیں یورپ بھی محض مادی قدروں کا بندہ نہ ہو جائے تو اُس کا خطرہ یوں بھی ہے کہ کہیں یورپ اپنی خشک عقلیت اور ذہن پرستی سے اپنے کو تباہ نہ کرے۔ عقل و عشق تخلیق کے لئے دونوں لازمی ہیں کوئی چیز جس میں ان دو متضاد عناصر کا صحیح توازن نہ ہو موثر نہیں ہوسکتی۔ لہذا یورپ کا کام یہی نہیں ہے کہ اس شعلہ کو جذبات اور مادیت کے سیلاب سے نہ بجھنے دے بلکہ یہ بھی ہے کہ اس شعلہ کو عقلیت کے صحرا میں جل کر خاکسترِ مردہ نہ بن جانے دے۔

اگر یورپ ان جدید بربری قدروں کی مخالفت میں اپنی منطق اور عقلیت ہی پر زور دیتا رہا تو روح کا شعلہ یورپ میں بھی افسردہ ہو جائے گا اور روس اور امریکہ میں بھی روشن نہ ہونے پائے گا۔ یورپ والوں کو بھی ضرورت ہے کہ وہ اس زمین سے تعلق پیدا کریں اور جبلت و جذبات کے حیات بخش چشمہ سے سیراب ہوں جب وہ ان دونوں میں توازن پیدا کرلیں تب ہی اس مقدس شعلہ کے محافظ بن سکتے ہیں۔

"جامعہ"

سکائی لارک[1]

آزاد سب افکار سے آزاد ہے ہستی تری
وہ اُڑنا اور آکاس میں نظروں سے چھپ جانا ترا
کیا چیز ہے ہستی تری
وہ دور کا ستانہ ترا
دنیا کی شورش گاہ سے ہے دور تر بستی تری
گاتے ہوئے اڑنا ترا اُڑتے ہوئے گانا ترا

تیری نوا‌ئے شوق سے سارا جہاں معمور ہے
جاتی ہے جب تو عرش پر اپنے حریم ناز سے
اور آسماں معمور ہے
آراستہ ہر ساز سے
کیا جانے کن اسرار سے تیری فغاں معمور ہے
گرتے ہیں نغمے فرش پر تیرے پر پرواز سے

---

[1] سکائی لارک انگلستان کی ایک نغمہ سنج چڑیا ہے۔

تو اک مجسم شعر ہے جذبات کا فوارہ ہے
اور عشق کا گہوارہ ہے
یا زندگی کی نیند میں کوئی پریشاں خواب ہے

یا آب و گل کی شکل میں کوئی صدا آوارہ ہے
اک نغمہ سیال ہے یا روحِ آزادی ہے تو
ننھی سی شہزادی ہے تو

ہے لیلیٰ محمل نشیں اور تیرا بن ہے آسماں
دشتِ کہن ہے آسماں
جنگل میں منگل تجھ سے ہے صحرا کی آبادی ہے تو

او بادلوں کی نازنیں! تیرا وطن ہے آسماں
اڑ کر زمیں سے چرخ پر تو صورتِ شبنم گئی
رستے میں لیکن تھم گئی

تو اس کی دلدادہ ہوئی وہ چاہنے والا ترا
ہے چاند متوالا ترا
گویا لہو کی بوند تھی جا کر فضا میں جم گئی

یہ کہکشاں کیا چیز ہے اک منجمد نالہ ترا
تو رفعتِ پرواز سے سوتے زمیں تکتی نہیں
اڑتی ہوئی تھکتی نہیں

اک تیر ہے تو وقت کی ٹیڑھی کماں کے درمیاں
جسم اور جاں کے درمیاں
اور اس بلندی تک نظر میری پہنچ سکتی نہیں

یا ایک نقطہ ہے زمین و آسماں کے درمیاں
کیا آسماں اور کیا زمیں یہ گردشِ ایام کیا
زنجیرِ صبح و شام کیا

یا سازِ موجودات میں اک نغمۂ بے تاب ہے
یا قطرۂ سیماب ہے
تیری نظر میں ہیچ ہے آغاز کیا انجام کیا

"ادبی دنیا"

دنیا کے پھول

اے دنیا میں نے تیرا پھول توڑ لیا۔ اور اپنے سینہ سے لگایا۔ لیکن کانٹا چبھ گیا۔
دن رخصت ہوا اور رات ہوئی تو میں نے دیکھا کہ پھول مرجھا چکا تھا۔ مگر کانٹے کی چبھن ابھی تک باقی تھی۔

اے دنیا بہت سے نکہت بداماں پھول تیرے پاس آئیں گے۔ مگر میری گل چینی کا زمانہ ختم ہو چکا۔ اندھیری رات میں میں اپنے گلاب کے پھول سے جدا ہوں۔ صرف چبھن باقی ہے

"نیرنگ خیال"

ہری

مَیں ہری کی تعریف میں رطب اللساں ہوں۔ جب اُس نے کرۂ زمین کو اوپر کی طرف اُٹھایا تو سات سمندر کی موجیں اُٹھ اُٹھ کر اس پر یورش کرنے لگیں جو بہ مشکل تمام اس کے عظیم الشان پاؤں کے انگوٹھوں کے ناخن تک پہنچ سکیں۔ اور تینوں عالم پانی کے ایک قطرہ کی طرح اس کی جھونپڑی میں سما گئے۔ یہ جھونپڑی اُس کے دانت کا صرف ایک گوشہ تھی۔ اے سری ہر نیا مرے حال پر لطف و کرم کی نظر کر۔ تو ان شہد کی مکھیوں کا نشیمن ہے جو یاسمین کے عطر بیز غنچوں کی کشش سے کھنچی ہوئی تیرے پاس چلی آتی ہیں۔ خدا کرے سرسوتی علم کی دیوی مرے دل میں آ بسے جس کو میں اپنی ماں کے برابر سمجھتا ہوں۔ وہ دودھ کی دھاروں سے ہمیں بلند مدارج پر پہنچاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرچشمۂ علم سرسوتی چاند کے نور سے گوندھی ہوئی ہے یا ہلکے ہلکے صندلی رنگ کا ایک نازک مجسمہ ہے۔

"مخزن"

علم و عمل

سننے یا پڑھنے سے انسان کا علم ترقی کرتا ہے اور مشاہدے سے بھی علم بڑھتا ہے لیکن جو علم پڑھنے سننے یا مشاہدے سے حاصل ہوتا ہے۔ جب تک اس پر غور نہ کیا جاوے وہ کچھ فائدہ نہیں پہنچاتا۔ جب انسان غور کر کے معقول اور نامعقول یا حق و باطل میں تمیز کرتا ہے۔ اور پھر اپنے علم کے موافق عمل کرتا ہے۔ تب وہ علم اس کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ عمل کے بغیر علم سے کچھ نتیجہ نہیں نکلتا۔ نیک و بد کی تمیز سے انسان کو کیا حاصل ہے جب تک وہ بدی سے قطعی بچنے اور نیکی کرنے کی ہمت نہ کرے۔ عمل سے خالی علم یقین اور خیال سے کچھ سود نہیں پہنچتا۔ عالم باش و عامل باش کے مسئلے پر عمل کرنا چاہئے۔

"رفیق التعلیم"

مطبوعاتِ جدیدہ

ناٹک کتھا۔ مولفہ نور الٰہی و محمد عمر صاحبان۔ اس کتاب میں آٹھ افسانے ہیں جن میں سے چھ قدیم ڈراموں سے ماخوذ ہیں اور ایک طبعزاد تاریخی واقعہ ہے ابتدا میں ایک مختصر دیباچہ اور پنڈت کیفی کے نقاد قلم کی ایک تقریب ہے۔ کہانیاں کالی داس، بھوابھوتی، بھوسا، شودرک، ہرش دیوا اور وِیسا کھ دت جیسے بلند پایہ مصنفین کی ہیں اور اُن کو قابل مولفین نے اس خوبی سے اخذ کیا ہے کہ قدیم رنگ بھی قائم ہے اور دلچسپی میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ زبان پاکیزہ ہے اور اُس میں کہیں کہیں ہندی الفاظ نے عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر تعجب ہوتا کہ قدیم ہندوستانیوں نے ڈراما کے فن میں کتنی ترقی کی تھی۔ کتاب ہر طرح سے اچھی چھپی ہے۔ حجم ۱۰۴ صفحات اور قیمت آٹھ آنے ہے۔ پتہ، محمود برادرس، تاجران کتب جموں۔

گڑیا کا گھر۔ مشہور ڈراما نویس ہنرک ابسن کے "ڈالس ہوس" کا ترجمہ ہے۔ اردو میں اسے جناب عبد الشکور صاحب ایم۔ اے لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج علی گڈھ نے منتقل کیا ہے اور ساتھ ہی افراد ڈرامہ کے نام بھی بدل دیئے ہیں۔ اس افسانہ میں ایک بیوی کا اپنے شوہر کے لئے ایثار دکھایا گیا ہے اور کتاب کا مقصد اس امر کی تحقیق ہے کہ ازدواجی زندگی میں تعلقات کے قیام اور بقا کے لئے کون کون سی باتیں ضروری ہیں۔ گڑیا کا گھر ایک دلچسپ اور قابل غور کتاب ہے۔ حجم دو سو صفحات کے قریب ہے، قیمت درج نہیں۔ مجالس ادبیہ، انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے طلب فرمائیے۔

آنند مٹھ۔ بنگال کے مایۂ ناز ادیب بابو بنکم چندر چٹرجی کے اسی نام کے بنگالی ناول کا اردو ترجمہ ڈاکٹر گوکل چند صاحب نارنگ ایم اے، پی ایچ ڈی نے کیا ہے۔ یہ ناول بابو بنکم چندر کے بہترین ناولوں میں سے ہے اور اس کی قومیت اس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کا قومی گیت "بندے ماترم" اسی سے ماخوذ ہے۔ سارا افسانہ وطن کی محبت اور قومی جوش سے بھرا ہوا ہے اور حقیقت و صداقت کے بہت سے عقدے حل کرتا ہے۔ کاغذ اور چھپائی معمولی ہے حجم ۲۱۲ صفحات اور قیمت ایک روپیہ چار آنے ہے۔ گیان پرکاش مندر ماچھرہ ضلع میرٹھ سے منگائیے۔

اردو کویوں کی نیتی کویتائیں۔ ۶۴ صفحات کی اس کتاب میں اردو شعرا کے منتخب اخلاقی و روحانی اشعار ہندی رسم الخط میں مختلف عنوانات کے تحت درج کئے گئے ہیں۔ انتخاب بہت اچھا ہے اور عموماً انہیں شعرا کے کلام سے ہے جن کی شہرت دنیائے ادب میں مسلمہ ہے۔ مثلاً آتش، ناسخ، ذوق، غالب، ظفر، داغ، امیر، اکبر وغیرہ۔ کاغذ اور چھپائی

عمدہ ہے قیمت ۸؍ مقرر کی گئی ہے۔ ملنے کا پتہ۔ گیان پرکاش مندر، ماچھرہ ضلع میرٹھ۔

گائے بیل۔ اس کتاب کے ناشر جناب محمد نصیر صاحب ہمایوں، مالک قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور ہیں۔ اس میں گائے اور بیل کی پہچان، ان کی پرورش، بیماریاں اور اُن کا علاج۔ غرض کہ تمام معلومات کو بڑی وضاحت سے اور آسان پیرایہ میں لکھا ہے، اور ان سب باتوں کو تصویروں کے ذریعہ سے بھی ظاہر کیا ہے جن لوگوں کے پاس مویشی ہیں انہیں یہ کتاب ضرور خریدنی چاہیئے سولہ تصویروں کے علاوہ ۶۱ صفحات کا مضمون ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ہے قیمت سات آنے ہے۔

پیکر ماتم۔ میرزا فہیم بیگ صاحب فہیم چغتائی کی دل گداز نظم ہے جو انہوں نے ایک بیوہ عزیزہ کی تصویر دیکھ کر لکھی۔ نظم میں تصویر صورتِ حال سے اپنا دکھڑا روتی ہے۔ زبان اچھی ہے اور بیان پُراثر ہے۔ حجم ۲۴ صفحے آرٹ کاغذ کا سرورق اور قیمت دو آنے ہے مینیجر کتب خانہ، لاہور سے طلب فرمائیے۔

آتنک نگرہ البم۔ تقریباً پچاس برس ہوتے ہیں جام نگر میں وید شاستری منی شنکر گووندجی نے آتنک نگرہ فارمیسی کے نام سے ایک دواخانہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے ایسی محنت دیانت داری اور قابلیت سے اپنے کام کو انجام دیا کہ اُن کے کارخانے کی شاخیں ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اور بیرون ہند میں قائم ہوگئیں یہ البم اُن کی شاخوں کے دفاتر اور کارپردازوں کی تصاویر پر مشتمل ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کتنی قابلِ رشک ترقی کی ہے۔ اپنی کارگذاری پر انہیں جس قدر ناز ہو بجا ہے۔

"ادبی دنیا" اس نام کا ایک رسالہ اس مہینے لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا ہے سر عبدالقادر اس کے نگران ہیں اور مولانا تاجور نجیب آبادی اور جناب حنیف ہاشمی مدیر۔ رسالہ بڑی تقطیع کے تقریباً ایک سو صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں سات تصویریں ہیں سالانہ چندہ تین روپے اور محصول بارہ آنے مقرر کیا گیا ہے۔ اردو زبان کی تہذیب و اصلاح اور ترقی یافتہ مشرقی و مغربی زبانوں کے تراجم شائع کرنا اس کے مقاصد ہیں۔ زیر نظر پرچے کے لئے مضامین انتخاب کرنے میں اور اُن کو ترتیب دینے میں کافی محنت کی گئی ہے، لیکن زبان کے اعتبار سے بعض مضامین میں خامیاں بھی موجود ہیں "پامال انجام"، "فاوسٹ"، "عناصر تیاتر"، اور "پیر لوتی" مفید مضامین ہیں اور سکائی لارک بہت اچھی نظم ہے۔ دنیائے ادب کے عنوان کے تحت کئی ایک مشرقی اور مغربی زبانوں کے ادب لطیف کا اُردو ترجمہ کیا گیا ہے۔ غرض کہ رسالہ ہر حیثیت سے اچھا ہے اور بہت سستا ہے۔ مینیجر ادبی دنیا کشمیر بلڈنگ لاہور سے طلب فرمائیے۔

فہرستِ مضامین

جلد (۱۶)

بابت ماہِ جولائی ۱۹۲۹ء

تصویر:- ملّا شاہ اور میاں میر

زندگی اور فلسفہ

میں روٹھ گیا ــــــ دوستوں کی مجلس جمی تھی، کالے گورے کا ملاپ تھا، بڑے بڑے آدمی مدعو تھے، جدید ترین قسم کے ملبوس زیب تن تھے، تازہ ترین خبروں کا پتہ چلتا تھا اور اُن کے متعلق ہر ایک کی اپنی رائے تھی جو کسی عجیب منطق کی رُو سے کبھی دوسرے کی رائے سے مختلف اور کبھی اُس کے عین مطابق ہوجاتی تھی۔ بچہ سقہ اور امان اللہ موسیٰ ہوائیں اور مزدور حکومت کی فتح وائسرائے کی تقریر اور وزیر پنجاب کی چائے اور ٹینس کی پارٹیاں یہ باتیں گھاتیں کچھ اس انداز سے باہم ملتی چلی جاتی تھیں کہ اس کا نتیجہ بے معنی پن کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ایک ہم پیشہ انگلستانی ہندوستانی کی بے تکلف نظر بازی اور نسوانی ملبوسات کی برملا لیکن روکھی پھیکی تعریف بھی اگرچہ وہیں میرے دماغ وقلم کو شرما دینے والی ایک پنجابی افسر کی لگی لپٹی سخن طرازی اور ہر قسم کے اصول سے ایک باغیانہ بے نیازی بھی تھی آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہورہی تھیں باتوں ہی باتوں میں ممنوعات کے اشارے تھے اور ان اشاروں سے فطرت کی کمزوری اپنا لطف اُٹھا رہی تھی ــــــ اور میں وہیں پاس ہی لیکن اپنا ایک کونے سے میں بیٹھا ہوا تھا اور روزمرہ کے اس ناٹک کو بغور دیکھ رہا تھا یعنی دنیا کو میں اپنے کنج عزلت سے جھانک رہا تھا اور سمجھتا تھا کہ گویا فلسفہ زندگی پر پہرہ دے رہا ہے!

یوں تو میں وہیں بیٹھا رہا لیکن جی ہی جی میں روٹھ کر خاموشی کی فریب کار مہر منہ پر لگاتے ہوئے حلقۂ معاشرت سے میں بیزار ہوگیا جس کے تارے وہ باتیں کرنے والے آدمی تھے جو کائنات کے سمندر پر میری حقیقت کے ساحل کے ایک ذرے سے بھی کم حیثیت تھے۔ میں نے علی الاعلان شکایت کو لب وا نہ کیا کہ میں معاشرت کو اپنی زجر وتوبیخ کے قابل بھی نہ سمجھتا تھا لیکن محض اس لئے کہ یہ لوگ سطحی سی باتیں کرتے تھے میں نے انہیں لغو قرار دے دیا اور فقط اس لئے کہ میں خاموش بیٹھا رہا میں نے اپنے تئیں ان سے بالاتر سمجھ لیا+

اپنے ایک دوست سے بھی جسے دو سال ہوئے میں انیس سال کے بعد ایک دوسری مجلس میں ملا تھا میں نے منہ پھیر لیا کہ مجھ میں رفعت ہے مگر اس میں کوئی خاص امتیاز نہیں! ــــــ لیکن آہ کل صبح جب ایک بے چین رات کے بعد میرا نووارد فلسفہ مجھے خیرباد کہہ کر چل دیا تو میرا خالی سا دل اور میری منتظر سی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں کیونکہ میں نے یک لخت محسوس کیا اور معاً دیکھ لیا کہ اوروں کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے نتیجے نکال لینا خودساختہ فلسفیوں کی سب سے بڑی کمزوری ہے!

"فلسفی"

جہاں نما

کیا مشرق اور مغرب کے نوجوان لامذہب ہیں؟

ہمارے ملک میں اکثر یہ شکایات سنی جاتی ہیں کہ موجودہ زمانہ کے نوجوان لامذہب ہیں۔ یہ شکایات اور ان کی وجہ صرف ہندوستان تک محدود نہیں ہیں۔ ڈاکٹر جے۔ ایچ لیتھراپ بنگلور کے ایک مذہبی جلسہ میں فرماتے ہیں۔

موجودہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کا طبقہ جسے ہم لامذہب سمجھتے ہیں نہ صرف ہندوستان میں بلکہ امریکا میں بھی موجود ہے۔ امریکا میں اس وقت نصف سے کچھ زیادہ آبادی ایسی ہے جس کا تعلق دنیا کے کسی مذہب کے ساتھ نہیں ہے۔ شاید آپ یہ سن کر ان کافروں کو کسی مذہب میں واپس لانے کے لئے مبلغ بھیج دیں گے۔ مگر کبھی آپ نے سوچا کہ کیا وجہ ہے کہ اُن کا تعلق کسی مذہب کے ساتھ نہیں ہے۔

اس کا جواب فاضل مقرر اس طرح دیتے ہیں:۔ اول آپ دیکھیں گے کہ اُن کے ہلکے دل ناپائیدار مسرتوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ میرے خیال میں وہ اپنی خداداد قابلیتوں کو ضائع کر رہے ہیں۔ اور وہ اطمینانِ قلب جو وہ حاصل کر سکتے تھے ان سے دور ہے۔ لیکن انہیں لامذہبوں کا ایک گروہ اور ہے یعنی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں اور اُن لوگوں کا گروہ جو جدید سائنس کا مطالعہ اپنے طور پر کر رہے ہیں اور جو سمجھتے ہیں کہ خیالاتِ جدیدہ تمام اُن مذہبوں پر فوقیت رکھتے ہیں جن کا انحصار تمام تر توہمات پر ہے۔

ہندوستان کی طویل سیاحت کے بعد جو نتائج میں نے اخذ کئے ہیں مجھے بتاتے ہیں کہ ہندوستانیوں کا ایک بڑا طبقہ اسی نوعیت کے خیالات کا ہے جیسا کہ امریکا میں ہے۔ دوسرے لفظوں میں میں کہوں گا کہ اس معاملہ میں دونوں ملکوں کے عقائد ایک دوسرے سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ میں بہت سے ایسے والدین کو جانتا ہوں جو اپنے بچوں کی لامذہبی کی شکایت کرتے ہیں۔ اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ کسی زمانہ یا نسل کے مردوں یا عورتوں کی مذہبیت یا لامذہبیت کا پتہ کس طرح لگانا چاہئے تو میں کہوں گا کہ اس مرد، عورت یا بچے کے متعلق صرف یہ معلوم کر لو کہ کیا وہ کسی چیز کو متبرک سمجھتا ہے؟ اگر بوڑھے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے بڑھاپے کی عزت نوجوان نہیں کرتے اور اگر نوجوان سمجھتے ہیں کہ وہ اب اس چیز کی عبادت اسی طریق پر نہیں کر سکتے جس طریق پر اُن کے آباو اجداد کرتے چلے آئے ہیں تو ہم اُن پر لامذہبی کا الزام نہیں لگا سکتے۔ میرے خیال میں آج دنیا میں کئی چیزیں ایسی ہیں جنہیں نوجوان ایسا ہی متبرک سمجھتے

ہیں جیسا کہ اُن کے آباو اجداد سمجھتے تھے۔ اور سب سے پہلی بات جو ہمیں یاد رکھنی چاہیئے یہی ہے کہ جب تک کوئی مرد یا عورت کسی چیز کو متبرک سمجھتا ہے وہ ایک مذہب کا پابند ہے۔ آج انسانیت کو اس قدر متبرک اور پاک سمجھا جاتا ہے کہ تاریخ عالم میں اُس کی مثال موجود نہیں ہے۔

اس وقت امریکا، انگلستان اور ہندوستان میں بچوں کی حفاظت کے لئے ہر قسم کی تحریکات عمل پیرا ہیں۔ کیونکہ ہمارا ایمان ہے کہ ہر انسانی بچے کا پیدائشی حق ہے کہ دنیا کی خوش قسمتیوں میں ہمارا ساجھی ہو اور اپنی طاقتوں کو پوری طرح بسہولت تمام تکمیل تک پہنچائے۔

اب ریاستہائے متحدہ میں یہ تحریک ہو رہی ہے کہ سزائے موت کو قطعاً منسوخ کر دیا جائے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم اپنے آباو اجداد کے مقابلہ میں انسانی زندگی کو زیادہ متبرک سمجھتے ہیں۔

انسان کا انسان سے رشتہ آج ایسا متبرک خیال کیا جارہا ہے جیسا اس سے قبل کبھی نہ کیا گیا تھا۔ دنیا میں کبھی اس قدر سچے انسان نہیں ہوتے جس قدر آج ہیں۔ کیونکہ موجودہ سائنس ہمیں سکھاتا ہے کہ تجربہ گاہ میں مادہ کے ایک ذرہ کے متعلق جھوٹ بول کر تجربہ کے درست نتائج حاصل نہیں کئے جا سکتے۔ ہم ریاضی کے متعلق جھوٹ بول کر صحیح جواب حاصل نہیں کر سکتے۔ ہم اگر ڈاکٹر ہیں تو نسخہ کے متعلق جھوٹ بول کر مریض کو صحتیاب نہیں کر سکتے۔ ہر جگہ سائنس نے سچائی کو بے نقاب کر دیا ہے۔ ہمیں ان سچے اور متبرک انسانوں کی قدر کرنی چاہیئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ نوجوان نسل انسانی زندگی کو ویسی ہی متبرک اور پاک سمجھتی ہے جیسا کہ ان کے آباو اجداد کسی کتاب، انسان، چھڑی یا پتھر کو سمجھتے تھے اور پھر نیک نیتی سے بھی۔ آپ کے چند بڑے بڑے معلموں کو جو آج بھی زندہ ہیں کہنا پڑا ہے کہ "گھر کی چار دیواری کے اندر خاوند اور بیوی کے درمیان، باپ ماں اور بچے کے درمیان یا شہر یا سلطنت کے اندر اور قوموں کے درمیان صرف ایک قانونِ زندگی جاری و ساری ہے، جس کا مطلب زندگی ہے اور موت نہیں" یہی خیر خواہی کا راستہ ہے۔ رسول نے کہا تھا کہ "اپنے دشمنوں کو معاف کر دو خواہ تمہیں ستر دفعہ بھی کرنا پڑے۔ اگر کوئی تمہارے ساتھ ایک منزل چلے تو اُس کے ساتھ دو منزل چلو۔" سو اگر آپ اپنی مذہبی کتب میں تلاش کریں گے تو ان میں بھی انہی حقائق کو پائیں گے۔ صرف ایک رشتہ جس پر ہمارے قیام کا امکان ہے اور پھر جس پر ہم کامیابی کے ساتھ قائم رہ سکتے ہیں یہی ہے جسے موجودہ زمانہ کا نوجوان دل متبرک ترین سمجھتا ہے۔

ان لوگوں کو لامذہب نہ سمجھو۔ ان کے ایمان کو اپنے دل میں سوچو ممکن ہے ان کا ایمان تمہارے ایمان سے بہتر ہو۔ میں نوجوان مردوں اور عورتوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ اگر تم نے کچھ پرانے اعتقادات چھوڑ دیئے ہیں تو تم مذہب سے بیگانہ نہیں ہوگئے کیونکہ مذہب کا مفہوم بہت وسیع ہے۔

ترکی میں تعلیمِ نسواں

ان ترکی خواتین کی تعداد جو انہیں چند سال میں فارغ التحصیل ہوئی ہیں ایک سو دس تک پہنچ گئی ہے۔ ان میں سے بیس مدرسہ قانون سے کامیاب ہو کر نکلی ہیں، چودہ مدرسۂ طبیہ سے اور تیس مدرسۂ فنون سے۔ نو نے فلسفہ میں، سات نے تاریخ میں، نو نے جغرافیہ میں، اور باقیوں نے ادبیات میں امتیازی سندیں حاصل کی ہیں۔

مدرسۂ علوم نے بھی بہت عظیم الشان کام کیا ہے چنانچہ اس تعلیم گاہ نے اب تک اکہتّر خواتین کی تعلیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ جن میں سے اکیس طبیعیات کی، انتیس کیمیا کی، چار صنعت کی، ایک کیمیائے طبعی کی، ایک ریاضی کی اور پانچ دانتوں کے امراض کی ماہر ہیں۔

لاسلکی کے ذریعہ سے تصویریں

تصاویر کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کرنے میں لاسلکی نے جو حیرت انگیز ترقی کی ہے اُس کا مشاہدہ حال ہی میں کپتان فلٹن نے کرایا ہے۔

تصویر منتقل کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کا ایک بلاک تیار کیا جائے۔ پھر اس کو آلۂ ترسیل پر رکھ دیتے ہیں اور چار منٹ کے اندر تصویر ہزارہا میل پر پہنچ جاتی ہے۔

صبح کے ساڑھے گیارہ بجے ایک عکّاس نے کپتان فلٹن کی تصویر برقی روشنی سے لی۔ اس کے پندرہ منٹ بعد پلیٹ تیار ہو چکی تھی اور جونہی کہ وہ سوکھی اسے آلۂ ترسیل پر رکھ دیا گیا۔ ٹھیک چار منٹ بعد وصول کرنے والوں کو یہ تصویر کاغذ پر تیار ملی۔

گویا اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ کسی ایک واقعہ کی تصویر لے کر سفری آلہ ترسیل کے ذریعہ سے چند لمحوں میں ہزاروں کوس کے فاصلہ پر بھیجی جاسکے۔ اور امید کی جاتی ہے کہ جلد ہی ہر ڈاک خانہ سے اس طرح عام طور پر تصاویر بھیجی جاسکیں گی۔

پولیس ان مشینوں کے معاملہ میں خاص دلچسپی لے رہی ہے۔

دماغی اختلاف

نفسیات کے شائقین آج کل اتنی دلچسپی کسی دوسرے مسئلہ میں نہیں لے رہے جتنی ان مسائل میں لے رہے ہیں کہ ایک شخص کا دماغ دوسرے سے اختلاف کس لئے رکھتا ہے۔ مدرسوں میں صنعت گاہوں میں اور شفاخانوں میں نفسیات کے جن بڑے بڑے تجارب سے استفادہ کیا جاتا ہے اُن کی بنیاد بجائے لوگوں کے اتمثال کے ان کے اختلاف پر ہوتی ہے۔ نفسیات کے اس تقریباً نئے سلسلہ میں بڑی کاوش کے بعد جو انکشافات ہوئے ہیں وہ عوام کے لئے بھی دلچسپی لیتے ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:۔

اندھے آدمی کی سماعت ایک عام آدمی کی سماعت سے کچھ زیادہ تیز نہیں ہوتی۔

ہر سو میں سے تین یا چار آدمی ایسے ہوتے ہیں جو سرخ اور سبز رنگ میں امتیاز نہیں کر سکتے۔ مردوں میں یہ نقص عورتوں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔

بعض عورتوں کے دائیں ہاتھ میں بہ مقابلہ دوسری عورتوں کے نگنی طاقت ہوتی ہے۔

ہماری عقل و شعور کی قوت اٹھارہ برس کی عمر تک بڑھتی رہتی ہے۔ دماغ کے قدیم ممتحنوں نے اس ترقی کو چودہ سال کی عمر تک محدود کیا ہے، لیکن یہ درست نہیں۔ شاید اٹھارہ برس کے بعد بھی ہم میں یہ خصوصیت باقی رہتی ہے۔ مگر ابھی تک یہ تحقیق نہیں ہوا۔

حافظہ اور ایجاد و اختراع کا مادہ عمر کے بڑھنے سے گھٹتا ہے۔

سر کی شکل اور حجم کو کسی شخص کی دماغی قابلیتوں سے کچھ زیادہ تعلق نہیں ہوتا۔

کالجوں کے پروفیسر اتنے ذہین نہیں ہوتے جتنا لوگوں کے خیال میں ان کو ہونا چاہئے۔

عورتیں مردوں کے مقابلہ میں زیادہ حسّاس ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کا حافظہ بھی زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ ذہانت کے لحاظ سے لڑکیاں لڑکوں کی بہ نسبت بہتر طالب علم ثابت ہوتی ہیں۔

ہر شخص تقریباً ہر پیشہ میں معمولی کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔

اکثر پیشوں میں بہترین آدمی ادنیٰ درجہ کے آدمی سے تین یا چار گنا زیادہ قابلیت رکھتا ہے۔

اگر کوئی شخص کسی ایک پیشہ میں نمایاں کامیابی حاصل کر لیتا ہے تو وہ کسی دوسرے شعبہ میں قطعاً ناکام بھی رہ سکتا ہے۔ نپولین نے ـــــ جو خود املا میں بڑی غلطیاں کیا کرتا تھا۔ جب ایک بلند پایہ ریاضی دان لاپلاس کو کابینہ میں ایک اہم عہدہ پر فائض کیا تو وہ اس کے لئے بالکل غیر موزون ثابت ہوا۔
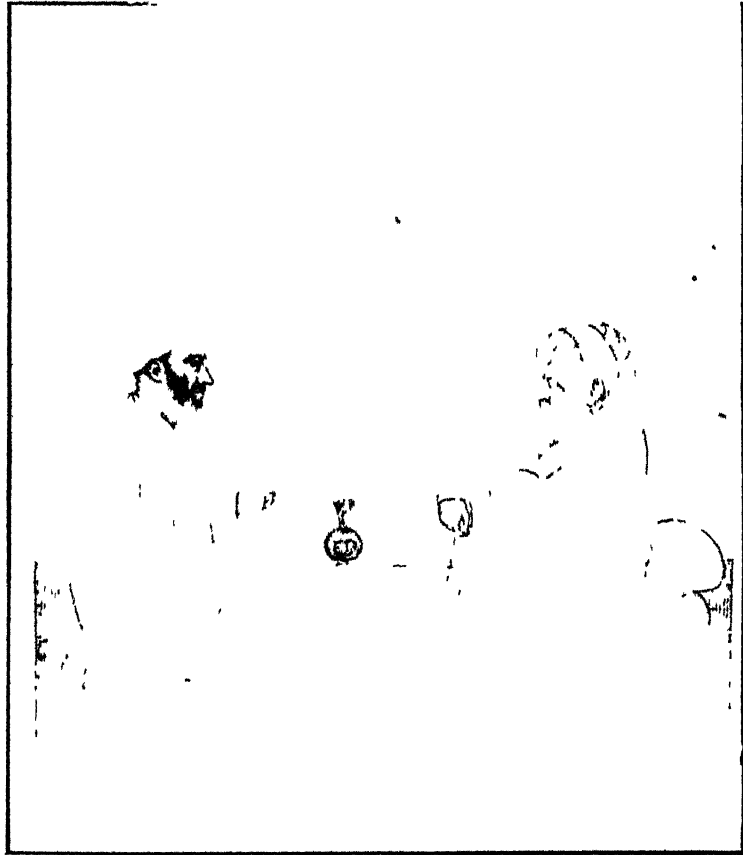
میاں میر　　　　ملا شاہ

یہ تصویر بوڈلین لائبریری سے لی گئی ہے

مُلّا شاہ اور میاں میر

میاں میرؒ

حضرت شیخ میر محمد جو عام طور پر میاں میر کے لقب سے مشہور ہیں ۱۵۵۰ء میں سیستان میں پیدا ہوئے۔ آپ سلسلۂ قادریہ کے درویش تھے۔ شہنشاہِ اکبر کے عہد میں آپ لاہور چلے آئے اور یہاں ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ تک علمِ دین کی نشر و اشاعت میں منہمک رہے۔ آپ کے علم و فضل اور زہد و اتقا کی وجہ سے ہر وقت آپ کے پاس علما و فقرا کی مجلس جمی رہتی تھی۔ دارا شکوہ کے مرشد ملّا شاہ آپ ہی کے مرید تھے۔ اس لئے دارا شکوہ آپ کا بڑا ادب کرتا تھا۔ اُس کی ایک خورد سال بہن آپ کو وضو کرایا کرتی تھی۔ جہانگیر اور شاہجہان نے بھی آپ سے ملاقاتیں کی ہیں۔ جہانگیر نے لکھا ہے کہ روحانی پاکیزگی اور صفائے قلب میں یہ بزرگ اپنے زمانے میں نظیر نہیں رکھتے۔ شاہجہان کہتا تھا کہ میں نے صرف دو ایسے صوفی دیکھے ہیں جو الٰہیات کے ماہر ہیں، ایک میاں میر اور دوسرے محمد فضل اللہ بہاری۔ سکینۃ الاولیا میں دارا شکوہ نے آپ کی وفات کا یوں ذکر کیا ہے "و بتاریخ ہفتم ماہ ربیع الاول ۱۰۴۵ھ بروز سہ شنبہ بمحلہ خانی پورہ در حجرہ کہ مسکن ایشاں بود از قفس تقید و وجود ہوتی خلاص یافتہ بعالم اطلاق لاہوتی کہ وطنِ آں بود شتافت و قطرہ بحر شد۔

ملّا شاہؒ

حضرت شاہ محمد ملّا شاہ بدخشانی تھے حضرتِ میاں میر کے مرید اور دارا شکوہ کے روحانی پیشوا تھے ۱۶۱۴ء میں آپ لاہور تشریف لائے۔ اس وقت آپ ابھی بچے ہی تھے حضرت میاں میر سے بیعت کی درخواست کی تو انہوں نے پہلے علمِ دین کی تکمیل کی ہدایت کی۔ چنانچہ آپ لاہور ہی میں رہ کر تحصیلِ علم کرتے رہے۔ جب فارغ التحصیل ہو گئے تو حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے بیعت سے سرفراز فرمایا۔ وعظ نہایت عالمانہ فرماتے تھے۔ فارسی زبان میں بہت اچھے شعر کہتے تھے۔ یہ مشہور رباعی آپ ہی کی ہے:-

اے بندِ بپائے، قفل بر دل ہشدار
وے دوختہ چشم، پائے در گل ہشدار
عزمِ سفرِ مغرب و رُو در مشرق
اے راہ روِ پشت بہ منزل ہشدار

۱۶۶۰ء کے قریب آپ نے انتقال فرمایا۔ دارا شکوہ نے لکھا ہے کہ میاں میر عالم گنج اور دارا پور کے نواح میں مدفون ہیں۔ یہ وہی علاقہ ہے جہاں اب میاں میر کا گاؤں آباد ہے۔

منصور احمد

رات

بلینکو وہائیٹ کا نام انگریزی ادب میں صرف ایک نظم کی وجہ سے زندہ ہے۔ بظاہر اس نظم کو انیسویں صدی کی عقلی و روحانی کشمکش سے کوئی علاقہ معلوم نہیں ہوتا لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ خیالات ادبی چل چل کے اسی دور کی یادگار ہیں جب علوم جدیدہ کی ترقی نے کائنات کا ایک نیا تصور انسان کے دماغ میں پیدا کر دیا تھا۔ اس نظم کا ترجمہ نثر میں یہاں دیا جاتا ہے۔

پُراسرار رات! جب ہمارے باپ آدم نے پہلے پہل،
خدا کے گھر میں تیرا چرچا سنا، اور تیرا نام جانا،
تو کیا اُس کا دل اِس مرصّع نگارخانہ کے لئے خوف وہراس سے کانپ نہ اٹھا تھا ـــــ
روشنی اور نیل کے اِسی حسین وجمیل سائبان کے لئے؟
لیکن پھر جھلملاتی ہوئی شفاف شبنم کے ایک پردے کے نیچے،
قدرت کے عظیم الہیئت ڈوبتے ہوئے شعلے کی کرنوں میں نہایا ہوا،
شام کا ستارہ ایک نورانی اژدحام کے ساتھ آسمان پر اُبھرا
اور دیکھا تو کائنات کی پہنائی انسان کی نظر میں اور زیادہ وسیع ہوگئی تھی۔
کس کو خیال تھا، اے آفتاب! کس کو خیال تھا کہ تیری شعاعوں کے اندر
اتنی تاریکی چھپی ہوئی ہے؟ اور کون سمجھ سکتا تھا
کہ جس وقت پھول اور پتّا اور کیڑا سب نظر کے لئے آشکار تھے،
اُس وقت تو نے ہم کو نور کے ان گنت کروں کے وجود سے بے بصر بنا رکھا تھا۔
پھر بھلا کیوں ہم اس قدر آسیمہ سری کے ساتھ موت سے گریز کرتے ہیں؟
اگر روشنی اس طرح فریب دے سکتی ہے تو کیا زندگی فریب نہ دیتی ہوگی؟

کرم آباد

حمید احمد خاں

خلیفۃ اللہ فی الارض سے خطاب

اے مسلماں! یہ جان رکھ کہ تجھے
دہر میں کامیاب بننا ہے
اپنی ہمت جوان رکھ کہ تجھے
مصلح شیخ و شاب بننا ہے

مائل پستیٔ خیال نہ ہو
تجھ کو رفعت مآب بننا ہے
اپنے نام بلند کو نہ ڈبو
تجھ کو کیوان جناب بننا ہے

جستجوئے سکوں نہ کر، اک دن
منبع اضطراب بننا ہے
انقلابات سے نہ ڈر، اک دن
مصدر انقلاب بننا ہے

گرم اتمام کار ہونا ہے
قادر فتح باب بننا ہے
فائز اقتدار ہونا ہے
مالک رعب و داب بننا ہے

نیک و بد کا حساب لینا ہے
صاحب احتساب بننا ہے
عدل کو ہر کا سب لینا ہے
معدلت انتساب بننا ہے

پھر تجھے رحمت دو عالم کا
نقطۂ انتخاب بننا ہے
پھر تری ذات کو دو عالم کا
مرکز انجذاب بننا ہے

بے خبر! قطرگی اسیر نہ بن
رشک بحر و سحاب بننا ہے
شرم کر، ذرۂ حقیر نہ بن
غیرت آفتاب بننا ہے

اُٹھ اور اپنے کو ضو فشاں فرما
چارۂ ظلمت جہاں فرما

حکیم آزاد انصاری

قصرِ بخت نصر ثانی

شہرِ بابل کا قدیم حصہ دریائے فرات کے داہنے کنارے پر آباد تھا اور جدید شہر جسے بخت نصر ثانی نے تعمیر کرایا تھا بائیں کنارے پر بستا تھا۔ بادشاہ نے رعایا کے آرام کی غرض سے دریا پر ایک نادر پل بنایا تھا جو شب کو بند ہو جاتا تھا اور دن کو کھول دیا جاتا تھا۔ اس پل کے قریب ہی بادشاہ نبوپلیسر کا قدیم محل چار مساوی مربعوں پر تعمیر کیا گیا تھا اس کے مغرب میں بخت نصر ثانی نے ایک عالی شان قلعہ نو مساوی مربعوں پر بنایا تھا جس کی فصیل شہری تھی اس محل کے کھنڈر القصر کے نام سے مشہور ہیں۔ ڈاکٹر کالڈیوی سولہ سال تک اس کی تحقیقات کرتے رہے۔

یہ قلعہ معلی جیسا کہ کتبہ سے ظاہر ہے ارست باب ایلی یعنی وسطِ شہر بابل میں بنایا گیا تھا۔ چونکہ عہدِ عتیق سے خاص قلعہ کا مقام یہی چلا آتا تھا اور شہر کے دیوتا مردوخ (منتری) کے مندر عیسٰی غیلا کو جانے والی سڑک اسی کے سامنے سے گذرتی تھی اس لئے بقول ڈاکٹر کالڈیوی بابل کا نام باب ایلی (دیوتاؤں کا دروازہ) رکھنا کچھ بعید نہ تھا۔ قصر کے جنوبی مشرقی گوشہ کے کھودنے سے بہت نیچے جا کر قدیم آبادی کے آثار نمودار ہوئے اور متعدد گلی ظروف، چقماق، پتھر کے ہتھیار اور مختلف اقسام کے اوزار وغیرہ بھی برآمد ہوئے[1]۔

بعدِ فتح مصر بخت نصر ثانی نے اس عالی شان قصر کی تعمیر شروع کی جب تک جدید قصر زیرِ تعمیر رہا بادشاہ مذکور کا

---

[1] ممالکِ بابل و اسیریا کے قدیم شہروں کے آثار جو شارعِ عام کے گرد و نواح میں واقع تھے ان کو اول اول سیاح ریگ کے ٹیلے تصور کرتے رہے لیکن شہرِ نینوہ اور بابل کی روایات سولہویں اور سترھویں صدیوں میں یورپین سیاحوں کی کشش کا باعث ہوئیں کچھ تو شوقِ تحقیق اور کچھ دفائن و خزائن کے لالچ نے غیر معمولی شوق قدیم شہروں کے کھودنے کا پیدا کر دیا۔

اٹلی کے باشندہ ڈیلاوال نے اپنے سفرنامہ میں آثارِ بابل و مقیار کا تذکرہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ قصر کے ایک حصہ کو بھی کھودا گیا تھا اٹھارھویں صدی کے شروع میں ڈنمارک کے مشہور فاضل نائی بوہر (Niebauhr) نے شہر بابل کے کھنڈروں کی تحقیقات کی اور انہیں کے طفیل سے یہ مسئلہ طے ہوا کہ جو ٹیلے قصبہ حلہ کے متصل ہیں وہ شہرِ بابل کے آثار ہیں! سولہویں صدی کے آخر میں مسٹر بی چہم نے وضاحت کے ساتھ ان ٹیلوں کا حال قلمبند کیا جن کے نیچے شہرِ بابل کے آثار دبے ہوئے تھے۔

مسٹر ریچ، مسٹر منگن، موسیو فرزنل، موسیو اوپرٹ، سر ہنری لے یارڈ، مسٹر ریسم، اور ڈاکٹر کالڈیوی نے فرداً فرداً اور مختلف سنوں میں قسمت آزمائی کی تھی۔

قیام قدیم محل میں تھا۔ جدید قصر کی تکمیل ہوتے ہی قدیم محل گرا دیا گیا اور اس کی بنیاد پر دوسرا محل تعمیر کیا گیا۔ نیز قصر و محل کے درمیانی حصے کو ملبے اور گٹی سے بھر کر مشرقی حصہ کے برابر کر دیا تھا۔

اس قصر میں لاتعداد کمرے تھے۔ بادشاہ حامورابی کے عہد سے داد و ستد کا تعلق شاہی محل سے چلا آتا تھا۔ تمام قضیے اور جھگڑے یہیں طے ہوتے تھے[1] نیز تجارت، بیوپار، خرید و فروخت، لین دین جملہ معاملات کی تکمیل قصر کی چار دیواری کے اندر ہو جاتی تھی[2] الغرض قریب قریب تمام عدالتیں قصر کے اندر تھیں اور اُن کے لئے مکانات مخصوص تھے۔ علاوہ ازیں خاص خاص ارکینِ دولت اور دیگر ملازموں کو بقدرِ حیثیت و خدمت قصر کے مکانات رہنے کے لئے دیئے جاتے تھے۔ تمام شاہی کارخانے بھی اسی قلعہ کے ایک حصہ میں تھے اور جو اشیا بادشاہ کے استعمال میں آتی تھیں قلعہ ہی میں بنائی جاتی تھیں۔

قصر کی دیوار کے جنوبی مغربی گوشہ کے کمرے سے متعدد نہایت اعلیٰ سنگِ مرمر کے نامکمل مرتبان برآمد ہوئے ہیں۔ ایسے مرتبانوں کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے[3]۔

مغرب کی جانب بادشاہ نبوپولیسر کے قدیم محل پر شاہی محل سرا جس میں باغِ آویزاں تھا تعمیر کی گئی تھی[4] اس محل سرا میں تین مدوّر چاہ بھی برآمد ہوئے ہیں۔ ہر چاہ ایک مختصر پیمانہ کے کمرے میں تھا جس کی دیواریں سطحِ آب تک گئی تھیں۔ چاہ کے گرد گٹی کی بھرتی دی گئی تھی تاکہ پانی صاف اور ستھرا رہے۔

چھتوں کے پرنالوں کے موہرے نہایت خوبصورت اور خوشنما تھے۔ بارش، غسل خانوں اور روزمرہ کا مستعمل

---

[1] عہدِ عتیق میں تو بادشاہ خود فیصلہ کرتا تھا بعد میں حکام زیرِ نگرانی بادشاہِ وقت ہر قسم کے مقدمات فیصل کرنے لگے تھے۔

[2] اس کی شہادت ان کتبوں سے پہنچتی ہے جو جدید خاندانِ شاہانِ بابل کے عہد کے ہیں اُن پر مقامِ تکمیلِ اسناد یا نامِ عدالت کی بجائے ”البیت شہر بابلی“ کندہ ہے جس کا مطلب ہے ”احاطۂ قلعۂ بابل“

[3] شاہانِ سلف اکثر تحائف کے طور پر سنگِ مرمر کے مرتبان اپنے ہمعصر بادشاہوں کو بھیجا کرتے تھے۔ خاندانِ کیانی کے مشہور بادشاہ بہمن دراز دست نے سنگِ مرمر کے مرتبانوں پر اپنا نام اور لقب کندہ کرا کر فرعونِ مصر اور شہریارِ ایشیائے کوچک کو تحفہ بھیجے

[4] محل سرا کے کھودنے سے ایک قبر برآمد ہوئی جس میں ایک گلی تابوت رکھا ہوا تھا۔ تابوت مذکور کے اندر لاش کے ساتھ طلائی اور جڑاؤ زیور نیز ایک مستطیل منقش طلائی تختی برآمد ہوئی۔ اس تختی کے چاروں کونوں پر ایک ایک سوراخ ہے جس کی وجہ سے اسے کو جوشن یا بازوبند کا ایک حصہ قیاس کیا گیا ہے۔ اس پر کسی مندر کا نقشہ ٹھپہ کیا ہوا ہے۔ بقول ڈاکٹر کالڈیوی سامانِ قبر سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ نبوپولیسر کی لاش ہے۔

پانی نہایت عمدہ پختہ اور وسیع پٹی ہوئی موریوں اور نالیوں کے ذریعہ سے خارج ہوتا تھا۔

یہودی مورخ جوزیفس کا قول ہے کہ بادشاہ بخت نصر ثانی نے اس عالی شان قصر کو پندرہ روز کے عرصہ میں تعمیر کرایا تھا مورخ مذکور کا بیان مبالغہ آمیز تصور کیا جاتا تھا لیکن بخت نصر ثانی کا ایک کتبہ برآمد ہوا ہے جو لندن کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس سے مورخ مذکور کے قول کی صداقت ہوئی۔

بخت نصر ثانی اپنے دوسرے کتبہ میں بیان کرتا ہے "تاپرتی نیسی (عجائب روزگار یعنی قصر) کی بنیاد نہایت مضبوط قائم کی ہے اور اس کو پختہ خشت و قیر سے پہاڑ کے برابر بلند بنایا ہے۔ اس کی چھت پر میں نے بڑے بڑے زبردست دیودار کے شہتیر ڈالے ہیں۔ اس کے کواڑوں پر جو دیودار کے ہیں تانبے کے پتر جڑوائے ہیں۔ ان کی چوکھٹیں اور چولیں برنجی ہیں۔ چاندی، سونا، جواہر اور تمام وہ بیش قیمت اشیا جو شوکت، دولت اور ثروت کا لازمہ ہیں نیز قابل قدر نادرات بے قیاس جمع کر کے اس محل کے شاہی خزانہ میں محفوظ کی ہیں"۔ قصر کا عالیشان دروازہ مشرقی جانب تھا جس کے بیرونی حصہ پر گرگج بنے ہوئے تھے۔ اس شاندار اور وضعدار پھاٹک کے کواڑوں پر تانبے کی چادریں جڑی ہوئی تھیں۔ چوکھٹیں اور چولیں پیتل کی تھیں۔ ان پر نہایت خوشنما بیل بوٹے ٹھپہ کئے ہوئے تھے دیوی نن ماخ کے مندر کے متصل ہونے کی وجہ سے اس دروازہ کا نام باب بعلتی یعنی بیگم کا دروازہ تھا۔

قصر کی تین ڈیوڑھیاں نہایت وسیع تھیں۔ ان کے دونوں جانب محافظان محل، دربانوں، یساولوں اور چوبداروں کے لئے خوبصورت صحنچیاں بنائی گئی تھیں۔ ڈیوڑھیوں کے دروازے شان اور وضع میں صدر دروازہ کی طرح تھے۔ ہر ڈیوڑھی کے بعد ایک صحن تھا جس کے چاروں طرف خوش وضع اور خوش قطع دالان در دالان بنے ہوئے تھے۔ ہر صدر دالان جنوبی سمت میں بنایا تھا تاکہ تمازت آفتاب سے پناہ ملے۔ بعض دالانوں اور صحنچیوں میں حکام کے اجلاس تھے۔ سب سے زیادہ خوبصورت اور وسیع دالان صحن کے جنوب کی طرف بنا ہوا تھا جس کو دربار عام کہتے تھے۔ اس کی دیواروں کا عرض چھ میٹر[۱] تھا[۲]۔ اس دالان کے تین دروازے صحن کے رخ کھلتے تھے۔ درمیانی دروازہ کے بالکل مقابل یا سامنے کی دیوار کے آثار میں ایک دوہرا طاق نہایت بلند اور وسیع آراستہ و مزین بنا ہوا تھا۔ یہ طاق کسریٰ کا ہمسر اور طاق نوفل سے برتر تھا اور اس میں بادشاہ بخت نصر ثانی کا تخت بچھا رہتا تھا

---

[۱] میٹر۔ ایک میٹر برابر ہے ۳۹.۳۷۰ انگریزی انچ کے یا ۳۹.۳۸۰ امریکن انچ کے۔

[۲] چونکہ اس کمرہ کی دیواریں دیگر کمروں کی دیواروں سے زیادہ عریض تھیں اس لئے قرین قیاس ہے کہ اس کمرے کی چھت ڈاٹ کی تھی۔

دالان کی پیش عمارت (برآمدہ) کی روکار میں نہایت خوش رنگ و خوشنما منقش روغنی چوکے[۵۱] نصب تھے اس برآمدہ کے ستون اور فیل پائے بسنتی رنگ کے اور ان کے اوپری حصے نیلے تھے مگر ستون و سر ستون کے اطراف سفید تھے۔ ستونوں کے سروں پر پیچ در پیچ رنگین تحریروں کا ایسا جال بنایا تھا کہ دیکھ کر عقل حیران ہوتی تھی[۵۲]۔ قصہ مختصر آرائش آسمانی و بسنتی رنگوں میں کی گئی تھی جو دیدنی ہے الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتی۔ دیواروں پر رزم و بزم، شکار و دربار وغیرہ کے مناظر تصاویر میں دکھائے تھے جن کی مصوری کو دیکھ کر انسان عالم سکوت میں رہ جاتا تھا۔

چوکوں کی رنگ آمیزی سے اور غلطان و مشبک اشکال بنا کر ایسے جوڑ ملائے تھے کہ ہزاروں برس بدستور رہ کر کمال صناعی کا زبانِ حال سے اظہار کر رہے ہیں اور جن کو دیکھ کر آج کل کے صناعوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑتے ہیں۔ اس قصر کے در و دیوار کی سنگ تراشی، منبت کاری، نقاشی، مصوری اور دستکاری کمال درجہ کی تھی۔ اس عمارت میں بخت نصر ثانی دربار کرتا تھا۔ سب اعلیٰ اور ادنیٰ، چھوٹے بڑے اپنے اپنے پایہ مرتبہ پر آ کر کھڑے ہوتے تھے۔ ارکین دولت بقدرِ منصب و درجہ دالانوں میں اور عوام صحن میں دست بستہ کھڑے ہو کر منتظرِ جلوۂ بادشاہی ہوتے تھے بادشاہ بخت نصر تخت پر جلوس فرماتا تھا۔ وہ مجرا گاہ میں تسلیمات و آداب بجالاتے تھے۔ موافق قدر و منزلت ہر ایک کو سرفرازی ہوتی تھی۔

گردشِ آسمان و انقلاب لیل و نہار کو دیکھئے کہ قرب و جوار کے سب آثارِ قصر کی طرف ڈر کے مارے نہیں جاتے بھوتوں کا اکھاڑا سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں شب کو ہر طرف سے بھوت پریت نکل کر ناچتے کودتے ہیں۔

افسوس گردشِ افلاک نے اس عدیم المثال عمارت سے نام و نشان کو حرفِ غلط کی طرح صفحۂ زمین سے مٹا دیا۔ اب صرف تواریخ کی نوحہ خوانیاں رہ گئی ہیں۔

آں قصر کہ بر چرخ ہمے زد پہلو ۔۔۔ بر درگہ او شہاں نہادندے رو

دیدیم کہ بر کنگرِ او فاختۂ ۔۔۔ بنشستہ ہمی گفت کہ کو کو کو

باغِ آویزاں - قصرِ مذکور کے اندر وہ مشہور باغ بھی تھا جس کا ہفت عجائبِ عالم میں شمار ہوا ہے۔ واللہ

---

۵۱ اگر انصاف سے دیکھا جاتے تو پچیکاری خواہ وہ اشکال ہندسی ہوں یا پھول پتیاں ہوں عہدِ تغلق کے منقش روغنی چوکوں سے اخذ کی گئی ہیں۔

۵۲ اس کام کو فنِ عمارت کی اصطلاح میں غالب کہتے ہیں۔

اعلم کہ اس باغ کو یونانی مورخین نے باغ آویزاں کیوں لکھا ہے حالانکہ صحیح اصطلاح اس کے واسطے غلطان باغ ہے۔ بہرحال بروسس بابلی، ٹی سیاس، ہراڈوٹس، اسٹریبو، کرٹیس روفس، ڈائڈورس کے اقوال شاہد ہیں کہ اس باغ کو بادشاہ بخت نصر ثانی نے اپنی بیگم اموھیا[۵۱] کی خوشنودی کے لئے بنایا تھا تاکہ بیگم مذکور کو اپنے وطن کی پہاڑیوں اور شاداب جنگلوں کا پورا لطف اس کفِ دست میدان میں حاصل ہو۔

بابل جیسے لق و دق میدان میں اپنی بیگم کی دل بستگی کے لئے مصنوعی پہاڑ اور جنگل بنانا پھر وہ نزہت افزا اور پُرلطافت باغ نمونۂ بہشت بریں لگانا جو دنیا کے عجائبات میں شمار کیا جاتا ہو بخت نصر کی دولت و اقبال کا اعلیٰ ثبوت ہے۔

باغ مذکور مربع شکل میں تھا جس کا ہر ضلع ۴۴۰ (چار سو چالیس) فیٹ اور طبق بر طبق یا سیڑھی پر سیڑھی بلند ہوتا ہوا فصیل کی سطح تک پہنچ گیا تھا۔ ایک طبق یا چبوترے سے دوسرے چبوترے تک دس فیٹ کا فاصلہ تھا اور تمام چھتوں کو محراب دار بناتے ہوئے چلے گئے تھے۔ دونوں پہلوؤں میں نو نو گز چوڑی دیواریں اور چھتیں ڈاٹ کی تھیں یعنی ستونوں پر محراب بنا کر سولہ فیٹ طویل اور چار فیٹ عریض سنگین سلیں پاٹ دی تھیں۔ ان کے اوپر ایک تہ گھانس کی بچھا کر دوہری اینٹوں کا کھرنجہ قیر سے جما کر موٹی موٹی جست کی چادریں بچھا دی تھیں۔ ان جست کی چادروں پر مٹی ڈال کر کیاریاں بنائی گئی تھیں لیکن کیاریوں میں اس قدر موٹی تہ مٹی کی دی تھی کہ بڑے بڑے درخت مثل سرو، شمشاد، بیدِ مجنون، انار، املی، سرس وغیرہ نشو و نما پا سکیں۔

یونانی اور رومن مورخوں کا بیان ہے کہ سب سے اوپر کے طبق یا چبوترہ پر پانی کھینچنے کی مشین اس خوبی سے لگائی گئی تھی کہ باہر سے معلوم نہیں ہوتی تھی۔ یہ مشین نلوں کے ذریعہ سے دریائے فرات اور اس کی نہروں کا پانی کھینچ کر حوضوں میں بھرتی تھی اور وہاں سے پانی مختلف طبقوں کی کیاریوں میں تقسیم ہوتا تھا[۵۲]۔ آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ باغ چار طبقوں کا تھا اور پائے جن پر محرابیں قائم کی گئی تھیں ایک دوسرے سے ساٹھ فیٹ کے فاصلہ پر قائم کئے گئے تھے۔ ہر پایہ کا دور بائیس[۲۲] فیٹ تھا۔

ڈاکٹر کالڈیوی کا قول ہے کہ دورانِ تحقیقات میں ایک باولی برآمد ہوئی جو نہایت عمیق اور وسیع تھی اور جس کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ درمیانی حصہ چوکور اور ادھر اُدھر ایک ایک مستطیل چاہ تھا۔ گمانِ غالب ہے کہ ان پر بہت بڑا

۵۱؎ اموھیا کو بگاڑ کر یونانی مورخوں نے امی تس یا اماتی تس کر لیا تھا۔ یہ بیگم سےکاوس بادشاہِ ایران کی لڑکی تھی بادشاہ مذکور کا نام زبانِ ژند میں ہووک شاتارہ تھا

۵۲؎ مسٹر رسیم جن کا ذکر پہلے آچکا ہے بیان کرتے ہیں کہ دورانِ تحقیقات میں اس باغ کے سب سے بالائی طبقہ پر کچھ نل ایسے دیکھنے میں آئے جو پتھر کی سلوں میں گذر کر زیریں حصوں میں پہنچے تھے۔ کوڑے کرکٹ سے اٹ گئے تھے۔ صاف کرنے پر ہزاروں برس کے بعد بھی پانی بھرا ہوا پایا۔

رہٹ لگا ہوا تھا جو شب و روز چلتا ہوگا[۵۱]

ہر دو مستطیل چاہ سے رہٹ کی ڈولچیاں ہوکر گذرتی تھیں اور پانی کسی قریب کے خزانہ میں جمع ہوکر مختلف طبقوں کے حوضوں میں تقسیم ہوتا تھا جہاں سے کیاریوں میں دوڑایا جاتا تھا[۵۲]۔

اس قدر بلندی پر نونہالانِ باغ کی پرورش کے لئے جو ذرائع آب رسانی کے اس قدیم زمانہ میں اختیار کئے گئے تھے وہ قابلِ ستائش ہیں۔

ہر قدیم مورخ نے اس بے نظیر باغ کی ثنا و صفت میں خوب نغمہ سرائی کی ہے اُن کے خیال کا اظہار مندرجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے

ہر کرمی خواہد کہ بیند شکلِ فردوسِ بریں　　گو بیا ایں قصر و ایں باغ ہمایوں را ببیں

کبھی اس باغ میں بارہ دربان، سرد خانے، نشاط خانے، سیرگاہیں، بزم گاہیں وغیرہ وغیرہ موقع موقع اور سلیقہ سے بنی ہوئی تھیں اور چاروں طرف نہریں جاری تھیں۔ جابجا حوض بنے ہوئے تھے۔ پانی لہراتا تھا۔ فوارے چھوٹتے تھے۔ پھول کھلتے تھے۔ طائرانِ خوش الحان نغمہ سرائی کرتے تھے۔

سب سے اوپری منزل سے کوسوں تک سبزہ زار کا نظارہ اور دریائے فرات کا پیچ در پیچ لہرانا عجیب فرحت افزا اور حیات بخش تھا۔ عجیب زمانہ تھا جب کہ یہ باغ کمالِ نزہت و طراوت کے باعث رشکِ ارم نظر آتا تھا اور اس کی سیر سے ناظرین و سیاحین کو بہشتِ شداد کا لطف حاصل ہوتا تھا مگر زمانہ ناساز گار نے سب ویران کردیا۔ وہ سرو جو قدِ یار پر طعنہ مارتے تھے۔ وہ پھول جو دلبروں کے لبوں پر ہنستے تھے نام کو بھی نہ رہے۔ روشیں مٹ گئیں۔ نہریں ٹوٹ گئیں۔ حوض بند ہوگئے۔ فوارے چپ ہوگئے۔ کوئیں اندھے ہوگئے آبشاروں کا نام نہ رہا الغرض

جلتا ہے اب پڑا خس و خاشاک میں ملا　　وہ گل کہ ایک عمر چمن کا چراغ تھا

گذروں ہیں جس خرابہ پہ کہتے ہیں واں کے لوگ　　ہے کوئی دن کی بات یہ گھر تھا یہ باغ تھا

محمد حامد دہلوی

۵۱؎ یہ قرینِ قیاس ہے کہ دریائی چاہ کی علتِ غائی رہٹ کی مرمت تھی یعنی جب کوئی حصہ رہٹ کا قابلِ مرمت ہوجاتے تو زنجیر وغیرہ اس میں اتر کر مرمت کردیں۔

۵۲؎ عموماً رہٹ گھوڑوں یا بیلوں کی امداد سے عراق عرب میں چلایا جاتا ہے مگر باولی مذکورہ کے آس پاس اس قدر گنجائش نہیں ہے کہ گھوڑے یا بیل پھر سکیں۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ قیدی یا غلام اس خدمت کو انجام دیتے ہوں یا کوئی مشین آب رسانی کی ایسی لگی ہو جس کے ذریعہ سے بغیر خارجی امداد کے آبپاشی ہوتی ہو مگر اس وقت تک کسی کتبہ سے ایسا ثابت نہیں ہوا۔

راز و نیاز

۱

رگ رگ میں بسی ہے تیری خوشبو اب تک — فرقت میں ٹپک رہے ہیں آنسو اب تک
اِک عمر ہوئی جدھر بٹھایا تھا تجھے — ویران ہے اُس دن سے وہ پہلو اب تک

۲

آجا، مرتا ہوں غم کے مارے، آجا — بھیگی ہوئی رات کے شرارے، آجا
اے شام کا وعدہ کر کے جانے والے! — اب ڈوب رہے ہیں دیکھ تارے، آجا

۳

میں رات گئے اٹھا ہوں سوتے سوتے — آنکھوں کا بُرا حال ہے روتے روتے
تارے کے قریب ماہِ نَو ہے، اے کاش — اِس وقت مرے قریب تم بھی ہوتے!!!

۴

کیا عہد تھا وہ اے بُتِ پُرفن تیرا — دیتا تھا مجھے ہوائیں دامن تیرا
فسوس وہ دن، کہ کھیلتا تھا پہروں — جب میری جوانی سے لڑکپن تیرا

جوش
ملیح آبادی

قُدرتی مناظر

ایک سنسکرت کا شاعر کہتا ہے کہ "جہاں ہری ہری دوب کا فرش زمردیں بچھا ہے۔ قریب ہی خوبصورت جھرنے بہ رہے ہیں جن میں آہوانِ دشت کے کھروں کے نشانات بنے ہیں۔ نازک اور خوبصورت پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو میں لپٹی ہوئی عطر بیز ہوا چل رہی ہے۔ اشجار مستوں کی طرح جھوم رہے ہیں جن پر طائرانِ خوش نوا چہچہا رہے ہیں اُن کے شیریں اور روح پرور نغمات سے میدان گونج رہا ہے۔ بھلا ایسے دل آویز نظارے کس کے دل کو فریفتہ نہیں کر سکتے"

قدرتی مناظر کی خوبصورتی اور خوشنمائی سے اگرچہ کسی کو انکار نہیں ہو سکتا مگر انہیں بخوبی سمجھنے کی قابلیت بہت تھوڑے انسان رکھتے ہیں۔ جب ہم کسی بحرِ بیکراں کو پہلے پہل دیکھتے ہیں اُس کی مہیب اور ہولناک لہروں کے تھپیڑوں کی صدائیں سنتے ہیں یا کسی سنسان اور لق و دق وادی میں جا نکلتے ہیں۔ یا فلک رفعت برفانی چوٹیوں پر نظر ڈالتے ہیں یا کسی کوہِ آتش فشاں کو آتش فشانی کی حالت میں دیکھتے ہیں تو حیران اور ششدر ہو کر رہ جاتے ہیں ان قدرتی مناظر کو قدرت کے پرستان کی پریاں تصور کرنا چاہیئے جو اپنے کرشمہ ہائے سحر ساز سے دیکھنے والوں کو متحیر بنا دیا کرتی ہیں۔

قدرتی مناظر پر غور کرنے سے قبل مشاہدہ کرنے کی عادت ڈالنا ضروری اور لابدی ہے۔ کیونکہ کسی شے پر غور وخوض کرنے کی بہ نسبت اس کا مشاہدہ کرنا کہیں زیادہ آسان ہے۔ اور پھر یہ بھی ایک مسلہ امر ہے کہ انسان جس شے کا مشاہدہ کرتا ہے اُس کی تحقیق کی طرف بھی اُس کی طبیعت راغب ہوتی ہے۔ ازاں بعد قوتِ بیانیہ کے عمل کا شوق پیدا ہوتا ہے محققین اور عوام کی آنکھوں میں بظاہر تو کوئی تفاوت نظر نہیں آتا البتہ بباطن اُن کی وسعتِ نظری اور باریک بینی کے روبرو عوام کی آنکھیں بے کار سی ہیں۔ بدن کے تمام اعضا خدا نے تمام انسانوں میں یکساں بنائے ہیں۔ مگر دانشمندوں اور بے عقلوں کے حرکات و سکنات وغیرہ میں زمین و آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔ جو نظرِ تعمق سے مشاہدہ کرنے کے عادی ہیں موسم برسات میں ہر گھڑی ایک نیا نظارہ دیکھتے ہیں کھیت میں یا جنگل میں جہاں کھڑے ہوں پُر کیف منظر سے آنکھیں روشن کرتے ہیں۔ آسمان پر منڈلاتے ہوئے بادلوں کے دل ربا نظارے کا لطف

اٹھاتے ہیں۔

قدرتی مناظر کو دیکھ کر حظ حاصل کرنا دل کی صفت محمود ہے اگر ہم اس کی بیخ کنی کر ڈالیں تو ہماری ہستی پر اس کے لازوال نتائج کا اثر ظہور میں آئے گا۔ اس لیے جو انسان قدرت کی خوبصورتی اور خوشنمائی سے متاثر ہو کر لطف اٹھاتے ہیں وہ خواہ نیک ہوں یا بد شگفتہ خاطر رہتے ہیں۔

جس وقت آم کے بُور کی خوشبو چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ بھونرے گونجتے ہوئے آتے ہیں اور شیفتہ ہو جاتے ہیں یا جب پودوں میں نئی نئی کونپلیں اور پتے نکل کر خوبصورت چند رنگ کی طرح خوشنما معلوم ہونے لگتے ہیں تو بسنت کی خوبصورتی اور دل ربائی رشیوں اور منیوں کے قلوب کو بھی کھینچ لیتی ہے پھر انسانوں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔

شعرا نے پھولوں کو پہلا درجہ دیا ہے اور یہ مناسب بھی ہے کیونکہ جب کسی باغ یا چمن کا منظر نظروں کے سامنے آتا ہے تو سب سے پہلے پھولوں ہی پر نظر جاتی ہے۔ قدرت کی دیوی نے پھولوں کو انسان ہی کے مفاد اور آرام کے لیئے بنایا ہے۔ بچے پھولوں سے محبت کرتے ہیں۔ لازوال خوشیاں بخشنے والے پھولوں پر کسان اور باغبان بھی شیفتہ ہو جاتے ہیں عیش و طرب کے بندے، راحت و آرام کے دلدادے بھی پھولوں پر جان دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ شہری اور دیہاتی بھی پھولوں سے الفت رکھتے ہیں۔

ہر موسم میں پھول جُدا جُدا قسم کے ہوتے ہیں۔ لیکن صحراؤں، کوہوں، بنوں میں ہر قسم کے پھول ہر موسم میں پائے جاتے ہیں اسی طرح سمندر کے ساحلوں پر بھی ہر موسم میں ہر قسم کے پھول کھلتے رہتے ہیں۔

پھولوں کے نظارہ سے صرف آنکھوں ہی کو لطف حاصل نہیں ہوتا بلکہ پُر نصیحت اور اخلاقی اسباق بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان کے مختلف رنگوں اور مختلف اشکال سے پتہ چلتا ہے کہ قدرت نے ضرور کسی اہم کام کے لیئے انہیں پیدا کیا ہے۔ پھولوں کی طرح درختوں اور بیلوں کے پتے بھی نہایت خوشنما معلوم ہوتے ہیں یہ گویا اُن کے لباس ہیں۔ بڑے بڑے تناور درختوں پر چھوٹے چھوٹے پھولوں کا لگنا اور چھوٹے چھوٹے پودوں اور بیلوں میں بڑے پھولوں کا آنا یہ بھی ایک نرالی ہی خوبصورتی ہے لیکن درختوں کی خوبصورتی کو پتے ہر موسم میں قائم رکھتے ہیں اور درخت سراپا حسنِ فطرت کی تصویر نظر آتا ہے۔

سرد ممالک کے بن موسمِ گرما میں سرسبز ہوتے ہیں لیکن موسم سرما میں جب برف پڑنے لگتی ہے تو درختوں کے پتے جھڑ جاتے ہیں شاخوں میں کونپلوں کا نام و نشان تک بھی نہیں رہتا صرف برف کا سیمیں ملمع چڑھا رہتا ہے۔ اُس نظارہ کی کیفیت بھی نرالی ہی ہوتی ہے۔ منطقہ حارہ کے جنگلوں کی رونق میں اس سے نہایت اختلاف پایا جاتا

ہے۔ یہاں اشجار اونچے اونچے چرخِ بریں سے باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ زیرین حصہ کچھ دور تک یعنی درختوں کی جڑوں سے شاخوں کے نکلنے کے مقام تک ایک لمبا سیدھا تنا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے زیرین حصہ کشادہ رہتا ہے اور گھرے سائے کے سبب بہت سرد بھی ہوتا ہے۔ بالائی حصہ میں درختوں کی شاخیں اتنی گنجان رہتی ہیں کہ اچھے خاصے بادلوں کے گروہ دکھائی دیتے ہیں، جو مہرِ عالمتاب کی زریں شعاعوں کے استقبال کو اوپر چڑھتے محسوس ہوتے ہیں۔ چوپائے اشجار پر چڑھ جاتے ہیں۔ طائرانِ خوش الحان درختوں کی بلند سے بلند شاخوں پر بیٹھ کر شیریں نغمات گایا کرتے ہیں۔ سانپ اور دوسرے رینگنے والے جانور بھی درختوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ بیلوں کو درختوں سے لپٹی ہوئی دیکھ کر جوشِ محبت کا سماں بندھ جاتا ہے۔ جتنی قسمیں بیلوں کی منطقۂ حارّہ میں پائی جاتی ہیں اتنی کسی اور خطّہ میں نہیں پائی جاتیں۔ دکن کے جنگلات کے حالات جو سنسکرت کے مشہور شاعر بھوبھوتی نے اتر رام چرتر میں قلمبند کئے ہیں گویا دلکش تصویر کھینچ دی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "جس جگہ پر سلسلہ ہائے کوہستان پھیلے ہوئے ہیں اُس سرزمین کی رونق کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ مست موروں کی صدائیں ہوائیں گونجتی رہتی ہیں آہوانِ دشت قطاروں میں کلیلیں کرتے پھرتے رہتے ہیں۔ ندی کے کنارے پر درختوں کی قطاروں کی خوشنمائی قابلِ دید ہے۔ بیلوں کی کثرت کے نظارہ کی رونق حدِ بیان سے باہر ہے۔ گنجان جنگل کیا ہے ایک پرکیف نظارہ ہے جہاں طرح طرح کے پرند دلفریب نغمات گاتے ہیں۔ بارآور اشجار ہیں کہ اثمار کے بار سے جھکے پڑتے ہیں جن کا سایہ گوداوری کے پانی میں جھلملا جھلملا کر رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ بانسوں کے جنگلات میں جگہ جگہ ان کے آپس میں ملنے سے قدرتی کٹیاں سی نظر آتی ہیں جن سے الوؤں کی خوفناک صدائیں نکل کر سنائی دیتی ہیں۔ ان کو سن کر زاغ گونگے کی طرح خاموش بیٹھے رہتے ہیں اور اس قدر خائف ہو جاتے ہیں کہ کسی طرف اُڑنا تو درکنار اُڑنے کا قصد بھی نہیں کرتے۔ طاؤس اِدھر اُدھر جنگلوں میں صدائیں کرتے پھرتے ہیں جن کے شور سے سانپ گھبرا کر پرانے درختوں کے کھوکھلوں میں کنڈلی مارے پڑے رہتے ہیں جن پہاڑوں سے گوداوری ندی نکلی ہے وہ سیاہ بادل کی طرح نظر آتے ہیں۔ گوداوری کی دھار شور کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جس میں اونچی اونچی لہریں اٹھتی ہیں اور آپس میں ٹکراتی ہیں۔ اور پھر گوداوری اُس خوبصورت اور مقدس بحرِ بے کراں میں داخل ہو جاتی ہے جس کے پانی کا منظر نہایت دل کش ہے۔"

بہت سی جنگلی اقوام درختوں کو دیوتاؤں کی طرح پوجتی ہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ اگر ہم اکیلے کسی بن میں جا نکلیں اور کوئی درخت ہم سے گفتگو کرنے لگے تو ہمیں خوشی ہوگی اور لطف بھی آئے گا۔ دن کے وقت گنجان جنگل میں جانے سے خوف بھی طاری ہوتا ہے جس سرزمین پر درختوں اور بیلوں کی حکومت ہوتی ہے وہاں

پانی کا مقام ضرور نزدیک تر ہوتا ہے مثلاً ندی، تالاب، آبشار وغیرہ اور بن کا منظر نہایت ہیبتناک ہوتا ہے۔ بادل گھر کر نیلگوں فلک کی رونق کو دوبالا کرتے ہیں۔ علی الصباح کہرے کے دھندلکے ہیں تالاب اور چشموں کا صاف شفاف پانی بلّور تبھر کی طرح چمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ دنیا کی نباتات کی زندگی کا انحصار پانی ہی پر ہے اس کی بدولت بڑے بڑے وسیع میدان سرسبز نظر آتے ہیں۔ پانی کے بہاؤ سے دریائے نربدا کے کاٹے ہوئے بڑے بڑے پہاڑ اور پتھر دیکھنے سے دستِ قدرت کی صناعی کے بے مثال نمونے آشکار ہوتے ہیں۔

جب کوئی تھکا ہوا مسافر مہاندی یا کشادہ تالاب کے نزدیک پہنچتا ہے تو سفر کی تمام کلفتوں کو فراموش کر دیتا ہے۔ پانی میں نہانے سے تکان کا نام ونشان تک بھی نہیں رہنے پاتا۔ کالی داس کا بیان ہے کہ "صاف اور گہرے پانی میں خوب غوطے لگا کر فرحت حاصل ہوتی ہے"۔ نازک پھولوں کی خوشبو سے بھری ہوئی ہوا ہر فرد کو مست کر دیتی ہے۔ موسم گرما میں گہرے سائے میں فوراً ہی نیند آجاتی ہے۔ شام کا وقت عجیب فرحت بخش ہوتا ہے بحری سیاحوں کو سمندر نہایت دلکش معلوم ہوتا ہے۔ آسمان کی بہ نسبت سمندر زیادہ آزاد اور پُرجلال ہے۔ سمندر کا ساحل بے شمار جاندار اور نباتات کا گہوارہ ہوتا ہے اُن میں سے بہت سے مدوجزر کی تفتیش میں ہمہ تن محو ہوتے ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جنہیں سمندر کی موجیں سمندر سے نکال کر پھینک دیا کرتی ہیں۔ ساحلِ سمندر پر کھڑے رہنے سے پرندوں کی خوفناک صدائیں سنائی دیا کرتی ہیں۔ اور سمندری ہوا میں تو ایک برقی اثر معلوم ہوتا ہے کہ بدن سے لگتے ہی دلوں میں سنسنی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ جوش اور امنگ کے دریا موجزن ہونے لگتے ہیں۔

سمندر کی حالت میں ہر وقت تغیر و تبدل ہوا کرتا ہے صبح سے شام تک کتنے ہی انقلابات ظہور پذیر ہوتے ہیں اگر ہمارا مکان سمندر کے کنارے ہو اور ہم دریچے میں بیٹھے ہوئے نیچے کی طرف دیکھ رہے ہوں اور نیچے چھوٹا سا میدان بھی ہو تو اُس سے آگے کی طرف نشیبی زمین معلوم ہوتی ہے اس کے بعد بہت بڑا تفاوت نظر آتا ہے سامنے سمندر کے بیچ میں تقریباً ایک کوس کے فاصلہ پر ریت کے خوبصورت اور زرد زرد ٹیلے نظر آتے ہیں۔ اُدھر شاہِ خاور افق کی نقاب سے چہرۂ خنداں کو نکال کر اپنی جھلملاتی ہوئی شعاعوں سے سمندر کو روشن کر رہا ہوتا ہے۔ جوں جوں آفتاب اوپر چڑھتا جاتا ہے سمندر کے زیادہ حصہ میں روشنی پھیلتی جاتی ہے۔ دور کے بادبان کہرے کے پردے میں مستور ہو جاتے ہیں۔ نو بجے کے قریب سمندر کا رنگ بالکل نیلگوں ہو جاتا ہے۔ آسمان نیلگوں معلوم ہونے لگتا ہے اور جہاں تہاں لکہ ہائے ابر روئی کے پہلوں کی مانند پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سامنے کے پتھریلے علاقے کی ترائی، کھیت اور صحرا پتھروں کی کانیں اور سنگِ خارا معلوم ہوتے ہیں۔ جب آفتاب نصف النہار پر ہوتا ہے تو سمندر پھر اپنا رنگ تبدیل کر لیتا ہے اب وہ بالکل گہرا

نیلگوں جامہ زیب تن کئے ہوتے معلوم ہوتا ہے اور سامنے کے جزیرہ میں سایہ دار جنگل، سبز سبز مرغزار اور زرد زرد رنگ کے کھیت نظر آتے ہیں۔ شکستہ چٹانوں کے حصص بھی بخوبی دکھائی دینے لگتے ہیں مچھیروں کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں اور کالے کالے بادبان بالکل نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔

سمندر کی یہ حالت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہتی کچھ دیر بعد پھر یکایک تبدیلی واقع ہوتی ہے اور آسمان پر بادلوں کے دل منڈلانے لگتے ہیں۔ تیز اور تند ہوا چلنے لگتی ہے طوفان نمودار ہونے لگتا ہے درختوں کے پتوں پر گرتے ہوئے پانی کے قطروں کی آواز سنائی دینے لگتی ہے۔ سامنے کا ساحل تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا طوفان سے خوف زدہ ہوکر چھپ گیا ہے۔ اس حالت میں سمندر کا رنگ سیاہ ہوتا ہے اور پانی کھولتا ہوا خوفناک صدائیں کرتا ہے جب خاموش ہوجاتا ہے تو پھر آسمان کی طرح نیلگوں نظر آنے لگتا ہے۔ آفتاب غروب ہونے سے قبل اس پر پھیکا پن چھا جاتا ہے اور مغرب کے وقت پھر ایک نئی سنہری خوبصورتی سے چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس طرح سمندر کی حالت میں دن بھر تبدیلیاں ہوا کرتی ہیں۔ سمندر کی حالت میں رات کے وقت بھی انقلابات ہوا کرتے ہیں۔ اگر کبھی تاریکی کا عالم ہوتا ہے تو کبھی لاتعداد سیاروں اور ستاروں سے آراستہ آسمان کے روبرو صاف اور شفاف شیشہ کی طرح دکھائی دیتا ہے اور کبھی چاندکی چاندنی میں بالکل سفید براق نظر آتا ہے۔

کبھی طوفان کے وقت آسمان پر قوس قزح نظر آتی ہے جس کے مختلف رنگوں کو دیکھ کر حسن ازل کا جلوہ آنکھوں میں سما جاتا ہے ٹامسن لکھتا ہے کہ "لال رنگ سب سے گہرا اور خوشنما ہے بیچ میں زرد رنگ سونے کی طرح معلوم ہوتا ہے نارنجی، ہرا، اور نیلا مختلف رنگوں سے قوسِ قزح خوبصورت معلوم ہوتی ہے"

رنگوں کے متعلق اس سے زیادہ ہم اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اگر رنگوں کی واقفیت نہ ہوتی تو محض سایہ، شکل اور روشنی کی امداد سے جُداجُدا اشیا کی شناخت مشکل ہوجاتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم خود یہ سوال کرتے ہیں کہ خوبصورتی کیا شے ہے؟ تو ہمارے دل میں مختلف رنگ کے چرندوں، پرندوں، پھولوں، تیتلیوں، جواہرات، آسمان اور قوسِ قزح وغیرہ کا تصور بندھ جاتا ہے۔

فطرت نے ہمیں جو حواسِ خمسہ عطا کئے ہیں اس کی یہ ہم پر بڑی مہربانی ہے۔ اگر کان نہ ہوتے اور قوتِ سامعہ نہ ہوتی تو دنیا کی شیریں آوازیں اور دوستوں کے شیریں تکلم ہمارے لئے بے سود تھے۔ آنکھوں کی بناوٹ میں اگر تل برابر بھی فرق ہوتا تو وسعتِ قدرت کا نظارہ، اشیا کی خوشنما اشکال، رنگوں کی چمک دمک، قدرت کے جنگلات کی خوبصورتی کوہ، دریا، تالاب وغیرہ قدرتی مناظر کا مشاہدہ کرنے سے محروم رہ جاتے۔ اگر قوتِ ذائقہ نہ ہوتی تو لذیذ اشیا بے کار تھیں

حسن کے دلدادہ رسکن نے لکھا ہے کہ پہاڑوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں قدرت نے صرف انسانوں کے لئے بنایا ہے تعلیم کے لئے قدرتی درس گاہیں موجود ہیں جو علم کی تشنگی بجھانے کے لئے علم کے سرچشموں سے پُر ہیں۔ تفکر و تدبر کے لئے پُرسکون اور غیر آباد کنج عزلت موجود ہیں۔ خدا کی عبادت کے لئے مقدس عبادت گاہیں ہیں۔ ان سنسان مقامات میں چٹانوں کے دروازے بادلوں کا فرش فلک رفعت چوٹیوں سے پانی کے بہنے کی آواز برف کی چٹانوں سے بنے ہوئے چبوترے کیا ہی دلکش مناظر ہیں۔ بے شمار سیاروں ستاروں سے آراستہ پیراستہ نیلگوں آسمان کا شامیانہ ہے۔ تمام دنیا خوبصورتی سے آراستہ ہے اور یہ قدرت کی ہی بدولت نہایت دلکش اور دلفریب بنی ہوئی ہے۔ جو دیکھنے والے یہاں آگئے اسے دیکھ کر متحیر ہو کر رہ گئے"۔

آسمان کی خوشنمائی دل کو محو کر لیتی ہے جس وقت دل پژمردہ ہو اور بے چینی کا عالم ہو، اس وقت اس کو محظوظ کرنے کے لئے آسمان کی طرف نظر دوڑاؤ۔ اگر دوپہر کا وقت ہے تو آسمان کا نیلگوں رنگ اور چاروں طرف پھیلے ہوئے بادل دلفریب نظر آئیں گے۔ صبح اور شام کے وقت تو ہمیشہ ہی آسمان کا منظر قابلِ دید ہوتا ہے۔ رات کا وقت ہے تو بزمِ فلک کا کہنا ہی کیا ہے۔ سیاروں اور ستاروں سے بھرا ہوا آسمان ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہیروں سے تھال بھرا ہوا ہے۔ ان کے طلوع اور غروب ہونے کے وقت ان کی گردش کی کیفیت وغیرہ دیکھ کر نہایت لطف آتا ہے۔ خدا کی ابدی طاقت اور صناعی کے تصور سے دل میں پرستش کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ جس وقت ہم ستاروں پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ہم کو ایک جگہ ساکن محسوس ہوتے ہیں لیکن اس وقت وہ خوب تیزی سے حرکت کرتے ہیں۔

آسمان کی فضا میں دس کروڑ سے بھی زیادہ سیارے ہیں اور ان کے علاوہ ستارے بھی ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ بہت سے اجرامِ فلکی ایسے بھی ہیں جن کی روشنی اب قطعی زائل ہو چکی ہے کسی وقت وہ آفتاب کے مانند تاباں اور درخشاں تھے لیکن اب بالکل تاریک اور شل ہیں۔ ایک سائنسدان کا خیال ہے کہ ہمارا آفتاب بھی تقریباً ایک کروڑ ستر لاکھ سال کے بعد بالکل ویسا ہی ہو جائے گا۔ دُم دار ستارے بھی آسمان پر موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ دوربین کے بغیر نظر آ سکتے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو ہماری حدِ نگاہ سے باہر ہیں۔

ستاروں کی بے شمار تعداد کو دیکھ کر انسانوں کو تعجب ہوتا ہے پھر بھلا اُن کے وسیع اجسام اور ایک دوسرے سے فاصلہ کا علم ہونے پر نہ معلوم کیا حال ہوتا ہو گا۔ سمندر بہت زیادہ وسیع اور عمیق ہے اور اس کو بحرِ بے کراں کہتے ہیں لیکن اگر آسمان سے سمندر کا مقابلہ کیا جائے تو سمندر اُس کے مقابلہ میں بے حقیقت ہے۔ بہت سے اجرامِ فلکی ایسے ہیں کہ اگر اُن کا مقابلہ زمین سے کیا جائے تو زمین بالکل بے حقیقت معلوم ہو گی اور اگر

اُن کا مقابلہ آفتاب سے کیا جائے تو آفتاب سے وہ بہت چھوٹے نظر آئیں گے۔ کچھ ستارے ایسے ہیں جو ہماری زمین سے کروڑوں میل کی دوری پر ہیں۔ اُن کی روشنی کی چال لاکھوں میل فی سیکنڈ ہونے پر بھی ہماری زمین تک پہنچنے میں برسوں کا عرصہ درکار ہے۔ کچھ ستارے اتنی دور ہیں کہ نظر نہیں آسکتے یہاں تک کہ دوربین سے دیکھنے پر بھی وہ کہرے کی طرح دھندلے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ سائنسدانوں نے بہت کچھ پوشیدہ راز معلوم کئے ہیں لیکن اب بھی اُس کی قدرت کا پار نہیں پایا ہے

جانتا قدرت کو ہے اک کھیل تو
کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا

(ترجمہ از ہندی) اندرجیت شرما

کسی شخص کی قوتِ عمل کا امتحان منظور ہو تو دیکھو کہ وہ بے مہریٔ ایام اور تلخیٔ دوران کا شاکی تو نہیں جنہیں اپنے پر اعتماد ہوتا ہے وہ زمانہ کی بے اعتنائیوں کو خاطر میں بھی نہیں لاتے۔

اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے لئے قناعت ضروری ہے۔ حصولِ قناعت کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اپنی زندگی کو سادہ بناؤ، ضروریات گھٹادو اور خواہشات کم کرو۔

امید پر زندگی گذارنا اچھا ہے لیکن رشتۂ امید کو طول نہ دو کہ اُس کے ٹوٹ جانے پر تم یاس وحرمان کا شکار ہو جاؤ۔

دنیا سے امیدیں کم لگاؤ تاکہ تمہیں مایوسی بھی کم ہو۔

مال و دولت اچھی چیز ہے لیکن اُس کے حاصل کرنے میں خودداری وغیرتِ نفس کو ہاتھ سے نہ دے بیٹھو۔ تمہارے گردوپیش کتنے مالدار لوگ موجود ہیں جن کی دولت و ثروت کے باوجود تم اُن کو اپنے سے کمتر خیال کرتے ہو۔ اگر روپیہ ہی پیدا کرنا ہے تو معزز و محبوب خلائق بن کر پیدا کرو۔

دولت اور علم شاذو نادر ہی اکٹھے ہوتے ہیں۔ خوش نصیب ہے وہ جو مالِ دنیا اور دولتِ علم سے مالا مال ہے

محبت ایک کیفیت ہے جس کا تعلق قلب سے ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کا اظہار بھی کیا جائے بلکہ اپنے انتہائی مدارج میں تو وہ شرمندۂ تکلم ہونا گوارا بھی نہیں کرتی۔ جو شخص بار بار اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے سمجھ لو کہ وہ بوالہوس ہے

عاشق بٹالوی

تجلّیات

وہ لُطفِ ابتدائے تمنّا نہیں رہا
شکوہ تو ہے یہ شکوہ بے جا نہیں رہا

ہر عرضِ شوق پر وہاں اقرارِ سہل ہے
یعنی وہ لُطفِ حسنِ تقاضا نہیں رہا

آئینۂ خیال ہے جلوہ گہِ جمال
اب میں حریفِ شوقِ تماشا نہیں رہا

کیا کر دیا نگاہِ حقیقت شناس نے
وہ رنگِ دلفریبیِ دنیا نہیں رہا

بیزارِ شوق سے ہے دلِ ناکامِ آرزو
وہ اعتبارِ وعدۂ فردا نہیں رہا

مایوسیوں نے سارے زمانے سے کھو دیا
واحسرتا کہ اب کوئی سودا نہیں رہا

اُس رشکِ آفتاب پر اُٹھتی نہیں نگاہ
پردہ بھی ہے اب کوئی پردا نہیں رہا

مشکل میں پڑ گئی نگہِ مشکل آرزو
پردہ بقدرِ شوقِ تماشا نہیں رہا

میں وہ فریب خوردۂ حباب ہوں جسے
دنیا میں اعتبار کسی کا نہیں رہا

جوشِ جنوں میں گھر ہی کو صحرا بنائیے
اکبر بقدرِ شوق جو صحرا نہیں رہا

جلال الدین اکبر

بمبئی کا ایک پھیرا

کشمشی دن کی چھٹیوں میں میرا جانا بمبئی ہوا۔ گھر کے الجھاوؤں سے جان چھڑا نکلی۔ بمبئی کے ثوبانی خاندان والوں سے میرا بہناپا تھا۔ انہی کی جا کے مہمان ہوئی۔ عمر ثوبانی کو میں عمر ماموں جان کہا کرتی تھی۔ ان کے گھر کے ٹھاٹ باٹ صاحبِ ملک رئیسوں سے ٹکر کھاتے تھے۔ گھر کی آرائش میں دو رنگ سب سے زیادہ نمایاں تھے ایک سرخ دوسرا سیاہ۔ دیواروں کے اجارے لال کالے۔ سیڑھیوں کا فرش لال کالا۔ آبنوس کے بڑے بڑے تخت پایوں کی جگہ یار ہاتھی ان کو اٹھائے۔ ان پر سرخ و سیاہ بانات کا وسطی اشیا کا بنا بیش قیمت گبھا بچھا۔ اس پر کٹاؤ کا جو کام وہ ٹھیٹ بخاری وضع کا۔ دیواروں پر دو تین تصویر سمیع الزمان کے ہاتھ کی بنی لٹکیں۔ دو ایک تصویریں بنگالی صناعی کا نمونہ۔ کچھ بدری کے خوش وضع، خوش گھاٹ برتن۔ ایک کمرے میں ایشب کا سامان۔ تبت کے جڑاؤ ڈبے، مرصع رکابیاں۔ ہاتھی دانت کا ایک تخت ایک طرف کو قرینے سے بچھا، سلیقہ سے ہاتھی دانت کے کھلونے اور سجاوٹ کی چیزیں چنیں۔ کھانے کا حجرہ بہت دلکشا۔ اعلیٰ قسم کی ڈولیاں برتنوں کی رکھیں۔ جن پر رومی اور یونانی وضع کا اثر۔ کھانا میز پر کھایا جاتا تھا۔ جتنے دن رہی ہر وقت چینی کے برتن نئی نئی وضع کے آتے رہے۔ جن میں یورپ کی بہترین چینی بھی تھی اور چین کے اصلی برتن بھی۔ شیشے کا سامان چینی کے برتنوں ہی کی جوڑ کا ہوتا تھا۔ اور سب کا سب قدیم وینسی بلور کا۔ کبھی سرخ اور سفید بلور سنہری نقش و نگار۔ کبھی اودا، کبھی سبز۔ کیسے نفیس گھاٹ اور کیا پیاری وضاعیں (وضعیں)، کہ انہیں دیکھنے میں کھانے کو آدمی بھول جائے۔ چمچے، چھریاں، کانٹے سب چاندی کے اور بہت خوبصورت بنے۔ خصوصاً مچھلی کھاتے کے چھری کانٹے تو دیکھنے کے قابل۔ جیسا سامان اُسی کی جوڑ کا کھانا۔ بے مثل آش۔ بوباس بسا، نام کو نہیں۔ کھانے انگریزی مغلائی دونوں طرح کے۔ مغلئی کھانے وہ خوش مزہ اور حلاوت دار کہ مہمان شرم و رم کو طاق پر رکھ کر بھوک سے زیادہ کھا جائے۔ بمبئی میں اس فی اللہ کے کھانے کھا مجھے حیرت ہوئی نہ رہا گیا تو میں نے پوچھا کہ اچھی یہ تو مزا دلی کے کھانوں کا ہے۔ سب ہنسنے لگے اور کہا کہ ایک باورچی دہلی کا ہے اور دوسرا لکھنؤ کا۔ انگریزی کھانے گوآنی کرسٹان پکاتا ہے۔ دلی کے باورچی کا جو میں نے نام سنا تو اُسے بلا کر دیکھا وہ میری سسرال سے واقف تھا اور ان کے بچپن میں وہاں نوکری کر چکا تھا اب بمبئی میں آن رہا تھا۔ اور وہی کارچوبی ٹوپی ٹیڑھی اوڑھے صدری پہنے ریشمین رومال صدری کے مونڈھے میں اڑسے بمبئی والوں کی وضع اختیار کر لی تھی۔ اس گھرانے

کی بیویوں کا لہجہ بمبئی والوں سے بالکل الگ تھا۔ اس میں لکھنؤ کی لٹک تھی۔ اور زبان بہت صاف اور سادہ تھی بیویوں کا لباس بہت وضعداری کا تھا۔ کپڑوں کی جوڑ کا زیور اور زیور کی جوڑ کے کپڑے ہوتے تھے۔ بہت صاف ستھرا گھر۔ ہر چیز صاف شفاف چندن سی۔ عمر ماموں جان نے ایک ایرانی بی بی سے نکاح کر لیا تھا۔ وہ بہت روشن خیال تھیں۔ زیادہ تر مردانے میں اپنے میاں کے دوستوں کی خاطر مدارات میں لگی رہتیں۔ اُن کا لباس کناویز کا ترکی پاجامہ۔ باریک کریب کا کرتا اور کریب کا ہی دوپٹہ تھا۔ ہاتھوں میں مہندی۔ آنکھوں میں سرمہ۔ گالوں پر گلگونہ۔ ہونٹوں پر رنگ۔ ڈھیلی ڈھیلی چوٹی آدھی گندھی آدھی میں ریشمیں فیتا لباس کے رنگ کا تیتری کی وضع میں گرہ دیا۔ باریک آواز۔ انگریزی بہت اچھی بولتیں اور فارسی غزلیں بڑی پیاری طرح گاتیں۔ باہر مردانے میں عمر ماموں جان اور اُنکے چھوٹے بھائی عثمان ماموں جان کے دوستوں کا دربار لگا رہتا۔ اور ہر وقت قہقہوں چہچہوں کی آوازیں آتی رہتیں۔ میں اپنے میزبانوں کے ساتھ ایک دفعہ مالا بار پہاڑی پر جان محمد صاحب کے ہاں گئی۔ ان کے ہاں ایرانی قالینوں کا فرش اور جالیدار پیتل کا قدیم سامان نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے پیتل کے سامان پر چاندی کا ملمع کرا لیا تھا۔ سامان اتنا نازک وضع کا اور اس کثرت سے تھا کہ کمرے میں حرکت کرتے جی ڈرتا تھا کہ معلوم نہیں کس چیز کو ٹھیس لگ جائے اور کچھ نقصان ہو جائے۔

عثمان ماموں جان کے ساتھ میں محمد علی جناح کے ہاں گئی۔ ان کا مکان بھی مالابار پہاڑی پر ہے۔ ان کے بنگلے میں سے سمندر کا خوب نظارہ ہے۔ کرسی بڑی پست ہے۔ ملاقات کے ایوان میں بجائے سیڑھی چڑھ کے، اتر کے جانا پڑتا ہے۔ کمرے کو تاریک کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس میں سیاہ پردے لٹکے تھے۔ میز، کرسیاں، صوفے سب آبنوس کے بنے۔ کچھ تو نے بمبئی کی کاریگری کا نمونہ۔ کچھ برما اور چین کی ساخت کے۔ لیکن تھے سب کالے۔ ان پر گجرات اور کاٹھیاواڑ کی اعلیٰ سوزن کاری کے قدیم کپڑے پڑے۔ جن میں پرانے شیشوں کی ٹکلیاں ٹکی۔ طرح طرح کے ابتدائی فن مصوری کے نمونے سوئی سے کڑھے۔ کالی چُندریاں پرانی وضع کی۔ تانبے پیتل کانسی کا پرانا سامان۔ ایران، ہندوستان، تبت، نیپال، برما، چین کی کاریگریوں کے قدیم نمونے۔ پیتل کے قدیم بت جن پر قدیم تحریریں کندہ۔ غصے، انتقام، حسد کے تبتی دیوتا۔ ڈراونی صورتیں آنکھیں نکالے، منہ پھاڑے پرانے پیتل کے ڈھلے دیواروں میں لگے۔ ان کی پھٹی آنکھوں اور کھلے دہانوں میں سرخ برقی قمقمے لگے۔ یہ سامان کبھی مانجھا نہ جاتا تھا۔ کیونکہ قدیم تانبے پیتل اور کانسی کے سامان جمع کرنے والے ان چیزوں کو مانجھنا ظلم اور فرنگیت کے مساوی سمجھتے ہیں۔ اور جو رنگ ان اشیا کو صدیوں نے عطا کیا ہے۔ اس کو مانجھ کر صدیوں کے کام کو لمحوں میں برباد کرنا نہیں گوارا کرتے۔ تھوڑی دیر

میں ایک کتیا جبڑے چرے کچلیاں باہر نکلیں، پیٹ جھول کے زین کو لگتا، اپنے اردگرد کے سامان سے رنگ میں
جوڑ کھاتی، ہانپتی ہوئی آئی۔ بے حد ڈراونی۔ اسے دیکھ میرے دم پر بن گئی۔ ایوان کا سامان، در و دیوار، چھت،
پردے، کیواڑ، آرائش، غرض ہر چیز ایسی تھی جس کو دیکھ دل بیٹھا جاتا تھا اور اس کا طبیعت پر بڑا پست کن اثر
ہوتا تھا۔ ہم دونوں اور تیسری وہ کتیا اس ایوان میں ایسے ہو گئے جیسے کانسی کے کلّے دیوتاؤں کی وضع کے دیوارگیریوں
کی طرح لگے تھے۔ بالکل خاموش۔ ایک سناٹا۔ ہاں کتیا کے ہانپنے سے اس خاموشی میں اور پریشانی کا ایزاد ہوتا تھا
مجھ پر اس ایوان کی آرائش کا ایسا اثر ہوا کہ معلوم ہوتا تھا دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔ مجھے ایسا نظر آیا کہ وہ
دیوتاؤں کے کلّے منتر پڑھ پڑھ کر مجھ پر پھونک رہے ہیں اور یہ سارا ایوان جادوگھر ہے اور تھوڑی دیر میں میں بھی پس
کانسی، تانبے یا پیتل کی بن جاؤں گی۔ کونے کا کالا پردا ہل کر ہٹا۔ میں اچھل پڑی۔ اس کالے کالے پردے میں سے
کیا دیکھتی ہوں ایک کالی بلّی۔ بصرے یا انگورے کی۔ لال فیتا گلے میں باندھا۔ ٹیڑھی ہوئی۔ دُم اٹھائے پردے سے
پہلو اور دُم کو رگڑاتی۔ مہین آواز میں میاؤں کہہ سنہری دیدے میری طرف کر ٹھٹھیا کے کھڑی ہو گئی۔ اس کی طرف سے
جو ہوا آئی تو سارا ایوان فرنگی سگندھ کی خوشبو سے مہک گیا۔ معلوم ہوا کہ بنفشے کے تازے پھولوں کے کسی نے ڈھیر
لگا دیئے ہیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ بڑی بوڑھیوں کے عقیدے بموجب اس بلی میں تو ضرور دال بسر ہوگا۔ اسی پردے میں
سے ایک مرقع نظر آیا۔ بہزاد کی سج رضا عباسی کی دھج اور آقا میرک کا چہرہ مہرہ میرے سامنے تھا جس میں جان پڑی
حرکت پیدا ہوئی اور پوربی راگنی کے سروں میں ایک دلکش روح پرور ندا کانوں میں آئی۔ عثمان ماموں جان جلدی سے
سنبھل کھڑے ہوئے۔ سلام کر آگے بڑھے۔ اور اس زندہ تصویر کو ساتھ لے میری طرف آئے اور مسکرا کر
کہا یہی رتی بیگم محمد علی جناح ہیں۔ پھر میرا نام بتایا وہ بہت تپاک سے میرے قریب آئیں۔ محبت سے ملیں چندیری
کی شنگرفی پاتل بندھی۔ کوئی ڈیڑھ گز کا بھاری آنچل۔ کلابتو پر ریشم کے گلدستے سرو کے درخت گل بوٹے بنے۔
کندھے پر سے ڈھلکتا ہوا۔ گورا گورا شانہ اور سڈول سڈول بازو نظر آتے۔ میں نے ساڑھی کا رنگ کام اور صناعی
بہت پسند کی اور اُن کے انتخاب کی داد دی۔ بجیا کے بہت خوش ہوئیں اور کہا آپ نے پسند کی تو قیمت اور چھانٹنے
کی محنت دونوں وصول ہو گئے۔ اور آنچل اٹھا مجھے دے اس کے کام کی باریکی بتانے لگیں۔ اور کہا اگر آپ کو یہیں
پسند ہیں تو میں ایک چندیری کی پاتل آپ کو دکھاتی ہوں۔ جو مجھے گوالیر کی بڑی مہارانی صاحبہ نے دی ہے۔ رتی کا رنگ
روغن وضع قطع ایوان کی آرائش اور سامان کے بالکل متضاد تھا۔ ان کے آنے نے اس ایوان کی ہر چیز میں ایک روح
پھونک دی۔ اور وہ اس ایوان میں ایک پری تھیں جس نے میرے ہوش و حواس کو مسحور کر دیا تھا کہ اب میں اس

کمرے کی دیگر خصوصیات اور کیفیات پر غور نہ کر سکتی تھی۔ حمام کر کے سیدھی میرے پاس آئی تھیں۔ گیلے بال پیچھے ہوئے پیچھے پڑے پورے پچھائے کو ڈھانکے ہوئے۔ برف سا ٹھنڈا ٹھنڈا اپنڈا مجھے پاس سے محسوس ہوتا تھا۔ میرا ہاتھ پکڑ اپنی خواب گاہ میں لے گئیں۔ اور الماری کھول کر مجھے اپنی ساریاں اور کپڑے دکھانے شروع کئے حقیقت میں ہر ایک کپڑے سے اعلیٰ درجے کی خوش مذاقی عیاں تھی۔ ان کے رنگوں اور وضاعوں کے انتخاب پر میں اش اش کرتی تھی اور وہ سب مجھے قدر دان اور صنعت پسند سمجھ کر زیادہ دلچسپی سے لے کر دکھاتی تھیں۔ باتیں کرتی جاتی تھیں اور لوپدینے کے قرص، لیموبوندیاں اور دوسری انگریزی مٹھائیاں برابر کھائے جاتی تھیں۔ اور مجھ سے کھانے کا اصرار تھا۔ یہاں سے ہمیں لے کر وہ اپنے کتب خانے میں آئیں۔ بڑی بڑی الماریوں میں قانون کی کتابیں بھری تھیں۔ الماریوں کے رنگ کے کتابوں کے پشتے تھے۔ اور اس کی جوڑ کی میز کرسیاں۔ بڑی بڑی آرام کرسیاں جن پر بھینسیا رنگ کے چمڑے چڑھے بہت نرم اور آرام دہ تھیں۔ یہاں بیٹھ کر انھوں نے اپنی ایک بھتیلی کے نام میرے لئے تعارف نامہ لکھا۔ قلم ہاتھ میں لے آنکھیں اوپر کو اٹھائیں اور بھولپن کے انداز میں کچھ سونچا کیں۔ تھوڑی دیر میں چہرے پر ایک الہامی کیفیت ہویدا ہوئی اور وہ فوراً لکھنے میں مشغول ہوگئیں۔ اتنے میں ایک صاحب چھریرا ڈیل، کشیدہ قامت، صاف تراش، تیز تیز نقشہ، انگریزی لباس، دروازے پر آ اذن خواہ ہوا۔ رتی لکھنے میں معروف رہیں۔ عثمان ماموں جان نے اندر بلایا اور میرا تعارف کرایا۔ معلوم ہوا یہی محمد علی جناح ہیں۔ انھوں نے مسکرا کر مجھ سے رسمی طور پر خیریت مزاج پوچھی اور چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں رتی نے خط ختم کیا۔ شربت منگایا ہمیں پلایا اور سمندر کے رخ ہم کو لے جا کر بیٹھیں۔ اور بڑے دلنواز طریقے پر باتیں کرتی رہیں۔ گفتگو ہماری انگریزی میں رہی۔ ان کی انگریزی بے مثل تھی غضب کا لب و لہجہ اور بلا کی روانی تھی۔ میں ایسی باتوں میں گتھی کی کہ اپنے اصلی میزبانوں کو بھول گئی۔ آخر عثمان ماموں جان نے چلنے کی فرمائش کی اور ہم دوبارہ ملنے کا ایک دوسرے سے وعدہ لے رخصت ہوئے۔

سیدہ بدرالنسا بیگم

نوائے سروش

پردۂ چشم میں جب تک تُو تھا ۔ دل کا ہر گوشہ مقامِ ہُو تھا

ہو گیا داغِ چمن بالآخر ۔ گُلِ خوشرنگ بھی آتش خُو تھا

تیری صُورت تھی جدھر مُنہ پھیرا ۔ جس طرف آنکھ اُٹھائی تُو تھا

کیا کہیں داغِ محبت اپنا ۔ کس قدر قابلِ شست و شُو تھا

موجِ طوفانِ فنا کیا جانے ۔ تشنہ لب کون کنارِ جُو تھا!

دم الجھتا ہے اب اس کی تدبیر؟ ۔ دل پھنسانے کے لئے گیسُو تھا

جلوۂ حسن ترا کیا کہئے! ۔ کہیں اعجاز کہیں جادُو تھا

ہم ہی برگشتۂ ایماں تھے تپش

جو بُت تھا وہ قبلہ رُو تھا

عبداللطیف تپش

ستارہ

نادر شاہ کی داستانِ عشق

(۱)

نادر شاہ اپنے خیمہ میں لیٹا اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔ان دنوں مغلوں کی عظیم الشان سلطنت اُس کے قدموں میں بے دست و پا پڑی سسک رہی تھی۔ فتح و نصرت اُس کی ہمرکاب تھی۔ وہ اس خیال میں محو تھا کہ بہت جلد وہ سکندرِ اعظم کے مرتبہ پر پہنچ جائے گا۔ وہ ایک نئی دنیا کی فتح کے دل خوش کن خواب دیکھ رہا تھا۔

وہ پیدائشی ترک تھا اور اپنی خداداد قابلیت اور سپاہیانہ جرأت کی وجہ سے اس مرتبہ پر پہنچا تھا کہ دنیا اُس کے نام سے تھراتی تھی۔اُس کی مثال بالکل ایک بگولے کی سی تھی، جو پوری شان و شوکت سے اُٹھا، آندھی کی طرح چھا گیا اور پھر ایسا مٹا کہ اُس کا نشان ملنا محال ہے۔نپولین اعظم کی زندگی بھی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

جس وقت وہ تخت پر متمکن ہوا ایران عجیب کشمکش کی حالت میں مبتلا تھا۔ترک، افغان اور روسی دشمن سلطنت کو زیر و زبر کرنے پر تلے بیٹھے تھے۔ہر طرف فتنہ و فساد، سازش اور بغاوت کی آگ بھڑک رہی تھی لیکن اس بے آئینی کی حالت میں اس نئے حکمران نے اپنی خداداد قابلیت اور قوتِ تدبیر سے بہت جلد ملک میں امن قائم کر لیا اور بہت جلد اپنے جاں نثاروں کی مدد سے برِ اعظم ایشیا کے لئے ایک ہیبت بن گیا۔

ان دنوں اُس نے ہندوستان پر حملہ کر کے مغل شہنشاہ محمد شاہ رنگیلے کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔اُس کا حریف اُس کے لشکر میں صلح کی گفت و شنید کے لئے آیا تھا اور ذلت سے واپس کر دیا گیا تھا ـــــ وہ حریف جس نے ایک مرتبہ نادر شاہ کے متعلق توہین آمیز کلمات کہنے کی جرأت کی تھی!

وہ سوچ رہا تھا کہ کامیابی واقعی عجیب چیز ہے لیکن انتقام! انتقام اس بھی زیادہ پُرلطف ہے! اس خیال سے ایک لمحہ کے لئے اس جنگجو انسان کے لبوں پر ایک ملائم تبسم کھیلنے لگا۔

اُس نے علی اکبر اور احمد خاں قندھاری اپنے دو دانا وزیروں کو طلب کیا اور آئندہ طرزِ عمل پر بحث کرنے لگا۔ اُس کی دلی خواہش تھی کہ محمد شاہ کے صوبجات پر قبضہ کر کے اُسے اور اذیت پہنچائی جائے اور اُسے اچھی طرح ذلیل

کیا جائے۔ اُس کا ارادہ تھا کہ لشکر کے تازہ دم ہوتے ہی دارالسلطنت دہلی پر حملہ کردے اور کچھ عرصے کے لئے ایک فاتح کی حیثیت سے شہر پر قابض رہے اور پھر سلطنت محمد شاہ ہی کو دے کر خود واپس چلا جائے +

لیکن اس کا ایک مقصد اور بھی تھا، دہلی میں بے شمار دولت تھی! مسلسل جنگلوں میں اُسے بے شمار اخراجات برداشت کرنے پڑے تھے، اور اُس کی اپنی رعایا محصولات کے بوجھ سے چلا رہی تھی۔ اور اب وہ اسے زیادہ تنگ کرنا نہیں چاہتا تھا اُس نے خیال کیا کہ آخر اس بوجھ کو شکست خوردہ حریف کے کندھوں پر کیوں نہ ڈال دیا جائے۔ علاوہ ازیں وہ دہلی کی دولت سے اپنے آئندہ ارادوں کے لئے راستہ ہموار کرنا چاہتا تھا +

نادر ایک مرتبہ پھر مسکرایا۔

معاً وہ رک گیا، خیمہ کے باہر سے کچھ آوازیں آرہی تھیں، ایک لمحہ بعد خیمہ کا پردہ اُٹھا اور ایک خادم خاموشی کے ساتھ اندر داخل ہوا، نادر نے پوچھا: "کیا ہے؟" +

خادم جھک کر آداب بجالایا اور کہنے لگا "مغل شہنشاہ نے موعودہ تحائف بھیجے ہیں، ایک ہاتھی، چند گھوڑے، پچاس غلام اور بہت سی حسین ہندی عورتیں" +

نادر اُٹھ کر بیٹھ گیا، یہ تحائف بے وقت پہنچے تھے۔ وہ شام سے اُن کا انتظار کر رہا تھا۔ اس وقت تاریکی پھیل چکی تھی، اور وہ تھکا ہوا بھی تھا، اس لئے اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ ہاتھی گھوڑوں کے معائنہ کو صبح پر اُٹھا رکھے +

لیکن عورتیں! وہ انہیں دیکھنے کا بے حد مشتاق تھا۔ اُس نے ہندی حسن کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔ احمد خاں نے اُسے بتایا تھا کہ وہ سرو کی مانند نازک، ہرن کی مانند چالاک و چوبند ہوتی ہیں اور اُن کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمکتی ہیں اور آہوانِ مست کی آنکھوں کو شرماتی ہیں! احمد خاں قندھار کا باشندہ تھا جو ہندوستان کے بالکل قریب ہے، اس لئے یقیناً وہ ہندی عورتوں کے متعلق بہت کچھ جانتا تھا۔

نادر نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا اور اپنے خیمہ سے نکل کر اس خیمہ کی طرف چلا جس میں وہ فروکش تھیں۔ اُس نے داخل ہوتے ہی بیک نظر معلوم کر لیا کہ واقعی اُن کے حسن کے متعلق مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا۔ ان میں ایک سے ایک زیادہ حسین تھی، مگر نادر کی نگاہیں صرف اُس لڑکی کے چہرے پر ٹھہریں جو قطار کے وسط میں کھڑی تھی ـــــ بلند قامت اور نازک بدن، اُس کے رخسارے انگارے کی مانند سرخ ہو رہے تھے۔ اُس نے نہایت بے اعتنائی سے نادر شاہ کی طرف دیکھا اور نگاہیں نیچی کر لیں +

نادر شاہ نے پوچھا: "یہ لڑکی کون ہے ؟"

ایک خواجہ سرا نے ادب سے جواب دیا: "جہاں پناہ یہ ایک راجپوت دوشیزہ ہے" +

لڑکی ایک نفرت آمیز طریق سے ہنسی اور نہایت بےباکانہ انداز میں کہنے لگی "دوشیزہ! جھوٹ بکتے ہو! میں شادی شدہ ہوں!"

خواجہ سرا، لڑکی کی گستاخی سے غضبناک ہوکر، چابک لے کر، اُن لبوں پر جن سے یہ گستاخ الفاظ نکلے تھے مارنے کے لئے آگے بڑھا لیکن یکایک پیچھے ہٹ گیا، کیونکہ ستارہ نے ـــــ یہی اُس حور وش کا نام تھا ـــــ کمر سے ایک خنجر نکال لیا تھا، اور اُسے مارنے کے لئے تیار ہوگئی تھی۔ اُس کے اس انداز سے شجاعت اور غیرت نمایاں تھی۔

نادر ہنسا۔ وہ ستارہ کی اس جرأت پر ازحد خوش تھا۔ وہ اسے مخاطب کرکے بولا "یہ خنجر مجھے دے دو!" +

لیکن ستارہ بالکل بےحس و حرکت کھڑی رہی! ـــــ

اُس نے پھر کہا: "یہ خنجر مجھے دے دو!" +

اس مرتبہ اُس کی آواز میں درشتی تھی +

ستارہ نے کچھ تامل کے بعد خنجر اُس کے حوالے کردیا۔ نادر نے اُسے اپنی کمر میں رکھ لیا اور ایک لفظ کہے بغیر عورتوں کی قطار کے آگے سے گزر کر باہر چلا گیا۔

(۲)

خیمہ میں واپس آکر نادر دیر تک گوناگوں خیالات میں غرق رہا۔ ستارہ کی ادا اُسے کچھ ایسی بھاگئی تھی کہ وہ اسے دل سے محو نہ کرسکتا تھا، اور جب وہ بیٹھا اُس کے خنجر سے کھیل رہا تھا ایک خفیف سا تبسم اُس کے لبوں پر نمودار ہوگیا۔ ستارہ واقعی حسین تھی! +

اُس نے بڑی بڑی حسین عورتیں دیکھی تھیں، اور اُن سے محبت کی تھی، لیکن ستارہ جیسی حسین عورت اُس نے آج تک نہ دیکھی تھی۔ اُس میں دس مردوں جتنی طاقت تھی اور اُس کا حسن! اُس نے زندگی بھر ایسا حسن نہ دیکھا تھا، معاً اُس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوگئی جو محبت سے لبریز تھی، اُس نے ارادہ کیا کہ ایک مرتبہ پھر اُسے دیکھنا چاہیئے اور اس دفعہ تنہائی میں دیکھنا چاہیئے۔ وہ کھڑا ہوگیا اور ایک خادم سے کہنے لگا:

"آغا باشی کو فوراً یہاں بھیج دو"

خادم یہ الفاظ سنتے ہی حکم بجالانے کے لئے دوڑا۔

ایک لمحہ بعد آغا باشی خیمہ میں داخل ہوا، وہ ایک بلند قامت مگر متین چہرے والا حبشی تھا، نادر نے اُسے اپنی خواہش سے آگاہ کیا، وہ کچھ ملول سا ہوگیا۔ وہ ایک وفادار خادم تھا اور ستارہ کی جرأت کو بخوبی جانتا تھا۔ اُس نے سوچا کیا وہ ستارا سے تنہا ملے گا؟ اُس نے اس کے خلاف کہنا چاہا لیکن نادر نے اُسے فوراً ٹوک دیا اور کہنے لگا "اس لڑکی کو فوراً میرے پاس بھیج دو، میں اُسے دیکھنا چاہتا ہوں، ابھی اِسی وقت ـــــــ"۔

خواجہ سرا جھک کر اور "جو حضور کی مرضی" کہہ کر خیمہ سے باہر چلا گیا۔

نادر اُسے جاتے بغور دیکھتا رہا اور پھر خیمہ میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ رات کی پُرخوف خاموشی اُسے ستا رہی تھی اور ستارہ کا خیال بار بار آ رہا تھا۔ وہ اپنی نشست پر جا بیٹھا اور انتظار کرنے لگا۔

یکا یک پردہ ایک طرف ہٹا اور غلام لڑکی اندر داخل ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی۔ مارے شرم کے اس کا سر جھکا ہوا تھا، لیکن اُس کی چال میں ایک عجیب شان تھی۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا، اور ہونٹ خوف سے کانپ رہے تھے۔ نادر ایک بت کی طرح اُس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ وہ پہلے سے ہزار گنا زیادہ حسین معلوم ہو رہی تھی۔ نادر کی آنکھیں اُس کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں اور شمع کی مدہم روشنی میں اُس کا سادہ لباس اُس کے حسن کو دوبالا کر رہا تھا۔ وہ خیمہ کے وسط میں ٹھہر گئی، اور چپ چاپ کھڑی رہی۔ نادر نے کہا: "ذرا قریب آجاؤ، میری طرف دیکھو، تم خوفزدہ کیوں ہو؟"۔

ستارہ نے اُس کی طرف پُرخوف نگاہوں سے دیکھا۔ وہ واقعی خوفزدہ تھی، کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ وہ موت کے منہ میں جا رہی ہے، جس کی اُسے تمنا نہ تھی۔ گو ایک گھنٹہ پیشتر اُسے زندگی کی ذرہ بھر پرواہ نہ تھی لیکن اب! اب جب کہ اُس نے زندہ رہنے کا سبب معلوم کر لیا تھا، وہ زندہ رہنے کی متمنی تھی آج تک اُس کا شمار صرف محل کی کٹھ پتلیوں اور خوشامدی کنیزوں میں رہا تھا، لیکن اِس وقت وہ ایک مرد کے سامنے کھڑی تھی۔ ایسا مرد جس کے وہ اکثر خواب دیکھا کرتی تھی۔ جو طاقتور، شجاع اور باجبروت تھا۔ اُس کی دلی خواہش تھی کہ اپنے تئیں اُس کے قدموں پر گرا دے اور تا زیست خدمت گزاری کی قسم کھائے۔ وہ محبت کے بدلے محبت کی طالب تھی۔ وہ اپنے تئیں اس کا اہل تصور نہ کرتی تھی، لیکن اُس کی خدمت! اُس کے لئے یہی کافی تھا کہ عمر بھر اُس کی خدمت کرتی رہے اور اگر ضرورت آن پڑے تو اس پر اپنی جان بھی نثار کر دے!

نادر نے بھی تاڑ لیا کہ ستارہ کے دل میں اس قسم کے خیالات موجزن ہیں۔ عورتوں نے آج تک صرف دولت

وثروت کے لئے اُس سے محبت کی تھی، مگر یہ عورت جو خود بہادر تھی، ایسی تھی، جو محض اُس کی بہادری کے لئے اُس سے محبت کرتی تھی اور وقت پر جان تک دینے کو آمادہ تھی!!

نادر کو بخوبی معلوم تھا کہ ایسی بات کہنے کے لئے اُسے کافی جرات سے کام لینا پڑے گا، اس لئے اُس نے نہایت شریفانہ لہجہ میں اُسے تسلی دی اور یقین دلایا کہ اُس کا قصور معاف کر دیا گیا ہے۔ پھر اُس نے اُس کی زندگی کے حالات دریافت کئے۔

معلوم ہوتا تھا کہ ستارہ کے دل میں مغلوں کی محبت نہ تھی۔ اُس نے بتایا کہ وہ ایک راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئی اور ابھی بچہ ہی تھی کہ گرفتار ہوگئی اور ایک مغل سپاہی کے ساتھ بیاہ دی گئی، لیکن وہاں سے وہ بھاگ نکلی اور کئی حادثات کے بعد چند مارواڑی تاجروں کے گروہ میں اُس نے پناہ لی۔ وہ اسے دہلی لے آئے، وہاں شہنشاہ کی ایک حرم اُس پر مہربان ہوگئی اور آج تک وہ اسی کی خدمت میں رہی۔

نادر کچھ دیر خاموش رہا، پھر بولا اور اُس کی آواز جوشِ محبت سے کانپ رہی تھی، وہ کہنے لگا: "کیا تو میری ملکہ بنے گی؟ ایسی ملکہ جس کے سامنے ساری دنیا کے سر خم ہونگے!"

ایک کپکپی بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اُس کے جسم میں دوڑنے لگی۔ اُسے یقین نہ آتا تھا کہ اُس کے کانوں نے واقعی یہ الفاظ سنے ہیں، وہ وہاں ایک مجرم کی حیثیت سے آئی تھی، مگر ایک فاتح شہنشاہ کو ملتجی دیکھ رہی تھی، جو اُسے عزت طاقت اور دولت پیش کر رہا تھا۔ اُس نے اپنے تئیں نادر کے قدموں پر گرا دیا اور فرطِ محبت سے اُس کے پاؤں چوم لئے۔ یہی اُس کا جواب تھا!

نادر نے اُسے اٹھایا اور کہا: "اب تم میری ملکہ ہو، لونڈی نہیں ہو۔ تمام دوسری عورتیں تمہارے پاؤں چومیں گی۔ تم اپنے تئیں اس قدر ذلیل نہ سمجھو!"

اُس نے آغا باشی کو حکم دیا کہ قاضی کو بلائے اور چند لمحہ بعد ستارہ جو ایک حقیر کنیز کی حیثیت سے آئی تھی اُس زمانہ کے عظیم الشان سپاہی کی باعزت ملکہ بن گئی! —— اُس وقت اُس کا لباس جواہرات سے چمک رہا تھا۔

سارے لشکر میں یہ خبر بجلی کی طرح پھیل گئی، لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگے، لیکن ستارہ کو ان باتوں کی ذرہ بھر پروا نہ تھی، وہ از حد مسرور تھی۔ نادر کی محبت اُس کے روئیں روئیں میں سرایت کر گئی تھی۔ اس کے سوا اُسے اور کوئی خیال نہ تھا اور نہ دوسرے خیالات کے لئے اُس کے دماغ میں جگہ تھی۔

بعض دفعہ وہ اپنے تئیں اجنبی اور تنہا محسوس کرتی، جس کے لئے وہ مجبور تھی مگر وہ اس تنہائی میں بھی خوش تھی

اُسے اُن لمبے گرم دنوں سے از حد محبت تھی جن میں وہ اپنے خیمہ میں تنہا بیٹھی شام کا انتظار کیا کرتی تھی، نادر شام کو اُس کے پاس آتا تھا، ایک بادشاہ کی طرح نہیں بلکہ ایک شوہر کی طرح! اور پھر ساری رات وہ وہیں رہتا تھا +

اور واقعی نادر ہر شام کو اُس کے پاس ہوتا تھا!

آہستہ آہستہ اُس نے لشکر کی دوسری عورتوں سے راہ و رسم پیدا کی کیونکہ اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ اس طریقہ سے اُس نے کئی بدگمان رقیبوں کو رام کر لیا، لیکن اُن میں ایک رقیب ایسی بھی تھی، جو ستارہ کی تمام خوبیوں کے باوجود اس کی دشمن تھی۔ اس بد باطن اور کینہ پرور عورت کا نام شیرازی تھا۔ وہ نادر شاہ کی چہیتی تھی جسے ستارہ کے آنے پر رد کر دیا گیا تھا +

رقابت کی آگ کے تیز و تند شعلوں نے شیرازی کے دل کو بھڑکا دیا۔ اُس نے اپنے دل سے قسم کھائی کہ جب تک وہ ستارہ سے شدید ترین انتقام نہ لے گی چین سے نہ بیٹھے گی۔ بھولی بھالی ستارہ کو ان بد ارادوں کا علم نہ تھا۔ شیرازی اپنی مکاری سے اُسے یہ معلوم کرنے کا موقع ہی نہ دیتی تھی۔ اُس نے ستارہ سے خوب گہری دوستی پیدا کر لی تھی اور اپنی مکر آمیز چکنی چپڑی باتوں سے اُس کی رازدار بن گئی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ آخر یہی رازداری کام آئے گی۔ وہ ہر وقت ستارہ کی حرکات پر نگاہ رکھتی اور مناسب موقع کی تاک میں رہتی +

شیرازی کوئی معمولی عورت نہ تھی۔ وہ علی اکبر کی بہن تھی، لیکن بیچاری ستارہ کو کیا معلوم کہ اس رازداری کے پردے میں کیسے کیسے مصائب و آلام اُس کے لئے اکٹھے کئے جا رہے ہیں۔ اور اگر اُسے معلوم بھی ہو جاتا تو کیا وہ اُس کی پروا کرتی؟ کبھی نہ کرتی! وہ ایک ایسی عورت تھی، جو "پچھلا کل دفنا چکے اور اگلا کل کل ہو" کے مقولہ پر عمل پیرا تھی۔ اُسے ایک ایسا محبوب مل گیا تھا، جسے اس سے پہلے کوئی عورت اس طرح حاصل نہ کر سکی تھی +

نادر کے مصاحب اُس کی اس محبت پر سخت حیران تھے جو وہ ستارہ کے لئے ظاہر کرتا تھا۔ وہ انتہائے حیرت میں ایک دوسرے سے چہ میگوئیاں کرتے تھے کہ دیکھیں اس انوکھی محبت کا کیا انجام ہوتا ہے؟

(۳)

نادر شاہ کا جرار لشکر اسی طرح پڑاؤ ڈالے پڑا تھا، دن یکے بعد دیگرے تیزی سے گزر رہے تھے، نادر کو اندیشہ تھا کہ اگر اُس کی افواج اسی طرح کچھ اور عرصہ بے کار پڑی رہیں تو اُن کا جوش سرد پڑ جائے گا۔ اُس نے دہلی کی طرف کوچ کا حکم دے دیا۔ یہ سنتے ہی لشکر میں تیاریاں شروع ہو گئیں۔ شام تک نادر شاہ بھی انہیں تیاریوں میں مصروف رہا اور پھر حسب معمول ستارہ کے خیمہ میں گیا۔ وہ از حد تھکا ہوا تھا، اور اُس آدمی کی مانند معلوم ہوتا تھا جو کسی خواب سے بیدار ہوا ہو۔ اُس

خیال سے کہ اب وہ پہلے کی طرح اُس کی پُرلطف محبت سے بہرہ ور نہ ہو سکے گا، نادر شاہ نے ستارہ کی طرف دیکھا۔ اُس کی نگاہوں میں حسرت تھی، کیونکہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ اب اُس کے سامنے زیادہ اہم معاملات پیش ہونے والے ہیں! ـــــ سلطنت اور جنگ کے معاملات! ـــــ وہ افسوس کر رہا تھا کہ وہ ایک ہفتہ اور کیوں نہ ٹھیر گیا۔ عورت کی محبت! آہ ایک عورت کی محبت کس قدر زبردست اور قابلِ قدر چیز ہے! اُس کی خداداد طاقت سے بھی زبردست!

ستارہ بھی یہ بات اُس کے بشرے سے تاڑ گئی۔ اُس نے بادشاہ کا غم دور کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ وہ یہ معلوم کرنے کی از حد مشتاق تھی کہ اُس کے غم کی وجہ کیا ہے۔ نادر نے اپنی پگڑی سے ایک بیش بہا اور نایاب ہیرا اتارا اور ستارہ کو دے کر کہا "میں یہ تمہیں بطور تحفہ دیتا ہوں۔ اگر تم میرے پاس آنا چاہو تو یہ ہیرا بھیج دینا۔ میں خواہ کسی حالت میں ہوں تمہیں ضرور بلا لوں گا"۔

اب ستارہ کو اُس کے غم کا حال معلوم ہوا۔ اُس نے وہ ہیرا لے لیا۔ اُس وقت اُس کے دل میں وہم تک بھی نہ تھا کہ اُسے واقعی کبھی اس کی ضرورت پیش آئے گی۔

یہ واقعہ ستارہ کو صرف ایک گزرتا ہوا بادل دکھائی دیا، جس نے ایک لمحہ کے لئے اُس کی مسرت کو ڈھانپ لیا۔

دوسرے دن دہلی کی طرف کوچ شروع ہوگیا۔ ستارہ کے لئے یہ سفر نئے اور حیرت انگیز تجربات سے بھرا ہوا تھا، اور اُس نے اس کے ہر لمحہ سے لطف اٹھایا کیونکہ وہ اپنے محبوب کے پہلو بہ پہلو سوار تھی، اور اسی طرح فتح و نصرت کے ہم رکاب وہ دہلی میں داخل ہوئی۔

یہ لمحہ اُس کی زندگی میں بیک وقت افسوسناک اور دل خوش کن تھا۔ وہ دہلی سے ایک قیدی کنیز کی حیثیت سے نکلی تھی اور اب ایک فاتح مالکہ کی حیثیت سے شاہی محل میں فروکش تھی۔ اُس کے گردوپیش عیش و عشرت کا سب سامان موجود تھا جو ایک فاتح کی منظورِ نظر رفیقۂ حیات کے شایانِ شان ہو سکتا تھا۔

دوسرے روز مغل ملکہ ـــــ جس کے محل میں ستارہ کبھی ایک ادنیٰ کنیز تھی ـــــ اُس کی ملاقات کو حاضر ہوئی اور دست بستہ التجا کرنے لگی کہ اپنے اقتدار سے شہر کو تباہی و بربادی سے بچا لے۔ ستارہ نے خندہ پیشانی سے اس بات کا وعدہ کر لیا۔ اُس نے خیال کیا کہ جب زمانہ نے اُس کے ساتھ مہربانی کا سلوک کیا ہے تو اُسے بھی لوگوں پر مہربانی کرنی چاہیئے جب نادر رات کو اُس کے پاس آیا تو ستارہ نے اپنے وعدہ کا ذکر کیا۔ نادر نے ہنستے ہوئے قبول کر لیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ پہلے ہی افواج میں احکام صادر کر چکا ہے کہ ظلم و تعدی اور لوٹ مار سے پرہیز کیا جائے اور لشکر کو بھی ان احکام کی تعمیل میں عذر نہیں کیونکہ اُسے شہر والوں سے کسی قسم کا خوف نہیں، شکست نے اُن کی ہمت بالکل توڑ دی ہے۔

لیکن نادر کا یہ خیال بالکل غلط نکلا، چند روز بعد جب ستارہ کمرے میں نادر کی منتظر بیٹھی تھی، اُسے چیخ پکار اور شور وغل سنائی دیا۔ وہ یک دم اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے سوچا شاید نادر اپنا وعدہ بھول گیا ہے! پھر اُس نے خیال کیا کہ کیا یہ ممکن ہے؟ نہیں ہرگز نہیں! نادر اپنا وعدہ کبھی نہیں بھول سکتا، لیکن پھر بھی اُس کی تشویش نہ مٹتی تھی۔ اُس نے آغا باشی کو بلا کر دریافت کیا، جس نے بتایا کہ شہریوں نے بلوہ کر دیا ہے اور اُنہیں اپنے کئے کی سزا مل رہی ہے +

سزا مل رہی ہے! ستارہ ان الفاظ کا مطلب بخوبی سمجھتی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ نادر کی سزا کیا معنی رکھتی ہے۔ اُس نے نادر کو کہلا بھیجا کہ خدا کے لئے اپنا ہاتھ روک لے اور بدقسمت دہلی کو تباہی سے بچالے، لیکن دیر تک اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ آخر بڑی مایوسی کے بعد اُس نے وہ ہیرا بھیجا +

لیکن اس پر بھی یہ ہولناک خونریزی بند نہ ہوئی۔ نادر کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ اُس نے خیال کیا وہ مجھ سے ناراض ہے؟ کیا اُس نے میری منت اور سماجت کو رد کر دیا ہے؟ کیا میں نے ایک ایسے معاملہ میں دخل دیا ہے جس میں مجھے کچھ کہنے کا کوئی حق حاصل نہ تھا؟

غریب ستارہ! وہ از حد مغموم اور ناامید تھی۔ اُس نے آج ہی ایک درخواست کی تھی اور وہ مسترد ہو گئی تھی!

لیکن اُسے صحیح حالات کا علم نہ تھا۔ وہ بالکل نہ جانتی تھی کہ تمام دن اُس کی یہ التجا نادر کے پیش نظر تھی۔ فوج کے سردار اُس کے صبر و تحمل پر جو وہ شہریوں کو سزا دینے میں کام میں لا رہا تھا، حیران ہو رہے تھے، کہ نادر اور یہ تحمل! ستارہ کو یہ حقیقت اُس وقت تک معلوم نہ ہوئی جب تک نادر نے رات کو اُسے خود نہ بتایا +

آخر جب ایرانی عسکر دہلی کی بیش بہا دولت سے مالا مال ہو کر شمال کی جانب لوٹا تو ستارہ نے محسوس کیا کہ یہ ایک نئی زندگی کی ابتدا ہے، ایک ایسی زندگی کی ابتدا جس میں ماضی کا ہر لمحہ اور اُس کی یاد ایک خوش آئند مستقبل میں کھوئی جا رہی تھی۔

اُس کے سامنے ایک ایسی شاہراہ تھی جو ایک اجنبی ملک کو جاتی تھی جو اُس کے لئے نئی نئی دلچسپیوں اور امیدوں کی دنیا تھی، اور جہاں شاید شدید خطرات بھی تھے، لیکن ستارہ کسی خطرہ سے ڈرنے والی نہ تھی! وہ بخوبی جانتی تھی کہ اب ایسے اُن لوگوں سے سابقہ پڑے گا جو اُسے از حد نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن اُسے یہ بھی خیال تھا کہ نادر کی معیت میں، جو اس کے پہلو بہ پہلو ایک سچے سپاہی کی شان سے سوار تھا، اُسے کسی قسم کا خوف نہیں۔ اُس کی پگڑی میں وہ عظیم الشان ہیرا "کوہِ نور" چمک رہا تھا جو اس وقت برطانیۂ عظمےٰ کے تاج کی زیب و زینت ہے!

سفر کی کٹھن منزلوں کے بعد لشکر دریائے سندھ کے کنارے پر پہنچ گیا اور نادر نے آرام کرنے کا حکم دیا۔ اُس کا ارادہ

تھا کہ درۂ خیبر کو یوسف زئی قبائل کے علاقہ میں سے ہو کر عبور کرے۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر وہ شمال کی جانب بڑھا سارا دن اُس نے قبائل کے سرداروں سے گفت وشنید میں گزارا اور شام کو تھکان سے چور چور ہو کر واپس آیا اور جلد ہی سو گیا۔

رات بہت گرم تھی اور سنسان کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی، یہاں تک کہ کسی پتے کے کھڑکھڑانے کی آواز بھی نہ آتی تھی۔ ساری فضا پر موت کا سا سکوت طاری تھا۔ ستارہ کو نیند بالکل نہ آئی۔ وہ خیالات میں غرق اپنے بستر پر لیٹی رہی۔

معاً وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی حرکت کر رہا ہے وہ نہایت دلیری سے اٹھی اور دبے پاؤں خیمہ کے دروازہ تک گئی اور باہر دیکھنے لگی۔ ایک لمحہ تک وہ کچھ نہ دیکھ سکی، لیکن آہستہ آہستہ اُسے معلوم ہونے لگا کہ کوئی زمین کے ساتھ ساتھ رینگتا ہوا آرہا ہے، اس کے بعد اُسے فولاد کی ایک چمک دکھائی دی، جس نے اُس کے شک کو یقین سے بدل دیا وہ خیمہ میں واپس آئی اور عین اُس وقت جب کہ قاتل اُس پر ٹوٹ پڑنے کو تیار تھے اُس نے نادر کو بیدار کر دیا۔

لیکن قاتلوں کو اس بات کا علم ہو گیا، اور وہ بھاگ گئے۔ باہر محافظوں کے مردہ جسموں نے ثابت کر دیا کہ ستارہ واقعی سچی تھی۔ اُس نے اپنے محبوب کو بر وقت ہوشیار کر کے اُسے موت کے منہ سے نکال لیا تھا۔

ابھی تک شیرازی نے ستارہ کا اُس کے محبوب کی محبت چھین لینے کا جرم معاف نہ کیا تھا، اور نہ وہ اس دوران میں انتقام کے خیال سے بے خبر رہی تھی۔ یہ بھی اُسی کی کارستانی تھی۔

(۴)

نادر شاہ ہرات پہنچا تو قاصدوں نے اُسے خوشخبری سنائی کہ ولیعہد سلطنت بڑی سرعت کے ساتھ استقبال کے لئے آرہا ہے، اور امید ہے کہ کل صبح تک یہاں پہنچ جائے گا۔

نادر کو ولیعہد کی ملاقات کا از حد اشتیاق تھا۔ اُسے اپنے لخت جگر سے ملے پورے دو سال کا عرصہ ہو گیا تھا۔ اُس نے خیال کیا کہ اس عرصہ میں وہ ایک جوانمرد سپاہی بن گیا ہو گا۔ اُسے اُس کے متعلق جس قدر خبریں موصول ہوئی تھیں سب مسرت آمیز تھیں۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کا حاکم اور سپاہی ثابت ہوا ہے، اور صحیح معنوں میں شہنشاہ کا وارث ہے۔

لیکن افسوس صبح کو جب باپ بیٹا بغل گیر ہوئے ایک خیال نے نادر کی مسرت کو برباد کر دیا۔ وہی فطری خیال جسے بدگمانی کہتے ہیں۔ اُس نے خیال کیا کہ کہیں شاہزادہ خود مختار تو نہیں ہو گیا۔ وہ بڑی تشویش میں پڑ گیا۔ اُسے خوف سا ہو گیا کہ کہیں وہ اس کا مددگار ہونے کی بجائے اُس کے لئے بلائے جان نہ بن جائے اُسے معلوم تھا کہ وہ لوگوں میں

ہر دلعزیز ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں۔ نادر نے اس بدگمانی کو چھپانے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود۔

اِدھر رضا خاں ولیعہد کے دل میں یہ خیال تھا کہ بادشاہ کی اس مراجعت سے اُس کی خود مختاری میں فرق آجائیگا اور اب وہ ایک دوسرے شخص کے تابع فرمان رہے گا، اور اُس کا ہر حکم بلا چون وچرا قبول کرے گا۔ اُس نے سوچا کیا وہ یہ برداشت کر سکے گا؟ یہی باتیں تھیں جو نادر اس سے چاہتا تھا اور جب تک ان کا فیصلہ نہ ہو جائے دونوں باپ بیٹے کے درمیان اعتماد یا دوستی کا رشتہ استوار نہیں ہو سکتا تھا۔

ستارہ نے نادر کی اس ناامیدی سے متاثر ہو کر چاہا کہ کسی طرح دونوں باپ بیٹوں میں صلح ہو جائے اور نادر کے دل سے وہ بدگمانی دور ہو جائے جس نے اُسے اپنے بیٹے سے کشیدہ کر دیا تھا۔

لیکن نادر کو اُس کا یہ دخل درمعقولات بہت ناگوار گزرا اور وہ بہت ناراض ہو گیا۔ اُس نے ستارہ کے لئے کیا کچھ نہ کیا تھا؟ اسے توقع تھی کہ وہ اس کے صلہ میں اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرے گی، کم از کم اس وقت جب کہ اُسے اِس ہمدردی کی ازحد ضرورت تھی!

نادر سوچنے لگا کہ وہ کیوں اُن کے درمیان صلح کرانا چاہتی ہے؟ ایک خیال، ایک خوف بجلی کی طرح اُس کے دماغ میں کوندا، کیا شہزادہ اور اُس کی جماعت نے ستارہ کو رشوت دے کر یا کسی اور طریقہ سے اپنا طرفدار تو نہیں بنا لیا؟ کہیں وہ اسے دھوکا تو نہیں دے رہی؟ کون! ستارہ؟ نہیں نہیں اُسے یقین نہ آتا تھا، لیکن اس شک نے اس کے دل کے گوشہ میں جگہ پکڑ لی تھی، اور وہ عشق پیچاں کی بیل کی مانند اُس کے گرد لپٹا جاتا تھا۔

اب شیرازی نے — اُس شیرازی نے جو ہمیشہ انتقام کی تجاویز سوچتی رہتی تھی — دیکھا کہ وقت آن پہنچا ہے وہ وقت جس کا وہ مدتوں سے گھڑیاں گن گن کر انتظار کر رہی تھی، اور جس کے لئے وہ دیر سے ایک نہایت خوشنما، اور بالکل غیر معلوم جال بڑی احتیاط اور مکاری سے بچھا رہی تھی۔ پہلے اُس نے کوشش کی کہ کسی طرح نادر کی محبت کو پھر فتح کرے۔ یہ اب کوئی مشکل بات نہ تھی، کیونکہ ان دنوں اسے ایک ایسی ہستی کی ضرورت تھی جو شہزادہ کے معاملہ میں اُس کی طرفدار ہو، اُس سے ہمدردی کا اظہار کرے، باقی باتوں کے لئے اُس کی نسوانیت کا جادو کافی تھا اور اس طرح شیرازی نے بتدریج اُس محبت کو غصب کرنا شروع کیا جو نادر کے دل میں ستارہ کے لئے تھی۔

ستارہ اس منصوبہ سے بالکل بے خبر تھی۔ وہ اس تبدیلی سے بہت غمگین تھی جو نادر میں پیدا ہو گئی تھی۔ اُس کی سمجھ کام نہ کرتی تھی کہ کس بات نے اُسے ناراض کر دیا ہے؟ اُس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ ضرور رات کو اپنے محبوب سے دریافت کرے گی اور اس رنجش کو دور کرے گی جو اُن میں پیدا ہو گئی تھی۔

لیکن افسوس اس رات ستارہ کچھ دریافت نہ کرسکی! نادر اس رات اُس کے پاس نہ آیا! وہ دیر تک اُس کا بے سود انتظار کرتی رہی۔ اُس کے آنے کا مقررہ وقت گزر گیا، اور وہ تنہا منتظر بیٹھی رہی، اور اُس وقت تک ناامید نہ ہوئی جب تک اس نے شیرازی کے خیمہ سے قہقہوں کی آواز نہ سن لی۔ اُس وقت اُس نے اس خوفناک حقیقت کو پہچانا! اُس نے فرش پر لیٹ کر رونا اور آہیں بھرنا شروع کردیا، یہاں تک کہ نیند نے رحم کھا کر اُسے اپنی شفقت بھری آغوش میں لے لیا۔

لیکن شیرازی ابھی مطمئن نہ تھی۔ صرف نادر کی محبت کے مدھم شعلوں کو دوبارہ تیز کرنا اُس کے لئے کافی نہ تھا، بلکہ وہ اپنے رقیب کو بالکل تباہ کردینا چاہتی تھی۔ مدت سے اُس نے اس بات کی قسم کھا رکھی تھی، اور اب تک وہ اس پر قائم تھی۔

اُس نے بڑی مکاری سے ولیعہد کا اعتماد حاصل کرکے اُس کے سب راز معلوم کرلئے اور حرف بحرف نادر کو بتا دیئے، اور اس طریقہ سے اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرلیا۔ اُس نے اپنی کینہ پرور باتوں سے نادر کو ستارہ کے خلاف بدظن کردیا، اُس ستارہ کے خلاف جس کی محبت ان تمام باتوں کے باوجود بھی اُس کے لئے ایک قیمتی تحفہ تھی۔ کوئی کمینہ حرکت ایسی نہ ہوگی جو شیرازی نے اٹھا رکھی ہو۔

چند روز بعد ایک مرتبہ پھر نادر کی جان لینے کی کوشش کی گئی، وہ ایک نالے کو عبور کررہا تھا کہ کسی نے چھپ کر اس پر گولی چلائی۔ پہلی گولی کی آواز سنتے ہی ستارہ جھٹ اُس کے پہلو میں آگئی، اور نادر اور اس سمت کے درمیان کھڑی ہوگئی جس طرف سے گولی آئی تھی۔ یہ دوسری بار تھی کہ اُس نے محض اپنی دلیری کی وجہ سے اُسے موت کے پنجے سے بچایا تھا۔

لیکن نادر نے اس واقعہ کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اُسے بہت سے مفسدانہ اور قاتلانہ ارادوں کی خبر ملی تھی، اور وہ غصہ میں ستارہ کا شکریہ ادا کرنا یا اُس کا احسان ماننا بھول گیا تھا۔ سب سے پہلے اُس نے جی میں ٹھان لی کہ کچھ بھی ہو ملزم کو ضرور تلاش کرنا چاہیئے اور اُسے کیفر کردار کو پہنچا کر دنیا کو دکھا دینا چاہیئے کہ نادر پر حملہ کرنے کا نتیجہ کیا ہے!

شیرازی نے اپنی تمام مکاری سے کام لے کر اس تحقیقات میں اُسے مدد دینے کا وعدہ کیا اور ایسی ایسی جھوٹی شہادتیں بہم پہنچائیں جن سے صاف ثابت ہوتا تھا کہ یہ گولی ولیعہد کے ایما ہی سے چلائی گئی ہے، اور وہی اس کا ذمہ دار ہے!

لیکن یہ بات بہت خوفناک تھی کہ اُس کا اپنا لخت جگر اُسے قتل کرنے کی کوشش کرے! نادر کو اس بات کا یقین نہ آتا تھا تاہم وہ شیرازی کی فراہم کردہ عینی شہادتوں میں کوئی نقص نہ نکال سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ اُسے یقین ہوگیا کہ سب قصور ولیعہد کا ہے! اس کے علاوہ ایک اس سے زیادہ خوفناک اور بے معنی شبہ بھی اُس کے دل میں پیدا ہوگیا کہ رضا خاں اپنے

باپ کی ملکہ ستارہ کو دل و جان سے چاہتا ہے اور وہ بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ بدگمانی غصہ اور غرور نے نادر کو بالکل اندھا کر دیا! اُس کے لئے یہ بات بیٹے کی غداری سے زیادہ محزن تھی۔ وہ اُن شہادتوں کو جو حلف اٹھا کر دی گئی تھیں کیسے جھٹلا سکتا تھا۔ نادر کے دل میں محبت اور انتقام برسرِپیکار تھے لیکن نتیجہ قطعی تھا۔ اُس کے خلاف ایک جرم کا ارتکاب کیا گیا تھا جو کسی حالت میں معاف نہ ہوسکتا تھا اور جس کے لئے ایک ہی سزا مناسب معلوم ہوتی تھی۔ لیکن موت! کیا وہ اپنے پیارے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دے گا؟ نہیں، نادر سا سنگ دل انسان بھی اس خیال سے کانپ اُٹھا۔

تاہم اُس نے خیال کیا کہ شہزادہ کو کچھ نہ کچھ سزا ضرور ملنی چاہئے ایک سخت سزا جو اسے آئندہ کے لئے کمزور بے بس کر دے تو کیا پھر شہزادہ کی آنکھیں نکال کر اسے جلاوطن کر دینا چاہئے؟ یقیناً یہی ایک سزا تھی جو اُس کے جرم کے لئے مناسب تھی! ایک ایسی سزا جو موت سے زیادہ ہولناک تھی، مگر جو نادر کو بہت رحم بھری نظر آتی تھی! علاوہ ازیں اُس نے غور کیا کہ شاید یہ سزا ستارہ کے لئے ایک سبق کا کام دے سکے! ایک اندھا عاشق! کیا وہ اب بھی ۔۔۔۔ ؟

نادر نے یہ فیصلہ صادر کر دیا اور شیرازی کا دل بے پایاں مسرت سے لبریز ہوگیا وہ بڑے عمدہ طریق سے اپنے منصوبوں کو عمل میں لا رہی تھی۔ اب وہ بدبخت شہزادے کی والدہ کے پاس گئی اُس سے بڑی ہمدردی ظاہر کی اور کہنے لگی: "افسوس میں اب کچھ نہیں کر سکتی، شاہ پر اب میرا کوئی اختیار نہیں، لیکن ستارہ ۔۔۔۔"

ان الفاظ نے غمزدہ ماں کے دل میں امید کی ایک کرن روشن کر دی۔ ستارہ! ہاں شاید وہ کچھ مدد کر سکے۔ وہ اُس سے ملی اور اپنی درد بھری داستان سنا کر رحم کی ملتجی ہوئی اور اُس کی یہ کوشش بے سود ثابت نہ ہوئی۔ ستارہ نے بڑی ہمدردی سے اُس کی باتیں سنیں اور بے اعتباری کے باوجود نادر سے رحم کی درخواست کرنے کا وعدہ کر لیا۔ اُسے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ ایک حماقت کر رہی ہے اور اُس کی منت و سماجت بے کار ثابت ہوگی تاہم اُس نے محسوس کیا کہ اُسے ایک فرض ادا کرنا ہے اور وہ اُسے ضرور ادا کرے گی!

اُس نے دلیری سے کام لے کر نادر سے ملنے کی درخواست کی جو منظور ہوگئی جب وہ خیمہ میں داخل ہوئی نادر اکیلا بیٹھا تھا۔ اُس کے چہرے سے وحشت اور درشتی ٹپک رہی تھی۔ اُس نے ستارہ کے آنے کا مطلب سمجھ لیا۔ جب وہ بولی تو نادر کا چہرہ اَور درشت اور پُرغم ہوگیا۔

اپنے بیٹے کو سزا دینے سے اُس کے دل کو سخت صدمہ پہنچا تھا لیکن ستارہ کا اس فیصلہ کے خلاف التجا کرنا اُسے سخت ناگوار گزرا۔ اُسے یقین ہوگیا کہ اُس کا شک غلط نہ تھا۔ شیرازی کی باتیں یکے بعد دیگرے اُس کے دماغ میں خاص شکل اختیار کرنے لگیں۔ اُس کے خیال میں وہ شہزادہ کی محبت کی وجہ سے التجا کر رہی تھی۔ اُس کی سفارش نے نادر کو اُس کی بے وفائی

کا یقین دلادیا۔ وہ ازحد غمزدہ ہوگیا، کچھ عرصہ خاموش رہا، پھر غضبناک آواز میں کہنے لگا:۔ "دور ہوجاؤ! نہیں تو میں تمہیں بھی اندھا کردوں گا!"

لیکن ستارہ نے اس کا بازو تھام کر کہا: "میرے آقا رحم کرو! رحم! وہ تمہارا بیٹا ہے! اُسے اور کوئی سزا دے دو، میرے آقا میں تمہاری منت کرتی ہوں اُس بیچارے کو اندھا نہ کرو!"

یہ نادر کی قوت برداشت سے زیادہ تھا۔ اُس کا غم غصہ میں تبدیل ہوگیا۔ وہ بیتاب ہوکر اُٹھا اور پورے زور سے ستارا کی پیشانی پر خنجر مارا، وہ چیخ کر زمین پر گر پڑی اور دیر تک بے حس و حرکت پڑی رہی۔ اُس کی خوبصورت پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔

کچھ عرصہ نادر اُس کے جسم کو پریشانی سے دیکھتا رہا۔ اُس نے سوچا کہ میں نے کیا کردیا ہے؟ کیا وہ مرگئی ہے؟ خوف نے اُس کے وحشیانہ غضب کو ٹھنڈا کردیا، اور وہ بستر پر اوندھے منہ جا پڑا، وہ ایک بے خوف اور جری سپاہی تھا لیکن اس وقت وہ خوب جی کھول کر رویا۔ وہ دل شکستہ ہوچکا تھا!

(۵)

وفادار آغا باشی خیمہ میں داخل ہوا اور آرام سے ستارہ کو اٹھا کر لے گیا، اور اُسے طبیب کو دکھایا۔ وہ ابھی تک زندہ تھی۔ آغا باشی کو اُس سے ازحد عقیدت تھی اور چونکہ تنازعہ کے اصلی وجوہ سے بےخبر تھا، اس لئے اُس نے یہی بہتر سمجھا کہ اس بات کو نادرشاہ سے پوشیدہ رکھے۔

کئی دن تک ستارہ بیہوش پڑی رہی۔ اُس کی جان، موت اور حیات کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ آخر کچھ دن بعد جب اُسے ہوش آیا اور وہ بولنے اور حرکت کرنے کے قابل ہوئی، تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ نادر سے کوسوں دور ہے +

آغا باشی نے اُسے ایک ارمنی خاندان کے پاس بھیج دیا تھا جس نے بڑی خندہ پیشانی سے اُس کی تیمارداری کی اور اُسے کہا کہ وہ بڑی خوشی سے اس وقت تک رہ سکتی ہے جب تک بادشاہ پر اُس کا زندہ ہونا ثابت نہ ہوجائے چنانچہ وہ مستقبل کا مقابلہ کرنے کے لئے وہاں رہنے پر رضامند ہوگئی +

ایک مہینہ گزر گیا، لیکن شاہی دربار سے کوئی امید افزا خبر موصول نہ ہوئی۔ دوسرا اور پھر تیسرا مہینہ بھی گزر گیا لیکن حالات جوں کے توں ہی رہے۔ اُس نے خیال کیا کہ شاہ کو یہ بتانا کہ میں زندہ ہوں، یقیناً اُن تمام اشخاص کی تباہی کا باعث ہوگا جو اس واقعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُسے یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ نادر نے اپنی موجودگی میں ستارہ کا نام تک لینے کی ممانعت کردی تھی۔ وہ واقعی اپنے جنون پر قابو نہ پا سکتا تھا +

مصاحبوں کا خیال تھا کہ اس جنوں کا باعث غصہ ہے، اور یہی خیال ستارہ کا تھا۔ شیرازی ہاں صرف شیرازی ہی اصل حقیقت سے واقف تھی کہ یہ غم ہے جس نے اُسے دیوانہ اور ناامید کر رکھا ہے۔ نادر کو ستارہ سے محبت تھی، ایسی محبت جو بمشکل کسی مرد کے دل میں کسی عورت کے لئے پیدا ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں جس دن سے اُس نے ستارہ کو قتل کیا تھا اُسے کسی بات میں لطف نہ آتا تھا۔ وہ دیوانہ سا ہو گیا تھا!

وہ قسمت کے ساتھ بیباکانہ جنگ کر رہا تھا۔ اُس قسمت کے ساتھ جو اُس نے سالہا سال کی کشمکش کے بعد اپنے لئے بنائی تھی، مگر بے سود۔ حکومت کی باگیں اُس کی گرفت سے نکلی جا رہی تھیں اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس میں اب انہیں دوبارہ پکڑنے کی ہمت نہیں۔ اس احساس سے اُس کے مزاج میں بے حد تلخی پیدا ہو گئی تھی اور اُس کے مصاحبوں کو ہر وقت اُس کے عتاب سے اپنی جانوں کا خطرہ رہتا تھا۔

مہینے سالوں میں تبدیل ہو گئے لیکن ستارہ کو ایک لفظ نادر کی جانب سے موصول نہ ہوا۔ وہ بالکل مایوس ہو گئی اور اُسے یقین ہو گیا کہ واقعی نادر اُسے فراموش کر چکا ہے۔ وہ اب ایک ایسے شخص کی مانند تھی جس کی زندگی میں کوئی مسرت اور دلچسپی نہ ہو، لیکن اس پر بھی اُس کے دل میں اُس شخص کی طرف سے کوئی غصہ نہ تھا جس نے بزعم خود اُسے قتل کر دیا تھا!

یکایک مشہور ہوا کہ کسی جنگی مہم کے سلسلہ میں نادر اس چھوٹے سے ارمنی گاؤں کے قریب سے گزرے گا جس میں وہ کئی سال سے پناہ گزین تھی۔ ستارہ کے دل میں نادر کو ملنے کی زبردست خواہش پیدا ہوئی۔ وہ ایسے نادر موقع کو ہاتھ سے کھونا نہ چاہتی تھی۔

اُس کے بہی خواہوں نے اُسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن ستارہ کا مضبوط ارادہ بالکل متزلزل نہ ہوا۔ اُس نے کہا وہ ضرور جائے گی خواہ کچھ ہو۔ اُس کا ارادہ چٹان کی طرح مضبوط تھا۔ اُسے موت کا بالکل خوف نہ تھا۔ اُس کے خیال میں سالہا سال کی بے لطف زندگی سے نادر کے ہاتھوں مرجانا ایک لازوال مسرت کے برابر تھا۔

علاوہ ازیں اُس نے محسوس کیا کہ اس وقت نادر کو اُس کی سخت ضرورت ہے۔ اُس نے ایک معتبر قاصد تلاش کیا اور ایک خط دے کر ایرانی لشکر میں بھیجا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے وہ ہیرا بھی بھیج دیا جو مدت ہوئی نادر نے اُسے بطور تحفہ دیا تھا، اور خود انتظار کی گھڑیاں گننے لگی۔

اُس کی نسوانی فطرت نے اُس کی بالکل ٹھیک راہنمائی کی تھی۔ نادر نے ابھی تک اُسے فراموش نہ کیا تھا اُسے واقعی اُس کی ضرورت تھی۔ کوئی شخص اُس بے پایاں مسرت کو بیان نہیں کر سکتا جو اسے یہ سن کر ہوئی کہ ستارہ اُس کی

پیاری ستارہ ابھی تک زندہ ہے۔ اُس نے فوراً شاہی سواروں کا ایک دستہ اُس کی طرف بھیجا اور التجا کی کہ جس قدر جلد ممکن ہو اُس کے پاس چلی آئے۔ لیکن یہ التجا بلا ضرورت تھی۔ ستارہ نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا اور دو دن بعد ایک دفعہ پھر ایک ملکہ کی شان و ممکنت کے ساتھ ایرانی لشکر میں جا پہنچی ؛

نادر اس سے ملا ۔۔۔۔ اِس پُر مسرت گھڑی میں ماضی اور اُس کی تمام تکالیف ایک خواب کی یاد کی مانند فراموش ہو گئیں۔ اب اُن کی جدائی ناممکن تھی۔ محبت کی شکستہ زنجیر کی کڑیاں اب پھر مضبوطی سے جڑ گئیں جنہوں نے ستارہ اور نادر کو پہلے سے کئی گنا مضبوطی سے جکڑ دیا ؛

لیکن اب نادر کی شہرت اور عظمت کے دن جا چکے تھے اور اُن کے ساتھ مسرت کے دن بھی رخصت ہو چکے تھے قسمت اُس کے خلاف ہو گئی تھی۔ وہ اب اپنی زندگی کے لئے جدوجہد کر رہا تھا، اور اُس کے اپنے پیروؤں میں اُس کے بدترین دشمن پیدا ہو گئے تھے اور یہ صاف ظاہر تھا کہ اُس کا انجام نزدیک آن پہنچا ہے ؛

اچانک ایک رات جب کہ ہر طرف خاموشی اور تاریکی مسلّط تھی اور ستارہ اپنے غمزدہ آقا کے بستر کے قریب بیٹھی اُس کی حفاظت کر رہی تھی، اسے باہر کسی کے حرکت کرنے کی آواز آئی، وہ فوراً اُٹھ بیٹھی، لیکن اس مرتبہ خطرہ کی خبر اُسے بہت دیر بعد ملی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ کسی قسم کی حرکت کرکے یا چیخ کر نادر کو جگا دے، قاتل خیمہ میں داخل ہو گئے اور خوابیدہ سلطان کو قتل کر دیا ؛

اس کے بعد جب قدر ناشناس محافظ اندر داخل ہوئے تو انہوں نے ایک عجیب پُرغم نظارہ دیکھا۔ اُن کا ذی شان حکمران زمین پر بے حس و حرکت پڑا تھا، اُس کے دیوزاد جسم سے اُس حسین عورت کا نازک جسم لپٹا تھا جس سے اُسے از حد محبت تھی، اور ایک تیز خنجر اُس کے دل میں گہرا پیوست تھا ؛

سراج الدین احمد نظامی

مسکراہٹ

اُس کے سادہ حسن میں فرشتوں کی سی بیباکی ملاحت ہے اور تبسم کی وہ کرن جو ہر وقت اُس کے لبوں پر رقصاں رہتی ہے اُس کی پاک اور پیاری روح کا عکس معلوم ہوتی ہے۔

محسن عبداللہ

لمعات

نہ ملا سکونِ خاطر مجھے عمرِ جاوداں سے
جو ہوا بھی کچھ میسّر تو وہ مرگِ ناگہاں سے

مرے دل میں ہے وہ طوفاں کہ خدا ہی جانتا ہے
یہ خیال، توبہ توبہ کہ بیان ہو زباں سے

ترے چارہ ساز آئے ترے دل نواز آئے
دلِ مبتلا ٹھہر جا، وہ ہیں تجھ سے بدگماں سے

اسے ڈھونڈھتا ہوں جس کو سرِ طور ڈھونڈتے تھے
اسی جستجو میں آیا ہوں مکانِ لامکاں سے

میں فدائے حسنِ مطلق میں نثارِ حسنِ خوباں
میں شکارِ تیرِ جاناں، جو چھٹا نہیں کماں سے

جو خیال میں نہ آئے نہ سما سکے نظر میں
اُسی ذات کا ہوں شیدا جو بلند ہے گماں سے

مجھے شعر و شاعری سے نہیں دور کی بھی نسبت
یہ لگی ہوئی ہے دل کی جو نکل گئی زباں سے

میں عمل کو چاہتا ہوں کہ عمل کا شیفتہ ہوں
کہ حیات ہے عمل سے نہ زبان اور بیاں سے

ترے در پہ آکے بیٹھا ہے شہابِ شعلہ ساماں
وہ اُٹھے تو مٹ کے اُٹھے ترے سنگِ آستاں سے

مہر محمد خاں **شہاب** مالیرکوٹلوی

سچّی خوشی

اپنی طبیعت میں ایک تغیر ناشناس شیرینی کا پیدا کرلینا، صرف شستہ اور پاکیزہ خیالات کو اپنے دل میں جگہ دینا اور ہر حال میں خوش رہنا سیرت کا ایک ایسا حسن ہے جس کا حصول ہر شخص کا مقصدِ حیات ہونا چاہیئے، اور خصوصاً اُن لوگوں کا مقصدِ حیات جو دنیا کے مصائب کو کم کرنا چاہتے ہیں۔ جو شخص، کج خلقی، آلودگی اور ناخوشی کی سطح سے اپنے آپ کو بلند نہیں کرسکا وہ بہت بڑے دھوکے میں ہے اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی نظریہ یا مذہبی اصول کی تبلیغ سے دنیا میں مسرت کو پھیلا سکے گا۔ وہ جو اپنی زندگی کے اوقات کج خلقی، آلودگی یا ناخوشی میں گزارتا ہے دنیا کی مصیبت میں اضافہ کرتا ہے۔ بخلاف اس کے وہ جو ہمیشہ نیکی اور فلاح پر نظر رکھتا ہے اور کبھی آزردہ خاطر نہیں ہوتا روز بروز دنیا میں خوشی کو فروغ دے رہا ہے۔

وہ جس نے خوش خلق ہونا، درگذر کرنا، محبت سے پیش آنا اور خوش رہنا نہیں سیکھا خواہ اُس نے انبار در انبار کتابیں پڑھ لیں اور آسمانی کتابوں کے لفظ لفظ کو حفظ کرلیا اُس نے دنیا میں بہت کم سیکھا، کیونکہ نیکی، پاکیزگی اور خوشی ہی سے ہم دنیا کے گہرے، حقیقی اور صبر آزما اسباق کو سیکھ سکتے ہیں۔ زمانے کی تمام مخالفتوں اور مخاصمتوں کے بالمقابل ہشاش بشاش رہنا ہی اپنے نفس پر غلبہ حاصل کرلینے کی بہت بڑی دلیل ہے، دانشمندی کی شہادت ہے اور حقیقت کو پالینے کا ثبوت ہے۔

ایک مسرور اور شاداں روح تجربہ اور دانش کا پختہ ثمر ہے جو نظر تو نہیں آتا مگر اُس کی خوشبو دور دور تک پہنچتی ہے، دوسروں کے دلوں کو فرحت دیتی اور دنیا کی فضا کو پاکیزہ بناتی ہے۔ یہ نہ کہو کہ تمہارے گرد و پیش کے حالات تمہارے مخالف ہیں۔ گرد و پیش کے حالات کبھی انسان کے مخالف نہیں ہوتے۔ وہ ہمیشہ اس کے موید ہوتے ہیں اور تمام وہ واقعات جن کے پیش آنے پر ہم اپنی طبیعت کی شگفتگی اور اپنے قلب کا سکون کھو بیٹھتے ہیں دراصل وہ منازل ہوتی ہیں جن سے گزرنا ہماری سیرت کی نشوو ارتقا کے لئے لازمی اور لابدی ہے، اور جب تک ہم ان منازل کو طے نہ کرجائیں اُس وقت تک نہ ہم کچھ جان سکتے ہیں اور نہ کوئی ترقی کرسکتے ہیں۔ نقص خود ہمارے نفوس میں ہے۔

سچی خوشی روح کی صحیح اور اصلی حالت ہے، اور ہر شخص اُسے حاصل کرسکتا ہے اگر وہ سچائی اور بے غرضی سے بسر کرے۔ تمام جانداروں کے لئے اپنے دل میں مہربانی کا جذبہ پیدا کرو، نامہربانی حرص اور غصہ کو دل سے نکال دو تاکہ تمہاری زندگی اُس روح پرور نسیم کی طرح ہو جائے جو پھولوں اور کانٹوں پر سے ایک سی نرمی سے گزر جاتی ہے۔

اگر تم اسے کچھ زیادہ مشکل سمجھ بیٹھے ہو تو بے اطمینانی اور ناخوشی تمہارے قلوب سے نہیں نکل سکے گی۔ اسے آسان بنانے میں تمہارا یقین، تمہاری خواہش، تمہارا عزم سب بروئے کار آنے چاہئیں۔

مایوسی، تنک مزاجی، فکر و تردد، شکایت، ملامت اور غصہ ——— یہ سب خیالی گھن ہیں، قلب کی بیماریاں ہیں۔ یہ ایک ناقص دماغی کیفیت کی نشانی ہیں اور جو ان امراض میں مبتلا ہیں انہیں اپنے قلب و دماغ کا علاج کرنا چاہئے۔ یہ سچ ہے کہ دنیا میں گناہ اور مصیبت کا دور دورہ ہے۔ اسی لئے دنیا کو ہماری محبت و رافت کی ضرورت ہے، لیکن ہمارے رنج و مصیبت کی دنیا کو ضرورت نہیں کیونکہ وہاں پہلے ہی اس کی کمی نہیں۔ اُسے ہماری خوشی اور خرمی کی ضرورت ہے کیونکہ وہاں خوشی اور خرمی کی کمی ہے۔ ہم دنیا کو حسنِ حیات و سیرت سے بہتر کوئی تحفہ پیش نہیں کرسکتے۔ اس کے بغیر سب چیزیں فضول ہیں، اسے سب پر فوقیت حاصل ہے، یہ پائدار، حقیقی اور غیر فانی ہے اور مسرت و برکت کلیتہً اس پر مشتمل ہے۔

اپنے گرد و پیش کو مایوسانہ نظروں سے نہ دیکھو اور دوسروں کی برائی کی شکایت یا اُس برائی کے خلاف جنگ کرنے کی بجائے خود اپنے گناہوں اور بدیوں کے بندھنوں سے آزاد ہو کر رہو۔ اطمینانِ قلب، خالص مذہب اور سچّی اصلاح کا یہی راستہ ہے۔ اگر تم لوگوں کو حقانیت سکھانا چاہتے ہو تو پہلے خود حق پرست بنو، اگر تم دنیا کو مصیبت اور گناہ سے آزاد کرنا چاہتے ہو تو پہلے خود آزاد بنو، اگر تم اپنے گھر اور اپنے گرد و پیش کو مسرور دیکھنا چاہتے ہو تو پہلے خود خوش ہو جاؤ۔ تم اپنے گرد و پیش کی تمام فضا کو بدل سکتے ہو اگر تم اپنے آپ کو بدل ڈالو۔

ایلن منصور احمد

غزل

پوشیدہ دیکھتی ہے کسی کی نظر مجھے
دیکھ اے نگاہِ شوق تُو رسوا نہ کر مجھے

رحمت پیام لائے گی عفوِ گناہ کا
عذرِ گناہ کی ہوئی توفیق اگر مجھے

مقصد سے بے نیاز رہا ذوقِ جستجو
میں بے خبر ہُوا جو ہوئی کچھ خبر مجھے

تھی کج روی کی خُو جو ازل میں پڑی ہوئی
گم کردہ راہ چھوڑ گیا راہبر مجھے

ڈوبا ہُوا تھا کیف میں تیرِ نگاہِ ناز
رکھتی ہے مست لذتِ زخمِ جگر مجھے

مَیں شب کی بزمِ عیش کا ماتم نشیں ہوں آپ
رو رو کے کیوں رلاتی ہے شمعِ سحر مجھے

حیرت نے میری آئنہ ان کو بنا دیا
کیا دیکھتے! کہ رہ گئے وہ دیکھ کر مجھے!

قربان جاؤں، چھوڑ تکلف کی گفتگو
کہہ کر پکار وحشتِ شوریدہ سر مجھے

رضا علی وحشت

غزل

سر میں جنونِ عشق ہو، حکمت یہی تو ہے
دونوں جہاں کے علم کی دولت یہی تو ہے

دیکھا نہ چشمِ فلسفہ نے روئے یار کو،
ہے علم خود حجابِ حقیقت یہی تو ہے

ہر ذرہ کائنات کا ہے دفترِ رموز
"محرم نہیں ہے تُو" مصیبت یہی تو ہے"

وہ ہیں جو بے نیاز، تو میں ہوں نیاز مند،
دونوں میں ایک راہِ محبّت یہی تو ہے!

آنکھیں ملا کے شوق سے دل میں سمائیے
حضرت! حضور کا درِ دولت یہی تو ہے!

واعظ سے ارتباط نہ ہر گز بڑھائیے
پیرِ مغاں کی ایک نصیحت یہی تو ہے

مصطفی خاں

جوگن

ایک زمانے میں جب میری تحریروں نے عوام کے ایک طبقہ کو میرے خلاف سخت مشتعل کر دیا اور جرائد و رسائل نے اپنی مشقِ ستم کے لئے میرا نام منتخب کر لیا تو میں نے مناسب سمجھا کہ چپ چاپ کسی پُر سکون مقام کو چلا جاؤں اور یہ کوشش کروں کہ کچھ عرصہ کے لئے خود مجھ کو بھی اپنی ہستی فراموش ہو جائے۔

کلکتہ سے کچھ فاصلہ پر ایک گاؤں میں میرا ایک مکان ہے جہاں میں عوام کی نگاہوں کا ہدف بننے سے بچا رہ سکتا ہوں۔ گاؤں والوں نے ابھی تک میرے متعلق کوئی خاص رائے قائم نہیں کی۔ انہیں یہ معلوم ہے کہ گاؤں کی اقامت سے میرا مقصد محض تفریح و تفرج یا عیش و عشرت کا حصول نہیں ہوتا کیونکہ میں نے گاؤں کی راتوں کے سکون کو شہر والوں کے عافیت سوز شور و شغب سے کبھی برہم نہیں کیا۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں تارک الدنیا بھی نہیں، کیونکہ میری طرزِ زندگی میں انہیں آسائش و آسودگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ وہ مجھے سیاح بھی نہیں سمجھتے کیونکہ گو میں فطرۃً آوارہ گرد ہوں لیکن گاؤں کے کھیتوں کے گرد میرا چکر لگانا انہیں بالکل بے مقصد معلوم ہوتا ہے۔ انہیں یہ بھی ٹھیک معلوم نہیں کہ میری شادی ہو چکی ہے یا نہیں کیونکہ انہوں نے کبھی مجھے اپنے بچوں کے ساتھ نہیں دیکھا۔ میرا وجود اُن کے لئے ایک ناقابلِ حل معما ہے۔ پس مدت سے انہوں نے میرے متعلق کسی قسم کا غور و فکر صرف کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔

لیکن مجھے حال ہی میں معلوم ہوا ہے کہ گاؤں میں کم از کم ایک متنفس ایسا بھی ہے جس کو مجھ سے نہایت گہری دلچسپی ہے۔ ہماری ملاقات پہلے پہل جولائی کے گرم موسم میں ایک سہ پہر کو ہوئی۔ صبح لگاتار بارش ہوتی رہی تھی اس لئے کہر نے اس وقت تک ہوا کو بوجھل اور نم آلود بنا رکھا تھا۔

میں بے کار بیٹھا ایک چتکبری گائے کو دیکھ رہا تھا جو دریا کے کنارے گھاس چر رہی تھی۔ سورج کی آخری کرنیں اُس کے چمکیلے جسم کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ گائے کے خوبصورت قدرتی لباس کو دیکھ کر میرے دل میں عجیب و غریب خیال پیدا ہو رہے تھے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ انسان اپنے جسم کو قدرتی لباس سے محروم کر کے کپڑے مہیا کرنے میں کس قدر اسراف سے کام لیتا ہے۔

میں انہیں خیالات میں محو بیٹھا تھا کہ ادھیڑ عمر کی ایک عورت میرے روبرو آکر ادب سے جھکی اور پھر میرے سامنے زمین پر سجدہ ریز ہوگئی۔ اس کے دامن میں پھولوں کے چند گچھے تھے جن میں سے ایک اُس نے مجھے دیا، اور اس کے بعد ادب کے ساتھ دست بستہ کھڑی ہوگئی۔ پھولوں کا یہ ہدیہ پیش کرتے وقت اُس نے مجھ سے یہ الفاظ کہے۔ "یہ ناچیز ہدیہ میرے معبود کی نذر ہے"

وہ چلی گئی۔ اس کے یہ الفاظ سن کر میں اس قدر گھبرا گیا تھا کہ اس کے روانہ ہوجانے سے قبل میں اس پر ایک نگاہ بھی نہ ڈال سکا۔ یہ تمام واقعہ بالکل سادہ سا تھا لیکن میرے دل پر اس سے ایک نہایت گہرا اثر پڑا۔ اور جب دوبارہ میں نے کھیت میں گائے پر نظر ڈالی جو سرگرمی سے گھاس کھانے میں مصروف تھی اور ساتھ ساتھ اپنے جسم پر سے مکھیاں بھی اڑاتی جاتی تھی، تو مجھے اس چوپایہ کا وجود بھی سراپا اسرار معلوم ہونے لگا۔ شاید قارئین مجھ پر ہنسیں، لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس وقت میرا دل خدا کی تسبیح وتقدیس کے جذبات سے مملو ہوگیا۔ میں نے زندگی کی پاک مسرتوں کے عطیہ پر خدا کا شکر ادا کیا۔ کہ وہی ہر قسم کی زندگی کا سرچشمہ ہے۔ پھر میں نے آم کے درخت کی ایک نرم سی شاخ لے کر اپنے ہاتھ سے گائے کو کھلائی۔ اس سے میرا دل کچھ مطمئن سا ہوگیا گویا میں نے اپنے خدا کو خوش کیا ہے۔

دوسرے سال جب میں گاؤں میں آکر ٹھہرا، فروری کا مہینہ تھا۔ جاڑا ابھی رخصت نہ ہوا تھا صبح کے وقت سورج کی دھوپ میرے کمرے میں داخل ہوئی جس کی گرمی نے میرے دل میں جذباتِ تشکر پیدا کردیئے میں لکھنے میں مصروف تھا جب ایک خدمتگار نے مجھے اطلاع دی کہ ایک جوگن ملاقات کے لئے نیچے کھڑی ہے۔ میں نے بے پروائی سے اُسے اوپر بلانے کو کہا اور خود پھر لکھنا شروع کردیا۔ جوگن نے اندر داخل ہوتے ہی ادب سے جھک کر میرے پاؤں چھوئے۔ میں فوراً پہچان گیا کہ یہ وہی عورت ہے جس سے گزشتہ سال میری ایک مختصر سی ملاقات ہوئی تھی۔

اب میں زیادہ غائر نگاہ کے ساتھ اس کو دیکھ سکا۔ اس کی عمر اس حد سے متجاوز ہوچکی تھی جب کسی عورت کے حسن کو معرضِ بحث میں لایا جاتا ہے۔ اس کا قد لمبا تھا اور جسم سے وہ بہت مضبوط معلوم ہوتی تھی۔ لیکن عبادت وریاضت کی کثرت نے اُس کی کمر میں کسی قدر خم پیدا کردیا تھا۔ اس کے انداز واطوار میں کسی قسم کی جھجھک نہ پائی جاتی تھی۔ اس کے چہرہ کا سب سے نمایاں حصہ اس کی آنکھیں تھیں جو ہر اس چیز میں جس پر وہ نگاہ ڈالتی تھی کھب جاتی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے نہایت زبردست قوتِ ادراک کا اظہار ہوتا تھا۔

جب وہ اندر داخل ہوئی تو مجھے یوں محسوس ہوا گویا اُس نے اپنی ان دو بڑی بڑی آنکھوں سے میرے جسم کو ایک دھکا سا دیا ہے۔ آخر اُس نے یوں سلسلۂ کلام شروع کیا۔

"یہ کیا! میرے معبود تُو نے مجھے اپنے تخت کے پاس کیوں بلا لیا؟ میں تجھے درختوں کے سایہ میں دیکھا کرتی تھی۔ تیرے ملنے کی صحیح جگہ وہی ہے۔ اور تجھے وہیں دیکھنا مجھے زیادہ پسند ہے۔"

غالباً اُس نے مجھے باغ میں ٹہلتے دیکھا ہوگا۔ لیکن گزشتہ چند دن سے مجھے نزلہ کی شکایت ہوگئی تھی اس لئے طبیب کے مشورہ کے مطابق میں گھر سے باہر نہ نکلا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جوگن نے کہا "اے میرے معبود مجھے نیکی کا کوئی درس دے"

میں اس ناگہانی سوال کے جواب کے لئے بالکل تیار نہ تھا چنانچہ میں نے بلا تامل یہ جواب دیا "نیکی کا درس نہ میں نے کبھی دیا ہے نہ لیا ہے۔ مَیں اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہوں اور منہ سے کچھ نہیں بولتا۔ اس طرح میں دیکھ بھی سکتا ہوں اور سن بھی سکتا ہوں، خواہ کوئی آواز پیدا نہ ہو۔ اس وقت جو میں تمہیں دیکھ رہا ہوں یہ ایسا ہی ہے گویا میں تمہاری آواز سن رہا ہوں۔"

میری یہ گفتگو سن کر جوگن کے دل میں ایک ہیجان سا پیدا ہوگیا اور اُس نے کہا کہ "خدا نہ صرف اپنی زبان سے بلکہ اپنے تمام جسم کے ساتھ مجھ سے ہم کلام ہوتا ہے"

میں نے کہا "میں خاموشی کی حالت میں اپنے تمام جسم سے سن سکتا ہوں۔ اور میں کلکتہ سے صرف یہی آواز سننے یہاں آیا ہوں۔"

جوگن نے کہا "یہ مجھے معلوم ہے۔ اور اسی لئے میں تیرے حضور میں بیٹھنے کے لئے آئی ہوں۔"

رخصت ہونے سے پہلے اُس نے پھر جھک کر میرے پاؤں چھوئے۔ مجھے جرابیں پہنے دیکھ کر اُسے تکلیف ہوئی کیونکہ وہ برہنہ پاؤں کو چھونا چاہتی تھی۔

دوسرے دن علی الصباح میں باہر نکل کر اپنے بالا خانے کی چھت پر بیٹھا۔ جنوب کی طرف درختوں کی قطاروں کے پار مجھے اجاڑ اور سرسبز وسیع میدان نظر آتا تھا۔ مشرق میں ایکھ کے کھیتوں کے اوپر سے سورج طلوع ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ گھنے درختوں کے سایہ میں گاؤں کی سڑک نظر آتی تھی جو دوسرے قصبات کی طرف جاتی ہوئی دور جا کر دھند میں غائب ہوگئی تھی۔

اُس صبح کو یہ کہنا مشکل تھا کہ سورج طلوع ہوچکا ہے۔ ہر طرف دھند چھائی ہوئی تھی اور درختوں کی چوٹیوں

پر ابھی تک سفید پالا جما ہوا تھا۔
صبح کے اس دھندلکے میں میں نے جوگن کو چلتے ہوئے دیکھا۔ وہ خدا کی تعریف میں گاتی اور سنکھ بجاتی ہوئی پھر رہی تھی۔
رفتہ رفتہ دھند غائب ہوگئی اور سورج کی روشنی ہر طرف اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ پھیل گئی۔
جب میں اپنے حریص ایڈیٹر کی ادبی گرسنگی کی تسکین کے لئے جو کلکتہ میں بیٹھا ہل من مزید کا ورد کیا کرتا ہے دوات قلم لے کر لکھنے کے کمرے میں بیٹھ گیا تو مجھے سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ ایک لمحہ کے بعد جوگن آپ ہی آپ کوئی راگ گنگناتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور میرے سامنے ادب کے ساتھ جھک کر کھڑی ہوگئی۔ میں نے سر اوپر اٹھایا۔
اُس نے کہا "میرے معبود کل میں تیرے دسترخوان سے بچا کھچا کھانا تبرک کے طور پر لے گئی تھی"۔
میں یہ سُن کر چونک پڑا اور اُس سے دریافت کیا کہ تم نے یہ کس طرح حاصل کیا؟
اُس نے کہا "میں دروازے پر منتظر کھڑی رہی اور جب کھانے کے برتن باہر آئے، تو طشتری میں سے کچھ کھانا میں نے لے لیا"۔
یہ بات میرے لئے بہت تعجب انگیز تھی کیونکہ گاؤں میں سب لوگ جانتے تھے کہ میں یورپ جا چکا ہوں اور فرنگیوں کے ساتھ مل کر کھانا کھا چکا ہوں۔ اس وجہ سے راسخ الاعتقاد لوگ میرے کھانے کو ناپاک سمجھتے تھے۔
میرے اس اظہار تعجب پر جوگن نے کہا "میرے معبود اگر میں تیرا کھانا اپنے لئے منع سمجھوں، تو پھر بھلا میں تیرے پاس کس لئے آؤں"؟
میں نے کہا "مگر تمہارے ہم قوم اس بات پر کیا کہیں گے"؟
اُس نے مجھے بتایا "میں پہلے ہی سے یہ بات سب لوگوں کو بتا چکی ہوں جس پر انہوں نے تاسف سے اپنے سر ہلائے لیکن پھر سب نے کہا کہ اسے اسی کے حال پر چھوڑ دینا چاہیئے"۔
مجھے معلوم ہوا کہ جوگن ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی ماں جو خوشحال ہے اسے اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی، مگر اُس نے بھکارن بننے کو ترجیح دی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ در در کی بھیک مانگ کر جو روزی مجھے میسر ہوتی ہے اُس کو میں مقدس سمجھتی ہوں۔ اس کے قول پر غور کرنے کے بعد میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ جب ہمیں اپنی روزی خیرات کے طور پر میسر ہو تو ہم خدا ہی کو اپنا داتا سمجھتے ہیں اور اُس کے زیادہ شکر گزار ہوتے ہیں لیکن جب ہمیں گھر

پر حسبِ معمول کے مطابق باقاعدہ کھانا ملتا رہے تو ہم اُسے اپنا حق سمجھنے لگتے ہیں۔

میں بہت چاہتا تھا کہ اس کے شوہر کے متعلق کچھ اس سے پوچھوں، لیکن چونکہ خود اس نے کبھی اس کی طرف اشارہ تک بھی نہ کیا تھا اس لئے میں نے اُس سے کچھ نہ پوچھا۔

مجھے معلوم ہوا کہ جوگن کے دل میں گاؤں کے امراکی کچھ بھی وقعت نہیں ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ وہ خدا کے نام پر ایک پائی بھی نہیں دیتے لیکن اس کے باوجود خدا کی نعمتوں کے بہت بڑے حصہ دار ہیں۔ ان کے مقابلہ میں غریب فاقے کھینچتے ہیں اور عبادت کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم ان خدا ناشناس لوگوں میں جا کر کیوں نہیں رہتیں تاکہ انہیں سیدھا راستہ دکھا سکو پھر میں نے ذرا مذہبی جوش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ خدا کی عبادت کی افضل ترین صورت ہے۔"

جوگن پر میرے اس وعظ کا بظاہر کچھ اثر نہ ہوا اُس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ کر کہا "میں مطلب سمجھ گئی یعنی چونکہ خدا گنہگاروں کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے جب ہم اُن کی خدمت کرتے ہیں تو گویا خدا کی خدمت کرتے ہیں"

میں نے جواب دیا "ہاں میرا مطلب یہی ہے"

اُس نے بے صبری سے کہا "بیشک خدا انہیں کے ساتھ ہے، ورنہ وہ اس آرام سے زندگی نہ گزار سکیں لیکن مجھے اس سے کیا سروکار ہے، میرا خدا وہاں نہیں۔ میں وہاں اپنے خدا کی عبادت نہیں کرسکتی کیونکہ وہ ان میں نہیں ہے۔ میں وہیں اُس کی تلاش کرتی ہوں جہاں وہ ملتا ہے۔"

اس گفتگو کے دوران میں اُس نے میرے سامنے ادب سے اپنا سر جھکا دیا۔ اُس کا مطلب یہ تھا کہ محض خدا کے ہر جگہ حاضر و ناظر ہونے کا نظریہ ہمیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اور ہمیں خدا کے ہر جگہ موجود ہونے کا خیال اُس وقت تک ناقابلِ فہم معلوم ہوتا ہے جب تک کہ ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ سکیں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جوگن میرے سامنے بحیثیت ایک انسان کے اظہارِ عبودیت نہ کرتی تھی، بلکہ میرے وجود کو اس نے عبادتِ ایزدی کا محض ایک وسیلہ قرار دے رکھا تھا۔ مجھے اس عبادت کے رد و قبول کا اختیار نہ تھا کیونکہ یہ میری نہیں بلکہ خدا کی عبادت تھی۔

دوسری دفعہ جب جوگن آئی اُس نے ایک دفعہ پھر مجھے کتابوں اور کاغذات میں گھرا ہوا دیکھا۔ اس پر اُس نے تنگ آکر کہا "میرے معبود تو کیوں اس مصیبت میں گرفتار رہتا ہے جب میں آتی ہوں تجھے لکھنا پڑھنا

دیکھتی ہوں"۔

میں نے جواب دیا "خدا اپنی ناکارہ مخلوق کو ہر وقت مصروف رکھتا ہے تاکہ وہ فتنہ سے بچی رہے"۔
جوگن نے مجھے بتایا کہ میں نے اُس کے راستہ میں بہت سی روکاوٹیں پیدا کر رکھی ہیں جنہیں وہ برداشت
نہیں کر سکتی۔ اگر وہ میرے پاس آنا چاہے تو نوکر اُسے اوپر آنے سے روکتے ہیں، اگر وہ عبادت کے لئے میرے پاؤں چھونا
چاہے تو اس میں جرابیں حائل ہوتی ہیں، اور جب وہ مجھ سے سیدھی سادھی باتیں کرنا چاہے تو میرا دماغ اُسے الفاظ
کے ایک صحرا میں بھٹکا ہؤا معلوم ہوتا ہے۔
اب کی بار رخصت سے قبل جوگن نے مجھ سے کہا: "میرے معبود آج صبح میں نے تیرے پاؤں اپنے
سینے میں محسوس کئے۔ اُف وہ کتنے سرد تھے اور وہ برہنہ تھے، جرابوں سے ڈھکے ہوئے نہ تھے۔ میں انہیں سر پر رکھ
کر دیر تک عبادت میں مصروف رہی۔ پھر مجھے بتا کہ اس کے بعد اب خود تیرے پاس آنا مجھے کیا ضرور تھا۔ میں کیوں
آئی۔ میرے آقا مجھے سچ سچ بتا کیا یہ محض ایک جنون نہیں ہے"؟
میرے گلدان میں کچھ پھول تھے جوگن کی موجودگی میں مالی ان کو بدلنے کے لئے کچھ تازہ پھول لایا۔ مالی کو پھول
بدلتے ہوئے دیکھ کر وہ پکاری "بس کیا اب یہ پھول بے کار ہو گئے ہیں؟ تو پھر یہ میں لے لیتی ہوں"۔
اُس نے پھولوں کو نہایت نرمی سے اٹھا کر اپنے دونوں ہاتھوں کی کٹوری میں رکھ لیا، اور جھکے ہوئے
سر کے ساتھ ان کو نہایت احترام سے دیکھنے لگی۔ پھر اُس نے نظر اٹھا کر مجھ سے کہا "تم کبھی ان پھولوں کو دیکھتے
نہیں اسی لئے تم ان کو باسی سمجھنے لگتے ہو۔ اگر تم ان کو ذرا بھی غور سے دیکھو تو لکھنے پڑھنے کا شوق نام کو بھی نہ رہے"۔
اُس نے گلدستے کو بہ احتیاط اپنے آنچل سے باندھ لیا اور پھر نہایت تعظیم کے ساتھ اس کو اپنے سر پر رکھ
کر کہنے لگی "اب میں اپنے معبود کو اپنے ساتھ لئے پھروں گی"۔
اس کا یہ طرزِ عمل دیکھ کر مجھے محسوس ہؤا کہ ہمارے کمروں میں جو پھول گلدانوں میں پڑے رہتے ہیں، ہم اُن پر
اپنی وہ محبت آمیز توجہ صرف نہیں کرتے جس کے وہ مستحق ہیں۔ پھول گلدانوں میں پڑے رہتے ہیں، جیسے مدرسہ
کے شریر لڑکے سزا دینے کے لئے ایک قطار میں کھڑے کر دیئے گئے ہوں۔
اسی شام کو جوگن دوبارہ آئی اور بالا خانے پر آ کر میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔
اُس نے کہا "آج صبح جب میں اپنے معبود کی تعریف میں گاتی ہوئی گھر گھر پھر رہی تھی میں نے وہ تمام پھول
بانٹ دیئے۔ ہمارے گاؤں کا مکھیا میری عقیدت مندی پر ہنسا اور کہنے لگا تم کیوں بے سود اُس کی اتنی پرستش کرتی ہو

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ وہ دور و نزدیک بدنام ہے اور لوگ اُسے بہت برا بھلا کہتے ہیں؟ میرے معبود کیا یہ سچ ہے کیا لوگ واقعی تجھ سے نا ملائمت کے ساتھ پیش آتے ہیں؟"

لمحہ بھر کے لئے میں بالکل ساکت و صامت رہ گیا۔ میرے لئے یہ تکلیف دہ علم بالکل نیا تھا کہ مطبع والوں کی سیاہی کے دھبے اس قدر دور تک پہنچ چکے ہیں۔

جوگن نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "کھیا سمجھتا تھا کہ وہ میری پرستش کے شعلہ کو اپنی ایک ہی پھونک سے بجھا دے گا لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ یہ کوئی چھوٹا سا شعلہ نہیں بلکہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔ میرے معبود لوگ تجھے کیوں بُرا بھلا کہتے ہیں؟"

میں نے کہا "اس لئے کہ میں اسی قابل ہوں۔ غالباً میری حرص یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ میں چپکے چپکے لوگوں کے دل چرا لینے کی کوشش کر رہا تھا"

جوگن نے جواب دیا "اب تو نے دیکھ لیا، اُن کے دل کس قدر بے وقعت اور ناکارہ ہیں۔ ان میں زہر بھرا ہوا ہے۔ لیکن اب یہی زہر تجھے حرص سے شفا دے گا"

میں نے جواب دیا "جس شخص کے دل میں حرص موجود ہو اُسے ہر وقت سزا کا خطرہ لگا رہتا ہے یہ حرص خود دشمنوں کو زہر بہم پہنچاتی ہے"

اُس نے کہا "ہمارا مہربان خدا ہمیں اپنے ہاتھ سے سزا دیتا ہے اور زہر کے اثر سے ہمیں محفوظ رکھتا ہے جو شخص آخر تک خدا کی رضا پر صابر رہے وہ ضرور نجات پاتا ہے"

۲

اُس شام جوگن نے مجھے اپنی زندگی کی داستان سنائی۔ شام کے ستارے طلوع ہو کر درختوں کے اوجھل غروب ہو گئے، مگر وہ اپنا قصہ بیان کرتی چلی گئی۔

"میرا شوہر بہت سادہ مزاج ہے۔ بعض لوگ اُسے سادہ لوح کہتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ جو لوگ سادہ طور سے سمجھتے ہیں وہی صحیح سمجھتے ہیں۔ اپنے کاروبار اور گھر کے انتظام میں اُسے خاصی مہارت حاصل تھی۔ چونکہ اس کی ضروریات کم اور اُس کی خواہشات محدود تھیں اس لئے وہ اپنے چند خاص خاص فرائض کو نہایت اچھی طرح سے انجام دے لیتا تھا۔ دوسرے امور میں وہ نہ دخل دیتا تھا اور نہ اُن پر غور کرتا تھا۔

"ہماری شادی کے بعد میرے شوہر کے والدین زیادہ مدت تک زندہ نہ رہے، اور ہم تنہا رہ گئے لیکن

میرا شوہر ہمیشہ کسی اور کا مطیع ہو کر رہنا چاہتا تھا اور میں شرم سے یہ اقرار کرتی ہوں کہ وہ مجھے نہایت احترام کی نظر سے دیکھتا تھا اور مجھے اپنے مقابلہ میں بہت ارفع و اعلیٰ سمجھتا تھا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگرچہ باتیں کرنے میں مجھے زیادہ ملکہ حاصل تھا مگر معاملات کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت اس میں مجھ سے کہیں زیادہ تھی۔

"اس کے دل میں اپنے گرو ٹھاکر کی بے انتہا عزت تھی۔ بلاشبہ یہ صرف عزت ہی نہ تھی بلکہ محبت تھی اور ایسی محبت جیسی اُسے تھی دنیا میں شاذ ہوتی ہے۔

"گرو ٹھاکر عمر میں میرے شوہر سے چھوٹا تھا۔ اُف! وہ کتنا خوبصورت تھا۔

"میرا شوہر لڑکپن میں اُس کے ساتھ مل کر کھیلتا رہا تھا۔ اس زمانے سے لے کر اب تک میرے شوہر کا دل اور جان اپنے عہدِ طفلی کے اس دوست کی محبت سے سرشار تھے۔ ٹھاکر میرے شوہر کی سادہ دلی سے واقف تھا اور اسے خوب ستایا کرتا تھا۔ وہ اور اُس کے ساتھی اپنی تفریح کے لئے میرے شوہر کا مذاق اڑایا کرتے تھے لیکن وہ یہ سب کچھ برداشت کر لیتا تھا۔

پندرہ برس کی عمر میں خدا نے مجھے بچہ دیا۔ میں اتنی کمسن تھی کہ مجھے اس کی نگہداشت کے متعلق بھی کچھ تجربہ نہ تھا۔ مجھے باتیں کرنے کا بہت شوق تھا۔ میں گاؤں میں جا کر گھنٹوں اپنی سہیلیوں کے پاس بیٹھی رہتی تھی، اور اگر مجھے اپنے بچے کی خاطر کبھی گھر پر ٹھہرنا پڑتا تھا تو میں اس سے بہت تنگ آ جاتی تھی۔ آہ میرا بالک دیوتا میرے پاس آیا لیکن میں نے اس کے کھلونے تیار نہ رکھے۔ وہ ماں کے آغوش میں آیا لیکن ماں کا دل ابھی کہیں پیچھے تھا۔ آخر وہ ناراض ہو کر مجھ سے رخصت ہو گیا، اور اب میں نے اُس کی تلاش میں دنیا کا چپّہ چپّہ چھان مارا ہے لیکن اُسے کہیں نہیں پاتی۔

"بچہ باپ کی آنکھ کا تارا تھا۔ میری غفلت اور بے پروائی پر میرے شوہر کا دل دکھتا تھا لیکن خدا نے اُسے بے زبان بنایا تھا۔ اُس نے کبھی اپنے دکھ کا اظہار نہ کیا۔ تعجب یہ ہے کہ میری بے توجہی کے باوجود بچّے کے دل میں میری محبت سب سے زیادہ تھی۔ اُس کے دل میں یہ خوف سمایا ہوا معلوم ہوتا تھا کہ میں کسی دن اس کو چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ جب میں اس کے پاس کبھی بیٹھی ہوئی ہوتی تھی، وہ نہایت اضطراب انگیز نظروں سے مجھے دیکھتا تھا۔ میں بہت کم اس کے پاس رہتی تھی، اس لئے میرے پاس رہنے کی خواہش اس کے دل میں اور بھی زیادہ تھی۔ جب میں دریا پر نہانے جاتی، وہ پیچ و تاب کھاتا اور میرے ساتھ جانے کے لئے اپنی باہیں پھیلا دیتا تھا۔ مگر نہانے کا گھاٹ میری سہیلیوں کے ملنے کی جگہ تھی، وہاں میں کندھوں پر بچّے کا بوجھ لاد کر نہ جاتا

چاہتی تھی۔

"یہ اگست کی ایک صبح کا واقعہ ہے۔ آسمان پر گہرے سیاہ بادل چھا رہے تھے۔ میں نے بچے کو خادمہ کے سپرد کر کے دریا کی راہ لی۔ بچہ میرے جانے پر رونے لگا۔

"جس وقت میں گھاٹ پر پہنچی وہاں کوئی اور موجود نہ تھا۔ مجھے تیرنے کی مشق گاؤں کی سب عورتوں سے زیادہ تھی۔ بارشوں کی کثرت کی وجہ سے دریا لبالب بھرا ہوا تھا۔ میں تیرتی ہوئی دریا کے وسط میں چلی گئی۔

"اس وقت مجھے کنارے پر سے آواز آئی، اماں! میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میرا بچہ گھاٹ کی سیڑھیوں پر مجھے پکارتا ہوا بڑھا آ رہا تھا۔ میں نے چلا کر اُسے ٹھہرنے کو کہا مگر وہ ہنستا اور مجھے پکارتا ہوا بڑھا چلا آیا۔ میرے ہاتھ پاؤں خوف سے اینٹھ گئے اور دنیا میری نگاہ میں اندھیر ہو گئی۔ شدتِ ہراس سے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن آہ جب دوبارہ میں نے آنکھیں کھولیں، گھاٹ کی پھسلنی سیڑھیوں پر میرے بچے کے قہقہے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکے تھے۔ میں کنارے پر پہنچی اور بچے کو پانی میں سے نکال کر گود میں لیا۔ وہ ہمیشہ میری گود میں آنے کے لئے التجائیں کیا کرتا تھا۔ اب میں اس کو گود میں لئے ہوئے تھی لیکن وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پہلے کی طرح اماں! نہیں کہہ سکتا تھا۔ اُس کی زبان ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکی تھی۔

"میرا بچہ، میرا دیوتا آیا، لیکن میں نے اس کی پروا نہ کی۔ میں ہمیشہ اپنے دیوتا کو رلاتی رہی۔ اس وقت مجھے اپنی یہ تمام بے توجہی یاد آئی، اور میرے دل کو صدمے پر صدمہ محسوس ہونے لگا۔ جب میرا بچہ میرے پاس تھا میں اسے تنہا چھوڑ جاتی تھی، میں اسے اپنے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیتی تھی۔ اب اس کے مرنے کے بعد اس کی یاد ہر وقت میرے دل میں رہتی ہے اور مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑتی۔

"میرے شوہر کو جس قدر صدمہ ہوا اُس کا حال خدا کو معلوم ہے۔ اگر وہ مجھے میرے اس جرم کی سزا ہی دے دیتا تو یہ ہم دونوں کے لئے بہتر ہوتا۔ لیکن وہ ہر بڑی سے بڑی مصیبت کو صبر و رضا کے ساتھ برداشت کر لینے کے سوا اور کچھ نہ جانتا تھا۔ اس کے منہ سے کبھی میں نے کوئی درشت کلمہ نہ سنا تھا۔

جن دنوں میں رنج و غم سے تقریباً دیوانی ہو رہی تھی اگرو ٹھاکر بنارس سے واپس آیا۔ ابتدا میں میرے شوہر اور گرو ٹھاکر کے تعلقات طفلانہ دوستی تک محدود تھے۔ اب اُس کے علم و فضل اور صدق و صفا کو دیکھ کر میرے شوہر کے دل میں اُس کا بے انتہا احترام پیدا ہو گیا۔ میرا شوہر گرو ٹھاکر سے اتنا مرعوب تھا کہ وہ اس کے سامنے بات کرتے ہوئے بھی جھجکتا تھا۔

"اُس نے گرو ٹھاکر سے درخواست کی کہ وہ مجھے تسلی دینے کی کوشش کرے۔ اس پر گرو ٹھاکر مجھے مقدس کتابیں پڑھ کر سنانے لگا۔ وہ ساتھ ساتھ اُن کے مفہوم کی واضح طور پر تشریح بھی کرتا جاتا تھا، لیکن میرا خیال ہے کہ اس تعلیم کا میرے دل پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ اُن الفاظ کی میرے دل میں اگر کوئی قدر تھی تو وہ محض اس آواز کے طفیل تھی جو ان کو ادا کرتی تھی۔ خدا آسمانی شراب کو انسان کے دل کی گہرائیوں میں چھپا کر رکھتا ہے اور ہم اسے انسانی آواز کے ذریعہ سے پیتے ہیں۔

"میرے شوہر کو گرو سے جو محبت و عقیدت تھی وہ ہمارے گھر کے ذرہ ذرہ میں بس رہی تھی۔ میرے دل میں بھی یہ عقیدت پیدا ہوئی اور میں مطمئن ہو گئی۔ میں نے اپنے خدا کو اس گرو کی صورت میں دیکھا۔ وہ ہر صبح ناشتا کرنے کے لئے ہمارے گھر پر آتا تھا۔ جاگنے پر ہر صبح جو سب سے پہلا خیال میرے دل میں آتا وہ اس کے ناشتے کے متعلق ہوتا تھا اور اسے میں خدا کا ایک پاکیزہ انعام سمجھتی تھی۔ جب میں اس کے کھانے کی چیزیں تیار کرتی میرے ہاتھوں کی انگلیاں بھی گویا مسرت سے گانے لگتی تھیں۔

جب میرے شوہر نے دیکھا کہ مجھے اُس کے گرو سے اتنی عقیدت ہے تو اُس کے دل میں میرا احترام اور بھی بڑھ گیا۔ جب اُس کو یہ معلوم ہوا کہ اُس کا گرو مجھے نہایت شوق سے مقدس کتابیں پڑھاتا ہے تو اسے اس بات سے نہایت مسرت ہوئی۔ اُس نے خیال کیا کہ گرو کے دل میں اپنی نااہلی کے باعث جو جگہ میں خود حاصل نہ کر سکا تھا وہ میری ذہین بیوی نے حاصل کر لی ہے۔

"اس طرح اور پانچ سال نہایت مسرت سے کٹ گئے اور میری باقی زندگی بھی اسی طرح گزر جاتی، لیکن پردے میں چپکے چپکے کہیں چوری ہو رہی تھی۔ میں خود اس چوری سے واقف نہ ہو سکی لیکن میرے دل کے خدا نے اس کا سراغ نکال لیا۔ پھر ایک دن ایسا آیا جب ایک لمحہ میں ہماری زندگی کی بساط بالکل الٹ گئی۔

"یہ برسات کی ایک صبح کا واقعہ ہے۔ میں دریا پر نہا کر گھر کو واپس آ رہی تھی اور میرے بھیگے ہوئے کپڑے میرے جسم کے ساتھ چمٹ رہے تھے۔ سڑک کے موڑ پر آم کے درخت کے نیچے مجھے اپنا گرو ٹھاکر ملا۔ وہ کندھے پر تولیہ ڈالے سنسکرت کا ایک گیت گاتا ہوا نہانے کو جا رہا تھا۔ میں بھیگے ہوئے کپڑوں کے ساتھ اُس سے دوچار ہوتی ہوئی شرماتی تھی، اس لئے میں نے نظر بچا کر جلدی سے گزر جانا چاہا، لیکن اُس نے میرا نام لے کر مجھے بلایا۔ میں آنکھیں جھکائے شرم سے سمٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے بغور مجھے دیکھا اور پھر کہا "تمہارا جسم کتنا خوبصورت ہے!

"مجھے یوں معلوم ہؤا کہ آم کے درخت کی شاخوں میں دنیا جہاں کے پرندے نغمہ سنج ہونے لگے ہیں اور میدان کی جھاڑیاں پھولوں کے نور سے جگمگا اُٹھی ہیں۔ آسمان زمین اور اُس کی ہر چیز مجھے ایک کیف آور نشاط میں ڈوبی ہوئی معلوم ہونے لگی۔

"مجھے یہ معلوم نہیں کہ میں گھر کس طرح پہنچی۔ صرف اتنا یاد ہے کہ میں گھر میں داخل ہوتے ہی عبادت کے کمرے میں چلی گئی لیکن کمرہ مجھے خالی معلوم ہوتا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے صرف نور کے وہی سنہرے ستارے رقص کر رہے تھے جو دریا پر سے گھر کو آتے ہوئے اُس آم کے درخت کے نیچے مجھے لرزتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

"گرو ٹھاکر جب اُس دن ناشتے کے لئے آیا تو اُس نے میرے شوہر سے میرا پتا پوچھا۔ میرے شوہر نے میری تلاش کی لیکن میں اُسے کہیں نہ مل سکی۔

"آہ میرے لئے اب زمین و آسمان کا نقشہ بدل چکا تھا۔ میں نے مایوسی میں اپنے خدا کو بلایا لیکن اُس نے اپنی نگاہ بدستور میری طرف سے پھرائے رکھی۔

"دن خدا جانے کس طرح گزرا۔ رات کو مجھے اپنے شوہر سے ملنا تھا۔ رات کے سکوت اور تاریکی میں میرے شوہر کا دماغ چمک اُٹھتا ہے۔ اندھیرے میں اس کی گفتگو سن کر میں ہمیشہ اُس کے فہم و فراست پر ششدر رہ جایا کرتی تھی۔

بعض اوقات رات کو مجھے گھر کے کام کاج سے دیر تک فرصت نہ ملتی تھی۔ اور میرا شوہر بستر پر سونے کے بجائے میرے انتظار میں فرش پر بیٹھا رہتا تھا۔ ایسے موقعوں پر ہماری گفتگو کا موضوع بالعموم ہمارا گرو ہؤا کرتا تھا۔

"اُس رات جب میں اپنے کمرے میں آئی وقت بہت گزر چکا تھا۔ میرا شوہر فرش پر سو رہا تھا۔ میں اس کے آرام میں خلل انداز ہوئے بغیر فرش پر اُس کے قدموں میں لیٹ گئی۔ میرے سر کا رخ میرے شوہر کی طرف تھا۔ ایک دفعہ سوتے ہوئے اُس نے اپنے پاؤں پھیلائے تو وہ میرے سینے پر لگے۔ یہ اس کا آخری عطیہ تھا۔

"صبح اپنے شوہر کے بیدار ہونے سے پہلے ہی اُٹھ کر میں اُس کے پاس بیٹھ گئی۔ کھڑکی میں سے رات کے سیاہ دامن پر شفقِ صبح کی سرخی پھیلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

"میں نے جھک کر اپنی پیشانی سے اپنے شوہر کے پاؤں چھوئے۔ وہ اس طرح چونک کر اُٹھا، گویا وہ کسی خواب سے بیدار ہؤا ہے۔ اُس نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

"میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ میں دنیا کو ترک کر دوں گی۔ میں آیندہ تمہارے پاس نہیں رہ سکتی۔ مجھے تمہارا

گھر چھوڑنا پڑے گا!

"شاید میرا شوہر یہ سمجھتا تھا کہ وہ اب بھی خواب دیکھ رہا ہے۔ اس لئے اُس نے جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہا
"میں نے پھر درد میں ڈوبی ہوئی آواز سے کہا " آہ میری بات سنو، اور اس کو سمجھو لیتمیں اب دوسری شادی کر لینی چاہیئے۔ میرے لئے رخصت ہو جانا ضروری ہے"

"میرے شوہر نے کہا یہ کیا دیوانوں کی سی باتیں کر رہی ہو تمہیں کس نے دنیا ترک کرنے کو کہا ہے؟"
"میں نے جواب دیا "میرے گرو ٹھاکر نے"

"میرا شوہر کچھ حواس باختہ سا ہو گیا۔ اُس نے چلا کر کہا "گرو ٹھاکر نے! اُس نے کب تمہیں یہ نصیحت کی"
"میں نے کہا "کل صبح جب میں دریا پر سے آتی ہوئی راہ میں اُس سے ملی"

"اس کی آواز ذرا کانپ گئی۔ پھر اُس نے میرے چہرے پر نظر گاڑ کر پوچھا "اُس نے تمہیں اس قسم کا حکم کیوں دیا؟"
"میں نے جواب دیا "مجھے معلوم نہیں اسی سے پوچھو۔ اگر وہ بتا سکا تو خود اُسی سے تمہیں یہ بات معلوم ہو جائے گی"
"میرے شوہر نے کہا "دنیا میں رہ کر بھی انسان دنیا کو ترک کر سکتا ہے۔ تمہارے لئے میرا گھر چھوڑنا ضروری نہیں۔ میں اپنے گرو سے اس کے متعلق ذکر کروں گا"

"میں نے کہا "تمہارا گرو تمہاری درخواست منظور کرے تو کرے، مگر میرا دل کبھی اس پر آمادہ نہیں ہو سکتا میرے لئے تمہارا گھر چھوڑنا ضروری ہے۔ اب دُنیا میرے لئے باقی نہیں رہی"

"میرا شوہر خاموش رہا اور ہم اندھیرے میں فرش پر بیٹھے رہے جب دن کی روشنی پھیل گئی تو اُس نے مجھ سے کہا "چلو ہم دونوں گرو کے پاس چلیں"
"میں نے اپنے ہاتھ باندھ کر کہا "میں اب کبھی اس سے نہیں ملوں گی"

میرے شوہر نے غور سے میرے چہرہ کو دیکھا میں نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ اُس کے بعد اُس نے کچھ نہ کہا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح میرے دل کے حال سے واقف ہو گیا ہے اور اُس نے میری بات سمجھ لی ہے۔

"میری دنیا میں صرف دو متنفس تھے جن کو مجھ سے حقیقی محبت تھی، یعنی میرا بچہ اور میرا شوہر۔ یہ محبت میرا خدا تھی، اس لئے یہ کسی قسم کی ناراستی کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ ان دونوں میں سے ایک نے مجھے چھوڑ دیا اور دوسرے کو خود میں نے چھوڑ دیا۔ اب میرے لئے راستی سے لو لگانے کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا"

پھر اُس نے میرے قدموں کی خاک کو چھوا، اٹھی، جھک کر آداب بجا لائی اور رخصت ہو گئی۔

(ٹیگور)

حامد علی خاں

مرے دل کو

مرے دل کو جب سے خبر ملی کہ کسی کو مجھ سے بھی پیار ہے
مری زندگی کی کلی کھلی مری روح باغ و بہار ہے

مرے باغِ زیست میں گلفشاں ہؤا جب سے عشق کا باغباں
مرے ہر نفس میں ہے بُوئے گل مرا نغمہ بانگِ ہزار ہے

مری آرزو ہے فقط یہی مری جاں مجھے بھی جگہ ملے
ترے حسن و عشق کی سرزمیں میں سمندروں کے جو پار ہے

مری راگنی کی ہے تان تُو مری شاعری کی ہے جان تُو
یہ وہ پھول باغِ حیات کا ہے جسے خزاں بھی بہار ہے

تجھے کچھ خبر بھی ہے جانِ من کہ فلک پہ تاروں کی بزم میں
تری حسرتوں کے جو کچھ شرر ہیں مرا بھی اُن میں شمار ہے

مجھے ضبطِ غم کا سبق پڑھا مجھے حلم و صبر کی رہ دکھا
مرے دل میں درد ہے روز و شب مری جان زار و نزار ہے

بہار

وہ دونوں ملّاح

وہ دونوں ملاح جن کے شباب کی دنیا کو عشقِ ناکام کی افسردگیوں نے برباد کر ڈالا، اور جن کی جوانی کی رونقیں حسن جفاشعار کی بے اعتنائیوں سے مرجھا کر رہ گئیں کبھی دوست تھے۔ اس قدر گہرے دوست کہ ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے۔ مگر کارخانۂ قدرت کی انقلاب آفرینیاں یکسانیت کی دشمن ہیں اور زمانے کے نشیب و فراز کا خزانہ تبدیلیوں سے معمور ہے۔ چنانچہ واقعات نے انہیں ایک دوسرے سے بیگانہ کر دیا۔ وہی دل جو کبھی محبت اور الفت سے لبریز تھے نفرت اور حقارت سے بھر گئے، اور دونوں نے ارادہ کر لیا کہ جیتے جی ایک دوسرے سے کبھی نہ ملیں گے۔

برسوں کے تعلقات کو فراموش کر کے انہوں نے دوستی کو دشمنی سے بدل لیا، اور غلطی سے اپنی زندگی کی ناکامیوں کا ایک دوسرے کو ذمہ دار سمجھ کر الگ ہو گئے۔ اُن کی محبت کا آغاز بچپن کی سادگیوں میں ہوا اور شباب کی رقیبانہ شورشوں نے اُس کا خاتمہ کر دیا۔

یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب وہ شیریں کے ساتھ دریا کے کنارے پر خشک اور زرریتوں میں کھیلا کرتے اور بچپن کی تمام سادگیوں کے ساتھ اُس کے حسنِ معصوم کی پرستش کیا کرتے تھے۔ صبح جب ملاح مسافروں کو پار اتارنے کے لئے دریا پر آتے تو بچے بھی اپنے بزرگوں کے ہمراہ آجاتے، دن بھر بے فکری کی کھیلوں سے دل بہلاتے اور شام کو جب رات کی تاریکی دنیا کے کاروبار پر آرام اور سکون کے پردے ڈال رہی ہوتی تو ایک شیریں کا دایاں ہاتھ تھام لیتا دوسرا بایاں اور اُسے بیچ میں لئے ہوئے ہنستے ہنساتے گھر لوٹ آتے۔ یہ اُن کا روز کا معمول تھا۔ اُن کے ننھے سے دل جو انسانی زندگی کی تلخیوں سے ناآشنا تھے نہیں جانتے تھے کہ زندگی کا یہ کھیل جس کی ابتدا دریا کے کنارے کی خاموشیوں میں ہوئی کن ہنگاموں پر ختم ہونے والا ہے۔ انہوں نے اپنی محبت کی مختصر سی زندگی ایک ہی وقت اور ایک ہی جگہ شروع کی مگر جب رقابت کی ہنگامہ خیزیوں نے جذباتِ خفتہ کو بیدار کر دیا تو وہ ایک دوسرے سے پرے ہٹتے گئے یہاں تک کہ بچپن کی محبتیں عداوتوں میں تبدیل ہو گئیں اور وہ ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو گئے۔ رقابت کے جوش نے انہیں اندھا بنا دیا اور اُن میں سے ہر ایک نے شیریں کو اپنا بنا لینا چاہا، مگر اُس کے صلح پسند حسن نے کسی کو قبول نہ کیا اور اُن کی باہمی عداوت کی ہنگامہ آرائیوں سے بیزار ہو کر انکار کر دیا۔ اُن بدبخت نوجوانوں کے دل ٹوٹ گئے۔ سنسان

راتیں اُن کے شور وشیون سے آباد ہوگئیں۔ پامال شدہ جذبات کی کش مکش پیشانی کی شکنوں میں تبدیل ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ناکامی کی اندوہناکیوں نے ان کو وحشی بنادیا اور لوگ اُن سے خوف کھانے لگے لیکن دنیا کے ہر ہنگامے کا انجام سکوت ہے۔ اور ہر شورش آخر کار خاموشی پر ختم ہوجاتی ہے۔ وقت کے سکوت پرور ہاتھوں نے ہوتے ہوتے جذبات کی تلاطم خیزیوں کو فرو کردیا اور انہوں نے خاموشی اختیار کرلی۔ اس قدر گہری خاموشی کہ صرف سرد آہیں ہی اُس کی گہرائی کو معلوم کرسکتی تھیں۔ اور یہ اس طرح ہؤا کہ شیریں کی شادی ہو گئی۔ اب وہ قطعی مایوس ہوگئے تو انہوں نے اپنی تمناؤں کو آنسوؤں کے سیلاب میں بہادیا اور اپنے آپ کو ناکامی کی تلخیوں کے حوالے کرکے تنہائی کی زندگی بسر کرنے کا عہد کرلیا۔ دن گزرتے گئے اور آدم کے ان غمگین فرزندوں کے مقابلے میں شیریں بامراد اور شادکام ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اُس نے انہیں بالکل فراموش کردیا مگر بدقسمت ملاحوں کے دل اُس کی یاد سے آباد تھے اور وہ اکثر راتوں کو جب دنیا کی رونقیں محوِ خواب ہوتیں اپنی ناکامی پر روتے اور مایوس آرزوؤں کا ماتم کرتے۔ کبھی کبھی اتفاق ہی تو ہے، اگر ان میں سے کوئی شیریں کو دیکھ پاتا تو اُس کا زخمی دل درد سے بیتاب ہوجاتا اور اس کی کشتی کئی دن تک ساحلِ دریا پر بے کار پڑی رہتی۔ دوسرے کو نہ جانے اس کا کس طرح سے علم ہوجاتا اور وہ دل ہی دل میں اپنے ناکام رقیب کی اتفاقی مگر عارضی کامیابی پر کڑھتا ——— کڑھتا رہتا حتیٰ کہ اس کا بدبخت ساتھی اپنی روزانہ مصروفیتوں میں آشامل ہوتا اور دونوں اپنی تلخ اور خاموش زندگی کی افسردہ یکسانیتوں میں محو ہوجاتے۔

۲

ایک سال دریا کے بلاخیز سیلاب نے ساحل کو پانیوں میں گم کردیا، اور لہروں کی بلاانگیز روانیاں اردگرد کی وسعتوں پر قابض ہوگئیں۔ تناور درخت مقابلے کی تاب نہ لاکر موجوں کے سامنے جھک گئے، اور پانی کی طغیانیوں نے زمین کی پستیوں کو بلندیوں سے ملادیا۔ انسانی آبادیاں اپنی کمزوریوں کے اعتراف میں سربسجود ہوگئیں، اور فانی انسان زر وسیم کی کاہشوں سے آزاد ہوکر بے بسی کے عالم میں بہنے لگے۔ اس وقت جب کہ جان کے خطرے نے دلوں کو محبت اور نفرت کے جذبات سے یکسر خالی کررکھا تھا وہ دونوں ملاح اپنی اپنی کشتی پر سوار ایک ساتھ پانی کے زوروں کو چیرتے ہوئے بڑھے کہ اپنے بدنصیب ہم جنسوں کو دریا کے قہر وغضب سے چھڑائیں مگر حسبِ معمول خاموش تھے۔ برسوں کے بعد ایک مشترکہ مصیبت نے دونوں کو اکٹھا کردیا تھا اور وہ ایک ہی مقصد کے ماتحت اپنی کشتیوں کو اِدھر سے اُدھر لئے پھرتے تھے۔ مگر پانی کی غضبناک روانی ان کی تمام سعی وکوشش کو

بے کار بنا دیتی تھی۔ انسان جس کے اقتدار کے سامنے خشکی کی فراخی سمٹ کر تنگیوں میں بدل جاتی ہے اور جس کی ہمہ گیر قوتیں سطحِ زمین کے قدرتی نشیب و فراز کو اپنی صناعیوں کے زور سے مغلوب کر لیتی ہیں، چیختے چلاتے بہتے چلے جا رہے تھے۔ اور کوئی نہ تھا کہ اُن ڈوبتے ہوئے جسموں کو سہارا دے۔ پانی کی طوفان زا بلندیوں کے سامنے انسانی تگ و دو ناکارہ اور لاچار تھی، اور طغیانیوں کا زور لحظہ بلحظہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جب کہ مایوسین محبت کی پیہم کوششیں موجوں سے ٹکرا ٹکرا کر رہ جاتی تھیں انہوں نے ایک چیخ کی آواز سنی۔ دونوں تڑپ اُٹھے یہ بدنصیب شیریں کی چیخ تھی۔ اپنی جانوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اور گویا اُن میں سے ہر ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتا ہے انہوں نے کشتیوں کو پانی کے حوالے کیا اور دریا میں کود پڑے۔ موجیں اُن سے لپٹ گئیں۔ اور لہروں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ سیلاب کی تندیوں نے بہتیرا زور مارا اور طغیانی کی تیزیوں نے ہر چند انہیں پیٹنے کی کوشش کی مگر وہ ہاتھ مارتے ہوئے بڑھتے چلے گئے، بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ شیریں کے پاس پہنچ گئے۔ بچپن میں جس طرح ایک اُس کے داہنے ہاتھ کو تھام لیتا تھا اور دوسرا بائیں کو اسی طرح سے ایک نے اُسے دائیں بازو سے پکڑ لیا اور دوسرے نے بائیں سے اور چپ چاپ تیرتے ہوئے واپس لوٹے۔ سیلاب ترقی پر تھا اور کنارہ لحظہ بلحظہ دور ہوتا چلا جا رہا تھا، مگر شیریں کو زندہ اور سلامت دیکھنے کی آرزو فاصلے کی درازی سے بے پروا اور پانیوں کی تندی سے بے نیاز تھی۔ طغیانی کی پُرخروش لہروں نے ہر چند چاہا کہ اُن حسرت نصیب ملاحوں کو اور اُن کی قیمتی امانت کو بہا کر لے جائے مگر اُن کے تنومند بازوؤں نے انہیں مار ہٹایا اور وہ شیریں کو بیچ میں لئے آخر خشکی پر پہنچ گئے۔ وہاں ایک کھیت کے کنارے پر انہوں نے پریشان حال شیریں کو لٹا دیا۔ ایک اُس کے دائیں طرف تھا اور دوسرا بائیں جانب مگر دونوں سر جھکائے چپ چاپ حسرت سے اُس کی طرف تک رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد جب اُسے ہوش آیا اور اُس نے آنکھیں کھولیں تو بچپن کے پرستاروں کو موجود پایا۔ اُس کے رخساروں پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ اُس نے پہلے ایک کی طرف دیکھا پھر دوسرے کی جانب۔ دونوں ملاحوں کی آنکھیں دوچار ہوئیں، اور وہ نہ جانے کیوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور رونے لگے۔ رونے لگے اور حسنِ محبوب کے حضور میں سر جھکا کر آنسوؤں کی تمام گرمیوں کے ساتھ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی تلخ زندگیوں کو باہمی عداوت کی تلخیوں سے اور زیادہ تلخ نہیں بنائیں گے۔

امیر حسن ناز

غزلیات

(۱)

رہتا نہ کوئی طائرِ آزاد گلستاں میں — تسخیر اگر ہوتی صیاد کے امکاں میں

دنیا میں نہ پھر ہوتی ایسی کوئی آبادی — گھر انکا اگر ہوتا اس میرے دلِ ویراں میں

قاتل کے تبسم میں جو ہے نمک افشانی — پیدا نہیں ہو سکتی وہ بات نمکداں میں

میں طوق و سلاسل کا اسوقت گلا کرتا — تکلیف اگر ہوتی مجھکو کوئی زنداں میں

اسکے بھی تو وحشت میں ہی قیس اڑے پرزے — ہیں دامنِ صحرا کو ٹانکوں جو گریباں میں

کیا میں نے برائی کی کیوں میرے بنے دشمن — منہ اپنا ذرا ڈالیں وہ اپنے گریباں میں

سچ پوچھو تو پھر انسان حیوان سے بدتر ہے
اخلاق وہ جوہر ہے یہ گر نہ ہو انساں میں

حبیب السنا، حبیب رامپوری

(۲)

وہاں ہوں اب جہاں سیرِ ہفت افلاک کرتا ہوں — نگاہِ حسن کی عاشق نوازی و زمیں کیا ہو

فنا ہونا بقدرِ سعی ہے اپنے تجسس میں — اگر معلوم ہو جاتا کہ میں اپنی تمنا ہوں

نگاہیں پھر کے آتی ہی نہیں اللہ ری محویت — کوئی کانوں میں کہتا ہے کہ میں گرمِ تماشا ہوں

مری ہستی بھی کیا ہستی ہے جو مٹ ہی نہیں سکتی
جو گھٹ جاؤں تو قطرہ ہوں جو بڑھ جاؤں تو دریا ہوں

محمد مقصود علی شراد

(۳)

یہ مجھ کو جگہ دی ہے تقدیر نے مدفن میں — پیوند لگایا ہے یا دشت کے دامن میں

اے ہم قفسو وہ بھی اللہ کے بندے ہیں — اٹھتے ہیں نشیمن سے مٹتے ہیں نشیمن میں

قربانِ چمن اس کی کیا رنگِ جہاں بدلا — وہ روتے ہیں مدفن پر ہم سوتے ہیں مدفن میں

اچھے ہیں قفس والے دو چار تو ہیں یکجا — اک ہم ہیں کہ جو تنہا بیٹھے ہیں نشیمن میں

دو طور جلاتے ہیں اس برقِ تجلی نے
اک پہلوئے زیبا میں اک وادیٔ ایمن میں

زیبا ردولوی

(۴)

پوشیدہ مرے اشک میں ہے سوزِ جگر بھی — اس قطرہ کے دامن میں تڑپتے ہیں شرر بھی

تنہا نہیں آئی ہے مری شامِ جوانی — ساتھ اپنے لگا لائی ہے پیری کی سحر بھی

اے کھیلنے والے مرے جذباتِ حزیں سے — اس کھیل کے انجام کی ہے تجھ کو خبر بھی

باقی ہے اثر کچھ تو مرے نالۂ شب کا — ہیں درد میں ڈوبے ہوئے نغماتِ سحر بھی

اس وہم میں ہر دشت سے کرتا ہوں محبت — شاید ہو اسی میں مرا اجڑا ہوا گھر بھی

جلتا ہے عدو رشک سے میں تیری ضیا سے
اک آتشِ جاں سوز اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

اظہر امرتسری

(۵)

حال رہتا ہے شب و روز پریشاں دل کا — آرزو نکلی نہ نکلا کوئی ارماں دل کا

زندگی شکل ہے اک بے سر و سامانی کی — موت کہتے ہیں جسے ہے سر و ساماں دل کا

دیکھ لیتا ہے جسے بس یہ مچل جاتا ہے — کچھ ٹھکانا ہی نہیں ہے مرے ناداں دل کا

اشکباری کے سوا کام نہیں آنکھوں کو — محشرستانِ محبت ہے یہ طوفاں دل کا

اندرجیت شرما

محفلِ ادب

مرزا نوشہ غالب کا آخری خط

دیگر از خویشتم خبر نبود تکلف برطرف — ایں قدر دانم کہ غالب نامِ یارے داشتم

ہجومِ غم سے فراغ نہیں۔ عبارت آرائی کا دماغ نہیں اگرچہ گوشہ نشین و خانماں خراب ہوں لیکن بحسبِ ابطاءِ ازلی کثیر الاحباب ہوں۔ اطراف و جوانب سے خطوط آتے ہیں ادھر سے بھی ان کے جواب لکھے جاتے ہیں جو اشعار واسطے اصلاح کے آتے ہیں بعدِ اصلاح بھیج دیئے جاتے ہیں۔

ان صاحبوں میں سے اکثر ایسے ہیں کہ نہ میں نے انہیں نہ انہوں نے مجھے دیکھا ہے۔ محبت دلی و نسبت روحانی سہی لیکن صاحبانِ بلادِ دور دست کیا جانیں میرا حال کیا ہے۔ ہفتاد و یک سالہ عمر کی کتاب میں سے فصلِ آخر کی حقیقت یہ ہے کہ دس پندرہ برس سے ضعفِ سامعہ اور قلتِ اشتہا میں مبتلا ہوا اور یہ دونوں علتیں روز افزوں رہیں حسِ حافظہ کا بطلان علاوہ، جوں جوں عمر بڑھتی گئی یہ امراض بھی بڑھتے گئے۔ قصہ مختصر اب سامعہ کا حال یہ ہے کہ ایک تختہ کاغذ کا مع دوات، قلم سامنے دھرا رہتا ہے، جو دوست آتے ہیں پرسشِ مزاج کے سوا اور کچھ کہنا ہوتا ہے وہ لکھ دیتے ہیں میں ان کی تحریر کا جواب زبانی دیتا ہوں۔ غذا کی حقیقت یہ ہے کہ صبح کو آٹھ دس بادام کا شیرہ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا پانی، دو گھڑی دن رہے دو یا تین تلے ہوئے کباب۔ نسیان حد سے گذر گیا، رعشہ، دوران و ضعفِ بصر یہ یارانِ نو آمدہ سے ہیں۔ میر تقی مرحوم کا مطلع وردِ زبان ہے۔

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم — القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

خط بکس میں یا کتاب میں رکھ دیتا ہوں اور بھول جاتا ہوں آگے بیٹھے لیٹے خط لکھتا تھا اب رعشہ یوں بھی نہیں لکھنے دیتا۔

صاحبِ اکمل الاخبار اور صاحبِ اشرف الاخبار نے جو ہمیشہ مجھ سے ملتے جلتے رہتے ہیں اور میرا حال جانتے ہیں از روئے مشاہدہ میرے کلام کی تصدیق کر کے اسی اعتذار کو اپنے اخبار میں چھاپا ہے۔ کل دیگر صاحبانِ مطبع اور راقمانِ اخبار اگر اسی عبارت کو اپنے اخبار کے اوراق میں درج کریں گے تو فقیر ان کا احسان مند ہوگا۔ اس نگارش کی شہرت سے مقصود یہ ہے کہ میرے احباب میرے حال سے اطلاع پائیں اگر خط کا جواب یا اصلاحی غزل دیر میں

پہنچے تو تقاضا اور اگر نہ پہنچے تو شکایت نہ فرمائیں۔ میں دوستوں کی خدمت گذاری میں کبھی قاصر نہیں رہا اور خوشی خوشنودی سے کام کرتا رہا جب بالکل نکما ہوگیا نہ حواس باقی نہ طاقت، پھر اب کیا کروں بقول خواجہ وزیر ع

میں وفا کرتا ہوں لیکن دل وفا کرتا نہیں

اگر کسی کو میری طرف سے رنج و ملال ہو تو خالصاً للہ معاف فرمائیں۔ اگر جوان ہوتا تو احباب سے دعائے صحت کا طلبگار ہوتا، اب جو بوڑھا ہوں تو دعائے مغفرت کا خواہاں ہوں۔ غالب

"اردو"

شب ماہ

الاماں کیا چاندنی چھٹکی ہوئی ہے دشت میں — رقص کے قابل ہے اے دل یہ بہشت سبزہ زار

یہ شگوفوں کا تبسم یہ ستاروں کا جمال — موج رنگیں کے یہ ہلکورے یہ سبزہ کا نکھار

دھندلی دھندلی پتیوں پر یہ روپہلی چاندنی — آب جو کی راگنی پر یہ سکوت کوہسار

جابجا یہ ابر کے ٹکڑوں میں تاروں کا ہجوم — دور تک یہ جھاڑیوں میں جگنوؤں کا انتشار

یہ بساط نہر پر چاندی کی نازک دھاریاں — یہ جبین آب پر الماس کے نقش و نگار

چادر آب رواں پر یہ ضیائے مرتعش — جدول موج خنک پر یہ نقوش بے قرار

منہ اندھیرے جھلملاتے ہیں ستارے جس طرح — کانپتے ہیں اس طرح لہروں پہ جلوے بار بار

تیرتا پھرتا ہے یہ بادل کے ٹکڑوں میں ہلال — یا زمرد کا سفینہ درمیان جوئبار

یہ کلی پر قطرۂ شبنم میں ہے عکس قمر — آنکھ کی پتلی ہیں یا غلطاں ہے تاب روئے یار

یہ گھنی شاخوں سے چھن چھن کر آرہی ہے چاندنی — یا دل شب میں تصور صبح کا ہے بے قرار

مدح فطرت میں نہیں اشعار یہ ورد زباں — یہ جبین نطق کے سجدے ہیں اے پروردگار

ہاں مگر رونے کے قابل ہیں یہ احساس شکست — قامت فطرت پہ ملبوس زباں ہے تار تار

آہ اے فطرت! تری رعنائیوں کے سامنے — بہترین الفاظ ہو جاتے ہیں میرے شرمسار

ذکر تیرا ذوق گویائی کے سی دیتا ہے لب — راگنی تیری زباں کا توڑ دیتی ہے ستار

تیری محراب تجلی میں وفور شرم سے — سر جھکاتا ہے مرے زور بیاں کا افتخار

تیرا دریا نطق کی وادی میں بہہ سکتا نہیں — آدمی محسوس کر سکتا ہے کہہ سکتا نہیں

جوش ملیح آبادی

"مشاعرہ"

مذہب

انجمنِ مذاہبِ عالم نے جس کا اجلاس حال ہی میں کلکتہ میں ہو کر ختم ہو چکا ہے مذہب کے متعلق اپنی رائے کا یوں اظہار کیا ہے:۔

قیامِ امن کے لئے دنیا میں زبردست ترین قوت مذہب ہی ہے۔ بلکہ انسدادِ جنگ کا واحد امید افزا ذریعہ ہی یہ ہے کہ تمام مذہبی قوتوں کو مجتمع کر کے اس بدی کے استیصال کے لئے حرکت میں لایا جائے"

برنرڈ شا کہتا ہے:۔

"ستر برس کی زندگی کے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ لا مذہب لوگ اخلاقی نامرد ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ سنجیدگی کی حالت میں جسمانی حیثیت سے بھی نامرد ہوتے ہیں۔ تمدن بغیر مذہب کے قائم نہیں رہ سکتا۔ رہی یہ بات کہ ہم مذہب کو کس نام سے موسوم کرتے ہیں۔ قوتِ حیات سے یا روحِ عالم یا تخلیقی ارتقا سے سو یہ کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ ضروری بات جو ہے وہ یہ ہے کہ مذہب کے بغیر انسانی زندگی محض حوادث کا مجموعہ بن کے رہ جاتی ہے۔ میں نجات کا تصور بغیر خدا کے تو کر سکتا ہوں لیکن بغیر مذہب کے نہیں کر سکتا۔

ایچ جی ویلز کی رائے بھی ملاحظہ ہو:۔

"مذہب ہی اول ہے۔ مذہب ہی آخر ہے اور جب تک انسان خدا کو نہ پالے۔ اس کا آغاز آغاز نہیں، انجام انجام نہیں۔ اس کے یار دوست ہوتے ممکن ہیں، اس کا طاعت شعار ہونا ممکن ہے اس کا صاحبِ اعزاز ہونا بھی ممکن ہے۔ لیکن یہ سب کچھ لاحاصل ہے۔ زندگی بار آور جبھی ہو سکتی ہے جب خدا کے ساتھ وابستہ ہو"

انگلستان کا شاعر کوپر اپنی نظم الیگزنڈر سلکرک کی (Solitude) میں گویا ہوتا ہے:۔

"اے مذہب تجھ میں کیا لازوال خزانہ پوشیدہ ہے جو کہ تمام دنیا کے مال و زر سے بیش قیمت ہے لیکن وا حسرتا اگرجا کے گھنٹہ کی آواز کبھی ان چٹانوں اور گھاٹیوں میں سنائی نہیں دیتی۔ نہ ان سے کسی کی موت پر ماتم کرنا آتا ہے نہ کسی کے آنے کی خوشی میں اظہارِ مسرت"

"مخزن"

شریر دیوتا

میں نیند کی ان عمیق ترین گہرائیوں میں پڑی تھی جن سے میں پہلے آشنا نہ تھی کہ ایک عریاں لڑکے نے آکر میرے دروازے کو کھٹکھٹایا اور ایک شور برپا کر دیا۔

وہ سردی سے ٹھٹھر رہا تھا، باہر بادل گرج رہے تھے موسلا دھار مینہ برس رہا تھا اور بجلی غضبناک ہو ہو کر بار بار چمکتی تھی۔ میرا بھولا بھالا دل نہایت نرم واقع ہوا ہے میں نے دروازہ کھول دیا اور وہ لڑکا اپنے کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ اندر آ گیا۔

میں نے اُس سے اُس کا نام پوچھا، لیکن اُس نے کہا میں اپنا نام بھی بتاتا ہوں لیکن میں سردی سے کانپ رہا ہوں، مجھے آگ کی ضرورت ہے جو میرے جسم کو گرما دے، میں بالکل بھیگ رہا ہوں۔

وہ اپنی کمان کو نہایت احتیاط سے اُٹھائے ہوئے تھا اور اُسے ڈر تھا کہ کہیں بارش نے اُس کی تانت کو خراب نہ کر دیا ہو۔

وہ کانپ رہا تھا اور مجھ سے آنکھ نہ ملانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے ننھے پاؤں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور دل میں کہا یہ بچہ ہی تو ہے۔ ڈر کی کونسی بات ہے۔

لیکن اس لڑکے نے شوخی سے اپنے سر کو اس طرح حرکت دی کہ اُس کے دلکش، لانبے، سنہری بال پیچھے ہو گئے اور گوری گوری پیشانی نظر آنے لگی۔ اُس نے اپنے ترکش سے ایک دلآویز تیر نکالا اور پھر خطا نہ ہونے والے نشانے سے میرے سینے میں کھینچ مارا۔

"او ظالم اور بے وفا لڑکے تیرا خوفناک اور مسرت بخش نام میں جانتی ہوں۔ آہ! یہ تو نے میری مہربانی کا اجر دیا ہے"

شوخ دیوتا شرارت آمیز تبسم کے ساتھ بولا۔

"طوفان کی ان شورشوں کے باوجود جن کی اس وقت فضا پر حکومت ہے میری کمان محفوظ ہے لیکن اے بھولی لڑکی کیا تو کہہ سکتی ہے کہ تیرا دل بھی محفوظ ہے"

"ادبی دنیا"

حکمتِ قدیمہ کا ایک ورق

مصر کے عجائب خانہ میں حضرت عیسیٰ سے اڑھائی ہزار سال پہلے کی بانس کے کاغذ پر لکھی ہوئی ایک کتاب ہے جس میں وہ اخلاقی وصیت درج ہے جو ایک شخص "انی" نام نے اپنے بیٹے "کہیں سو ہی ٹپ" کے لئے لکھی تھی۔ ان نصیحتوں کا ترجمہ حسب ذیل ہے

(۱) اگر کوئی شخص تجھ سے مشورہ لینے آئے تو تُو اپنی واقفیت کے لئے کتاب سے امداد لے۔

(۲) کسی دوسرے شخص کے گھر میں بلا اجازت داخل نہ ہو۔ اور جو شخص تجھے اپنے گھر میں آنے کی اجازت دے اُسے اپنے لئے باعثِ عزت سمجھ۔

(۳) اپنے گھر میں بیٹھ کر کسی دوسرے شخص کے کاموں کی فکر و تجسس نہ کر۔

(۴) کسی جماعت میں سب سے پہلے داخل ہونے والا یا کسی جماعت میں سے سب سے پہلے علیحدہ ہونے والا نہ بن۔ اس سے تیرے نام کے ساتھ سبکی اور بے رونقی کا اضافہ ہو جائے گا۔

(۵) خدا کی عبادت گاہ چلّا کر بولنے سے نفرت کرتی ہے۔ رقیق القلب ہو کر عاجزی کے ساتھ دعا مانگ جس کے لفظ نہایت نرمی سے آہستہ آہستہ کہے جاتے ہیں اس صورت میں خدا تیری عرض سنے گا، نذر قبول فرمائے گا اور تیری حفاظت کرے گا۔

(۶) اس بات کا خیال رکھ کہ کیا گزر چکا ہے۔ اپنی زندگی کے لئے وہ اصول اختیار کر جو پیروی کے لئے مثال ہوں۔

(۷) موت کا قاصد جس طرح اوروں کے پاس آتا ہے تجھے لے جانے کے لئے تیرے پاس بھی آ جائے گا بلکہ آنے کے لئے تیار کھڑا ہے۔ قیل و قال تجھے کوئی فائدہ نہ دے گی، کیونکہ وہ آتا ہے اور تیار ہے۔

(۸) تُو یہ نہیں جانتا کہ تُو کب مرے گا۔

(۹) یہ نہ سمجھ کہ تو بچہ ہے۔ موت بچے کو اس کی ماں کی گود میں بھی آ جاتی ہے اُسی طرح جس طرح اس بوڑھے آدمی کو جو اپنی مدت پوری کر چکا ہو۔

(۱۰) نہایت احتیاط سے خیال رکھ کہ تیری زبان سے کسی آدمی کا دل زخمی نہ ہو۔

(۱۱) صرف ایک وفادار خدمتگار رکھ لے، اور اس کے کاموں کی نگرانی کر، اور اپنے ہاتھوں سے اُس شخص کی حفاظت کر جو تیرے گھر اور مال پر مختار ہے۔

(۱۲) جو شخص بہت میسر ہونے پر تھوڑا دیتا ہے وہ اس شخص کی مانند ہے جو دوسروں پر ظلم کرتا ہے۔

(۱۳) خدا کا ناشکر گذار نہ ہو کیونکہ اُس نے تجھے ہستی عطا کی ہے۔

(۱۴) جو شخص مرتبے یا عمر میں تجھ سے بڑا ہو جب تک وہ کھڑا ہے تو نہ بیٹھ۔

(۱۵) بری بات کہنے والا جواب میں بھلی نہیں سنتا۔

(۱۶) جب تو خدا کو نذر گذرانے تو ایسی شے پیش نہ کر جو اُس کے حضور میں مکروہ معلوم ہو۔

(۱۷) اُن بھیدوں میں بحث و تکرار نہ کر جو خدا کی ذات سے متعلق ہیں۔

(۱۸) دنیا کا خدا آسمان سے اوپر نور کے جلال میں ہے، اور اس کے نور کا عکس زمین پر۔ جو روز اُسی کا وظیفہ بجا لاتے ہیں وہ اُن سے نزدیک ہے۔

"اصلاح"

مطبوعاتِ جدیدہ

فخرِ کائنات۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر و مستند سوانح عمری ہے جسے مولانا مسعود الرحمٰن خاں صاحب ندوی نے مسلمان عورتوں اور بچوں کے لئے ترتیب دیا ہے۔ ہمارے خیال میں اس طبقہ کی راہنمائی کے لئے یہ ایک بہت اچھی کتاب ہے۔ حجم ۸۴ صفحات اور قیمت ۴ر مینیجر رسالہ پیشوا، پوسٹ بکس نمبر ۱۰۵، دہلی سے طلب فرمائیے۔

اسلام اِن انگلینڈ۔ از شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی، گدیہ۔ انگریزی زبان میں سولہ صفحے کا یہ رسالہ انگلستان میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی مختصر تاریخ ہے۔ تحریکِ تبلیغ میں حصہ لینے والوں کو اس سے معلومات حاصل کرنی چاہئیں۔

پردہ پر ایک نظر۔ اس میں مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی نے اسلامی نکتۂ نظر سے پردہ کے مسئلہ پر بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ موجودہ حالات میں ہندوستان کا پردہ شریعتِ اسلام کے مخالف نہیں حجم ۴۸ صفحے اور قیمت تین آنے ہے مینیجر مدینہ بک ایجنسی بجنور سے منگائیے۔

مسلمانانِ اندلس۔ مؤلفہ جناب مولوی عثمان علی مرزا صاحب۔ ۹۶ صفحات میں نہایت خوبی سے اس امر کو ظاہر کیا گیا ہے کہ علوم و فنون میں اندلس کے مسلمانوں نے کہاں تک ترقی کی، اپنے اثر و اقتدار کو ہمسایہ قوموں پر کس طرح قائم رکھا اور یورپ میں جہالت کی تاریکیوں کو علم و تہذیب سے کیوں کر منور کیا۔ قیمت تین آنے۔ پتہ، مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدر آباد (دکن)

تذکارِ سلف۔ اس کتاب میں جناب مولوی ضیا احمد صاحب ضیا ایم اے لیکچرار انٹر میڈیٹ کالج علی گڈھ نے اسلاف اسلام کے اخلاق اور اُن کے کارناموں کا تذکرہ قطعاتِ نظم میں کیا ہے۔ زبان سلیس اور انداز بیان شگفتہ ہے بچوں اور نوجوانوں کے لئے ایک سبق آموز چیز ہے۔ حجم ۳۲ صفحات ہے جن میں ۱۹ نظمیں مولانا عبدالماجد کی تقریب اور مولانا عبدالسلام کا مقدمہ ہے

غالب اور اُس کی شاعری۔ جناب مولوی احمد الدین احمد صاحب بار رہروی کے قلم سے مرزا غالب کے کلام پر چالیس صفحے کی ایک عمدہ تنقید ہے جو پڑھنے کے قابل ہے قیمت چھ آنے۔ پتہ، مینیجر سفیر بک ایجنسی، سبزی منڈی، الہ آباد۔

ترانۂ حریت۔ مرتبہ جناب محمد عرفان صاحب ہزاروی۔ یہ اقبال، ظفر علی خاں، جوش، حفیظ، سالک وغیرہ ادبا کی دلکش قومی نظموں کا مجموعہ ہے حجم ۴۳ صفحے اور قیمت ۲ر ہے۔ امان سرحد برقی پریس راولپنڈی سے منگائیے۔

بیمۂ زندگی۔ مؤلفہ ڈاکٹر سید محمد شریف صاحب متقی لدھیانہ۔ جیبی تقطیع پر ۳۲ صفحے کا یہ رسالہ ہندوستانیوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً لائف انشورنس سے روشناس کرانے کی غرض سے لکھا گیا ہے مسلمانوں کی اقتصادی ترقی کے لئے آج کل زندگی کا بیمہ کرانا ازبس ضروری ہے۔ قیمت پانچ آنے معہ محصول مقرر ہے، جناب مولف سے مل سکتا ہے

کوہستانِ کانگڑہ کی دلفریب وادی، یہ اردو زبان کا ایک خوبصورت مصور پمفلٹ ہے جسے ریلوے کے منتظمین نے

شائع کیا ہے۔ اس میں کانگڑہ کی تاریخی حیثیت صنعت و تجارت اور قدرتی مناظر کا دلکش بیان ہے یکم دسمبر ۲۹ء سے کانگڑہ ویلی ریلوے کا اجرا ہوا ہے اور اس پمفلٹ کی اشاعت کی غرض یہ ہے کہ لوگوں کو وادیٔ کانگڑہ کی سیر اور تجارت کے متعلق مفید معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ ایجنٹ صاحب نارتھ ویسٹرن ریلوے سے طلب فرمائیے۔

آل انڈیا مشاعرہ۔ اُس عظیم الشان مشاعرے کی روئداد اور شعرا کا کلام ہے جو انجمنِ خیابانِ اردو انٹرمیڈیٹ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی جانب سے منعقد ہوا۔ شعرائے وقت کے کلام کا یہ ایک عجیب مرقع ہے جسے حضرت احسن مارہروی نے مرتب کیا ہے۔ حجم بڑی تقطیع کے ۵۶ صفحے ہے اور چھ آنے میں انجمن کے دفتر سے مل سکتا ہے۔

سالانہ رپورٹ۔ یہ انجمن علم و ادب شملہ کی ۱۹۲۷ء کی رپورٹ ہے جس کے ساتھ ۴ ستمبر ۱۹۲۷ء کے مشاعرے کی منتخب نظمیں اور غزلیں بھی شامل ہیں حجم ۸۰ صفحات اور قیمت چھ آنے ہے۔ پتہ۔ خواجہ شجاع صاحب منشی پروفیسر کالج، بہاول پور

حزب اللہ اس کتاب میں سید ابوالبرکات سید محمد فضل شاہ صاحب سجادہ نشین جلال پور شریف نے اُس لائحۂ عمل کی تشریح کی ہے جو انہوں نے مسلمانوں کی تنظیم اور اصلاح کے متعلق مرتب کیا ہے۔ ان مصلحانہ مضامین کو پڑھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ سید صاحب کی تحریک مسلمانوں کی قومی، اقتصادی، معاشرتی اور تمدنی ارتقا و اعتلا کے لئے نہایت مفید ہے۔

"خضرِ راہ"۔ یہ نیا رسالہ نیا گاؤں، لکھنؤ سے نکلا ہے۔ جناب حامد علی صاحب اس کے اڈیٹر ہیں۔ انہوں نے اس کے لئے اچھے اچھے علمی و ادبی مضامین فراہم کئے ہیں اور اسے مفید بنانے میں اپنی پوری کوشش صرف کی ہے لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ہے حجم ساٹھ صفحے اور سالانہ قیمت چار روپے مقرر کی ہے۔

"نوشیرواں" منشی بلدیو سہائے صاحب صحرائی سروری کے زیرِ ادارت یہ مصور رسالہ کوئٹہ سے نکلنا شروع ہوا ہے جنابِ صحرائی دیر سے زبانِ اردو کی قابلِ قدر خدمات انجام دے رہے ہیں اور یہ رسالہ اُن کے ذوقِ ادب کا ایک دلکش نمونہ ہے اس رسالے کے دو نمبر ہماری نظر سے گزر چکے ہیں۔ دوسرا نمبر پہلے سے بہتر شائع ہوا ہے، اس لئے امید کی جا سکتی ہے کہ اُن کا رسالہ کامیاب ثابت ہوگا۔ حجم بڑی تقطیع کے ۴۶ صفحات اور سالانہ چندہ چار روپے ہے۔

حجازی کیلنڈر۔ یہ ایک نہایت خوبصورت، رنگین اور روغنی کیلنڈر ہے جس میں اسلامی اور عیسوی دونوں قسم کی تاریخیں دی گئی ہیں پیشانی پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اللہ۔ محمد اور کلمہ طیبہ بخط ثلث طغریٰ نما تحریر ہے، اس کے نیچے ایک اسلامی بندرگاہ کا نظارہ ہے اور پھر مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف کی تصاویر ہیں۔ دلکش نقش و نگار اور بیل بوٹے ان کے علاوہ ہیں۔ ناشرین کا یہ دعویٰ بجا ہے کہ اس سے پہلے ایسا کیلنڈر ہندوستان بھر میں شائع نہیں ہوا قیمت چھ آنے ہے۔ وی پی منگوانے والوں کو نو آنے میں پڑے گا۔ حافظ قمر الدین اینڈ سنز، تاجرانِ کتب موچی دروازہ کوچہ قاضی خانہ لاہور سے طلب فرمائیے۔

فہرست مضامین

جلد ۱۶

بابت ماہِ اگست ۱۹۲۹ء

تصاویر:- ۱-رات ۲-خواب

یہ موتی

کچھ کھویا نہیں گیا!

ہمیشہ آگے کو قدم بڑھائے جا!

ہر رات کے بعد دن ہے، ہر تاریک بادل کے پیچھے چمکتا ہوا سورج موجود ہے!

اور پھر رات، شاندار رات حسین وجمیل رات، اپنے ننھے تاروں والی اپنے پیارے چاند والی رات!

کونسی تاریکی ہے جس کے اندر ہمارے پُر نور خدا نے روشنی کی جھلکیاں نہیں چھپا دیں؟ سمندر کے پاس اس کے آبدار موتی ہیں پہاڑوں کے بطن میں لعل وجواہر کا خزانہ ہے تو کیا ہوا تیرے دریا میں جو جنگل بیابان میں سے ہو کر گذرتا ہے تیرے اس آئینے میں اپنے گرد وپیش کا عکس ہے اس کے اندر حسن وحقیقت کی وہ جیتی جاگتی تصویریں ہیں جن کا نظیر دنیا پیش نہیں کر سکتی!

کچھ کھویا نہیں گیا!

تو اس موتی کو کیا ڈھونڈتا ہے جو کل کھویا گیا، تیرے پروردگار کی شفیق فطرت نے تیرے ہی دل کی سیپی میں ہزاروں لاکھوں موتی چھپا کر رکھ دئیے ہیں، چھوڑ اُس لاحاصل تلاش کو اور کھول اِس لازوال خزانے کا زرنگار دروازہ!

کل کا وہ موتی اے دوست! کھویا گیا لیکن آج کا یہ موتی دمکتا ہے تیرے دل میں آج کا یہ موتی جھلک رہا ہے، تیری آنکھ کے ہر آنسو میں!

آنسو جو تیری آنکھ سے گر گئے موتی جو گذرے دنوں میں کھوئے گئے اب بھی تیرے گلے کا ہار ہیں، تو سر کو بلند رکھے تو وہ زینت ہیں تیرے سراپا کی تُو دل کو پاک کرلے تو وہ آرائش ہیں تیرے روح ورواں کے لئے!

تاریک بادل برس چکے، گذرے ہوئے رنج وراحت اب قوس قزح ہیں تیرے آسمان پر، کل گذر گیا رات ہو چکی وہ کروڑوں میل پر دور دور سورج افق سے ابھرا، اس کی سنہری روپہلی کرنیں چلی آتی ہیں دیکھ اور آج کے لہراتے شبنمی میدان میں تیری روح کے لاکھوں موتیوں میں وہ عکس ریز ہیں میرے دوست!

باغبان

جہاںؔ نما

عورتیں اور سیاسیات

مس لوسی ایم پیرس نے عورتوں کے سیاسیات میں حصہ لینے پر "ستّری دھرما" میں یوں بحث کی ہے :-

عورتیں قوم کی خانہ دار ہیں اور یہ امر کہ وہ اپنے گھروں کا انتظام کرنا جانتی انھیں اس قابل ثابت کرتا ہے کہ وہ قومی پیمانہ پر بھی خانہ داری کر سکیں گی جو خانہ داری کی محض ایک بہت بڑی صورت ہے۔ اپنے گھر کا انتظام اور قوم کے گھر کا انتظام جسے سیاسیات کہتے ہیں حقیقت میں دونوں ایک ہیں اور دونوں بڑی حد تک ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ سیاسیات کا اُن امور سے ایک گہرا تعلق ہے جو ہماری خانگی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہمارے گھر کے استعمال کی اشیا صنعت سے تعلق رکھتی ہیں۔ کھانے کی چیزیں پکانے کے برتن، آرائشی سامان، دریاں اور پہننے کے کپڑے یا ہاتھ سے بنائے جاتے ہیں یا کلوں کے ذریعہ سے، اور ان کے بنانے خریدنے اور بیچنے پر چند ملکی قوانین کی حکومت ہوتی ہے۔ کھانے کی چیزیں زراعت سے پیدا کی جاتی ہیں اور سیاسیات کا زراعت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ سیاسیات کا تعلق اُن تمام معاملات سے ہے جنہیں عورتیں اس قدر جانتی ہیں جتنا کہ مرد یا انہیں اسی قدر جاننا چاہئے جتنا مرد جانتے ہیں، کیونکہ وہ عورتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں اور عورتیں بڑی حد تک اُن پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔

امساکِ باراں کی وجہ سے جب کافی غلہ پیدا نہیں ہوتا تو عورتوں کے پیشِ نظر اُن کے فاقہ کش بچے ہوتے ہیں، اور وہ حکومت کو مجبور کر سکتی ہیں کہ وہ زراعت پر زیادہ توجہ کرے اور ذخائرِ آب کے لئے تالاب بنوائے جیسا کہ قدیم زمانہ میں دستور تھا۔ عورتیں اپنے بھوکے بچوں اور شوہروں، اور اپنے گردوپیش کے فاقہ زدہ لوگوں کو دیکھ کر اپنے دردانگیز جذبات کی زبردست طاقت کے ساتھ مردوں کے احساسات میں اضافہ کر سکتی ہیں۔ کاش عورتوں کو معلوم ہوتا کہ ان میں یہ طاقت موجود ہے۔ اور وہ تھوڑا سا وقت اپنے مردوں کی مدد سے ان اہم مسائل پر غور کرنے میں صرف کرتیں تاکہ علم و دانش کی رو سے موثر طریق پر رائے دے سکیں۔ سیاسیات میں حصہ لینے پر بہت زیادہ وقت صرف نہیں ہوتا۔ اکثر عورتیں آپس میں بہت باتیں کرتی رہتی ہیں۔ اس کی بجائے وہ قحط سالی میں غریبوں کی خوفناک حالت پر تبصرہ کر سکتی ہیں، وہ ایک دوسری کے متعلق ایسی باتیں بھی کر سکتی ہیں جن کا درجہ معمولی بے فائدہ گفتگو سے ذرا بلند ہو

لیکن ہندوستانی عورتوں کو ابھی اس بات کا احساس نہیں ہؤا کہ وہ بے کار باتوں کے علاوہ کام بھی کر سکتی ہیں۔
ممکن ہے بعض امور کے متعلق مردوں اور عورتوں کا علم برابر ہو، جیسا کہ خوراک مہیا کرنے کا مسئلہ ہے۔
لیکن عورت کا احساس زیادہ ہوتا ہے کیونکہ اسے اپنے گھرانے کے لئے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ مہیا
نہیں ہو سکتی۔ لیکن بعض ایسے معاملات بھی ہیں جن میں عورتوں کو مردوں سے زیادہ علم ہوتا ہے مثلاً قانونِ ازدواج
صغرسنی جو آج کل مجلس مقننہ کے پیش نظر ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق جو ہندوستان کے مردوں اور عورتوں دونوں
کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے صرف عورتیں ہی صحیح فیصلہ کر سکتی ہیں۔ صرف عورتیں ہی بتا سکتی ہیں کہ لڑکیوں
کی شادی کس عمر میں ہونی چاہئے۔ اکیلے مرد اس بات کا فیصلہ سوائے قیاس پر انحصار کرنے کے کس طرح
کر سکتے ہیں؟ قیاس صحیح سہی لیکن ایسے اہم مسئلہ میں جس کا تعلق تمام قوم کی زندگی سے ہو ——— عملی تجربہ
ضروری ہے۔ صرف قیاس پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔

چین کے طلبہ کی حالت

دوسرے ملکوں کے طلبہ کی طرح چینی طلبہ کے پیشِ نظر بھی سب سے مقدم امر فلسفۂ حیات ہے۔ طلبہ کی اکثریت
مادیت کی طرف مائل ہے چینی کم و بیش عملی لوگ سمجھے جاتے ہیں یعنی وہ لوگ جن کا مذہب کے ساتھ کچھ زیادہ تعلق
نہیں ہوتا۔ خصوصاً مذہب کی منظم حالت سے۔ وہ عام طور پر اخلاق کے ایک خاص درجہ پر مطمئن ہیں جو انہیں
روزمرہ کی زندگی کے گذارنے میں مدد دیتا ہے۔ اس لئے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ وہاں عقاید کا اس
قدر اختلاف کیوں ہے اور ایک ہی گھرانے کے افراد مختلف مذہبی عقاید پر کیوں عمل کرتے ہیں چینی بے اعتقادی کی
رواداری اور آزادی کے عادی ہو چکے ہیں۔ اسی لئے چینی طلبہ جدید مادیت اور الحاد کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔
عوام کی غربت و افلاس کی زندگی بھی اس زاویۂ نظر کے پیدا کرنے میں ممد و معاون ہوتی ہے۔

چینی طلبہ کے لئے دوسرا بڑا سوال صنفی زندگی کا ہے۔ گذشتہ زمانے میں دونوں صنفیں الگ الگ تھیں، اور
دونوں کی معاشرت میں بڑا فرق تھا۔ مردوں کی تعلیم محدود تھی۔ اور عورتیں بالکل بے علم تھیں۔ لیکن اب تعلیم نے
دونوں کو آپس میں ملا دیا ہے اور متاہل زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ اب چینی والدین کا طرزِ عمل بھی
ان کی ہمت افزائی کر رہا ہے۔ خصوصاً نکاح اور صنفِ مقابل کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے پیدا کرنے کے معاملہ

میں ۔ اس کے ساتھ ساتھ سنیما ، ناٹک ، ناچ گھر اور غیر ذمہ دارانہ کتب کی مقبولیت بہت زور سے بڑھ رہی ہے ۔ یہ چیزیں ایک اہم مسئلہ کی صورت میں طلبہ کے دلوں میں جاگزین ہو رہی ہیں ۔ آج چین میں صنفی معاملات پر اس قدر تصنیفات موجود ہیں کہ زندگی کے کسی اور شعبہ پر نہیں ہیں ، اور میرے خیال میں اگر ہم اتنی ہی مذہبی کتب بھی شائع کریں جتنی صنفی کتب شائع کر رہے ہیں تو طلبہ کی بہت بڑی خدمت بجا لائیں گے ۔

تیسرا اہم مسئلہ طلبہ کے نزدیک اقتصادی مسئلہ ہے ۔ طلبہ عام طور پر چین کے متوسط طبقہ کے خاندانوں سے ہوتے ہیں ۔ طبقۂ اعلیٰ کے طلبہ بہت کم ہوتے ہیں ۔ اس لئے والدین کو بچوں کی تعلیم کے اخراجات کے لئے کافی روپیہ کمانا پڑتا ہے ۔ بعض اوقات انہیں مشکلات کے باعث سلسلۂ تعلیم کو چند سالوں کے لئے روک دینا پڑتا ہے ۔ یہی مشکلات طلبہ کو جفاکش اور محنتی بنا دیتے ہیں ۔ اور اس کا ثبوت اعلیٰ تعلیم کی وہ عالمگیر خواہش ہے جو طلبہ میں ظاہر ہو رہی ہے ۔ طلبِ روزگار کا مسئلہ سب سے زیادہ پریشان کن ہے ۔ کیونکہ اعلیٰ تربیت یافتہ لوگوں کے لئے اسامیاں کم ہیں اور اس لئے مقابلہ سخت ہے ۔

طلبہ کے نزدیک آخری اور نہایت ہی اہم مسئلہ سیاسیات اور معاشرت کا ہے ۔ وہ سیاسی اور معاشرتی ترقی میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے ہیں ۔ وہ زندگی کے جدید نظریات میں بھی انہماک ظاہر کرتے ہیں ۔ ممکن ہے کہ مطالعہ کی کمی کے باعث یا اس لئے کہ نظریات ان کے سامنے عملی جامہ نہیں پہن سکتے ان کا علم خام اور سطحی ہو لیکن بہرحال اقتصادی اور معاشرتی تجدید کے جدید نظریات سے انہیں حقیقی دلچسپی ہے ۔

ٹیلیفون کی حیرت انگیز ترقی

پالسن کا برقی فونوگراف جو آج سے تین سال قبل سویڈن میں ایجاد ہوا تھا ایک ترقی یافتہ صورت میں پیش کیا گیا ہے ۔ اس کے ذریعہ سے ٹیلیفون پر بھیجا ہوا پیغام نہ صرف مکرر سنا جا سکتا ہے بلکہ نہایت تیز رفتار سے بھیجا جا سکتا ہے اور سننے والا اسے معمولی گفتگو کی رفتار پر سن سکتا ہے ۔

اگر آپ کو نو ہزار الفاظ کا ایک ضروری پیغام ٹیلیفون پر پیرس سے لندن میں اپنے ایجنٹ کو بھیجنا ہو تو ۱۵۰ الفاظ فی منٹ کے حساب سے اس کے ادا کرنے میں ایک گھنٹہ صرف ہوگا اور ایک گھنٹے کے کرایہ کی خطیر رقم ادا کرنے کے باوجود ممکن ہے کہ آپ کا سلسلۂ کلام دورانِ گفتگو میں قطع کر دیا جائے ۔ لیکن موجودہ ٹیلیفون پر آپ اپنے کمرے میں آرام سے بیٹھے ہوئے ایک کھنچتی ہوئے تار پر اپنا پیغام ایک گھنٹے میں پڑھ دیتے ہیں ۔ پھر اپنے ٹیلیفون

کا سلسلہ لنڈن سے ملاتے ہیں اور وہی تار ٹیلیفون کے آلہ میں سے دس منٹ کے اندر اندر گذر جاتا ہے اور آپ کا مکمل پیغام لنڈن میں موصول ہو جاتا ہے۔

وصول کرنے والا آلہ نوسو الفاظ فی منٹ کی رفتار سے پیغام وصول کرتا ہے۔ لیکن اس رفتار سے الفاظ سمجھ میں نہیں آتے ساب اس تار کو ایک اور آلہ سے ملا کر آہستہ آہستہ چلایا جاتا ہے مختصر نویس آپ کا پیغام حرف بحرف لکھ لیتا ہے۔ یہ کتنی بڑی سہولت ہے کہ آپ نے ٹیلیفون کا دس منٹ کا کرایہ ادا کر کے اس سے ایک گھنٹے کا کام لیا۔

یہ ٹیلیفون ایک جرمن سائنسدان ڈاکٹر سٹل کی محنت کا نتیجہ ہے۔ جس نے ایک باریک لوہے کے تار میں سے برقی لہریں گذار کر اسے اس قابل بنا دیا ہے کہ پیغامات ہمیشہ کے لئے اس میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔

سنہ ۱۹۰۰ء کے قریب سویڈن کے سائنسدان ڈاکٹر پالسن نے اس آلہ کو ابتدائی حالت میں پیش کیا تھا۔ اُس وقت تار کی آواز دینے والی طاقت دو تین روز میں زائل ہو جاتی تھی۔ لیکن موجودہ حالت میں اگر دس سال کے بعد بھی وہی پیغام سننا چاہیں تو سنا جا سکتا ہے۔ اور پیغامات کا کوئی خاص حصہ جسے محفوظ رکھنا مقصود نہ ہو حذف بھی کیا جا سکتا ہے۔

موت و حیات کی جنگ

انسان کی دائمی زندگی کا مسئلہ اس وقت دنیا بھر کے حکما کے پیش نظر ہے۔ انسانی زندگی کا مدار ہائیڈروجن آکسیجن کاربن اور نائٹروجن پر ہے ممکن ہے کہ ہم آئندہ زمانے میں ان کے ذریعے سے اپنے ہی جیسا ایک انسان پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

ایک امریکن حکیم کے پاس ایک چوزے کا دل بیس سال سے حرکت کر رہا ہے حالانکہ اس چوزے کے جسم کی خاک بھی اب تک منتشر ہو چکی ہوگی۔ یہ دل مع آنتوں کے ایک کیمیائی مرکب میں رکھا ہوا ہے اگر چوزہ ذبح نہ کیا جاتا تو شاید چار سال تک زندہ رہتا۔ لیکن اس کا دل بیس سال سے زندہ ہے۔ اور یہ حکیم اُسے کیمیائی خوراک دیتا رہا تو اس کے ساکن ہونے کی کوئی توقع نہیں ہے۔

روس کے حکما کئی سال سے خفیہ طور پر تجربات کر رہے تھے صرف چند ماہ ہوئے ان کے کارنامے آشکار ہوئے ہیں۔ انہوں نے پچکاری کے ذریعہ سے ایک مرکب ایک ایسے شخص کے جسم میں داخل کیا جسے مرے ہوئے چوبیس گھنٹے گذر چکے تھے کچھ دیر کے بعد اس کا دل آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگا۔ اور ایک ہلکی سی آواز اس کے گلے سے نکلی۔ دیکھنے والے حیران رہ گئے لیکن وہ شخص جلد ہی پھر مر گیا۔ پورے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ آیا واقعی اس شخص کے ہوش و حواس قائم ہو گئے لیکن اس قدر ضرور کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ تجربات زیادہ کامیاب ہونگے۔

خواب

رات

رات

محبت کی سب سے بڑی بیٹی، اے خوبصورت اور بے داغ رات!
سکوت کی ملکہ اور نیند کی شہزادی!
جو اپنے سیاہ فام رخساروں کے پاکیزہ رنگ روپ سے،
محبت کرنے والوں کی آنکھوں کو اپنے حسن پر مفتون کر لیتی ہے

مارلو

اے پُراسرار رات! تُو خاموش نہیں، تیری بہت سی زبانیں ہیں

جونا بیلی

اے مقدس رات! میں نے اُس کو تجھ سے برداشت کرنا سیکھا ہے
جس کو انسان پہلے برداشت کر چکا ہے!
تُو افکار کے ہونٹوں پر انگلی رکھتی ہے،
اور پھر وہ شکایت کے لئے نہیں کھلتے۔

لانگ فیلو

خواب

خواب جہاں خیال تصوّر کی بھول بھلیاں میں دیوانہ ہو جاتا ہے

ینگ

بند پلکوں کے نیچے ہم سمجھتے ہیں کہ ہم دیکھ رہے ہیں

فارڈنگھم

جس طرح خواب اُن لوگوں کے خیالات ہیں جو سو رہے ہیں، اسی طرح خیالات اُن لوگوں کے خواب ہیں جو جاگ رہے ہیں۔

بلونٹ

منصور احمد

ہندوستان اور اسلامی تہذیب

"اسلامک کلچر" کے نام سے جو انگریزی رسالہ مسٹر پکتھال کی زیر ادارت حیدر آباد دکن سے شائع ہوتا ہے اُس کی ایک اشاعت میں اس عنوان سے سید امیر علی مرحوم کے قلم سے ایک پر مغز مضمون شائع ہوا تھا جو درحقیقت قابلِ قدر تاریخی معلومات کا ذخیرہ ہے، ذیل کا مضمون اسی کی تلخیص ہے جس سے ناظرین کو اندازہ ہوگا، کہ اسلام نے ہندوستان کی تہذیب و تمدن پر کس حد تک اثر ڈالا،

کسی خاص تاریخی دور میں ایک قوم کی تہذیب و تمدن کے متعلق صحیح طور پر اندازہ نہیں ہوسکتا، جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ اس کے گذشتہ کارناموں کی کیا نوعیت تھی، اور اس کے عروج و زوال کے کیا اسباب و علل تھے؟

ہندوستان میں اسلامی تہذیب کی تاریخ تقریباً ایک ہزار برس پر مشتمل ہے، اسلام سے قبل ہندوستان ہزاروں برس سے ایک غیر معمولی تمدن کا گہوارہ تھا، اس میں شبہ نہیں کہ ہندوؤں نے مختلف علوم و فنون میں غیر معمولی کمال بہم پہنچایا تھا، لیکن جہاں تک قومی زندگی کے تاریخی حالات و واقعات کا تعلق ہے، بجز افسانوں اور مذہبی ترانوں کے انہوں نے کوئی ایسا مستقل سرمایہ نہیں چھوڑا ہے، جو تاریخی حیثیت سے کسی خاص عظمت کا مستحق ہو، یا جس سے ملک اور قوم کی اندرونی زندگی پر کافی روشنی پڑتی ہو، بہرحال قدیم ہندوؤں میں تاریخ نگاری اور تذکرہ نویسی کا مذاق تقریباً مفقود تھا یہی وجہ ہے، کہ مسلمانوں کی آمد کے قبل ہندوستان کے قدیم تمدنی حالات بالکل تاریکی میں پڑے ہوئے تھے،

لیکن جب اسلامی دور پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو کرۂ ارضی کے اس وسیع خطہ کے متعلق جہاں وہ پھیلا ہم کو بکثرت تاریخی معلومات کا ذخیرہ نظر آتا ہے، چنانچہ صرف ہندوستان کے متعلق اس کثرت سے تاریخی تصنیفیں موجود ہیں، کہ صرف اُن کی فہرست تیار کرنے کے لئے غیر معمولی کاوش کی ضرورت ہے. محمود غزنوی کے زمانہ سے لے کر موجودہ دور تک تاریخی تصانیف کا ایک غیر مختتم سلسلہ ملتا ہے، بیہقی نے ذاتی واقفیت کی بنا پر محمود اور اس کے وارث مسعود کے حالات بیان کئے ہیں، اسی طرح منہاج السراج نے رضیہ بیگم اور اُس کے بھائیوں کے کارناموں کا تذکرہ کیا ہے، شمس سراج عفیف نے وہ واقعات و حالات قلمبند کئے ہیں جو خود اُس کی نگاہوں کے سامنے گذرے تھے. فیروز شاہ نے خود اپنے کارناموں کا ایک تذکرہ چھوڑا ہے، جس سے مصنف کی خوبیوں کا دماغ پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے، بابر اور اُس کے ورثاء نے بھی اپنی

زندگی کے حالات نہایت دلکش انداز میں لکھے ہیں۔

دسویں صدی عیسوی کے ختم کے قریب جب کہ مسلمانوں نے شمالی ہند میں سب سے پہلے قدم رکھا، ایک عرب فلسفی ہندوؤں کی صحبت میں رہ کر اُن کے علوم فلسفہ و سائنس کے مطالعہ میں مصروف تھا، مامون جو خلفائے عباسیہ میں سب سے زیادہ مقتدر اور علم دوست تھا اُس نے اپنے دربار میں بہت سے فاضل برہمنوں کو جمع کر رکھا تھا، جو ہندوؤں کی کتبِ نجوم و ریاضی کا عربی میں ترجمہ کرتے تھے، لیکن البیرونی پہلا اجنبی شخص تھا جس نے برہمنوں کے مکانوں پر رہ کر براہِ راست ہندو مذہب، فلسفہ، اور فنِ قانون کا مطالعہ کیا تھا، اس کی تصنیف جو ہندوستان کے متعلق ہے، درحقیقت عربوں کی تحقیقی صلاحیت کا ایک غیر معمولی نمونہ ہے، اُس نے اپنی تصنیف میں نہایت فیاضانہ الفاظ میں برہمنوں کے مذہب اور فلسفہ کا تذکرہ کیا ہے، اور اُس نقصان پر اظہارِ افسوس کیا ہے، جو محمود غزنوی کے حملوں سے ہندوؤں کے تمدن کو پہنچا تھا،

ہندوستان کی اسلامی تہذیب کی نوعیت اور وسعت کی تحدید اُس وقت تک مشکل سے ہو سکتی ہے، جب تک کہ اُن کی تہذیب و تربیت سے واقفیت حاصل نہ کی جائے، اس سے مراد وہ تربیت ہے، جو اسلام کو مغرب میں نصیب ہوئی، عام طور پر قانونی نظم و نسق ایک قوم کی ترقی کا بہترین مظہر سمجھا جاتا ہے، حکومت کا نظام، علوم و فنون کی تربیت اناث کی تمدنی اور معاشرتی حیثیت قومی نشو و نما اور ترقی کے اندازہ کرنے کے لئے قابلِ قدر معیار ہیں۔

ترکوں کے زیرِ حکومت مغربی ایشیا میں ایک ایسا نظامِ حکومت قائم تھا جو جزرسی اور تقسیمِ عمل کے لحاظ سے موجودہ دور کے بہترین نظامِ مملکت سے بآسانی ہمسری کا دعویٰ کر سکتا ہے، اور جو حقیقت میں اکثر ترقی یافتہ مغربی ممالک کیلئے نمونۂ تقلید بن سکتا ہے۔

عباسیوں کے عہدِ اقبال میں حکومت کی مخصوص شاخیں حسبِ ذیل قائم تھیں۔

مرکزی محکمۂ محاصل، محکمۂ احتساب، محکمۂ جنگ، ڈاک خانہ، محکمۂ زراعت، خط و کتابت اور عرائض و شکایات کے معائنہ کی کمیٹیاں، محکمۂ عطیاتِ سرکاری وغیرہ، ان کے علاوہ اور بھی اکثر چھوٹے چھوٹے محکمہ جات قائم تھے، ان تمام محکمہ جات کے افسروں کی ایک کونسل تھی، جو سلطنت کی اعلیٰ ترین انتظامی جماعت سمجھی جاتی تھی، اس جماعت کا صدر وزیرِ اعظم ہوتا تھا، فوجی نظام ایک بورڈ کے سپرد تھا جسکو دیوان الارض کہتے تھے، یہ لفظ ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں اکثر آیا ہے، ہر شہر کی پولیس علیحدہ تھی، تجار کے منتخب نمایندوں کی ایک مجلس ہوتی تھی جو تمام تجارتی امور و حالات کی ذمہ دار تھی، اس جماعت کا صدر خود اسی کا ایک رکن ہوتا تھا،

اکثر بڑے شہروں میں کونسلیں ہوتی تھیں جن میں مقامی معززین اور بعض اوقات حکومت کے نمایندے بھی شامل ہوتے تھے، اس کونسل کا صدر انتخاب کے ذریعہ سے ہوتا تھا، جیساکہ موجودہ زمانہ میں رائج ہے۔

نظامِ عدل کا مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا، غیر مسلموں کے قانونی حقوق و معاملات کا تصفیہ خود اُن کے قبائل کے سرداروں اور ججوں کے سپرد تھا۔ ہر شہر میں ایک قاضی ہوتا تھا، اور بڑے شہروں میں متعدد نائب قاضی ہوتے تھے بغداد کا خاص قاضی قاضی القضاۃ کہلاتا تھا، اور سلطنت کا مخصوص قانونی مجوز سمجھا جاتا تھا، قاضیوں کی امداد کے لئے عہدہ داروں کا ایک دوسرا طبقہ قائم کیا گیا تھا جس کو عدل کہتے تھے۔

فوجداری کا نظام مجسٹریٹوں کے ہاتھ میں تھا جن کو صاحب المظالم کہتے تھے، لیکن اعلیٰ ترین عدالت وہ بورڈ تھا جو شکایات کے تدارک کے لئے قائم تھا، اس کا صدر خود بادشاہ یا اُس کی عدم موجودگی میں کوئی خاص عہدہ دار ہوتا تھا۔ اس بورڈ کے دیگر ارکان قاضی القضاۃ حاجب مخصوص وزراء حکومت اور متعدد مفتی ہوتے تھے جو خاص طور پر شرکت کے لئے بلائے جاتے تھے، اس عدالت کے قیام و تاسیس کی ضرورت اس بنا پر محسوس ہوئی کہ اکثر جب مدعا علیہ معزز یا حکومت کا عہدہ دار ہوتا تھا تو قاضی کے فیصلوں کی تعمیل اور اس کے احکام کے اجرا میں دقت واقع ہوتی تھی، لیکن اس عدالت العالیہ کے احکام سے کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی ذی جاہ اور صاحبِ اقتدار ہو، سرتابی نہیں کرسکتا تھا،

سلاطینِ عباسیہ کو رعایا کی خوشحالی کا خاص خیال رہتا تھا، اور اُن کے آرام و آسائش کے لئے ہر وقت کوشاں رہتے تھے خلیفۂ عباسیہ ثانی منصور نے گیہوں اور جوار کے ٹیکس کو جو پہلے نقد تھا فصل کے ایک مخصوص اندازہ کے مطابق جنس کی صورت میں بدل دیا، لیکن اور معمولی زراعتی فصلوں کھجور اور بارآور درختوں پر وہی سابق نقدی ٹیکس قائم رہنے دیا۔ لیکن چونکہ اکثر اس کے ذریعہ سے عمالِ مال کو جبر و تشدد کا موقع ملتا تھا اس لئے اس کے بیٹے مہدی نے تخت نشین ہونے کے بعد اس تخصیص کو بھی مٹادیا اور عام حکم دے دیا کہ ہر حالت میں صرف واقعی پیداوار کے پرتہ سے ٹیکس وصول کیا جائے، اگر زمین خاص طور پر سرسبز و شاداب ہوتی تھی اور اُس کی کاشت کے لئے معمولی محنت کافی ہوتی تھی تو کاشتکار نصف فصل حکومت کو دیتا تھا، اگر زمین کی آبپاشی میں زیادہ خرچ اور دقت اٹھانی پڑتی تھی تو ایک ثلث، اور جہاں اور مشکلات کا سامنا ہوتا تھا وہاں صرف ایک ربع اور بعض اوقات ایک خمس، انگور، کھجور، اور دیگر قسم کے باغات پر ٹیکس اس طرح تشخیص کرتے کہ اُن کی فصلوں کا اندازہ نقد میں کرلیتے اور اس رقم کے نصف یا ثلث پر شرح کا تعین کردیتے، اکبر نے اپنی اصلاحی انتظامات میں ان قواعد سے دوبارہ کام کیا تھا،

سپین میں بھی نظامِ حکومت زیادہ تر انہی اصولوں پر مبنی تھا، اگرچہ سلطان حکومت کا اعلیٰ ترین سردار تھا لیکن

جہاں تک حکومت کے عملی انتظام کا تعلق تھا، وہ وزرا کے ہاتھ میں تھا، ہر محکمہ ایک وزیر کے سپرد تھا، خاص طور پر چار محکمے تھے، مال، امورِ خارجیہ، قضا، فوجی نظام، ان وزرا کی ایک کونسل تھی جس کا صدر حاجب کہلاتا تھا، وہ براہِ راست سلطان سے تعلق رکھتا تھا، اور تمام شاہی احکام بذاتِ خود لے کر اُن کی تعمیل کراتا تھا، غیر مسلموں کے حقوق کی نگہداشت ایک علیحدہ عہدہ دار کے سپرد تھی۔ سپین میں قاضی کا عہدہ بہت زیادہ معزز خیال کیا جاتا تھا،

دیگر مشرقی ممالک کی عورتوں کی بہ نسبت عرب کی عورتیں اکثر قیود سے زیادہ آزاد تھیں، عام طور پر وہ باہر نکلتی تھیں اور علانیہ تقریریں کرتی تھیں، منصور کی بھتیجیاں فوجی لباس پہن کر میدانِ جنگ میں جاتی تھیں، اور سپاہیوں کی ہمت افزائی اور مجروحین کی خدمت کرتی تھیں، صدیوں تک مغربی مسلمانوں میں تہذیب کی یہی حالت رہی، قدیم یونان میں عورتیں دنیا سے بالکل بے تعلق تھیں، روس میں پیٹر اول کے زمانہ تک عورتوں کو کسی معاملہ میں دخل دینے کا کوئی حق نہ تھا، ایران میں بھی یہی حال تھا، قدیم ہندوستان میں عورتوں کی آزادی کا بہت شور سنا جاتا ہے، لیکن دروپدی کا جو انجام ہوا اس سے بالکل برعکس نتیجہ نکلتا ہے، مہابھارت کے پڑھنے والوں کو معلوم ہے کہ اس کے شوہر نے قمار بازی کے موقع پر کس طرح اس کو داؤ پر چڑھا دیا تھا، اور جب شوہر ہار گیا تو وہ کس طرح اندرونی کمرے سے بال پکڑ کر باہر گھسیٹی گئی، علاوہ اس کے منو نے عورتوں پر جو قیود عاید کئے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں اس جنسِ لطیف کی تمدنی حالت کچھ بہت زیادہ خوشگوار اور مسرت انگیز نہ تھی،

اگرچہ ان مختلف قوموں سے اختلاط کی وجہ سے عرب کی شجاعت میں ایک حد تک تنزل آگیا، تاہم جہاں تک عورتوں کی عزت و احترام کا تعلق تھا، اس میں بہت کم فرق آیا، اور مسلمان عورتیں اب بھی اپنے ملک کی تمدنی ترقی میں نمایاں حصّہ لیتی رہتی تھیں، سپین کے عربوں میں بھی عورتوں کو خاص عزت حاصل تھی، وہ علوم و فنون کی تحصیل اور عام طور پر تقریریں کرتی تھیں، اکثر تماشوں میں بھی شریک ہوتی تھیں۔

ہندوستان میں بھی پٹھان اور ترکی بادشاہوں کے زیرِ حکومت عورتوں کو غیر معمولی عزت حاصل تھی، بادشاہ کی حرمِ خاص کو "ملکۂ جہاں" کا خطاب ملتا تھا، اکثر "مخدومۂ جہان" بھی کہتے تھے۔ اکبر کی ماں حمیدہ بانو تاریخ میں مریم مکانی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اعزاز صرف برائے نام نہ تھا، بلکہ ان کی دماغی اور علمی قابلیت دراصل اس کی مستحق تھی۔ رضیہ سلطان بیگم نے جس قابلیت، ہمت اور عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی اس سے ہر شخص واقف ہے، اکبر کی رفیقِ زندگی سلیمہ سلطان بیگم نہایت قابل شاعرہ تھی، اور عام طور پر عزت کے ساتھ دیکھی جاتی تھی، زمانۂ مابعد میں اودھ کے شاہی خاندان کی عورتیں بھی تمدنی اور سیاسی حیثیت سے غیر معمولی اقتدار و اثر رکھتی تھیں،

اگرچہ آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں عرب سندھ میں اقامت گزین ہو چکے تھے، لیکن ان کے حالات بہت کم معلوم ہیں، ہندوستان کی اسلامی تہذیب کی ابتدا در اصل اس وقت سے ہوئی، جب کہ غزنویوں نے اپنے کوہستانی ملک سے باہر نکل کر لاہور میں حکومت قائم کی،

اب ہم اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں، جو تین مختلف دوروں میں آسانی سے تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) پٹھان (۲) مغل، (۳) اور سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد کا زمانہ،

محمود اور اُس کے جانشینوں کے زمانۂ حکومت میں تمدن اور علوم وفنون کی جو حالت تھی اس کے متعلق البیرونی بیہقی اور دیگر ہمعصر وقائع نگاروں کی تصانیف میں تاریخی معلومات کا ایک معتد بہ ذخیرہ موجود ہے، محمود باوجود اپنی کمزوریوں کے علوم وفنون کی تربیت اور سرپرستی میں نہایت فیاضی اور دریا دلی سے کام لیتا تھا، اور اس کے دربار میں فضلا اور شعرا کا ایک مجمع رہتا تھا، علاوہ اس کے اُس نے غزنی اور دیگر مخصوص شہروں میں ترکی طرز پر بہت سی خوبصورت عمارتیں بنوائی تھیں، لیکن اُس کا نام خاص طور پر اُس کے وزیر خواجہ حسن میمندی کی وجہ سے مشہور ہے، جس نے ایک نہایت مفید قانونِ مال گذاری وضع کیا تھا، یہ قانون ایران اور مغربی ایشیا میں رعایا کے لئے اس قدر مفید اور راحت آفرین ثابت ہوا کہ ناصر خسرو جو ایک مشہور سیاح گذرا ہے اس نے ان ممالک کو چمن زار بیان کیا ہے، حسن میمندی درحقیقت زمانۂ حال کے وزرائے مال کا ایک نمونہ تھا، پٹھانوں کے زمانۂ حکومت میں بھی مالی نظام میں کوئی اصلاح یا تغیر کرنا ہوتا تھا تو ہمیشہ اسی کے اصولِ قانون کو مدنظر رکھتے تھے، محمود کے آخر زمانۂ حکومت میں اس پر دفعتہً شاہی عتاب نازل ہو گیا اور وہ محمود کی وفات تک قعرِ مذلت میں پڑا رہا لیکن جب اس کا بیٹا مسعود تخت نشین ہوا تو اُس نے دوبارہ حسن میمندی کو طلب کیا، اور وزارت قبول کرنے پر آمادہ کیا، مسعود بہ نسبت اپنے باپ کے زیادہ متحمل، دور اندیش اور منکسر المزاج تھا، اور تجربہ کار ملازمین کے صلاح و مشورہ کو بغور سنتا اور اُس سے فائدہ اٹھاتا تھا، اُس کے زمانہ میں فضلا کی ایک جماعت تھی جس کا وہ خود صدر تھا، البیرونی بھی اس کا ایک رکن تھا، اور اکثر علمی بحثوں میں شریک رہتا تھا، وزرا کا ایک دفتر بھی تھا، جہاں ارکانِ حکومت بجز جمعہ کے روزانہ جمع ہوتے تھے۔

مسعود کے جانشین اگرچہ شاہی خاندان کے اقتدار و عظمت کو قائم نہ رکھ سکے تاہم علم وفن کی سرپرستی اور قدر شناسی میں کسی سے پیچھے نہ تھے" سلطان ابراہیم جس کا انتقال ۱۰۹۸ء میں ہوا، خود ایک ممتاز شاعر اور فلسفی ہونے کے علاوہ علما کا بہت بڑا دوست اور قدر شناس تھا، اور اُس کے دربار میں وسطِ ایشیا کے ہر حصہ سے صاحبانِ فن کا مجمع رہتا تھا، حکیم سنائی اُسی کے زمانہ میں تھے، اور اکثر اُس کے دربار میں حاضر ہوتے رہتے تھے،

ہندوستان کی مستقل فتح وتسخیر کا کام غور کے افغان بادشاہوں نے شروع کیا، پنجاب سے خاندانِ غزنوی کے قدم اکھڑ چکے تھے، اور اس وقت جب کہ ہنری آف آنجو (Henry of Anjou) انگلستان کا بادشاہ تھا، شہاب الدین محمد افغانستان پر حکومت کر رہا تھا، اجمیر کے راجپوت بادشاہ سے شکست کھانے کے بعد شہاب الدین نے ۱۱۹۱ء میں پانی پت کے میدان میں ہندوؤں کو بالکل پامال کر دیا، اور اسلامی ہند میں اسلامی شہنشاہی قائم کر دی،

مسلمانوں نے ہندوؤں کے قدیم حقوق، اور رسم و رواج سے بالکل تعرض نہیں کیا، قانونِ مال گذاری بدستور سابق قائم رہا، معمول سے زیادہ رعایا سے لگان وصول نہیں کیا جاتا تھا، دیہات کے نظامِ برادری میں کوئی مداخلت نہیں کی گئی، قانون میں بھی کوئی تغیر نہیں کیا گیا، مثاکشرا جو ہندوؤں کی مخصوص قانونی کتاب ہے، بارھویں صدی میں ایک مسلمان بادشاہ کی سرپرستی میں دوبارہ مدون کی گئی تھی، مفتوحین کی زبان بھی فاتحین کی زبان سے مختلف تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے، کہ ہندو درباروں میں فارسی کا رواج تھا جیسا کہ شہاب الدین کے قاصد کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے، جو اُس نے راجپوت بادشاہ سے شرائطِ صلح کے متعلق کی تھی، سنسکرت، بے شبہ ہندوؤں کی مقدس زبان تھی لیکن اُس وقت ایک عام زبان وجود میں آ رہی تھی جس نے فاتح و مفتوح کے درمیان رشتۂ اتحاد کا کام دیا۔

مسلمانوں کا سیاسی اقتدار جب دلّی میں مستحکم ہو گیا، تو ہندوستان میں ایک جدید تہذیب کا دور شروع ہوا جس کے آثار کی جھلک اب تک محسوس ہوتی ہے، انگریز مصنفین کا اب تک خیال ہے، کہ پٹھانوں کے زمانۂ حکومت میں بجز جور و ظلم اور خونریزی کے اور کچھ نہ تھا، اس میں شبہ نہیں کہ یورپ کی طرح اس دور کے تاریخی صفحات کشت و خون سے رنگین ہیں۔ اور اکثر فرمانروایانِ سلطنت وحشی، نیم تعلیم یافتہ اور رعایا کے مفاد سے غافل ہوتے تھے، لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو نہایت ہوشمند مدبر، رعایا کے خیر خواہ، اور علم و فن کے مربی تھے، اُن میں سے ایک ممتاز فرمانروا سلطان شمس الدین التمش تھا جو ۱۲۱۱ء میں مسند آرائے حکومت ہوا تھا، تاتار کے سیلابِ مظالم کی زد سے جو علما جان بچا کر بھاگے تھے، ان کو اسی کے دربار میں پناہ ملی، جہاں بحیثیت مہمان کے اُن کا استقبال کیا گیا، امیر خسرو نے جو دو برس تک تاتاریوں میں مقید تھے، ان مظالم کا تذکرہ نہایت دلچسپ انداز میں لکھا ہے، بارہ سال بعد منہاج السراج التمش کے دربار میں ملازم ہوا، اور اُس وقت سے اس کی نگرانی میں دلی کے روزانہ واقعات وحالات قلمبند ہونے لگے، اُس نے نہ صرف شاہی فتوحات کا تذکرہ کیا ہے، بلکہ یہ بھی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ ملکی نظم و نسق کا کیا اصول تھا اور مختلف ارکانِ حکومت کس طرح مقرر ہوتے تھے، التمش نے جو مسجد اور کالج تعمیر کرائے تھے، وہ متعدد صدیوں تک قائم رہے، اور ان میں وقتاً فوقتاً تجدید ہوتی رہتی تھی، حوضِ شمسی جو دلّی کی ایک خاص چیز تھی اکبر کے زمانہ تک قائم رہا، التمش کی بیٹی رضیہ بیگم کی وفات کے بعد اُس کے دو نا اہل بھائی تخت نشین ہوئے، لیکن تیسرا بھائی

نصیر الدین ایک لائق حکمران ثابت ہوا، منہاج السراج نے اسی کے عہد میں اپنی تاریخ مکمل کی، جو طبقات ناصری کے نام سے مشہور ہے،

اس زمانہ میں بہ نسبت پہلے کے ملک کے اندرونی حالات اور رفتار ترقی کے متعلق بہت زیادہ معلومات کا ذخیرہ ملتا ہے، حکومت کے امرا کو عام طور پر ملک کے لقب سے پکارتے تھے، اور جب کوئی ان میں سے بلند تر درجہ کو پہنچتا تھا، تو اس کو خان کا خطاب ملتا تھا، امیر العسکر کو عز بک کہتے تھے، خاص مذہبی پیشوا کا لقب شیخ الاسلام تھا۔

نصیر الدین کے زمانہ حکومت میں دو اشخاص نہایت فاضل اور مدبر گذرے ہیں، جن کی بدایونی نے بہت زیادہ مدح سرائی کی ہے، ایک اُن میں سے شمس الدین تھا، جو علمی حیثیت سے دبیر کے نام سے مشہور ہے، امیر خسرو نے اپنی مثنوی ہفت بہشت میں اس کی بہت تعریف کی ہے، دوسرا امیر فخر الدین تھا، جو ابن الکلام کے نام سے مشہور ہے،

ہندوستان کے پٹھان حکمرانوں میں سب سے زیادہ ممتاز تین نام نظر آتے ہیں جنہوں نے ہندوستان کی تمدنی ترقی میں مخصوص حصہ لیا تھا، یعنی بلبن، تغلق، اور فیروز، ضیاء الدین برنی نے بلبن کے زمانہ کے حالات کا نہایت مفصل اور مبسوط تذکرہ کیا ہے، بلبن ۱۲۶۵ء میں تخت نشین ہوا تھا، رضیہ بیگم کے بعد جو بادشاہ ہوئے تھے، اُن کی کمزوریوں نے ملک میں ایک عام بدامنی پھیلا دی تھی، رہزنوں کی مستقل جماعتیں تھیں، جو جنگلوں سے نکل کر عام طور پر ڈاکے مارتی تھیں، بلبن نے اپنی توجہ خاص طور پر قیام امن کی طرف مبذول کی، اور اکثر اس تشدد سے کام لیتا تھا کہ بے رحمی کے درجہ تک پہنچ جاتا تھا، لیکن اس وقت کے حالات اسی کے مقتضی تھے، نظام عدل تجربہ کار حکام کے سپرد تھا، ضیاء الدین برنی کا بیان ہے، کہ بلبن عدل و انصاف کا نہایت شدت سے پابند تھا، اور اپنے بھائیوں، ملازموں، دوستوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتا تھا، اور ہمیشہ مظلومین کی اعانت کے لئے تیار رہتا تھا، مورخ مذکور کا مزید بیان ہے، کہ اپنی چہل سالہ حکومت کے زمانہ میں اُس نے کبھی کسی ادنیٰ حیثیت کے آدمی سے گفتگو نہیں کی، اور نہ کبھی اپنے شاہانہ اقتدار کے خلاف کسی شخص سے بے تکلف ہوا، وہ کسی سے مذاق نہیں کرتا تھا، اور نہ کسی کو اُس کی موجودگی میں مذاق کرنے کی مجال تھی، وہ کبھی زور سے نہیں ہنستا تھا۔ اور نہ کسی کو اس کے دربار میں اس کی ہمت ہوسکتی تھی،

مظالم کے انسداد کی غرض سے اُس نے ہر شہر میں ایجنٹ مقرر کر دیئے تھے، جو خفیہ طور پر اس کو حالات کی اطلاع دیتے رہتے تھے، کبھی کبھی یہ لوگ اپنے عہدے سے ناجائز فائدہ اٹھا کر جبر سے کام لیتے تھے، لیکن جب اُس کو اس کی اطلاع ملتی تھی تو وہ شدید ترین سزائیں تجویز کرتا تھا، علاوہ اس کے اُس نے ملک پر جو خاص احسان کیا وہ یہ تھا کہ شمالی ہند کے اکثر جنگلوں کو کٹوا کر صاف کرا دیا، اور ڈاکو جو اُن میں رہتے تھے بالکل نیست و نابود کر دیئے گئے، اور اس طرح اُس نے ان رہزنوں کی سفاکیوں

سے ملک کو نجات دے دی، اُس نے مختلف اطراف میں افواج و تجار کی آمد و رفت کے لئے سڑکیں بنوائیں، اور حفاظت کے لئے مخصوص مقامات پر چوکیاں بھی قائم کر دیں، ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ "ساٹھ برس گذر چکے ہیں لیکن اب تک سڑکیں محفوظ و مامون ہیں"

بلبن کا فرزند اکبر محمد فتح خاں نہایت قابل اور بہادر سپاہی تھا۔ اس کے دربار میں اس زمانہ کے بہترین اور فاضل ترین افراد کا مجمع رہتا تھا، اکثر شاہنامہ، اور سنائی، خاقانی، نظامی کے اشعار اس کے سامنے پڑھے جاتے تھے، اور اُن کے محاسن پر بحث ہوتی تھی۔ امیر خسرو اور امیر حسن جو پانچ سال تک ملتان میں دربارِ شاہی سے وابستہ رہے شاہزادہ اُن کی بہت عزت کرتا تھا۔

اگرچہ اس وقت تک ہندوستان کی قومیت پردہ مستقبل میں تھی، تاہم خسرو صحیح معنوں میں قومی شاعر تھا۔ اس کو اپنے وطن سے غیر معمولی محبت تھی، اور اُس کی تصنیفات ہندوستان کی مدح و توصیف سے مملو ہیں، چنانچہ مغربی مخالفین کی طرف مخاطب ہو کر جوش میں کہتا ہے،

"تم اس کو کالا ملک کہو، لیکن وہ عروسِ نو کی طرح حسین ہے، سرسبز و شاداب ہے اور براعظم کی طرح وسیع ہے"

موجودہ مخلوط زبان جس کا نام اردو ہے اس کی تخلیق اس وقت سے شروع ہو گئی ہوگی جب کہ مغربی اور وسطِ ایشیا کی قومیں ہندوستان میں آکر آباد ہونے لگیں۔ امیر خسرو کے عہد میں یہ بالکل ابتدائی غیر منظم حالت میں تھی، اور بہت کم خط و کتابت یا علمی اغراض کے لئے مستعمل تھی، یہ لشکر کی زبان تھی جس سے عام طور پر دیہاتیوں سے معاملہ کرنے میں کام لیا جاتا تھا، امیر خسرو کے بیان کے موافق اس وقت ہر صوبہ کی ایک مخصوص زبان تھی، سندھی، لاہوری، کشمیری، بنگالی، گجراتی وغیرہ وغیرہ، سنسکرت سے صرف برہمن کام لیتے تھے، عوام اس سے بالکل نا آشنا تھے۔

سنہ ۱۳۲۰ء میں خاندانِ تغلق کے دورِ حکومت کا آغاز ہوا، اس سلسلہ کا پہلا تاجدار غیاث الدین تغلق تھا، جس کے انتظام کے متعلق ضیاء الدین برنی لکھتا ہے۔

"اگر کوئی غریب مسافر کسی آفتِ سماوی کی وجہ سے سڑک پر گر کر مرجاتا تھا تو اُس کے احکام کے مطابق تمام دیہاتی عہدیدار مع قاضیوں کے طلب ہوتے تھے، اور اُن کی موجودگی میں لاش کی جانچ کی جاتی تھی، اور ایک رپورٹ مرتب ہوتی تھی جس پر مجسٹریٹ کی مہر لگتی تھی، اور جب اس کی تصدیق ہو جاتی تھی کہ اس کے بدن پر کوئی زخم کا نشان نہیں ہے، تو لاش دفن کر دی جاتی تھی"

مورخِ مذکور کا بیان ہے کہ اس اصول کا یہ نتیجہ تھا کہ اس بادشاہ کے زمانہ میں کوئی طاقتور کسی کمزور پر ظلم نہیں کر سکتا تھا۔

غیاث الدین پانچ سال کی مختصر حکومت کے بعد انتقال کر گیا، اُس کے بیٹے اور جانشین محمد جونا خاں نے تغلق آباد کے نام سے ایک جدید شہر کی بنیاد ڈالی جس کے آثار اب تک موجود ہیں، اکثر مورخین کا خیال ہے کہ وہ نصف دیوانہ تھا، عبدالقادر بدایونی کا بیان ہے کہ

"از افراط ظلم و تعدی سلطان کردہ اعتقاد او عین عدل بود ملک برباد شد"

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ باوجود ظلم و تعدی کے جس کی وجہ سے تمام ملک میں برہمی پھیلی ہوئی تھی اس ظالم کے دربار میں اکثر ارباب علم و فن کا اجتماع رہتا تھا، ضیاء الدین برنی مورخ اس کا دوست تھا جس سے وہ اکثر مشورہ کرتا تھا، مشہور شاعر بدر چاچ اس کے دربار کا ملک الشعرا تھا، علاوہ ان کے ظہیر الدین معمار، شہاب الدین ابوالعباس احمد خطیب، سراج الدین ابوالفتح عمر مقنن جونا خاں کی سرپرستی سے فیضیاب تھے، لیکن ان ارباب فن میں سے خاص ذکر کے قابل مشہور سیاح اور مورخ ابن بطوطہ ہے جس نے ۱۳۳۳ء میں دلی کا سفر کیا تھا، اور شہر کی وسعت اور دیگر خصوصیات کا دلچسپ تذکرہ چھوڑا ہے۔ اُس نے خاص شہر کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"دیوار جس سے دلی محدود ہے اس کی کوئی مثال نہیں، گیارہ کیوبٹ موٹی ہے، اس میں مختلف کمرے بنے ہوتے ہیں جن میں محافظین اور پاسبان رہتے ہیں، ان کمروں میں سامان جنگ و خورد و نوش بھی رہتے ہیں۔ غلہ بغیر خراب ہوئے پڑا رہتا ہے، میں نے ایک کمرے میں سے چاول نکلتے ہوئے خود دیکھا تھا، رنگ سیاہ تھا، لیکن خوش ذائقہ تھا، یہ تمام غلے سلطان بلبن نے نوے سال قبل سے جمع کر رکھے تھے، پیدل اور سوار شہر کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک اس دیوار کے اندر سے گذر سکتے ہیں، شہر کی طرف اُس کے اندر روشنی کے لئے دریچے موجود ہیں، دیوار کا نیچے کا حصہ پتھر کا بنا ہوا ہے اور بالائی حصہ اینٹوں کا، شہر میں اٹھائیس دروازے ہیں"

اس زمانہ میں پوسٹمین (خطرسان) ڈاک کا تھیلا ٹھیک اسی طرح لے کر چلتا تھا جس طرح آج دیہاتوں اور غیر معروف قصبوں میں ایک لمبے ڈنڈے پر جس کے ایک سرے پر آہنی حلقہ ہوتا ہے تھیلے کو رکھ کر جھنجھناتا ہوا چلتا ہے، اور اس طرح وہ اکثر دن میں بیس تیس میل کی مسافت طے کر لیتا تھا،

علاؤالدین اور جونا خاں کے عہد میں بھی علمائے مذہبی اور حکام عدالت کو جو آزادی تقریر و عمل حاصل تھی وہ ان سلاطین کی فطرت کا لحاظ رکھتے ہوئے واقعی حیرت انگیز ہے، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے جو بہلول لودی کے زمانہ میں وجود پذیر ہوا، بہلول کا بیٹا ناظم خاں جو بعد کو سکندر لودی کے نام سے مشہور ہوا، اس واقعہ کے وقت

دلی کے اقطاعِ مشرقی کا گورنر تھا، اس کو خبر دی گئی کہ تھنیشور سے قریب کرکھت میں مفسد ہندوؤں کا ایک گروہ اپنے مقدس تالاب میں نہانے اور اس جگہ جو مندر واقع ہے اس میں عبادت کرنے کی غرض سے جمع ہوا ہے، اُس نے فوراً اُن کے قتل کا ارادہ کر لیا۔ لیکن اس کی تعمیل سے پہلے اس کو مشورہ دیا گیا کہ وہ اس معاملہ میں ماہرین قانون سے رائے طلب کرے، چنانچہ یہ لوگ جمع ہوئے، اور ان میں جو سب سے زیادہ ممتاز تھا اور ملک العلما کا خطاب رکھتا تھا اس کے سامنے ناظم خاں نے یہ سوال پیش کیا کہ آیا میں ہندو پرستاروں کے قتل کرنے میں حق بجانب ہوں؟ واقعہ نگار کا بیان ہے کہ ملک العلما نے سلطان کو یہ یقین دلایا کہ یہ اس کے لئے نہایت نامناسب ہوگا کہ وہ ایک قدیم بت خانہ کو برباد کرے، اور رسومِ مذہبی کے ادا کرنے میں مانع و مزاحم ہو، یہ گفتگو تھوڑی دیر تک جاری رہی، پھر دفعتہً سلطان نے اپنا ہاتھ تلوار پر رکھ کر غضبناک لہجہ میں کہا "تم کفار کی طرفداری کرتے ہو، میں سب سے پہلے تمہارا ہی خاتمہ کر دوں گا اور تب کرکھت کے مشرکین کو قتل کروں گا" اُس نے جواب دیا۔

"ہر شخص کی جان خدا کے ہاتھ میں ہے، کوئی شخص بغیر اس کے حکم کے مر نہیں سکتا، جو شخص ایک ظالم کے سامنے آتا ہے اس کو پہلے ہی سے موت کے لئے تیار رہنا چاہئے، جو کچھ بھی ہو، تم نے مجھ سے ایک سوال کیا، احکامِ رسول کے مطابق میں نے اس کا جواب دے دیا، اگر تم اُن کا احترام نہیں کرتے تو اس تحقیقات سے کیا فائدہ؟"

اس دلیرانہ جواب نے بادشاہ کے غیظ و غضب کا سارا جوش ٹھنڈا کر دیا۔

ہندوستان ہو یا یورپ ہر جگہ اس قسم کی مثالیں اس دور میں بکثرت ملتی ہیں، جب کہ انسانی زندگی اور انسانی حقوق کی قیمت نہایت ارزاں خیال کی جاتی تھی۔

جونا خان کے زمانہ میں خواجہ کمال الدین احمد جو بہت بڑا صاحبِ علم تھا چیف جسٹس تھا جس کو عام طور پر صدر الصدور یا صدرِ جہاں کہتے تھے۔ ہندوستان میں حکومتِ برطانیہ کے زمانہ میں ایک مدت تک لفظ صدر کا استعمال جاری رہا، ایسٹ انڈیا کمپنی نے مفصل عدالتوں کے لئے حکام کے تین درجے قائم کئے تھے ایک منصف جو اب تک قائم ہے دوسرا صدر امین اور اس پر صدر امین اعلیٰ جن کو اب سب جج کہتے ہیں۔

جونا خاں کی وفات کے بعد اعیان و امرائے حکومت نے اُس کے بھتیجے فیروز کو تختِ شاہی کے لئے منتخب کیا۔ جو اپنے محاسن اور قابلیتوں کے لحاظ سے اُن تمام بدنظمیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے جو سابق بادشاہ کی بددماغی اور برہم مزاجی کی وجہ سے سلطنت میں پیدا ہوگئیں تھیں، سب سے زیادہ موزوں اور اہل تھا۔ جونا خاں نے خزانۂ شاہی

بالکل خالی کر دیا تھا، اس کے زمانہ حکومت کے اختتام تک دلی کی صورت بالکل ایک ویرانے کی ہوگئی تھی تخت نشین ہوتے ہی فیروز کی پہلی کوشش یہ ہوئی کہ رعایا کو واپس بلا کر آباد کیا جائے، اور اُن کے قلوب میں حکومت کا اعتبار قائم کیا جائے، چنانچہ وہ اپنی اس کوشش میں جس حد تک کامیاب ہُوا، اُس کا چشم دید تذکرہ ضیا برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں ان الفاظ میں کیا ہے

"میں جس مقام پر جاتا ہوں، خواہ وہ مسجد ہو، یا عیدگاہ، سرائے ہو یا بازار، وہاں انسانوں کے ہجوم اور ان کی خوش حالی اور سکون وطمانیت پر میں متحیر ہو جاتا ہوں، اور مجھ کو تعجب ہوتا ہے کہ یہ مجمع آخر کہاں سے ابل پڑا ہے"

مورخین کا بیان ہے کہ رعایا کے لئے سامانِ امن وسلامتی کی فراہمی سے فارغ ہو کر فیروز نے اپنی توجہ تین خاص امور کی طرف مبذول کی، ایک قیدیوں کی رہائی۔ دوسرے مظلومین کی دادرسی، اور تیسرے مذہبی اور تعلیمی عمارتوں کی تجدید وتعمیر

ممالکِ مفتوحہ کے ساتھ وہ نہایت رحمدلی سے پیش آتا تھا، اُس کو دشمن کی عورتوں کی عزت کا اتنا خیال تھا، کہ وہ کبھی اس کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ کوئی مقام جبر وزور سے حاصل کیا جائے، تاکہ اُس کے سپاہیوں کو کسی قسم کی دست درازی کا موقع نہ مل سکے،

بنجر زمینوں کو قابلِ کاشت بنانے کے لئے اُس نے متعدد نہریں تعمیر کرائیں، جن میں سے ایک اب تک موجود ہے، اِن نہروں کی نگرانی اور ان کو سیلاب سے محفوظ رکھنے کے لئے اُس نے متعدد عہدہ دار مقرر کئے، دلّی سے چار میل کے فاصلہ پر اُس نے ایک شہر فیروز آباد کے نام سے تعمیر کیا، جس میں مسجدیں مدرسے اور شفاخانے بنوائے، شمس سراج کا بیان ہے کہ آٹھ عام مسجدیں جو سلطان نے تعمیر کرائی تھیں، ان میں سے ہر ایک دس ہزار آدمیوں کی وسعت رکھتی تھی۔ سواری کے لئے گھوڑے اور خچر ہر وقت تیار ملتے تھے، لیکن جو لوگ گھوڑے کی سواری پسند نہیں کرتے تھے اُن کو گاڑیاں بھی ملتی تھیں جن کو گھوڑے یا خچر کھینچتے تھے، ان گاڑیوں کا کرایہ نہایت کم تھا، پالکی مع کہار کے ہر وقت مل سکتی تھی، طویل سفر کے لئے اونٹ گاڑیوں سے کام لیتے تھے؛

شفاخانوں اور مدرسوں کے اخراجات کی خود حکومت کفیل ہوتی تھی، فیروز کو باغ کا اس قدر شوق تھا کہ اُس نے اپنے صرفِ خاص سے دہلی اور اُس کے قرب واطراف میں بارہ سو باغات تیار کرائے، شفاخانوں کے علاوہ اُس نے ایک لنگر خانہ قائم کیا تھا، جہاں غربا اور مساکین کو روزانہ کھانا ملتا تھا، بے کاری کے انسداد کے لئے اُس

نے ایک مستقل نظام مقرر کر رکھا تھا،

فیروز نے اپنی تاریخ فتوحاتِ فیروز شاہی میں اپنے مورثوں کی یادگاروں کا حال لکھنے کے بعد خود اپنے رحم و انصاف کے کارناموں کا نہایت سادگی کے ساتھ تذکرہ کیا ہے جن میں سے دو واقعات خاص طور پر نہایت دلچسپ ہیں۔ لکھتا ہے۔

"میں نے خدا کی عنایت سے ایک دار الشفا تعمیر کیا جس سے ہر شخص کو خواہ وہ کسی درجے کا ہو امداد ملتی ہے، وہاں اطبا ہر وقت حاضر رہتے ہیں، جو مرض کی تشخیص کرتے ہیں، غذا کی نگرانی کرتے ہیں، دوا اور غذا کا خرچ خود میرے اوقاف سے دیا جاتا ہے۔ ہر قسم کے بیمار لوگ خواہ وہ مستقل باشندے ہوں، یا مسافر آزاد ہوں یا غلام وہاں آتے ہیں، ان کے امراض کا علاج کیا جاتا ہے، اور وہ خدا کی مہربانی سے صحت یاب ہوتے ہیں"

"ہدایت ربانی کی ایک دوسری مثال یہ تھی، میرے پیشرووں کے زمانہ حکومت میں لوگوں کی جائدادیں اور زمینداریاں وغیرہ چھین کر سلطنت کے حق میں ضبط کر لی گئیں تھیں، میں نے عام حکم جاری کر دیا کہ جس کا جائداد پر جو حق ہو، وہ عدالت میں مقدمہ دائر کرے، اور استحقاق ثابت ہونے پر وہ چیز اُس کو دے دی جائے، خدا نے مجھ کو اس کار خیر کی توفیق دی اور لوگوں کو اپنے حقوق مغصوبہ واپس مل گئے"

فیروز کے عہدِ حکومت کے قبل ہندو اکثر ملازمتوں پر مامور تھے، لیکن اس کے زمانہ میں ہندو حکومت کے مسلمان اعلیٰ عہدہ داروں کے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔

سنسکرت کی تحصیل و مطالعہ کا آغاز اگرچہ بہت پہلے ہو چکا تھا، لیکن اس بادشاہ کی سرپرستی میں اس کو غیر معمولی تحریک ہوئی، چنانچہ اُس کے حکم سے عزالدین خالد خانی نے جس کو شیخ عبدالقادر نے عہدِ فیروزی کے اربابِ فن میں شمار کیا ہے نجوم، موسیقی، طب وغیرہ پر اکثر سنسکرت تصانیف کا ترجمہ کیا، ان کو مجموعی طور پر دلائلِ فیروزی کہتے تھے، مولانا داؤد نے سنسکرت کی مشہور نظم چندبن کا فارسی میں ترجمہ کیا، قاضی ظہیر دہلوی اور ملک احمد اس زمانہ کے مشہور شعرا تھے،

فیروز کے زمانہ میں حکومت کے دو خاص شعبے تھے، ایک دیوان الوزارت جس کے متعلق ملکی نظم و نسق کا فرض تھا، اور دوسرا دیوان الارض یعنی دفترِ جنگ، سب سے پہلے اسی کے زمانہ میں اوقاتِ نماز وغیرہ کے اعلان کے

لئے تاس گھڑیال وجود میں آیا،

ہندوستان کم ازکم تین شہروں کی تعمیر و تاسیس کے لئے فیروز کا رہین منت ہے، یعنی ہسار، جان پور، اور فیروز آباد، لیکن بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں کہ اسی نیک دل سلطان کی بدولت آگرہ کی دوبارہ تعمیر اور آبادی وجود میں آئی تھی،

فیروز نے تقریباً ۳۸ سال کی حکومت کے بعد ۲۶ ستمبر ۱۳۸۸ء کو ۹۰ سال کی عمر میں وفات پائی، اور اس کی موت کے ساتھ پٹھانوں کی حکومت کے جاہ و جلال کا خاتمہ ہوگیا۔

مرزا احسان احمد

زندگی

زندگی ایک سفر ہے — وکٹر ہیوگو

زندگی خواب ہے اور موت بیداری — برتیو مل

زندگی عجز و انکسار پر ایک طویل سبق ہے — بیری

زندگی ازل اور ابد کے درمیان ایک ہلکی سی ضیا ہے — کارلائل

زندگی ایک مختصر سا دن ہے لیکن سراسر مصروفیت — حنّا مور

زندگی ہم ہیں سے گزرتی ہے لیکن ہم اس پر قبضہ نہیں کر سکتے — امیل

زندگی ختم ہو جاتی ہے جب ہم زندہ رہنے کی تیاری شروع کرتے ہیں — ایمرسن

زندگی مقدس ہے لیکن اس سے مقدس تر ایک چیز اور ہے، حیف ہے اُس کے جینے پر جو مقدس کے ذریعہ سے مقدس تر کو حاصل نہیں کرتا — کارلایل

زندگی سمندر کے پانی کی مانند ہے اُسی وقت پاکیزہ ہوتی ہے جب آسمانوں کی طرف اُٹھتی ہے — جین پال

زندگی نیند ہے اور محبت خواب، جو محبت کرتا ہے وہ زندہ ہے — حمدی

وجدانیات

حریفِ شیوۂ تمکیں لبِ سوال ہوا — یہی ہوا کہ مجھے سخت انفعال ہوا

کسی کی مشقِ تغافل کا جب کمال ہوا — لبِ خموش بھی آمادۂ سوال ہوا

مری خرابیِ دل میں ہنوز شک ہے اُسے — کہ پھر وہ مائلِ آرائشِ جمال ہوا

امید کا ہے تقاضا کہ ناامیدی کا — دلِ ستم زدہ بیتابِ عرضِ حال ہوا

یہی سزا ہے کہ ہو پائمالِ جورِ فلک — وہ دل جو تیری جفا کا نہ پائمال ہوا

کسے ہو دید کی رخصت یہاں کہ دیدۂ شوق — شریکِ حیرتِ آئینۂ جمال ہوا

تیری جفا کا تو احساں ادا ہوا نہ ابھی — ستم ہوا کہ وفا کا تجھے خیال ہوا

بہارِ گلشنِ امید کا مآل نہ پوچھ — وہ خواب رونقِ گلدستۂ خیال ہوا

یہی خیال ہے ہر دم کہ دیکھئے کیا ہو — مآلِ عشق سے بدتر غمِ مآل ہوا

وہ اس ادا سے ہوئے محوِ پرسشِ پنہاں — کہ تن پہ ہر سرِ مو وقفِ عرضِ حال ہوا

جہانِ شوق میں کیا کیا رہا ہے شور انگیز — فسونِ عشق کہ افسانۂ جمال ہوا

نہیں ہوں عشق کی دریا دلی سے بے بہرہ — کہ سینہ مخزنِ غمہائے لازوال ہوا

ہے ذرہ پروریِ آفتاب اس کی گواہ — کہ عشق شانہ کشِ طرۂ جمال ہوا

ستم نصیب کا مرنا بھی تو نہیں ممکن — تمہارے ہجر میں جینا اگر محال ہوا

پڑا ہے کام عجب مارِ آستیں سے ہمیں — ہمارے سینے میں دل جان کا وبال ہوا

بہ فیضِ صحبتِ اہلِ کمال ہے وحشت
کہ روشناسِ سخن مجھ سا بے کمال ہوا

رضا علی وحشت

تھورو کا ملاقاتی

اُس سے زیادہ سادہ مزاج اور با اصول انسان ملنا ناممکن ہے۔ برائی اور بیماری جو دنیاوی مصیبتوں کی جڑ ہیں اُس کے لئے مطلق کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھیں۔ اُس کی عمر اندازاً اٹھائیس برس ہوگی۔ بارہ سال ہوئے وہ کینیڈا میں اپنے باپ کا گھر چھوڑ کر ریاستہائے متحدہ میں آرہا کہ محنت مزدوری کرکے اور کچھ پس انداز کرکے اپنے ملک میں زمین خرید کر اپنی بقیہ زندگی آرام و آسائش میں گزار دے۔ شکل وصورت سے وہ بھدا سا معلوم ہوتا تھا۔ جسم مضبوط مگر سست سا تاہم چال پسندیدہ، موٹی سیاہ گردن، سیاہ گھنے بال اور نیلی بے رونق آنکھیں جو خوشی کے لمحوں میں اکثر اوقات چمک اٹھتی تھیں۔ وہ سر پر بھورے رنگ کے کپڑے کی چوڑی ٹوپی، جسم پر سیاہ رنگ کا بڑا کوٹ اور پاؤں میں موٹے چمڑے کے بوٹ پہنتا تھا۔ وہ گوشت بہت کھاتا تھا۔ اپنا کھانا ٹین کے ایک برتن میں اٹھائے ہوئے میرے گھر سے کچھ آگے ایک جگہ جایا کرتا جہاں وہ درخت کاٹا کرتا تھا۔ سارا موسم گرما وہ یہی کام کیا کرتا تھا۔ جب وہ میرے گھر کے پاس سے گزرتا تو کبھی کبھی مجھے پینے کے لئے قہوہ پیش کرتا۔ قہوہ ایک پتھر کی بوتل میں ہوتا جو اُس کی کمر سے لٹکی ہوتی تھی۔ وہ صبح سویرے کام پر چل دیا کرتا۔ لیکن اس کی چال سے بے فکری ٹپکتی تھی۔ وہ زیادہ کام کرکے اپنے جسم کو تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا اگر اسے اتنے پیسے مل رہتے جن سے اُس کا بخوبی گزارا ہو جاتا تو وہ بہت خوش وخرم رہتا۔ درخت کاٹنے کے کام میں اُسے خوب مہارت حاصل تھی، لیکن وہ اپنا کام ظاہرداری اور نمائش کے ساتھ کرنے کا عادی تھا۔ اس کے کاٹے ہوئے درخت ہمیشہ زمین کے برابر ہوتے تھے جس سے موسم سرما میں جب ان علاقوں میں ہر طرف برف جم جایا کرتی ہے برف گاڑیاں بغیر رکاوٹ کے اِدھر اُدھر دوڑ پھر سکتی تھیں۔

مجھے اس سے اس لئے رغبت تھی کہ وہ نہایت خاموش، تنہائی پسند اور خوش مزاج واقع ہوا تھا، اور اپنے حال پر مطمئن تھا۔ خوشی اور اطمینان اس کی آنکھوں سے ٹپکا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی جب وہ درخت کاٹ رہا ہوتا اور میں اُدھر سے گزرتا تو وہ بے انتہا خوش ہوتا، اور کینیڈین فرنچ زبان میں مجھے سلام کہتا، اگرچہ وہ انگریزی زبان بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ جب میں اُس کے پاس جا کھڑا ہوتا تو وہ کچھ عرصہ کے لئے کام چھوڑ دیتا اور میرے ساتھ باتیں کرنے لگتا بعض اوقات ایسے انداز میں ہنستا، گویا خوشی کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔ کسی معمولی سی بات پر ہنسی آجاتی تو زمین پر لوٹنے لگتا اور خوب ہنستا۔ درختوں کی طرف دیکھ کر کہتا، "خدا کی قسم، مجھے یہاں درخت کاٹنے میں بہت

لطف آتا ہے۔ میرے لئے اس سے بہتر اور کوئی مشغلہ نہیں" فرصت کے اوقات میں وہ اپنا جیبی پستول لے کر جنگل میں نکل جاتا اور تھوڑے تھوڑے وقفوں پر یونہی فائر کرتا، گویا اپنے لئے سلامی اتار رہا ہو۔ سردیوں میں میرے پاس آگ کے قریب بیٹھ کر اپنا قہوہ گرم کرتا اور جب کھانا کھانے کے لئے کسی کاٹے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھ جاتا تو چھوٹے چھوٹے پرندے درختوں سے نیچے اتر آتے اور آہستہ آہستہ اُس کے کندھوں پر آبیٹھتے اور اس کی انگلیوں میں پکڑے ہوئے آلو پر چونچیں مارنے لگتے۔ اُس وقت اس کا دل خوشی سے لبریز ہو جاتا اور وہ کہتا، "مجھے یہ ننھے ننھے پرندے بہت پیارے لگتے ہیں"

اُس میں حیوانیت کا عنصر غالب تھا۔ صبر، تحمل اور قناعت اور جسمانی تکالیف کو برداشت کر لینا یہ سب خوبیاں اس میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ایک دفعہ میں نے اس سے سوال کیا "کیا تم دن کی سخت اور صبر آزما جسمانی کاوش کے بعد رات کو تھکن محسوس نہیں کرتے؟" "نہیں" اُس نے سنجیدہ صورت بنا کر کہا "میں اپنی ساری عمر میں ایک دفعہ بھی نہیں تھکا" مگر اس میں فہم و فراست اور قوت متخیلہ تقریباً معدوم تھی۔ اور روحانی جذبات اُس کے اندر خوابیدہ معلوم ہوتے تھے اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ بچپن میں اسے روحانی تعلیم ہی کچھ ایسے طریق پر دی گئی تھی جس سے بچے کی واقفیت میں کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے برعکس اس کی عقل خام رہ جاتی ہے۔ اور جو کچھ اسے اس زمانہ میں بتایا گیا ہو اس سے کچھ زیادہ سوچنے اور سمجھنے کی طاقت اُس میں ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جاتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ قدرت نے اُسے تخلیق کرتے وقت ایک مضبوط جسم، صبر و قناعت اور خوش اعتقادی جیسی بیش بہا دولت عطا کرنے میں فراخ دلی سے کام لیا تھا تاکہ وہ ساری عمر ایک بچے کی طرح سادہ لوحی اور خوشی میں گزار دے وہ اس قدر مخلص اور سادہ مزاج تھا کہ الفاظ کے ذریعہ سے ناظرین کو اس کے ساتھ تعارف کرانا ایک دشوار امر ہے۔

اُس کے لئے دوسروں کے کاموں میں چنداں دلچسپی نہ ہوتی تھی۔ وہ وہی بات کہتا اور وہی کرتا جو اُس کے خیال میں درست ہوتی۔ لوگ اسے اس کے کام کی مزدوری دے دیتے، جس سے وہ اپنا پیٹ پالتا، لیکن اس سے زیادہ لے ہرگز کوئی تعلق ان سے نہ ہوتا۔ وہ کبھی ان لوگوں سے تبادلہ خیالات نہ کرتا۔ وہ اس حد تک سادہ تھا کہ اُسے اپنی سادگی کا بھی علم نہ تھا۔ عالم اور دانا لوگ اس کے نزدیک دیوتا تھے۔ پادریوں اور مصنفوں کی وہ خصوصاً بہت عزت کرتا۔ ان کے فعل اُس کے نزدیک بمنزلہ معجزہ کے ہوتے۔ جب میں نے اسے پہلی مرتبہ بتایا کہ میں بکثرت لکھا کرتا ہوں تو وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اُس نے خیال کیا کہ اس سے میری مراد محض خط سے ہے کیونکہ وہ خود اچھا خط لکھنا جانتا تھا۔

بسا اوقات میں برف پر فرانسیسی ہجوں میں لکھا ہوا اُس کی بستی کا نام دیکھتا جس سے میں سمجھ جاتا کہ یہ اُسی کے

ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اور یہ کہ وہ اس راستے سے گزر کر گیا ہے۔ ایک دفعہ میں نے اُس سے پوچھا کہ کیا کبھی اپنے خیالات کو لکھ کر ظاہر کرنے کا خیال اُس کے دل میں آیا ہے، تو اُس نے جواب میں مجھے بتایا کہ وہ اکثر اَن پڑھ لوگوں کے خط لکھا اور پڑھا کرتا ہے، لیکن خود خیالات قلمبند کرنے کی اُس نے کبھی کوشش نہیں کی۔ در اصل وہ یہ کر ہی نہ سکتا تھا وہ یہ معلوم نہ کر سکتا تھا کہ پہلے کون سی بات لکھے۔ وہ اس کا متحمل ہی نہ ہو سکتا تھا اور اس پر ہجوں کا خیال رکھنا اُس کے لئے ایک اور مشکل تھی۔

میں نے سنا ہے کہ ایک دفعہ ایک ممتاز ادیب نے اس سے سوال کیا "کیا تم دنیا میں تبدیلی ہوتی دیکھنا پسند کرتے ہو" اس پر وہ کچھ حیران سا ہو گیا اور یہ خیال کر کے کہ یہ سوال اس سے پیشتر کبھی کسی سے نہیں پوچھا گیا۔ جواب دیا "ہاں میں اسے پسند کرتا ہوں" کسی فلسفی کے دل میں یہ جواب سن کر کیا کچھ خیال نہ گزرتے۔ اگر کوئی ناآشنا اسے پہلی مرتبہ دیکھتا تو خیال کرتا کہ یہ شخص عام باتوں کے متعلق کوئی خاص واقفیت نہیں رکھتا، لیکن میں تو بعض اوقات اُس میں ایسی خصلتیں موجود پاتا جن کا پہلے کبھی اس نے مظاہرہ نہ کیا ہو۔ میں اپنے دل میں یہ فیصلہ نہ کر سکتا کہ اسے ارسطو کا ہم پلہ سمجھوں یا ایک بچے جیسا نادان خیال کروں، آیا اسے ایک شاعرانہ دل و دماغ کا مالک کہوں یا کند ذہن تصور کروں۔ قصبہ کے ایک باشندہ نے مجھے بتایا کہ جب ایک دن وہ اسے اپنی چست ٹوپی پہنے اور ہونٹوں سے سیٹی بجاتے ہوئے گاؤں میں سرگشت کرتا ملا تو وہ ایک شہزادہ معلوم ہوتا تھا جس نے بھیس بدل رکھا ہو۔ اس کا کتاب خانہ صرف ایک ریاضی کی کتاب اور ایک جنتری پر مشتمل تھا۔ ریاضی پر اسے کافی عبور حاصل تھا۔ دوسری کتاب اس کے لئے ایک مجمع العلوم تھی۔ جس میں تقریباً ہر قسم کی قیمتی معلومات درج تھیں۔

جاڑے میں ایک دن جب کہ سردی شدت کی پڑ رہی تھی یہ خیال کرتے ہوئے کہ اسے معاشرت کا کوئی عمدہ سابق سکھاؤں گا میں نے اُس سے سوال کیا کہ کیا وہ اپنی حالت پر ہمیشہ مطمئن رہتا ہے؟ اُس نے جواب دیا "بالکل مطمئن بعض لوگ ایک بات پر قناعت کرتے ہیں، بعض کسی دوسری پر۔ ایک ایسا شخص جس کے پاس وصن دولت کافی ہو غالباً تمام دن کھاتے پیتے رہنے اور انگیٹھی کے گرد بیٹھ کر آگ تاپتے رہنے سے خوش رہے گا۔" غرض میں کسی حکمتِ عملی سے بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ شاید وہ اپنی اسی حالت پر قانع رہنے میں مصلحت سمجھتا تھا۔ اور اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو ہم بہت سے انسانوں کے متعلق یہ حقیقت درست پائیں گے۔ اگر میں کبھی اس کے رہنے سہنے کے طریقہ میں اصلاح کی کوشش کرتا اور اُس کے سامنے کوئی تجویز پیش کرتا تو وہ بغیر افسوس کے کہتا کہ اب کوئی وقت نہیں رہا۔

ان سب باتوں کے باوجود وہ دیانت داری اور راست بازی جیسی بیش بہا دولت سے مالا مال تھا۔

(منقول)

عبدالکریم سراوپوری

راہ میں

آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی پگڈنڈی پر چلی جا
چڑیاں اپنے گھروں کو لوٹ چلی ہیں اور سیاہ رات جھانک رہی ہے
لیکن دُور درختوں میں ایک شوخ ستارا ہنس رہا ہے
جتنا بھی تو چاہے اس راستہ میں ٹھہر ٹھہر کر اپنا جی بھر لے
آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی پگڈنڈی پر چلی جا

اس پُرسکون ماندگی میں تیرے پیروں کی کڑیاں گونگی ہو گئی ہیں
اور تیرے چہرے پر محنت کے پانی کے قطرے چھلک اُٹھے ہیں۔
ایسے میں تو اپنے گھر کی دہلیز تک کیوں کر پہنچ سکے گی
آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی پگڈنڈی پر چلی جا

اے سکھی یہ جنگل آدمی سے خالی ہے اور ملّاح ابھی اُس پار ہے
میں مرلی بجاتا ہوں تو میری ساجھی بن جا
اپنے پیروں کی دھن پر مجھے گیت گانے دے
آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی پگڈنڈی پر چلی جا

جب تو اُس نگری کی چھاؤں میں اوجھل ہو جائے گی
اور تیرے اِس نیلے لباس کی جھلک باقی نہ رہے گی
تب میں بھی پُرنم آنکھوں کے ساتھ دنیا سے منہ موڑ لوں گا
آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی پگڈنڈی پر چلی جا

ہندی

بزمِ خرابات

(۱)

بیدار اگر ہوں ہوش و حواس اے ساقی
ہاں بادۂ صبح سے قیاس اے ساقی
پی پی کے اب ہوئے عروس رنگیں
کیوں آج اتری سی ہے مٹھاس اے ساقی

(۲)

ہشیار کہ دل کی وقت شتابی ہے
از نوش رخِ لیلائے طرب شتابی ہے
ساقی کہ عمر صبح و فصل نو وا آتا ہے
دنیا پہ آ دے جام پر شتابی ہے

(۳)

کیا جام و سبو میں متصل اے ساقی
اب سینے میں تیرے آب و گل اے ساقی
ہیں ذرۂ ناچیز جب سمجھا تھا نہیں
پیچیدہ ہیں کہ ہوئے دل اے ساقی

(۴)

فردوس ارم ہے فضائے کہسار
صد ساز خرد و دل ہے ترانۂ کہسار
جمعیت خاطر ہو جب کس کی نہ سیاہ
سر نعمت ہیں ایک ہی ترانۂ کہسار

جوش
ملیح آبادی

جامِ صہبائی

(۱)

آزادِ طلسمِ رنگ سے کوئی نہ ہوا!!
بیگانۂ جہانِ کل از خودی نہ ہوا
دنیا سے عبث رہی شکایت ہم کو
افسوس کہ اپنا دوست کوئی نہ ہوا!!!

(۲)

جویائے رموزِ رازِ فطرت تو ہے
آگاہِ حقیقت اے ہوا حقیقت تو ہے
اسباب و علل میں کیوں ہے غلطاں پیچاں
اس عالمِ اسباب کی غایت تو ہے!!!

(۳)

صہبائے نشاط کی تمنا نہ کرے
جو تلخیٔ زہرِ غم گوارا نہ کرے
غم جزوِ حیات ہے طلبگارِ حیات
نیشِ غمِ زندگی کی پروا نہ کرے

(۴)

تو اپنی ہی جوہر سے شناسا نہ ہوا
ہر گام پہ ہستی سے بیگانہ نہ ہوا
پوشیدہ ہیں تجھ میں بھی ہزاروں جلوے
افسوس کہ تو مگر ان سے شناسا نہ ہوا

عبدالمسیح پال اثر صہبائی

دو خط

پیاری

جس طرح تم ایک شاندار نظم ہو اسی طرح میں ایک بے سروپا کہانی ہوں جس طرح تم سے دنیا کی توقع یہ ہے کہ بجائے نظم بنے رہنے کے تم ایک کامیاب روحانی جاروب کش بن جاؤ اسی طرح مجھ پر گلہ یہ ہے کہ میں ایک کارآمد بوریا کیوں نہیں ؟

دنیا کا جو جی چاہے سوچے ، جو جی چاہے بنے ، لاکھ طرح سے بنے اور کروڑ طرح سے بگڑے تم پیاری اس کے فریب میں نہ آنا ، کچھ نہ کہنا ، کچھ نہ سننا ، کچھ نہ کرنا بغیر کہنے ، سننے ، کرنے کے یہ حال ہے تو اگر خدانخواستہ تم نے دنیا کو کوئی نیک مشورہ دے دیا تو ستم ہو جائے گا۔

اچھا ! کیا وہ بات تمہیں یاد ہے کہ ایک بھری مجلس میں تم نے ایشیائی تہذیب (یا عدم تہذیب) کا مرقع ان الفاظ میں پیش کیا تھا تم کہہ رہی تھیں کہ ایشیائی تہذیب جہاں تک اس کا صنف نازک سے تعلق ہے یہ ہے کہ بھولی بھالی لڑکیوں کو اس طرح سے پالا جائے کہ بڑے ہو کر اگر اُن میں دل لبھانے کی کوئی ادا باقی رہ جائے تو خود انہیں تعجب ہو۔ تم اپنے لطیف طنزیہ پیرائے میں کہہ رہی تھیں

عشق کی بات بیسوا جانیں ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

بات یہاں تک پہنچی تھی کہ کسی نے شاہزادی زیب النسا ، کا ذکر شروع کر دیا اور اس پر مجھے موقع مل گیا کہ زیب النسا کا وہ مشہور شعر پڑھ دوں

بشکند دستے کہ خم در گردنِ یارے نہ شد
کور بہ چشمے کہ لذت گیرِ دیدارے نہ شد

اس سے بات پھر وہیں پلٹ آئی جہاں سے شروع ہوئی تھی یعنی یہ کہ مسلمان خاتونیں خشک نیکی کی ایسی بے دام لونڈیاں بنی ہیں کہ اُن کی ہر حرکت ہر بات ، اُن کی نشست برخاست سب پکار پکار کر کہہ رہی ہیں

"خدا نہ کرے کہ کوئی ہمیں چاہے"

اور واقعی اس تربیت نے یہ کرامت کر دکھائی ہے کہ بہت کم صورتیں نظر آتی ہیں جن میں چاہے جانے کے قابل

بنانے والی کوئی ادا باقی رہی ہو۔ لڑکیاں تو لڑکیاں خود میرے حلقے میں ایک نوجوان اس مرض میں مبتلا ہے کہ حسن سے چھپتا پھرے۔ عجب تہذیب ہے کہ ہر اس چیز سے گریز ہو جس سے زندگی کی گدڑی میں کہیں کہیں جو بیش بہا لعل اٹکا ہوا ہے وہ بھی نظر نہ آئے۔ اماں باوا بھی یہاں کے نرالے ہیں، اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان کی اولاد چاہے جانے کے قابل نہیں بن سکتی۔

ہاں تو جو بات تمہیں لکھنا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ تمہاری اس گفتگو کا بعض دائروں میں ضرورت سے زیادہ چرچا ہو رہا ہے۔ تم نے تو یونہی ایک چلتی سی بات کہہ دی تھی مگر اب اُس کا بتنگڑ بنایا جا رہا ہے۔ کہنے والے یہ کہہ رہے ہیں کہ لڑکیوں کو تعلیم دینے کا اگر یہ نتیجہ ہے کہ وہ آبائی طرز خیال کو چھوڑ کر دنیا کے نیک و بد کی نسبت خود شخصی رائے قائم کریں تو اس تعلیم کو دور سے ہی سلام ہے۔ پیاری تم سمجھیں کہ تعلیم سے قومی لیڈروں کا اصل مطلب کیا ہے؟ وہ مطلب یہ ہے کہ تعلیم تو تم پا جاؤ مگر کہو وہی جو بزرگ کہتے آئے ہیں۔ پڑھو لکھو سب کچھ مگر چلو نانی دادی کے نقشِ قدم۔ اَور جگہ تو تعلیم حالاتِ حاضرہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہے مگر ہمارے ہاں تعلیم اس لئے دی جا رہی ہے کہ ہم زمانے کا مقابلہ کریں۔ زمانہ ہمیں اگر دو قدم آگے کی طرف لے جانا چاہے تو ہم تعلیم کے زور سے چار قدم پیچھے ہٹیں۔ میرے خیال میں کیا ہی اچھا ہو جو کوئی خاتون ایک انجمن "ترکِ تعلیم نسواں" کے نام سے قائم کرے۔ کسی اچھے سے چلتے پرزے پیر کو اس مجلس کا مربی قرار دے دے اور اس کے مریدوں اور مریدنیوں سے خوب ترکِ تعلیمِ نسواں کے متعلق چندے جمع کرے۔ یہ تو تمہیں پتہ ہی ہے کہ پنجاب میں پیروں کا کال نہیں۔ اس سرزمین نے تو نبی پیدا کر دیئے پیر کس گنتی میں ہے۔

یہ خط شیطان کی آنت ہو گیا۔ لکھنا کچھ چاہتا تھا لکھ کچھ گیا جو نہیں لکھا وہ سمجھ لو جو لکھا ہے وہ بھول جاؤ۔ تمہارا

مکرر یہ کہ خط کو جب دوبارہ پڑھنے بیٹھا تو تعجب ہوا کہ یونہی روا روی میں کیا ایک لاجواب بات میرے قلم سے نکلی یعنی یہ خیال کہ نسوانی تحریکوں کے متعلق پیروں سے کام لیا جائے۔ یہ لوگ واقعی بہت کام آسکتے ہیں۔ کسی زمانے میں ان کے اردگرد عورتوں کے ٹھٹھ ہوتے تھے اگر کوئی زباں آور ساڑھی کسی مقبولِ عام پیر کو اپنا مرید کرے تو کئی نسوانی یونیورسٹیاں قائم ہو جائیں مگر تم سے یہ ذکر ہی فضول ہے۔ تم تو چاہتی ہو کہ طبقۂ اناث اپنی مدد خود آپ کر کے مردوں کو نیچا دکھائے اور دنیا پر یہ ثابت کرے کہ ہندوستان کی عورتیں مردوں سے کم ناقص العقل ہیں۔ تمہارا

سہ کر رہیہ کہ جس دن تمہاری یہ رائے کہ شادی ایک قسم کی خباثت ہے جس سے کسی شریف عورت کو سروست اس ملک میں مفر نہیں تبدیل ہو تو مجھے سب سے پہلے مطلع کرنا۔ ہاں اور مہربانی کر کے یہ بھی لکھنا کہ تم اس ملک میں پیدا کیوں ہوئیں؟

جواب

ڈیر سسٹر

آپ کا خط کچھ ایسا ضروری تو نہیں کہ جواب جلدی تحریر کیا جائے مگر کیا آپ کے لئے یہ بہت تکلیف دہ امر ہے کہ آپ اپنے بیش قیمت مشورے بے طلب پیش نہ کیا کریں؟ یوں تو آپ کو بہت دانشمندی کا دعوٰے ہے مگر نہ آپ میری گفتگو سمجھے نہ لوگوں کے اس پر بہتان۔

میں تو دل سے چاہتی ہوں کہ مردوں کی مجالس ہیں عورتوں کا ذکر شدومد سے ہو۔ اس بات کی ہمیں ذرہ برابر بھی پروا نہیں کہ نکتہ چینیاں ہونگی۔ کیا لوگ ابھی سے بھول گئے کہ وہ دن کچھ بہت پرانے نہیں ہوئے جب ہمارا ذکر ہی مفقود تھا۔ بہت کوئی کمبخت مجبور ہوتا تھا تو یوں ذکر کرتا تھا "گھر میں طبیعت اچھی نہیں"۔ مہربانی کر کے اپنے سب دوستوں سے ضرور کہئے کہ بیباک خاتونوں کی ایک فوج تیار ہو رہی ہے۔ اور یہ بات ذرا نمک مرچ لگا کر کہئے یعنی اس طرح کہ یورپ میں عورتوں نے مردوں کو وہ ناچ نہیں نچایا جو عنقریب ہندوستان میں رائج کیا جائے گا۔ ہاں اور یہ بات ذرا وضاحت سے کہئے کہ ہمارے آئندہ مظالم ان کے لئے نہیں جو ہمارے کھلم کھلا مخالف ہیں بلکہ اُن بزدل کنارہ کشوں کے لئے جن میں ہمارے دوست بننے کی ہمت نہیں۔ صنفِ نازک کے سب سے بڑے دشمن وہ ہیں جو ہمیں نہایت رقت آمیز خلوص سے کہتے ہیں "بیبیو ذرا سوچ کر قدم بڑھاؤ"۔ اور کیا لکھوں۔ کاش کہ آپ کسی زنانہ مدرسے کے تعلیم یافتہ ہوتے۔ پھر شاید آپ کے خط میں کچھ دلیری کی جھلک ہوتی۔

فلک پیما

گولکنڈہ میں چند لمحے

اک شکستہ سنگِ در پر سرنگوں بیٹھا ہوں میں
سرحدِ احساس سے کوسوں نکل آیا ہوں میں

چھا رہا ہے ذرہ ذرہ پر اداسی کا گداز
وہ اداسی جس سے حاصل ہو دلوں کو سوز و ساز

جو دریچے کھول دے اگلے مناظر کے تمام
روح کو ایامِ رفتہ سے جو کر دے ہم کلام

نوکِ غم سے جو تخیل کی رگوں کو چھیڑ دے
نشترِ ماضی سے خوابیدہ دلوں کو چھیڑ دے

عہدِ پیشیں نے الٹ کر اپنے چہرے سے نقاب
اس لطافت سے سنایا مجھ کو ماضی کا رباب

گوش پیدا ہو گئے اگلے فسانوں کیلئے
چونک اُٹھا سامعہ پچھلے ترانوں کیلئے

ایک لمحے میں حجاباتِ نظر سب ہٹ گئے
مطلعِ اسرار کے تاریک بادل چھٹ گئے

یوں تو معمولی کھنڈر ہیں گر بظاہر دیکھئے
ہاں اگر گہری نظر سے یہ مناظر دیکھئے

ایک عالم پھر نظر آئے گا ان ذرات میں
واہمہ بھر دے گا ایسا رنگ محسوسات میں

جتنی دھندلی یادگاریں ہیں ابھر آئیں گی سب
مٹ گئے ہیں جو نشاں وہ بھی نظر آئیں گے سب

ان شکستہ پتھروں میں دفن ہے وہ داستاں
جس کا اک اک حرف ہے درسِ بصیرت کا جہاں

حسن کا گہوارہ تھی جس بزمِ رنگیں کی فضا
جس میں چلتی تھی سرور و کامرانی کی ہوا

نغمۂ عشرت اُٹھا جس کے در و دیوار سے
گونجتی تھی روز و شب جو ساز کی جھنکار سے

مدتوں جس میں رہی مصروفِ جنگِ خودسری
عشق کی جانبازیوں سے حسن کی افسوں گری

آج وہ نوحہ کناں ہے گردشِ ایام پر
عبرتیں منڈلا رہی ہیں اُس کے سقف و بام پر

پھر رہا ہے میری آنکھوں میں وہ تختِ زرنگار
جلوہ فرما جس پہ روز و شب تھا شاہوں کا وقار

شاہ بھی کیسے کہ جن کا دبدبہ رستم فگن
جن کی دارائی تھی ہیبت آفریں گردوں شکن

جن کے پائے خسروی پر خم تھا اک عالم کا سر
جن کی سطوت سے ہلے سینوں میں دل کانپے جگر

وقت کا سیلاب گو اُن کو بہا کر لے گیا
دہر کی آغوش سے اُن کو چھڑا کر لے گیا

زندگی پر گرچہ اُن کی پڑ گئے صدہا نقاب
کارنامے دفن ہیں اُن کے حجاب اندر حجاب

گو زمانہ کی کشاکش نے مٹا ڈالے نشاں
بُعد صدیوں کا ہے اب اُن کے ہمارے درمیاں

پھر بھی دنیا اُن کی ہستی محو کر دے کیا مجال
ہڈیاں مٹ جائیں لیکن اُن کا مٹ جانا محال

گردشیں کتنی ہی بدلے وقت کا موہوم جام
صفحۂ عالم پر اُن کا ثبت ہے نقشِ دوام!

ذوقی

غیر فانی اِنسان

بقا یہیں اور ابھی سے موجود ہے اور اس کا وجود قبر کی سرحد سے پرے کسی وہمی یا خیالی سرزمین میں نہیں یہ شعور کی ایک اجلی اور روشن کیفیت ہے جس میں جسم کے احساسات، قلب کی متغیر اور ناسکوں شناس حالتیں اور زندگی کے حالات و واقعات ایک گزرتے ہوئے اور اس لئے ایک پُر فریب بادل کی طرح نظر آتے ہیں۔

بقا کا تعلق وقت سے نہیں ہے اور اس کا وجود ہمیں کبھی وقت میں نہ ملے گا۔ اس کا تعلق سرمدیت سے ہی اور جس طرح وقت اب اور یہاں ہے سرمدیت بھی اب اور یہاں موجود ہے، اور ایک انسان اِس سرمدیت کو ہر وقت حاصل کرسکتا اور اپنے آپ کو غیر فانی بنا سکتا ہے اگر وہ اُس نفس پر غلبہ پائے جو وقت کے اطمینان سوز اور فانی لمحوں سے زندگی حاصل کرتا رہتا ہے۔

جب تک کوئی شخص محسوسات، خواہشات اور شب و روز کی زندگی کے گزشتنی حادثات میں منہمک رہتا ہے، اور ان محسوسات، خواہشات اور رفتنی واقعات کو روحِ حیات جانتا ہے وہ بقا کا مفہوم نہیں سمجھ سکتا جو چیز اس نوع کا انسان چاہتا ہے اور جس کو وہ غلطی سے بقا خیال کرتا ہے در اصل "ثبات" ہے یعنی وقت کے دائرے کے اندر محسوسات و واقعات کا تسلسل۔ اُن چیزوں میں رہ کر اور ان سے دل لگا کر جو اُس کی وقتی خواہشات کو پورا کرتی اور تقویت دیتی ہیں اور اس سے بالاتر اور آزاد کیفیتِ شعور کا احساس نہ کرکے وہ اپنے قیام و استقلال کے لئے ترستا ہے، اور اس خیال کو اپنے دل سے مٹانے کی کوشش کرتا ہے کہ اسے آخر کار اُس دنیاوی آرام و آسائش کو چھوڑنا پڑے گا جس کا وہ غلام ہو چکا ہے اور جسے وہ اپنے لئے ایک جزوِ لاینفک سمجھے ہوئے ہے۔

ثبات اور بقا دو متضاد باتیں ہیں اور ثبات کی تلاش میں کھو جانا موت کے ہم معنی ہے۔ اس کی فطرت ہی تغیر ہے، فنا ہے۔ یہ ایک مسلسل زیست اور موت ہے۔

جسم کی موت انسان کو کبھی غیر فانی نہیں بنا سکتی۔ روحیں اجسام سے کوئی مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ انہیں بھی اپنی پُر سوز و گداز شکستہ شعور زندگی کی منازل طے کرنی پڑتی ہیں اور تغیر اور فنا میں سے گزرتا پڑتا ہے۔ وہ فانی انسان جو اپنے عیش پسند وجود کے ثبات کے لئے سرگرداں رہتا ہے موت کے بعد بھی فانی رہتا ہے اور اسی قسم کی ایک زندگی بسر کرتا ہے جس کی ایک ابتدا اور ایک انتہا ہوتی ہے اور اسے گزشتہ اور آئندہ کا کوئی علم نہیں ہوتا۔

غیر فانی انسان وہ ہے جس نے اپنے آپ کو وقت کی قیود سے آزاد کرلیا ہے اور وہ شعور کے اُس بلند درجہ پر پہنچ گیا ہے جہاں تزلزل اور تغیر کا وجود نہیں ہے اور جہاں گزشتنی واقعات و احساسات اس پر اثر نہیں کرسکتے۔ انسانی زندگی واقعات کی ایک کبھی نہ تھمنے والی رَو ہے اور اس رو میں فانی انسان مل جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بہنے لگتا ہے اور اس بہاؤ میں اسے خبر تک نہیں ہوتی کہ پیچھے کیا ہے اور آگے کیا۔ غیر فانی انسان وہ ہے جو اس رو سے نکل جاتا ہے اور چپ چاپ الگ کھڑے ہو کر اس کا تماشا دیکھتا ہے، اور اپنی مقررہ جگہ سے آگے پیچھے سامنے اس متحرک شے کا معائنہ کرتا ہے جسے زندگی کہتے ہیں۔ وہ شخصیت کے احساسات اور چڑھاؤ اتار سے یا اُن بیرونی تغیرات سے جو زندگی کو وقت کے دائرے میں محدود کردیتے ہیں رشتہ توڑ کر اپنی قسمت اور دوسرے انسانوں اور قوموں کی قسمت کا ایک ایسا ناظر بن جاتا ہے جس پر کسی حادثہ کا اثر نہیں ہوتا۔

فانی انسان کی مثال ایک یہ بھی ہے کہ جیسے کوئی سو رہا ہو، اور وہ نہ جانتا ہو کہ وہ اس سے پہلے جاگ رہا تھا یا پھر جاگے گا۔ وہ بس ایک بے ہوش سونے والا ہے۔ غیر فانی انسان ایسا ہے جیسے کوئی نیند سے بیدار ہو چکا ہو، اور وہ جانتا ہو کہ اُس کا خواب کوئی حقیقت باقیہ نہیں تھا بلکہ ایک مٹنے والا سراب تھا۔

فانی انسان شعور کی وقتی اور دنیاوی کیفیت میں رہتا ہے جو شروع ہوتی ہے اور ختم ہوتی ہے۔ غیر فانی انسان ایک جاودانی اور آسمانی حالتِ شعور میں بستا ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا، اور جو ایک سرمدی اب ہے۔ ایسا انسان ہر تغیر کے ماتحت مضبوط و مستحکم رہتا ہے اور اُس کے جسم کی موت بھی اُس کے شعور بقا میں مخل نہیں ہوسکتی۔ ایسے ہی انسان کی نسبت کہا گیا ہے کہ "وہ موت کا ذائقہ نہ چکھے گا" کیونکہ وہ موت کی ندی سے باہر نکل چکا ہے اور حقیقت کے مسکن کو اپنا مسکن بنا چکا ہے۔ اجسام، شخصیتیں، قومیں اور دنیائیں فنا ہو جاتی ہیں لیکن **حقیقت** باقی رہتی ہے اور اُس کی عظمت و شوکت کو وقت گھٹا نہیں سکتا۔ پس غیر فانی انسان وہ ہے جس نے اپنے نفس کو زیر کرلیا ہو، جو شخصیت کی خود پسند قوتوں کو مغلوب کرچکا ہو، لیکن جس نے ان قوتوں کو ایک استادانہ انداز سے سدھا لیا ہو، اور یوں اُس حقیقی توانائی سے اُن کا رشتہ مواصلت قائم کردیا ہو جو سب چیزوں کا منبع و مصدر ہے۔

زندگی کے غم و الم کی آگ بجھ چکی، شک اور خوف جا چکا، اور موت اُس کے لئے نہیں ہے جس نے اپنے دل و دماغ کو ابدی و سرمدی صداقتوں سے آشنا کر کے **حقیقت** کے نہ بجھنے والے نور کی جھلک کو دیکھ لیا۔

ایلن

منصور احمد

نواہائے راز

آرزوئے اثر نہ ہو جائے — دردِ دل دردِ سر نہ ہو جائے

شبِ غم کی سحر نہ ہو جائے — زندگی مختصر نہ ہو جائے

آپ کا اہتمامِ پردہ کہیں — عشق کا پردہ در نہ ہو جائے

جوشِ سجدہ میں سر کہیں میرا — آپ کا سنگِ در نہ ہو جائے

حسن کی بدگمانیاں توبہ — عاشقی معتبر نہ ہو جائے!

نگہِ شوق اس قدر بھی نہ دیکھ — اُن کو اپنی خبر نہ ہو جائے

منزلِ دوست کا تمنائی — غش سرِ رہگذر نہ ہو جائے

ضبطِ الفت کی تاب ہے مجھ میں — بدگماں تُو اگر نہ ہو جائے

میرے یمنِ قدم سے ویرانہ — کہیں ویرانہ تر نہ ہو جائے

سروری وہ اگر کرم نہ کرے
عیب میرا ہنر نہ ہو جائے

اکبر سروری لکھنوی

۲

کون ہوں میں کس کو میرا درد ہے — کون کرتا ہے مری غمخواریاں

کر رہا ہوں دیدۂ خونبار سے — دامنِ الفت پہ لالہ کاریاں

مٹ گئے نقش و نگارِ حسن سب — عشق کی باقی ہیں آہ و زاریاں

اے نگاہِ ناز پروردِ حیا — کس سے سیکھیں تو نے عشوہ کاریاں

بڑھ گئیں کچھ اور غم کی شورشیں
ہیں قیامت آپ کی غمخواریاں

سرور اکبری لکھنوی

پہلا ایکٹ

پیران کا خیمہ

پیران تاتاری فوج کا سالار ایک قالین کے فرش پر آنکھیں بند کئے لیٹا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ ادھر اُدھر پڑے ہیں۔

سہراب داخل ہوتا ہے، پیران آہٹ پاکر بیدار ہو جاتا ہے۔

پیران (ایک ہاتھ کے سہارے اُٹھتے ہوئے) کون ہے؟ اور اس وقت یہاں کیوں آیا ہے؟ ابھی افق پر صبح کی سپیدی بھی اچھی طرح ظاہر نہیں ہوئی ۔۔۔۔ بول کوئی نئی خبر لایا ہے یا کسی خطرہ سے آگاہ کرنے آیا ہے؟

سہراب (ذرا اضطراب لہجہ میں) پیران گھبراؤ نہیں میں سُہراب ہوں۔ تم مجھے جانتے ہو۔

(سہراب، پیران کے قریب پہنچ جاتا ہے)

پیران (کسی قدر متفکرانہ انداز سے) سہراب تم ہو؟ میرے بچے اس وقت تم یہاں کیوں آئے ہو؟

سہراب۔ کیا بتاؤں پیران ۔۔۔۔ میں یہ سب جانتا ہوں کہ ابھی سورج نہیں نکلا، اور غنیم کی فوج پر بھی نیند موت کی طرح طاری ہے۔

پیران (محبت آمیز انداز سے) پھر تم کیوں نہیں سوئے؟

سہراب۔ ہاں میں نہیں سویا۔ پیران مجھے نیند نہیں آتی۔ رات بھر جاگتے اور کروٹیں بدلتے گزری ہے۔

پیران۔ کیوں؟ میرے بچے تم اس قدر بے چین کیوں ہو؟

سہراب۔ پیران میری بے چینی بے سبب نہیں۔ میں اس وقت ایک ضرورت سے تمہارے پاس آیا ہوں۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔

پیران۔ کہو کیا بات ہے؟

سہراب۔ پیران، افراسیاب نے سمرقند میں مجھ سے چلتے وقت کہا تھا کہ میں تمہیں اپنے باپ کی طرح سمجھوں اور بیٹے کی طرح تمہاری خدمت اور حفاظت کروں، اور ہر معاملہ میں تم سے مشورہ کر لیا کروں، اس وقت ایک امر میں تمہارے

مشورہ کی ضرورت ہے۔

پیران۔ میرے بچے سہراب! مجھے اچھی تدبیر بتانے اور مفید مشورہ دینے میں کوئی عذر نہیں۔ تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو بے تکلف کہو۔ میں بغور سننے کو تیار ہوں۔

سہراب۔ (پیران کے سامنے بیٹھتے ہوئے) تم جانتے ہو کہ جب آذربائیجان سے آکر میں پہلے پہل تاتاریوں میں شامل ہؤا اور ہتھیار اٹھائے اُس وقت سے آج تک میں نے شاہِ افراسیاب کی خدمت نہایت جانفشانی اور ایمانداری سے کی ہے اور میں نے اپنے لڑکپن کے زمانے ہی میں ایک جوان سورما کی سی شجاعت کا ثبوت دیا ہے۔

پیران۔ ہاں تمہاری دلیری، شجاعت اور جوانمردی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

سہراب۔ اور پیران تم یہ بھی جانتے ہو کہ اب بھی جب کہ میں تاتاریوں کی فتح وظفر کا جھنڈا دنیا کے ہر گوشے میں اُٹھائے پھرتا ہوں، اور ایرانیوں کو ہر معرکہ میں شکست دیتا ہوں میں ایک آدمی کو تلاش کر رہا ہوں، پیران ایک آدمی کو۔ وہ رستم میرا باپ ہے، جو مجھے امید ہے کہ ایک دن ضرور اپنے شجاع اور جوانمرد بیٹے سے کسی میدانِ جنگ میں مل کر خوش ہو جائے گا۔ میں مدت سے اُس کی ملاقات کی تمنا میں آوارہ پھر رہا ہوں، لیکن آہ پیران وہ مجھے کہیں نہیں ملتا۔

پیران۔ (متاثر ہو کر) سہراب کیا اسی لئے تم بے چین ہو؟ رستم سے ملنے کے لئے اتنے بے قرار ہو؟ —— ہاں تمہیں ضرور ہونا چاہئے —— مگر سہراب اس وقت اس قدر بے تاب اور پریشان نہ ہو۔ ابھی تمہیں غنیم کی فوج سے مقابلہ کرنا ہے۔ جنگ کے بعد دیکھا جائے گا۔ اگر تم اتنے بدحواس اور مضطرب رہو گے تو لڑائی کا رنگ پھیکا پڑ جائے گا۔ سنتے ہو سہراب؟

سہراب۔ نہیں، پیران، ذرا غور سے سنو اور میری التجا کو فضول سمجھ کر نہ ٹھکراؤ —— آج دونوں فوجوں کو آرام کرنے دو لیکن میں اب یہ اعلان کرنے والا ہوں کہ ایران کے سب سے بہادر اور نامور سردار یکے بعد دیگرے تنِ تنہا مجھ سے مقابلہ کریں۔ اگر میں جیت گیا تو یقیناً رستم میری اس فتح کی خبر سنے گا —— اگر میں ہار جاؤں تو پیران پھر مجھے رستم کی تلاش اور اُس کا بیٹا بننے کی خواہش بھی نہ رہے گی —— مردے کسی کو اپنا رشتہ دار نہیں بنا سکتے۔ سنا تم نے؟ —— کیونکہ جب فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے پر ہوتی ہیں تو کسی ایک شخص کی شجاعت اور دلیری کا حال نہیں معلوم ہوتا اور بہت سے جوانمردوں کی شجاعت پر تاریکی کا پردہ پڑ جاتا ہے لیکن اکیلے لڑنے سے دلیری اور شجاعت کا مظاہرہ کامل طور پر ہو سکتا ہے۔

(پیران سہراب کا ہاتھ محبت سے پکڑ لیتا ہے)

پیران (آہ بھرتے ہوئے) تمہارے محبت سے لبریز سینے میں ایک سیماب کا دریا موجزن ہے جس سے تمہیں کسی پہلو قرار نہیں ملتا ـــــ کیا تم تاتاری سرداروں میں آرام سے نہیں بیٹھ سکتے؟ کیا تم ہماری فوجوں کے پہلو بہ پہلو لڑکر فتحمندی، اور دلیری کی شہرت حاصل نہیں کرسکتے؟ ـــــ سہراب ہم سب کو تم سے محبت ہے تنہا لڑنے میں صرف اپنی اکیلی جان کا خطرہ ہوتا ہے اور ہم یہ نہیں چاہتے کہ تمہاری اکیلی جان کو، تم جیسے خوانمرد اور ہر دلعزیز انسان کو خطرہ میں ڈال دیں۔

سہراب۔ پیران تم سچ کہہ رہے ہو میں بھی اس خطرہ سے واقف ہوں، مگر میں اپنے دل کو کیا کروں۔ میں اپنے جذبات کو کس طرح ضبط کروں۔ وہ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں تنہا لڑوں ـــــ اور مجھے یقین ہے پیران کہ اس طرح میں اپنے باپ کو ڈھونڈھ لوں گا۔

پیران۔ ایسے باپ کو جسے تم نے کبھی دیکھا تک نہیں ہے تم لڑائی اور جنگ میں تلاش کرنا چاہتے ہو، کیسے تعجب کی بات ہے! میرے لڑکے سہراب میں تمہاری بہتری اسی میں سمجھتا ہوں کہ تم قسمت پر بھروسا کرکے، جب تک جنگ جاری ہے، ہمارے ساتھ خیموں میں رہو، اور جب صلح ہو جائے تو چل کر افراسیاب کے شہروں میں آرام کرو ـــ لیکن اگر اپنے باپ رستم سے ملنے کی خواہش تمہیں چین سے نہ بیٹھنے دیتی ہو تو اُسے لڑائی اور جنگ میں تلاش نہ کرو اُسے امن وصلح کے وقت جاکر ڈھونڈو اور اس کی آغوش ـــــ او سہراب اُس کی آرزومند آغوش سے ایک تندرست بیٹے کی طرح ملو۔

سہراب۔ پیران، یہ نہ کہو۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس لڑائی میں اپنے باپ کو پالوں گا۔ پیران، میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم مجھے منع کر رہے ہو؟

پیران۔ تم نادان ہو۔ تمہیں نہیں معلوم کہ رستم یہاں نہیں ہے ـــــ وہ یہاں سے منزلوں دور ہے کیونکہ اب وہ زمانہ نہیں ہے جب میں جوان تھا اور وہ وقت نہیں ہے جب میں رستم کو ہر لڑائی میں سب سے آگے دیکھتا تھا، بلکہ اب وہ ان تمام لڑائی جھگڑوں سے دست کش ہو گیا ہے اور اپنے گھر، سیستان میں اپنے باپ کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ تمہیں وہیں ملے گا۔

(سہراب سر اٹھا کر پیران کو اس انداز سے دیکھتا ہے جس سے انکار کا اظہار ہو)

پیران۔ سہراب (آہِ سرد بھرتے ہوئے) میرا دل ڈرتا ہے۔ مجھے خوف معلوم ہوتا ہے کہ اس جنگ میں موت یا کوئی خطرہ ضرور تمہارے لئے موجود ہے۔

سہراب (بہ اضطراب ظاہر) پیران ــــــ پیران کیا کہہ رہے ہو؟ سہراب کو موت اور خطرات سے ڈر نہیں لگتا۔

پیران۔ سہراب تم نہ ڈرو، مگر مجھے ضرور خوف معلوم ہوتا ہے۔ تمہیں محفوظ اور اچھا دیکھ کر ہم سب بہت خوش ہونگے خواہ تم ہم سے جدا ہی کیوں نہ ہو جاؤ۔ ہم تمہیں نہایت مسرت سے صلح کے بعد اپنے باپ کی تلاش کے لئے روانہ کر دیں گے۔ لیکن اس جنگ کے وقت نہیں۔ سہراب اپنے باپ کو تنہا لڑائی میں پا لینے کی بے کار کوشش نہ کرو۔

سہراب (سر اٹھا کر پیران کو ملتجی انداز سے دیکھ کر) پیران ــــــ؟

پیران۔ تم نہیں مانتے؟ ہاں شیر کے بچے کو گرجنے سے کون منع کر سکتا ہے۔ اور رستم کے بیٹے پر کون فتح پا سکتا ہے؟ سہراب میرے بچے رنجیدہ نہ ہو۔ جاؤ آرام کرو۔ جو تم چاہتے ہو وہی ہو گا۔

سہراب۔ پیران میں تمہاری اس عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

(پیران سہراب کا ہاتھ چھوڑ دیتا ہے۔ سہراب آہستہ آہستہ خیمہ سے نکل کر چلا جاتا ہے۔ پیران بستر سے اٹھتا ہے اور ادنی کپڑے پہن لیتا ہے۔ آواز دیتا ہے۔ ایلچی حاضر ہوتا ہے اور پیران اپنا عصائے حکومت لے کر اُس کے ہمراہ خیمہ سے باہر چلا جاتا ہے)

دوسرا ایکٹ

رستم کا سرخ خیمہ

رستم کھانے سے فارغ ہو کر دستر خوان ہی پر بیٹھا ہے۔ دستر خوان پر ایک طرف ہرن کے کباب اور روٹیاں ہیں اور دوسری طرف بہت بڑے بڑے شوخ سبز رنگ کے تربوز رکھے ہیں۔ رستم کے ہاتھ پر ایک باز بیٹھا ہے اور وہ اس سے کھیل رہا ہے۔

(گودرز ایرانی فوج کا ایک اعلیٰ سردار خیمہ میں داخل ہوتا ہے۔ رستم باز کو علیحدہ چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ گودرز کے پاس آتا ہے اور اس سے مصافحہ کرتا ہے)

رستم۔ خوش آمدید۔ میری آنکھیں اس سے زیادہ خوشگوار منظر اور کیا دیکھ سکتی تھیں کہ وہ تمہیں دیکھ رہی ہیں۔ کہو گودرز کیا خبر لائے ہو، لیکن پہلے بیٹھ جاؤ، کچھ کھاؤ کچھ پیو۔

(گودرز خیمے کے دروازے ہی پر کھڑا رہتا ہے)

گودرز۔ ابھی نہیں۔ رستم! کھانے پینے کے لئے ایک دن ضرور آئے گا لیکن آج نہیں۔

رستم (کسی قدر استعجاب سے) کیوں گودرز آج کیوں نہیں؟

گودرز۔ آج ہم کو کچھ اور کرنا ہے۔

رستم۔ کوئی مہم درپیش ہے؟

گودرز۔ ہاں مہم درپیش ہے۔ رستم بہت بڑی مہم۔ تاتاری اور ایرانی فوجیں میدانِ جنگ میں آمنے سامنے ڈیرے ڈالے پڑی ہیں۔ تاتاریوں نے یہ دعویٰ پیش کیا ہے کہ ایرانی سرداروں میں سب سے بہادر سردار منتخب کئے جائیں جو تاتاریوں کے نوجوان اور ممتاز عالم ہیرو سے تنِ تنہا مقابلہ کریں —— اور تم اس کا نام جانتے ہو لوگ اسے سہراب کہتے ہیں۔

رستم۔ سہراب؟ —— سہراب؟ ہاں میں نے یہ نام سنا ہے —— مجھے اس کی دلیری اور شہرت کا حال بھی معلوم ہوا ہے۔ مگر گودرز یہ سہراب کس کا بیٹا ہے۔

گودرز۔ مجھے معلوم نہیں۔ اس کی پیدائش ایک راز ہے جس سے تمام ایرانی سردار بھی ناواقف ہیں۔ رستم تمہاری طاقت کی طرح اس میں بھی بلا کی قوت ہے، اس کی ٹانگوں میں صحرائی بارہ سنگے کی سی تیزی ہے اس کا دل شیروں کے مانند ہے اور وہ بالکل جوان ہے —— ایرانی سردار سب ضعیف اور کمزور ہیں اور اس لئے اب سب کی آنکھیں تمہاری طرف لگ رہی ہیں۔ رستم تم چل کر ہماری مدد کرو۔ ورنہ ہم کو اس جنگ میں فتح نصیب نہ ہوگی

رستم (ایک ہلکے تبسم سے) جاؤ گودرز! اگر ایرانی سردار بڈھے ہیں تو میں ان سے زیادہ ضعیف ہوں۔ اگر جوان سردار کمزور ہیں تو کوئی ہرج نہیں۔ خود بادشاہ بڑی جوانمردی سے لڑتا ہے۔ بادشاہ کیخسرو خود جوان ہے اور جوانوں کی قدر و عزت کرتا ہے۔ گودرز اُس سے جا کر کہو۔

گودرز (مصنوعی انکسار کے ساتھ) نہیں رستم انکار نہ کرو۔ ہماری آخری امیدیں اب صرف تم اور تمہاری ذات سے وابستہ ہیں۔ ہماری امیدوں کا خون نہ کرو۔

رستم۔ (بہ اندازِ تمکنت) گودرز میں سب جانتا ہوں۔ اب زیادہ باتیں بنانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں جانتا ہوں کیخسرو کی حالت، وہ اب صرف جوانوں کا زیادہ خیال کرتا ہے، رستم کے لئے اب اُس کے سینے میں کوئی احترام اور محبت باقی نہیں۔ وہ صرف جوان سرداروں کا طالب ہے اور جوان سردار ہی سہراب کے مقابلہ پر جائیں گے میں نہ جاؤنگا

گودرز۔ رستم، رستم۔ تم اب پہلے سے رستم نہیں معلوم ہوتے۔ ہمیں تمہارے اخلاق اور تمہاری جرات سے ہرگز یہ امید نہ تھی

ہمیں ایسے سخت الفاظ تمہاری زبان سے سننے کا گمان بھی نہ تھا۔

رستم۔ گمان نہیں تھا تو میں اس کی ذرا بھی پروا نہیں کرتا۔ گودرز مجھے اس کی فکر بھی نہیں ہے کہ سہراب ایک نہایت دلیر اور بہادر جوان ہے ـــــ آہ میری تو یہ تمنا ہے کہ کاش سہراب جیسا میرا کوئی لڑکا ہوتا ـــــ آہ ایک ایسا بہادر، شجاع اور ممتاز عالم لڑکا جسے میں جنگ پر بھیجتا۔ اور وہ بدبخت لڑکی نہیں جو گھر میں پڑی ہوئی ہے اور میں اپنے نحیف و نزار، سفید سر والے باپ کے ساتھ مکان پر رہتا ـــــ میں اپنے عزیز باپ کے ساتھ جس کے بھیڑ بکری کے گلوں کو افغانی ڈاکو بھگا لے جاتے ہیں اور جسے لوگ ستاتے رہتے ہیں اسی باپ کے ہمراہ سیستان میں آرام کرتا۔ اور اس کی حفاظت کرتا کیونکہ وہ اب اکیلا ہے، اور کوئی اس کے پاس نہیں جو اسے ڈاکوؤں کی ایذا رسانی سے بچا سکے۔

گودرز۔ ہاں یہ درست ہے لیکن رستم، اس جنگ کے بعد تم چلے جانا۔ اس وقت ضرور ہماری مدد کرو۔

رستم۔ نہیں اب میں کسی جنگ میں حصہ نہ لوں گا۔ میں سیستان چلا جاؤں گا، اپنا زرہ بکتر اتار کر رکھ دوں گا اور صرف اپنی شہرت اور اپنے نام سے اپنے بڈھے باپ زال کی حفاظت کروں گا جو مال اور خزانے میں نے جمع کئے ہیں انہیں اطمینان سے گھر میں بیٹھ کر صرف کروں گا ـــــ سہراب کی دلیری اور بہادری کے راگ سنا کروں گا اور احسان فراموش بادشاہ کی فوج کو موت کے گھاٹ اترتے ہوئے دیکھ کر ذرا بھی رنج اور افسوس نہ کروں گا ـــــ گودرز گودرز تم جاؤ اور کیخسرو سے کہو۔ وہ جا کر سہراب کا مقابلہ کرے۔ میں اب ان خونی ہاتھوں سے (دونوں ہاتھ گودرز کی طرف اٹھا کر) کبھی تلوار نہ اٹھاؤں گا۔

(رستم مسکرانے لگتا ہے)

گودرز (طعن آمیز لہجے میں) رستم تمہارا خیال بجا ہے۔ تم اپنے نقطۂ نظر سے سب کچھ ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مگر رستم دنیا کی طرف بھی دیکھو۔ سہراب نے ہماری فوج کے سب سے بہادر شخص سے مقابلہ کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ اُسے سب سے زیادہ تم سے لڑنے کی خواہش ہے اور وہ صرف تمہاری تلاش میں پھر رہا ہے۔ جب لوگ دیکھیں گے کہ رستم سہراب کے مقابلہ سے منہ چھپاتا ہے تو وہ کیا کہیں گے؟

رستم۔ (کسی قدر برہم ہو کر) گودرز کیا کہیں گے؟ رستم کی شان کے خلاف کوئی ایک لفظ زبان سے نہیں نکال سکتا۔ اس نے اپنے حیرتناک کارناموں سے بچے بچے کو اپنا مدح خواں اور گرویدہ بنا لیا ہے ـــــ گودرز دنیا نے جس زبان سے میری تعریف کے راگ گائے میری شجاعت اور طاقت کے تذکرے کئے، کیا اسی زبان سے اب مجھے بُرا بزدل اور کمزور بھی کہے گی؟

گودرز۔ تم جہاں دیدہ آدمی ہو۔ رستم تم سے میں کیا کہہ سکتا ہوں، لیکن یہ وقت ایسا ہی نازک آپڑا ہے کہ تم اس مرتبہ نہ گئے تو لوگ ضرور کہیں گے کہ رستم نے ایک بخیل کی طرح اپنی شہرت اور ناموری کو محفوظ کرلیا ہے اور وہ اب اُس کو خطرہ میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

رستم۔ (نہایت غصہ میں آکر) گودرز تو ایسی باتیں کیوں اپنی زبان سے نکال رہا ہے۔ تو ان سے بہتر الفاظ جانتا ہے اور کہہ سکتا ہے۔ میرے سامنے ایک یا بہت، کم یا زیادہ، مشہور یا گمنام، شجاع یا بزدل، جوان یا بڈھا، کسی کی کوئی حقیقت نہیں، کیا وہ مرنے والے نہیں ہیں؟ کیا میں وہی رستم نہیں ہوں جس نے اُن جیسے سینکڑوں اور بے شمار انسانوں کو شکست دے کر تہ تیغ کیا۔ (لہجہ بدلتے ہوئے) لیکن احسان فراموش بادشاہ کے لئے کون مفت اپنا سر کھپائے۔

گودرز۔ یہ میں مانتا ہوں کہ کیخسرو نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ لیکن رستم اس وقت کوئی حقیقت کو جاننے کی کوشش نہ کرے گا، بلکہ سب تمہاری بزدلی پر ہی لعنت ملامت کریں گے۔

رستم۔ (غصہ سے) اچھا جا گودرز اور دیکھ رستم کس بخیل کی طرح اپنی شہرت کو پوشیدہ رکھتا ہے ۔۔۔ سن میں گمنام بن کر لڑوں گا اور سادہ زرہ بکتر پہن کر تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ رستم ایک نوجوان سے تن تنہا لڑا ۔۔۔ جا گودرز اور میرا انتظار کر۔

(گودرز وہاں سے شاداں و فرحاں چلا جاتا ہے۔
رستم تالی بجاتا ہے۔ دو ملازم داخل ہوتے ہیں اور رستم کو ایک سادہ زرہ بکتر پہنا دیتے ہیں۔ اور خود میں ایک طرہ بھی لگا دیتے ہیں۔
رستم خیمے سے باہر نکل جاتا ہے)

تیسرا ایکٹ

دریائے آمور کے کنارے ایرانی اور تاتاری فوجوں کے خیمے نظر آرہے ہیں۔ تاتاری فوج داہنی جانب اور ایرانی فوج بائیں جانب صف بستہ کھڑی ہے

بیچ میدان میں سہراب اپنے گھوڑے پر استادہ ہے رستم خیمے سے نکل کر آہستہ آہستہ آتا ہے اور سہراب کے قریب پہنچ جاتا ہے اور سہراب کو نہایت متحیر و معنی خیز نگاہوں سے تکنے لگتا ہے۔

تھوڑا عرصہ گذر جاتا ہے۔

رستم (اپنا ایک ہاتھ سہراب کی طرف اُٹھاتے ہوئے رحم کے انداز سے) اے جوان انسان، زندگی بہت زیادہ خوشگوار، پُرلطف اور آرام دہ ہے۔ لیکن موت بے حد خوفناک، خونی اور تکلیف دہ چیز ہے۔ سوچ لے کہ زندگی موت سے بہتر ہے!

سہراب۔ ہاں، اے جسیم انسان! تو سچ کہتا ہے، مگر اس سے تیرا کیا مطلب ہے؟

رستم۔ میرا مطلب پوچھتا ہے؟ پہلے مجھے دیکھ کہ میں کس قدر قوی ہیکل، اور کتنا طاقتور اور جسیم انسان ہوں۔ میرا تمام جسم فولادی زرہ بکتر سے ڈھکا ہوا ہے میں بے انتہا خونی جنگوں میں حصہ لے چکا ہوں اور میں نے بے شمار دشمنوں کو موت کا راستہ دکھا دیا ہے۔ کبھی نہ کوئی دشمن مجھ سے بچ کر جا سکا اور نہ کبھی کسی نے مجھے شکست دی،

اے سہراب! پھر تو کیوں اپنے آپ کو موت کے منہ میں گرانا چاہتا ہے؟ تاتاری فوج سے نکل کر تو میرے ساتھ ایران چل اور میرا لڑکا بن کر میرے ساتھ رہ، اور میرے جھنڈے کے نیچے رہ کر میری موت تک لڑتا رہ۔ تیری طرح کا بہادر اور دلیر جوان ایران میں ایک بھی نہیں ہے۔

(سہراب رستم کے دیو جیسے جسم کو متحیر نگاہوں سے دیکھتا رہتا ہے اور خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہتا ہے پھر وہ دوڑ کر رستم کے پاس آتا ہے اُس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا ہے اور اُس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ارمان بھری نگاہوں سے رستم کو دیکھنے لگتا ہے)

سہراب۔ (محبّت آمیز لہجہ میں) آہ تمہیں اپنے باپ کی قسم، تمہیں اپنی جان کی قسم، سچ بتاؤ کیا تم رستم نہیں ہو۔ بولو، کیا تم وہ نہیں ہو۔؟

رستم (مشکوک نگاہوں سے سہراب کو دیکھنے لگتا ہے (دور ہٹ کر دل میں) ہاں میں سمجھ گیا اس جوان کی مکاری کو اگر میں کہہ دوں کہ رستم میں ہی ہوں تو یہ لڑنے سے انکار کر دے گا اور تاتار جا کر شیخی مارے گا کہ میرے دعوے پر صرف رستم ہی آیا اور کسی میں جرأت نہ ہوئی، اور یہ کہ میں نے اس سے صلح کر لی۔ اس سے ایرانی فوج کی کتنی بڑی بدنامی ہوگی (سہراب سے مخاطب ہو کر سخت لہجہ میں) او جوان لڑکے تو رستم کے متعلق کیوں فضول سوالات کرتا ہے۔ میں یہاں تیرے سامنے موجود ہوں، اور تیرے دعوے پر تیرے مقابلے کو آیا ہوں۔ مجھ سے مقابلہ کر یا شکست کا اقبال کرے ——— کیا تو صرف رستم سے لڑنا چاہتا ہے؟

سہراب۔ ہاں صرف رستم سے۔

رستم۔ (برہم ہو کر) او شریر لڑکے! لوگ رستم کے چہرے کو دیکھ کر خوف کھاتے ہیں اور بھاگ جاتے ہیں۔ مجھے

اچھی طرح معلوم ہے کہ آج رستم تیرے سامنے موجود ہوتا اور تجھے معلوم ہوجاتا کہ رستم یہی ہے تو تُو ہرگز لڑنے کا خیال نہ کرتا۔ تُو اُن باتوں کو اپنے دل پر نقش کرلے۔ آج تو اپنی بہادری اور شیخی کو برقرار رکھے گا، یا شکست کھائے گا اور تیری ہڈیاں اس ریت کے ذروں میں مل کر ناپید ہوجائیں گی یا دریائے آمور کے طوفان انہیں بہا لے جائینگے۔

سہراب۔ (دلیرانہ لہجہ میں) کیا تُو اس قدر خوفناک ہے؟ نہیں لیکن تیری ان دھمکیوں سے میں ڈرنے والا نہیں ہوں میں کوئی لڑکی نہیں کہ صرف تیری باتوں سے خوفزدہ ہوجاؤں مگر ہاں یہ تُو سچ کہتا ہے کہ اگر رستم اس وقت موجود ہوتا تو یہ لڑائی ہرگز نہ ہوتی ـــــ لیکن آہ رستم یہاں سے کوسوں دور ہے اور ہم دونوں یہاں ایک دوسرے کے مقابلہ پر موجود ہیں۔ تو اب لڑنے کو تیار ہوجا۔ میں جانتا ہوں کہ میں ایک ناتجربہ کار اور جوان آدمی ہوں اور تو مجھ سے بہت زیادہ طاقتور، دیوجثہ اور خوفناک انسان ہے۔ تو مجھ سے بہت تجربہ کار اور جہاں دیدہ ہے لیکن فتح اور شکست خدا کے قابو میں ہیں۔ گو تجھے یقین ہے کہ میں ضرور ہار جاؤں گا لیکن یہ تو بالکل یقینی طور سے نہیں جان سکتا کیونکہ ہم دونوں قسمت کے سمندر میں تیر رہے ہیں اور ایسی موجوں کی سطح پر ہیں کہ ہمیں خبر نہیں وہ کس طرف گرا دینگی دائیں یا بائیں۔ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ ہمیں خشکی پر لے جاکر ڈال دیں گی یا سمندر کے اندر بہت دور سمندر کے اندر موت کے گھاٹ کے قریب گھسیٹ کر لے جائیں گی۔ ہم نہیں جانتے اور کوئی ہمیں نہیں بتا سکتا صرف واقعات سے ہم انجام کا پتہ لگا سکتے ہیں

(رستم یہ سن کر اپنا بھالا سہراب پر مارتا ہے سہراب فوراً ہٹ جاتا ہے اور بھالا زمین پر گر پڑتا ہے۔

سہراب اپنے بھالے سے رستم پر وار کرتا ہے لیکن وہ رستم کی ڈھال میں پھنس کر ٹوٹ جاتا ہے۔

رستم اپنا بہت بھاری گرز، جسے صرف وہی اٹھا سکتا ہے اٹھا لیتا ہے اور سہراب پر حملہ کرتا ہے۔

سہراب اس وار کو بھی خالی جانے دیتا ہے گرز زمین پر گر پڑتا ہے اور اس کے جھونک میں رستم بھی زمین پر آجاتا ہے۔ سہراب پیچھے ہٹ کر متبسم انداز سے رستم کو دیکھنے لگتا ہے۔

(رستم سے مخاطب ہوکر) تو نے اے طاقتور انسان بہت خوفناک حملہ کیا تھا تیرا گرز میری کمزور ہڈیوں کو پیسنے کی بجائے اب دریائے آمور میں بہتا ہوا نظر آئے گا، لیکن اب تو اُٹھ اور غصہ نہ ہو، کیونکہ میں بھی برہم نہیں ہوں ـــــ آہ جب میں تجھے دیکھتا ہوں تو غصہ میرے سینے سے یک لخت مٹ جاتا ہے ـــــ تو کہتا ہے کہ تو رستم نہیں ہے۔ خیر ایسا ہی سہی ـــــ لیکن پھر تو کون ہے جس کی طرف میرا دل آپ ہی آپ کھنچا جاتا ہے میں لڑکا ہوں مگر میں نے بھی جنگ آزمائی کی ہے، میں بھی خون کی ندیوں میں چلا ہوں، میں نے بھی زخمیوں کی

چیخ و پکار سنی ہے، لیکن آج سے قبل کبھی میرے دل میں رحم کا احساس نہیں ہوا، نہ مجھے کبھی کسی دشمن پر ترس آیا کیا یہ کیفیتیں قدرتاً میرے دل میں پیدا ہو گئی ہیں؟ —— اے بڈھے بہادر انسان ہمیں اب انجام کو خدا کے حوالے کر دینا چاہئے —— آ اب ہم اپنے خونی بھالے یہاں ریت میں گاڑ دیں۔ اور آپس میں صلح کر لیں۔ اس ریت پر بیٹھ جائیں اور دوستوں کی طرح ایک دوسرے کی صحت کا جام نوش کریں۔ اور تو مجھ سے رُستم کی شجاعت کے تذکرے کر۔ ایرانی فوج میں کافی سردار ہیں جن سے میں لڑ سکتا ہوں، ان کو مار سکتا ہوں اور مجھے کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی، مگر ہم دونوں کو آپس میں صلح کر لینی چاہئے۔

(سہراب چپ ہو جاتا ہے۔ رستم کھڑا ہو جاتا ہے اور غصہ سے تھر تھر کانپنے لگتا ہے اور اپنا برچھا سنبھال لیتا ہے)

رستم۔ (غصہ سے چلا کر) او مکار لڑکی صرف تیری ٹانگوں میں رقص کرنے والی چھوکریوں کی سی تیزی اور نزاکت ہے، تیرے بازوؤں میں کوئی قوت نہیں۔ تو صرف ایک معشوقہ، ایک رقاصہ اور ایک باتونی چنچل عورت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا —— آ میرے سامنے اب میں تیری نفرت انگیز آواز سننا نہیں چاہتا تو اس وقت افراسیاب کے باغ میں حسین تاتاری لڑکیوں کے ساتھ نہیں ہے جس کا تو عادی ہے۔ بلکہ دریائے آمور کی ریت پر لڑائی کے رقص میں مصروف ہے اور میرے ساتھ، جو لڑائی کو کھیل نہیں سمجھتا —— مجھ سے اب زیادہ صلح و شراب کا تذکرہ مت کر، تو اب جنگ کے تمام فنون اچھی طرح یاد کرلے، اور اپنی تمام جرات اور دلیری سے میرا مقابلہ کر۔ میرے دل میں تیرے لئے جو رحم اور درد تھا سب جاتا رہا، کیونکہ تو نے مجھے اپنی عیاریوں اور لڑکیوں کی سی مکاریوں سے دونوں فوجوں کے سامنے ذلیل کیا ہے۔

(سہراب رستم کی اس توہین اور طعن آمیز تقریر کو سن کر اپنی تلوار میان سے کھینچ لیتا ہے۔

رستم اور سہراب ایک دوسرے پر اس طرح حملہ کرتے ہیں جیسے دو گرسنہ عقاب کسی ایک شکار پر جھپٹیں دونوں کی تلواروں اور زرہوں کی جھنکاریں فضا میں گونجنے لگتی ہیں۔

لڑائی کا منظر اس قدر خوفناک ہو جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے سورج اور ستارے بھی اس میں شریک ہیں۔

یکایک آسمان پر بادل چھا جاتا ہے۔ بہت اندھیرا ہو جاتا ہے اور آندھی کے طوفان زور زور سے چلنے لگتے ہیں آندھی میں رستم اور سہراب چھپ جاتے ہیں)

رستم (زور سے چلا کر) رستم رستم۔

(رستم کا نام سن کر سہراب پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ رستم کو غور سے دیکھنے لگتا ہے اور اپنی تلوار اور ڈھال پھینک دیتا ہے،

رستم کا برچھا اُس کے سینے میں پیوست ہو جاتا ہے اور سہراب زخمی ہو کر زمین پر گر پڑتا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد آندھی بند ہو جاتی اور آسمان بھی صاف ہو جاتا ہے)

رستم۔ (نفرت انگیز تبسّم سے) سہراب تیرا خیال تھا کہ آج تو ایک ایرانی سردار کو شکست دے کر قتل کر ڈالے گا، اور افراسیاب کے خیموں میں جا کر اپنی بڑائی کا تذکرہ کرے گا۔ نیز ا خیال تھا کہ خود رستم تجھ سے لڑنے آئے گا، اور تیری مکاریاں ایک تحفہ قبول کرنے پر اُسے مجبور کر دیں گی اور وہ تجھے یوں ہی چلا جانے دے گا۔ اور پھر تمام تاتاری فوجیں تیری اس شجاعت کی تعریف کریں گی اور تیری شہرت تمام دنیا میں پھیل جائے گی اور اس طرح تُو اپنے ضعیف باپ کو بے حد مسرور کر سکے گا۔ بیوقوف لڑکے اس وقت ایک گمنام شخص نے تجھے شکست دے کر زخمی کیا ہے اور اب تو اپنے باپ اور رشتہ داروں کو عزیز ہونے کی بجائے بھیڑیوں اور درندوں کی غذا بنے گا۔

سہراب۔ (اطمینان کے ساتھ) تو ایک گمنام انسان سہی، لیکن تیری یہ تمکنت اور شیخی فضول ہے۔ اے مغرور شخص "تو" نے مجھے قتل نہیں کیا بلکہ "رستم" کے نام نے مجھے زخمی کیا ہے۔ اور اِس باپ کی محبت سے بھرے ہوئے دل" نے اگر میں تجھ جیسے دس آدمیوں سے بھی مقابلہ کرتا تو وہ سب یہاں مردہ پڑے ہوتے اور میں تیری جگہ پر کھڑا ہوتا لیکن آہ اس پیارے نام نے مجھے ساکت کر دیا، اور میرے ہوش و ہواس گم کر دیئے۔ میری سانسیں روک لیں۔ وہ نام ـــــ اور کوئی اَن دیکھی چیز جو تجھ میں ہے ـــــ میں اعتراف کرتا ہوں ـــــ کوئی ان دیکھی چیز جو ہر وقت میرے دل کو بے قرار رکھتی ہے اُسی نے مجھے ڈھال اور تلوار پھینک دینے پر مجبور کیا، اور تیرا برچھا ایک غیر محفوظ انسان کے قلب میں پیوست ہو گیا۔ اب تو شیخی مار رہا ہے اور میری قسمت پر ہنس رہا ہے، لیکن او خوفناک انسان سن اور اپنے کانوں سے سن اور سن کر کانپ اٹھ کہ رستم میری موت کا انتقام تجھ سے ضرور لے گا۔ رستم میرا باپ، جسے میں تمام دنیا میں تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔ وہ اپنے بیٹے کی اس موت کا بدلہ تجھ سے ضرور لے گا اور اچھی طرح تیری سرزنش کرے گا۔

(رستم سہراب کی باتیں سن کر قدرے متحیر ہو جاتا ہے اور اس راز کو نہ جانتے ہوئے خاموشی سے دیکھتا رہتا ہے)

رستم (سخت اور کرخت لہجہ میں) یہ باپ اور انتقام کا کیا فضول تذکرہ ہے۔ رستم کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔

سہراب:۔ (نحیف آواز میں) آہ ـــــ ہاں اُس کا ایک بیٹا تھا اور میں وہی کھویا ہوا بیٹا ہوں۔ یقیناً ایک روز یہ خبر

اس کے کانوں تک بھی پہنچ جائے گی۔ وہیں جہاں وہ اس وقت بیٹھا اطمینان سے دن گذار رہا ہے۔ کسی جگہ ــــ معلوم نہیں کہاں ــــ لیکن یہاں سے منزلوں دور ــــ اور یہ اُس کے دل میں تیر کی طرح جاکر لگے گی ــــ یہ خبر سن کر وہ تڑپ اُٹھے گا، اور تجھ سے انتقام لینے کا فلک شگاف نعرہ مارنے لگے گا ــــ اے خوفناک انسان ــــ خیال کر، صرف ایک ہی بیٹے کے لئے، اُس کا غم کس قدر محشر خیز اور اس کا انتقام کتنا آسمان کو لرزہ براندام کرنے والا ہوگا ــــ آہ کاش میں اُس کے اس غم کو دیکھنے تک زندہ رہ سکتا ــــ تاہم مجھے اپنے باپ کے غم والم کا اتنا خیال نہیں جتنا ماں کا۔ میری بیچاری ماں، جو اپنے ضعیف باپ کے ساتھ جو کرد پر حکمرانی کرتا ہے آذربائیجان میں رہتی ہے ــــ ہاں اسی ماں پر مجھے بہت ترس آتا ہے، اُس کی مجبور حالت پر، جو اب اپنے بیٹے سہراب کو تاتاری فوج سے مع مال ومتاع اور وقعت و احترام کے ساتھ دوبارہ لوٹتے ہوئے نہ پائے گی ــــ ایک غمناک خبر، ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے میں پھیلتی رہے گی اور آخر کار اس کے کانوں میں بھی پڑے گی اور تب اس بیچاری عورت کو معلوم ہوگا کہ اب سہراب اس کی آنکھوں کو روشن کرنے کے لئے کبھی واپس نہ آئے گا، بلکہ ایک گمنام انسان سے لڑائی میں ہار کر دریائے آمو کے کنارے زخمی پڑا ہے۔

(سہراب چپ ہوجاتا ہے اور اپنی موت اور ماں کی مفارقت کا خیال کرکے رونے لگتا ہے

رستم غور سے اس کو دیکھتا رہتا ہے اور ایک گہرے خیال میں ڈوب جاتا ہے کیونکہ آذربائیجان سے اس کو ایک لڑکی پیدا ہونے کی خبر آئی تھی۔

سہراب کی موجودہ حسرتناک زندگی اور حالت دیکھ کر اس کی نگاہوں میں اپنے خسر کی محبت، اس کے محل اور اپنی پُرلطف زندگی کا منظر سما جاتا ہے۔ وہ نہایت بے تابی سے سہراب کو دیکھنے لگتا ہے اور اب اس کے قلب میں ایک انتہائی غم کا سمندر ابلنے لگتا ہے)

رستم۔ (دردآگین لہجہ میں) سہراب درحقیقت تو ایسا ہی لڑکا ہے جسے رستم بہت پیار کرتا ــــ کاش تو اس کا لڑکا ہوتا ــــ تاہم اس وقت تو اپنے آپ کو رستم کا بیٹا بتلا رہا ہے سہراب تجھے لوگوں نے غلط باور کرادیا ہے ــــ تو رستم کا بیٹا نہیں ہے۔ کیونکہ رستم صرف ایک کمزور لڑکی کا باپ ہے، جو اب اپنی ماں کے ساتھ نسوانی زندگی اور خانہ داری کے کاروبار میں مصروف ہوگی۔

(سہراب رستم کی باتیں سن کر برافروختہ ہوجاتا ہے اور اُس کی تکلیف میں اضافہ ہوجاتا ہے وہ اپنے جسم سے برچھا نکالنے کا ارادہ کرتا ہے تاکہ خون آسانی سے بہ جائے اور اس کی روح بھی عالم بالا کی طرف صعود کرجائے)

سہراب (خود سے ایک ہاتھ کے سہارے اٹھتے ہوئے) لیکن میں مرنے سے پہلے اپنے دشمن کے سامنے اپنے آپ کو رستم کا بیٹا ثابت کروں گا (رستم سے مخاطب ہوکر) آہ تو کون ہے جو میری باتوں کو جھوٹ سمجھتا ہے۔ ایک مرنے والے انسان کی زبان سے سچے الفاظ کے سوا اور کچھ نہیں نکل سکتا اور میں نے اپنی ساری عمر میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ میں تجھ سے کہتا ہوں کہ میرے اس بازو پر رستم کی وہ مہر لگی ہوئی ہے جو اس نے میری ماں کو یہ کہتے ہوئے دی تھی کہ جب کوئی بچہ پیدا ہو تو یہ اس کے بازو پر ثبت کر دے۔

(رستم سہراب کے ان الفاظ کو سن کر بیتاب ہو جاتا ہے۔ اور اس کی ٹانگوں اور عام اعضا میں ایک رتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔

وہ اپنے زرہ بکتر سے ملفوف ہاتھوں کو اپنے سینے پر مارنے لگتا ہے جس سے ایک نہایت پرسوز گونج پیدا ہوتی ہے۔ وہ اپنے بڑے بڑے ہاتھوں سے اپنے دل کو اس طرح ملنے لگتا ہے جیسے کوئی اس کی روح اس کے جسم سے کھینچ رہا ہو)

رستم (انتہائی حسرت و یاس کے لہجہ میں) سہراب یہ ایک ایسا ثبوت ہے جس میں شک کی ذرا بھی گنجائش نہیں اگر تو وہ مہر دکھا دے تو یقیناً تو رستم کا بیٹا ہے۔

(سہراب آہستہ آہستہ اپنا بازو کھولتا ہے اور کندھے کے قریب بازو پر لگی ہوئی رستم کی مہر، رستم کو دکھاتا ہے اور پھر اسے حسرتناک نگاہوں سے دیکھتا ہے)

سہراب۔ (مہر کو اپنے کمزور ہاتھوں سے چھوتے ہوئے) تو کیوں جھوٹ سمجھتا ہے؟ یہ دیکھ یہ رستم کی نشانی ہے یا کسی اور کی؟

(رستم نہایت بے قراری سے مہر کو دیکھنے لگتا ہے)

رستم۔ (شدت غم سے دیوانہ ہو کر) اے بیٹے میں رستم تیرا باپ ہوں۔

(رستم کی آواز رک جاتی ہے اسے چکر آتا ہے اور بے تحاشا ریت پر بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے۔

سہراب ریت پر گھسٹتا ہوا اپنے باپ کے قریب پہنچ جاتا ہے، اپنے دونوں ہاتھ اس کی گردن میں ڈال دیتا ہے، اس کے لبوں کو بوسے دیتا ہے اور پھر اسے ہوش میں لانے کے لئے آہستہ آہستہ اپنے ہاتھوں کو اس کے چہرے پر پھیرنے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر گذر جاتی ہے۔

رستم ہوش میں آتا ہے اور اپنی آنکھیں کھول دیتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو متوحش نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ رستم اپنے دونوں ہاتھوں میں ریت اٹھا کر اپنے سر پر ڈالنے لگتا ہے اور زور زور سے اپنے آپ کو

برا بھلا کہنے لگتا ہے۔ پھر تلوار نکال کر خودکشی کرنا چاہتا ہے۔ سہراب اُس کا ارادہ سمجھ لیتا ہے اور اپنے باپ کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے)

سہراب۔ (باپ کو تسکین دیتے ہوئے) میرے پیارے باپ، صبر کیجئے، کیونکہ کاتب ازل نے جو کچھ میری پیشانی پر لکھ دیا تھا وہ آج پورا ہو رہا ہے ـــــ آپ خدا کے وہ نامعلوم ہاتھ ہیں جو اس فرض کی تکمیل کے لئے مقرر کئے گئے۔ آپ کو پہلی ہی نظر میں دیکھ کر، بلا شبہ میرا دل یہ بول اٹھا تھا کہ آپ رستم ہیں۔ اور آپ کا دل بھی یہی کہہ رہا تھا ـــــ میں جانتا ہوں لیکن قسمت نے ان نازک احساسات کو اپنے فولادی پنجوں سے روند ڈالا ـــــ روند ڈالا اور پیس کر بالکل فنا کر دیا۔ آہ صرف قسمت اور اسی قسمت نے مجھے اس لڑائی میں شریک ہونے پر مجبور کیا اور آخر مجھے اپنے باپ کی برچھی کا نشانہ بنا دیا ـــــ لیکن اب ہمیں اس کے متعلق کچھ خیال نہ کرنا چاہئے ـــــ جو کچھ گذر گیا بھول جائیے ـــــ سب کچھ، اور میں بھی بھلا دوں گا ـــــ میں اب اپنے باپ کو دیکھ رہا ہوں۔ مجھے یہ اطمینان کر لینے دیجئے کہ میں نے اپنے باپ کو پا لیا ـــــ آئیے میرے پاس ریت پر بیٹھ جائیے۔ میرا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیجئے۔ میرے گرد آلود چہرے کو بوسے دیجئے اور اس کو اپنے محبت بھرے آنسوؤں سے دھونے کی کوشش کیجئے اور کہئے "میرا بیٹا، میرا پیارا سہراب" میں آپ کی زبان سے یہ پیارے اور دلکش الفاظ سننے کے لئے بے چین ہوں ـــــ جلد بہت جلد ـــــ دیر نہ کیجئے۔ اب میری زندگی کے صرف چند لمحے اور باقی ہیں۔ جلدی کیجئے، کیونکہ میں بجلی کی طرح اس میدان میں نازل ہوا تھا اور اب آندھی کی طرح جا رہا ہوں ـــــ ہاں ایک بہت تیز رو آندھی کی طرح میں چلا جاؤں گا کیونکہ کاتب ازل نے یہ واقعہ بھی ہمارے صفحۂ تقدیر پر غیر فانی حروف میں نقش کر دیا تھا۔

(رستم سنتا رہتا ہے اور پھر بے ساختہ رو پڑتا ہے۔ پھر سہراب کو اپنے دونوں بازوؤں میں لے لیتا ہے اور چلا چلا کر رونے لگتا ہے۔ اور سہراب کو پیار کرتا جاتا ہے۔ یہ دلخراش منظر دیکھ کر دونوں فوجوں پر ایک حسرتناک خاموشی اور غم طاری ہو جاتا ہے)

رستم ۔ (نہایت غم انگیز اور جگر سوز لہجہ میں) آہ سہراب میں چاہتا ہوں کہ دریائے آمو کے طوفان آ کر مجھے بہا لے جائیں، میں چاہتا ہوں کہ اُس کی خوفناک اور بلند موجیں ہمیشہ کے لئے مجھے اپنے اندر سما جانے دیں۔

سہراب۔ (نقاہت سے) آہ ایسی تمنا نہ کیجئے۔ ابھی آپ کو زندہ رہنا چاہئے، کیونکہ کچھ لوگ بڑے بڑے کارناموں کی تکمیل کے لئے پیدا ہوتے ہیں اور بعض کی تخلیق بہت جلد فنا ہو کر گمنام ہو جانے کے لئے ہوتی ہے۔ اب آپ اپنی زندگی میں ایک نئی شہرت حاصل کیجئے ـــــ آپ میرے باپ ہیں۔ اور آپ کی شہرت اور نیک نامی

میری اپنی شہرت اور عزت ہے ـــــ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں اس فوج کو جو میرے ساتھ آئی ہے۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اس میں سے کسی ایک کو بھی قتل نہ کیجئے۔ میں ان کے لئے سفارش کرتا ہوں اُن کی اس میں کوئی خطا نہیں ہے۔ انہوں نے میرا ساتھ دیا ہے ـــــ میری امیدوں کا ـــــ میری شہرت کا ـــــ میری قسمت کا ـــــ ابا جان ان سب کو دریائے آمو کے پار اطمینان اور بلا کسی خوف اور ضرر کے گذر جانے دیجئے۔ لیکن مجھے آپ خود لے جائیے۔ اور سیستان لے جاکر مجھے ایک بستر پر لٹا دیجئے۔ اور میرے لئے ماتم کیجئے۔ آپ کا سفید بالوں والا باپ زال۔ اور آپ کے دوست ـــــ سب مل کر ماتم کریں۔ آپ مجھے وہاں کی پیاری اور مقدس خاک میں دفن کیجئے اور میری ہڈیوں کے اوپر ایک قبر بنا دیجئے۔ اور اس کے قریب ایک بہت بلند مینار بنائیے جو میلوں کے فاصلہ سے بھی نظر آسکے تاکہ جب کوئی فوجی سردار ادھر سے گذرے تو دیکھ کر کہے۔

"سہراب، رستم کا بیٹا یہاں راحتِ ابدی کی نیند لے رہا ہے جس کو اُس کے بہادر باپ نے دھوکے اور نادانی سے قتل کر ڈالا"

رستم۔ (پُر درد آواز سے) میرے پیارے بیٹے سہراب جیسا تُو نے کہا ہے ویسا ہی ہوگا۔ تو اس کی فکر نہ کر۔ پیارے سہراب میں تجھے اپنے ہمراہ سیستان لے جاؤں گا۔ تجھے ایک بستر پر لٹا دوں گا اور آہ و زاری کروں گا۔ میرے ساتھ میرا بڈھا باپ اور تمام دوست اور عزیز بھی اس ماتم میں شریک ہونگے۔ میں تجھے وہاں کی بے حد پیاری اور پاک زمین میں دفن کروں گا، اور ایک بہت اونچا مینا ر بنواؤں گا، اور لوگ تجھے اور تیری قبر کو کبھی نہ بھولیں گے میں تیری فوج کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچاؤں گا۔ میں اُسے دریائے آمو کے پار اطمینان سے اور بے خوف و خطر گذر جانے دوں گا ـــــ آہ اب میں ان میں سے کسی کو مار کر کیا کروں گا ـــــ کاش وہ سب جن کو میں نے قتل کیا ہے ایک مرتبہ اور زندہ ہو جاتے۔ میرے خونخوار دشمن جو اپنے زمانہ کے ہیرو کہلاتے تھے اور جن کو شکست دے کر میں نے موجودہ شہرت حاصل کی ہے، وہی سب زندہ ہوتے اور میں صرف ایک ادنیٰ درجے کا آدمی ہوتا ـــــ ایک بہت معمولی، ایک غریب ایک کمزور اور گمنام سپاہی۔ آہ شاید اُس وقت۔ میرے پیارے بیٹے ـــــ میرے پیارے سہراب۔ اُس وقت تو زندہ رہ سکتا ـــــ کاش اس وقت تیرے حملے سے زخمی ہو کر میں خود ہی اس خونی ریت پر پڑا دم توڑ رہا ہوتا، مگر تو میرے حملے سے نہیں۔ کاش اس وقت میں مر رہا ہوتا مگر تو نہیں۔ اور میں سیستان لے جایا جاتا، مگر تو نہیں۔ اور زال میری قبر پر روتا، مگر تیری قبر پر نہیں۔ اور کہتا۔ "اے بیٹے میں تیری موت کا غم ضرور کر رہا ہوں لیکن اس اطمینان کے ساتھ کہ تو نے خود ہی ایسے انجام کی آرزو کی تھی" اب

تک میری زندگی جنگی اور خونی مناظر میں گذری ہے، اور میں شاید اب یہ خونریز زندگی کبھی ختم نہ کرسکوں گا۔

سہراب۔ (انتہائی ضعف سے) بیشک او شیر دل انسان ایک خونی زندگی ــــــ لیکن اب تجھے آرام حاصل ہونے والا ہے اب تجھے سکون مل جائے گا ــــــ اس وقت نہیں ــــــ ابھی نہیں ــــــ لیکن ہاں اُس دن جب تو ایک بلند اور سفید بادبان والے جہاز میں سفر کرے گا۔ اور صرف تو نہیں بلکہ کیخسرو کے اور تمام سردار بھی تیرے ساتھ ہونگے ــــــ نیلے سمندر کو پار کر کے گھر پہنچ کر اور اپنے عزیز بیٹے کو قبر میں سلانے کے بعد ــــــ ہاں اُس وقت تجھے سکون مل جائے گا ــــــ

رستم۔ (سہراب کو ارمان بھری نگاہوں سے تکتے ہوئے) میرے بیٹے۔ خدا وہ دن جلد لائے اور وہ گہرا نیلا سمندر۔ اُس وقت تک اگر خدا کی مصلحت یہی ہے تو مجھے یہ صدمہ برداشت کرنا پڑے گا۔

(سہراب رستم کے چہرے کو دیکھ کر مسکراتا ہے پھر برچھی اپنے جسم سے علیحدہ کرتا ہے۔ اور خون ندی کی طرح اس کے زخم سے بہنے لگتا ہے۔

سہراب اپنی نگاہیں باپ کے چہرہ پر جما دیتا ہے۔ رستم اپنی آنکھیں اپنے بیٹے کے معصوم اور حسرت نصیب چہرہ پر گاڑ دیتا ہے۔

سہراب کی روح پرواز کر جاتی ہے رستم بیٹھا آنسو بہاتا رہتا ہے۔ دونوں فوجیں اپنے اپنے خیموں کی طرف آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگتی ہیں)

آرنلڈ

محشر عابدی

صرف اپنے پر بھروسا رکھ پھر اور کوئی تجھے دھوکا نہ دے گا۔

قوت مطیع کرے لیکن رام صرف محبت ہی کر سکتی ہے۔ جس نے پہلے محبت کی وہ بازی لے گیا۔

اگر تو باپ بن کر حکم منوانا چاہتا ہے تو پہلے بیٹا بن کر حکم ماننا سیکھ۔

دیہات کی دنیا میں خدا کے کارخانے ہیں شہروں کی دنیا میں انسان کے۔

تعریف کی خواہش نہ کرو بلکہ صرف نیکی کی پھر تعریف خود بخود تمہاری طرف کھچی چلی آئے گی۔

خیرات کی کئی صورتیں ہیں لیکن اُس کی ہر صورت خوبصورت ہے۔

گلچیں

پریشیدۂ خیال!

میری آنکھوں میں نہاں، اک پیکرِ تنویر ہے
میرے دل میں جلوہ گر، اک حسن کی تصویر ہے!
میرے خوابِ شعر کی اک دلنشیں تعبیر ہے

رات دن میری فضائے روح میں رہتی ہے وہ
دل کی ہم آغوشیوں کی آفتیں سہتی ہے وہ!
اور مجھ سے داستانیں عشق کی کہتی ہے وہ!

میری نیندوں کی فضاؤں میں وہی ہے جلوہ گر!
میری راتوں کی دعاؤں میں وہی ہے جلوہ گر!
میرے شعروں کی اداؤں میں وہی ہے جلوہ گر!

میرے اشکِ شبنمیں میں یہ اُسی کا نور ہے!
میری وارفتہ نگاہوں میں وہی مستور ہے!
اُس کے جلووں سے مری دنیائے دل معمور ہے!

جب کبھی راتوں کو مل جاتی ہے تنہائی مجھے
پاس لے جاتا ہے ذوقِ سجدہ فرسائی مجھے!
اور تصور میں وہ کر جاتی ہے سودائی مجھے!

اُس کی الفت کی خلش سینے میں جب پاتا ہوں میں
جھوم کر پُر درد نغمے عشق کے گاتا ہوں میں!
سازِ حسرت کے، فضا میں، سوز برساتا ہوں میں!

جی میں آتی ہے کہ اُس کی یاد میں کھو جاؤں میں
اس تصور میں ہمیشہ کے لئے سو جاؤں میں!
یعنی مٹ کر اُس کے جلووں میں فنا ہو جاؤں میں!!

"آوارہ"

ذرّاتِ مُضطرب

میں اور میرے چند عزیز اور رشتہ دار پوجا کے سفر سے واپس کلکتہ جا رہے تھے کہ ہماری اُس شخص سے گاڑی میں ملاقات ہوئی۔ وضع ولباس سے تو پہلے ہم یہ سمجھے کہ وہ کوئی شمالی علاقہ کا مسلمان ہے مگر جب ہم نے اُس کی باتیں سنیں تو ہم حیران رہ گئے۔ ہر موضوع پر وہ اس تیقن کے ساتھ گفتگو کرتا تھا کہ اگر کوئی اس کو سنے تو یہی سمجھے کہ شاید دنیا جہان کو آراستہ ومنظم کرنے والا خدا بھی ہمیشہ اور ہر بات میں اس شخص سے مشورہ لے کر کام کرتا ہوگا۔

اودھر اب تک ہم ہر قسم کے فکر وغم سے آزاد تھے، کیونکہ ہمیں علم ہی نہ تھا کہ دنیا میں کون کون سی نادیدہ وناشنیدہ طاقتیں کارفرما ہیں۔ ہمیں خبر نہ تھی کہ روسی بڑھتے بڑھتے ہمارے قریب آ گئے ہیں، انگریزوں کی گہری اور پُر اسرار چالوں سے ہم ناواقف تھے اور ہمیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ دیسی ریاستوں کی تباہی وبربادی کا زمانہ قریب آ پہنچا ہے۔ ہمارے نئے دوست نے مسکراتے ہوئے حرافانہ انداز سے کہا "میرے دوست! آسمان اور زمین میں بعض ایسی باتیں بھی ظہور میں آتی ہیں جن سے تمہارے اخبارات کے صفحات بے بہرہ رہتے ہیں۔" چونکہ ہم اس سے پہلے کبھی اپنے گھر سے باہر نہ نکلے تھے اس لئے اُس شخص کی وضع وگفتگو نے ہماری زبانوں پر مہرِ سکوت لگا دی۔ کتنا ہی عام اور معمولی سے معمولی موضوع کیوں نہ ہو، وہ اس پر مختلف علوم کی رو سے بحث کرتا، ویدوں سے حوالے دیتا یا کسی ایرانی شاعر کی رباعیات پڑھتا اور چونکہ ہمیں ان علوم اور کتبِ مقدسہ کے جاننے کا یا اپنی فارسی دانی کا کوئی دعویٰ نہ تھا اس لئے ہمارے دلوں میں اس کی بزرگی کا نقش گہرا ہوتا چلا گیا۔ میرے عزیزوں میں ایک جنہیں تصوف سے شغف تھا، یہ سمجھنے لگے کہ اس شخص کے قبضہ میں ضرور کوئی غیر معمولی روحانی قوت ہے۔ وہ ہمارے اس عجیب وغریب ہم سفر کے فرسودہ سے فرسودہ خیالات کو نہایت توجہ سے سنتے اور پوشیدہ طور پر اس کی گفتگو کے بعض فقرات قلمبند بھی کرتے جاتے۔ میرا خیال ہے کہ اُس نے ان کی یہ حرکت دیکھ لی اور اس پر کسی حد تک مسرور بھی ہوا۔

جب گاڑی مقامِ اتصال پر پہنچی تو ہم تبدیلی کے لئے ویٹنگ روم جمع ہو گئے۔ رات کے دس بج چکے تھے، اور چونکہ لائنوں کی خرابی کی وجہ سے ہماری گاڑی کے دیر میں آنے کا احتمال ظاہر کیا جا رہا تھا اس لئے میں نے میز پر اپنا بستر پھیلا دیا اور لیٹنے کے قریب ہی تھا کہ اس حیرت انگیز انسان نے اپنی کہانی شروع کر دی۔ بلاشبہ میں اس رات آنکھ نہ جھپک سکا۔

جب چند انتظامیہ مسائل پر اختلاف ہو جانے کی وجہ سے میں نے اپنی جوناگڈھ کی ملازمت ترک کر دی اور نظام حیدرآباد کی ملازمت میں شامل ہو گیا تو انہوں نے مجھے مضبوط اور نوجوان دیکھ کر جھٹ بیرچ میں کپاس کے محصول کی کلکٹری پر متعین کر دیا۔

بیرچ ایک خوبصورت مقام ہے۔ یہاں ایک ندی تنہا پہاڑیوں کے نیچے جنگلوں کے پتھریلے راستوں سے شور مچاتی اور کنکروں کو بجاتی اس طرح چلتی ہے جیسے کوئی طرار رقاصہ سبک خرامی کر رہی ہو۔ دریا سے کوئی ڈیڑھ سو سیڑھیوں کی بلندی پر اور پہاڑی کے دامن میں سنگِ مرمر کا ایک تنہا محل کھڑا ہے۔ اس کے آس پاس کوئی انسان نہیں رہتا—— بیرچ کا گاؤں اور کپاس کی منڈی یہاں سے فاصلہ پر واقع ہیں۔

تقریباً ڈھائی سو سال گزرتے ہیں کہ شہنشاہ محمود ثانی نے یہ تن تنہا محل یہاں اپنے عیش و عشرت کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ اُس کے عہد میں یہاں فواروں میں سے گلاب کی دھاریں اچھلتی تھیں، اور پانی کی ہلکی ہلکی موجوں سے دھوئے ہوئے کمروں کے ٹھنڈے ٹھنڈے فروش پر نوخیز ایرانی لڑکیاں نہانے سے پہلے اپنے بال کھول کر بیٹھتی تھیں، اور اپنے نرم نرم برہنہ پیروں سے شفاف پانی کے حوضوں میں چھینٹے اڑاتی تھیں اور بربط کی دھن پر اپنے تاکستانوں کے نغمے گاتی تھیں۔

فوارے اب نہیں اچھلتے نغمے خاموش ہو چکے ہیں، وہ برف جیسے سفید پاؤں بھی اب اس برفانی مرمر کو اُس انداز و ادا سے نہیں چھوتے۔ یہ جگہ اب ہم جیسے تنہائی کے ماروں اور بیوی بچوں کی صحبت سے محروم محصولیوں کی قیام گاہ بنی ہوئی ہے۔ کریم خاں جو ہمارے دفتر کا ایک محرر ہے مجھے ہمیشہ اس مقام کو اپنا مسکن بنانے سے منع کیا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا "دن تم شوق سے یہاں گذارو لیکن رات کبھی بسر نہ کرنا" میں ہنسی ہنسی میں بات ٹال دیا کرتا۔ ملازمین نے کہا ہم گھری شام تک تو کام کیا کریں گے لیکن رات کو چلے جایا کریں گے۔ میں نے اسے جھٹ منظور کر لیا۔ یہ مکان ایسا بدنام ہو چکا تھا کہ اندھیرا چھا جانے کے بعد چوروں کو بھی یہاں ٹھہرنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔

پہلے پہل اس سنسان محل کی تنہائی کابوس کی طرح مجھ پر سوار رہی۔ میں دن بھر باہر رہتا اور بڑی محنت سے کام کرتا، پھر رات کو تھک ٹوٹ کر گھر آتا اور آتے ہی سو جاتا۔

ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ محل کا پُرہول سحر مجھ پر چھانے لگا۔ یہ بات بیان سے بھی باہر ہے اور لوگوں کو اس پر یقین دلانا بھی مشکل ہے لیکن مجھے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے یہ تمام مکان ایک زندہ جسم ہے جو مجھے آہستہ آہستہ اور ایک نامعلوم طریقہ سے ہضم کر رہا ہے۔

شاید یہ عمل اسی وقت شروع ہوگیا جب میں نے گھر میں قدم رکھا لیکن مجھے وہ دن بہت اچھی طرح یاد ہے جب میں پہلی مرتبہ اس سے آگاہ ہوا۔

موسم گرما کی ابتدا تھی اور چونکہ تجارت کا بازار سرد تھا اس لئے میرے پاس کوئی کام نہ تھا۔ غروب آفتاب سے کچھ پہلے میں سیڑھیوں کے نیچے دریا کے کنارے ایک آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ ندی کا پانی اترا ہوا تھا۔ دوسری طرف ریت کا ایک چوڑا سا قطعہ شام کے رنگوں سے چمک رہا تھا۔ کہیں سے ہوا کا ایک جھونکا بھی نہ آتا تھا، اور پُرسکون فضا اُن جھاڑیوں کی گراں بار خوشبو سے لدی ہوئی تھی جو پاس کی پہاڑیوں پر اگ رہی تھیں۔

سورج پہاڑی چوٹیوں کے پیچھے اوجھل ہوگیا تو دن کے چہرے پر ایک لمبی سیاہ نقاب پڑ گئی، اور حائل پہاڑیوں نے اُن لمحات کو مختصر کرکے کاٹ ڈالا جن میں غروب کے وقت روشنی اور سایہ آپس میں ملتے ہیں میں نے گھوڑے پر سوار ہوکر باہر سیر کو جانے کا خیال کیا اور اب اُٹھنے ہی کو تھا کہ پیچھے سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے پیچھے دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔

میں اسے دھوکا سمجھ کر پھر بیٹھ گیا تو سیڑھیوں پر مجھے کتنے ہی پاؤں پڑتے ہوئے سنائی دیئے، جیسے بہت سے آدمی ایک ساتھ نیچے اتر رہے ہیں۔ مسرت کی ایک عجیب تھرتھری جس میں کچھ کچھ خوف بھی ملا ہوا تھا میرے بدن میں دوڑ گئی، اور گو میری نظروں کے سامنے کوئی شکل نہ تھی تاہم مجھے خیال ہوگیا کہ ہنستی کھیلتی دوشیزہ لڑکیوں کی ایک ٹولی ندی میں نہانے کے لئے سیڑھیوں سے اتر رہی ہے۔ وادی میں، دریا میں، محل میں ذرا سا کھٹکا بھی نہ ہوتا تھا کہ سکوت اُس سے ٹوٹے، لیکن لڑکیوں کی اُس مسرور اور خوش آیند ہنسی کو جو کسی سینکڑوں جھرنوں میں سے بہنے والے نغمہ ریز چشمے کی طرح پھوٹ رہی ہو میں نے صاف سُن لیا جب وہ میری موجودگی کا احساس کئے بغیر شوخی سے ایک دوسرے کا تعاقب کرتی میرے پاس سے گزر گئیں۔ جس طرح وہ مجھ کو نظر نہ آتی تھیں اسی طرح میں بھی ان کو نظر نہ آتا تھا۔ دریا میں کامل سکون تھا، لیکن مجھے یوں معلوم ہوا جیسے اس کے ساکن، پایاب اور صاف پانی میں چوڑیوں سے کھنکھناتی ہوئی باہوں کے ہلنے سے ایک ہیجان پیدا ہوگیا ہے، جیسے لڑکیاں ہنستی ہیں اور ایک دوسرے پر پانی کے چھینٹے اڑاتی ہیں اور جیسے ان حسین تیراکوں کے پاؤں ننھی ننھی لہروں کو ابھار ابھار کر اُن میں سے موتی اچھال رہے ہیں۔

میرا دل کانپ گیا ــــــ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیفیت خوف کی وجہ سے طاری ہوئی یا خوشی سے یا تعجب سے۔ میرے دل میں ان باتوں کو اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ دیکھنے کی خواہش تھی مگر مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ میں نے سوچا کہ

اگر میں اپنے کانوں پر ذرا زور ڈالوں تو میں اُن کی تمام گفتگو سمجھ لوں گا، اور میں نے بہت زور ڈالا مگر جنگل کے جھینگروں کی آواز کے سوا مجھے کچھ سنائی نہ دیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے ڈھائی سو برس کا ایک تاریک پردہ میرے سامنے لٹک رہا ہے، اور میں کانپتے ہوئے اس کا ایک کونہ ہٹا کر نظارے کو جھانک لوں گا، گو دوسری طرف کا مجمع پورے طور پر تاریکی میں لپٹا ہوا تھا۔

شام کا سکوتِ گراں یکایک ہوا کے ایک جھونکے سے ٹوٹ گیا، اور ندی کی ساکن سطح پر کسی دریائی پری کے گھنگریالے بالوں کی سی لہریں اُٹھنے لگیں، اور شام کی تیرگی میں لپٹے ہوئے جنگلوں میں سے ایک مسلسل سنسناہٹ سنائی دینے لگی جیسے وہ کسی خوابِ سیاہ سے بیدار ہو رہے ہوں۔ اس کو حقیقت کہو یا خواب، وہ غیر مرئی لمحاتی جھلک جس کا انعکاس اڑھائی سو سال کی پرانی دنیا سے ہو رہا تھا ایک پل میں میری آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ وہ پُراسرار شکلیں جو غیر جسمانی رفتار اور بلند بے آواز قہقہوں کے ساتھ جلد جلد میرے پاس سے گزر گئی تھیں اور دریا میں کود پڑی تھیں اب اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں کے ساتھ اسی راستے واپس نہ گئیں بلکہ جس طرح خوشبو ہوا میں مل کر غائب ہو جاتی ہے اسی طرح وہ بھی ہوا کے ایک ہی جھونکے سے منتشر ہوگئیں۔

اب حقیقتاً مجھ پر ایک خوف ساطاری ہوگیا یہ شاید سرسوتی دیوی تھی جس نے مجھے اکیلا دیکھ کر مجھ پر غلبہ پا لیا تھا ـــــ آہ، اس ساحرہ نے یہ نہ دیکھا کہ اُس کم بخت کو تباہ کرنے سے کیا حاصل ہے جو کپاس کا محصول اکٹھا کر کے اپنی روزی کماتا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج نہایت اچھا کھانا کھاؤں گا کیونکہ جب پیٹ خالی ہوتا ہے تو بہت سے امراض اسے اپنی آماجگاہ بنا لیتے ہیں۔ میں نے اپنے باورچی کو بلایا اور اُسے نہایت اعلیٰ درجہ کا مغلئی کھانا تیار کرنے کو کہا۔

دوسری صبح مجھے اس تمام واقعہ کی حقیقت وہم وخیال سے زیادہ نظر نہ آتی تھی۔ میری طبیعت ہلکی ہو چکی تھی۔ میں نے صاحب بہادروں کی سی ٹوپی پہنی اور اپنے کام کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ اُس روز مجھے اپنی سہ ماہی رپورٹ لکھنی تھی اس لئے میرا خیال تھا کہ دیر تک واپس نہ آسکوں گا، لیکن ابھی اندھیرا نہ ہوا تھا کہ میرا دل عجیب وغریب طریقہ سے گھر کی طرف کھنچنے لگا ـــــ مجھے محسوس ہوا کہ وہ سب میرا انتظار کر رہے ہیں اور اب مجھے زیادہ دیر نہیں کرنی چاہئے۔ رپورٹ کو ختم کئے بغیر میں اُٹھ کھڑا ہوا، ٹوپی پہنی اور تاریک، سایہ دار سنسان راہ کے سکوت میں اپنی گاڑی کی گڑگڑاہٹ سے رخنہ اندازی کرتا ہوا اُس وسیع اور خاموش محل میں پہنچ گیا جو پہاڑیوں کی تاریک فضا میں تنہا کھڑا تھا۔

پہلی منزل میں ایک نہایت فراخ کمرہ تھا اُس کی چھت خوشنما محرابوں کے اوپر موٹے موٹے ستونوں کی تین قطاروں پر پھیلتی چلی گئی تھی، اور دن رات شدید تنہائی کے بوجھ تلے دب کر کراہتی رہتی تھی۔ دن ابھی ابھی ختم ہوا تھا اور چراغ ابھی روشن نہیں کئے گئے تھے۔ جب میں نے دروازے کو دھکا دے کر کھولا تو ایسا معلوم ہوا کہ اندر بڑی ہل چل سی پڑ گئی ہے، اور انسانوں کا ایک بہت بڑا مجمع درہم برہم ہو رہا ہے اور وہ سب کے سب دروازوں سے، کھڑکیوں سے، برآمدوں سے اور کمروں سے بسرعت تمام نکل بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

چونکہ مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا میں حیران پریشان کھڑا رہا۔ ایک قسم کی پُرکیف مسرت میں میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے اور عطر کی ہلکی ہلکی خوشبو جسے استدادِ زمانہ نے نابود کر کے برابر کر دیا تھا میرے دماغ میں سما رہی تھی۔ اس وسیع اور خالی ایوان کی تاریکی میں ان قدیم ستونوں کی قطاروں کے درمیان کھڑے ہو کر فواروں کے نغموں کو، سنگِ مرمر کے فرش پر اُن کے گرنے کو، بربط کے ایک عجیب سُر کو، زیوروں کی کھن کھن کو اور پایلوں کی آواز کو، گھڑیال کی منادی کو، ہوا سے ہلتے ہوئے جھاڑوں کے بلوروں کی ٹن ٹن کو، پنجروں میں بند بلبلوں کے ترانوں کو اور باغ میں سارس کے نالوں کو میں سن رہا تھا اور یہ سب میرے آس پاس ایک عجیب غیر ارضی موسیقی پیدا کر رہے تھے۔ پھر مجھ پر ایسا جادو ہو گیا کہ یہ غیر محسوس، غیر مرئی اور غیر ارضی نظارہ مجھے دنیا کی تنہا حقیقت معلوم ہونے لگا اور باقی ہر چیز ایک خواب نظر آنے لگی۔ میں یعنی سری جت اور فلاں ابنِ فلاں جو کپاس کے محصول کے محصّل کی حیثیت سے چار سو پچاس روپے ماہوار تنخواہ پاتا تھا اور اپنی ٹمٹم میں بیٹھ کر چھوٹا کوٹ اور انگریزی ٹوپی پہن کر ہر روز دفتر جاتا تھا اپنے آپ کو اس قدر حیرت انگیز طور پر مضحکہ خیز سراب سمجھنے لگا کہ اس وسیع خاموش ایوان کی تاریکی میں کھڑے کھڑے بے اختیار ہنس پڑا۔

اسی وقت میرا ملازم ہاتھ میں ایک جلتا ہوا لمپ لے کر اندر داخل ہوا۔ میں نہیں جانتا کہ اُس نے مجھے دیوانہ سمجھا یا کیا، لیکن اُس کی آمد سے مجھ پر یہ پھر نمایاں ہو گیا کہ میں سری جت فلاں ابن فلاں ہوں اور یہ جو ہمارے چھوٹے بڑے شاعر کہا کرتے ہیں کہ اس دنیا میں یا اس دنیا سے باہر ایک سرزمین ایسی بھی ہے جہاں نادیدہ چشمے اُبل کر اور سریلے بربط کے تار غیر مرئی انگلیوں سے مس ہو کر سرمدی نغمے پیدا کرتے ہیں بہرحال یقینی ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ میں بیرج کی روئی کا محصول جمع کر کے چار سو پچاس روپے ماہوار تنخواہ پاتا ہوں۔ وفورِ مسرت میں اپنے ان نادر اور عجیب تصورات پر ہنستے ہوئے میں اپنی میز پر بیٹھ گیا اور اخبار پڑھنے لگا۔

جب میں اخبار ختم کر چکا اور اپنا مغلئی کھانا کھا چکا تو میں نے چراغ گل کر دیا اور ایک بغلی کمرے میں اپنے

بستر پر جا لیٹا۔ کھلی ہوئی کھڑکی میں سے پہاڑیوں کے اوپر اور اُن کے جنگلوں کی تاریکی میں محیط ایک چمکتا ہوا ستارہ آسمان کی کروڑوں میل کی دوری سے مسٹر کلکٹر کو ایک غریبانہ بستر میں غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں متحیر تھا اور اس خیال سے خوش تھا۔ اور میں نہیں جانتا کہ کب مجھے نیند آئی اور کتنی دیر میں سوتا رہا، لیکن یکایک میں چونک کر اٹھا، گو کوئی آواز میرے کان میں نہ آئی اور کسی خلل انداز کو میں نے نہ دیکھا ــــ صرف پہاڑی کی چوٹی پر چمکنے والا وہ روشن ستارہ غروب ہو چکا تھا، اور چاند کی دھیمی روشنی کھلی ہوئی کھڑکی میں سے چپکے چپکے اندر داخل ہو رہی تھی جیسے وہ اس مداخلت سے محجوب ہو رہی ہو۔

مجھے کوئی نظر نہ آیا مگر میں نے یوں محسوس کیا جیسے کوئی مجھے آہستہ آہستہ بلا رہا ہے۔ جب میں جاگا تو اُس نے ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا، بلکہ انگوٹھیوں سے چمکتی ہوئی پانچ انگلیوں کے اشارہ سے مجھے باحتیاط پیچھے آنے کو کہا۔ میں دبے پاؤں اُٹھا اور گو میرے سوا کوئی ایک متنفس بھی اس خوابیدہ آرزوؤں اور بیدار صداؤں والے سنسان محل کے بے شمار ایوانوں میں موجود نہ تھا تاہم میں ہر ہر قدم پر ڈرتا تھا کہ کوئی جاگ نہ اُٹھے۔ محل کے اکثر کمرے ہمیشہ بند رہتے تھے اور میں ان میں کبھی داخل نہ ہوا تھا۔

میں دم بند کئے، پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے اس غیر مرئی رہنما کے پیچھے چلا جا رہا تھا ــــ میں اب نہیں بتا سکتا کہ کہاں۔ کتنے لمبے تھے وہ تاریک اور تنگ راستے، کتنی طویل تھیں وہ غلام گردشیں اور کیسے خاموش اور پُر رعب تھے وہ مجلسی ایوان اور خاص کمرے جن میں سے میں گزرا۔

گو میں اپنی حسین پیش رو کو دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن اُس کی شکل میرے دل کی آنکھوں سے پوشیدہ نہ تھی ــــ وہ ایک عرب لڑکی تھی، جس کی مرمر جیسی سخت اور ملائم باہیں اس کی ڈھیلی ڈھالی آستینوں میں سے نظر آ رہی تھیں ایک باریک نقاب تھی جو اس کی ٹوپی کے کناروں سے اسکے رخ پر پڑ رہی تھی اور ایک خم دار خنجر تھا جو اُس کی کمر سے لٹکا ہوا تھا۔ میں سمجھا کہ الف لیلہ کی ایک رات رومانی دنیا سے اڑ کر میرے پاس آگئی ہے اور میں آدھی رات کے وقت محوِ خواب بغداد کی تنگ و تاریک گلیوں میں سے گزر کر کسی پُرخطر موعودہ و مقررہ مقام پر جا رہا ہوں۔

آخر وہ حسینہ یکایک ایک گہرے نیلے پردے کے سامنے کھڑی ہو گئی، اور نیچے کسی چیز کی طرف اشارہ کرتی ہوئی معلوم ہوئی۔ وہاں کچھ نہ تھا مگر ایک فوری خوف نے خون کو میرے قلب میں منجمد کر دیا ــــ میں سمجھا کہ میں پردے کے دامن میں زمین پر ایک ہیبت ناک حبشی غلام کو دیکھ رہا ہوں جو زربفت کی ایک قیمتی پوشاک پہنے، اپنی ٹانگیں پھیلائے

بیٹھا ہی بیٹھا اونگھ رہا ہے اور ایک ننگی تلوار اس کی گود میں پڑی ہے۔ وہ حسینہ آہستہ سے اُس کی ٹانگوں کو طے کرکے آگے بڑھی اور پردے کا ایک کنارہ اٹھا کر کھڑی ہوگئی۔ مجھے کمرے کے صرف ایک حصے کی خفیف سی جھلک نظر آئی جہاں ایک ایرانی قالین بچھا تھا ۔۔۔ اندر پلنگ پر کوئی خاتون بیٹھی تھی ۔۔۔ میں اُسے دیکھ نہ سکا، مگر دو نازک اور خوبصورت پاؤں مجھے نظر آئے جن میں دو زرنگار جوتیاں تھیں اور جو زعفرانی رنگ کے پائنچوں میں سے نمایاں ہوتے ہوئے عجب بے پروایانہ انداز سے نارنجی رنگ کے مخملی قالین پر پڑے تھے۔ ایک طرف ایک ہلکے نیلے رنگ کا بلوریں تاش تھا جس میں چند سیب ناشپاتیاں سنگترے اور بہت سی انگوروں کے گچھے، دو چھوٹے پیالے اور ایک سنہری رنگ کی صراحی یہ سب چیزیں کسی مہمان کا انتظار کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ کمرے میں ایک ایسی کیف آور خوشبو جل رہی تھی جس نے میرے حواس کو مدہوش کر دیا۔

جونہی کہ کانپتے ہوئے دل کے ساتھ میں نے غلام کی پھیلی ہوئی ٹانگوں کو پھلانگنا چاہا وہ چونک کر اٹھا اور تلوار اُس کی گود سے ایک تیز جھنکار کے ساتھ سنگِ مرمر کے فرش پر گر پڑی۔

ایک چیخ سنائی دی اور میں اچھل پڑا، اور میں نے دیکھا کہ میں اپنے بستر پر بیٹھا ہوں اور میرے جسم سے پسینے کے فوارے چھوٹ رہے ہیں، اور چاند کا چہرہ ایک تھکے ہوئے شب بیدار مریض کے چہرے کی طرح صبح کی روشنی میں زرد نظر آرہا ہے، اور ہمارا سودائی کریم خاں سنسان سڑک پر سے گزرتے گزرتے اپنے روزمرہ کے قاعدے کے مطابق پکار پکار کر کہہ رہا ہے "خبردار! خبردار!!"

یوں اچانک میری الف لیلہ کی ایک رات ختم ہوئی، لیکن ابھی ایسی ہزار راتیں باقی تھیں۔

اس کے بعد میرے دنوں اور راتوں کے درمیان کوئی مناسبت نہ رہی۔ دن کو میں افسردہ و مضمحل اپنے کام پر جاتا اور سحر کن رات اور خالی خولی خوابوں کو صلواتیں سناتا رہتا، لیکن جب رات آتی تو مجھے اپنی پابندیوں اور ذمہ داریوں سے بھری ہوئی زندگی ایک حقیر، بے اصل، مضحکہ خیز دھوکا معلوم ہوتی۔

رات کی تاریکی چھا جانے کے بعد مجھ پر ایک نشہ کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اُس وقت میری ہستی گزرے ہوئے زمانے کی کسی نامعلوم شخصیت میں تبدیل ہو جاتی جس کے کارنامے بن لکھی تاریخ کے صفحات میں منضبط ہو رہے ہوں، اور چھوٹا انگریزی کوٹ اور چست برجس مجھے اپنے لئے قطعاً ناموزوں معلوم ہوتے۔ سر پر ایک مخملی ٹوپی، ڈھیلا پاجامہ، ایک کامدار واسکٹ، ایک لمبا لہراتا ہوا چغہ اور عطر میں بسے ہوئے رنگین رومال میری پرتکلف پوشاک کی تکمیل کرتے، سگریٹ کی بجائے میرے سامنے گلاب سے بھرا ہوا ایک پیچ دار حقہ ہوتا اور میں ایک نرم

گدیلوں والی عمدہ چوکی پر یوں بیٹھ جاتا جیسے کوئی اپنے محبوب کی ملاقات کے شدید انتظار میں ہو۔
میں اُن حیرت انگیز واقعات کے بیان کی اپنے اندر طاقت نہیں پاتا جو رات کی تاریکی کے بڑھنے کے ساتھ ہی اپنے آپ کو منکشف کرنے لگتے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے اس وسیع محل کے عجیب و غریب کمروں میں ایک خوبصورت کہانی کے اجزا بادِ بہاری کے ایک ناگہانی جھونکے سے اڑنے لگے ہیں۔ یہ ایک ایسی کہانی تھی جس کا ایک حد تک تو میں مطالعہ کر لیتا لیکن جس کا انجام مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکتا۔ تاہم میں تمام تمام رات ان اجزا کے تعاقب میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پھرتا رہتا۔
ان خوابناک اجزا کے بھنور میں، حنا کی خوشبو اور بربط کے نغموں میں فواروں کی مہکتی ہوئی پھوار سے لدی ہوئی ہوا میں برق کی چمک کی طرح مجھے ایک نازنین کی جھلک دکھائی دے جاتی۔ یہ وہی تھی جس کا پاجامہ زعفرانی رنگ کا تھا جس کے سرخ و سپید نرم پیروں میں خمدار نوک والی زرنگار جوتی تھی جس نے ایک چست سونے کے کام والی انگیا اور ایک سرخ ٹوپی پہن رکھی تھی جس کے سنہری تار اُس کی روشن پیشانی اور گورے گالوں پر پڑتے تھے اُس نے مجھے دیوانہ بنا دیا تھا۔ اُس کی تلاش میں میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتا تھا اور دنیائے خواب کی مسحور سرزمین میں پیچ در پیچ گلیوں کی بھول بھلیاں کو جادہ بہ جادہ طے کرتا پھرتا تھا۔
بعض دفعہ شام کے وقت جب میں اُس بڑے آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر جس کے دونوں جانب دو مومی شمعیں جل رہی ہوتیں اپنے آپ کو بڑے انہماک کے ساتھ ایک شاہزادے کے سے لباس میں آراستہ کر رہا ہوتا مجھے ناگہاں اپنے پہلو پر اس فسوں ساز ایرانی حسن کا عکس نظر آجاتا۔ اُس کا تیزی سے پلٹنا، اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں درد اور محبت سے چھلکتی ہوئی ایک مضطرب نگاہ، اُس کے سرخ ہونٹوں پر بول اُٹھنے کی سی کیفیت، اُس کا خوبصورت اور نازک شباب پرور قد و قامت جیسے ایک پھولوں سے بھری ہوئی بیل پُرکیف انداز میں بلند ہوتی چلی گئی ہو، ارمان، آرزو اور امنگ کی ایک خیرہ کن جھلک، ایک تبسّم، ایک نگاہ اور اس کے جواہرات اور لباس کی ایک بھڑک پیدا ہوتی اور پھر نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔ پہاڑیوں اور جنگلوں کی تمام خوشبو سے لدا ہوا ہوا کا ایک وحشی جھونکا آکر میری روشنی کو گل کر جاتا اور میں اپنی پوشاک کو ایک طرف پھینک کر اپنے بستر پر لیٹ جاتا۔ میری آنکھیں بند ہوتیں اور میرا جسم نشاط سے کانپ رہا ہوتا ــــ میرے آس پاس ہوا میں جنگلوں اور پہاڑیوں کی خوشبو کے درمیان خاموش تاریکی میں بہت سی ہم آغوشیاں اور بہت سے بوسے اور نرم نرم ہاتھوں کے بہت سے مس تیرتے تھے۔ میں ہلکی ہلکی سرگوشیوں کو سنتا تھا اور کسی کی معطر سانسیں اپنی پیشانی پر محسوس کرتا تھا یا بھینی بھینی

خوشبو میں بسا ہوا رومال بار بار میرے رخساروں پر ہلایا جاتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ایک پُر اسرار ناگن اپنے ہوش ربا پیچوں سے مجھے جکڑنے لگتی، اور میں ایک بوجھل آہ بھر کر بے خبری کے عالم میں کھو جاتا اور پھر مجھ پر گہری نیند طاری ہو جاتی۔

ایک شام میں نے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر باہر جانے کا ارادہ کیا ـــــ میں نہیں جانتا کہ کون بہ اصرار رہ جانے کی مجھ سے التجائیں کر رہا تھا ـــــ مگر اُس دن میں نے کسی التجا کو نہ سنا۔ میری انگریزی ٹوپی اور کوٹ ایک کھونٹی پر لٹک رہے تھے۔ میں ان کو وہاں سے اتارنے ہی کو تھا کہ یکایک ندی کی ریت اور پہاڑی کے خشک پتوں کا ایک بگولا سا اٹھ کر اُن پر جھپٹا اور اپنے چکر میں ان کو لے کر گھمانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی کسی کے پُرمسرت قہقہوں کی آواز لمحہ بہ لمحہ بڑھنے لگی جس نے سازِ طرب کے ایک ایک تار کو چھیڑ ڈالا، یہاں تک کہ آخر کار وہ غروب آفتاب کی سرزمین میں گم ہو گیا۔

میں سواری کے لئے باہر نہ جا سکا، اور دوسرے دن میں نے انگریزی کوٹ اور ٹوپی ہمیشہ کے لئے چھوڑ دی۔

اُس دن آدھی رات کے وقت پھر میں نے کسی کی دل خراش سسکیاں سنیں ـــــ جیسے بستر کے نیچے، اس رفیع الشان محل کی سنگین بنیادوں کے نیچے کسی مرطوب اور تاریک قبر میں ایک آواز، مسترحمانہ میری منتیں کر رہی ہے: "آہ، مجھے چھڑا لو! اس شدید فریب، اس موت نما نیند، ان بے ثمر خوابوں کے دروازے توڑ کر میرے پاس آؤ، گھوڑے پر سوار ہو کر مجھے اپنے پہلو میں بٹھا لو، مجھے اپنے سینے سے لگا لو اور پہاڑیوں جنگلوں اور دریا میں سے ہوتے ہوئے مجھے اپنے روشن کمروں کی گرم فضا میں لے آؤ!"

میں کون ہوں؟ آہ میں تجھے کیونکر چھڑا سکتا ہوں؟ اے غارت گر حسن اور اے سراپا عشق تو کون ہے جسے میں خواب کے وحشی بھنور میں سے نکال کر ساحل پر لاؤں؟ اے دل کو موہ لینے والی اثیری پری! تو نے کہاں نشو و نما پائی؟ کس ٹھنڈے چشمے کے کنارے کس نخلستان کے سائے میں تو پیدا ہوئی ـــــ کس بے خانماں بادیہ گرد ماں کی گود کو تو نے زینت دی؟ وہ بدوی کون تھا جس نے تجھے تیری ماں کی آغوش سے جدا کیا، ایک کھلتی ہوئی کلی کو ایک صحرائی بیل سے توڑ لیا، تجھے ایک برق رفتار گھوڑے پر رکھ کر جلتی ہوئی ریت کو طے کرتا ہوا وہ تجھے کس شاہی شہر میں لایا؟ اور وہاں، بادشاہ کے کس اہلکار نے تیری اٹھتی ہوئی پر حیا جوانی کی شان و شوکت کو دیکھ کر سونے کے بدلے تجھے خرید لیا، ایک زریں پالکی میں تجھے بٹھایا اور اپنے آقا کے محل کی زینت کے لئے تجھے

تحفۃً پیش کر دیا؟ اور آہ، اے اس محل کی سرگزشت! آہ وہ سارنگ کی موسیقی، پایلوں کی جھنکار، خنجروں کی چمک اور شیرازی شراب کی تندی اور تیزی! آہ وہ بے پایاں جاہ و جلال اور وہ بے حساب اطاعت و خدمت! تیرے دائیں بائیں کنیزیں چمپر ہلاتی تھیں تو اُن کے سینوں پر ہیرے چمکتے تھے، بادشاہ وہ حاکموں کا حاکم دست بستہ تیرے برف جیسے سفید پاؤں میں بیٹھتا تھا، اور باہر وہ خطرناک حبشی غلام جس کی شکل موت کے قاصد کی طرح اور جس کا لباس ایک فرشتے جیسا ہوتا تھا ہاتھ میں ایک برہنہ تلوار لئے کھڑا رہتا تھا! پھر اے وہ صحرا کے پھول جسے عظمت و شوکت کا وہ تابان و درخشاں خون آلود سمندر بہا کر لے گیا جس میں رشک اور حسد کا کف اور فریب و سازش کی چٹانیں اور ٹیلے ہیں مجھے بتا کہ تجھے اُس نے ظالم موت کے کس ساحل پر جا ڈالا، یا کس غدار تر اور ظالم تر سرزمین پر جا پھینکا؟

یکایک اس وقت وہی مجنون مہر علی پکارا "خبردار! خبردار!! سب مایا ہے! سب مایا ہے!!" میں نے آنکھیں کھولیں اور دیکھا کہ صبح کی روشنی نمودار ہو چکی تھی۔ میرا چپڑاسی آیا اور اُس نے مجھے کچھ خطوط دیئے اور رخانا سلام کر کے میرے احکام کا انتظار کرنے لگا۔

میں نے کہا "سنو میں اب یہاں نہیں رہوں گا۔" اسی دن میں نے اپنا اسباب باندھا اور دفتر میں منتقل ہو گیا۔ بوڑھا کریم خاں مجھے دیکھ کر ذرا مسکرایا۔ اُس کی مسکراہٹ مجھے کانٹے کی طرح چبھ گئی مگر میں نے کچھ نہ کہا اور اپنے کام میں لگ گیا۔

جب شام ہوئی تو میرا دل اُڑنے لگا، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے اپنا کوئی وعدہ پورا کرنا ہے، اور حساب کی پڑتال کا کام مجھے بالکل بے فائدہ معلوم ہونے لگا، یہاں تک کہ نظام کی نظامت بھی مجھے ہیچ نظر آنے لگی۔ جس چیز کو بھی حال کے ساتھ تعلق تھا جو چیز بھی روٹی کے لئے حرکت کر رہی تھی یا سرگرمِ عمل تھی مجھے بے حقیقت بے معنی اور حقیر دکھائی دینے لگی۔

میں نے اپنا قلم رکھ دیا، کھاتے بند کر دیئے، اپنی گاڑی میں بیٹھا اور روانہ ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ گاڑی غروبِ آفتاب کے وقت خود بخود محل کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔ میں جلد جلد زینے کو عبور کر کے کمرے میں داخل ہوا۔

محل میں شدید خاموشی محیط تھی۔ تاریک کمرے رنجیدہ نظر آتے تھے جیسے وہ ناراض ہو گئے ہوں میرا دل پشیمانی سے لبریز ہو گیا مگر وہاں کوئی نہ تھا جس کے سامنے میں اسے کھول کر رکھ سکوں یا جس سے میں معافی مانگ

سکوں۔ میں ان تاریک کمروں کے پاس بے فکر ہو کر پھرتا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ میرے پاس ایک بربط ہو اور میں اُس پر اُس نامعلوم کے لئے گاؤں کہ "اے آگ، غریب پروانہ جس نے اُڑ بھاگنے کی بے کار کوشش کی تھی تیرے پاس پھر واپس آ گیا ہے! بس اس دفعہ اسے معاف کر دے، اس کے پروں کو جلا اور اسے اپنے شعلے میں بھسم کر ڈال!"

یکایک اوپر سے آنسوؤں کے دو قطرے میری پیشانی پر گرے۔ اس دن پہاڑیوں کی چوٹیوں پر سیاہ بادلوں کے دَل چھا رہے تھے۔ تاریک جنگل اور ندی کا تاریک پانی ہولناک امید و بیم میں ساکن پڑا تھا۔ یکایک زمین پانی اور آسمان کانپ گیا، اور ایک تیز و تند طوفانی جھونکا دور بے راہ جنگلوں میں سے شور مچاتا ہوا اور اپنے برق پاش دانت نکالتا ہوا لپکا جیسے کوئی دیوانہ زنجیریں تڑا کر بھاگا ہو۔ محل کے خالی ایوانوں کے دروازے زور زور سے بجنے لگے، اور درد و کرب میں کراہنے لگے۔

نوکر تمام دفتر میں تھے اور وہاں کوئی نہ تھا جو چراغ روشن کرے۔ رات ابر آلود اور بے ماہ تھی محل کی شدید تاریکی میں میں صاف طور پر محسوس کرتا تھا کہ ایک عورت پلنگ کے نیچے قالین پر منہ کے بل لیٹی ہے اور اپنے کھلے ہوئے لمبے بالوں کو نوچ رہی ہے۔ اُس کی خوبصورت پیشانی سے خون بہ رہا تھا۔ کبھی وہ ایک ناگوار کرخت اور ناشاد ہنسی ہنستی اور کبھی روتے روتے اُس کی ہچکی بندھ جاتی اور کبھی وہ اپنا گریباں چاک کر کے اپنی چھاتی پیٹتی۔ کھلی ہوئی کھڑکی میں سے ہوا چیخ چیخ کر داخل ہوتی اور مینہ کے دھارے اندر آ آ کر اُسے تر بہ تر کر جاتے۔

تمام رات نہ طوفان تھما اور نہ اُس کی دل گداز گریہ وزاری ختم ہوئی۔ میں بھی اندھیرے ہی میں اپنے بے حاصل غم کو لئے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پھرتا رہا۔ میں کس کی ڈھارس بندھاتا جب مجھے کوئی نظر ہی نہ آتا تھا؟ یہ کس کے غم و اندوہ کا کرب و اضطراب تھا؟ یہ تسکین ناپذیر غم و الم کہاں سے امنڈ رہا تھا؟ اتنے میں اُس دیوانے نے آوازہ لگایا: خبردار! خبردار!! سب مایا ہے! سب مایا ہے!!

میں نے دیکھا کہ صبح ہو چکی ہے، اور اس خوفناک موسم میں بھی مہر علی محل کے اردگرد چکر کاٹ رہا ہے اور اپنی مقررہ صدا لگا رہا ہے۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ شاید وہ بھی کبھی اس محل میں رہا ہے، اور اگرچہ وہ اب دیوانہ ہو چکا ہے تاہم وہ اس مرمر کے دیو کے جادو سے مسحور ہو کر یہاں آتا ہے اور اس کا طواف کرتا ہے۔

طوفان اور بارش کے باوجود میں اُس کے پاس پہنچا اور میں نے کہا: او مہر علی، کیا مایا ہے؟"

اُس نے کچھ جواب نہ دیا بلکہ مجھے ایک طرف ہٹا کر اپنے طواف میں مصروف رہا اور وہی مجنونانہ آوازہ لگاتا گیا۔ جیسے کوئی مسحور پرندہ کسی سانپ کے منہ پر منڈلا رہا ہو، اور یہ کہہ کہہ کر اپنے آپ کو ہوشیار کرنے کی پوری

کوشش کر رہا ہو: خبردار! خبردار! سب مایا ہے! سب مایا ہے!!"

اس بے پناہ بارش میں ایک سودائی کی طرح بھاگتا ہوا میں دفتر پہنچ گیا۔ اور میں نے کریم خاں سے کہا "مجھے بتاؤ یہ کیا ماجرا ہے؟"

جو کچھ مجھے اُس نے بتایا اُس کا ماحصل یہ ہے کہ ایک وقت تھا جب بے حساب ناشاد ارمانوں ناکام آرزوؤں اور عیش و عشرت کی مسرتوں کے گسستہ عنان شعلے اس محل میں بھڑکتے تھے، اور دل کی ٹیسوں اور امید کی شکستوں کی نحوست نے اس کے ایک ایک ذرے کو ایک بھوکی ڈائن کی طرح بنا رکھا تھا، اور اگر اتفاقاً یہاں کوئی شخص آجاتا تو یہاں کا کونہ کونہ اُسے پھاڑ کھانے کے لئے مضطرب ہو جاتا جس نے بھی یہاں مسلسل تین راتیں بسر کیں وہ ضرور اس کے خونخوار چنگل کا شکار ہو گیا، لیکن مہر علی اپنی عقل و دانش کے بل پر یہاں سے بچ نکلا۔

میں نے پوچھا "کیا میری رہائی کی کوئی تدبیر ہوسکتی ہے؟" بوڑھے کریم خان نے کہا صرف ایک تدبیر ہے اور وہ بہت مشکل ہے۔ میں یہ تمہیں بتادوں گا مگر پہلے تم ایک ایرانی دوشیزہ کی سرگذشت سن لو جو کبھی اس عشرت گاہ میں رہتی تھی۔ اس سے زیادہ عجیب اور اس سے زیادہ دل گداز واقعہ دنیا کی آنکھ نے کبھی نہ دیکھا ہوگا"

اتنے میں قلیوں نے شور مچایا کہ گاڑی آگئی۔ ہم نے جلد جلد اپنا اسباب باندھا، گاڑی اسٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔ ایک انگریز جو بظاہر ابھی ابھی بیدار ہوا تھا اسٹیشن کا نام پڑھنے کی کوشش میں ایک اول درجہ کی گاڑی سے باہر جھانک رہا تھا۔ جونہی اس کی نظر ہمارے ہمراہی پر پڑی وہ بولا "ہیلو" اور اس نے اسے اپنے کمرے میں بٹھا لیا۔ چونکہ ہم دوم درجہ کی گاڑی میں بیٹھے اس لئے ہمیں یہ معلوم کرنے کا موقع نہ ملا کہ وہ کون تھا اور اُس کی کہانی کا انجام کیا تھا۔

میں نے کہا "اُس نے ہمیں بے وقوف سمجھ کر ہم سے خوب مذاق کیا ہے۔ کہانی شروع سے آخر تک محض گھڑت تھی"۔ اس پر جو بحث ہوئی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مجھ میں اور میرے صوفی عزیز میں عمر بھر کشیدگی رہی۔

ٹیگور　　　　منصور احمد

سعیِ حیات

پروا نہیں خوشی کی کہ غم مجھ کو راس ہے
دُنیا اگر ہے دُور خدا میرے پاس ہے

بے اعتنائیوں کا محبّت میں ذکر کیا
سعیِ حیات ہو تو [illegible] کی فکر کیا

چل دے جو چل دیا ہے کوئی منہ کو موڑ کر
چل دیں گے ہم بھی عیش کی دُنیا کو چھوڑ کر

اپنے ہی ہم خیال کی دنیا بسائیں گے
اپنے ہی قیل و قال کی دنیا بسائیں گے

رنگینیٔ جمال کی دنیا بسائیں گے
گلچینیٔ کمال کی دنیا بسائیں گے

تدبیر کی سوال کی دنیا بسائیں گے
سب کچھ بُھلا کے حال کی دنیا بسائیں گے

دنیا میں ہم بسائیں گے دنیا اک اَور ہی
سارے جہاں سے جس کا نرالا ہو طور ہی

راحت ہو اپنے واسطے اَوروں کا جور ہی
یوں زندگی کٹے کہ رہیں محوِ غور ہی

دیکھیں سبھی کچھ آنکھ سے منہ سے نہ کچھ کہیں
خالق بھی مرحبا کہے دنیا میں یوں رہیں

ل ب

جب ہوائیں چلنا بند ہو جائیں تو سمندر ساکن ہو جاتا ہے یہی حالت ہماری ہے !

جب خواہشات کے تند و تیز جھونکے گزر جاتے ہیں تو ہمارے بحرِ زندگی پر بھی سکون طاری ہو جاتا ہے !

پہلے پہل ہم اپنی چیزوں کا ذکر کس قدر فخریہ لہجہ میں کرتے تھے، وہ چیزیں جن کی تقدیر فنا تھی + اب ہمیں معلوم ہوا کہ کس قدر جاہلانہ تھیں ہماری لن ترانیاں !

عہدِ شباب میں ہم ان چیزوں پر اس قدر فریفتہ ہو جاتے ہیں کہ ان کی حقیقت سے اندھے ہو جاتے ہیں — اُس حقیقت سے جس کو زمانہ کی آنکھیں بغور دیکھ رہی ہیں۔

جس طرح مکین اپنے مکان کے کونے کونے سے واقف ہوتا ہے یونہی ہماری روح بھی ہمارے جسم کی رگ رگ سے واقف ہے !

آندھیوں کے طوفانوں سے اور وقت کی سختی سے مکان کی دیواریں خستہ ہو جاتی ہیں۔ ان میں جا بجا درزوں کا ظہور ہوتا ہے۔ سورج کی کرنیں ان میں سے مکان کے اندر آتی ہیں اور یہی درزیں وجہ تخلیقِ ضیا بن جاتی ہیں !

جسم کی کمزوری روح کے لئے طاقت ہے !

جوں جوں ہم دنیا سے راہ و ربط زیادہ کئے جاتے ہیں۔ ہماری عقل و دانش بڑھتی چلی جاتی !

جو لوگ **وقت** اور **سرمدیت** میں حائل شدہ حد کو پار کرنے والے ہیں مڑ کر ذرا اُس دنیا کو بھی دیکھ لیں جسے وہ الوداع کہنے کو ہیں اور اُس کو بھی جس میں انہیں داخل ہونا ہے !

(والر) امین

محفلِ ادب

جرمن شاعر رلکے کی دو نظمیں

فقیر کا ترانہ

دروازے دروازے پھرنا، صدائیں دینا، آندھی میں، پانی میں چلچلاتی دھوپ میں، ایکبار گی تھک کر کہیں بیٹھ جانا کسی کونے میں، کسی چوکھٹ پر، اپنا داہنا کان اپنے داہنے ہاتھ پر رکھ لینا، اور چلّانا ــــ چلّانا، چلّانا، چلّانا۔

اور پھر، مجھکو خود اپنی آواز ایک غیر کی سی آواز لگتی ہے، پھر مجھ کو نہیں معلوم ہوتا کہ یا الٰہی یہ کون حلق پھاڑ پھاڑ کر چلّاتا ہے؟ میں یا کوئی اور؟

میں چلّاتا ہوں تو ایک ذرا سی چیز کے لئے، لیکن شاعر؟ ایک جلوۂ عالمِ خیال کی خاطر! اور آخر کار میں اپنا چہرہ اپنی دونوں آنکھوں سے ڈھانپ لیتا ہوں اور اپنے سر کا سارا بوجھ دونوں ہاتھوں پر ٹیک دیتا ہوں جس میں اس کی صورت ایسی ہوتی ہے جیسے آرام کی۔

ہاں! یہ نہ سمجھیں راہ گزرنے والے، کہ مجھ آفت نصیب کے سر کو تکیہ تک نصیب نہ تھا۔

فریاد

کیسی ہر چیز دُور اور بے بو سی ہے، اور مدت کی گزری ہوئی سی ــــ

شاید وہ ستارہ جس پر میرے کسبِ نور کا انحصار ہے ہزارہا سال ہوئے مر چکا ہے ــــ

شاید اس کشتی میں جو ابھی ادھر سے گزری کسی نے کسی سے کان میں ڈر کر کچھ بات کہی ــــ

گھر میں ایک گھڑی ٹن ٹن بجی ...... کس گھر میں؟

الٰہی توبہ! جی چاہتا ہے کہ دل کے اندر سے نکل کر کہیں بھاگ جاتا، فضائے آسمان میں قرار لیتا ــــ جی چاہتا ہے کہ سجدے کرتا ــــ

اور ان ستاروں میں سے ایک شاید اب تک برقرار ہو،

جی کہتا ہے کہ مجھے معلوم ہے (ان میں سے) کون، یکہ و تنہا، ہنوز آشنائے حیات ہے، کون ایک شہر نور کی طرح شعاعوں کی منزل پر آسمانوں میں روشن ہے۔

"جامعہ"

روح کے پر

ننھی صغرا چوزوں کو دانہ ڈال رہی تھی۔ اتنے میں ایک چڑیا اڑتی ہوئی چوزوں میں آ بیٹھی اور بڑی دیر تک وہیں بیٹھی رہی۔

صغرا بولی۔ "اے ہے، کیا چھوٹی سی چڑیا ہے یہ یہاں سے چلی کیوں نہیں جاتی۔

اتنے میں چوزوں کی ماں بی مرغی مٹکتی ہوئی ادھر آ نکلی۔ اور چڑیا کو ٹھونگ مار کر بولی "جاؤ جی، کیا باوا کا مکان ہے"؟

اتنے میں گھر کی بلی نے اسے دور سے بھانپا۔ اور بی مرغی سے یہ کہتی ہوئی کہ "آپا تم چپکی ہو رہو مہمان آئے تو اس کی خاطر تواضع کرنی لازم ہے" اس کی طرف لپکی۔

بیچاری چڑیا تھر تھر کانپنے لگی۔ اسے بلی کی آنکھوں میں موت نظر آئی۔ ڈر کر طاق میں جا بیٹھی۔

تب ایک بڑا سا ہیبت ناک کتا لنگڑاتا ہوا ادھر آ نکلا۔ اس کے دائیں طرف کے کان پر کھجلی نکلی ہوئی تھی۔ اور کان کے بال جھڑ گئے تھے۔ وہ اپنی لال لال انگارہ سی آنکھوں سے چڑیا کو گھورنے لگا۔ چڑیا دم بخود ہو کر طاق میں بیٹھی رہی۔ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ اللہ میاں مجھے اس بلا سے نکال۔ اور جو نہیں نکالتا تو مجھ پر بجلی ہی گرا دے۔

دن بھر ننھی چڑیا طاق میں بیٹھی کانپتی رہی۔ اور اس کا دل اس زور سے دھک دھک کرتا رہا کہ معلوم ہوتا تھا۔ اب بند ہوا کہ اب بند ہوا۔

رات ہو گئی آسمان پر ستارے جھلملانے لگے۔ لیکن چڑیا ڈر کے مارے اسی طاق میں بیٹھی رہی۔ اسے سخت پیاس بھی لگ رہی تھی۔ کہنے لگی "اے کاش، مجھے پانی کا ایک قطرہ ہی مل جاتا لیکن اگر میں اس طاق سے باہر نکلی تو بلی مجھے نوالہ ہی کر لے گی"۔

تب گھر کا ملازم لڑکا جھمن کڑوے تیل کا چراغ جلا کر اس طاق میں رکھنے آیا۔ چڑیا دبک کر کونے میں بیٹھی رہی۔ اور رات بھر "اے اللہ میں کیا کروں"۔ "اے اللہ میں کیا کروں"۔ اپنے دل ہی میں کہہ کر روتی رہی۔

آخر دوسرا دن نکل آیا۔ کسان کا لڑکا ادھر آ نکلا اور اُسے چڑیا پر بہت ترس آیا۔ بولا "اے ہے، بیچاری چڑیا کا کوئی پر ٹوٹ گیا ہے جو اڑتی نہیں۔ یہاں دبکی بیٹھی ہے۔"

یہ سُن کر چڑیا کی زبان سے خوشی کی ایک چیخ نکل گئی۔ دفعتہً اُسے اپنے پروں کا خیال آگیا۔ اور وہ بے تحاشا آسمان کی طرف اڑتی ہوئی آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اسی طرح ہم بھی کبھی کبھی بھول جایا کرتے ہیں کہ ہماری روح کے بھی پر ہوتے ہیں جو ہمیں غم سے دور اُڑا کر لے جا سکتے ہیں۔

"مخزن"

محبّت

سمندر کو اپنے بے شمار موتیوں پر ناز ہے، آسمان کو اپنے درخشاں ستاروں پر فخر ہے، لیکن میرا دل! میرا دل محبت میں سرشار ہے۔ آسمان اور سمندر اپنی حیثیت میں عظیم ہیں، لیکن میرا دل ان سے عظیم تر ہے۔ گو ستارے اور موتی خوبصورت ہیں، لیکن میرے دل کی پُر نور شعاعیں ان سے کہیں زیادہ حسین ہیں۔

محبت کیا ہے؟ "مشغلۂ بے کاری" دانشمندوں کا یہ ناصحانہ جواب ہے۔ کیا میں بھی اس جواب کی ہم نوائی کروں۔ فطرتِ صحیح کا جواب ہے "نہیں"! اے دانشمندو! احمقانہ وعظ ختم کرو، زمانہ نے تمہارے دلوں کو برف کی طرح شل کر دیا ہے۔ کیا تمہاری نصیحتیں مفید ہو سکتی ہیں؟ فطرت صحیح کا جواب ہے "ہرگز نہیں!!"

میں نے اپنے محبوب کے دل کا دروازہ کھٹکھٹایا، آواز آئی "کون ہے"؟ میں نے جواب دیا "میں ہوں"، لیکن دروازہ بند رہا، میں یاس و غم میں تڑپتا رہا۔ میں نے دوبارہ دروازہ پر دستک دی۔ صدا آئی "کون ہے"؟ میں نے کہا "تو ہے" اور دروازہ کھل گیا۔

"مکتبہ"

میرے بچے کی قبر کہاں ہے

نپولین کی شجاعت پیوندِ خاک ہو چکی تھی لیکن اس کی ماں کی مامتا اس کو ڈھونڈ رہی تھی اور اس کے دل کی تڑپ کہہ رہی تھی کہ اے صحرا کے درختو! بتاؤ کہ میرے بچے کی قبر کہاں ہے۔ اُس نے بلند پہاڑیوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ اس کی فوجوں نے مدتوں تمہارے سینہ کو پامال کیا ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ نپولین کی قبر کہاں ہے۔ میرے بچے کی قبر کہاں ہے؟

زمانہ کا نشیب و فراز دیکھنے والے بلند پہاڑوں نے کہا کہ تو کس نپولین کو پوچھتی ہے۔ نپولین کی ماں نے کہا کہ میں اُس نپولین کو پوچھتی ہوں جس نے دنیا کو شجاعت کا درس دیا ہے جس کی تلوار نے مشرق و مغرب میں ایک کہرام مچا دیا ہے جس نے بڑی بڑی سلطنتوں کی حکومتوں کو پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ کوہستان کے ذرات نے خاک میں اُڑ کر کہا۔ ہم تیری گفتگو کا مطلب نہیں سمجھے۔ نپولین کی ماں نے کہا کہ کیا تم اس نپولین کو نہیں جانتے جس کی تلوار سے دنیا کی زمین کا چپہ چپہ آشنا ہے اور جس کی شجاعت کا جواب دنیا نہیں پیش کر سکتی۔

کوہستانی فضا میں بوڑھی عورت کی اس بات کے جواب میں قہقہہ بلند ہوا اور کسی نے کہا کہ ایسے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں نپولین اس دنیا میں دفن ہیں اور اس سے زیادہ بہادر اور جری جس کی تو تعریف کر رہی ہے ہمارے لئے اس کا پتہ چلانا دشوار ہے لیکن اگر تو یہ چاہتی ہے تو کسی ایسے مکان میں جا کر دعا کر جہاں آج تک کوئی نہ مرا ہو۔ مامتا کی ماری ماں نے ساری دنیا چھان ماری لیکن اسے ایسا کوئی گھر نہ ملا جہاں آج تک کوئی نہ مرا ہو۔ اور زمین کا کوئی حصہ اسے ایسا نہ ملا جہاں کسی کی لاش دفن نہ ہوئی ہو۔ وہ مایوسی سے تھک کر جنگل کے ایک گوشہ میں بیٹھ گئی اور اُس نے کہا کہ نہ جانیں کتنی جانیں اولاد کے غم میں تڑپ رہی ہونگی اور کہہ رہی ہونگی کہ میرے بچے کی قبر کہاں ہے۔ لیکن اس کا سراغ چلنا نپولین کی فتح سے زیادہ دشوار کام ہے، کیونکہ دنیا سر لئے فانی ہے۔

"دین و دنیا"

کبیر کے دوہے

جب تک زندگی ہے حق کی خواہش کرو، علم حاصل کرو، غور کرو کیونکہ زندگی ہی میں نجات کا حصول ممکن ہے۔ اگر زندگی میں قیدیں نہ ٹوٹیں تو موت کے بعد نجات کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ روح محض اس وجہ سے

خالق کے ساتھ مل کر ایک ہو جائے گی کہ وہ جسم سے علیحدہ ہو چکی ہے۔ اگر حق اب نہ ملا تو مرنے کے بعد کب ملے گا اگر تم میں اور ذات باری میں اس وقت اتحاد ہے تو آئندہ زندگی میں بھی اتحاد رہے گا حقیقت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لو سچے رہبر کو پہچانو اور حقیقی نام پر ایمان رکھو۔ کبیر کہتا ہے کہ تلاش ہی مدد دیتی ہے اور میں تو اُس کا غلام ہوں جو جویائے حق ہے۔

اے دوست پھولوں کی کیاری میں نہ جا ہرگز نہ جا۔ خود تیرے جسم میں پھولوں کی کیاری ہو۔ پھول پھل کے لئے لگتا ہے اور جب پھل ظاہر ہوتا ہے تو پھول مرجھا جاتا ہے۔ مشک ہرن کی ناف میں ہوتا ہے لیکن وہ اسے اپنے پاس نہیں تلاش کرتا بلکہ گھاس کی فکر میں اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا ہے۔ کنول کی ہزاروں پنکھڑیوں پر بیٹھ اور وہاں غیر محدود حسن کو دیکھ۔

اے بھائی مجھے بتا کہ دنیا کیونکر چھوڑوں۔ جب میں نے آرائش ترک کر دی تب بھی کپڑے استعمال کرتا رہا جب میں نے لباس ترک کیا تب بھی جسم کو اس کی تہوں میں چھپاتا رہا۔ اسی طرح جب میں جذبات کی قید سے آزاد ہوں تو دیکھتا ہوں کہ غصہ باقی رہتا ہے۔ اور جب غصہ بھی چھوڑ دیتا ہوں تو حرص باقی رہتی ہے۔ دل جب علیحدہ ہو جاتا اور دنیا کو تج دیتا ہے تب بھی اُس کے باطن سے ملا رہتا ہے۔ کبیر کہتا ہے میری بات سُن کر لے پیارے عابد سچا راستہ کم ملتا ہے۔

"نیرنگ"

نیکی کی جانچ

کسی شے کو بغیر جانچ کے اچھا سمجھ لینا گویا خدا پر الزام لگانا ہے نیک آدمیوں کی جانچ ہمیشہ بذریعہ تکالیف اور مصائب ہوا کرتی ہے

اور وہ جو اپنی شہوتوں کو روک سکتا ہے اس کا دامن دوسری بدکاریوں سے پاک ہے عقل وقتاً فوقتاً اِس یا اُس برائی کا مقابلہ کرنے کے بجائے ایک ہی قوت میں پورا حملہ کر کے سب کو پسپا کر دیتی ہے۔

ایسا شخص بدنامی کا کیا خیال کرے گا۔ جو اپنی وقعت کسی کے کہنے سے نہیں بلکہ صرف اس روشن دل کی وجہ سے کرتا ہے جو اس کے سینہ کے اندر ہے۔

"مخزن"

سنکا

مطبوعاتِ جدیدہ

"تاریخ اخلاقِ یورپ جلد اول - یہ ایڈورڈ ہارٹ پول لیکی کی مشہور کتاب "ہسٹری آف یورپین مارلس" کا ملخص اور آزاد اردو ترجمہ ہے جس میں فلسفہ، معاشرت، تمدن، مذہب اور اخلاق کے باہمی تعلقات پر قدیم یورپ کی تاریخ کی روشنی میں بحث کی گئی ہے - لیکی کو حیاتِ اجتماعی کا مصور تسلیم کیا جاتا ہے - اس کتاب میں اس نے بے حد وسعتِ نظر اور تلاش و تفحص سے کام لے کر قدیم یورپ کی اخلاقی زندگی کے جزئیات کا استقصا کر کے نہایت اہم نتائج نکالے ہیں، رومہ کی حیاتِ اخلاقی میں عہد بہ عہد جو تغیرات ہوتے رہے ہیں ان کے اسباب و علل کی بکمال وقتِ نظر تحقیق کی ہے اور ہر عاملِ موثر سے جو جو اثرات پیدا ہوئے ہیں انہیں تفصیل سے دکھایا ہے - حجم چار سو صفحات ہے، اور قیمت تین روپے مقرر کی گئی ہے - کتاب مجلد ہے - انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد (دکن) سے طلب فرمائیے -

اردو کہانیاں - مصنفہ قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم - ۴۲ صفحے کی ایک چھوٹی سی کتاب ہے جس میں سولہ ننھی ننھی کہانیاں ہیں - یوں تو یہ کہانیاں زبان زدِ خاص و عام ہیں لیکن قاضی صاحب نے سید انشا مرحوم کی تقلید میں انہیں "ٹھیٹ ہندوی میں" لکھا ہے - تمام تحریر میں عربی یا فارسی کا ایک لفظ بھی نہیں آیا اس کے باوجود زبان نہایت پُر لطف ہے - قیمت فی جلد ۲ ر، پتہ، قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم مکان مولوی فیض الدین صاحب وکیل، محلہ عابد شاپ، حیدر آباد (دکن)

پتھر سے ہیرا - ایک دلچسپ تبلیغی افسانہ ہے جسے ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی نے لکھا ہے جناب مصنف کا قول ہے کہ یہ ایک یتیم بچے کی سچی سرگزشت ہے جس میں نام تبدیل کر دیئے گئے ہیں والدین کے لئے بچوں کی تربیت کے معاملہ میں یہ کتاب بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے - حجم ۱۱۲ صفحات ہے قیمت درج نہیں - ملنے کا پتہ منیجر "نظام المشائخ" پوسٹ بکس نمبر ۱۵ دہلی -

"رسالہ کیمیکل سوسائٹی" - یہ رسالہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے جاری ہوا ہے اس کے اجرا کی غرض یہ ہے کہ عوام الناس میں علم کیمیا سے دلچسپی پیدا کی جائے - دوسرا نمبر ہمارے سامنے ہے صفحات سو سے زائد ہیں جن میں نصف کے قریب اردو اور نصف انگریزی زبان کے مضامین ہیں - اس کے چند قابلِ ذکر مضامین یہ ہیں - بیماریوں کے جراثیم، دودھ کا کیمیائی امتحان، حقیقتِ مادہ، ہاضمہ اور کیمیائی تعامل - ہمیں امید ہے کہ ناظرین ہمایوں اسے دلچسپی سے پڑھیں گے اور

فہرست مضامین

جلد ۱۶ بابت ماہ ستمبر ۱۹۲۹ع نمبر ۹

تصویر:- چارلس ڈارون

ناکامیاں

زندگی کی ناکامیوں سے مایوس نہ ہو!

وہ زندگی کامیاب نہیں جو نری کامرانی ہو، وہ خوشی خوش نہیں کرسکتی جو درد و الم کی قیمت دے کر حاصل نہ کی گئی ہو! دن کی جلوہ گری رات کی پردہ پوشی سے ہے، پہاڑوں کی چوٹیوں کو وادیوں کی افتادگی بلند کئے ہوتے ہے، حسن زشت نمائی کا پروردہ ہے، دید کا لطف غم فراق کا دست نگر ہے اور زندگی کی فتح اُس کی شکستوں سے ہے۔

وہ عیش و عشرت بے لذت ہے جسے کبھی دنیا کی مصیبتوں سے واسطہ نہیں پڑا، وہ آرام غم انجام ہے جس کا کوئی انجام نظر نہ آئے، وہ سکون روح کی موت ہے جس میں بے تابی آکر اپنا خون نہ دوڑا دے!

وہ جو خدا سے ابدی راحت کے طلب گار ہیں وہ خدا کو ایک فارغ حکمران ایک غرقِ عشرت ہستی تصور کئے ہوئے ہیں وہ ایک ایسی جنت کے تمنائی ہیں جس میں دیکھنے کے لئے آنکھ، سننے کے لئے کان اور کھانے کے لئے منہ تک بھی کھولنا نہ پڑے! جب تک زندگی ہے اس میں برکت حرکت ہی سے ہے کہ کامل سکون روح کے لئے عین موت ہے!

جو کہتے ہیں کہ اس دنیا میں برائی کیوں ہے کمی کیوں ہے رکاوٹ کیوں ہے وہ فی الحقیقت نیکی اور فراوانی اور آزادی کے قدردان نہیں، وہ ان موتیوں کے لئے ان کی پوری قیمت ادا نہیں کرنا چاہتے وہ دوست کے تبسم کے لئے دل میں آرزو کی کسک کو بھی اک مصیبت جانتے ہیں!

جس قدر ایک عطیہ شاندار ہوگا اُسی قدر کٹھن وہ کوششیں ہونگی جو اس کے حصول کے لئے درکار ہیں۔ زندگی کی ناکامیوں سے مایوس نہ ہو کہ وہ محض تمہاری سعی و قوت کی امیدیں سرنگوں ہیں!

باغبان

جہاں نما

دنیا کی قدیم ترین پارلیمنٹ

پچھلے مہینے دنیا کی قدیم ترین پارلیمنٹ کی ہزارویں سالگرہ منائی گئی۔ یہ پارلیمنٹ گزشتہ دس صدیوں سے جزیرۂ آئس لینڈ کے دارالحکومت میں اپنے اجلاس منعقد کرتی اور اپنے مندوبین کے ذریعہ سے امورِ سلطنت انجام دیتی آئی ہے، اور اُن قدیم ایام سے لے کر آج سے چند سال پہلے تک اس کے اجلاس کھلے میدان میں منعقد ہوتے رہے ہیں۔ اس کی ابتدا اُس زمانہ میں ہوئی جب ہیرلڈ فیر ہیر شاہِ ناروے کے مظالم سے تنگ آکر وہاں کے رؤسا کا ایک گروہ ترکِ وطن کرکے آئس لینڈ میں آن بسا تھا۔ ان دنوں سے لے کر آج تک جمہور کے مندوب منتخب ہو کر اس مجلس میں آتے ہیں اور قوانین وضع کرنے کے علاوہ ضروری مقدمات کے فیصلے کرتے اور قومی مسائل پر بحث و تمحیص کرتے ہیں۔

عالمگیر رسم الخط کی عالمگیر تحریک

کچھ دنوں سے ہندوستان میں بھی عالمگیر رسم الخط کی ترویج کا مسئلہ جاذبِ توجہ ہو رہا ہے۔ حال میں ڈاکٹر الما لطیفی، آئی سی ایس، نے یہ عجیب و غریب تجویز پیش کی تھی کہ ہندوستانی زبانوں کے لئے انگریزی یعنی لاطینی رسم الخط استعمال کیا جائے تاکہ اس طرح ملک بھر میں ایک یکسانیت پیدا ہو جائے اور اردو ہندی وغیرہ کے جھگڑے ختم ہو جائیں۔ مزید براں چند وہ نقائص بھی گنائے ہیں جو مروجہ رسومِ خط میں پائے جاتے ہیں۔

اس تجویز کو ہندوستان میں بہت سی وجوہ کی بنا پر ناقابلِ قبول قرار دیا گیا ہے۔ اور اب انگلستان سے بھی یہی آواز بلند ہوئی ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے اپنے نظریہ کی تائید میں ایک علمی مجلس کے سامنے ایک مضمون پڑھا تو اس کے بعد ایک عام مباحثہ منعقد ہوا، جس میں تقریر کرتے ہوئے سر ڈینین راس نے کہا کہ "لاطینی رسم الخط دنیا کے بدترین رسم الخطوں میں سے ہے۔ اس کے برعکس دو رسم الخط اکمل اور بے عیب ہیں، ایک عربی اور دوسرا روسی۔ اگر آپ ہندوستانی زبانوں میں آسانی پیدا کرنی چاہتے ہیں تو رسم الخط کی اصلاح سے شروع کیجئے۔

اس کے بعد مسلمانوں کو چھوڑ کر باقی ہندوستان کے لئے ناگری حروف کا رواج ہونا چاہیئے۔ مسلمانوں کے پاس بہترین رسم الخط موجود ہے۔ لیکن اگر وہ پسند کریں تو وہ دوسری زبان کے طور پر ناگری سیکھ سکتے ہیں تاکہ باقی ہندوستان سے نامہ و پیام کرسکیں، لیکن میں یہ مشورہ ہرگز نہیں دوں گا کہ تمام ہندوستان میں ایک مصنوعی انگریزی رسم الخط کو رواج دیا جائے۔

مسئلۂ حیاتِ نباتات

نباتات کی زندگی کے متعلق سر جے سی بوس نے جو اہم انکشافات کئے ہیں اگرچہ وہ بہت سی ممتاز علمی مجالس کے سامنے ثابت کئے جا چکے ہیں اور اب عام طور پر دنیائے سائنس میں قبول کر لئے گئے ہیں، لیکن کئی دفعہ ان کے خلاف انفرادی طور پر نکتہ چینی کی گئی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں امریکا کے ایک حکیم نے اُن کے خلاف آواز بلند کی ہے۔

ڈاکٹر پرسن رسالہ "سائنٹیفک امیریکن" میں لکھتے ہیں کہ میں نے اپنے دارالتجربہ میں سر جگدیش کے تجربات کو دہرایا لیکن مجھے کامل طور پر ناکامی ہوئی، اور میں اُن نتائج میں سے ایک بھی حاصل نہ کرسکا جن کا ذکر سر بوس نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ میں صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ سر جگدیش کو اپنی زیر عمل نباتات میں حرکت قلب اس لئے محسوس ہوئی کہ وہ خود اسے محسوس کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے سر جگدیش کی تحقیقات کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے تجربے اس تیقن سے شروع کئے کہ ہمیں پودوں کی حرکت نبض کا احساس اور اُن تغیرات کا ادراک ہوگا جو مختلف ادویہ کے داخل کرنے سے اس حرکت میں پیدا ہوتے ہیں، لیکن باوجود انتہائی کوشش اور احتیاط کے ہم اس قسم کی کیفیت محسوس نہیں کرسکے۔ ہم نے بار بار یہ تجارب کئے اور اُن آلات سے بدرجہا ذکی تر آلات استعمال کئے جن کا ذکر سر جگدیش اپنی کتاب میں کرتے ہیں لیکن کچھ بھی معرضِ ظہور میں نہ آیا۔ آخر کار ہم نے فیصلہ کیا کہ اپنی تحقیقات سے پبلک کو آگاہ کر دیا جائے۔

درحقیقت سر جگدیش زندگی کی وحدانیت پر نہایت پختہ اعتقاد رکھتے ہیں؛ اور یہ اعتقاد ہندو فلسفہ کی بنیاد ہے۔ ممکن ہے کہ اسی اعتقاد نے اُن کی علمی تحقیقات پر ضرورت سے زیادہ اثر کیا ہو۔

چائے بنانے کے عجیب وغریب طریقے

روسی طریقے سے چائے بنانے کا اب پھر رواج ہو رہا ہے اور حقیقت میں اس سے زیادہ فرحت دینے والی اور کیا چیز ہو سکتی ہے کہ سادہ اور صاف چائے کی ایک پیالی ہو اور اس میں لیموں کی ایک قاش تیر رہی ہو۔ اس میں شکر حسب پسند ملالی جاتی ہے اور یہ عموماً مصری کی صورت میں پیش کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر سگمنڈ نے اپنے سیاحتِ روس کے حالات بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ کہا کہ میں نے اپنی عمر میں بہترین چائے ایک کاسک کے ہاں سے پی تھی جس نے ایک پتیلی میں پانی اور چائے ڈال کر اسے چولہے پر رکھ دیا اور جب وہ ابلنے لگی تو اس نے کہا کہ چائے تیار ہے اس میں کوئی اور چیز نہیں ملائی گئی مگر اس قسم کی چائے پہلے ہی سے یاسمین یا دوسرے خوشبودار پھولوں میں بسائی جاتی ہے۔

سیامی چائے کا حسا ندہ تیار کر لیتے ہیں اور مصری کی ایک ڈلی منہ میں رکھ کر پینا شروع کر دیتے ہیں۔ مگر چینی جو چائے کے صرف اس سے ذرا زیادہ خوشبودار پر دروں کی مہک حاصل کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں چائے کے چند پتوں پر گرم پانی انڈیل کر جلد ہی پیالیوں میں ڈال لیتے ہیں۔

لیکن تبت کے لوگ عجیب طریقے کی چائے پیتے ہیں۔ وہ پہلے چند گھنٹوں تک چائے کو ایک برتن میں ابالتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اس کا رنگ گہرا سیاہ ہو جاتا ہے اور بعض اوقات تو چائے پانچ پانچ دن تک آگ پر چڑھی رہتی ہے۔ پھر اس میں سے تھوڑا سا سیاہ رس لے کر اس میں تازہ گرم پانی ملاتے ہیں اور شکر کی بجائے اس میں تھوڑا سا سوڈا اور مکھن کی ایک گولی ڈال لیتے ہیں۔ چائے میں ڈالنے کا مکھن عجیب طریقے سے تیار ہوتا ہے اس کو زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ اس میں انتہا درجہ کی بدبو پیدا ہو جاتی ہے۔ جن گڑھوں میں لاما کے لئے مکھن تیار ہوتا ہے اُن میں پچاس پچاس سال کا بلکہ اس سے بھی پرانا مکھن موجود رہتا ہے۔ چنانچہ جس چائے میں یہ مکھن ملایا جاتا ہے اس کی "مہک" صرف تصور میں آسکتی ہے، بیان سے باہر ہے۔

چائے بنانے کے یہ طریقے مغربیوں کو کچھ عجیب سے معلوم ہوتے ہونگے لیکن خود ان کے ہاں اس سے بھی انوکھے طریقے رائج ہیں۔ مثلاً وکٹر ہیوگو نے چائے میں تھوڑی سی رم ڈال لینے کا فیشن نکالا اور لارڈ لٹن ہمیشہ چائے میں ٹھنڈے پانی کی ایک پیالی ملا کر یکدم چڑھا جایا کرتے تھے۔

ہیزلٹ اپنی چائے ہمیشہ نہایت احتیاط سے تیار کیا کرتا تھا۔ پہلے وہ اپنی چائے دانی کو نہایت قیمتی سیاہ چائے سے آدھی کے قریب بھر لیتا تھا پھر اس پر کھولتا ہوا پانی ڈالتا تھا اور فوراً پیالی میں الٹ کر اور بہت سی شکر اور بالائی ڈال کر پی جاتا تھا۔

بہترین ورزش

ڈاکٹر لیسٹر نکس لکھتے ہیں "میرے خیال میں گانا بہترین صحت افزا ورزش ہے۔ باوجود تلاش کے بارہ پندرہ سال کے عرصہ میں میں نے ایک بھی پیشہ ور گانے والا ایسا نہیں دیکھا جس کی صحت عام آدمیوں سے بہت اچھی نہ ہو۔

دوسرے، جو لوگ کم سے کم چھ ماہ تک گانے کی مشق جاری رکھتے ہیں، اُن کی صحت بہت اچھی ہو جاتی ہے۔ میں نے خود بھی اس کا تجربہ کیا ہے اور میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ میری صحت کبھی ایسی اچھی نہیں ہوئی جیسی تین چار ہفتہ کے متواتر گانے سے ہوئی ہے۔

گانے سے طبعی اور نفسیاتی، دونوں قسم کا عمل ہوتا ہے۔ تفریح کو مشقت پر جو فوقیت حاصل ہے وہی گانے کو تمام دوسری ورزشوں پر ہے۔ موسیقی خوشی کی علامت ہے۔ تندرست اور خوش آدمی گاتا ہے سیٹی بجاتا ہے یا کسی اور طرح سے موسیقی پیدا کرتا ہے، اس کلیہ کو مانتے ہوئے کہ دل جسم پر اثر انداز ہوتا ہے کوئی شخص تردید نہیں کر سکتا کہ مسرت صحت کو بڑھاتی ہے۔

ہزاروں آدمی نہایت تن دہی سے تنفس کی ورزش کرتے ہیں لیکن کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔ ان کی ناکامی کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ وہ اسے بے دلی سے انجام دیتے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ اسے بطور تفریح کے نہیں بلکہ بطور ایک پُرمشقت کام کے کرتے ہیں تنفس کے عمل سے گانے والے کے پردۂ شکم کو خاص طور پر قوت حاصل ہوتی اور یہ وہ عضو ہے جس پر صحت کا بیشتر انحصار ہے علاوہ ازیں وہ رغبت سے اسے انجام دیتا ہے۔

چھاتی کا زیادہ سے زیادہ ناپ صحت اور طاقت کی دلیل سمجھا جاتا ہے لیکن یہ فیصلہ ہمیشہ درست نہیں ہوتا کیونکہ ناپ کی زیادتی بیرونی مٹاپے پر بھی منحصر ہے۔ گانے والے مردوں کی چھاتی عام طور پر چالیس انچ ہوتی ہے۔ اور یہ بہترین صحت و قوت پر دلالت کرتی ہے، لیکن دوسری طرف اگر ایک پہلوان کی چھاتی اسی قدر ہو تو اس کا نپ دِق سے مرجانا تعجب خیز نہیں

دونوں میں فرق یہ ہے کہ گانے والے کی چھاتی اندر سے پھیلی ہوئی ہوتی ہے اور اس کے پھیپھڑوں کا پھیلاؤ زیادہ ہوتا ہے اور پہلوان کے ناپ کو اُس کی ٹھیٹھ چھاتی، سینہ اور بغل کے بیرونی اعصاب بڑھائے رکھتے ہیں ان اعصاب کی موجودگی میں پہلوان اپنی چھاتی کو دس سے بیس انچ تک پھلا سکتا ہے لیکن گانے والا صرف چار یا پانچ انچ۔

لیکن پھیپھڑوں کی پوری پوری وسعت اُس زیادہ سے زیادہ ہوا کے حجم سے معلوم ہوتی ہے جو ان میں سماتی ہے۔ سینڈو اپنی چھاتی کو اٹھارہ یا بیس انچ تک اُبھار سکتا تھا لیکن اس کے پھیپھڑوں کی وسعت صرف ۲۶۰ مکعب انچ تھی جو ایک معمولی آدمی سے بڑھ کر نہ تھی۔ میرے پھیپھڑوں کی وسعت ۳۵۰ مکعب انچ ہے اور مجھے یقین ہے کہ بعض گانے والوں کے پھیپھڑوں کی وسعت چار سو مکعب انچ ہو گی۔

مشرقی لٹریچر مغرب میں کیونکر پہنچا

(سر ڈینی سن راس کے ایک مضمون کا ترجمہ)

اس امر کا تصور دلچسپی سے خالی نہیں کہ پندرھویں صدی میں یورپ کا ایک تعلیم یافتہ اور خواندہ آدمی ایشیا کی کیا خیالی تصویر قائم کئے ہوئے ہوگا، اور چین و ہند کے متعلق اس کا مبلغ علم کیا ہوگا۔ ایشیائی جغرافیہ کے متعلق تو اس کے نظریے محض تخمیناً درست ہونگے مگر ایشیائی ممالک کے لوگوں کے متعلق اس کی واقفیت سرے سے صفر ہوگی، اُسے ہندومت اور بدھ مت کا کوئی علم نہیں ہوگا اور اُس نے کنفیوشس یا راما ئن کا نام تک نہیں سنا ہوگا، چنانچہ مشرق کے متعلق جو عدم واقفیت یورپ پر مسلّط تھی اُس کی تائید میں واقعۂ ذیل کا ذکر کیا جاسکتا ہے:۔ جب پرتگیز راس امید کا چکر کاٹ کر ۱۴۹۸ء میں سرزمین ہند میں اترے تو اُن کا خیال تھا کہ ہندوستان میں واحد غیر عیسائی مذہب صرف اسلام ہے، چنانچہ اپنے ورود پر وہ ایک ہندو معبد میں داخل ہوگئے، اور اپنے مع الخیر پہنچنے پر خدائے بزرگ کا شکریہ اس خیال کے ماتحت ادا کیا کہ وہ ایک عیسائی گرجا میں ہیں جس کے پادری بظاہر راہِ رشد سے کسی حد تک منحرف ہو چکے ہیں۔ ان لوگوں کی اسلام سے واقفیت بالکل طبعی تھی بالخصوص اس لئے کہ سرزمین سپین سے آخری مور صرف دس سال پیشتر ویس بدر ہوئے تھے۔ مگر مشرق سے وہ کلیتہً ناآشنا تھے۔ اس کے باوجود مشرق اس وقت سے کہیں پیشتر اپنے افسانوں کا انمول تحفہ مغرب کی نذر کر چکا تھا، جو ہندوستان سے دو بڑی بڑی قسطوں میں وارد ہوئے، ایک تو وہ جو لقمان نے سنہ عیسوی سے پیشتر مرتب کئے، اور دوسرے وہ جو تراجم کی وساطت سے، ازمنۂ وسطیٰ میں عربی سے عبرانی، یونانی، اور ہسپانوی زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ مگر ان زبان زد افسانوں کے ہندی الاصل ہونے کا احساس اُس وقت کیا گیا جب کہ لافان ٹین نے ۱۶۷۸ء کے ایڈیشن میں اس امر کی وضاحت کی کہ اس کی جدید نظموں کی اکثریت بیدپائے ہندی افسانوں پر مبنی ہے۔

تاہم جب ہم مغربی لٹریچر پر مشرق کے تشقیقی اثرات کا ذکر کرتے ہیں تو کوئی دوسری ایسی خصوصیت نہیں پائی جاتی جو یہودی کتب مقدسہ کے اثرات کے مقابلہ پر آسکے، جو زبان و معانی میں بالکل مشرقی ہیں۔ یورپ میں بائیبل سب چیزوں سے بڑھ کر پڑھی جاتی ہے، اور یہ ایک خاص بات ہے کہ انگریزوں کے ہاں کوئی اپنے اساطیر نہیں، کوئی ایسی شے نہیں جو انہیں اوثان و اصنام کی جانب منسوب کرے۔ ان کے ہاں زیادہ سے زیادہ شاہ آرتھر اور اس کی گول میز کا افسانہ ہے

جس میں یقیناً فوق العادۃ امور داخل ہو گئے ہیں۔ مگر دوسرے شمالی لوگوں مثلاً اہلِ سکنڈے نیویا اور اہلِ جرمنی کے اپنے باضابطہ اور خصوصی اساطیر ہیں جیسا کہ ان سے پیشتر یونانیوں اور رومنوں کے ہاں موجود تھے۔ ان اساطیر کی نمائش پہاڑیوں، وادیوں، اور دریاؤں پر ہوتی ہے جن سے کہ یہ لوگ مانوس ہیں، لیکن حکایات جن پر انگریز بچوں کی تربیت ہوتی ہے تو وہ عہد نامۂ قدیم کی کہانیاں ہیں جن کا تعلق محض تمدنی اور اقلیمی حالات سے ہے اور جو اُن حالات سے بالکل مختلف ہیں جن سے کہ انگریز اپنے ملک میں مانوس ہیں۔ چنانچہ ہر حکایت کی تشریح بطور واقعۂ دخیل کے کرنی پڑتی ہے اور ایسے لوگوں کی تصاویر دکھانی پڑتی ہیں جو غیر مانوس مشرقی لباس میں ملبوس ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ امر محض فطرتی ہے کہ بائبل نے ان جزائر کی زبان اور لٹریچر کی تشکیل میں خاص طور پر بڑا کام کیا ہے +

یہ امر ملحوظ رہے کہ مشرق نے مغرب پر اپنے ادب و فنون کا اظہار نہایت تمہل سے کیا، اور یہ بات نہایت تعجب انگیز ہے کہ اشیائے مشرقی کی صدہا سالہ تجارت مشرقی تثقیف و تہذیب کا کوئی حصہ اپنے ہمراہ نہیں لائی، اور نہ ہی مشرق و مغرب کے شخصی اختلاط میں خواہ وہ سیاسی ہو یا فوجی یا کاروباری، کوئی ایسا قرینہ پایا جاتا ہے جس نے مہذب دنیا کے ان دو نصفوں میں کوئی باہمی تشخص پیدا کیا ہو۔ قدیم ترین زمانوں سے چین اپنا ریشم تجارتی راہوں سے ایران میں بھیجتا رہا جہاں سے پھر وہی ریشم یورپ میں جاتا، مگر یورپ کو چین کے متعلق تیرھویں صدی کے وسط تک عملی طور پر کوئی علم نہیں تھا، سوائے اس کے کہ چین ایک ایسا ملک ہے جہاں سے ریشم آتا ہے +

ساتویں صدی میں فتحمند عربوں نے یورپ پر حملہ کیا اور اس حملہ کا نتیجہ ایک حیرت انگیز کیفیت تھی، جس کی رو سے یورپ کے اکثر لوگ اسلامی حکومت کے تحت میں آ گئے، یہ ایک ایسی کیفیت ہے جسے مشرق و مغرب کے عام مفہوم کے ضمن میں، اور موجودہ سیاسیاتِ یورپ پر ترکی اثرات کی ذیل میں، ہم بیشتر فراموش کر دیتے ہیں +

قسطنطنیہ پر عربوں کا پہلا حملہ ۶۶۸ء میں واقع ہوا یعنی حضرت محمدؐ کی ہجرتِ مکہ کے صرف چھیالیس سال بعد آٹھویں صدی کے وسط سے پیشتر عربوں نے تمام کا تمام سپین اور پرتگال فتح کر لیا، اور یہ صرف چارلس مارٹل کی ذات تھی جس نے اُن کی پیش قدمی کا سلسلہ ٹورز اور پائیٹیرز کے مابین روک دیا۔ سرزمینِ یورپ میں عربوں کی موجودگی کی اہمیت جو اپنی مادی اور دماغی طاقتوں کے کمال پر پہنچے ہوئے تھے، ہم ایسے وقت میں قطعاً نظر انداز نہیں کر سکتے جب کہ یونان و روما کی تہذیب قریب قریب کالعدم ہو چکی تھی، اور جنوبی یورپ میں اُن کی جگہ نئی اقوام لے رہی تھیں۔ پانچویں صدی کے خاتمہ سے پیشتر روما کی سات پہاڑیوں پر قائم شدہ سلطنت کی مستحکم تعمیر آخر کار مغربی یورپ کے گوشہ گوشہ میں شمال کی غیر مہذب اقوام کے ہاتھوں منہدم ہو چکی تھی، جن کی غیر معمولی طاقت اور ان گنت تعداد کا مقابلہ محض محال تھا۔ مذکورہ حملہ آور اپنے

ہمراہ سوائے جسمانی طاقت کے تحفہ کے اور کچھ نہ لائے، اور یہ امر خلافِ توقع تھا کہ وہ مفتوحہ علاقوں کے علم و فن یا دبستانوں کی قدر شناسی کا کوئی ثبوت پیش کرتے، چنانچہ ۸۰۰ء تک ہمارے سامنے کوئی ایسی نمایاں شخصیت نہیں آتی جس نے ماسبق کی اہمیت کا اندازہ کیا ہو۔ شمالی اقوام کے مابین اشاعتِ عیسائیت نے جس کا آغاز پانچویں صدی کے خاتمہ کے ساتھ ہوا کلیسائی طبقہ کے علاوہ ان فاتح طبقات پر کوئی خوشگوار اثر پیدا نہیں کیا، اور یہ صرف چارلی مین کی ذات تھی جس نے پہلے پہل اپنے لوگوں کی وحشیانہ عادات اور طبعی بغاوت کو قومی اصلاح کے نظریوں سے مانوس کرنے کی سعی کی۔

بلا شک و شبہ مشرق کا انگلستان پر اولین براہِ راست اثر، اہلِ انگلستان کا حروبِ صلیبیہ میں اشتراک تھا، جس نے یورپ کی آنکھیں اُس تہذیب پر وا کر دیں جس کا اہلِ یورپ کو خیال تک نہیں تھا۔ مشرقِ ادنیٰ و متوسط کی وہ تصویر جو عام لوگوں کے ذہن میں بارھویں صدی میں محفوظ تھی غالباً سرے سے غلط تھی۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ لٹریچر کی وساطت سے اسے مصر و ایران اور ہندوستان جیسے ممالک کے ناموں سے واقفیت تھی اور بائبل کے ذریعہ سے اُسے فلسطین اور عراق و عرب کے متعلق کچھ نہ کچھ علم تھا مگر اُن واقعات کے متعلق جو ان ملکوں میں سلطنتِ روما کے زوال کے بعد رونما ہوئے اُسے غالباً کوئی علم نہیں تھا، سوائے اس مزعومہ امر کے کہ ساتویں صدی میں ایک جھوٹا (نعوذ باللہ من ذالک) پیغمبر محمد نام کا پیدا ہوا ہے جو ان دنوں عیسائیوں اور یہودیوں کے مقاماتِ مقدسہ پر قبضہ کئے ہوئے ہے۔ اس وقت عام طور پر لوگوں کا گمان اغلباً یہ تھا کہ محمد کے پیرو کار وحشی عرب ہیں، جن کے ہاں بہت کم یا سرے سے کوئی تہذیب و شائستگی نہیں۔ انہیں یقیناً کسی ایسے دربار کا خیال نہیں تھا جس کا صدر الصدور ایک بہادر اور مہذب حاکم ہے اور جس کے ہاں اکثر ممالک کے اہلِ علم و فن بکثرت آتے جاتے ہیں چنانچہ اُس حیرتِ مطلق کا تخیل محض محال ہے جو اولین صلیبی جنگ آزماؤں کو اُس وقت لاحق ہوئی جب کہ انہیں ان برائے نام جاہلوں کی اہلیت کا علم و احساس ہوا۔ اس قسم کے جو جنگ آزما یونان و اٹلی کی سرزمین سے گذرے انہوں نے محسوس کیا کہ ان ملکوں کی پہلی شان و شوکت جا چکی ہے، مگر جب انہوں نے سرزمینِ شام میں قدم رکھا تو ایک ایسی طاقت کو اپنے جوبن پر پایا جس کا انہیں خواب و خیال تک نہیں تھا۔

درحقیقت یورپ میں مشرق کے متعلق ذخیرۂ معلومات لانے کا ذریعہ صلیبی جنگجو ہی تھے، مگر یہ ذخیرہ محض محدود تھا جو جغرافی حیثیت سے صرف فلسطین، شام اور مصر تک مقید تھا، اور تنقیقی حیثیت سے اُس کی اہمیت یا تو بہت کم تھی، یا سرے سے تھی نہیں صلیبی جنگ آزماؤں کو بادیہ نشینوں سے تعلم کی کوئی خواہش نہ تھی، بلکہ وہ صرف انہیں یروشلم سے خارج کرنا چاہتے تھے، اور حتی الامکان انہیں ملیا میٹ کر دینے کے متمنی تھے۔

سرزمینِ سپین پر متمکن ہونے کے بعد باقی یورپ پر عربوں کا فوری اثر مقابلتہً خفیف تھا، چنانچہ نویں اور دسویں صدی میں ہمیں ایسی بہت کم شخصیتوں کا علم ہے جن کا علمی مشغلہ عربی زبان کی تحصیل ہو اولین مثالوں میں سے نہایت مشہور مثال پوپ سلوسٹر ثانی (گربرٹ، ریھمس کے اسقفِ اعظم) کی ہے، جس نے دسویں صدی کے خاتمے اور گیارھویں صدی کے آغاز میں بحیثیت ایک عالم و فاضل کے خاصی شہرت حاصل کی۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اسے عربی اور عبرانی زبانوں میں زبردست مہارت حاصل تھی۔ پوپ سلوسٹر کے بعد فریڈرک ثانی کا نام ہے جو ۱۲۵۰ء میں فوت ہوا۔ فریڈرک ثانی باربار وسا اعظم کا پوتا تھا، اور اسے از ابلا دخترِ شاہ جان کا خاوند ہونے کی حیثیت سے انگلستان سے گہرا تعلق تھا" فریڈرک نے عربی تصانیف کے مطالعہ اور ترجمہ کی ترویج کے لئے بہت سا کام کیا۔ وہ میکائیل سکاٹ کا مربی تھا جس نے بوعلی سینا کی "نیچرل ہسٹری" کا ترجمہ کیا۔ یہ امر تو ظاہر نہیں ہوتا کہ قرطبہ یونیورسٹی کے بہت سے فضلا نے باقی یورپ کا سفر کیا ہو، مگر اس قدر یقینی ہے کہ بہت سے یورپین فضلا، بالخصوص ڈینٹے کے استاد برونیٹو لیٹنی جیسے مورش سپین کے عربوں اور یہودیوں کے زیرِ نگرانی تعلم کے لئے گئے۔ مگر ان تمام امور کے باوجود یہ صرف صلیبی جنگ آزماؤں کی ذات تھی جس نے پہلے پہل یورپ کو اسلام سے حقیقی طور پر روشناس کرایا۔ جب پیٹر راہب نے ۱۰۹۶ء میں پہلی صلیبی جنگ کی تبلیغ کی تو وہ تثقیف جو براہِ راست عیسائیت سے منسوب ہوسکتی ہے اُس وقت تک صرف کلیسا تک محدود تھی، اور عیسائی یورپ ابھی بچپن کے ابتدائی زمانہ میں خیال کیا جاتا تھا، بحالیکہ اسلام جو ۶۰۰ برس پیشتر منصۂ شہود پر آیا، اس وقت سے قبل اپنے سیاسی عروج پر پہنچ چکا تھا، اور لٹریچر کا ادبی دور گزار چکا تھا۔ سنہ عیسوی کی ابتدائی دس صدیوں میں خلافتِ عربیہ کے ارتقا کی سرعت اور ترقیٔ عیسائیت کی سستی عنصری کا مقابلہ دلچسپی سے خالی نہیں کیونکہ اس مقابلہ سے اس امر کی توضیح ہوتی ہے کہ کیونکر ہزار سالہ عیسائی ملوکیت کی نمائندہ امارت نے، ایسی شانِ تہذیب سے محیط امارتِ اسلام کا مشاہدہ کیا جس کی نظیر انہیں اپنے گھروں میں نہیں ملتی تھی +

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ صلیبی جنگ آزما جو انگلستان واپس آئے کس قسم کے اثرات اپنے ہمراہ لائے اولاً تو ہم یہ امر تسلیم کرسکتے ہیں کہ اُن کی ذہنی کیفیت بہت حد تک وسعت پذیر ہو چکی تھی، اور وہ محسوس کرنے لگ گئے تھے کہ بادیہ نشین گو منکرِ عیسائیت ہیں لیکن دوسرے پہلوؤں سے وہ ایسے ہی اچھے انسان ہیں جیسے کہ وہ خود۔ بہادری میں اُن کے برابر، اسلحہ میں ان کے ہم پلہ اور عشرت و امارت پسندی میں اُن سے بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ ایک عجیب امر ہے کہ صلیبی لڑائیاں جو ڈیڑھ سو سال سے زائد عرصہ تک جاری رہیں، بطورِ خود ملک گیری کے کسی مزید اقدام کا موجب نہ بنیں اس لئے کہ اہلِ انگلستان نے مشرق میں اٹھارہویں صدی کے وسط سے پیشتر کسی قسم کی فوجی پیش قدمی شروع

نہیں کی۔ یہاں تک کہ مذہبی مقاصد کی جگہ تجارتی اغراض نے لے لی۔ علاوہ ازیں راس امید کی مشرقی راہ کے انکشاف کے وقت تک بحیرۂ متوسط سے باہر تجارت کا کوئی عندیہ نہیں تھا۔ لہٰذا ہم اس امر کا دعویٰ کرسکتے ہیں کہ ازمنۂ وسطیٰ کے انگلستان کے مشرق سے تعلق کا نتیجہ محض عیش وعشرت، نمایش اور امارت کا اظہار تھا۔ چنانچہ اس دور میں انگلستان پر کسی تثقیفی اثر کا نشان نہیں ملتا کیونکہ چند ابتدائی تراجم کے قطع نظر (مثلاً میکائیل سکاٹ کی بوعلی سینا کی نیچرل ہسٹری) یہ صرف علوم وفنون کی عام تجدید کے بعد تھا کہ عربوں کا سائنس اور فلسفہ لاطینی زبان کی وساطت سے اہلِ تدریس کے علم میں آیا۔ تاہم یہ امر طبعی ہے کہ مسلمانوں کے تثقیفی پہلو نے صلیبیوں پر کوئی اثر پیدا نہیں کیا، اس لئے کہ ان کے ہاں مذہبی اشتعال سے قطعِ نظر سوائے جنگ آزمائی کے اور کوئی مقصد نہیں تھا۔

بارھویں صدی کے وسط میں یورپ میں افواہ اڑی کہ کہیں اسلامی سلطنت کی حدود سے باہر ایک عیسائی شہر وآز نامی پیر سٹر جان رہتا ہے جس نے بادیہ نشینوں کو تباہ کن شکست دی ہے۔ اس افواہ نے اس امر کی امید دلائی کہ صلیبیوں کو ایک ایسا اتحادی مل گیا ہے جو مخالفین پر دوسری جانب سے حملہ کرے گا مگر اس امید نے عملی جامہ کبھی نہ پہنا اس لئے کہ یہ افواہ مغالطہ پر مبنی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ۱۱۴۱ء میں سلجوق حکمران کو ایک ترکی شہزادہ کے ہاتھوں جس کی فوج میں بہت سے عیسائی ترک تھے شکست ہوئی، مگر ان ترکوں کو صلیبی جنگوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی، جن کے متعلق بہت ممکن ہے کہ انہیں کبھی کوئی اطلاع نہ ہوئی ہو +

یہ صرف تیرھویں صدی کے وسط میں مغلوں کا مشرقی یورپ پر حملہ تھا، اور اپنے وسطِ ایشیا کے گھروں میں اُن کی فوری واپسی تھی جس کا نتیجہ مشرقِ ادنیٰ سے اتر کر ایشیا کا حقیقی انکشاف ہوا، اور جس نے چین کا خشکی کا راستہ کھول دیا۔ اُس وقت مشنری پادری لوگوں اور تاجروں نے اس امر کے انکشاف کی خاطر سفر کرنا شروع کیا کہ یہ عجیب و غریب اور ناقابلِ شمار مغل حملہ آور کہاں سے آتے در آنحالیکہ ساتھ ہی انہیں پیر سٹر جان سے ملنے کی امید بھی تھی۔ چنانچہ جو بیانات یہ لوگ اپنے ہمراہ لاتے، نہایت اشتیاق سے پڑھے جاتے تھے، اور ان میں سے سب سے زیادہ مطلع نہیں تو کم از کم سب سے زیادہ مشہور و معروف مارکو پولو کا بیان ہے۔

مارکو پولو وینس کا شہری تھا جو قبلا خاں کے عہد میں شہر پکینگ میں پہنچا اور کئی سال تک چین میں اقامت پذیر رہا اور اسی دوران میں مغل شہنشاہ کے زیر حکومت اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔ بالآخر وہ ایران کی راہ اپنے اصلی وطن کو مراجعت کر گیا جہاں وہ سمندر کے راستے ۱۲۹۵ء میں پہنچا۔

وینس پہنچنے پر مغل لباس میں ملبوس نووارد کو اُس کے ہم وطن پہچان نہ سکے، یہاں تک کہ اُسے خود اپنے مکان

میں بدقت داخلہ نصیب ہوا۔ مارکوپولو کے "اسفار" ہمیشہ غیر معمولی ہر دلعزیزی کا باعث بنے رہے ہیں، اور چین کے متعلق یورپین استعجاب کی ابتدا بمقابلہ کسی دوسری کتاب کے صرف اسی سفر نامہ کی طرف منسوب کی جاتی ہے +

مگر مشرقی "اسفار" کے متعلق کوئی تصنیف ہر دلعزیزی میں اُس کہانی کا مقابلہ نہیں کرسکی جو سرجان منڈیول نے تالیف کی ہے اور جو مارکوپولو کے تقریباً پچاس سال بعد معرضِ ظہور میں آئی۔ یہ صحیح ہے کہ اس کتاب کا نفسِ مضمون صرف مشرقِ ادنیٰ تک محدود ہے مگر بوجہ اپنے انتہائی غلو کے اُسے مطالعہ کرنے والے پسند کرتے تھے اور صدیوں تک اُسے حالات کا حقیقی مرقع خیال کیا جاتا تھا۔ مگر جدید تحقیق کی روشنی میں یہ امر مشکوک ہے کہ آیا منڈیول فلسطین سے آگے بڑھا بھی یا نہیں، اور یہ محض اسی نوعیت کی کتابوں کی وجہ سے کہ قدیم نقشہ کاروں کو اس بات کی ترغیب ہوئی کہ وہ ممالکِ غیر منکشفہ کے نقشوں میں خیالی باشندے دکھائیں ——— ایسے باشندے جن کے دو سر ہوں یا تین ٹانگیں اور علیٰ ہذا القیاس، یا اژدہاؤں کے سے خوفناک درندے۔ غلط افواہ کے برقی خرگوشوں پر حقیقت کے سکھائے صید افگن کا غلبہ شاذونادر ہی ہوا ہے، اور اگر ایسے خرگوش گرفت میں آ بھی جائیں تو خرگوش و سگ ہر دو کو حرمان و یاس اور رنج والم کا سامنا ہوتا ہے۔ بہرحال اس وقت سے آگے مشرقی "اسفار" کی کتابیں پڑھی جانے لگیں اور پرتگیزوں کی ہندوستان اور ابی سینیا میں ابتدائی پیش قدمیاں بے شمار نفیس و غریب بیانات کا موجب بنیں۔ چنانچہ ڈاکٹر جانسن کی پہلی شائع شدہ کتاب اب پولو کے اسفار ابی سینیا کا ترجمہ تھا جس پر بعد میں سیلاز کی کہانی کی تعمیر ہوئی۔

لیکن مشرق کے حقیقی حکایت نامہ کا انکشاف یورپ پر "الف لیلیٰ" کے ترجمہ کی وساطت سے ہوا۔ یہ ترجمہ جس کا اظہار پہلے پہل فرانسیسی میں اور عین بعد انگریزی میں ہوا، بعض کے الفاظ میں یورپ کے لٹریچر کی تاریخ کا اہم ترین واقعہ تھا۔ ہمارے لئے جو بچپن سے "ریشِ نیلگوں" "علی بابا اور چالیس چور" کی حکایات سے مانوس ہیں اُس استعجاب کا اندازہ لگانا مشکل ہے جس سے یورپ والوں نے ان مسرت آمیز کہانیوں کا استقبال کیا۔ انہیں کہانیوں نے ان لوگوں کا خلفا، شیوخ، جنات اور عفاریت کی ایک نئی دنیا اور اس قسم کے محلات اور ضیافتوں سے تعارف کرایا جن کا انہیں خواب و خیال تک نہیں تھا۔ ان حکایات نے بغداد و مصر کو محبت و نفاق اور عجائبات کے کرشموں سے از سرِ نو زندہ کر دکھایا۔

ان حکایات کی عربی اصل کو اول اول ایک فرانسیسی مسمی گیلنڈ نے جو محکمۂ سیاسیات کا ملازم تھا دمشق میں پایا، اور بعد میں اُن کا ترجمہ بھی شائع کیا جو متعدد اقساط میں ۱۷۰۴ء اور ۱۷۱۷ء کے مابین اشاعت پذیر ہوا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد لندن میں ایک گمنام انگریزی ترجمہ شائع ہوا۔ ان حکایات کو فوری کامیابی حاصل ہوئی چنانچہ سر جیمس سٹیورٹ سکاٹ لینڈ

کے لارڈ ایڈووکیٹ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اُس نے ایک ہفتہ کی شام کو اپنی لڑکیوں کو "الف لیلیٰ" پڑھتے دیکھا سرجیمس نے اُن سے کتاب چھین لی، مگر دوسری صبح خود لارڈ ایڈووکیٹ اپنی لائبریری میں اس حالت میں سوتے پائے گئے کہ کتاب اُن کی بغل میں تھی، یعنی یہ کہ وہ اس کتاب کو سبت کے دن طویل عرصہ تک پڑھتے رہے تھے۔

تاہم اُس زمانہ تک جب وارن ہیسٹنگز ہندوستان کے گورنر جنرل بنے اس سرزمین کی قدیم زبان اور لٹریچر نے مغربی اہلِ علم کی خاص توجہ حاصل نہ کی۔ وارن ہیسٹنگز کا یہ خیال صحیح تھا کہ ہندوستانیوں پر انصاف و ہمدردی سے حکومت کرنے کے لئے ان کے اپنے قوانین اور رسوم سے واقفیت حاصل کرنا لازمی ہے۔ چنانچہ سنسکرت لٹریچر کی تشریح کے بلند پایہ کام کے ضمن میں دو ممتاز نام سرولیم جونز اور کول برک ہیں۔ سرولیم جونز تو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کا بانی ہے، اور کول برک نے سنسکرت کے کئی متون شائع کئے۔ ان انگریز فضلا نے جس کام کی ابتدا کی فرانس اور جرمنی کے فضلا انہماک سے اُس کے درپے ہوگئے، اور علم الالسنہ (فلالوجی) کی بنیاد ڈالی گئی۔ تاہم یہ صرف ایف ڈبلیو میکس ملر کتبِ شرقیہ کا ایڈیٹر تھا جس نے عہدِ وکٹوریا میں سنسکرت لٹریچر اور فلالوجی کی ترویج کی خاطر ہر دوسرے فاضل سے بڑھ چڑھ کر کام کیا۔

جونہی کہ لوگوں نے سنسکرت زبان میں ضبط شدہ لٹریچر کی فراہمی اور مطالعہ کا کام شروع کیا، انکشافات کے وسیع اور جدید میدان کھل گئے، اور مذہب و فلسفہ کے علوم میں ایک انقلاب برپا ہوگیا۔ ہمارے لئے یہ امر مشکل ہے کہ ہم اُس اثر کی تشخیص کریں جو یورپ کے فضلا پر ایک قدیم ثقافت و تہذیب کے انکشاف سے مترتب ہوا ۔۔۔۔ ایسی ثقافت و تہذیب جس کے وجود کا انہیں علم تک نہیں تھا، جو بلند پایہ ادبی اور فلسفیانہ نوعیت کی بے شمار تصانیف پر مشتمل تھی اور جو اعلیٰ صنف کی شاعری اور ڈراما کے علاوہ، دماغی اور اخلاقی علوم اور فنون و قانون سے متعلقہ وسیع تصانیف پر حاوی تھی، چنانچہ بعض پہلوؤں میں اُس کی کامیابی یونانیوں کی کامرانی سے حقیقۃً پیش پیش تھی۔

متقابل فلالوجی کا باقاعدہ مطالعہ جس کا حصول سنسکرت کے انکشاف سے ممکن ہوگیا اُن تمام مروّج نظریوں کے مکمل اعادہ کا موجب بنا، جو بنی نوعِ انسان کی اصل سے متعلق تھے یعنی ایسے نظریے جو اس وقت تک شہرِ بابل میں اختلافِ السنہ کے افسانہ پر مبنی تھے۔ اس طرح پر مشرق نے، جس نے خود کو مغرب پر اس تہل سے منکشف کیا، آخرالامر اپنے سب سے گراں مایہ راز یعنی ہندوستان کو عیاں کیا۔

فیض احمد

نشاطِ رُوح

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا — جو غم ہُوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا

ہوں کامیابِ دید بھی محرومِ دید بھی — جلوؤں کے اژدحام نے حیراں بنا دیا

یُوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی — یُوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

کچھ شورشوں کی نذر ہُوا خونِ عاشقاں — کچھ جم کے رہ گیا اُسے حرماں بنا دیا

اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی — کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا

اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موجزن — آج اُس کو حسن و عشق کا ساماں بنا دیا

وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے — جب مختصر کیا انہیں انساں بنا دیا

ہم اُس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر — تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیرِ عشق کی — جب خاک کر دیا اُسے عرفاں بنا دیا

کیا کیا قیود دہر میں ہیں اہلِ ہوش کے — ایسی فضائے صاف کو زنداں بنا دیا

اِس طرح کی جنوں میں یہاں زندگی بسر
خود زندگی کو میں نے پشیماں بنا دیا

اصغر گونڈوی

مبادیٔ سیاسیات

باب ۷

حکومت کا دائرۂ عمل[ا]

پچھلے باب کے عنوان موسومہ "ملکیت" کے تحت بتایا گیا تھا کہ آج کل اشتراکیوں کا ایک خاص گروہ یہ کہتا ہے کہ افراد کے حقِ مالکانہ اور اُن کے معاشی مقابلے کی وجہ سے پیداوارِ دولت میں بہت کچھ وقت، محنت اور سرمایہ رائگاں جاتے ہیں، لہٰذا عاملینِ پیداوار پر حکومت کا پورا قابو ہونا چاہیئے، اور سرمایہ وزمین دونوں مملکت ہی کی مِلکہ ہونی چاہئیں یہ اصول محض ضمنی طور پر بیان کیا گیا تھا اور اُس وقت بحث وتحیص کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ موجودہ باب میں اس اہم مبحث پر غور کیا جائے گا اور کوشش کی جائے گی کہ آج کل دنیا کی فضا جن طبقہ داری نزاعات کی وجہ سے مکدر ہو رہی ہے اُن پر ٹھنڈے دل سے تبصرہ کیا جائے۔

مملکت اور حکومت کی مداخلت۔ اشتراکیت اور اس کے جوابی اصول انفرادیت کا مسئلہ دراصل افراد و مملکت کے باہمی تعلقات، اور افراد کے کاموں میں مملکت کی مداخلت کا مسئلہ ہے۔ اس میں تو شبہ کی گنجائش نہیں کہ مملکت کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے، اور چونکہ ملک کی تمام منظم قوت اُس کی پشت پناہی کے لئے حاضر ہوسکتی ہے اس لئے بظاہر وہ ایسی مطلق العنان فرمانروا ہے جس کا حکم گویا قانون ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ افراد کی کن کن مصروفیات اور امور میں عمالِ حکومت کو معمولی طور پر مداخلت کرنے کا اختیار ہونا چاہیئے۔ ایک مثال پر غور کیجئے۔ ممالکِ متحدۂ امریکہ کی ریاست یوٹا میں ہر شخص جتنی عورتوں سے چاہے نکاح کرسکتا ہے، لیکن شرع اسلامی کی رو سے کسی مرد کو چار سے زیادہ

[ا] اس باب میں بہت سی معاشی اصطلاحات کو استعمال کرنا پڑا ہے۔ سیاسیات اور معاشیات دونوں علوم عمرانی ہیں، اور اُن میں جو باہمی رشتہ ہے اُسے باب ا (ہمایوں فروری ۱۹۲۸ء) میں واضح کردیا گیا ہے۔ زمانۂ حال میں ان دونوں علوم کا تعلق پہلے سے بھی قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ موجودہ باب میں اس کی کوشش کی گئی ہے کہ حتی الامکان معاشی اصطلاحات سے گریز کیا جائے لیکن بعض مرتبہ اس سے مفر نہیں ہوسکا۔ "دولت"، "اصل"، "زمین"، "عاملینِ پیداوار"، "اجارہ" اور دوسری معاشی اصطلاحات کے مفہوم کے لئے دیکھو الیاس برنی کی کتاب "علم المعیشت"۔

نکاح کرنے کا اختیار نہیں ہے اور وہ بھی جب وہ اپنی ہر ایک بیوی کے ساتھ مکمل مساوات کا سلوک کر سکے؛ پھر اکثر ممالکِ یورپ میں کسی فرد کو اتنی آزادی بھی حاصل نہیں، بلکہ اگر کوئی شخص ایک زوجہ کے ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح کرے تو وہ گرفتنی تصور کیا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں عمالِ حکومت اکثر ممالکِ یورپ میں افراد کے حقِ مناکحت میں نسبتہً زیادہ مداخلت کر سکتے ہیں، اسلامی شرع کی رو سے اس سے ذرا کم، اور یوٹا جیسی ریاست میں انہیں اس نوع کی مداخلت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ایک دوسری مثال لیجئے انگلستان میں جہاں جبری تعلیم کا قانون رائج ہے، اگر کوئی شخص اپنے بچے کو جس کی عمر ایک خاص حد سے تجاوز کر چکی ہو، مدرسہ نہ بھیجے تو اس پر مقدمہ چلایا جا سکتا ہے، لیکن ہندوستان میں حکومت کسی شخص کو جبرًا اپنے بچے کو مدرسہ بھیجنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

انفرادیت اور اشتراکیت۔ اگر انفرادیت اور اشتراکیت کو اجمالی طور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انفرادی مسلک کے پیرو حکومت کی مداخلت کو فرد کے حق میں برا تصور کرتے ہیں اور اُن کا یہ خیال ہے کہ اُس کی غیر ضروری دست اندازی سے انسان کی آزادی میں رخنہ پڑتا ہے؛ تاہم اُن کے نزدیک چونکہ معاشرۂ انسانی ہنوز اُس پایۂ کمال کو نہیں پہنچا کہ بغیر بیرونی دباؤ کے انسان کی زندگی، حقوق اور مملوکات مامون و محفوظ رہ سکیں اس لئے حکومت کے بغیر چارۂ کار بھی نہیں۔ بدیں سبب اس کی ضرورت ہے کہ جس وقت ان عناصرِ حیات میں سے کوئی بھی معرضِ خطر میں آئے تو حکومت مداخلت کر کے نقصان رساں کو کیفرِ کردار کو پہنچائے لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ حکومت ایسے معاملات میں بھی دست اندازی کرے جو صریحًا خود فرد کے حیطۂ اقتدار میں ہوں، جیسے تعلیم، حفظانِ صحت وغیرہ، اس لئے کہ انفرادیوں کی دانست میں ہر شخص کو ان کے طے کرنے کا کلیتہً حق حاصل ہے، چنانچہ ایسی حالت میں بیرونی مداخلت بے کار بلکہ شاید نقصان رساں ثابت ہوگی۔

اس کے برعکس اشتراکی یہ کہتے ہیں کہ انسان ہرگز اپنے مفاد سے کماحقہٗ واقف نہیں ہوتا اور اس کے اور مملکت کے اغراض میں بعض مرتبہ جو تضاد پایا جاتا ہے اُس کے نتائجِ بد کے انسداد کے لئے مملکت کی مداخلت لازمی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ انفرادی معاشرہ میں اصولِ مقابلہ کی ترویج کے باعث انسان کی محنت اور سرمایہ کا بہت بڑا حصہ ضائع ہو جاتا ہے، اور چونکہ ایک ہی قسم کے کام کو بہت سے لوگ بیک وقت انجام دیتے ہیں اس لئے کوئی بات بھی خاطر خواہ انجام کو نہیں پہنچتی۔ اُن کی دانست میں بہترین مملکت وہی ہے جس میں اپنے پرائے کا سوال باقی نہ رہے بلکہ سرمایہ و زمین دونوں مملکت ہی کی سمجھی جائیں اور "محنت" پر اُسی کی کلیتہً دسترس ہو۔ مکمل اشتراکی مملکت میں نہ خانگی زمینداریاں ہونگی نہ خانگی گرنیاں اور ملیں، نہ خانگی مدارس و کارخانجات، بلکہ جس قدر بھی عاملینِ پیداوار ہیں سب کے سب حکومت ہی کے

دست نگر ہونگے، ہر ایک فرد گویا مملکت ہی کی طرف سے کام کرے گا اور حکومت ہی کے مقرر کردہ معاوضہ پر اُس کی قوت بسری ہوگی۔

یہ ظاہر ہے کہ موجودہ انسانی معاشرہ میں نہ تو مکمل اشتراکیت کا راج ہوسکتا ہے نہ مکمل انفرادیت کا، چنانچہ جس اصول پر آج کل عام طور سے اکثر ممالک میں عمل کیا جاتا ہے وہ خذ ما صفیٰ ودع ما کدر کا اصول ہے[52] محض عقیدہ پرستی سے علوم عمرانی میں کام نہیں چل سکتا اس لئے کہ مختلف ممالک دراصل افراد ہی کے مجموعے ہیں اور افراد میں بے حد تنوع پایا جاتا ہے اور ملک کی معاشی، جغرافی و سیاسی کیفیات بھی جداگانہ ہوتی ہیں۔ نہ تو یہ ممکن ہے کہ کسی ملک میں فرد کی باگ بالکل چھوڑ دی جائے نہ یہ کہ فرد کے ہر ایک معاملے میں حکومت مستقل طور پر مداخلت کرتی رہے[53]۔ انفرادی ممالک میں آسانی اسی میں تصور کی گئی ہے کہ تار، ڈاک اور ایک بڑی حد تک تعلیم و حفظانِ صحت کا کام حکومت اپنے ذمہ لے لے اور کارخانوں وغیرہ کی نگرانی کرتی رہے، اُدھر روس جیسے اشتراکیت پسند ملک میں یہ ناممکن ہوگیا ہے کہ بلا شرکتِ غیرے حکومت ہی براہِ راست زمیندار، سرمایہ دار اور کارخانہ دار بنی رہے۔ گویا فی الجملہ آج کل کے زمانے میں اکثر ممالک کا مطمحِ نظر یہی ہوگیا ہے کہ محض عقیدہ پرستی کو بالائے طاق رکھ کر ایک طرف تو افراد کی ذاتی و خانگی آزادی کے دائرہ کو حتی الامکان وسیع تر کیا جائے لیکن ساتھ ہی حسبِ ضرورت ملک کی بہبود و مفاد کی خاطر حکومت مداخلت کرنے سے بھی گریز نہ کرے۔

انفرادیت ۔ اب ان اصول پر ذرا غائر نظر ڈالئے۔ انفرادیت کی ابتدا اُس وقت ہوئی جب قدیم تجاریت کے ساتھ ساتھ حکومت کی مداخلت و نگرانی کے خیالات زائل ہورہے تھے۔ آدم سمتھ[54]، فون ہمبولٹ[55] اور ہربرٹ سپنسر[56] نے اس اصول کو پیش کرکے اس سے مختلف النوع استدلال کئے۔ انفرادیت کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ ہر ایک فرد کو اپنی حرکات و سکنات کی اُس وقت تک پوری آزادی ہونی چاہئے جب تک یہ عیاں نہ ہوجائے کہ اس کی آزادی سے کسی دوسرے کو گزند پہنچتا ہے۔ معاشرۂ انسانی کی بنیاد خود غرضی پر ہے، اور ہر ایک شخص اپنی غرض کو دوسروں کی بہ نسبت بہتر پہچان سکتا ہے، چنانچہ جس قدر بیرونی اور مصنوعی روکاوٹیں کم ہونگی اتنا ہی وہ اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب

---

۵۲ "جو اچھا ہو اسے رکھ اور جو برا ہو اُسے چھوڑ"

۵۳ دیکھو باب ۵، رسالہ ہمایوں، جون ۱۹۲۸ء

۵۴ آدم سمتھ: "دولت اقوام" Adam Smith: Wealth of the Nations

۵۵ فون ہمبولٹ: خیالات متعلق تحدید دائرہ حکومت Humbold: Greunzer der Wirksamkeit des Staats

۵۶ ہربرٹ سپنسر: "فرد بمقابلہ مملکت" Herbert Spenser: Man versus the State

ہوگا۔ یہی نہیں، بلکہ ہر فرد کے حصولِ مقاصد ہی سے افراد کی اجتماعی بہبود مدِنظر ہوتی ہے اس لئے کہ آخر افراد ہی سے تو معاشرہ ترکیب پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہر فرد اپنی بہبود کے لئے کوشش کرے گا تو مختلف افراد کے مابین مقابلے کی کیفیت پیدا ہو جائے گی جس سے انسان کی اعلیٰ ترین قابلیتیں نمایاں ہو جائیں گی اور اس میں اپنی مدد آپ کرنے کی اہلیت پیدا ہو جائے گی۔ نیز اس مقابلے کا نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ جو افراد فطرتاً ناقابل ہیں یا ماحول کے باعث ان کی فطری اہلیت زائل ہو چکی ہے وہ یا تو پسِ پشت چلے جائیں گے ورنہ فنا ہو جائیں گے جس کی وجہ سے معاشرہ کو بقائے اصلح سے فائدہ پہنچے گا۔ الغرض انفرادیوں کے نزدیک بہتر یہی ہے کہ افراد کے کاموں میں حکومت بے ضرورت مداخلت کرنے سے باز رہے اور صرف انہیں کاموں کی نگرانی رکھے جو افراد کی جان، مال اور آزادی کے لئے ضروری ہیں۔

اگر نظریۂ انفرادیت پر تنقیدی نگاہ دوڑائی جائے تو ہمیں بہت جلد اس کے بے بنیاد ہونے کا ثبوت مل جائیگا۔ سب سے پہلا اصول جو اس نظریہ کی گویا بنیاد ہے یہ ہے کہ نہ صرف ہر ایک فرد کو اپنی بہبود مدِنظر ہوتی ہے اور وہ اس کے لئے کماحقہٗ کوشش کرتا ہے بلکہ وہی اس کا اہل بھی ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انفرادیوں کا یہ خیال بالکل خام ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ عقلِ انسانی مکمل نہیں[۵۷]، اور روزمرہ اس قسم کے سینکڑوں واقعات پیش آتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے لئے اپنے پاؤں میں جان بوجھ کر کلہاڑی مار لینا بالکل معمولی بات ہے۔ اگر وہ اپنے جائز مقاصد حاصل کرنے کے درپے ہوتا اور اُس کے حصول کے ذرائع سے بھی واقف ہوتا تو پھر ہم کسی کو ناکامی یا عسرت کی زندگی بسر کرتے ہوئے نہ دیکھتے پھر یہ بات غلط ہے کہ افراد اور مملکت کے اغراض ایک ہی ہیں ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ بعض مرتبہ جس چیز میں بظاہر افراد کا مفاد نظر آتا ہے اُس میں ان کی اجتماعی کیفیت یا مملکت کا مفاد مضمر نہیں ہوتا[۵۸]۔ اگر یہ اجتماعی کیفیت قائم رکھنی ہے (اور اس سے مفر بھی نہیں[۵۹]) تو پھر دونوں خیالات کو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ اور ممتاز رکھنا پڑے گا۔ اور مملکت کو بھی اس کے ارتقا اور اس کے اغراض کے حصول کے لئے اسی طرح سے آسانیاں اور سہولتیں بہم پہنچانی پڑیں گی جیسے خود افراد کو۔ نظریۂ انفرادیت پر تیسری تنقید یہ کی جا سکتی ہے کہ انفرادی جس "آزادی" کو ملحوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اُس کا تعین مملکت کی اثباتی مداخلت کے بدوں ناممکن ہے اور فطری آزادی و حقوق کیسے ہی دل خوش کن

---

۵۷ عسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم وعسیٰ ان تحبوا شیئاً وھو شر لکم (قرآن مجید، سورۂ بقرہ رکوع ۱۰)

۵۸ باب ۱۰ (ہمایوں، فروری ۱۹۲۸ء)

۵۹ باب ۳، (ہمایوں، اپریل ۱۹۲۸ء)

خیالات کیوں نہ ہوں، بغیر اس اثباتی مداخلت کے اُن کی بنیا دمحض ہوا پر ہے[10]۔ آخری دلیل جو انفرادیت کے موافق پیش کی جاتی ہے وہ بقائے اصلح کی ہے، اور اس کا سب سے بڑا موید ہربرٹ سپنسر ہے[11]۔ وہ کہتا ہے کہ معاشرۂ انسانی کی حقیقی فلاح وبہبود اسی میں مضمر ہے کہ بہترین افراد باہمی مقابلے کے ذریعے سے پیش پیش ہو جائیں اور بدترین فنا ہو جائیں۔ بظاہر یہ خیال بہت ہی اچھا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بے کار فرد باقی نہ رہے جو ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر دوسروں کا گویا پیٹ کاٹ کر کھاتا ہو، لیکن ذرا غور کرنے سے یہ نظریہ بالکل بے اصل معلوم ہونے لگتا ہے۔ اول تو سپنسر کا یہ خیال ایسے جانوروں سے اخذ کیا گیا ہے جن میں اپنی اصلاح کی اہلیت نہیں، درآنحالیکہ انسان ان جانوروں سے ممتاز ہے۔ اور وہ ہر آن اپنی حالت کو بہتر کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ بعض ترقی یافتہ ممالک میں اب وہی بہرے، اندھے، گونگے، لولے اور اپاہج، جنہیں شائد سپنسر دریا برد کرا دیتا، معاشرہ کے مفید عناصر بن گئے ہیں، اور وہ جنہیں فطرت کی طرف سے جملہ قوائے جسمانی عطا ہوئے ہیں ہر لحظہ اپنی اور اپنے ماحول کی حالت کو سدھارنے میں مشغول ہیں۔ جب واقعی صورتِ حال یہ ہے تو پھر جانوروں کی عادات وخصائل سے استدلال کرنا اور بنی نوعِ انسان کو گردن زدنی قرار دینا کہاں تک مناسب ہے۔ دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ مقابلے کی ترویج سے بد فنا ہو جاتے ہیں اور نیک باقی رہتے ہیں، درآنحالیکہ حقیقۃً اس سے بہت سے لوگ ایک ہی قسم کا کام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے معاشرہ کو صریح معاشی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے، اور پھر جو شخص مقابلے کی وجہ سے امتیاز حاصل کر لیتا ہے وہ اگرچہ اضافی اعتبار سے قابل ترین ہو، لازماً بہترین نہیں ہوتا؛ اس کے وسائل اور اس کا دائرۂ نظر نسبتاً تنگ ہوتا ہے درآنحالیکہ اجتماعی انتظامات کی شکل میں یہ دائرہ وسائل کی فراوانی، مقاصد کی توسیع اور سرمایہ کی زیادتی کے باعث وسیع تر ہو جائے گا۔

انفرادیتِ جدیدہ - حال کے زمانے میں دوسرے سیاسی نظریوں کی طرح انفرادی نظریہ نے بھی چولا بدلا ہے اور بالخصوص پچھلی جنگِ عظیم کے بعد اس کی ہیئت میں بہت کچھ تبدیلی ظہور میں آئی ہے۔ دورانِ جنگ میں اور اس کے بعد تقریباً ہر ملک میں دو قسم کی کیفیات ظاہر ہوئیں، ایک تو حکومت کی مداخلت اور دوسرے حکومت کے علاوہ دیگر ادارات کے اثر میں توسیع۔ جنگ کے زمانے میں اس کی ضرورت پیش آئی کہ مرکز گریز قوتوں کا یا تو خاتمہ کر دیا جائے ورنہ حکومت کسی نہ کسی طرح سے ان پر حاوی ہو جائے، چنانچہ نئے نئے محاصل جاری ہوئے، قوانین

---

[10] باب ۶، (ہمایوں، فروری ۱۹۲۹ء)

[11] ہربرٹ سپنسر حسبِ بالا۔

تحفظِ قومی نافذ کئے گئے، اکثر جنگجو ممالک میں ہر ایسے شخص کو جو جنگ میں حصہ لینے کے قابل تھا، بھرتی ہونے پر مجبور کیا گیا، خانگی کارخانوں اور گرنیوں میں، جن میں پہلے روزانہ استعمال کی اشیا بنائی جاتی تھیں، سامانِ جنگ اور گولا بارود بننے لگا۔ الغرض ہر جگہ حکومت کی نگرانی ہونے لگی اور حکومت کے عمال ہر موقع محل پر نظر آنے لگے۔ اس صورتِ حال کے خلاف ردِ عمل ہونا لازمی تھا، چنانچہ جنگ کے بعد لوگوں کو حکومت کی دست برد اور مداخلت سے ایک قسم کی نفرت سی پیدا ہوگئی اور بڑی بڑی قومی انجمنوں اور اداروں نے خود اپنے ضابطوں اور قاعدوں کا نفاذ کرکے یہ دکھا دیا کہ ترتیب اور تنظیم محض حکومت کے جبر ہی سے برقرار نہیں رہتی بلکہ اس کے بغیر بھی ممکن ہے۔ انہیں معاشی کیفیات سے انفرادیتِ جدیدہ جنم لیتی ہے[۱۲]۔ اول تو اکثر ملکوں کے باشندوں میں عام طور پر یہ خیال پیدا ہوگیا کہ عقیدہ پرستی اور عملی سیاسیات دو مختلف النوع باتیں ہیں، اور انہیں یہ یقین ہوگیا کہ انفرادی اور اشتراکی عقیدہ پرست کچھ ہی کہتے ہیں، ہر ملک کا سیاسی ارتقا اس ملک کی سیاسی کیفیات کے مطابق ہوتا رہے گا۔ ایک مسلک یہ بھی قائم ہوگیا کہ مملکت کو محض افراد کی بجائے ان کے مجموعوں کا مقابلہ کرنا ہے، اور جس طرح ہمیں یہ سکھایا جاتا ہے کہ وقت آنے پر ہم اپنے ملک (یعنی اپنے مخصوص جغرافی رقبے) پر اپنی جان تک قربان کردیں، اسی طرح دوسرے ایسے ادارات بھی ہیں جن کے واسطے ممکن ہے کہ ہمیں قربانی کرنی پڑے؛ وہ ادارات ہمارا مذہب، ہمارا مدرسہ، ہمارا "دائرہ"، ہمارا اتحادِ تجارتی وغیرہ ہیں[۱۳]۔ جدید انفرادیوں کا یہ قول ہے کہ اگر مملکت اور ان قومی یا مذہبی عالمگیر ادارات کے مابین تصادم ہوجائے تو استقرائی اعتبار سے کوئی وجہ نہیں کہ مملکت ہی کو فوقیت حاصل ہو، اور موجودہ صورتِ حال میں ان ادارات کو نظر انداز کردینا کسی طرح سے مناسب نہیں ہے۔ جدید انفرادیوں کے نزدیک مملکت کی بابت زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ جملہ مجموعہ جاتِ انسانی کی ایک عہدیت یا وفاقیت ہے جس کے ذریعے سے ان ادارات کے مابین ایک قسم کی ترتیب و تنظیم پیدا ہوجاتی ہے؛ لیکن ان کے نزدیک اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مملکت کو فی نفسہٖ کسی قسم کا ایسا تفوق حاصل ہے جس کے باعث اسے ان ادارات کو فنا کرنے کا بھی اختیار حاصل ہو۔

---

[۱۲] جدید نظریوں کے متعلق جوڈ کی کتاب "زمانۂ حالیہ کے نظریاتِ سیاسی" Joad: Modern Political Theory نہایت بسیط اور پُر معلومات ہے۔

[۱۳] اس خیال اور اس کا نظریۂ اقتدارِ اعلیٰ سے جو تعلق ہے اس کے لئے دیکھو لاسکی: "مسئلۂ اقتدارِ اعلیٰ" Laski: The Problem of Sovereignty، باب ا۔

نراج ۔ اب انفرادیت کی انتہائی شکل یعنی نراج کے اصول پر نظر ڈالئے ۔ عام طور پر "نراج" کے معنی اعدامیت کے لئے جاتے ہیں، اور ان دونوں لفظوں سے شہنشاہیت پسندوں نے اپنا جو کام نکالا ہے ۔ اس کے باعث ہم انہیں بالالتزام انقلابی سمجھنے لگے ہیں ۔ جہاں کہیں کسی بدبخت نے کوئی بم پھینکا، جہاں کسی سیاسی جرم کا ارتکاب کیا گیا، بس "نراج" "نراج" کی صدائیں ہوا میں چکر لگانے لگیں، اور چونکہ عام طور پر اس قسم کے حالات سے کام نکالنا مقصود ہوتا ہے ۔ اس لئے کسی کو یہ سوچنے کی مہلت نہیں ملتی کہ آخر نراج کے معنی کیا ہیں اور یہ بم واقعی کسی نراجی نے پھینکا ہے یا اس کا مقصد کچھ اور ہے ۔ "نراج" کے معنی عدم حکومت کے ہیں، اور اس کے موید یہ چاہتے ہیں کہ انسانی قوائے ذہنیہ وجسمانیہ میں کچھ اس قسم کا ارتقا ہو جائے کہ جبر واکراہ بالکل غیر ضروری ہو جائے اور افراد و مجموعہ جات (افراد بدون کسی بیرونی دباؤ کے جملہ کاروبار زندگی انجام دے سکیں ۔ ان کے نزدیک نیابتی حکومت ایک بڑے بھاری مغالطے پر مبنی ہے، وہ یہ کہ سیاسیات میں اصول نیابت کا انطباق ممکن ہے، یا کوئی شخص کسی مصنوعی رقبے کی آبادی کا نائب بن سکتا ہے ۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی دانا و بینا کیوں نہ ہو، ہر ایک امر میں رائے دینے کا اہل نہیں ہوسکتا، نہ یہ ممکن ہے کہ "مختار" اپنے "اصل" سے ہر ایک معاملے میں استفسار کیا کرے ۔ اس کے ساتھ ہی موجودہ حکومت بے کار بھی ہے، اس لئے کہ تعلیم اور حفظان صحت ہی نہیں، بلکہ ملک کی حفاظت بھی اختیاری انجمنوں اور مجموعوں کے ذریعے سے کی جاسکتی ہے؛ مثلاً ان کا یہ قول ہے کہ تاریخ دنیا پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی حملہ آور اکثر ملک کی منظم فوجوں کے مقابلے میں ان پر سبقت لے جاتے ہیں، اور انہیں آخرکار شہریوں کے ایسے اختیاری مسلح گروہوں کے سامنے نیچا دیکھنا پڑتا ہے جو جگہ جگہ سے چھپ چھپ کر ان پر گولے برساتے ہیں ۔ بہرحال نراجیوں کے نزدیک اگر مملکت اور حکومت کا ہاتھ اٹھالیا جائے تو کاروبار اور مختلف امور کی کارفرمائی بالکل موجودہ زمانے کی طرح سے ہوتی رہے گی ۔ صرف فرق یہ ہوگا کہ ملک میں بجائے مقابلہ، عناد اور دشمنی کے محبت اور اتحاد واتفاق کا راج ہو جائے گا ۔ ان کے خیال میں حکومت کے فقدان کے باوجود ترتیب وتنظیم باقی رہے گی لیکن جبر کا عنصر بالکل اٹھ جائے گا ۔ ان کا سب سے بڑا گرو کروپوٹکن کہتا ہے[41] کہ تم اگر مجریط سے موسکو جاؤ تو تمہیں بیسیوں ملکوں اور شرکتوں کی ریلوں میں سفر کرنا پڑے گا جنہیں لاکھوں کروڑوں مزدوروں نے بنایا ہوگا، لیکن جن کی ہم آہنگی کے لئے کسی برسر اقتدار واحد قوت یا ادارہ کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی ان کے نزدیک فرد صرف اسی وقت آزادی کا دعویٰ کرسکتا ہے جب بساط سیاسی سے مملکت اور حکومت دونوں

---

[41] کروپوٹکن: "نراج کا فلسفہ اور اس کا مطمح نظر" Kropotkin: Anarchism its Philosophy & Ideal (ترجمہ انگریزی)

ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیں۔ ایسی حالت میں فرد کو مملکت اور سرمایہ دار دونوں کے جوئے سے آزادی حاصل ہو جائے گی اور امورِ ملکی ان کی بجائے اختیاری انجمنوں کے ذریعہ سے انجام پایا کریں گے۔

اتحادیت۔ اشتراکیت کی طرف رجوع ہونے سے پیشتر ہمیں ایک اور تحریک کا مفہوم سمجھنا ضروری ہے اور وہ اتحادیت ہے۔ اتحادیت کی ابتدا فرانس میں ہوئی۔ اس کا بانی میانی پرودھوں تھا جس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ دنیا کی جملہ حکومتوں میں دراصل طبقۂ اوسط یا طبقۂ اعلیٰ برسرِ اقتدار ہے، اور یہی دو طبقے ملک کی افزائشِ دولت میں کم سے کم حصہ لیتے ہیں[۵۱]۔ اس کے نزدیک واقعہ یہ ہے کہ وہی طبقہ جو پیداوارِ دولت کے لئے اپنا عزیز وقت اور اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے (یعنی مزدور) سیاسی حقوق سے ایک بڑی حد تک محروم ہے۔ اتحادی کہتے ہیں کہ حکومت کے تخیل کو بالکل غائب کر دیا جائے اور اُس کی جگہ تمام سیاسی قوت اتحاداتِ تجارتی کے ساتھ وابستہ ہو تاکہ مزدور ہی معاشرۂ سیاسی کے رہبر اور روح رواں ہو جائیں۔ معاشی اعتبار سے اتحادیت اشتراکیت کا عکس ہے، اس لئے کہ جہاں اشتراکیت میں مصارف کی اہمیت پر زور دیا جاتا ہے وہاں اتحادیت "آجر" کو معاشرہ کا اہم ترین عنصر قرار دیتی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق مرکزی روایات کے باعث ضرورت سے زیادہ یکسانی، روزمرہ کا بے جان چکر، جدت کا فقدان اور بے اعتباری کے احساسات نمایاں ہو جاتے ہیں جس سے معاشرہ کو صریح نقصان پہنچتا ہے۔ جہاں پارلیمنٹیں قائم ہیں وہاں مزدور فریق کے ارکان دراصل اپنے ہم خیالوں کے قائم مقام نہیں بلکہ اپنے اپنے حلقہ جاتِ انتخابات کے قائم مقام ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ بالکل دست و پا بستہ ہوتے ہیں اور مزدوروں اور آجروں کی بہبود کے لئے چاہیں بھی تو کچھ نہیں کر سکتے اتحادی جانتے ہیں کہ کسی ملک میں نسبتاً کم ایسے لوگ ہونگے جو اتحادیوں کے ہم خیال ہوں، لیکن اتحادی کہتے ہیں کہ عہدِ ارتقا میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کو راہِ راست پر لایا جائے جس کے لئے کسی کثرتِ رائے کی ضرورت نہیں بلکہ حکومت اور اصل داروں کو بالجبر "عمل براہ راست" یعنی ہڑتال، مقاطعہ، غیر ضروری تعویق کا وغیرہ کے ذریعے سے دباؤ ڈال کر اپنا کہا منوایا جائے۔

نراج کے نظریہ کو کسی نے تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا، اور اس کا سب سے بڑا سقم یہ معلوم ہوتا ہے کہ (جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے) بلاشبہ انسان خود غرض ہے، افراد اور مجموعوں کے باہمی اغراض میں یقیناً تصادم ہوتا رہتا ہے، اور اس تصادم کو روکنے کے لئے محض اختیاری انجمنیں اور اختیاری ادارات ہرگز موثر نہیں ہو سکتے

---

[۵۱] دیکھو لیوین: "فرانس میں اتحادیت" Levine: Syndicalism in France

اگر چوری کے انسداد کے لئے ایک انجمن، قاتل کو سزا دینے کے لئے دوسری انجمن، اور قرضہ کی ادائیگی پر مجبور کرنے کے لئے تیسری انجمن قائم کی گئی تو پھر جس انجمن کی قوت دوسری انجمنوں سے بڑھی ہوئی ہوگی وہی موجودہ حکومت کی جگہ لے لے گی اور دوسری "اختیاری انجمنوں اور اداروں" کو اپنا مطیع کر لے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں حاکمیت و محکومیت کے اصول بھرے ہوتے ہیں اور کسی نظریہ ساز کی تحریر یا محض عقیدہ پرستی کی وجہ سے اُس کی فطرت میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ یہی کیفیت اتحادیت کی بھی ہے۔ اتحادی چاہتے ہیں کہ تمام "اتحاداتِ تجارتی" باہم متفق ہوجائیں اور یہ جدید "وفاقیت" حکومت کی جگہ حاصل کرے۔ ظاہر ہے کہ جب اس وفاقیت کو حکومت کے اختیارات حاصل ہوجائیں گے اور وہ شہریوں سے اپنے احکام جبراً منوانے لگے گی تو پھر موجودہ حکومت میں اور اس میں کونسا ایسا بڑا فرق رہ جائے گا جس کی وجہ سے موجودہ حکومت کو تہ و بالا کرنے کی کوشش ضروری سمجھی گئی ہے۔

اشتراکیت۔ انفرادیت کا مفہوم سمجھنے کے بعد اشتراکیت کی طرف آیئے اور سب سے پہلے اشتراکیت کے ابتدائی نظریہ کو لیجئے۔ اشتراکیوں کا سب سے بڑا گرو اور اشتراکی نظریے کا موجد کارل مارکس ہے جس نے اپنی کتاب موسومہ "اصل داری" کو ۱۸۴۷ء میں جرمنی میں شائع کرایا[۱۶]۔ صنعتی و میکانیکی انقلاب کی وجہ سے ایک طرف تو دولت روز بروز نسبتاً کم تعداد لوگوں کے قبضے میں چلی جارہی تھی اور بڑی بڑی شرکتوں اور عظیم الشان کارخانوں کا دور دورہ شروع ہوگیا تھا، اور دوسری جانب اسی دولت کی وجہ سے اصل داروں کی پیٹھ بھاری اور بیچارے مزدوروں کی کم مائیگی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کارل مارکس نے انہیں اثرات کے تحت اپنی کتاب لکھی جس میں اُس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دنیا کے جملہ آلام و نقائص کا انسداد صرف اسی طرح ہوسکتا ہے کہ موجودہ معاشرہ کی ابتدائی بنیاد یعنی خانگی ملکیت کا خاتمہ کردیا جائے اور اس کی بجائے مشترکہ ملکیت کے اصول پر عمل کیا جائے۔ بلاشبہ ہر قسم کے کاروبار کے لئے اصل کی ضرورت ہے، لیکن اصل کی ملکیت افراد کی بجائے مملکت کے ساتھ وابستہ ہونی چاہیئے، جو افراد کی اجتماعی کیفیت ہی کا دوسرا نام ہے۔ مملکت کا مقصدِ اعظم یہ ہونا چاہیئے کہ اصل کو محض کسی چھوٹی سی جماعت کے فائدے کے لئے نہیں بلکہ تمام معاشرہ کی فلاح کی غرض سے استعمال کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب سرمایہ مملکت کے قبضے میں آجائے گا تو مملکت ہی اُسے کام میں لائے گی، جس کی وجہ سے مقابلہ جیسے نقصان رساں عنصر کا سدِ باب ہوجائے گا، اور بجائے چند چنے ہوئے لوگوں کے تمام معاشرۂ ملکی کو طرح طرح کے فوائد حاصل ہونگے۔ نہ صرف یہ بلکہ اشتراکیت کے رواج سے خود افراد

---

[۱۶] کارل مارکس "اصل داری" Karl Marks: Kapital (انگریزی ترجمہ)

کی عام اخلاقی حالت بھی سدھر جائے گی اس لئے کہ وہ محض اپنی ذاتی اغراض کو ملحوظ رکھنے کی بجائے ملک کے معاشری مفاد کے حصول میں کوشاں ہونگے۔ان تمام انتظامات کے واسطے مملکت کی دست اندازی لازمی ہے، اس لئے کہ وہ افراد کی فلاح و بہبود سے خود ان سے کہیں زیادہ واقف ہوتی ہے۔ان مقاصد کے حصول کے لئے حکومت کو جملہ عاملینِ پیداوار پر خاص نگرانی رکھنی پڑے گی، کارخانوں کا انتظام کرنا پڑے گا اور ہر شخص کے واسطے اس کے کام کے مطابق آرام و آسائش کا انتظام کرنا پڑے گا۔

اجتماعیت۔یہ تو ابتدائی اشتراکی نظریہ ہوا! لیکن پچھلے اسّی برس میں (بالخصوص جنگِ عظیم کے بعد) اس میں بہت کچھ تبدیلیاں اور اضافے ہوئے ہیں گو اب بھی ان سب کا دارومدار کارل مارکس کے خیالات ہی پر ہے جس خیال کا سب سے زیادہ تعلق ابتدائی اصول کے ساتھ ہے وہ اجتماعیت ہے، اور اس کے موید صرف یہ چاہتے ہیں کہ اشتراکی اصول کا اثر ہر ملک میں بتدریج پیدا کیا جائے تاآنکہ حکومت کی کل اشتراکیوں کے قبضے میں آجائے۔اس کے لئے مغربی یورپ کے ہر ملک میں باضابطہ اجتماعی سیاسی گروہوں کو منظم کیا گیا جن میں سے شاید سب سے پہلا گروہ جرمنی کی "انجمنِ مزدوراں" کی شکل میں نمودار ہوا جسے فرڈینینڈ لاسال نے چند سال پیشتر قائم کیا تھا، اور ۱۸۷۵ء میں آخر کار جرمانی دستوری اشتراکی گروہ کی بنیاد پڑی جس نے سولہ سال بعد یعنی ۱۸۹۱ء میں اپنے پیش نامہ کا اعلان کیا[۱]۔اس پیش نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فریق انقلاب پسند نہیں بلکہ حکومت میں اُس وقت تک ارتقا کا خواہاں ہے جب تک ملک میں اشتراکی خیالات پورے طور سے سرایت نہ کر جائیں۔اسی طرح انگلستان میں اشتراکی خیالات کی رہبری جارج برنارڈ شا اور فےبین سوسائٹی نے کی جس کے روحِ رواں مسٹر اور مسز سڈنی ویب ہیں[۲]۔ان کا مطمحِ نظر یہی رہا ہے کہ ایک طرف تو حتی الامکان لامرکزیت کے اصول کی ترویج کریں اور دوسری جانب جبری بیمہ، وظائفِ معمرین، کارخانہ داروں اور مزدوروں کی جبری پنچائت اور نگرانیِ کارخانہ جات کے اصول کے ذریعے سے مداخلتِ حکومت کے دائرے کو وسیع کریں۔یہی وہ طریقے ہیں جن کے ذریعہ سے اجتماعیوں کو مختلف ممالک میں لاثانی کامیابی حاصل ہوئی ہے اور ایک طرف تو ۱۹۱۹ء میں جمہوری جرمنی کا سب سے پہلا صدر وہاں کے اشتراکی گروہ کا رہبر فریڈرش ایبرٹ مقرر ہوتا ہے دوسری جانب ۱۹۲۴ء میں انگلستان کے مزدور فریق کا صدر ریمزے میکڈونلڈ

---

[۱] دیکھو کرکپ "تاریخِ اشتراکیت" Kircup: A History of Socialism

[۲] ۱۹۲۹ء کے وسط میں مزدور جماعت کی جو وزارت ترتیب دی گئی اس میں سڈنی ویب کو وزیرِ نوآبادیات بنایا گیا اور ملکِ معظم نے انہیں بیرنی کا رتبہ اور لارڈ پاسفیلڈ کا خطاب مرحمت کیا۔

خود شاہ جارج پنجم کے ہاتھ سے قلمدانِ وزارت حاصل کرتا ہے[۵۱۹]۔

اشتمالیت۔ اشتراکیت کا آخری اور سب سے اہم پیرایہ وہ ہے جسے اشتمالیت کا لقب دیا جاتا ہے، اور جس نے روس میں بولشویت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ بولشویت پر اس وقت بحث نہیں کی جائے گی بلکہ اس مخصوص طرزِ حکومت پر سیاسی فرق بندی کے سلسلے میں آئندہ غور کیا جائے گا؛ اس وقت صرف اس کے بنیادی اصول یعنی اشتمالیت کو بنظرِ غائر دیکھنا ہے۔ اجتماعیت کی طرح اشتمالیت کے پیرو بھی ایک مخصوص طرزِ کار کے ذریعہ سے اپنے مقصد کے حصول کے خواہاں ہیں۔ جس طرح اجتماعیت پسند محض ارتقا کے ذریعے سے اشتراکی کیفیت کو پیدا کرنا چاہتے ہیں اسی طرح اشتراکیوں کے نزدیک اشتراکی مقاصد کا حصول انقلاب اور طبقہ واری جنگ کے بغیر ممکن نہیں اس لئے آج دنیا کے اصل داروں اور سرمایہ داروں نے اپنی بنیاد کو اس درجہ مضبوط کر لیا ہے کہ وہ کسی حالت میں ملائمت سے راہِ راست پر نہیں آسکتے۔ ابتدائی اشتمالیوں میں جرمانی سیاسی فلسفی اینگلس کا نام نہایت ممتاز ہے، لیکن جتنے بھی اشتمالی گزرے ہیں ان سب میں ممتاز ترین شخص جس نے اصول اشتمالیت کی عملی ترویج[۵۲۰]

---

۵۱۹ انگلستان کی مزدور جماعت کی حیرت انگیز سیاسی کامیابی کا اندازہ مفصلہ ذیل جدول سے ہو جائے گا۔

انتخاباتِ پارلیمنٹ سنہ وار	دار العلوام میں مزدور فرق کے ارکان	دار العوام کے انتخاب میں مزدور فرق کے رائے دہندوں کی جملہ تعداد
سنہ ۱۹۰۰ء	۲	۶۲،۷۰۰
سنہ ۱۹۰۶ء	۲۹	۳،۲۳،۲۰۰
جنوری سنہ ۱۹۱۰ء	۴۰	۵،۰۵،۷۰۰
دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء	۴۲	۳،۷۰،۸۰۰
سنہ ۱۹۱۸ء	۵۷	۲۲،۴۵،۰۰۰
سنہ ۱۹۲۲ء	۱۴۲ (وزارتِ مزدوراں)	۴۲،۳۶،۸۰۰
سنہ ۱۹۲۳ء	۱۹۱	۴۳،۴۸،۴۰۰
سنہ ۱۹۲۹ء	۲۸۸ (وزارتِ مزدوراں)	۸۳،۷۴،۲۰۰

۵۲۰ دیکھو مارکس و اینگلس: "اعلانِ اشتمالیین"
Marks and Engels: The Communist Manifesto (Eng. Transl., Ch. Kerr, N.Y.)

کر کے اُس کی تاریخ میں گویا چار چاند لگا دیئے ہیں، لینن[۵۱] تھا جو ۱۹۱۷ء سے لے کر ۱۹۲۴ء تک مسلسل روس کا آمر اعظم رہا اور جو زمانۂ جدیدہ کے عظیم ترین انسانی قائدوں میں شمار کرنے کے قابل ہے۔ لینن کہتا ہے کہ یہ خیال محض خام ہے کہ جس طبقے کے قبضے میں صدیوں سے قوت واقتدار رہا ہو وہ بغیر فیصلہ کن جنگ کے اپنے اقتدار سے دست بردار ہو جائے گا، چنانچہ اس کی ضرورت ہے کہ جس طرح سے ہو سکے مزدور اور ملک کا محنتی طبقہ، جو اس وقت تک نہایت کس مپرسی کے عالم میں رہا ہے، جبرًا و قہرًا موجودہ سیاسی اختیارات اپنے قبضے میں کر لے اور انہیں خود اپنے مقاصد کے حصول کی غرض سے کام میں لائے۔ اشتراکی کہتے ہیں کہ یہ حکومت بلا شبہ محض ایک طبقہ واری جماعت پر مشتمل ہو گی اور صحیح معنی میں ملک کی قائم مقام نہیں ہو گی لیکن یہ طریقہ صرف اس لئے استعمال کیا جانا ضروری ہے کہ کسی نہ کسی طرح سے اصل داروں کا سیاسی و معاشی اجارہ منسوخ کر دیا جائے۔ زمانۂ موجودہ میں جتنی بھی بے اعتباری اور نقصِ امن نظر آتا ہے وہ سب عدمِ مساوات کی وجہ سے ہے، چنانچہ جب مکمل مساوات ہو جائے گی اور "حق بحق دار رسید" کے اصول کے تحت محنتیوں اور مزدوروں کو، جو اپنے پسینے کی کمائی سے اپنا پیٹ پالتے ہیں، جملہ گم شدہ حقوق مل جائیں گے، تو پھر ایسی سیاسی فضا پیدا ہو جائے گی جس میں جبر واکراہ کی حاجت نہ ہو گی اور اس طرح گویا بنی نوعِ انسان کو سیاسی نجات حاصل ہو جائے گی۔ جبر واکراہ کے فقدان کے ساتھ ہی معاشرۂ سیاسی یعنی مملکت کی بھی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ اس لئے کہ اس کا اصلِ اصول اقتدارِ اعلیٰ ہے اور اُس کی ضرورت صرف اس لئے داعی ہوتی ہے کہ مختلف طبقاتِ آبادی کے مابین توازن پیدا کیا جائے؛ جب طبقہ جاتِ آبادی ہی کا خاتمہ ہو گیا تو پھر مملکت یا معاشرۂ سیاسی کی کیا ضرورت باقی رہی۔ الغرض گو اشتراکیت اور انفرادیت کے مابین بعد المشرقین معلوم ہوتا ہے لیکن ان دونوں کا انتہائی نصب العین یہی ہے کہ ایسا زمانہ آجائے جس میں فرد کو کامل آزادی حاصل ہو اور کسی قسم کی بیرونی قوت یا اقتدار کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

اصولِ اشتمالیت کا تعین اور ضروریاتِ زمانہ کے اعتبار سے اس میں تغیر و تبدل ایک بین الاقوامی اشتمالی کانگریس کے ذریعے سے ہوتا رہا ہے جسے اصطلاح میں "بین الاقوامیہ" کہتے ہیں۔ اس بین الاقوامیہ نے اس وقت تک تین چولے بدلے ہیں۔ اس کا سب سے پہلا جلسہ سوئیزرستان کے شہر بازل میں ۱۸۶۹ء میں ہوا جس میں اشتمالیوں نے باکونن اور اُس کے نراجی پیروؤں کو اپنی جماعت سے نکال دیا اور اس طرح گویا یہ اعلان کر دیا کہ مداخلتِ حکومت کے متعلق ان دونوں جماعتوں کے مابین ایک اصولی فرق ہے، وہ یہ کہ جہاں نراجی گروہ حکومت کے وجود ہی کا مخالف ہے، وہاں دوسرا یعنی اشتمالیوں کا فریق حکومت کی مشین کو اپنے قبضے میں لا کر اس کے ذریعے سے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دوسری بین الاقوامیہ

---

[۵۱] لینن: "انقلاب طبقہ، سفل" Lenin: The Proletarian Revolution

کا انعقاد بلجیم کے شہر اینٹ ورپ میں ۱۸۸۹ء میں ہوا، اور اس میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب بھی کارل مارکس کے اصول کی لفظی و معنوی پابندی پہلے ہی کی طرح ضروری ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہونی چاہئے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس بین الاقوامیہ کا مسلک بالکلیہ ارتقائی تھا۔ اور اس میں انقلاب کو بہت ہی کم دخل تھا، لیکن اس کے انعقاد کی وجہ سے اشتراکی گروہ میں ایک قسم کا ہیجان پیدا ہو گیا اور مزدوروں کی انجمنوں میں تنظیم کی جو کیفیت پیدا ہوئی وہ برابر جنگِ عظیم تک جاری رہی۔ اس تنظیم کی وجہ سے اصل داروں اور سرمایہ داروں سے طرح طرح کی مراعات حاصل کی گئیں اور جنگِ عظیم کی ابتدا پر یہ محسوس ہونے لگا کہ شاید کارل مارکس کی پیش گوئی درست ثابت ہو گی اور اشتراکیوں کے مقاصد محض ارتقائی اور آئینی طریقوں سے حاصل ہو جائیں گے لیکن جنگ نے اشتمالیوں میں ایک خاص تہیج پیدا کر دیا اور اس کے بعد ہی ارتقائی اور انقلابی اشتراکیوں کے مابین گویا دیوارِ آہنی حائل ہو گئی؛ ارتقائی گروہ تو قومی حکومتوں کے ساتھ مل گیا اور انقلابی گروہ کے افراد مختلف ممالک کے مزدوروں اور محنتیوں کو اپنا بھائی بند سمجھ کر فی نفسہٖ جنگ اور اصولِ جنگ سے متنفر ہو گئے۔ ان کے اس میلان کے باعث ایک طرف تو ہر ملک میں ان پر تشدد ہونے لگا۔ اور دوسری جانب انہوں نے قومی حکومتوں کا ساتھ دینے سے منہ موڑ لیا۔ انہی اثرات کے ماتحت ۱۹۱۹ء میں (یعنی روس کے بولشوی انقلاب کے بعد) روس کے مرکز موسکو میں تیسری بین الاقوامیہ کا انعقاد ہوا، اور اس نے وہ اعلان شائع کیا جو تمام اشتمالیوں کا نصب العین ہے، یعنی مارکس اور اینگلس کے اصول کے ساتھ ہی ساتھ اس نے آخرکار اپنے قطعی طور پر انقلاب پسند ہونے کی قرارداد منظور کر لی۔

اگر اشتراکیت پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ تمام دوسری خیالی تحریکات کی طرح یہ بھی مغالطوں سے بھری ہوئی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں تین عاملینِ پیداوار (یعنی "زمین" "محنت" اور "اصل") میں سے ایک یعنی "محنت" پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ انفرادی حالات میں تو قیمت، نوعیت و مقدارِ پیداوار، تقسیمِ دولت اور دوسرے معاشی امور کا تعین خود بخود طلب و رسد کے قانون کی بنا پر ہوتا ہے لیکن جب مقابلہ ہی غائب ہو جائے گا تو پھر ان کا تعین بغایت دشوار ہو جائے گا۔ تیسرے جہاں مقابلہ نہ ہونے سے رشوت ستانی اور سازشوں کا بازار گرم رہے گا وہاں جب ذاتی بہبود اور ذاتی منفعت کا خیال نہ رہے گا تو افراد بے پروا ہو جائیں گے۔ ارسطاطالیس اپنے استاد حکیم افلاطون کی نظریۂ اشتراکیت پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب انسان کسی کام کو خود اپنا تصور کرتا ہے تو اس میں وہ شرکت اور ساجھے کے کام سے کہیں زیادہ دلچسپی لیتا ہے[۲۲]۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ زمانہ حال کے اشتراکی ہول

---

[۲۲] ارسطاطالیس "سیاسیات"، ۲، ۳، ۴ (ترجمہ انگریزی جوئٹ Aristotle's Politics, Transl. by Jowett

کے پیرو طبقہ داری حکومت کو محض ایک منزلِ ارتقا تصور کرتے ہیں اور اُن کا خیال ہے کہ اچھی طرح یا بری طرح کسی طرز پر ناہمواری اور عدمِ مساوات کو مٹا کر ایسا مکمل آزاد معاشرہ قائم کیا جائے جس میں مملکت یا حکومت کی ضرورت ہی نہ ہو؛ اس میں اور نراج میں مطلق کوئی فرق نہیں، سوائے اس کے کہ نراجی آج ہی سے مملکت اور حکومت کے خاتمے کے درپے ہیں اور اشتمالی بالآخر اسی نتیجے پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں آخری بات یہ کہنی ہے کہ روس میں اشتمالیت کی ترویج کو اب دس سال سے زیادہ گذر گئے، لیکن بجائے اس کے کہ فرد کو مملکت کے خلاف آزادی حاصل ہو، ہم دیکھتے ہیں کہ مملکت کا پنجہ تقریباً اتنا ہی بلکہ شاید اس سے زیادہ مضبوط اور دور رس ہے جتنا زاریت کے عہد میں تھا اور اشتمالیت کے مقصدِ اعلیٰ کا حصول پہلے سے بھی بعید تر ہوتا جاتا ہے۔

اعتدال پسندی۔ یہ قاعدہ ہے کہ جب تک کوئی اصول محض مجرد شکل اختیار کئے رہتا ہے اس وقت تک اس میں غالیت کا عنصر نمایاں رہتا ہے، لیکن جب وہ عمل میں لایا جاتا ہے تو ایک قسم کے اعتدال کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی حالت انفرادیت اور اشتراکیت کی ہے۔ کاغذی دلیل و استدلال اور بحث و تمحیص کے لئے ایک طرف ہربرٹ سپنسر اور کروپوٹکن اور دوسری جانب کارل مارکس اور اینگلس کے نظریے نہایت دل خوش کن ہیں، لیکن واقعات و حالات پر انطباق کرتے ہی ان کے پیروؤں کی غالیت کا کانٹا نکال کر پھینک دینا پڑتا ہے۔ جن ممالک میں انفرادی حکومت رائج ہے وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ بہبودِ عامہ و ضروریاتِ زمانہ کی خاطر مختلف شعبہ جاتِ حکومت میں اشتراکی اصول کو اختیار کر لیا گیا ہے اور روز بروز حکومت کا دائرۂ عمل وسیع تر ہوتا جاتا ہے؛ دوسری جانب روس میں، جہاں سنہ ۱۹۱۷ء سے اشتمالیت کا دور دورہ ہے، یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مکمل اشتمالیت کے ذریعے سے ارتقا کی "موجودہ منزل" بھی اُس وقت تک طے نہیں کی جا سکتی جب تک افراد کو تھوڑی بہت آزادی نہ دے دی جائے اور انفرادیت کے اصول پر ایک حد تک عمل نہ کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ انفرادی ہو یا اشتراکی، دونوں کے مابین جو فرق ہے وہ محض طرزِ کار کا ہے، اور اگر وہ اپنے وطن کی بہبود چاہتے ہیں تو موقع و محل کے اعتبار سے اس عظیم الشان مقصد کے حصول کی غرض سے انہیں اپنے اصول میں کمی بیشی کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آزاد و متمدن ممالک کی حکومتوں نے اپنے سر یہ فرض لے لیا ہے کہ نہ صرف اسی قسم کے کاموں کو اپنے ذمہ رکھیں جیسے ڈاک اور تار، بلکہ اُن میں سے اکثر میں ریلوں کو یا تو حکومت براہِ راست چلاتی ہے، ورنہ اگر وہ خانگی شرکتوں کے ماتحت ہیں تو ان پر نگرانی رکھتی ہے۔ پھر ملک کی معاشی بہبود بھی

نظر انداز نہیں کی جا سکتی جس کے لئے بیرونی مال پر طرح طرح سے محصول لگا کر ملکی صنعت و حرفت کو مامون کیا جاتا ہے، حکومت کی طرف سے کارخانوں کی سرپرستی کی جاتی ہے اور وقتاً فوقتاً صنعتی نمائشوں کے ذریعے سے دنیا کی توجہ ملکی پیداوار اور مصنوعات کی طرف مبذول کی جاتی ہے۔ زمانہ حال کی "انفرادی" حکومت کی دلچسپی یہیں نہیں رکتی، بلکہ خانگی امور اور خاندان تک کے معاملات میں وہ مداخلت کرتی ہے، مثلاً بعض ممالک میں لوگوں کو جبراً اپنی زندگی کا بیمہ کرانے پر مجبور کرتی ہے، غربا کو ایک خاص عمر سے تجاوز کرنے پر افلاس سے بچانے کی غرض سے ان کا وظیفہ مقرر کرتی ہے، اور مختلف کارخانوں میں ایک خاص مقدار سے زیادہ کسی کو کام نہیں کرنے دیتی محنت اور مزدوری کے معاملات میں حکومت کی مداخلت کا اصول اس قدر مسلمہ ہے کہ جب ۱۹۱۹ء میں انجمن اقوام کی ابتدا ہوئی تو اُس کے عہدنامے میں ایک دفعہ یہ بھی رکھی گئی کہ "جہاں کہیں روزانہ آٹھ گھنٹے یا ہفتہ وار ۴۸ گھنٹے کی محنت کا قاعدہ مقرر نہیں ہے وہاں کی حکومت کو اس قسم کے طرزِ کار کو رواج دینا چاہئے"[۲۳]، اور اسی طرح بعض جدید دساتیر (مثلاً جرمانیہ کے دستور) میں مزدوروں کی بہبود کا خیال بہت کچھ پیش پیش نظر آتا ہے[۲۴]۔

اُدھر روس کے بولشویوں کو بھی محض منطقی اشتمالیت کی سطح سے اترنا پڑا ہے، اور جدید معاشی طرزِ عمل کی ترویج کے بعد بہت سے انفرادی اصول کو روس میں رائج کیا گیا ہے[۲۵]۔ حقیقت یہ ہے کہ خود لینن کی حیات ہی میں یہ ثابت ہو گیا تھا کہ مجرد اشتراکیت میں جو نقائص ہیں ان کے باعث روز بروز ابتری پیدا ہونا لازمی اور لابدی ہے، چنانچہ اوائل ۱۹۲۱ء ہی میں کاشتکاروں سے غلہ کی بجائے لگان کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ اور مئی ۱۹۲۱ء میں لینن نے یہ اعلان کر دیا کہ ہم اصل داری کو روک نہیں سکتے لیکن اسے مملکتی اصل داری کے راستے پر لگا سکتے ہیں۔ دو ماہ بعد کارخانے اور گرنیاں کرایہ پر دی جانے لگیں اور رفتہ رفتہ باضابطہ دکانیں بھی کھلنے لگیں۔ انفرادی اصول نے بالآخر اس قدر ترقی کی کہ کچھ ہی عرصہ کے بعد اراضی باضابطہ بارہ سال کے لئے پٹے پر دی جانے لگی اور بعض سونے کی کانیں بھی قدیم شرکتوں کو پٹے پر دے دی گئیں۔

الغرض اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کسی ملک میں وہی حکومت کامیاب ہو سکتی ہے جو اس کے حسبِ حال ہو، اور محض عقیدہ پرستی اور عملی سیاسیات میں بہت بڑا فرق ہے۔ آیندہ باب میں انفرادی حکومتوں کے معمولی فرائض و اختیارات پر تبصرہ کیا جائے گا۔

ہارون خاں شروانی

---

۲۳ عہدنامہ انجمنِ اقوام میں محنت کے متعلق دفعہ ۲۳ ملاحظہ کی جائے ۲۴ دستورِ جرمنی ۱۹۱۹ء باب ۱۵۷۔

۲۵ دیکھو "سالانہ رجسٹر" ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء Vide Annual Register 1920 & 1921

اصطلاحات وغیرہ

Wealth	دولت	Producer	آجر
Czarism	زاریت	Director	آمر
Land	زمین	Trade Unions	اتحاداتِ تجارتی
Switzerlad	سوئیزرستان	Syndicalist	اتحادی
Political Equilibrium	سیاسی توازن	Syndicalism	اتحادیت
Political Party	سیاسی فریق	Monopoly	اجارہ
Company	شرکت	Collectivism	اجتماعیت
Consumer	صارف	Voluntary	اختیاری
Class	طبقہ	Institutions	ادارات
Proletariat	طبقہ اسفل	Inductive	استقرائی
Class War	طبقہ واری جنگ	Socialism	اشتراکیت
Agents of Production	عاملینِ پیداوار	Communism	اشتمالیت
Dogmatism	عقیدہ پرستی	Capital	اصل
Direct Action	عمل براہِ راست	Capitalist	اصل دار
Confederation	عہدیت	Relative	اضافی
Madrid	مجریط	League of Nations.	انجمنِ اقوام
Group	مجموعہ	Individualist	انفرادی
Labour	محنت	Individualism	انفرادیت
Agent	مختار	Bolshevism	بولشویت
Human Society	معاشرۂ انسانی	"The Internationale"	بین الاقوامیہ
Economic	معاشی	Mercantilism	تجاریت
Competition	مقابلہ	Distribution of Wealth	تقسیمِ دولت
Boycott	مقاطعہ	Conscription	جبری بھرتی
Anarchism	نراج	Compulsary Insurance	جبری بیمہ
Old Age Pensions	وظائفِ معمرین	Electoral Districts	حلقہ جاتِ انتخاب
Strike	ہڑتال	Private Property	خانگی ملکیت
		Club	دائرہ

نواہائے راز

تم مونس و غمخوارِ دل و جانِ حزیں ہو
ہوتا ہے فلک مجھ سے اگر برسرِ کیں، ہو

اُس رُخ کے تصوّر سے فراغت نہیں اک دم
تم دُور ہو آنکھوں سے مگر دل کے قریں ہو

ہرچند نہیں ربط مرے جسم کو جاں سے
تم ہی ہو مری جان، مری جان تمہیں ہو

بستے ہو مرے دل میں کم آمیز ہو پھر بھی
رہتے ہو مری آنکھ میں اور پردہ نشیں ہو

الفت ہے مرا دیں، وفا ہے مرا ایماں
تم ہی ہو مرا دیں، مرا ایمان تمہیں ہو

تم زینتِ گیتی ہو، تم آرائشِ جنّت
بے شبہ تمہیں خاتمِ ہستی کا نگیں ہو

گھر گھر میں ہے چرچا مری وارفتہ دلی کا
اے کاش تمہیں بھی مری الفت کا یقیں ہو

حامد علی خاں

ڈارون

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ! کہ من چیستم
موجِ زخود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر میروم گر نہ روم نیستم

یوں تو جس کے بدن میں روح ہے زندہ کہلاتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ زندگی عمل کا دوسرا نام ہے۔ کیونکہ اگر کالبدِ خاکی اور روح کی عارضی مصاحبت ہی کا نام زندگی ہو، تو ایسی زندگی کو دور سے ہمارا سلام! عمل ہی کی جاودانی ضیاپاشی ہے جس نے صدہا ہستیوں کو موت کی "تاریکیٔ غفیر" میں بھی روشن سے روشن تر بنا دیا ہے! اور آج ہم نہایت احترام کے ساتھ اُن کا نام لیتے ہیں اور اُن کے کارناموں پر فخر کرتے ہیں۔ جو لوگ مستقل مزاجی سے جادۂ جد وجہد پر گامزن رہتے ہیں، یقیناً کامیابی و فتح انہیں کا حق ہے "من جد وجد" پر دل سے یقین رکھنے والے ہمیشہ شادمانی و کامرانی سے دوچار ہوتے ہیں اور اپنی مساعیٔ پیہم سے منزلِ مقصود پر پہنچ جاتے ہیں۔ عمل ہی کے خوشگوار نتائج ہیں کہ نپولین، شیکسپیئر، فردوسی، غزالی، فاروق، نیوٹن، سرسید، کالیداس وغیرہ ہزاروں ہستیاں حیاتِ جاوید حاصل کر چکی ہیں۔ فی الواقع کوشش، گو اس کے نتیجے تیر بہدف نہ ہوں، ایک مستحسن مشغلہ ہے۔ ڈارون نے اپنی تمام عمر علمی تحقیقات میں صرف کر دی، اپنے جدید نظریہ سے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا اور گو سائنس کے ماہرین اس کے نظریۂ "ارتقا" کو غلط ثابت کر رہے ہیں تاہم وہ قابلِ وقعت ہے کہ اُس نے اپنی ان تھک کوششوں کی ایک درخشاں مثال قائم کر دی ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ عمل کے ذریعہ سے انسان حیاتِ جاوید حاصل کر سکتا ہے۔ انگریزی مدارس کے طلبہ ڈارون اور اس کے نظریۂ ارتقا سے ضرور آشنا ہونگے آج ہم بر سبیلِ اختصار ڈارون کے حالاتِ زندگی ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

ڈارون ۱۲۔ فروری ۱۸۰۹ء کو بمقام شروزبری پیدا ہوا تھا۔ اس حساب سے ڈارون کو پیدا ہوئے ایک سو بیس برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کا باپ مقامِ مذکور میں طبابت کیا کرتا تھا۔ ڈارون میں جو قابلِ توصیف ذہانت اور اشتیاقِ تحصیل تھا، وہ دراصل اسے میراث میں ملا تھا۔ والد کی جانب سے وہ شہرۂ آفاق عالم اریزمس ڈارون کی اولاد میں سے تھا اور والدہ کی طرف سے اُسے جوشیا وجوڈ کی ذریات میں ہونے کا فخر حاصل تھا۔ یوں تو علم و فن کے ہر شیدائی کو صدقِ شوق کی وجہ سے مقصد برآری میں سہولت بہم پہنچ جاتی ہے مگر قلیل وقت میں بہت کچھ

چارلس ڈارون

CALCUTTA
ART PG WORKS
LAHORE

حاصل کرلینا بسا اوقات گردوپیش کے ماحول کا مرہونِ منت ہوا کرتا ہے۔ اسی شاندار ماحول میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی وجہ سے اُسے اپنے علمی کارناموں کے اظہار کے لئے اور تحقیق و تفتیش کے شوق کو پروان چڑھانے کے لئے کافی مواقع بہم پہنچ گئے تھے۔ پس اس کے فطری شوق نے فطری ماحول کے زیرِ اثر وہ کر دکھایا کہ باید و شاید۔

اُس نے ابتدائی تعلیم اپنے ہی قصبے میں حاصل کی۔ خوش نصیبی سے ڈارون کو قابل مصنف و لائق عالم بشپ بٹلر کا سایہ نصیب ہوگیا، بدیں سبب وہ اپنی جوانی کے تشویشناک و تغیر خیز زمانہ میں بھی جادۂ اخلاق سے نہ ہٹا۔ اس کے علاوہ بری صحبت کے زہریلے اثر سے بھی وہ مامون رہا۔ ۱۸۲۵ء میں ڈارون مزید تعلیم کے حصول کی خاطر جامعۂ ایڈنبرا میں داخل ہوگیا۔ یہ وہی یونیورسٹی ہے جہاں اس کے فاضل دادا اریزمس نے تعلیم حاصل کی تھی۔ ڈارون یہاں ۱۸۲۶ء کے آخر تک تعلیم حاصل کرتا رہا۔ یہاں ڈارون نے اپنے فطری کمالات کا بدرجۂ اتم اظہار کر کے بہت بڑی ناموری حاصل کرلی، ۱۸۳۱ء میں بی، اے کی ڈگری حاصل کی اور ۱۸۳۷ء میں ایم اے کا ڈپلوما نہایت سرفرازی کے ساتھ حاصل کرلیا۔ بی اے اور ایم اے کے درمیان جو مدتِ مدید حائل نظر آتی ہے، اسے ڈارون نے رائگاں نہیں جانے دیا، بلکہ اسی عرصہ میں اُس نے وہ اہلیت و مہارتِ تامہ بہم پہنچائی جس پر اس کی آیندہ کی حیرت انگیز و انقلاب زا شہرت و ناموری کی مستحکم عمارت بشان و جلال قائم ہوئی۔ اسی زریں وقت میں اُس نے علمی تحقیقات میں ایسی نمایاں جد و جہد کی کہ علمی مسائل کے عقدہ ہائے لاینحل اس کے سامنے کھل گئے اور وہ مسرت آگین و امید افزا کوششوں کے ساتھ اپنے علمی کارناموں کی جلا میں منہمک ہوگیا۔

ڈارون کو لومڑی کے شکار کا بڑا شوق تھا۔ بعض کا قول ہے کہ انہیں شکارگاہوں نے اس کی قوتِ مشاہدہ میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ ۱۸۳۱ء میں اس کی زندگی کا اہم ترین واقعہ پیش آیا؛ اس سال آنجہانی ملکہ وکٹوریا کا جہاز "بیگل" کپتان فٹنز رائے کی زیرِ نگرانی ساری دنیا کی سیاحت کے لئے تیار ہوا۔ کپتان موصوف نے جہاز کا ایک کمرہ اس شخص کے لئے مقرر کردیا تھا جو ماہرِ فطرت ہو۔ بھلا ایسے موقع پر ڈارون کے سوا کون سی ہستی میدانِ مقابلہ میں آسکتی تھی؟ جہاز مذکور ۲۷ دسمبر ۱۸۳۱ء کو انگلستان سے روانہ ہوا اور ۲۸ اکتوبر ۱۸۳۶ء میں واپس آپہنچا۔ اس عرصہ میں ڈارون نے تحقیقِ فطرت و مشاہدۂ قدرت کے شعبوں میں جو جو تحیر خیز کارنامے انجام دیئے وہی درحقیقت اُسے حیاتِ جاوید بخشنے کے ذمہ دار ہوئے۔ ڈارون سے پہلے اسی غرض کی تکمیل کے لئے بہت سی سیاحتیں ہوئیں، مگر ڈارون کی انفرادی مساعی سب پر سبقت لے گئیں۔

اتنے گرانبہا تجربات حاصل کرنے کے بعد ڈارون نے ایک نہایت مفید کتاب Nationalist's Voyage Round the World لکھ کر سائنس کی دنیا میں ایک زبردست گھماگھمی پیدا کردی۔ منجملہ دیگر خوبیوں کے کتاب مذکور کی امتیازی شان یہ ہے کہ اس میں سائنس ایسے یابس مضمون کو ایسا دلکش و دلچسپ جامہ پہنایا ہے کہ ایک شوقین طالب علم ڈارون کے کمالات کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ڈارون نے اپنی کتاب میں سائنس کی اصطلاحات سے حتی الامکان اجتناب کیا ہے اور یہی خوبی اس کی دوسری کتابوں میں جلوہ گر ہے۔

مذکورالصدر سفر کے اہم ترین نتائج میں اول نمبر اس کے نظریۂ ارتقا کا ہے۔ پہلے پہل یہ نظریہ ڈارون کے داوا کے حاشیۂ دماغ میں رونما ہؤا تھا، مگر یہ ڈارون ہی تھا جس نے اسے حدِ کمال پر پہنچا کر سائنس کے کیمپ میں ہلچل ڈال دی۔

۱۸۳۹ء میں اُس نے اپنی ماموں زاد بہن ایما ویجوڈ سے شادی کرلی اور ۱۸۴۲ء میں کینٹ میں بود و باش اختیار کی اور وہیں اس کی وفات ہوئی۔

اس کے اخلاق و عادات نہایت معصومانہ سادگی پر مشتمل تھے۔ ان میں ایسا جادو بھرا تھا کہ ہر کس و ناکس اس کا گرویدہ نظر آتا تھا۔ اس کی رفتار، خیالات اور گفتگو میں لطافت، نفاست حیا اور پاکیزگی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ باوجودیکہ وہ عالم متبحر تھا، اسے اپنے فضل و کمال کا ذرہ برابر بھی گھمنڈ نہ تھا اور در اصل انہیں خوبیوں کی وجہ سے اس نے ہر شخص کا دل موہ لیا تھا۔ ڈارون ہر ایک کی بات بخندہ پیشانی سنتا اور ہر ایک کی امداد کے لئے تیار ہو جاتا تھا۔

باوجودیکہ ڈارون کا نظریہ غلط ثابت کیا جارہا ہے، اس کے نظریہ نے تحقیقات و تفتیشات کا راستہ صاف کردیا ہے اور سائنس کے متعدد اہم اور دقیق مسائل کو حل کر کے صدہا عوائق کا سدباب کردیا ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جس پر ڈارون کی تحقیقات کا اثر نہ پڑا ہو: مذہب، اخلاق، تعلیم، قانون وغیرہ۔ ڈارون کا سب سے زیادہ اثر جرمنی پر پڑا ہے، جہاں اس کے نام لیواؤں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

ڈارون آج دنیا میں نہیں ہے، مگر اس کے کارنامے زندہ ہیں اور ایک رعب پاش صدا کے ساتھ نغمہ سرا ہیں کہ

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اکبر آبادی

تم میرے دل میں ہو

وہ پہاڑوں پر زعفران کے مہکتے ہوئے کھیتوں کے پاس رہا کرتی تھی ―― اُس کی جھونپڑی کے نزدیک ایک چھوٹی سی ندی متبسم نغمہ پیدا کرتی، ―― اور قدیم درختوں کے سایہ میں سے گذر کر بہتی تھی۔ عورتیں وہاں اپنے مشکے پانی سے بھرنے آتیں، اور مسافر وہاں بیٹھ کر سستاتے۔ وہ ندی کے نغموں کے ساتھ سُر ملاتی، اور اس کی ہم آہنگی میں محوِ خواب ہو جاتی،

ایک شام اجنبی برف آلود چوٹیوں میں سے گزر کر آیا۔ اس کے لمبے لمبے بال مست سانپوں کی طرح بل کھاتے ہوتے تھے ―― ہم نے تعجب سے پوچھا تم کون ہو؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا ―― وہ پُر شور ندی کے کنارے بیٹھ گیا اور خاموشی سے اُس کی جھونپڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ ہمارے دل خوف و ہراس سے کانپ اُٹھے ―― اور جب رات کی تاریکی نے چمکدار برف کے تودوں کو ہماری نگاہوں سے اوجھل کر دیا، تو ہم اپنے اپنے گھر واپس آگئے۔

دوسرے دن جب علی الصباح عورتیں دیودار کے درختوں میں سے بہنے والی ندی پر پانی بھرنے آئیں، تو اس کی جھونپڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا ―― مگر اس کی قمری کی مانند شیریں آواز جا چکی تھی اور اس کا روشن چہرہ کہیں بھی نہ تھا۔ اُس کی خالی بالٹی ایک کونے میں رکھی تھی، اور اس کا چراغ ایک طاق میں پڑا دم توڑ رہا تھا ―― کوئی نہیں جانتا کہ صبح ہونے سے قبل وہ اجنبی کے ساتھ کہاں چلی گئی تھی۔

جیٹھ کا مہینہ آگیا ―― سورج تیز ہو گیا اور برف پگھلنے لگی۔ ہم چشمے کے کنارے بیٹھ گئے اور روتے رہے، ہم نے کہا "آہ! کیا کوئی ایسا ہی چشمہ اُس سرزمین میں بھی ہے جہاں وہ چلی گئی ہے اور جہاں وہ اپنے خالی برتن سرد اور پاک پانی سے بھر سکتی ہے؟" ہم نے ایک دوسرے سے مایوسی کے لہجہ میں پوچھا "کیا ان پہاڑوں سے پرے بھی کوئی دنیا ہے؟"

گرمی کی رات تھی، ٹھنڈی ہوا جنوب کی طرف سے آرہی تھی: میں اس کی کٹیا میں بیٹھا اس کے بے جلے چراغ کو دیکھ رہا تھا۔ یکایک میرے سامنے سے پہاڑ کپڑے کے پردوں کی طرح اٹھ گئے ―― آہ یہ تو وہی چلی آرہی ہے ―― "میری بچی تم اچھی تو ہو؟ ―― مگر تم اس کھلے ہوئے آسمان کے نیچے سوتی کہاں ہوگی؟ اور آہ! ہماری ندی اب تمہاری پیاس نہیں بجھا سکتی۔"

"یہاں وہی آسمان ہے" اُس نے کہا "صرف یہاں اس کو محبوس کرنے کے لئے پہاڑوں کے سلسلے نہیں ہیں۔ یہاں بھی ندی ہے، مگر فرق صرف اتنا ہے کہ وہ بڑھ کر دریا بن گئی ہے۔ زمین بھی وہی ہے صرف پھیل کر میدان ہو گئی ہے۔"

"وہاں سب کچھ ہے بس ہم نہیں ہیں" میں نے آہ بھر کر کہا۔ وہ ایک غمزدہ طرز سے مسکرائی "تم میرے دل میں ہو" ―― میں چونک کر جاگ اٹھا ندی کی آواز اور دیودار کے درختوں کی سرسراہٹ میرے کانوں میں آرہی تھی۔

(ترجمہ) معین الحق حقی

زیتا

زندگی کی ناقابلِ ملامت جفاؤں میں سے ایک یہ ہے کہ چاء پیو، کیک کھاؤ اور ہاں میں ہاں ملاؤ۔ یہ ایک مذہب ہے اور اس کی نماز یہ ہے کہ چار گول کرے میں (چاہے وہ چوکھونٹا ہی کیوں نہ ہو) پی جائے اور اس وقت کا بے تابی سے انتظار کیا جائے جب اس نماز کی امام مسکرا کر پوچھے کہ مصری کی ڈلیاں ایک کہ دو؟

جو لوگ اس مذہب کے پکے نمازی ہیں انہیں شاید ایک جماعت کی سوانح عمری کے ایک جزو میں کچھ دلچسپی ہو۔ وہ سوانح عمری یہ ہے۔

ایک کمرے میں چار تھی، میزیں تھیں، سامانِ آرائش بہتر سے بہتر، چند لیڈیز، ایک پرکالۂ لیاقت زیتا اور کچھ غیر ضروری بھتنے۔ بھتنوں کو معاشرتی اصطلاح میں جنٹلمین کہا جاتا ہے مگر ایک کی نکٹائی گر رہی تھی (آپ ان ہی کے مداحوں میں سے تھے) ایک حضرت کے استرے اور ٹھوڑی میں روزانہ ناتمام بحث کے آثار نمایاں تھے۔ ایک نوخیز شباب کے نشے سے لڑکھڑا رہے تھے۔ ایک کابل الوجود کو سفید بالوں کے لئے سیاہ بوٹ پالش میسر نہ ہوا تھا۔ غرض یہ کہ ان بھتنوں کو جنٹلمین کہنا اس لفظ کی آبرو کھونا ہے مگر چونکہ جنٹلمینوں کے بغیر یہ نماز ادا نہیں ہو سکتی یہ تھے اور ضرور تھے۔ یہ تھا وہ مجمع یا جماعت جس میں ایک شخص نے زیتا کی لیاقت سے تنگ آکر اسے یہ دھمکی دی تھی کہ "کسی رسالے میں تمہاری خبر لوں گا"

زیتا نے اس وقت تو کچھ نہ کہا مگر دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ آخر یہ شخص کیا لکھ سکتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ میری زبان ماسکو کو سبق آموز ہے یا یہ کہ میرے جذبات میرے ماحول سے ایک صدی مستقبلانہ ہیں یا یہ کہ میں اسی کم سنی میں زندگی کے بہترین انعاموں کو پرکھ کر رد کر چکی ہوں! لکھ دے، ایک دفعہ نہیں بلا سے سو دفعہ لکھ دے۔ اول تو کوئی شائع نہیں کرے گا اور کرے گا تو پڑھنے والے کیا خاک سمجھیں گے۔ یہ فیصلہ کر کے زیتا نے اس گفتگو کو دل سے محو کر دیا۔

(۲)

جس شخص نے زیتا کو مذاق مذاق میں یوں دھمکایا تھا اس کا اس وقت تک تو خیال صرف یہ تھا کہ گول کمرے کی چلتی چلاتی باتوں میں زیتا کے علمی تیر و تفنگ بے محل ہیں۔ اس لیاقت کی تیلی کو چاہیئے کہ اپنے ہم پلہ

کسی پروفیسر سے بحث کرے۔ خواہ مخواہ ہم واجبی واجبی پڑھے لکھوں سے سنا پڑا کرے مگر بعد میں جب اُس نے غور کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ معجزہ جس کا نام زینا ہے تنقید سے بالاتر ہے۔ اگر ہندوستان کے نصیب نیک ہیں تو یہ کراماتی شعلہ بھبھوکا ہزاروں دقیانوسی اوہام کو خاک سیاہ کر دے گا۔ اس نتیجہ پر پہنچ کر یہ شخص بھی اس گفتگو کو بھول گیا۔

(۳)

. . . . . نے بھی یہ دھمکی سنی۔ اس کا لطف بھی اٹھایا مگر عمیق ندیوں میں زمانہ کی ہوائیں شور نہیں پیدا کر سکتیں۔

اوروں کو زینا سے صرف محبت ہے۔ . . . . . کو زینا سے عشق ہے اور ان کی دنیا بھر کی اچھی خواہشیں زینا کے لئے وقف ہیں۔ وہ زینا کی لیاقت پر نازاں بھی ہیں اور اس سے ترساں بھی۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگیں کہ کاش زینا کی لیاقت بجائے شعلہ بن کر بھڑکنے کے پھول بن کر کھلے۔ یہ دعا مانگ کر وہ بھی اس بات کو بھول گئیں۔

(۴)

گول کمرے میں (جیسا گول کمروں کی زندگی کا تقاضا ہے) دھیمی دھیمی سے آوازیں سنائی دیں کہ آؤ تاش کھیلیں میز کھسکنے لگے، کرسیاں وقار سے جمنے لگیں، بکس میں سے تاش نکلے۔ ادھر اُدھر سے پتے تراشنے کے لئے ہاتھ بڑھے اور جب یہ فیصلہ ہو گیا کہ کون کس کا آڑی ہو تو پتوں کی تقسیم کی طیاری ہوئی۔

(۵)

پتوں کی سرسراہٹ کی آواز سن کر تین فرشتے (وہ سماوی مہمان جو مسلمان گھروں میں اب تک آتے جاتے رہتے ہیں) گول کمرے سے نکل کر باہر چمن میں گلگشت کرنے لگے (مسلمان فرشتوں کو اب تک تاش کے پتوں سے نفرت ہے) اور یوں باتیں کرنے لگے۔

ایک فرشتہ۔ تم نے زینا کی بے نیازی ملاحظہ کی؟ یوں سمجھتی ہے گویا زندگی کی تمام طاقتوں پر حکمران ہونا اور رہنا اس کے اپنے بس کی بات ہے۔

دوسرا فرشتہ۔ ہاں اور . . . . . کی زیر لب دعا سنی؟ بچاری یہ تصور کئے بیٹھی ہیں کہ نیک ہونا، ہمدرد خدمت گذار ہونا گویا قسمت کو خرید لینا ہے۔

تیسرا - اور اس خود پرست کو نہ دیکھا ؟ عجب انسان ہے - یہ خیال کرتا ہے کہ کسی بات کی ماہیت کو سمجھ لینا گویا افعال پر حاوی ہونا ہے -

دوسرا - سچ پوچھو تو وہ بچارا سب سے زیادہ قابلِ رحم ہے سمجھ اس میں ہے مگر قدرت نہیں - اس کے سارے جسم میں صرف آنکھیں تعلیم یافتہ ہیں اور جدھر وہ چل نکلیں وہیں حضرت کا دل و دماغ بھی حاضر ہے - ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے اور دعویٰ یہ کرتا ہے کہ میں ماہرِ حسن ہوں -

پہلا - ان باتوں کو چھوڑو - یہ بتاؤ کہ کیا ہم زینیا کی کچھ مدد کر سکتے ہیں اور اگر کر سکتے ہیں تو کیا ہمیں مدد کرنی چاہئے ؟

دوسرا - ہاں ضرور کرنی چاہئے -

تیسرا - اچھا میں یہ کروں گا کہ وہ سو رہی ہو گی تو میں چپکے سے اس کی روح کو شفق کی ندی میں دھولاؤں گا بہتر سے بہتر گلرنگ روح میں اُسے لپیٹ دوں گا -

پہلا - شاباش ، مگر دوست کیا تمہیں بنی آدم کی اس حماقت پر ہنسی نہیں آتی کہ سب کے سب یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ روح انسان کے اندر ہوتی ہے - عجب اُلّو ہیں - اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جسم روح کا جامہ نہیں بلکہ روح جسم کا جامہ ہے میلے ہاتھوں ، ناپاک نگاہوں سے اس لباس کو چاک کرتے رہتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ روح تو اندر ہے اور مامون ہے -

دوسرا - پھر تم نے وہی انسانوں پر تنقید شروع کی ، یہ کہو کہ زینیا کے لئے تم کیا کرو گے ؟

پہلا - دوست کچھ سمجھ میں نہیں آتا کسی انسان کی مدد کرنا عذاب خریدنا ہے - انسان کو تو اگر خدائی دے دو تو اسے بھی خوار کر دے گا -

تیسرا - اب تم باتیں نہ بناؤ - یا تو ہمارے ساتھ نہ آنا تھا یا آئے ہو تو کچھ کر کے دکھاؤ - خود ہی تو تم نے مدد کا سوال نکالا تھا -

پہلا - سچی بات یہ ہے کہ میری زینیا کی نسبت اتنی بلند رائے ہے کہ میں اسے لیاقت اور نیکی کے زہر سے بچانا چاہتا ہوں - اس کی بہترین مدد یہ ہے کہ میں اسے شک دے دوں - اعلیٰ سے اعلیٰ خوشی کے موقع پر بھی وہ شک سے آزاد نہ ہو - کبھی کبھی خود اپنے آپ پر شک کرنے لگے - اپنے شک پر شک کرنے لگے - اس قسم کے اضطراب اور کشمکش میں گرفتار رہے کہ یہی کشاکش اُس کا نغمہ ہو - موسیقی زندگی کا بہترین عکس ہے دیکھے بعد دیگرے سروں کا پیدا ہوتے کے ساتھ ہی مرنا اس فوری زیست و موت کے سلسلۂ تلاطم کا نام راگ ہے ، میں چاہتا ہوں کہ زینیا کے شکوک کا ایک دوسرے کو قتل کر کے پھر پیدا ہوتے رہنا اس انداز سے ہو کہ میرا دیا ہوا شک وہ گز ہو جو زینیا کی دلربا سے نازکے سُر پیدا کرتا ہے -

دوسرا۔ تم اسے ثنک دوگے تو میں اسے امید کی توسِ قزح دوں گا۔ اس میں جھول جھول کر وہ تمہارے تمام شکوک کو پھینک دے گی۔

(ایک افسر فرشتہ آتا ہے اور گہری آواز میں کہتا ہے کیا تم لونڈوں کا کھیل ابھی ختم نہیں ہوا؟ کچھ کام بھی کروگے یا یونہی دن عید رات شب برات! سب فرشتے چلنے لگتے ہیں)

(۶)

گول کمرے میں تاش کا کھیل ختم ہوا۔ وہ شخص جس نے زیتا کو دھمکایا تھا کہ کسی رسالے میں تمہاری خبر لوں گا عین اس وقت باہر نکلا جب کہ فرشتے چلنے پر تیار تھے۔ پھولوں میں عجب طرح کی خوشبو تھی۔ ان کا رنگ بھی کچھ نرالا تھا۔ یہ شخص کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا مگر ایک بڑے سے پھول کے پاس جا کر انتہائے آرزو سے کہنے لگا۔ "زیتا کے لئے یہ کچھ، اور میرے لئے؟" پھول نے مسکرا سا دیا گویا یہ کہہ رہا ہے کہ مانگنے کے قابل تو بنو۔

فلک پیما

یادگار

نغمہ ــــ جب مدہم سُر ختم ہو جاتے ہیں،
حافظہ کی گود میں جھولتا رہتا ہے۔
خوشبوئیں ــــ جب کہ خوبصورت پھول مرجھا جاتے ہیں،
حیات میں پنہاں زندہ رہتی ہیں۔

گلاب کی پنکھڑیاں ــــ جب کہ گلاب کملا جاتا ہے،
محبوب کی آرام گاہ پر برسادی جاتی ہیں۔
اسی طرح ــــ تیرے تصور میں جب کہ تو یہاں سے چلی جائے گی،
میری محبت ہمیشہ سوتی رہے گی۔

(شیلی)

محسن عبداللہ

ساون میں ایک دن باہر جانے لگا تو ترشح ہو رہا تھا۔ کہا چھتری لیتا چلوں۔ ساون کا کیا اعتبار نہ جانے یہ تقاطر کب موسلادھار بارش بن جائے۔ لپک کر گیا، تو کھونٹی سے ایک چھوڑ پانچ لٹک رہی تھیں مگر سب کی سب مرمت کے قابل۔ میں نے کہا لے چلوں لگے ہاتھوں مرمت ہو جائے۔ چنانچہ پانچوں کو بغل میں داب چل پڑا۔ ایک قدم ڈیوڑھی کے اندر اور ایک باہر تھا۔ آواز آئی، اور میں انہیں قدموں پر ٹھیر گیا +

"اچھی! یہ نگوڑی چھتریاں کہاں جا رہی ہیں آج"

"یونہی خیال آیا ذرا مرمت ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ نہیں تو"

"خیر یہ تم جانو۔ مجھے شام کو چھتری چاہیئے یہ دھیان رہے"

اس گفتگو نے چھتریوں کے مضمون کو میرے دل پر نقش کر دیا۔ اس لئے یہ ناممکن ہو گیا کہ میں انہیں مشترکاً یا منفرداً حسب معمول کہیں بھول جاتا یا انہیں لوہار کی دوکان سے لاتا کسی اور دن پر اٹھا رکھتا۔ میں نے لوہار سے صاف کہہ دیا کہ شام کو لوٹتے وقت میں چھتریاں ضرور لے جاؤں گا۔ اور جو اس میں تساہل ہوا تو جو مجھ سے ہوگا اس سے زیادہ کر گزروں گا +

پھرتے گھومتے دوپہر ہو گئی مگر بارش کا تار نہ ٹوٹا۔ ویسی ہی رم جھم برس رہی تھی۔ اور پھر مجھے چھتریوں کا خیال آیا۔ نزدیک ہی ایک قہوہ خانہ تھا وہاں گیا اور ایک میز پر بیٹھ گیا۔ یوں ہی سی دیر ہوئی تھی کہ ایک دوشیزہ آئی اور میرے بالمقابل اسی میز پر بیٹھ گئی۔ وہ ہنوز کھا رہی تھی کہ میں بل ادا کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی دروازے تک نہ پہنچا تھا کہ اُس نے مجھے آواز دی۔ میں ٹھیر گیا تو اُس نے مجھ سے کہا کہ جو چھتری میرے ہاتھ میں ہے وہ اُس کی ہے۔ ندامت سی ندامت۔ پسینہ چھُوٹ گیا۔ باچھیں کھلانا، دانت نکالنا، آئیں بائیں شائیں کرنا، غرض خفت آمیز معذرت کے جملہ لوازم بجا لا کر میں ہوٹل سے نکلا +

اس حادثہ نے چھتریوں کے بارے میں اُن کی تاکید کو تازہ کر دیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر پھرتا رہا، مگر چھتری شام سے پہلے پہنچانے کا کچھ ایسا دھڑکا لگا تھا کہ باقی سب کام چھوڑ کر لوہار کی دوکان پر جا بیٹھا۔ اور اٹھا تو

چھتریاں لے کر اٹھا۔ ایک اخبار خریدا اور ٹریم میں بیٹھ کر ایسا محو ہوا کہ گردوپیش کی خبر نہ رہی۔ مگر پھر بھی میرا ایک ہاتھ چھتریوں کے گٹھے پر پڑا تھا۔ یکایک میں نے محسوس کیا کہ کوئی مجھے گھور رہا ہے۔ میں نے اخبار سے اپنا سر نکال کر دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ہوٹل والی نیک بخت میرے سامنے والی نشست پر "حاضر و ناظر" تھی۔ اس کے چہرے کے عرض وطول پر ایک لبسیط تبسم رقص کر رہا تھا۔ اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال رازدارانہ انداز سے کہا "آج کس کا منہ دیکھ کر نکلے تھے، خوب مال مارا ہے" سوا اس کے کہ ایک آنکھ سے چھتریوں کو دیکھتا اور دوسری سے اس کافرہ کو اور فرمائیے میں کیا کر سکتا تھا۔ کتنا جان کش خیال ہے۔ توبہ توبہ۔

یعنی میں ....؟

ڈرامی

نغمۂ محبت

(۱)

اور میں نے کہا ——— میرے اعضا ضعیف تھے
اور میں نے کہا ——— میرا خون سرد تھا
اور میں نے کہا ——— میرا دل افسردہ تھا
اور میں نے کہا ——— میرے جذبات خفتہ تھے
اور میں نغمۂ محبت نہ چھیڑ سکتا تھا۔ اور میں محبت کا نام بھی نہ لے سکتا تھا
اور میں اپنے بربط کے تاروں میں محبت کے راگ نہ بسا سکتا تھا۔

(۲)

امن و صلح کے وقت محبت چرواہے کی بانسری میں سمائی رہتی ہے
جنگ کے وقت محبت دلیر اور بہادر سردار کے گھوڑے پر سوار ہوتی ہے
خوشیوں کے وقت محبت بیش بہا ملبوسات اور زیورات میں آراستہ باغوں اور محلوں میں نظر آتی ہے
محبت عدالت، فوج اور قبرستان پر حکومت کرتی ہے
محبت نیچے انسانوں پر حکمران ہے اور اوپر اولیا اور انبیا پر
کیونکہ محبت فردوس ہے اور فردوس محبت۔

(ترجمہ)

محشر عابدی

تجلّیات

طبعِ نازک کسی کی ہو نہ ملول
شکوۂ غم کو دے نہ اے دل طول

حُسن ہے اور تغافلِ بسیار
عشق ہے اور جنونِ حُسنِ قبول

جانے لے جا کے کس جگہ مارے
مجھ کو گم کردہ راہ شوقِ فضول

ہر دو عالم ہیں ہیچ میرے لئے
ہوں محبت میں اس قدر مشغول

ہے متاعِ وفا مری ناقص
پھر بھی کر لے جو تیرا لُطف قبول

واعظوں کی یہ ہرزہ گفتاری
ناصحوں کی یہ پندِ نامعقول

مجھ پہ کوئی اثر نہیں کرتی ق
کہ محبّت ہے میرا اصلِ اصول

نغمۂ گل طرازِ اکبر سے
ہیں بساطِ سخن پہ پھول ہی پھول

اکبر
سروری لکھنوی

دمِ واپسیں

یک جا اُن دونوں کی عمر ایک سو پچاس برس تھی۔ اُن کی الگ الگ عمریں؟ اُن میں سے ایک کو بھی معلوم نہ تھیں۔ مدت ہوئی انہوں نے اپنی عمروں کو علیحدہ علیحدہ شمار کرنا چھوڑ دیا تھا، اور اب وہ بلا تکلف ہر سال اپنی مشترکہ عمر میں دو برس بڑھا دیا کرتے تھے۔

اُس پست سے دیہاتی مکان میں جس کی چھت کسی پرندے کے پروں کی طرح پھیلتی ہوئی دیواروں سے آگے بڑھ گئی تھی انہیں رہتے ہوئے کتنے ہی دن، کتنے ہی موسم اور کتنے ہی سال ہو گئے تھے۔ اگر آج ان سے کوئی کہتا کہ تم ہمیشہ سے میاں بیوی نہیں تھے تو وہ کچھ دیر کے لئے حیران رہ جاتے۔ اُن کے چہروں پر ایامِ گذشتہ کی ایک ہلکی سی جھلک باقی تھی اور اُن کی شکلوں میں بہن بھائیوں سے بڑھ کر مشابہت تھی۔ جب گاؤں کے لوگ اُن کے اس درجہ ضعف کے باوجود اُن کی اس قدر شدید والہیت کو دیکھتے تھے تو وہ یہ خیال کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ عنقریب جب اُن میں سے ایک اس دنیا سے چل بسا تو دوسرے کے لئے یہاں کی تنہائی ناقابلِ برداشت ہو جائے گی۔

دونوں بوڑھی جانوں کے لئے موسمِ سرما نامہربان ثابت ہوا۔ اُس نے اُن کے حلقوم پر ذرا درشتی سے ہاتھ ڈالا، اُن کی کمر کو کسی قدر توڑ دیا اور اُن کے گالوں میں گڑھے ڈال دیئے۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ایک دھندلا سا پردہ دیکھنے لگا اور وہ غنودگی کے حملوں کا شکار ہونے لگی۔ جب بہار آئی تو چھاؤں کی فرحت انہیں کم محسوس ہونے لگی اور دھوپ کی شگفتگی انہیں بے کیف نظر آنے لگی۔ زندگی اُن کے لئے ایک بارِ گراں ہو گئی۔ صبح سے شام کرنا ایک جان کاہ مشقت سے کم نہ رہا۔

ایک دن جب وہ روزِ گزشتہ کی بہ نسبت زیادہ مضمحل ہو کر اپنے مکان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اُس کی بیوی خرگوشوں کے لئے گھاس لانے کے لئے باہر نکلی۔ جونہی کہ اُس نے جنگلے کے پھاٹک کو طے کیا اُس کے سانس کا آنا جانا بند ہو گیا۔ یہ سفر کی پہلی منزل تھی۔ پھر وہ آگے بڑھی۔ اُس مقام سے جہاں وہ ایک شریف بچے کی طرح بیٹھا تھا بڈھے کی دھندلی آنکھیں اپنی بیوی کو نہ دیکھ سکیں۔ مگر اُس نے اُس کے قدموں کی آواز سن لی۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تاکہ وہ اپنے تصور میں اُسے جاتے ہوئے دیکھ لے۔

جب وہ گلی کے موڑ پر پہنچی تو اُس نے اپنی آنکھیں ایک دفعہ زور سے کھولیں اور پھر یک لخت گر پڑی اُس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی اور اُس نے کوئی حرکت نہ کی۔

ایک راہرو آکر وہاں ٹھہر گیا، ایک لڑکی چلتی چلتی کود تی پاس آ کھڑی ہوئی۔ پہلے ایک اور پھر ایک اور عورت آئی۔ لوگ اُٹھا کر اُسے

دوکان میں لے گئے انہوں نے دیکھا کہ وہ مرچکی ہے۔

گھر خالی ہوگئے۔ دوکان اور اُس کے اطراف پر سوادِ ہجوم چھاگیا تین کرسیاں جوڑکر بڑھیا کو ان پر لٹا دیا گیا۔ اُس کا زرد اور قدرے بگڑا ہوا چہرہ دیکھ کر ڈر آرہا تھا۔

کسی نے کہا "بڈھے کو ضرور بتا دینا چاہیئے"

ایک اور آواز آئی "نہیں! اُسے نہیں، پہلے اُس کی بہو کو بتانا چاہیئے۔ وہ سامنے کھڑی ہے۔ او مارگریٹ!"

وہ آگئی، بدصورت اور باولی سی۔ اُس کے جھکے ہوئے کندھوں سے اُس کا ڈھیلا لباس لٹک رہا تھا اور اس کے رخسار خشک اور روکھی روٹی کی طرح بے رونق تھے۔ وہ دھوبن تھی اور پانی کے اثر سے اُس کے ابھرے ہوئے ہاتھ دو بیلچوں کی طرح لٹک رہے تھے۔

جب اُس نے اپنے اُس شوہر کی ماں کی نعش کو دیکھا جسے مرے اب ایک زمانہ گزر چکا تھا اور جسے اب وہ تقریباً بھول چکی تھی تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ اُس کے ہونٹ سفید ہوگئے اور اُس کے چوڑے چکلے چہرے میں اُس کی آنکھیں گردش کرنے لگیں اُس نے ناک کو سکوڑتے ہوئے اپنی آستین سے اُسے پونچھا اور آہستہ سے کہا "آہ! اس کا بیچارہ خاوند!"

کسی کی طرف دیکھے بغیر وہ عجب بے ڈھنگے پن سے ہجوم کی طرف مڑی اور کہنے لگی "بڑھیا کی موت کی خبر اُسے کوئی نہ سنائے میں اُسے خود بتاؤں گی"۔ اور اُس نے اپنے چہرے کو ایک ملتجیانہ انداز سے حرکت دی۔

اس کے بعد ایک ایک کرکے لوگوں نے جانا شروع کیا یہاں تک کہ ذرا سی دیر میں سارا مجمع منتشر ہوگیا۔

مارگیریٹ نعش کو اٹھوا کر اپنے بستر پر لے گئی۔ پھر جلدی سے کمرے کا دروازہ بند کرکے بڈھے کے پاس پہنچی۔ اپنے گھر کے سامنے چھت کی اُسی پرُ نما افزائش کے نیچے وہ بیٹھا انتظار کررہا تھا۔

لکڑی کا پھاٹک کھلا تو اُس کی آواز سے چونک کر اُس نے اپنا سر اوپر کو اٹھایا۔

مارگیریٹ نے کہا "میں ہوں بابا" وہ پھر ایک بت کی طرح بے حرکت ہوگیا "آؤ اب گھر چلنے کا وقت ہے"

اُس نے ایک آہ کی اور اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر ایک آہ کی۔ اُس نے ہاتھوں کو آگے کی طرف پھیلا کر ہلانا شروع کیا۔ اُس کے چہرے میں کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آتی تھی۔

مارگیریٹ نے کہا "کیوں کیا ہے بابا؟"

اُس نے جواب دیا "مجھے نظر نہیں آتا، مجھے کوئی چیز نظر نہیں آتی!"

"آہ!" مارگیریٹ نے کہا۔ اور بلاشبہ یہ اُس کی روح کی سادگی تھی جس نے اُسے اتنے بڑے بڑے حادثوں کے لیئے تیار کردیا کہ اس کی زبان سے اس ایک لفظ کے سوا اور کچھ نہ نکلا۔ اُس نے اُس شخص کا ہاتھ تھام لیا جس کی آنکھیں اپنے ازلی رفیق کے چھپ جانے کے بعد اب دیکھنا ہی نہ چاہتی تھیں۔

اپنے پاؤں کو گھسیٹتا ہوا وہ نعمت خانے میں پہنچ گیا۔ اُس نے ایک کرسی کی پشت کو چھوا اور اس پر بیٹھ گیا۔ مگر اس کی سانس سختی سے چل رہی تھی۔ وہ آہیں بھرتا کراہتا اور جونہی وہ اُسے بتانے کے لئے منہ کھولتی وہ چلّانے لگتا۔

"یہ اب بس ہو چکی ہیں۔ میری آنکھیں! آہ ابھی یہ دکھ باقی تھا!"

گھنٹوں تک وہ غم والم میں ڈوبا رہا۔

ایک لمحہ کے لئے جب اسے ذرا ہوش آیا تو اُس نے پوچھا "وہ کہاں گئی؟ خدا کے لئے، وہ کیا کر رہی ہے؟" تالم کے دورِ اور جلوں کے درمیان مارگیرٹ نے دیکھا کہ اُس نے اپنے حواس مجتمع کئے اور وہ اپنی بیوی کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر وہ شکایتیں کرنے لگا۔ آتنے میں پھر ایک حملہ ہوا۔

بہت سے لوگ آئے بعض اندر پہنچے اور بعض کھڑکیوں ہی میں سے دیکھ کر چلے گئے مگر کسی کو اس سے کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

سارا دن یوں ہی گزر گیا اور یہ جاں کاہ خبر اُس کے کانوں تک نہ پہنچ سکی۔ اب کسی کو اُس کے قریب آنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔

وقتاً فوقتاً مارگیرٹ اُس کے کمرے کا دروازہ بند کر کے اپنے آنسوؤں سے بھرے ہوتے چہرے کو صاف کرتی ہوئی اُٹھ دوڑتی۔ وہ بار بار بڑھیا کو دیکھنے کے لئے جاتی تھی جو باوجود دو شمعوں کی روشنی کے رات کی تاریکی میں نظروں سے اوجھل ہو رہی تھی۔ پھر وہ تجہیز و تکفین میں مصروف ہو گئی۔ ہر طرف اُس کا خیال تھا۔ وہ تھک کر چُور ہو رہی تھی مگر برابر بھاگ دوڑ میں مصروف تھی۔ وہ دلیرانہ مصیبت کا مقابلہ کر رہی تھی اور اُس کی شدت سے مغلوب نہ ہوتی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اُسے کیا کیا کرنا چاہیئے۔ وہ جو مجسم سوگ تھی۔ وہ جسے پس ماندگی کی اب عادت ہو چکی تھی!

شام اور رات کے درمیان وہ ایک مرتبہ پھر اُس کے پاس پہنچی۔ اب اُس کی طبیعت میں کچھ سکون پیدا ہو چلا تھا۔ مارگیرٹ نے ایک چھوٹا سا لیمپ جلا کر انگیٹھی پر رکھا اور دل میں سوچا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ اسے بتا دیا جاتے کہ وہ جو ہمیشہ تیرے ساتھ رہتی تھی آج تجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ نحیف و ناتواں کانپتی ہوئی وہ اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اُس کا سر اس طرح جھک رہا تھا جیسے وہ اپنے کسی جرم پر نادم ہو۔ اُس نے اپنی ساری قوت کو یوں مجتمع کیا جیسے وہ چلّانے لگی ہے مگر اُس کی زبان لڑکھڑا گئی اور اُس نے کہا "وہ اب کبھی ——— واپس نہ آئے گی ——— کبھی نہیں ——— وہ چلی گئی۔"

بڈھا خاموش رہا۔ مارگیرٹ نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا ——— اور سو رہا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹ گئی اور نہایت احتیاط سے کمرے کی اشیا کو درست کرنے لگی۔ یکایک بڈھے نے حرکت کی اور اُس کو بلایا۔ وہ اُس کے اس قدر قریب جا کھڑی ہوئی کہ وہ اپنی انگلیوں سے اُس کے ہاتھ کو چھو سکتا تھا۔

سنو میری بیٹی" اُس نے کہا "یہاں آؤ اور سنو۔ وہ واپس آگئی ہے۔ وہ یہیں ہے۔ میں نے اُسے ابھی وہاں دیکھا ہے جہاں اس وقت تم کھڑی ہو۔ میں سو رہا تھا اور یکایک مجھے معلوم ہؤا کہ وہ یہیں ہے۔ اُس نے کمرے کی چیزوں کو ترتیب دیا اور پھر چلی گئی۔ میں جان بوجھ کر بے حرکت اور خاموش ہو رہا۔ سنو، میں نہیں چاہتا اُسے معلوم ہو کہ میں دیکھ نہیں سکتا۔ میں نہیں چاہتا ــــــ اس سے اسے بڑا صدمہ ہوگا۔ مجھے یہ منظور نہیں۔ اُسے اُس وقت تک مجھ سے دور رکھو جب تک میں پھر اچھا نہ ہو جاؤں۔ کسی تدبیر سے، میری بیٹی"۔

اُس نے ذرا پہلو بدلا تو پرانی کرسی میں سے کراہنے کی سی آواز اُٹھی۔

"اُسے لے جاؤ۔ ایک یا اگر ضرورت ہو تو ایک سے زیادہ دنوں کے لئے اسے کہیں لے جاؤ اُس سے کہو ــــ اُسے لے جاؤ"

"اچھا پاپا، میں اُسے لے جاؤں گی۔ میں سمجھتی ہوں اُسے تمہاری بیماری کا علم نہ ہوگا ــــــ میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں اُسے علم نہ ہوگا"

بڈھے آدمی پر قسم کا بڑا اثر ہؤا اور اُس نے کہا "تو بہت اچھی لڑکی ہے" پھر وہ خاموش ہو گیا۔

دوسرے دن مارگیرٹ نے ایک جھوٹی کہانی بنا کر سنا دی کہ بڑھیا کو اُس کے رشتہ دار اپنے ساتھ گھر لے گئے ہیں پہلے وہ ایک چھوٹے بچے کی طرح حیرت آمیز دلچسپی سے اُس کی باتیں سنتا رہا۔ جب اُس نے بات ختم کر لی تو وہ کہنے لگا "مگر وہ پھر واپس آگئی ہے۔ گزشتہ شب میں نے سوتے میں اُس کی آواز سنی تھی"۔

مارگیرٹ نے نرمی سے کہا "ہاں ہاں وہ آگئی تھی"۔

اسی طرح دو دن گزر گئے۔ بڑھیا کو دفن کرنے کے بعد دوسرے دن جب ڈاکٹر بوڑھے وکٹر کو دیکھنے آیا تو اُس نے خلافِ توقع کہا کہ "حالت بہت اچھی ہے۔ بخار تقریباً اتر چکا ہے اور گرمی کم ہو رہی ہے۔ کل وہ دیکھنے لگے گا"۔

وہ مخبوط الحواس ہو کر ایک کونے میں دبکی بیٹھی تھی۔

"ہاں۔ کل ــــ کل ــــ"

اپنی تاریک روح کی گہرائی میں مارگیرٹ نے بھی ایک مرتبہ اس لفظ کو دہرایا "کل"!

کل وہ اپنی آنکھیں کھولے گا، اور پھر آنکھوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ اُسے نہ دیکھ سکے گا! کل مارگیرٹ کے دل میں اپنی خاموشی پر اُس کے اُس بوڑھے رشتے کو بھی ایک جھٹکا لگے گا جو شاید اُس کے لب اُٹھنے پر بھی محفوظ نہ رہ سکتا یہی زندگی کا قانون ہے۔ زندگی میں ہمیشہ ایک کل ایسی آتی ہے جس کا انجام بخیر نہیں ہوتا، اور امن اور امید کی وہ صبح جو کبھی کسی ایک کو حاصل ہوتی ہے ہمیشہ کسی دوسرے کے لئے شام کا پیغام لاتی ہے۔

(ترجمہ)

منصور احمد

غزل

مجھ سے حالِ دلِ فگار نہ پوچھ　　سختیٔ جورِ روزگار نہ پوچھ

غرق ہے کیف میں جہانِ وفا　　بیخودی ہائے انتظار نہ پوچھ

کیا ستم ڈھا رہی ہی رندوں پر　　مستیٔ ابرِ نوبہار نہ پوچھ

رنگِ ناکامیٔ مراد نہ دیکھ　　بےکسی ہائے بے شمار نہ پوچھ

دل میں اک حشرِ آرزو ہے بپا　　شوخیٔ حسنِ فتنہ کار نہ پوچھ

کیوں کسی کو کسی کی باتوں پر　　آہی جاتا ہے اعتبار نہ پوچھ

جی بھر آتا ہے حالِ دل کہتے
مجھ سے مضطر تو بار بار نہ پوچھ

رام رتن مضطر

پُراسرار قیدی

(۱)

قیدی جس وقت کٹہرے کے پیچھے اپنی جگہ پر کھڑا ہوا تو تمام عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ اُس نے مقدمہ کی پیروی شروع کردی۔

وہ ایک نحیف الجثہ آدمی تھا جس کی بے رونق آنکھیں اندر کی طرف دھنسی ہوئی تھیں اور زرد چہرہ اس کے جذباتِ غم کی پوری ترجمانی کررہا تھا۔ مقدمہ کی سماعت سے معلوم ہوا تھا کہ یہ شخص کبھی صوفیوں کے مقدس گروہ میں شامل تھا مگر ایک سخت جرم کے ارتکاب کی وجہ سے اسے یہ زندگی ترک کرنی پڑی۔ قیدی پانچ دن سے اپنے مقدمہ کی پیروی کررہا تھا اور اس دوران میں اُس نے اپنی غیر معمولی قابلیت اور اعلیٰ تعلیم کا کافی ثبوت دیا تھا۔

اُس کے لئے یہ معاملہ موت اور زیست کا معاملہ تھا مگر اس کی تقریر کا ایک ایک لفظ اس کے خلاف ثبوت دے رہا تھا، اور عام عدالت میں کوئی شخص بھی ایسا نہ تھا جسے اُس کا خوفناک انجام نظر نہ آرہا ہو، اُس نے ہر قسم کی قانونی امداد حاصل کرنے سے قطعی انکار کردیا تھا، اور خود ہی پیروی کرنا چاہتا تھا۔ جج، جیوری، سرکاری وکیل، تماشائی، عدالت کے ملازمین غرض سب اطمینان کے ساتھ قیدی کی تقریر سُن رہے تھے، مگر ہر شخص نے پہلے ہی سے فیصلہ کرلیا تھا کہ قیدی کو بے عزتی اور بدنامی کی تکلیف دہ موت کا سامنا کرنا پڑے گا، اور وہ اپنے تحفظ کے متعلق کتنا بھی کہے وہ بالکل بے وقعت سمجھا جائے گا۔

"مائی لارڈ اور حضراتِ جیوری ـــــــ"

جونہی کہ یہ الفاظ لوگوں کے کانوں میں پہنچے، تمام عدالت میں خاموشی چھا گئی، اور تماشائیوں کی نگاہیں کٹہرے کے پیچھے قیدی کے چہرے پر جم گئیں۔ اُس کی صورت سے ناامیدی اور ہراس کے آثار نظر آرہے تھے۔

قطعِ نظر اس سے کہ اس کا جرم کس قدر خوفناک تھا یا یہ کہ اس نے مقدمہ کی کارروائی کے دوران میں کتنی سنگ دلی کا ثبوت دیا تھا، انسانوں کے اس انبوہِ کثیر میں قیدی کے ساتھ عام ہمدردی اظہار کیا جارہا تھا۔

اب شام کے ساڑھے پانچ بج چکے تھے اور لنچ کے ایک قلیل وقفہ کے علاوہ عدالت کا اجلاس صبح سے اس وقت تک برابر ہورہا تھا۔

خود قیدی کے چہرے سے تکان کے آثار نمایاں تھے، مگر اُس نے تمام ناامیدیوں اور بے چینیوں کو نظر انداز کرکے اپنا سر اونچا کیا اور تن کر کھڑا ہو گیا، پھر کامل عزم و استقلال کے ساتھ تقریر شروع کر دی۔ وہ اپنی زندگی کے ایک ایک قابلِ بیان واقعے کو نہایت بلاغت کے ساتھ بیان کر رہا تھا۔ وہ تقریر کے دوران میں ایک لمحہ کے لئے بھی نہ رکا بلکہ مسلسل فراٹے بھرتا چلا گیا۔

شروع شروع میں جج رحم آمیز حیرت کے ساتھ قیدی کی تقریر سنتا رہا۔ وہ افسوس کر رہا تھا کہ کتنا قابل اور تعلیم یافتہ آدمی ایک خوفناک جرم کے ارتکاب کی وجہ سے انسانیت کے ذلیل ترین گڑھے میں گر پڑا ہے اور اب ــــــــ

اب سات بج چکے تھے مگر قیدی بغیر کسی تکان یا دماغی اضمحلال کے برابر بول رہا تھا اور یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اس میں کہیں سے نئی طاقت برابر چلی آ رہی ہے۔

"نہیں حضراتِ جیوری، اس کا کوئی علاج نہیں ہے، قیدی کو اپنی صفائی کے لئے بہت سے معاملات پر روشنی ڈالنی ہے، اُن پر زور دینا ہے، اور جب تک اُس کی تقریر معقول اور متعلق باتوں پر مشتمل ہے اُس کو دنیا کا کوئی قانون بند نہیں کر سکتا خواہ وہ کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو جائے۔ ــــــــ"

عدالت دوسرے دن صبح گیارہ بجے تک کے لئے ملتوی کر دی گئی، اور جیوری کے آدمی اپنے اپنے ہوٹلوں کی طرف چل دیئے۔ قیدی کے دبلے پتلے چہرے پر بھی مسکراہٹ کے آثار نمایاں ہوئے اور وہ بھی اپنی کوٹھڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔

(۳)

صبح ہوئی مگر ناخوشگوار اور افسردہ۔ جج کے داخل ہونے سے پہلے ہی اجلاس کا کمرہ تماشائیوں سے بھر گیا تھا۔ قیدی کو اندر لایا گیا جس نے گھستے ہی جیوری اور جج کی طرف جھک کر مودبانہ سلام کیا اور لوگوں کی قطار پر ایک حیرت آمیز نظر ڈالی، مجمع کی بے قراری پر مسکرایا اور کل شب کی بقیہ تقریر پھر شروع کر دی۔

ڈیڑھ بجے کے قریب ایک قلیل وقفہ ہوا جس میں قیدی نے نیچے جا کر کچھ شربت وغیرہ پیا اور جب عدالت کا اجلاس دوبارہ شروع ہوا تو وہ بالکل تازہ دم اور مستعد نظر آ رہا تھا۔

جیوری کے ارکان اونگھ رہے تھے، اور ہل ہل کر اور بار بار جمائیاں لے لے کر گھنٹے کی طرف بے چینی کے ساتھ دیکھتے تھے۔ جج بھی مضمحل ہو چکا تھا، اور اس لئے اُس کے چہرہ سے ناراضی کا اظہار ہو رہا تھا، جونہی کہ پانچ بجے

جج طیش میں آکر اُٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ ہلا کر کہنے لگا "خاموش"!

قیدی نے تقریر بند کر دی۔

جج نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا "مجھے تمہارے مقدمہ سے کوئی تعصّب یا بغض نہیں ہے مگر عدالت کا وقت بھی بے کار ضائع نہ کرنا چاہیئے"

"مائی لارڈ ———"

جج نے ہاتھ ہلا کر اُسے خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا۔

اُس نے پھر کہا "میں آپ کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں"

جج نے گھنٹے کی طرف دیکھ کر کہا "بہت اچھا اب عدالت کا اجلاس اُس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک تمہاری تقریر ختم نہ ہو جائے۔ اس میں خواہ آدھی رات ہی کیوں نہ لگ جائے"

جیوری کی طرف سے اس فقرہ پر عجیب عجیب چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ مگر قیدی کے چہرے پر مسرت کی ایک عجیب لہر دوڑ گئی۔

قیدی نے جھک کر مودبانہ عرض کیا "مائی لارڈ! آپ جیسا بھی مناسب خیال فرمائیں"

دس بجے کے قریب جج نے دوستانہ لہجے میں قیدی سے شکایت کی کہ وقت حد سے زیادہ گزر گیا ہے اور اب اُسے اپنی تقریر بند کرنی چاہیئے مگر قیدی نے کہا "مائی لارڈ! مجھے ان لوگوں کی تکلیفوں کا خوب احساس ہے اور حد درجہ افسوس بھی مگر کیا کروں یہ معاملہ میری موت و حیات کا سوال ہے" جیوری کے ارکان کی طرف مخاطب ہو کر کہا "حضرات آپ کو جو زحمت اٹھانی پڑی اُس کا مجھے حد درجہ افسوس ہے مگر میرا یہ بھی ایک فرض ہے کہ اپنی جان کی حفاظت کروں اور آپ جانتے ہیں جان سب چیزوں سے اعلیٰ و ارفع ہے اور اس کے آگے ہر چیز ہیچ ہے۔ چنانچہ میں آپ لوگوں کی اجازت سے پھر تقریر شروع کرتا ہوں ———"

جج نے غصہ میں کھڑے ہو کر کہا "عدالت کا اجلاس کل گیارہ بجے تک کے لئے ملتوی کیا جاتا ہے۔"

(۳)

ساتویں دن کی صبح کو جیوری کی طرف سے ایک شکایت نامہ موصول ہوا جس میں مذکور تھا کہ وہ لوگ جنہیں اپنے کاروبار اور اپنے بال بچوں کی فکر ہے چاہتے ہیں کہ کسی طرح اس لامتناہی تقریر کی مصیبت سے انہیں نجات دلائی جائے۔

عرضی کا خلاصہ یہ تھا کہ "قیدی کو پھانسی دے دو"۔ بہت ممکن تھا کہ جج اس پر برضا وخوشی عمل کرنے کے لئے تیار ہو جاتا مگر اُس نے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کیا اور کہا کہ انہیں ابھی قدرے توقف کرنا چاہئے۔

قیدی پہلے سے زیادہ تازہ دم اور مستعد کٹہرے میں داخل ہؤا، اور اس نے بغیر کسی تمہید کے اپنی سابقہ تقریر کے بقیہ حصے کو بیان کرنا شروع کر دیا۔ اس حرکت پر تمام عدالت میں ایک قہقہہ پڑا۔

جج نے کہا "خاموش" ملازموں نے بھی یک زبان ہو کر کہا "خاموش" (تمام مجمع اور چند بیرسٹروں کو اس خاموش" پر بڑی ہنسی آئی")

لنچ کے بعد جج نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "تمہیں اپنا بیان مختصر کر دینا چاہئے کیونکہ تم دو دن سے برابر بول رہے ہو، اور میں اپنی ذمہ داری کو کافی طور پر محسوس کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ تمہاری تقریر کا ایک ایک لفظ معاملہ کو بد سے بدتر بنا رہا ہے"۔

قیدی نے گردن جھکا لی اور کہا "مائی لارڈ! میں آپ کی اس تکلیف کے لئے جو آپ نے میری تقریر اطمینان قلب کے ساتھ سننے میں اٹھائی ہے، معافی چاہتا ہوں۔ چونکہ اب تک میں نے اپنی صفائی کے اصل معاملہ کو بالکل نہیں چھیڑا اور صرف چند تمہیدی باتوں پر زور دیا ہے اس لئے ———"

آخر کار جج بھی مجبور ہو کر کرسی میں لیٹ گیا۔

قیدی نے پھر کہنا شروع کیا "مجھے پھانسی کیوں دینی چاہئے اس کے لئے صرف ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے مگر پھانسی کیوں نہیں دینی چاہئے اس کے لئے میرے پاس ہزاروں دلیلیں موجود ہیں، چنانچہ میں ان دلیلوں کو ترتیب کے ساتھ بیان کرتا چلا جاؤں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کا اور معزز حضراتِ جیوری کا قیمتی وقت صرف ہو گا مگر خیر، اب میں شروع کرتا ہوں ———"

جج نے چلّا کر کہا "میں ہرگز اس امر کی اجازت نہیں دے سکتا کہ عدالت کا قیمتی وقت اس طرح بے کار ضائع کیا جائے"۔

"مائی لارڈ"

قیدی کی آواز بہت درد انگیز اور شکستہ معلوم ہو رہی تھی، وہ آزردہ خاطر ہو کر اپنے کٹہرے میں بیٹھ گیا اور کہنے لگا "آپ مجھے پھانسی دے دیں یہ اور بات ہے مگر یہ یاد رہنا چاہئے کہ مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کا کافی موقع نہیں دیا گیا"۔

تمام عدالت میں خاموشی چھا گئی جو بالآخر کتابوں اور کاغذوں وغیرہ کے اٹھانے، رکھنے کی وجہ سے ٹوٹ گئی۔ جج اور وکلا حکامِ اعلیٰ سے مشورہ کر رہے تھے۔

بالآخر جج نے کھڑے ہو کر کہا "عدالت کل صبح تک کے لئے ملتوی کی جاتی ہے"

یہ کہہ کر وہ نہایت شان و شوکت کے ساتھ جو ایسے وقت مناسب تھی، کمرۂ عدالت سے باہر چلا گیا۔ جیوری کے بکس کی طرف سے غصہ میں بھری ہوئی لعنت ملامت کی آوازیں آرہی تھیں مگر قیدی کے چہرے پر ایک عجیب مسرت اور لبوں پر تبسم تھا۔

(۴)

جب جج آٹھویں دن عدالت میں آیا تو بیٹھتے ہی بولا "میں نے سرکاری افسرانِ قانون سے مشورہ کر لیا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قیدی کو اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے کافی موقع دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اُسے انہیں واقعات سے سروکار رکھنا چاہیے جن کا مقدمہ سے براہِ راست تعلق ہو، وہ غیر متعلق باتیں چھیڑ کر خواہ مخواہ طوالت نہ پیدا کرے"

قیدی نے پھر اپنی لامتناہی تقریر کا سلسلہ شروع کر دیا، مگر اب اُس نے اپنے طریقے میں کسی قدر تبدیلی کر دی تھی، چنانچہ روئے سخن میں بھی ایک خاص فرق نظر آرہا تھا ——— اب وہ نہایت آہستہ آہستہ بول رہا تھا اور اس کی تقریر پہلے کی طرح غیظ آلود نہ تھی بلکہ اس سے نہایت متانت کا اظہار ہو رہا تھا۔

وہ بہت ہوشیاری کے ساتھ ایک ایک بات پر زور ڈال رہا تھا، اور برابر مستند آدمیوں کے واقعات بیان کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ نہایت چرب زبانی کے ساتھ مختلف کتابوں، مقدمات کی کارروائیوں، شہادتوں کے قانون اور صحتِ واقعہ کے مشتبہ ہونے کے متعلق سینکڑوں کتابوں کے حوالے دے دے کر اپنے مافی الضمیر کو واضح کر رہا تھا۔

متعدد مرتبہ اسے خاموش ہونے اور جوش کو قابو میں رکھنے کے لئے کہا گیا مگر ایسی تنبیہوں کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ایک بالکل غیر متعلق اور طویل بحث چھڑ جاتی تھی اور پھر افسروں کو بار بار مشورہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ چنانچہ آج جج نے بھی تمام دن مقدمہ کی کارروائی اونگھ اونگھ کر سنی۔ جیوری کے لوگ مسکرا مسکرا کر قیدی کی طرف کسی قدر ترش روئی کے ساتھ گھور رہے تھے۔ تماشائیوں کے مجمع میں بھی اس لامتناہی اور تکلیف دہ تقریر کے سننے کی تاب نہ رہی تھی اور اب اس کی طرف بے التفاتی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ بہرحال اس طرح یہ دن بھی گزر گیا۔ اور سات بجے عدالت کا قدرتی التوا یقینی امر تھا

(۵)

دوسرا ہفتہ بھی گزر گیا، مگر قیدی برابر بول رہا تھا۔ تقریر کے دوران میں ایک دفعہ جج نے کچھ مداخلت کی

تو اس کے جواب میں قیدی نے کہا "جناب عالی، یہاں تک میں نے صرف اُس معاملہ پر زور دیا ہے جو جسم کے قریب چاقو پڑا پانے کے متعلق ہے، حالانکہ ابھی مجھے بہت سی باتیں (اس پر تمام عدالت میں کامل خاموشی چھا گئی اور تمام لوگوں نے ایک تھرتھری سی محسوس کی) خود جسم کے متعلق عرض کرنی ہیں پھر اس کے بعد ٹوٹا ہوا گلاس، سفید سفوف، ماہرین کیمیا کے تجزیے، ارتکاب جرم کا وقت، موسم، اس رات کو چاند کی خاص ہیئت، پولیس اور ہوم آفس کی شہادتیں، اُن کی صحت و عدم صحت اور پھر سب سے بڑھ کر خودکشی کا مسئلہ، غرض ابھی تو سینکڑوں مسائل تشنۂ تکمیل ہیں۔ مثلاً وقوعہ کی شب کو میں ایک نیم سرکاری جلسہ میں مدعو تھا، اور اب اس جلسے کے حاضرین کی فہرست مجھے مل گئی ہے۔ چنانچہ میرا ارادہ ہے کہ آٹھ سو سات گواہوں کو جو میری عدم موجودگی کا ثبوت دیں گے یکے بعد دیگرے عدالت میں پیش کروں، جن کے متعلق میں چند تعارفی الفاظ بھی کہتا جاؤں گا، اور پھر ——"

جج نے اس جملۂ معترضہ کو روکتے ہوئے کہا "اچھا حضرت آگے بیان کیجئے، خدا کے لئے کہو! آگے کیا کہنا چاہتے ہو"

قیدی نے وہ دن بھی اعتراضات کے جوابات میں گزار دیا جو چاقو کے متعلق کئے گئے تھے، اور آخر میں اس نے کہا کہ "حضراتِ جیوری میں کل اُن اعتراضات کے جواب دوں گا جو پولیس کی اُس رپورٹ کے متعلق ہیں جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ میرا جسم بے حس پڑا ہوا پایا گیا تھا اور اس سے بھی بڑھ کر ایک بات ——"

جج نے قطع کلام کر کے غصہ میں بھری ہوئی آواز سے کہا "اجلاس ملتوی کیا جاتا ہے"

(۶)

نویں ہفتہ کی صبح کو جب کہ قیدی نے کامل دو گھنٹے اپنے آٹھ سو سات گواہوں میں سے چند کو پیش کرنے میں گزار دیئے تھے ارکانِ جیوری نے جج سے چند منٹ کے لئے رخصت چاہی تاکہ اُس سوال کے متعلق جو جج نے اُن سے کیا تھا غور و فکر کر سکیں۔

چنانچہ انہیں تھوڑی دیر کے لئے چلے جانے کی اجازت فوراً مل گئی، اور اس اثنا میں جج نے شاہی مشیر سے ایک مختصر مشورہ کرنا شروع کر دیا۔

مشیر نے پوچھا "تو کیا مائی لارڈ! اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا جا سکتا؟"

جج نے ایک لمبی سانس لے کر کہا "کچھ نہیں"

مشیر نے دریافت کیا "کیا اُسے جب تک وہ چاہے تقریر کرنے کی اجازت دی جائے گی اور اس کے سوا

کوئی مفر نہیں ہے"

ارکانِ جیوری عدالت کے کمرے میں آہستہ آہستہ داخل ہوئے۔ جج نے پوچھا "کیا آپ حضرات اپنے فیصلہ پر متفق ہو گئے ہیں؟"

جو شخص سب سے آگے تھا اُس نے کہا "ہاں، بیشک، جنابِ والا، ہم نے اس قیدی کو بالکل بے گناہ پایا"

کھچا کھچ بھری ہوئی عدالت میں سناٹا چھا گیا اور لوگ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

جج نے کہا "مسٹر جان تمہارے ملک کی جیوری نے تمہیں اُس الزام سے جو تم پر لگایا گیا تھا بالکل بری پایا ہے اور تمہیں آزاد کر دینے کے سوا اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ تم نے اپنی صفائی کی تقریر میں (یہاں تک پہنچ کر اُس کی آواز رک گئی) غیر معمولی قابلیت اور اعلیٰ دماغی جوہر کا ثبوت دیا ہے۔ اس لئے میں نہایت زوردار الفاظ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنی خداداد قابلیتوں کو کارآمد کاموں میں صرف کرو، نہ یہ کہ ایک قابلِ نفرت جرم کے ارتکاب کی تردید میں مشغول رہو۔ جان اب تم آزاد ہو اور جا سکتے ہو"

"مائی لارڈ مجھے ابھی چند الفاظ اور کہنے ہیں ــــــ"

فقرہ ختم ہونے سے پہلے ایوانِ عدالت میں سے مجمع منتشر ہونا شروع ہو گیا اور ایک منٹ کے بعد کمرے میں سوائے قیدی کے اور کوئی نہ رہا۔

قیدی کے چہرے پر ایک عجیب مسرت نمایاں تھی۔

"میرے "چند الفاظ" اُن کے تمام اعتراضات کا ایسا مسکت جواب ہوتے کہ اُن کے دانت کھٹے ہو جاتے۔ مگر خیر ــــــ"

یہ کہہ کر وہ بھی کاروبار میں مصروف بازار میں ایک طرف کو چل دیا۔

ظفر قریشی دہلوی

بچپن کی یاد

بچپن کا راز کیا ہے اے دل ذرا بتا دے
بچھڑے ہوئے دنوں سے اک بار پھر ملا دے

جس سے دلِ حزیں کو بچپن کی یاد آئے
تو اے ربابِ ہستی وہ راگ پھر سنا دے

آئے نئے نئے تھے جس وقت ہم جہاں میں
وہ عافیت کا منظر اک بار پھر دکھا دے

دنیا کی کلفتوں سے دل تنگ آ گیا ہے
گودی میں عاطفت کی تو پھر مجھے لٹا دے

کیا بات ہے جو ایسا خاموش ہو گیا ہے
اک بار پھر پرانے نغموں سے دل ہلا دے

شورِ جہاں ہے مجھ کو مانندِ شورِ محشر
پیاری سی دھن سنا کر تو مست پھر بنا دے

ہستی کی راہ میں ہے ہر ہر قدم پہ ٹھوکر
مہرِ پدر کی انگلی پھر راہبر بنا دے

محفوظ ہوں سدا میں آشوب سے جہاں کے
آغوشِ مادری میں تو پھر مجھے سلا دے

اے سازِ زندگانی مدت سے منتظر ہوں
تو زخمۂ ازل سے تاروں کو پھر بجا دے

آواز جن کی اب تک کانوں میں گونجتی ہے
وہ بے خودی کی تانیں ناشادؔ پھر سنا دے

رام پرشاد کھوسلا
ناشادؔ

چیتوا

افراد

چیتووں[1] کا ایک گروہ جس میں ایک بڈھا، اُس کا جوان بیٹا، بیٹے کی بیوی، سات برس کا ایک بچہ، ایک بے باپ کی بچی، اُس کی ماں اور دو اور نوجوان ہیں۔

دو پڑھے لکھے مالدار نوجوان، ایک سرکاری اہل کار، اُس کی بیوی اور گاڑی بان۔

پہلا سین

سنسان راستہ موسم سرما کی ایک شام۔ عورتیں اور مرد بیٹھے ہیں۔ لڑکا اور لڑکی سردی سے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ بڈھے کے پاس صرف ایک چادر ہے۔ جوانوں کے ہاتھ میں پوٹلیاں ہیں۔ لڑکا ننگے سر ننگے پیر ہے اور آدھی باہوں کی کرتی پہنے ہے۔ لڑکی کے بدن پر ہاتھ بھر کا ایک کپڑا ہے۔ عورتوں کے پاس اوڑھنے کو کچھ نہیں۔

نوجوان (اپنے باپ سے) بابا یہاں کیوں بیٹھ رہے ہو، آگے چلو۔

بڈھا۔ آگے کہاں چلیں؟

نوجوان۔ کہیں چلو۔

بڈھا۔ چلتے چلتے دن بھر تو ہوگیا۔ اب پاؤں کام نہیں کرتے۔

نوجوان۔ کہیں ٹھکانا ملے تو اچھا ہے۔ یہاں نہ کنواں ہے، نہ کوئی بستی ہے۔

بڈھا۔ یہاں بستی کہاں رکھی ہے ہم نے تو کہا تھا کہ اسی گاؤں میں ٹھہر جائیں، مگر تو نے نہ مانا۔ یہاں سے دوسرا گاؤں نہ جانے کتنی دور ہوگا۔

---

[1] چیت کی فصل کاٹنے والے مزدور۔ فصل کے مہینے میں ان کے گروہ کے گروہ مزدوری کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

دوسرا نوجوان۔ مگر بابا یہاں تو سردی سے ٹھٹھر جائیں گے۔ کہیں گھام میں چلو۔

بڈھا۔ چلو، گھام میں چلو۔ اس سے تو ٹھٹھر جائیں سو اچھا۔ اس جنجال سے تو پران بچیں گے۔

(دو نوجوان گھوم کر واپس آرہے ہیں۔ دونوں اوورکوٹ پہنے ہوتے ہیں۔ آپس میں باتیں کر رہے ہیں)

بڈھا۔ بھیّا، یہاں سے گاؤں کتنی دور ہوگا؟

(دونوں رک جاتے ہیں)

پہلا نوجوان۔ یہاں سے دو کوس ہے۔

بڈھا۔ تب تو بڑی دور ہے۔

نوجوان۔ تم لوگ کہاں جاؤ گے؟

بڈھا۔ کہاں بتائیں، جہاں جگہ ملے۔

کسان نوجوان۔ مہاراج، ہم چپتوا ہیں۔ سنا تھا کہ اپنے یہاں چیت کٹنے لگا ہے مگر ابھی تو یہاں اُگا بھی نہیں لگا۔

نوجوان۔ تم لوگ چپتوا ہو؟ کہاں سے آرہے ہو؟

بڈھا۔ مہاراج سیاوری سے آرہے ہیں۔ کل دوپہر کو چلے تھے۔ ساتھ میں جو کچھ تھا وہ ختم ہوگیا۔ اب کیا کریں؟ کہاں جائیں؟

نوجوان۔ سیاوری تو بہت دور ہے۔ یہاں سے ساٹھ میل ہوگی۔ تم لوگ برابر چلتے آئے ہو؟

بڈھا۔ اور کرتے کیا مہاراج!

نوجوان۔ مگر تم لوگوں نے بڑی بھول کی۔ جو بنی تھی وہاں کیوں نہ ٹھہر گئے؟

بڈھا۔ ٹھہر کر کیا کرتے؟ جتنا آگے نکل جائیں سو اچھا۔ یہی سوچ کر چل پڑے۔ ابھی ایک آدمی ملا تھا۔ کہتا تھا یہاں میں چیت کٹنے لگا ہے۔ لیکن مہاراج فصل تو ستیاناس ہوگئی، ہم لوگ کاٹیں گے کیا۔ اُس آدمی کے پاس ایک گٹھری تھی۔ کہتا تھا آدھ سیر دانے نہیں نکلے۔ پھر ہم سیمری جا کر کیا کریں گے؟ (رک کر) مہاراج، سیمری کتنی دور ہوگی؟

نوجوان۔ سیمری یہاں سے آٹھ میل ہے۔ تم ایسی سردی میں اب آگے کہاں جاؤ گے۔

بڈھا۔ مہاراج، کھانے کے لئے تو کچھ ڈھونڈنا ہی پڑے گا۔ سویرے ایک مٹھی چنوں سے پانی پی کر چلے تھے۔ دن بھر پانی کے سہارے ہی یہاں تک چلے آئے۔ مگر اب تو بھوک سے پیٹ جل رہا ہے آنکھیں مندی جا

رہی ہیں۔ اپنی کچھ نہیں۔ پیٹ باندھ کر سو رہیں گے۔ مگر یہ لڑکا ہے، چھوٹی لڑکی ہے۔ بھگوان کی دیا سے اُن کے لئے کچھ مل جاتے تو اچھا ہے۔

دوسرا نوجوان (اوورکوٹ میں سردی سے کانپتے ہوئے) کیوں جی، تمہارے اور کپڑے کہاں ہیں؟

پہلا نوجوان۔ دیکھتے نہیں۔ بیچاروں کے پاس اور کپڑے کہاں رکھے ہیں؟ جو کچھ ہیں سو یہی ہیں۔

بڈھا۔ مہاراج آپ دیکھ تو رہے ہیں۔ انہیں کپڑوں سے کسی طرح رات کٹ جائے گی۔ بھگوان سب کا مالک ہے۔

نوجوان (اوورکوٹ کی جیب ٹٹول کر اپنے ساتھی سے) انہیں کچھ پیسے دے دیں۔

دوسرا نوجوان۔ اچھی بات ہے۔

پہلا نوجوان (پریشان ہو کر) میری جیب تو خالی ہے۔

دوسرا۔ پھر چلو۔

پہلا۔ چلتے ہیں۔ ذرا اپنی جیب دیکھ لو۔ کچھ ہو تو ان بیچاروں کو دے دیں۔

دوسرا۔ میری جیب میں سگریٹ کی ڈبیا ہے۔

پہلا۔ تو کیا وہ سگریٹ کھائیں گے؟

دوسرا۔ کیا ہوا، پی تو سکتے ہیں۔

پہلا۔ چپ رہو۔ (پھر پریشان ہو کر بڈھے سے) بھائی اس وقت ہمارے پاس پیسے نہیں۔ نہیں تو تمہاری کچھ مدد کر دیتے۔

بڈھا۔ بھگوان تمہارا بھلا کریں، مہاراج۔ نہیں ہیں تو جانے دو۔

(دونوں نوجوان آگے بڑھتے ہیں)

پہلا نوجوان۔ تمہیں ان لوگوں پر ترس نہیں آتا؟

دوسرا۔ آتا کیوں نہیں۔ مگر جیسی حالت ہماری ہو ویسی ان کی۔ ہم اور وہ ایک سے ہیں۔

پہلا۔ تم تو وحشی ہو۔

دوسرا سین

(وہی چیتھڑوں کا گروہ۔ لڑکا ماں کی گود میں منہ چھپائے بیٹھا ہے۔ بڈھا چپ چاپ ہے۔)

پہلا نوجوان ۔ بابا، اب تو بھوک سے بُرا حال ہے ۔ پانی پی پی کر کہاں تک پیٹ بھریں۔ منہ سوکھ رہا ہے آنکھوں کے سامنے تکلے چھوٹ رہے ہیں ۔ ہم سب تو سہہ لیں گے ، مگر ننّھ نے سویرے سے کچھ نہیں کھایا ۔ وہی چنے کھاتے تھے ۔
بڈھا ۔ نہیں کھایا تو کیا کریں ۔ کسی نے کچھ نہیں کھایا ، بتاؤ کیا کریں ، مرجائیں ؟ تو ہی سب کو گھیر کر یہاں لے آیا ہے ۔ کہتا تھا چیت کٹنے لگا ۔ اب بتا ، یہاں چیت کہاں ہے ۔ گیہوں میں جان نہیں رہی ۔ چنا اوپر سے دیکھو تو پیلا ہے ، اندر سے اینٹھ کر کالا پڑ گیا ہے ۔ پھر آدمیوں کا کیا ہو ؟ بھس کھا کر جئیں گے ۔

(ساتھ کے دو نوجوان الگ باتیں کر رہے ہیں)

پہلا نوجوان ۔ جی چاہتا ہے یہ کالی مٹی کھا جائیں ۔
دوسرا نوجوان ۔ لگتی تو بڑی اچھی ہے ۔ تم نے کبھی کھائی ہے ؟
پہلا (تھوڑی سی مٹی اٹھا کر منہ میں رکھتا ہے) ارے یہ تو بڑی اچھی لگتی ہے یہ سوندھی سوندھی باس آتی ہے ۔
دوسرا ۔ تو پھر چلو اسی مٹی سے پیٹ بھر لیں اور سو جائیں ۔ سویرے دیکھا جائے گا ۔
پہلا ۔ پاگل اس طرح نیند آ جائے تو سب جھگڑا ہی نہ چک جائے ۔ بھوک سے آنتیں سکڑ رہی ہیں نیند کہاں آئے گی !
دوسرا ۔ یہاں بیری کے پیڑ بھی نہیں ۔ کسی پیڑ کی جڑ ہوتی تو اسی کو کھاتے ۔
پہلا ۔ جڑیں تو بہت سی ہیں ۔ کھاؤ نا ۔
دوسرا ۔ تم تو ہنسی کرتے ہو ۔ آج دوپہر کو میں نے سچ مچ ہی پیپل کی جڑ توڑ کر کھائی تھی ۔ بڑی مزے دار تھی ۔
پہلا ۔ چلو ، اسی کو کھودیں ۔

(دونوں جاتے ہیں)

(ایک طرف لڑکی اپنی ماں کی گود میں اوں اوں کر رہی ہے)

ماں ۔ ٹھنکی تو منہ توڑ دوں گی ۔
لڑکی ۔ اُوں اُوں ، ابھی دے دے ۔
ماں ۔ کیا دے دوں ؟
لڑکی ۔ وہی کھونٹ میں جو چنے بندھے ہیں ۔
ماں ۔ (ایک گھونسا مار کر، ہلکا کرتی ہے) کہہ دیا چپ بیٹھی رہ ۔ تھوڑی دیر میں کھا لینا ۔ ابھی دیکھ —— (کان میں کچھ کہتی ہے) —— سمجھی !

بڈھا (لڑکی کو روتے دیکھ کر) ارے اسے مار کیوں دیا۔ آ بیٹی میرے پاس بھاگ آ، پتن کے ساتھ کھیل۔

لڑکی (اونچی آواز سے فریاد کرتے ہوئے) مجھے ـــ مجھے بھوک لگی ہے۔ بائی چنے نہیں دیتی۔

بڈھا۔ بیٹی اب اُس کے پاس چنے کہاں ہیں۔ سویرے سب نے اپنے اپنے حصے کے کھائے تھے۔

لڑکی۔ رکھے تو ہیں۔ بائی نے کون کھائے تھے۔ کھونٹ میں بندھے ہیں۔

ماں (اُسے پیٹتے ہوئے) بندھے ہیں، تیرے لئے۔ کیوں اور میں کیا کھاؤں گی! بڑی لاڈلی آئی کہیں کی۔

بڈھا۔ ارے، کیوں مارتی ہے! ہیں تو دے دے۔ سکھیا، میرے پاس کیوں نہیں آجاتی؟

(لڑکی بڈھے کے پاس جاتی ہے۔ وہ اسے پچکار کر گود میں بٹھا لیتا ہے)

بڈھا۔ (اپنی بہو کو سردی سے ٹھٹھرتا دیکھ کر) ہر دسا کہاں چلا گیا؟ (اپنے بیٹے سے) اور تو بھی بیٹھا بیٹھا کیا کرتا ہے، اجا کر لکڑیاں چن لا اور تھوڑی سی آگ ہی بنا۔ سردی سے ہڈیاں کانپ رہی ہیں۔

نوجوان۔ میں کہاں سے چُن لاؤں۔ ان کو سلگانے کے لئے آگ بھی ہے؟

(بڈھا چپ ہو جاتا ہے۔ بہو تھوڑی دور آگے سڑک پر آگ جلتی دیکھتی ہے)

بہو۔ (دھیمی آواز میں) وہ دیکھو آگ جل رہی ہے تھوڑی سی لے آؤ۔

(سب اسی طرف دیکھنے لگتے ہیں جلتی ہوئی آگ کی روشنی میں ایک کھلی ہوئی گاڑی اور تین آدمی بیٹھے دکھائی دیتے ہیں)

نوجوان۔ بابا چلو، وہیں چل کر بیٹھیں۔ گاڑی کھڑی ہے۔ تمبا کو پینے کو مل جائے گا آگ بھی جل رہی ہے۔

(سب اُٹھتے ہیں)

بڈھا (اِدھر اُدھر دیکھ کر) ارے ہر دسا چل، ہم لوگ گاڑی کے پاس جاتے ہیں۔

(ہر داس اور اُس کا ساتھی کچھ چباتے ہوئے آتے ہیں)

(سب کا جانا)

تیسرا سین

(گاڑی کھڑی ہے سڑک کے کنارے گھاس کا ڈھیر جل رہا ہے۔ ایک سرکاری اہلکار بیوی کو لے کر اپنے گاؤں جا رہا ہے۔ رات کا کھانا کھانے کے لئے وہاں ٹھہرا ہے۔ آگ کے سامنے اہلکار، اس کی بیوی اور گاڑی والا بیٹھے ہیں)

گاڑی والا۔ آج تو بڑی سردی ہے۔

اہلکار۔ ہے تو پر ہم لوگوں کو کیا کرنا ہے۔ گاڑی پر پال تنا ہے۔ یہاں سے چار کوس جگہ اور ہوگی۔ دس گیارہ بجے گھر پہنچ جائیں گے۔ نہیں تو رات بھر یہیں رہنا پڑے گا۔

(بیوی نعمت خانہ میں سے کھانا نکال کر شوہر کے سامنے رکھتی ہے، گاڑی والے کو دیتی ہے اور خود بھی لیتی ہے سب کھانے لگتے ہیں)

(چینیوا آتے ہیں)

بڈھا (آگے بڑھ کر) مہاراج، ذرا ہم لوگ تاپ لیں؟ بیٹھ جائیں؟

اہلکار۔ (ذرا ہٹ کر) ہاں ہاں بیٹھ جاؤ۔

(سب چکر باندھ کر بیٹھتے ہیں)

اہلکار۔ (کھاتے ہوئے) تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟

بڈھا۔ کہیں نہیں۔ ہم لوگ چینیوا ہیں۔

اہلکار۔ ابھی سے نکل پڑے ابھی تو فصل آئی بھی نہیں۔

بڈھا۔ گھر بیٹھے بیٹھے کیا کرتے؟ باہر تو کچھ کام بھی مل جاتا ہے۔ سنتے تھے ادھر کہیں چیت کٹنے لگا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہوگا

اہلکار۔ ادھر تو ابھی دیر ہے۔ مگر کونچ کی طرف فصل کٹنے لگی ہے۔

بڈھا۔ (خوش ہوکر) آپ کو کیسے معلوم ہے؟

اہلکار۔ معلوم ہے۔ اُدھر تو بازار میں نیا اناج بھی آگیا۔

بڈھا۔ کونچ یہاں سے کتنی دور ہوگا، مہاراج۔

اہلکار۔ پندرہ کوس ہوگا۔

بڈھا۔ تب تو بہت دور ہے۔

اہلکار۔ کوئی دور نہیں۔ ابھی سے چلو گے تو دوپہر تک پہنچ ہی جاؤ گے۔

بڈھا۔ (مایوسانہ لہجے میں) دیکھو۔

اہلکار (آگ بجھتی دیکھ کر، گاڑی والے سے) ارے کھلبل تھوڑی سی گھاس اور لا۔ آگ بجھ رہی ہے۔

(کھلبل اٹھتا ہے)

بڈھا۔ اے مہاراج گھاس کاہے کو جلاتے ہو۔ بیلوں کو تو ملتی نہیں۔ ہم تھوڑا سا ایندھن اکٹھا کر لاتے ہیں۔

اہلکار۔نہیں، نہیں، ضرورت نہیں۔ہم لوگ ابھی چلے جائیں گے۔

بڈھا۔ایسی ٹھنڈ میں!

اہلکار۔کچھ ٹھنڈ نہیں۔گاڑی پر پال تنا ہے۔کپڑے بھی کافی ہیں۔چلے جائیں گے۔

بڈھا۔لیکن مہاراج، بیلوں کو ٹھنڈ لگ جائے گی۔

اہلکار۔ٹھنڈ کیا لگے گی! کون سارات بھر چلنا ہے۔ابھی دس بجے پہنچ جائیں گے۔

(اہلکار کی پوریاں ختم ہو جاتی ہیں۔بیوی اُس کے سامنے دو پوریاں اور رکھ دیتی ہے۔چار گاڑی والے کو دیتی ہے۔کسان لڑکا اور لڑکی اب تک برابر اہلکار کا منہ تک رہے تھے۔

لڑکا۔(بے صبر ہو کر اور ماں کے اوپر گر کر) بائی، لُچی، اُوں، اوں لچی۔

ماں (اسے دھکیل کر) بڑا الو کھا ہے۔لچی کہاں سے لاؤں!

لڑکا۔(اہلکار کی طرف دیکھ کر) وہ ہے۔

ماں۔(خفا ہو کر) تو کھالے۔

(لڑکا رونے لگتا ہے)

بڈھا۔(اہلکار سے) مہاراج، ایک لچی ہو تو اس لڑکے کو دے دو، بھوکا ہے۔

اہلکار۔اب تو کچھ نہیں بچا۔

بیوی۔ہے تو۔ایک پوری بچی ہے۔تم تو نہیں لوگے؟

اہلکار۔نہیں۔

(بیوی پوری لڑکے کے سامنے پھینکتی ہے۔اُسے کھانے کے لئے لڑکے کے ساتھ لڑکی بھی جھپٹتی ہے۔پوری لڑکے کے ہاتھ میں پڑتی ہے۔یہ اُسے جلدی سے منہ میں ٹھونس لیتا ہے۔اہلکار ہنستا ہے)

(لڑکی پل بھر تک کھڑی رہتی ہے۔پھر جھپٹ کر پوری پر منہ مارتی ہے۔تب تک لڑکا اُسے صاف کر چکتا ہے۔)

لڑکی۔(اپنی ماں کے پاس جا کر) لچی اُوں اُوں (روتی ہے)

ماں (اہلکار کی طرف دیکھ کر) مہاراج، ذرا سا ٹکڑا ہو تو اور دے دو۔

(اہلکار کھانا ختم کر کے چلنے کی تیاری کر رہا ہے)

اہلکار۔اب تو ہم لوگ کھا چکے۔

(عورت چپ ہو کر لڑکی کو گود میں چھپا لیتی ہے۔ لڑکا اب بھی اہلکار کی طرف دیکھ رہا ہے)

لڑکی۔ (ماں سے چمٹ کر) ہائے، لچھی۔

ماں۔ مجھے کھا لے۔ لچھی کہاں سے لاؤں۔

چوتھا سین

(وہی جگہ۔ اندھیری رات۔ آگ بجھی پڑی ہے۔ گاڑی چلی گئی ہے۔ بڈھا راکھ کے پاس لیٹا ہے۔ اس کے پاس اور لوگ لیٹے ہیں۔ دو نوجوانوں کے سوا سب سو رہے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا چلتا ہے)

نوجوان۔ (کانپ کر) اُف!

دوسرا نوجوان۔ بڑی سردی ہے۔

بڈھا۔ میری ہڈیاں تک کانپ رہی ہیں۔

(بغل میں لیٹے ہوئے لڑکے کو اپنے اور قریب کر لیتا ہے)

نوجوان۔ بابا ایسی سردی تو آج تک نہیں دیکھی۔ انگلیوں میں چنٹی چھوٹ رہی ہے۔ منہ کا خون جم رہا ہے۔

بڈھا۔ اس سے اچھا تو یہی تھا کہ اس گاڑی کے ساتھ ہی چلے چلتے۔

نوجوان۔ تمہیں بیٹھے رہے۔ میں نے تو کہا تھا کہ چلو۔

بڈھا۔ آگ کے آسرے سے بیٹھا رہا۔ اب وہ بھی بجھ گئی۔ چلو کچھ ایندھن اکٹھا کر لائیں۔

نوجوان۔ رات بھر ایندھن ہی اکٹھا کرتے رہیں گے۔ کچھ سوجھتا تو ہے نہیں۔ ایندھن سسرا کہاں ملے گا۔

(اُٹھ کر گھاس پھوس اکٹھا کرتا ہے۔ اُسے آگ پر رکھ کر پھونکتا ہے۔ دھواں)

بڈھا۔ سویرا جانے کب ہوگا۔

نوجوان۔ ابھی تو دیر ہے۔

(اتنے میں لڑکی روتی ہے۔ وہ اپنی ماں سے چمٹی پڑی ہے۔ ماں کا ایک آنچل اُس کے بدن پر ہے اور اُس کے بدن کا آدھا حصہ کھلا ہے)

ماں (لڑکی کو پچکار کر، نیند بھری آواز میں) سو جا بیٹی!

(لڑکی پھر روتی ہے)

ماں (اس پر ہاتھ رکھکر) اے تو کہاں چلی گئی، ادھر کھسک آ۔ (اُسے اپنی چھاتی سے لگا کر آنچل سے اچھی طرح ڈھکتی ہے)
لڑکی (اچانک چونک کر) ہائی، لچھی۔
ماں (اُسے تھپکی دے کر) سوجا، سوجا۔ سویرا ہونے پر تجھے لچھی اور جلیبی دوں گی۔
لڑکی (اُٹھ کر چلاتے ہوئے) اوں اوں، ابھی دے دے —— ابھی۔

(سب کی آنکھ کھل جاتی ہے)

ایک نوجوان۔ یہ کیا آفت ہے؟
بڈھا۔ سکھیا کی ماں، کیا ہے؟
سکھیا کی ماں۔ کچھ نہیں بابا لچھی کے لئے روتی ہے۔ بتاؤ لچھی کہاں سے لاؤں؟ (رونے لگتی ہے)
بڈھا۔ ارے روتی کاہے کو ہو؟
لڑکی۔ (روتے روتے اچانک سردی سے کانپ کر) اُوہو، اُوہو، اُوہو، جاڑا لگتا ہے۔
ماں۔ یہاں آجا بیٹی یہاں، جاڑا لگتا ہے تو کیا کروں۔

(اُٹھ کر آگ کے پاس جاتی ہے)

لڑکی۔ اُوہو، اُوہو، جاڑا، جاڑا۔
ماں۔ (بڈھے کی طرف دیکھ کر) ذرا اپنی چادر دے دو۔

(بڈھا چادر دیتا ہے۔ ماں لڑکی کو اُس میں لپیٹ کر سُلانے کی کوشش کرتی ہے۔ ادھر دونوں نوجوان ایندھن اکٹھا کرتے ہیں)

لڑکی۔ (ایک لحظت اُٹھ کر) ماں!
ماں۔ کیا ہے بیٹی؟
لڑکی۔ اُوہ!

ماں۔ (پریشان ہو کر) کیا ہے؟
لڑکی۔ (کانپتے ہوئے) ڈر لگتا ہے۔
ماں۔ ڈر کاہے کا بیٹی! دیکھو سب بیٹھے ہیں۔
لڑکی۔ ماں، ماں، وہ دیکھو میری لچھی —— لچھی چھین رہا ہے۔

نوجوان: (جو پاس ہی بیٹھا ہے) اسے کیا ہوگیا ہے؟ یہ تو مرنے والوں کی طرح بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔

ماں - جانے بھیا! دیکھو تو کیسی صورت بنا رہی ہے۔ (آنسو پونچھتی ہے)

نوجوان (لڑکی کو گود میں سے کر اور اس کا بدن ٹٹول کر) ارے، اس کا بدن تو بڑا گرم ہے۔ ہاتھ نہیں رکھا جاتا۔

بڈھا - تاپ تو نہیں چڑھی؟

نوجوان - تاپ ہی تو چڑھی ہے۔

ماں - تاپ! ہائے رام!

لڑکی (بے ہوشی میں) اوہ ماں، ماں، وہ دیکھو میری لچھی ــــــ لچھی

(ماں کی گود میں جانے کے لئے تڑپتی ہے)

ماں - لاؤ، بھیا مجھے دے دو۔ یہ تمہارے پاس نہیں رہے گی۔

(اچانک لڑکی چپ ہو جاتی ہے، ماں اسے گود میں لیتی ہے)

ماں - (چونک کر) ارے، اس کا بدن تو ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ تم تو کہتے تھے گرم ہے؟ بیٹی! بیٹی!! او سکھیا!

لڑکی (آنکھیں کھول کر) ماں، ماں بھوت! وہ دیکھو ــــــ میری ــــــ

ماں - بابا ذرا تم تو دیکھو۔ اسے کیا ہو گیا ہے۔ ہاتھ پیر اولے سے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔

بڈھا - گھبراؤ نہیں۔ باہر میدان کی جگہ ہے۔ کہاں کیا ہے، کون دیکھ آیا ہے۔ کچھ ہو گیا ہوگا۔ سویرا ہونے دو۔ ماں درگا کا نام لو۔ اُن کے نام سے سب دکھ دور ہوتا ہے۔

ماں - ماں درگا میری سدھ لو۔ ہائے! بیٹی، بیٹی، تو بولتی کیوں نہیں! جانے سویرا کب ہوگا۔ (روتی ہے)

(ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔ پتے کھڑکھڑاتے ہیں)

لڑکی - ماں! وہ بھوت۔ میں نے کہا تھا، مجھے مت لے چل۔ وہ دیکھ ــــ وہ آیا ــــ ارے رے رے! دانت نکال رہا ہے ــــ مجھے کھا جائے گا ــــ ہائے رے ــــ لے ــــ میری لچھی رے ــــ مجھے مت کھا ــــ لے ــــ لے ــــ

(تڑپ کر جان دے دیتی ہے)

ماں - ہائے بیٹی! (چھاتی پیٹتی ہے)

(سب حیران بیٹھے رہ جاتے ہیں)

ہندی

محفلِ ادب

پہلی شام

بالآخر فضا میں خاموشی چھا گئی، اور دھندلی شفق نے سرِ شب کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ پرندے اور چوپائے خاموشی کے ساتھ بسیرا لینے کے لئے اپنی اپنی جگہ پہنچ گئے۔ صرف ایک بلبل باقی رہ گئی جو تمام رات طرح طرح کے خوش آئند نغمے الاپتی رہی، رفتہ رفتہ آسمان زندہ جواہرات سے جگمگا اٹھا۔ زہرہ اپنے ستاروں کی بے شمار فوج پر حکمران سب سے علیحدہ جگمگا رہی تھی۔

یکایک چاند ایک شاہانہ پندار کے ساتھ نکلا اور اس نے اپنے عدیم المثال حسن کو بے نقاب کر دیا، تاریکی پر اب اس کی سیمیں شعاعوں کی حکومت تھی۔

آدم نے اس حال میں حوّا سے کہا "میری رفیقہ! رات آ گئی، اور ہر چیز آرام کی خواہشمند ہے۔ ہمیں جسمانی آسائش کا خیال رکھنا لازم ہے، اس لئے کہ خدا نے راحت و مشقت ساتھ ساتھ تخلیق کئے ہیں اور آئندہ نسل انسانی کے لئے ان کا مفہوم "شب و روز" سمجھا گیا ہے ــــ اب نیند کی اوس ہماری پلکوں کو خواب کے خوشگوار بوجھ سے جھکائے دیتی ہے۔ خدا کی دوسری مخلوق تمام دن بیکار، غیر ذمہ دارانہ طور پر پھرتی رہتی ہے اس لئے انہیں آرام کی ضرورت کم ہے۔ انسان اپنا روزمرہ کا معینہ دماغی یا جسمانی کام کرنے کے لئے بنایا گیا ہے جو خدا کی نظروں میں اسے دوسری مخلوق سے علیحدہ اور ہر لحاظ ممتاز بناتے ہوئے ہے برخلاف اس کے اور حیوانات بے کار گھومتے رہتے ہیں۔ اس لئے ان کے اعمال پر خدا بھی متوجہ نہیں۔ حوّا اس طرح مخاطب ہوئی۔

"میرے آقا! میری تخلیق کے راز، تیرا حکم بلا دلیل ماننا میرا فرض ہے، خدا کی یہی مرضی ہے۔ خدا تیرا قانون ہے اور تو میرا اس سے زیادہ نہ جاننا ہی عورت کی بہترین علمیت اور اعلیٰ ترین صفت ہے، میں جب تجھ سے مصروفِ گفتگو ہوتی ہوں تو تمام موسمی تبدیلیوں کو بھول جاتی ہوں اور میرے لئے ہر لمحہ پیغامِ راحت ہوتا ہے۔ صبح کا خوشگوار تنفس، طلوع کی دلکش کیفیت پرندوں کے سہانے نغمے، سورج کی بے شمار جھاڑیوں، درختوں، پھلوں، پھولوں پر چمکنے والی نورانی مشرقی شعاعیں، بذاتِ خود میرے لئے ایک ناقابلِ اظہار مسرت ہیں۔

بارش کی ہلکی پھواروں کے بعد بیش بہا شبنمی موتیوں میں جگمگاتی ہوئی معطّر اور زرخیز زمین، اس کے بعد سہانی خوشگوار شام کی آمد، پھر خاموش رات کا نزول اور اُس میں بلبل کے دلکش راگ، چاندی کی کرمزی شعاعیں، ستاروں کے آسمانی جواہرات غرض ہر چیز مسرت ہی مسرت ہے۔

لیکن پرندوں کے سحر آفریں نغمات میں صبح کا خوشگوار تنفس، سورج کی سطح زمین پر جگمگاتی ہوئی باصرہ نواز شعاعیں، شبنمی موتیوں میں چمکتی ہوئی نوخیز جھاڑیاں اور پھل پھول، ہلکی پھواروں سے نکلتی ہوئی بھینی بھینی خوشبوئیں، شام کی خوشگواری، رات کا سکون، بلبل کے نغمے، چاند کی قرمزی شعاعیں۔ستاروں کی جواہراتی چمک دمک ـــــ ہر شے میرے لئے بے معنی ہے،

اگر تو میرے پاس نہیں ہے"

"عالمگیر"

کتاب خانۂ اسکندریہ کے لائبریرین کا خط

ڈیمٹ ری ایس شاہِ والا تبار کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ جب تو نے کتابوں کی فراہمی اور تنظیم و نگرانی کی خدمت میرے سپرد کی تو میں نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔اب عرض ہے کہ اور کتابوں کے ساتھ ساتھ ہمیں یہودیوں کی کتبِ شریعت بھی درکار ہیں - یہ عبرانی حروف اور اس قوم کی زبان میں ہونے کی وجہ سے ہمارے دائرۂ علم میں نہیں آسکتیں۔اس کے علاوہ ان کی کتابت بھی مناسب احتیاط سے نہیں کی گئی کیونکہ اب تک اُن کو شاہانہ لطف توجہ نہیں حاصل ہوا۔اب یہ ضروری ہے کہ تو اس کے مستند اور صحیح نسخے تیار کرائے۔یہ شریعت حکمت و دانش سے معمور ہے کیونکہ یہ قانونِ الٰہی ہے۔اور اسی بنا پر جیسا کہ ہکٹیس باشندۂ ابدرا کا خیال ہے، مورخین اور شعرا کے ہاں اُن کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا اور نہ خود ان لوگوں نے اس کا کچھ حال لکھا جو اس شرع کے پابند ہیں کیونکہ یہ مقدس قانون ہے اور ناپاک زبانوں سے اس کی اشاعت نہیں ہو سکتی۔لہٰذا التماس ہے کہ تو یہودیوں کے سردار کاہن سے ہر قبیلہ کے چھ چھ ممتاز افراد اور دیگر ماہرانِ شرع کو طلب کر تا کہ ان کی مدد سے ہم ان صحائف کی روح کو پائیں اور ان کے مضامین کی حقیقی تعبیر و تفسیر سے واقف ہوں۔اس طرح تیرے کتب خانہ میں خاطر خواہ ذخیرۂ کتب جمع ہو سکے گا۔

"تاریخ"

ایرانی ماں کا گیت

اُٹھ ماں تجھ پر قربان! اُٹھ کہ اب تو بہت سو چکا! اُٹھ کہ اب تجھ پر سونا حرام ہے! اُٹھ کہ تیرا باپ آزادی کی راہ میں مارا گیا اور اپنی جگہ تیرے سپرد کر گیا۔ اُٹھ کہ میرا دودھ تیرے لئے حلال ہو۔ میری جان تجھ پر فدا ہو! تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے! تو اپنے باپ کی یادگار ہے!

اُٹھ! کہ میں تیرے باپ کی یہ تلوار تیری کمر سے باندھ دوں اور تجھے میدانِ جنگ میں بھیج دوں۔ اُٹھ کہ دشمن گھر کے دروازے تک پہنچ چکا ہے اپنے باپ کی جگہ کھڑا ہو اور اس کا بدلہ لے! اُٹھ میرا دودھ تجھ پر حلال ہو اور میری جان تجھ پر فدا ہو۔ تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے تو اپنے باپ کی یادگار ہے۔ اُٹھ! میری دونوں آنکھوں کے چراغ تیرے باپ کے بعد تیری ماں بے کس ہے بیدا و رس ہے اور تیرے سوا اس کے لئے کوئی امید گاہ اور پشت و پناہ نہیں۔ دشمن دروازے کی چوکھٹ پر پہنچ چکا ہے۔ اُٹھ اور اپنی ماں کے ناموس کی حفاظت کر! اُٹھ کہ میرا دودھ تجھ پر حلال ہو۔ میری جان تجھ پر فدا ہو۔ تو میرے دل کا ٹکڑا ہے! اور اپنے باپ کی یادگار ہے! اُٹھ میرے دل کے پرتو اُٹھ! اپنی آنکھیں کھول کہ میں تیری آنکھوں میں غیرت و شجاعت کے وہ نشان دیکھوں جو تیرے باپ کی نگاہ میں موجود تھے! آہ تیری آنکھیں تیرے باپ کی آنکھوں کے کس قدر مشابہ ہیں! اُٹھ کہ میرا دودھ تجھ پر حلال ہو! میری جان تجھ پر فدا ہو! تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے تو اپنے باپ کی یادگار ہے۔

اُٹھ! میری جان کی روح اُٹھ! کیا تو ناقوس کی آواز اور اپنے بھائیوں کی فریاد نہیں سنتا۔ تیرے رفیق تیرا انتظار کر رہے ہیں اور تجھے مدد کے لئے بلا رہے ہیں! اُٹھ! اور میدانِ جنگ کی طرف دوڑ! یا تو سربلندی اور فیروزی کے ساتھ واپس آ یا اپنے باپ کی جگہ آزادیٔ وطن کی راہ میں اپنے باپ کی طرح جان قربان کر۔ اُٹھ کہ میرا دودھ تجھ پر حلال ہو۔ میری جان تجھ پر فدا ہو۔ تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے تو اپنے باپ کی یادگار ہے!

"ادبی دنیا"

قافیہ

قافیہ نظم میں آبشار کا کام دیتا ہے۔ خیال کا تسلسل اور الفاظ کا ترنم قافیہ کی چٹان سے ٹکرا کر ابھرتا اور بلند ہوتا ہے، اور اگر قافیہ کو غزل کی طرح خیال کے بہاؤ کی روکنے والی دیوار بنا دیا جائے تو پھر خیال قافیہ پر سے ابل کر کھلکھلاتا اور ترنم کی دھواں دھار بوچھاڑ کرتا، دوسرے مصرع میں سریلی ہلچل ڈال دیتا ہے اور پھر اس مصرع کے ترنم کو ساتھ لے کر

آگے کے مصرعوں میں قافیہ پر سے چادر کی طرح بہتا، نغمہ بلند کرتا ہوا پورے بند کے بند کو خیال کے تسلسل اور موسیقی کے اتار چڑھاؤ سے ایک دلفریب زندہ چیز بنا دیتا ہے!"

"مجلہ عثمانیہ"

جب تو مجھے نغمہ سرائی کا حکم دیتا ہے

جب تو مجھے نغمہ سرائی کا حکم دیتا ہے تو میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا دل غرور کے مارے پھٹ جائے گا۔ میں تیرے چہرے کی طرف دیکھتا ہوں، اور میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے ہیں۔

زندگی میں جو تلخی اور ناموافقت ہوتی ہے وہ تمام ایک خوش کن ہم آہنگی میں مبدل ہوجاتی ہے اور میری پرستش ایک خوش وخرم پرندے کے مانند جو دریا کے پار گذر رہا ہو، اپنے بازو پھیلا دیتی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ تو میرے نغمے سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں صرف ایک مغنی ہی کی حیثیت سے تیرے حضور میں آسکتا ہوں۔

میں اپنے نغمے کے دُور رس بازوؤں کے سِروں سے تیرے قدموں کو چھوتا ہوں، جن تک پہنچنے کی میں کبھی امید نہیں کرسکتا۔

نغمے کی خوشی میں مست ہوکر میں اپنے آپ کو بُھول جاتا ہوں، اور تجھے جو میرا آقا ہے، دوست کے لقب سے یاد کرتا ہوں،

"اجمل"

انسان کی حقیقت

زمین بہ مقابلہ ان نو نیلے گنبدوں کے ایسی ہے جیسے ایک خشخاش کا دانہ سمندر کی سطح پر، اور تُو اس دانے کے مقابلہ میں کیا ہے؟ ــــــــــ نیوٹن

میں کہتا ہوں! انسان کیا ہے؟ وہ ایک حقیر چیز ہے، ایک مشتِ خاک اور حیاتِ دوروزہ، ایک سانس سے زندگی اور موت کے درمیان رو کے ہوتے ہے ــــــــــ پسکل

"اردو"

تبصرہ

غالب۔ مولفہ ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب پی، ایچ ڈی، پروفیسر جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ یہ مرزا غالب کے کلام اور زندگی کی تنقید ہے۔ کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی نقطۂ نظر بھی مغربی پیش کیا گیا ہے۔ شعر کی تعریف اور شاعری کی مثالیں تمام انگریزی سے اخذ کی گئی ہیں۔ حالانکہ قومی اور مذہبی روایات کی بنا پر مشرق اور مغرب کے تخیل میں بہت کچھ فرق ہے جس میں امتیاز کرنا ایک نقاد کا اولین فرض ہے۔

فاضل نقاد کو غالب کے اشعار پر "سخن ناشناسوں" کی تحسینِ بے جا کا بڑا گلہ ہے۔ سب سے زیادہ شکایت انہیں علامۂ بجنوری مرحوم سے ہے جنہوں نے جوشِ عقیدت میں یہاں تک کہہ دیا کہ "لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں، کونسا نغمہ ہے جو اس سازِ زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں!" اور جب غالب کے پرستار اس فقرے کو دہراتے ہیں تو انہیں سخت ناگوار گزرتا ہے۔

غالب کی نسبت اُن کی اپنی رائے یہ ہے کہ وہ دوسرے غزل گو شعرا کی طرح وہ بھی اپنے آپ کو صوفی اور فلسفی ظاہر کرتا ہے اور عشق، جام اور شراب کے جادۂ مبتذل پر گامزن ہے، اور اگر کبھی اُس نے کوئی نئی راہ اختیار کی ہے تو وہ قنوطیت کی راہ ہے۔ غالب کی اردو شاعری کو وہ جذبات سے معرا اور تصنع سے پُرخیال کرتے ہیں۔ ایک ستم انہوں نے یہ کیا ہے کہ غالب کے کلام کی کم مائیگی ثابت کرنے کے لئے اس کے بہترین اشعار منتخب کئے ہیں اور دلیل کوئی پیش نہیں کی مثلاً۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے ‏ ‏ ‏ کاش کے ادھر ہوتا عرش سے مکاں اپنا

کے متعلق فرماتے ہیں کہ "اس میں فلسفہ ہی کون سا ہے"؟ اور

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ‏ ‏ ‏ ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

کی نسبت لکھتے ہیں کہ "اس میں لفظی چھل بل کے سوا اور کیا رکھا ہے"؟ پھر

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور ‏ ‏ ‏ جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

کے متعلق فرماتے ہیں کہ "اس میں کوئی نئی بات بھی ہے"؟

بہرحال کتاب دلچسپ ہے، حجم ۱۴۰ صفحات قیمت تین روپے۔ جناب مولف سے طلب فرمائیے!

جلد ۱۶ — نمبر ۴

فہرست مضامین

بابت ماہِ اکتوبر ۱۹۲۹ء

تصاویر:- ۱- کوہِ سہسرام کا ایک دلکش منظر- ۲- حکیم عمر خیام

خلوت و جلوت

اپنی خلوت میں الگ بیٹھا ہُوا اپنی ہی چاردیواری میں گھرا ہُوا میں دنیا و عقبیٰ اور حیات و ممات کی الجھنوں کے سلجھانے میں مصروف ہوں۔ دنیا کو کس نے بنایا اور پھر اس کے پیچھے عقبیٰ کیوں ہوئی اور اس کے پہلے کیا تھا اور نہ تھا تو کیوں نہ تھا؟ اس سب کچھ کے اندر زندگی کی روح کیسے پھُنکی اور پھُنکی تو پھر اک ہوا کے جھونکے کی طرح کس لئے اس چمنِ زار میں اُدھر سے آئی اور اِدھر سے چل دی؟ یہ زندگی جس نے بیل بوٹوں کو اگایا پرند چرند کو اڑایا دوڑایا یہ مجھ میں آکر کیوں نرمی سانس لینے والی چلنے پھرنے والی کھانے پینے بولنے چالنے والی جان نہ بنی رہی؟ میرے اس دیس کے خاکی و ارضی جسم میں آکر یہ پردیسن کس سوچ بچار میں پڑ گئی؟ دیکھتی ہے سنتی ہے سوچتی ہے اور سر بگریباں ہو جاتی ہے! کیا یہ اس چھوٹے سے قید خانے میں بند کر دی گئی جس کی کھڑکیاں آنکھیں ہیں جو ہزاروں اور کروڑوں میل کے نظاروں کا پل کے پل میں عکس اتار لیتی ہیں جس کی غلام گردش دماغ ہے جو ایک چشم زدن کے ہزارویں حصے میں اُس دور دراز حریم ناز کے دروازے پر جا دستک دیتا ہے جس کا رہنے والا شاید اسی سبک رفتار کے ساتھ کائنات کی وسعتوں میں کوئی آنکھ مچولی سی کھیل رہا ہے؟

اپنے گھر میں اس گھر والی سے یہ باتیں پوچھتا ہوں تو یہ اندر ہی اندر ایک کرب سا ایک بے چینی سی پھیلا دیتی ہے۔ میں اُٹھ کر ٹہلنے لگتا ہوں اور میری نگاہ اُن چند کتابوں پر جا پڑتی ہے جو میری الماری کی سچی زینت اور میری ہستی کی ایک جھوٹی تشفی کا موجب ہیں۔ اپنی بےتابی میں یکے بعد دیگرے میں اُن کو اٹھاتا ہوں۔ ایک کہتی ہے کائنات کا بنانے والا! اچھا تو پھر اُس کا بنانے والا؟ اور پھر اُس بنانے والا کا بنانے والا؟ فضول لغو بے معنی! دوسری کہتی ہے رحیم و رحمٰن؟ عالم و عادل؟ نیک و پاک؟ اور اس پر یہ برائیاں! داہو سیاہی چھوٹے بڑے کے جھگڑے یہ کمزوروں پر طاقتوروں کے ظلم یہ تکلیفیں اور مصیبتیں؟ بے عقلی کج فہمی خوش گمانی!

جاہل مریدوں کم عقل صوفیوں اور بے علم انسانوں کو طعن و تشنیع کرتا ہُوا اپنے نفس سے باغی و بیزار ہو کر میں گھر سے نکل پڑتا ہوں لیکن اپنی خلوت سے یوں پہلو بچاتا ہُوا میں کسی کی جلوت سے دوچار ہو جاتا ہوں! اب محض اک میں ہی وہاں نہیں بلکہ یہاں تو مجھ سے کروڑوں اور بھی ہیں اور یہ پھیلتی ہوئی زمین اور یہ اُٹھتے ہوئے پہاڑ اور یہ سورج کی کرنیں اور یہ بادلوں کے پرے اور دور دور وہ سمندر اور وہ صحرا اور وہ غار اور وہ چوٹیاں اور پھر وہ چاند اور تارے اور اُن کی درمیانی مسافتیں اور اور کوئی مانے نہ مانے لیکن اور اَن دیکھی اَن ہستی اور اَن بوجھی خدا ہی جانے کیا کیا کچھ!!!

"خلوصی"

جہاں نما

جرمنی اور انگلستان کا لٹریچر

جریدۂ "لونگ ایج" کے بہرۂ ادبیات میں جرمنی اور انگلستان کے لٹریچر پر ایک دلچسپ مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ

"برلنر ٹیجبلیٹ" اور "مانچسٹر گارڈین" نے جرمنی اور انگلستان کے موجودہ ادب پر نہایت دلچسپ روشنی ڈالی ہے۔ جرمن اخبار لکھتا ہے کہ ۱۹۲۸ء کے دوران میں ہماری مطبوعات کی تعداد میں کمی واقع ہوگئی ہے اور انگریزی اخبار نے یہ قیافہ لگانے کی کوشش کی ہے کہ اب سے ایک سو سال بعد موجودہ برطانی افسانہ نویسوں میں سے کون کون سے بہت زیادہ مقبول ہونگے۔

جنگِ عظیم سے پہلے اور اُس کے بعد بھی جرمنی برابر کتابوں کی پیداوار میں سب قوموں سے بڑھا ہوا تھا۔ صرف ۱۹۱۹ء میں وہاں ۱۵۸۷۶ کتابیں شائع ہوئیں، لیکن ۱۹۲۲ء میں اُن کی تعداد ۳۲۲۶۱۴ تک پہنچ گئی۔ دو سال بعد تعداد گر کر ۳۰۹۸۱ رہ گئی، لیکن ۱۹۲۵ء میں پھر ۲۴۸۶۰ کتابیں طبع ہوئیں اور ۱۹۲۶ء میں ۲۶۹۵۱۔ ۱۹۲۷ء میں نئی اور پرانی جتنی کتابیں طبع ہوئیں اُن کا میزان ۳۱۰۲۶ تھا اور ۱۹۲۸ء میں ۲۷۷۹۴۔ ہمارے اپنے ملک (امریکا) میں سالانہ اوسط دس ہزار سے کچھ کم ہی رہتی ہے اور برطانیہ عظمیٰ میں اس سے ذرا بڑھ کر۔

گزشتہ سال کی جرمن مطبوعات کا تجزیہ ظاہر کرتا ہے کہ ادبِ لطیف کی کتابیں دوسری اصنافِ کتب سے تقریباً دوگنی شائع ہوئیں۔ ان کی تعداد ۵۰۰۰ کے قریب تھی، دوسرے درجے پر مدرسے کی کتابیں اور تیسرے درجے پر صنعیات اور دینیات کی کتابیں تھیں۔ گزشتہ سال کی بہ نسبت دو ہزار سے اوپر کتابیں معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی مضامین پر نکلیں۔ اگرچہ رومن حروف کا رواج ہر جگہ بڑھ رہا ہے لیکن جرمنی میں اب تک نصف سے زیادہ کتابیں گوتھک حروف میں چھپتی ہیں۔ تراجم کی مانگ بہت بڑھی ہوئی ہے۔ چنانچہ گذشتہ سال ان کی تعداد ۱۶ فیصدی سے متجاوز ہوگئی۔ پانچ سو سے زائد کتابیں انگریزی زبان سے ترجمہ ہوئیں۔ ۲۰۸ فرانسیسی سے اور ۱۶۷ روسی سے۔

انگلستان کے ادبی کوائف ماضی کی بجائے مستقبل کے متعلق ہیں "مانچسٹر گارڈین" میں یہ معلوم کرنے کے لئے ایک مقابلہ جاری تھا کہ ۲۰۲۹ء میں عہدِ حاضر کے کون کون سے برطانی افسانہ نویس سب سے زیادہ مقبول سمجھے جائیں گے۔ مقابلہ میں شامل ہونے والے ہر شخص کو چھ افسانہ نویسوں کے نام تحریر کرنے کی اجازت تھی جن کی تصانیف اُن کی رائے میں آج سے سو سال بعد سب سے زیادہ پڑھی جائیں گی کسی فہرست میں وہ چھ نام یکجا موجود نہ تھے جو آخر مقبول ترین ثابت ہوئے، لیکن اول درجے کا انعام اُس شخص کو ملا جس نے ویلز، بینٹ، جارج مور، گالزوردی، شیلا کے سمتھ، اور آر ایچ ماٹرم کے نام لکھے تھے۔ پہلے بیس ناموں کی فہرست یہاں درج ہے، اور ساتھ ہی اُن آرا کی تعداد بھی دی گئی ہے جو ہر ایک کے لئے موصول ہوئیں۔

نام	آرا
گالزوردی	۱۱۸۰
ویلز	۹۳۳
بینٹ	۶۵۴
کپلنگ	۴۵۵
بیری	۲۸۶
وال پول	۲۳۳
کے سمتھ	۱۹۸
جارج مور	۱۶۵
برنارڈ شا	۱۱۰
کانن ڈائل	۱۰۱
آر ایچ ماٹرم	۷۹
جان بوشن	۶۳
ڈی ایچ لارنس	۶۱
چسٹرٹن	۶۰
الڈوس ہکسلے	۵۰
ہال کین	۴۸
ہیز فیلڈ	۴۶

لاک ۴۶

روز میکالے ۴۱

فلپاٹس ۳۸

برنارڈشا کو زیادہ بلند جگہ اس لئے حاصل نہیں ہوئی کہ اُس کی شہرت کا انحصار افسانے کی بجائے ناٹک پر ہے لیکن یہ تعجب کی بات ہے کہ ہکسلے اور لارنس کو زیادہ آرا کیوں حاصل نہ ہوئیں۔ یہ امر بھی کچھ کم عجیب نہیں کہ ای ایم فاسٹر کو ۳۰، ورجینیا ولف کو ۲۱، کامٹن میکنزی کو ۱۶ اور جیمس جائس کو دس سے بھی کم آرا ملیں۔ امریکا والے یہ دیکھ کر بھی حیران ہونگے کہ مس سے سمتھ کو ایک کافی بلند مقام ملا ہے لیکن اس کی مقبولیت کی یہ وجہ ہے کہ اُس نے اپنی قابلیت کو اپنے محبوب وطن کے مناظر کے بیان کے لئے وقف کر رکھا ہے اور یہ بات انگریزوں کو بہت بھاتی ہے۔ امریکا کے اہل قلم اس مقابلے میں شامل نہ تھے۔

چینیوں کی "ذہانت"

چین کے کئی ایک اخبارات نے یہ خبر شائع کی ہے کہ چینی پولیس نے قیدیوں کی تعذیب کے لئے ایک برقی مشین منگائی ہے۔ ان اخبارات میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں اُن سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ انہوں نے یہ طریق عمل بین الاقوامی آبادی کی پولیس کی تقلید میں شروع کیا ہے، لیکن جب کپتان مارٹن کمشنر پولیس سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ "اس بیان میں کوئی صداقت نہیں ہے، اس پر عمل نہیں کیا جاتا اور اس کی اجازت کبھی نہیں دی جائے گی۔ بعض قیدیوں نے صوبجاتی عدالتوں میں یہ شکایت کی ہے مگر جب عدالت نے تحقیقات کی تو اس کی کوئی اصلیت نہ نکلی۔"

کرنل یو آن جو شنگھائی میں شعبۂ امنِ عامہ کے ڈائرکٹر ہیں اغوا اور ڈکیتی کے بڑھتے ہوئے حادثات کے پیشِ نظر یہ رائے رکھتے ہیں کہ اس سے کم درجہ کی کوئی سزا ان رہزنوں کی سرکوبی نہیں کرسکتی اور نہ اس کے بغیر امن عامہ کا قیام ممکن ہے۔ جن جن مجرموں کو جسمانی سزا انہیں دی گئی اُن کے معاملے میں ترغیب و تحریص کی تمام کوششیں بے کار ثابت ہوئی ہیں، انہوں نے جرم کا اقرار نہیں کیا اور معاملہ کی حقیقت واضح نہیں ہو سکی۔ چونکہ جسمانی سزا حکومت کے احکام کے خلاف ہے اس لئے کرنل موصوف کی تجویز سے اور جنرل چنگ کی منظوری سے مجرموں کی تعذیب کے لئے ایک ایسی برقی مشین خریدی گئی ہے جس کے دو کھمبوں کے ساتھ دو منفی اور مثبت تاریں لگی ہوئی ہیں۔ ہر تار کے سرے پر دھات کا ایک دستہ ہے۔ قیدی کے کپڑے اتروا کر اسے ایک لکڑی کی ... کرسی سے مضبوطی کے ساتھ کس دیا جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ سینے پر رکھے جاتے ہیں اور ان میں

پر دھات کے دستے دے دیئے جاتے ہیں۔ پھر بجلی کی رو کھول دی جاتی ہے اور وہ مجرم کے سارے بدن سے ایسی ناقابل برداشت سنسنی پیدا کرتی ہوئی گزرتی ہے کہ وحشی سے وحشی ڈاکو بغیر کسی مزید کوشش کے جرم کا اقرار کر لیتا ہے۔

آفتاب

آفتاب ہماری دنیا کے لئے توانائی کا سرچشمہ ہے۔ توانائی کے وہ تمام وسیع خزانے جو کوئلے اور تیل میں پوشیدہ ہیں سبز پتوں نے انہیں سورج کی روشنی ہی سے اخذ کیا ہے۔ پروفیسر فریڈ ایم ڈیلانو کے قول کے مطابق آفتاب کی اس توانائی کی مقدار جو ہر روز زمین تک پہنچتی ہے اُس توانائی کے برابر ہے جو آٹھ ارب ٹن کوئلے سے برآمد ہو۔

صرف ایک دن کی دھوپ سے اگر کام لیا جا سکے تو ساری دنیا کے کارخانے، ریل گاڑیاں اور دخانی جہاز بیس ہزار سال تک چل سکتے ہیں۔

ایک مربع گز قطعۂ زمین پر جو تپش دس منٹ میں پڑتی ہے وہ ایک کوارٹ پانی کو ابال دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن چونکہ ابھی ہم نے اس سے کام لینا نہیں سیکھا اس لئے اس کی تقریباً تمام کی تمام مقدار ضائع چلی جاتی ہے۔ سورج کی تپش اس قدر تیز ہے کہ ۹۹ فی صدی شیشے میں سے گزر جاتی ہے۔ تپش ایک ایسے ڈبے میں جمع کی جا سکتی ہے جس کا ڈھکنا شیشے کا ہو اور جو اندر سے کالا ہو۔ لارڈ ہرشل ایک ایسے ہی ڈبے میں سورج کی تپش سے انڈے پکا لیا کرتے تھے۔ روشن ملکوں میں استعمال کا پانی گرم کرنے کے لئے دھوپ ہی سے کام لیا جاتا ہے۔ دھوپ سے پانی گرم کرنے کے آلات فلوریڈا اور کیلیفورنیا میں کثرت سے رائج ہیں۔

ذرّے کی جسامت

آخر حکما نے دوسرے رخت و جنس کی طرح ذروں کو بھی تول اور ناپ لیا ہے۔ ماؤنٹ ولسن کی رصد گاہ کے ڈاکٹر ولسن کہتے ہیں کہ انسان کو ذرّے اور ستارے کی درمیانی منزل میں نصف راستے پر سمجھنا چاہئیے۔ دس کھرب کھرب کھرب ذروں سے ایک آدمی کی تعمیر ہوتی ہے اور ایک سو کھرب کھرب کھرب انسانوں کا مادہ ایک اوسط درجے کے ستارے کے برابر ہوتا ہے۔ ذرّے کا قطر انچ کے دس کروڑویں حصے سے بھی کم ہے۔ بہ مقابلہ ایک گالف کے گیند کے ذرّے کی اضافی جسامت اتنی ہی ہے جتنی گالف کے گیند کی زمین کے مقابلے میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر گیند کے ہر ذرّے کو گیند کے برابر کر دیا جائے تو گیند زمین کے برابر ہو جائے گا۔

Photo by Shahabuddin Rahmatullah

کوہ سہسرام کا ایک دلکش منظر

فرہاد کا ناوک ہے نشاں کوہ کے اوپر اک چشمۂ شیریں ہے رواں کوہ کے اوپر

حکیم عمر خیام

CALCUTTA
ART PG WORKS,
LAHORE
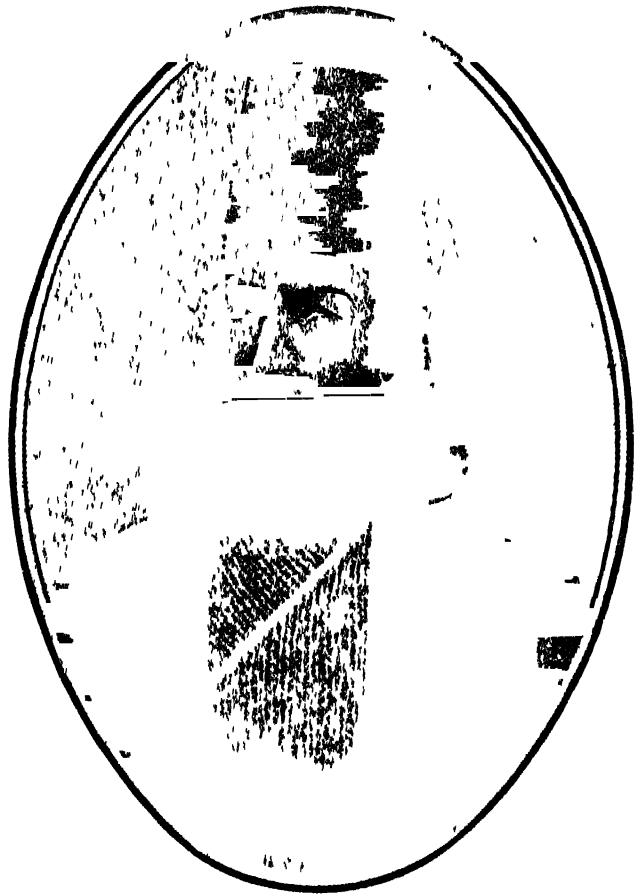
عمرِ خیّام

اس دنیا میں ہر شخص مسرت طلب پیدا کیا گیا ہے۔ آدمی پر جو کچھ آلام و مصائب گزرتے ہیں، ان سے عہدہ برآ ہونے، اور ان میں تا بمقدور تخفیف کرنے کی دلی خواہش قلبِ انسان میں ہمیشہ مستور رہتی ہے۔ آج جو چیز نئی ہے کل پرانی ہو جائے گی۔ جو آج پیدا ہوا ہے وہ کل مر جائے گا، جہاں آج بہار ہے وہاں کل خزاں ہوگی۔ انہیں مشاہدات کی بنا پر آدمی کے دل میں اس وقت جو و بجو سوالات پیدا ہونے لگتے ہیں جب اس کی عمر ذرا بھیگ جاتی ہے اور وہ عہدِ شباب سے نکل کر پیری میں قدم رکھتا ہے۔

یہ دنیا کیا چیز ہے؟ روح کیا چیز ہے؟ موت کیا چیز ہے؟ زندگی کیا چیز ہے؟ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ کیوں آئے ہیں؟ اور کہاں جائیں گے؟ زندگی کا اعتصام کیا ہے اور اختتام کیا ہوگا؟

ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک ان سوالات کا تشفی بخش جواب کسی نے نہیں دیا ہے۔ مشہور ہیئت دان اور فلسفی شاعر عمر خیام نے ان رموز و نکات کو اپنی لطیف رباعیات میں حل کرنے کی جو سعی کی ہے وہ قابلِ داد ہے اور اس بنا پر آج وہ دنیا سے خراجِ تحسین وصول کر رہا ہے۔

بقول اس کے روح ایک جنسِ لطیف ہے جس کا علاقہ جسم سے سوا ذاتِ باری سے براہِ راست ہے۔ اس کا پیغام ہے کہ روح کو دنیا کی تمام کشمکشوں سے پاک رکھو۔ طبیعت پر کبھی غم، تردد، افسوس، فکر اور طمع کا بار نہ ڈالو۔ ہمیشہ بے نیاز رہو۔ ایثار اور قربانی کی حقیقی روح اپنے اندر پیدا کرو۔ اگر تم میں ایثار کا جذبہ موجود نہ ہوگا تو تمہاری روحانیت تباہ ہو جائے گی۔

عمر خیام کسی ایک خاص مذہب و مسلک کا پیرو نہیں ہے۔ اس کے لئے عام مذہبی معتقدات بہت اچھے ہیں، اور عالمگیر مذہب کا وہ قائل ہے۔ اس کا خیال ہے کہ صداقت ہر جگہ جلوہ گر ہے۔ وہ کسی خاص مذہب و ملت کے لئے وقف نہیں ہے۔ خدا نے تمہیں جو دل دیا ہے وہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں تم حق و باطل کی تصویر بعینہٖ دیکھ سکتے ہو۔ "جیسا کرو گے ویسا بھرو گے" اس کا خیال نہیں ہے بلکہ وہ اس امر کا قائل ہے کہ جو کچھ واقعات حیاتِ انسانی میں گزرتے رہتے ہیں وہ سب تقدیرِ الٰہی کے ماتحت ہوتے ہیں۔ بغیر خدا کی مرضی اور حکم کے پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ لہذا ہمیں جب کوئی تکلیف پہنچے، یا راحت و کامرانی نصیب ہو تو یہی تیقن ہماری تسکینِ قلب کا ضامن ہوگا کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہے اور وہ جو کچھ کرتا ہے بہتر کرتا ہے اور اس کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں۔

انسانی زندگی ایسی ہے جیسے کنول کے پھول کی پنکھڑیوں پر قطرہ ہائے آب ہوتے ہیں۔ ذرا ہوا کا جھونکا آیا، قطرہ پھسل کر دریا میں مل گیا، اور پھر وہاں کچھ بھی نہیں رہا۔ لہذا انسان کی قابلیت، حسن، شجاعت، دولت، حشمت، سب فانی اور چند روزہ ہے، اگر بقائے دوام حاصل ہے تو صرف اس کی روح کو۔ عمر خیام کو خدا پر انتہائی توکل ہے۔ وہ اپنے گناہوں کا ہمیشہ معترف رہتا ہے اور توبہ کرتا رہتا ہے۔

عمر خیام کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ باوجودیکہ تنگ خیال اور متعصب ملاؤں کے درمیان اس کی پرورش اور تربیت ہوئی، تاہم وہ تعصب اور مذہبی امتیاز سے بالکل مبرا اور منزہ رہتا ہے۔

تخیل کی رفعت اس کے کلام کی ایک خاص شان ہے۔ اس کے جامِ سفالی کے ایک ایک ذرے میں ہزاروں خوبصورت چہرے، خندہ ہائے گل مسرت و کامرانیٔ حیات ملے ہوئے ہیں، جو کبھی خاک میں مل گئے اور پھر کمہار نے اُن کی خاک کا جام تیار کیا! اسی طرح خیام کے کاشانے کی ایک ایک اینٹ میں غرور و تمکنت اور شاہانہ اقتدار والے تاج داروں کے سر کی خاک ملی ہوئی ہے۔

عمر خیام باوجودیکہ فضل و علم میں کامل ہے، تاہم اپنے آپ کو انتہائی کسرِ نفسی سے جاہلِ مطلق تصور کرتا ہے۔ اُس کا مقولہ ہے۔

تمہارا آخری مقصد خدا کی ذات ہونی چاہئے

حسن عزیز جاوید

ذوقِ شاعری

تھوڑی دیر کے لئے شاعری کی بحث سے بالکل الگ ہٹ کر سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ "مذاق" یا "ذوق" جسے انسان کی دماغی خوبیوں میں "جمالی" نقطۂ نظر سے سب سے بہتر تصور کیا جاتا ہے در اصل ہے کیا چیز؟ مختصر الفاظ میں یہ تعریف پیش کی جا سکتی ہے کہ "ذوق اُس قوت کا نام ہے جس کے ذریعہ ہم خوبصورت چیزوں کے حسن سے متاثر ہوتے ہیں" قدرتی طور پر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ذوق کوئی "اندرونی حاسہ" ہے جو حسن کے اثر کو قبول کرنے کا کام انجام دیتا ہے یا اس قوت کا تعلق عقلی براہین اور خارجی دلائل سے ہے! یعنی ذوق کا تعلق وجدانِ قلب سے ہے یا تعقل سے ہے؟ اس بات کی تہ تک پہنچنے کے لئے ہمیں اپنے تجربہ سے دریافت کرنا پڑے گا کہ جب ہم کسی خوبصورت چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہم پر اُس کے حسن کا اثر کیونکر اور کس طرح کام کرتا ہے؟ آیا اس قلبی اثر کے لئے ہم اپنے فطری وجدان کے ممنون احسان ہوتے ہیں یا عقل اور تمیز کی عقدہ کشائی کے؟ جب ہم کوئی روح افروز منظر دیکھتے ہیں یا کوئی تڑپا دینے والا گیت سنتے ہیں تو کیا ہم پر ان چیزوں کا محض اس لئے اثر ہوتا ہے کہ چند مخصوص دلائل کی بنا پر وہ منظر قابلِ ستائش قرار پاتا ہے اور گیت سے محظوظ ہونے کے لئے ہمارے پاس متعدد عقلی وجوہ موجود ہوتی ہیں۔

ہمارا تجربہ ان سوالات کا یہ جواب دیتا ہے کہ خوبصورت مناظر یا سامعہ نواز صداؤں سے اثر پذیر ہوتے وقت ہمارا دماغ کبھی کسی منطقی استدلال کی ادھیڑبُن میں الجھا ہوا نہیں رہتا، نہ ہمارا ذہن اس وقت دلائل اور براہین کے ذریعہ ہمیں کسی عقلی نتیجہ کی راہ دکھانے میں مصروف ہوتا ہے بلکہ ہم بالکل وجدانی طور پر غیر محسوس طریقے سے حسن کا فوری اثر اس طرح قبول کر لیتے ہیں کہ بسا اوقات حسن کے بہت گہرے اثر کے باوجود ہم یہ تک بتانے سے بالکل قاصر رہتے ہیں کہ اس شدید اثر کی کونسی کھلی ہوئی اور نمایاں وجہ ہے؟ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ "ذوق" کا تعلق "وجدان" سے ہے جو تمام تر ایک اندرونی قوت ہے۔ ذوق کے وجدانی ہونے کا ایک دوسرا ثبوت یہ بھی ہے کہ حسن سے متاثر ہونے کے معاملے میں فطرتاً کائنات کے تمام انسان ایک جیسے ہیں۔ نیچر کے حسین نظاروں اور نغمہ و موسیقی کی دلکش صداؤں سے جہاں ایک طرف حقائقِ عالم کا رمز شناس فلسفی لطف اٹھاتا ہے وہاں دوسری طرف اہل

چلانے والا کسان اور بھیڑیں پالنے والا چرواہا بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عمدہ خوشبوؤں اور خوشنما رنگوں سے جس طرح ایک پڑھا لکھا جوان آدمی محظوظ ہو سکتا ہے اسی طرح ایک مدرسہ کے ناتجربہ کار لڑکے کے لئے بھی یہ چیزیں اثر اور لطف سے خالی نہیں۔ خوبصورتی سے محظوظ ہونے کے لئے بچے اور بوڑھے، تعلیم یافتہ اور جاہل، امیر و غریب کی کوئی قید نہیں،

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "جمال" کا اثر سب پر یکساں نہیں ہوتا یعنی کسی پر کم ہوتا ہے اور کسی پر زیادہ لیکن بہرحال خواہ کم ہو خواہ زیادہ لیکن ہوتا ضرور ہے۔ یہاں پر سوال صرف "کم اور بیش" یا مقدار کا رہ جاتا ہے لیکن اس میں ذرہ برابر شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ حسن سے متاثر اور محظوظ ہونے کی صلاحیت تمام بنی نوعِ انسان میں مشترک ہے۔ ظاہر ہے کہ جو وصف تمام انسانوں میں مشترک ہو وہ کبھی کوئی خارجی چیز نہیں ہو سکتی بلکہ لازمی طور پر اُسے اندرونی اور فطری ہونا چاہئے۔ بس یہ امر ثابت ہو گیا کہ "ذوق" بلا شبہ ایک وجدانی قوت کا نام ہے۔

ذوق کی اصلی بنیادیں تو دراصل اُس اندرونی حاسہ پر ہوتی ہیں جسے وجدانِ قلب کہتے ہیں لیکن اگر ہم ایک ترقی یافتہ ذوق کا تجزیہ کرنے بیٹھیں تو ہم پر یہ حقیقت آشکارا ہوگی کہ ذوق کے اندر جو عناصر شامل ہیں اُن کا پہلا اور بنیادی حصہ تو "وہبی" ہے اور دوسرا اضافہ حصہ "اکتسابی" ہے۔ ذوق کا وجود ہوتا تو تمام انسانوں میں فطری طور پر ہے لیکن سب کا ذوق یکساں اور ایک ہی حالت پر نہیں رہتا بلکہ اکتسابی ذرائع سے ارتقا اور بالیدگی حاصل کرتا رہتا ہے اور یہیں سے تمام انسانوں میں ذوق کی کمی بیشی کا یا اچھے اور بُرے مذاق کا اختلاف شروع ہو جاتا ہے

بعض لوگوں میں ذوق کی قوت بہت ہلکی اور کمزور ہوتی ہے۔ وہ حسین چیزوں سے زیادہ شدت کے ساتھ متاثر ہونے کی استعداد نہیں رکھتے۔ ایسے لوگوں میں صرف حسن کی بہت موٹی موٹی اور نمایاں خوبیوں سے لطف اٹھانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ جمال کے لطیف پنہاں اور غیر نمایاں پہلوؤں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ اس کے برخلاف بعض لوگوں میں ذوق اس قدر قوی ہوتا ہے کہ حسن کے باریک سے باریک اور نازک سے نازک رخ بھی اُن کی نگاہِ جستجو سے پوشیدہ نہیں رہتے۔

اگر ہم ذوق کی اس کمی و بیشی اور مقدار کی عدم یکسانیت پر غور کریں تو پتہ چلے گا کہ اس اختلاف کے عموماً دو بڑے اسباب ہوتے ہیں:۔

(۱) داخلی۔

(۲) خارجی

۱۔ داخلی اسباب سے میری مراد یہ ہے کہ تمام انسان اپنی دماغی ساخت اور ذہنی قویٰ کے لحاظ سے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اور چونکہ وجدان کی عمدگی کا دماغی قویٰ پر بہت کچھ انحصار ہے اس لئے فطرتاً بعض لوگوں میں حسن سے متاثر ہونے کا مادہ زیادہ ہوتا ہے بعض میں کم۔

۲۔ خارجی اسباب سے میرا یہ مطلب ہے کہ چونکہ اکتسابی ذرائع سے ذوق کی ترتیب کی جاسکتی ہے اس لئے جن لوگوں کو اپنے ذوق کی بالیدگی کے لئے موافق حالات میسّر آتے ہیں۔ اُن کا مذاق دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہوتا ہے۔ ظاہری حالات اور تعلیم و تمدن کے فرق کی وجہ سے ذوق میں عدم یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ بات تسلیم کر لینے کے بعد کہ ذوق پر تعلیم اور تربیت کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے یہ حقیقت خود بخود ثابت ہو جاتی ہے کہ ذوق ایک ایسی قوت ہے جس میں نشو و نما اور بالیدگی کی صلاحیت موجود ہے۔ آئیے اب ہم یہ دریافت کریں کہ ہم کون کون سے طریقوں اور ذریعوں سے مذاق کو بالیدہ کرسکتے ہیں اور نشو و نما کے ارتقائی مدارج طے کرنے میں مذاق کے لئے کون سی تدابیر معین اور مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

سب سے پہلے تو ہمیں یہ بات خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ انسانی قوتوں کو ترقی دینے کی سب سے بہتر تدبیر یہ ہے کہ اُن سے مسلسل اس کثرت سے کام لیا جائے کہ یہ کثرتِ استعمال اُن قوتوں کے لئے ورزش کا سامان بہم پہنچا دے۔ جس طرح جسم کو تندرست حالت میں رکھنے اور بدن کی قوت بڑھانے کے لئے جسمانی ورزش نہایت ضروری چیز ہے ٹھیک اسی طرح ذہنی قوتوں کو نشو و نما بخشنے کے لئے بھی لازمی ہے کہ ہم انہیں استعمال کی کثرت سے برابر طاقت پہنچاتے رہیں۔ ورزش جس طرح جسمانی قوتوں کے لئے مفید ہے۔ اسی طرح دماغی اور ذہنی قوتوں کے لئے بھی فائدہ رساں ہے۔ اور تو اور خود ہمارے حواسِ خمسہ کا یہ حال ہے کہ ان پر استعمال کی کمی اور زیادتی کا پُورا پورا اثر پڑتا رہتا ہے جن لوگوں کو اپنے پیشہ کے لحاظ سے روزمرہ کی زندگی میں کسی مخصوص حس سے زیادہ کام پڑتا رہتا ہے اُن کی وہ حس دوسرے حواس کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کی بصارت جو مشین کے باریک کل پرزوں کا کام کرتے ہیں۔ حیرت انگیز طور پر قوی ہوتی ہے جس گھڑی کے پرزوں میں ہمیں باوجود غور کے کوئی خرابی یا بے ترتیبی نہیں دکھائی دیتی اس میں ایک مشاق گھڑی ساز کی آنکھ بیک نظر نازک سے نازک نقص کی گرفت کر لیتی ہے۔ اسی طرح جو لوگ عطر کے کارخانوں میں ملازم ہوتے ہیں اور جنہیں روزانہ مختلف قسم کے عطروں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے اُن

کا شامہ اس درجہ تیز ہوتا ہے کہ وہ ایک لمحہ میں خوشبوؤں کے باریک سے باریک فرق کو بھی پہچان جاتے ہیں۔

جب حواس کو مشق اور کثرتِ استعمال سے اس قدر قوت پہنچائی جاسکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ذوق کو اس قسم کے خارجی ذرائع کی مدد سے ترقی نہ دی جاسکے۔

مثال کے طور پر موسیقی کے ذوق کو لے لیجئے۔ ہمارا مشاہدہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ ذوق حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ارتقا کے مدارج سے گذرتا رہتا ہے۔ بالیدگی اور نشوونما کی استعداد جس قدر اس مذاق میں ہوتی ہے کسی دوسری قوت میں نہیں۔ بلندی کو شروع شروع میں صرف سیدھی سادی اور عامیانہ چیزوں میں مزہ آتا ہے۔ اس منزل میں اسے فن کی بلند چیزوں سے مطلق لگاؤ نہیں ہوتا۔ ایک عرصہ تک کثرت کے ساتھ گانا سنتے سنتے وہ راگ راگنیوں کے سطحی فرق سے واقف ہوجاتا ہے۔ اس منزل سے بھی گزرنے کے بعد اُسے پست اور بلند چیزوں میں امتیاز ہونے لگتا ہے اب ادنیٰ درجہ کی عامیانہ چیزیں جنہیں وہ کچھ عرصہ پیشتر اس قدر دلچسپی سے سنا کرتا تھا اُسے محظوظ نہیں کرتیں اُسے بلند تر چیزوں کی تلاش پیدا ہونے لگتی ہے۔ غزل سے بتدریج ٹھمری اور دادرا، پھر دادرا سے ٹپہ اور ترانہ کی نوبت آتی ہے یہاں تک کہ جب ان چیزوں سے سابقہ پڑتے پڑتے مذاق میں اور زیادہ بالیدگی پیدا ہوجاتی ہے تو ان سے بھی تسکین نہیں ہوتی۔ ذوق کی بلندی اس منزل پر پہنچ کر دھرپد اور خیال کی سی نازک فنی چیزوں کی طلبگار ہوجاتی ہے۔

جو لوگ فنِ مصوری کے مبصر ہوتے ہیں انہیں ابتدائے شعور ہی سے اس صنعت میں دخل نہیں ہوتا۔ مذاق کے اعلیٰ مدارج تک پہنچنے کے لئے انہیں بھی بالکل اسی طرح صدہا منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے، جس طرح موسیقی کے اہلِ نظر کو۔

یہاں تک جو بحث ہوئی وہ مجموعی حیثیت سے اس ذوق کے متعلق تھی جس کے ذریعہ سے ہم ہر قسم کے حسن سے متاثر ہوتے ہیں۔ اب ہم اپنی بحث کو صرف اُس ذوق تک محدود کریں گے جس کا تعلق محض شعر شاعری اور سخن فہمی سے ہے۔

اب ہمیں یہ بات دریافت کرنا چاہئے کہ ذوقِ شاعری کو سدھارنے اور ترقی دینے کے کیا ذرائع ہیں۔ ظاہر ہے کہ ذوقِ شاعری چونکہ "مجموعی ذوق" ہی کی ایک شاخ ہے اس لئے اس کو ترقی دینے کے جو طریقے ہیں اُن کی شاہراہیں بھی بالکل وہی ہیں جن سے مجموعی ذوق کو ارتقائی مدارج میں گذرنا پڑتا ہے، شاعری کے بہترین شاہکاروں کے مطالعے سے اُن کے باہمی موازنہ اور مقابلے اور مختلف قسم کے کلام کو کثرت کے ساتھ پڑھنے سے ٹھیک اسی طرح مذاق کو درست کیا جاسکتا ہے جس طرح نغمے کے شوقین باکمال استادوں کا گانا سن سن کر موسیقی کے ذوق کو سنوارتے ہیں۔

ابتدا میں جب کوئی شخص پہلی مرتبہ شاعری کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو اس کا وجدان حد درجہ کند اور ضعیف الحس ہوتا ہے۔ اول اول شعر کی لطافت اس پر بہت خفیف اثر کرتی ہے۔ اُسے عموماً عامیانہ قسم کے اشعار محظوظ کرتے ہیں۔ یہ وہ منزل ہوتی ہے جس میں اُسے اعلیٰ درجہ کے شعر اور ادنیٰ درجہ کے شعر میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ وہ صاف صاف یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ جس کلام کا وہ مطالعہ کر رہا ہے اس میں کون کون سی نمایاں خوبیاں یا کون کون سے کھلے ہوئے عیوب ہیں۔ اس کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ کلام کو جانچنے کے لئے وہ کس چیز پر اپنے فیصلے کا انحصار رکھے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ بتا سکتا ہے کہ مجموعی حیثیت سے اسے حظ اور انبساط حاصل ہؤا یا نہیں۔ لیکن اس شخص کو اگر شاعری سے کثرت کے ساتھ سابقہ پڑتا ہے تو اس کے مطالعہ کے پہلو بہ پہلو اُس کے مذاق میں بھی ترقی پیدا ہوتی جائے گی۔ جوں جوں اس کا مطالعہ وسیع ہوتا جائے گا اُس کا ذوق بھی سدھرتا جائے گا۔ تھوڑے دنوں کی مشق اُسے اس قابل بنائے گی کہ وہ کسی نظم کو پڑھ کر اُس کے متعلق نہ صرف یہ فیصلہ کر سکے کہ وہ اچھی ہے یا بُری بلکہ وہ نظم کے تمام پہلوؤں کو جزواً جزواً پیشِ نظر رکھ کر اُس کی خوبیوں کو سمجھ سکے۔

مندرجہ بالا امور سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذوقِ شاعری کو بالیدہ کرنے کے لئے مطالعہ بہت ضروری چیز ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس مخصوص قوت کی نشو و نما کے لئے ہمیں اپنے دماغ کو ادبی ورزش بہم پہنچانا ضروری ہے۔

ذوق کو بالیدہ کرنے کا ایک دوسرا اہم طریقہ اور بھی ہے۔ اس کا تعلق براہِ راست انسان کی عقلِ سلیم اور قوتِ تمیز سے ہے۔ ہم کسی کلام کے محاسن کو اُس وقت تک حقیقی طور پر نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ ہم اپنی عقلِ سلیم اور قوتِ تمیز کی مدد سے اچھائی اور برائی میں فرق محسوس کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ہم اپنی سمجھ کے ذریعہ آسانی سے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اُس کو اچھا یا بُرا سمجھنے کے ہمارے پاس کیا وجوہ ہیں؟

اس بحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ذوق ایک ایسی قوت ہے جسے دو طریقوں پر بالیدہ کیا جاسکتا ہے

(۱) کلام کے متواتر مطالعہ کے ذریعہ دماغ کی ورزش سے۔

(۲) کلام کو عقلِ سلیم اور قوتِ تمیز کے ذریعہ پرکھنے سے۔

اگر ہم مذاقِ شاعری کی مکمل ترین نوعیت پر غور کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ مذاق میں عموماً دو بہت نمایاں اور اہم خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ اول لطافتِ مذاق۔ دوئم صحتِ مذاق۔

لطافتِ مذاق اور صحتِ مذاق میں بہت نازک اور لطیف لیکن نہایت اہم فرق ہے۔ لطافتِ مذاق کا تعلق تمام تر اُس فطری وجدان کی عمدگی پر ہے جس پر ذوق کی بنیادیں قائم ہوتی ہیں۔ وجدان کی عمدگی کا معیار یہ ہے کہ کلام کی وہ خوشنمائیاں بھی جو بے حد نازک اور غیر نمایاں ہونے کی وجہ سے ظاہر بین نگاہوں سے پوشیدہ رہتی ہیں ہمیں اپنی

تمام دلفریبیوں کے ساتھ اپنے اصلی رنگ میں عریاں نظر آجائیں۔

مذاق میں لطافت اُسی وقت پیدا ہوتی ہے جب اعلیٰ درجہ کے وجدان کے ساتھ انسان میں حسّاسیت بھی بدرجہ اتم ہو "حساسیت" سے میری مراد "حواس کے ذریعہ خارجی چیزوں سے متاثر ہونے کی قوت" ہے۔ جن لوگوں میں حساسیت کی قوت مضمحل ہوتی ہے وہ کبھی حسن سے صحیح طور پر متاثر نہیں ہوسکتے۔ نیچر اور آرٹ کی خوبصورتی سے پورا پورا لطف وہی اٹھا سکتا ہے جس کی بصارت، سماعت، لمس، شامہ اور ذائقہ اپنا اپنا فعل پوری مستعدی کے ساتھ انجام دیں۔

صحتِ مذاق کا تعلق اُس بالیدگی سے ہے جو سمجھ اور عقلِ سلیم کے ذریعہ ذوق کو حاصل ہوتی ہے۔ صحیح المذاق شخص وہ ہے جو کلام کی نقلی خوبیوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ جس کے پیشِ نظر کلام کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے ہمیشہ عقلِ سلیم کا معیار ہوتا ہے۔ وہ کلام کا باہمی موازنہ کرکے اس بات کا پتہ لگا لیتا ہے کہ کونسی خوبی کس پایہ کی ہے؟ اور کلام کا کون سا پہلو عمدگی کے لحاظ سے کیوں قابلِ ستائش ہے؟ ایسا شخص کبھی شعر کے ظاہری محاسن پر نہیں جاتا۔ اس کو الفاظ کی بھڑک اور فقروں کا انوکھا پن اُس وقت تک ہرگز نہیں رجھا سکتا جب تک وہ شعر کو اپنی سخن سنجی کی کسوٹی پر کس کر اُس کے حقیقی محاسن کا اندازہ نہ کرلے۔

اس میں شک نہیں کہ صحتِ مذاق اور لطافتِ مذاق دونوں لازم اور ملزوم ہیں اور ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ اور پیوستہ ہیں کہ کسی طرح انہیں علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ صحیح المذاق اُس وقت تک صحیح المذاق قرار نہیں دیا جاسکتا جب تک کہ اُس کے ذوق میں صحت کے پہلو بہ پہلو "لطافت" بھی موجود نہ ہو۔ اسی طرح لطیف المذاقی کے لئے صحیح المذاقی لازمی چیز ہے۔

اس تمام بحث کے بعد اب یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے پاس کوئی ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعہ ہم اچھّے اور بُرے ذوق کے درمیان تمیز کرسکیں؟

اس سوال کا جواب زیرِ نظر بحث کا وہ حصہ ہے جس میں ہمیں سب سے زیادہ دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ اس بات کا ایمان داری کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ دماغِ انسانی کی کوئی قوت اپنی نوعیت کے لحاظ سے اس قدر لوچدار، تغیر پذیر، اور جلد جلد رنگ بدلنے والی نہیں ہے جتنی کہ ذوق مختلف زمانوں اور مختلف حالات کے تحت دنیا میں ہمیشہ مذاق میں اس قدر کثرت اور سُرعت کے ساتھ انقلاب اور تغیر رونما ہوتا رہا ہے کہ بعض اوقات تو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ واقعی مذاق کوئی مستقل بالذات شے ہے بھی یا محض اعتباری اور ظنی شے ہے؟

آیا اس کی بنیادیں کسی ٹھوس حقیقت پر قائم ہیں یا یہ چیز فطرتِ انسانی کے تلوّن پذیر رجحانات اور ذہن کے رنگ برنگی میلانات کے زیر اثر ہے؟ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ چیز جو آج سے پچاس برس پیشتر صنعتی خوشنمائی اور فنی حسن کا بہترین شاہکار قرار دی جاتی تھی آج جدید روشنی کے دور میں اس قدر پامال اور غیر دل کش سمجھی جاتی ہے کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہونا بھی اپنے مذاق کی توہین سمجھتے ہیں۔

مثال کے طور پر ناسخ کی شاعری کو لیجیے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ناسخ استادِ روزگار تصور کئے جاتے تھے۔ ہندوستان کے اِس گوشے سے اُس گوشے تک اُن کی شاعری کی دھوم تھی۔ اور سخن فہموں کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جہاں اُن کے کمالِ شاعری کے گیت نہ گائے جاتے ہوں۔ لیکن آج ناسخ کے رنگ کا پسند کرنے والا مشکل سے ہندوستان کی تمام آبادی میں کوئی ایک آدھ ملے گا۔ انصاف سے بتائیے موجودہ زمانہ کے اردو دان حلقے میں آپ کتنے ایسے اربابِ فہم دیکھیں گے جو ناسخ کی شاعری سے لطف اُٹھا سکتے ہوں؟ "مثنوی گلزارِ نسیم" جو ایک زمانہ میں سخن سنجوں کی آنکھ کی سرمہ بنی ہوئی تھی، جو اپنے عہد کی بہترین شاعری کا بہترین شاہکار تصوّر کی جاتی تھی آج کیوں بے توجہی اور فراموشی کی تاریکی میں پڑی ہوئی ہے؟

یہ وہ سوالات ہیں جن سے بظاہر یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ واقعی مذاق کا کوئی اصل معیار نہیں۔ ہر شخص کا ذاتی مذاق ہی اُس کے لئے معیار کا کام دیتا ہے اور یہ کہ ہم کوئی ایسا مشترک معیار قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے جس کے فیصلے کے سامنے سب کو بلا چون وچرا تسلیم کی گردن خم کر دینا پڑے۔

اگر ہم ذرا سا بھی غور و فکر سے کام لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ایسا سمجھنا محض ایک مغالطہ ہے۔ اگر بالفرض ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم کر لیں کہ اعلیٰ درجہ کے ذوق اور ادنیٰ ذوق میں امتیاز کرنے کے لئے کوئی ایسا معیار مشترک نہیں ہے جس سے مرافعہ کیا جائے تو لامحالہ ہمیں یہ ماننے پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے کہ ہر قسم کا ذوق خواہ وہ ادنیٰ ہو یا اعلیٰ اپنی اپنی جگہ پر اچھا ہے۔ اہلِ نظر سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ یہ دعویٰ کس قدر مہمل اور بے معنی ہے۔ ممکن ہے کہ کلام کی سطحی خوبیوں کے معاملے میں یہ دعوی زیادہ ناقص اور بے معنی نہ نظر آئے لیکن جہاں شاعری کے اعلیٰ درجے کے نمونوں کی بحث آپڑتی ہے وہاں یہ دعویٰ محض غلط ہی نہیں بلکہ حد درجہ احمقانہ ثابت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ ہمارے پیشِ نظر ایک ایسا گروہ ہے جس میں مذاق کے لحاظ سے ہر درجے کے لوگ شامل ہیں۔ اگر اس گروہ کا ہر شخص فرداً فرداً غالب کی شاعری کو پسند کرتا ہے تو اس سے ہم اس نتیجہ پر ہرگز نہیں پہنچ سکتے کہ اس جماعت کے تمام افراد کا ذوق یکساں طور پر اعلیٰ درجہ کا ہے۔ اگر انہیں لوگوں سے

علیحدہ علیحدہ غالب کے بہترین شاہکاروں پر تنقیدی نقطہ نظر سے تفصیلی رائے پوچھی جائے تو فوراً پتہ چل جائے گا کہ ذوق کے لحاظ سے اس جماعت کے سارے افراد یکساں نہیں ہیں بلکہ کسی کا مذاق بلند ہے کسی کا پست۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں یہ تسلیم کرلینا کہ اعلیٰ اور ادنیٰ ذوق میں سرے سے کوئی فرق نہیں کتنی بڑی ناانصافی ہے۔ جب ہمارے پاس اس بات کے کافی دلائل موجود ہیں کہ ہم بجا طور پر ایک شخص کے مذاق کو دوسرے شخص کے مذاق پر ترجیح دے سکتے ہیں یا ایک شخص کے ذوق کو اچھا اور دوسرے کے ذوق کو بُرا قرار دے سکتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ مذاق میں اعلیٰ اور ادنیٰ کی تفریق قائم کرسکتے ہیں تو یہ حقیقت خود بخود واضح ہوجاتی ہے کہ ذوق کی اچھائی اور برائی پرکھنے کے لئے کوئی مشترک معیار ضرور ہونا چاہئے۔

اب یہاں ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ معیار کی ضرورت عموماً کن صورتوں میں لاحق ہوتی ہے؟ ہمیں کب اس کی حاجت پیش آتی ہے کہ ہم کسی معیار سے فیصلے کے لئے اپیل کریں۔

اگر مختلف چیزوں کے متعلق متضاد آرا کا اظہار کیا جائے تو اس وقت معیار کا سوال زیادہ اہم نہیں ہوتا۔ مثلاً فرض کیجے آپ کا کوئی دوست غالب کا پرستار ہے۔ وہ کسی دوسرے شاعر کو غالب کا مدِمقابل نہیں سمجھتا۔ اس کا خیال ہے کہ غالب کا کلام میر سے بہتر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس آپ میر کی شاعری کو غالب کی شاعری پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ چونکہ آپ کی رائے آپ کے دوست کی رائے کے بالکل متضاد ہے۔ اس لئے یا تو آپ کا مذاق صحیح ہوگا یا آپ کے دوست کا۔ زیادہ سے زیادہ اپنے دعووں کی حمایت میں آپ یہ کہہ کر اُسے قائل کرنے کی کوشش کریں گے کہ میر کا سا سوز و گداز، اس کی سی زبان کی حلاوت اور نرمی، اس کا سا خلوص اور درد غالب کے کلام میں موجود نہیں لہذا میر لازمی طور پر غالب سے بہتر شاعر ہے۔ بالکل اسی طرح آپ کا دوست غالب کی فوقیت میں یہ دلائل پیش کرسکتا ہے کہ خیالات کی ندرت، مضامین کے تنوع، تخیل کی بلند پروازی، انداز بیان کی جدت، اور الفاظ کے شکوہ کے اعتبار سے اردو کا کوئی شاعر غالب کی ہمسری نہیں کرسکتا لیکن اس تمام بحث کے باوجود یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ آپ کا ذوق جو میر کو غالب پر فوقیت دیتا ہے بہتر ہے یا آپ کے دوست کا جو غالب کو میر کے مقابلے میں قابلِ ترجیح ٹھہراتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تضاد کے باوجود دونوں کا مذاق اپنی اپنی جگہ پر اعلیٰ درجہ کا ہو۔

لہذا معلوم ہوا کہ دراصل معیار کے سوال کی اہمیت اُس وقت بڑھ جاتی ہے جب ایک ہی شے کے متعلق لوگوں میں اختلاف رائے ہو یعنی جب اسی چیز کو ایک شخص خوبصورت اور دوسرا بدصورت قرار دے۔ مثلاً اگر

کوئی شخص یہ کہے کہ میر کے کلام میں کوئی خوبی نہیں - اس کی شاعری بے جان اور مردہ ہے اس کے کلام میں نہ کوئی گداز ہے نہ سوز و ساز نہ تاثیر - وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اُسے اردو شعرا کی صف میں کوئی مرتبہ دیا جائے"، تو ہمیں یہ سمجھنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ یا تو یہ شخص شاعری کے متعلق کچھ نہیں جانتا اور یا اس کا مذاق حد درجہ ناقص اور بگڑا ہوا ہے - یہی وہ مقام ہے جہاں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ ہم اس پر یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اس کا مذاق غلط ہے شاعری کے کسی مشترک معیار سے اپیل کریں اور اس معیار کے ذریعہ اُس شخص کی بے راہ روی اسے سمجھاویں -

جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں ذوق کی اصلی بنیادیں تو اس اندرونی حاسہ پر ہوتی ہیں جس کا تعلق وجدانِ قلب سے ہے لیکن خارجی طور پر بھی ذوق کو عقلِ سلیم اور قوتِ امتیاز کے ذریعہ ترقی بہم پہنچائی جا سکتی ہے -

اب اگر دنیا میں کوئی ایک شخص ایسا موجود ہوتا جس میں تمام انسانی قوتیں مکمل ہوتیں جس کے ذہنی اور دماغی قویٰ ہر حالت میں بہترین اور صحیح ترین کام انجام دیتے - جس کی عقل کبھی خطا نہ کرتی اور جس سے فیصلے کے وقت ذرہ برابر غلطی کا احتمال نہ ہوتا تو ہم بلا خوف و اندیشہ تمام مخلوق کے مذاق کے لئے ایسے شخص کی صائب رائے کو معیار قرار دے سکتے تھے - لیکن چونکہ خدا کی اس وسیع کائنات میں ایک شخص بھی اپنے اندر یہ تمام خصوصیتیں اکٹھی نہیں رکھتا اس لئے لازمی طور پر ہمیں اُس اکثریت کے فیصلے کو تسلیم کرنا پڑے گا جس کے افراد میں مندرجہ بالا خصوصیتیں بدرجۂ اتم موجود ہوں - یعنی ہم بآسانی اُس اکثریت کے مذاق کو معیار قرار دے سکتے ہیں جس کا ہر فرد اپنی اپنی جگہ پر وہبی اور اکتسابی دونوں حیثیتوں سے اپنے اندر وہ تمام خوبیاں رکھتا ہو جو مذاق کی صحت اور لطافت کے لئے ضروری ہیں -

میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ اختلاف رائے کے ہر موقع پر ہم اس معیار سے کسی صحیح اور فوری فیصلے کے طالب ہو سکتے ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ شعر و سخن کے معاملات میں عام طور پر جو موٹے موٹے اختلاف پیدا ہوتے رہتے ہیں ان کے طے کرنے کے لئے اکثریت ہی کے مذاق کو معیار کے طور پر پیشِ نظر رکھا جا سکتا ہے؟

ذوقی
حیدرآباد دکن

غزل

پرستش کے قابل ہو تحقیق ہی
تصوّر کے ہمراہ تصدیق ہے

ہمیں علم ہے اور یہ تحقیق ہے
فقط دردِ دل وجہِ تخلیق ہے

بجا ہے، مرا نازِ قسمت بجا
کہ تیری تمنّا کی توفیق ہے

وہ مجھ سے قریب اور مَیں اُس سے دُور
مری جمع بھی رشکِ تفریق ہے

محبت کے اثنا میں ہر جورِ دوست
محبّت کے وعدے کی توثیق ہے

تعجب ہے اُس کا کرم اور یہ دیر
خدا جانے کیا وجہِ تعویق ہے

عطائے دو عالم تو برحق مگر
کچھ اس کے علاوہ بھی توفیق ہے؟

جو تُو کافرِ عشقِ جاناں نہیں
بالاجماع کافر ہے، زندیق ہے

مرے کفر کو کفر کہنا غلط
مرا کفر ایماں کی تصدیق ہے

اُسے خبطِ عقبیٰ سے کیا واسطا
جسے عیشِ دنیا کی توفیق ہے

مرا ایک دم اور دو عالم کے غم
عجب کشاکش ہے عجب ضیق ہے

حقیقت میں آزادؔ اُس کی جفا
ہماری وفا کی اتالیق ہے

حکیم آزادؔ انصاری

بلنسیہ

بلنسیہ جسے آج کل آپ نقشۂ یورپ پر ویلنشیا کے نام سے مرقوم دیکھیں گے سپین کا مشہور شہر ہے اور
اُس کے دارالحکومت میڈرڈ سے جسے مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں مجریط کہتے تھے ۔ ۱۹۰ میل پر جنوب مشرق
میں آباد ہے ۔ وادی الکبیر کہ سپین کا مشہور دریا ہے اس کے شمال میں موجیں مارتا ہوا سمندر سے جا ملتا ہے ۔ دریا
کا منظر نہایت سہاونا ہے ۔ اس کے دونوں کناروں پر سایہ دار درخت جھوم رہے ہیں ، اور دریا کا نیلگوں پانی اُن کے
درمیان سے گزرتا ہے جب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا قدرت نے اپنی فیاضی کا ثبوت
پیش کرنے کے لئے اپنے حسین و لطیف مناظر اسی جگہ کے لئے خاص کر دیئے ہیں ۔ شہر کے باہر کی عمارتیں خوشنما
اور منظر دلکشا ہے ، مگر اندر کے مکانات بہت بلند واقع ہونے کے سبب آنکھوں کو کچھ اتنے بھلے معلوم نہیں ہوتے
جب ان کا سایہ بازاروں پر پڑتا ہے تو طبیعت میں خنکی اور افسردگی کا احساس ہوتا ہے ۔ بازار کچھ اتنے فراخ نہیں ہیں
اور سڑکیں تو دور دور تک پیچ و خم کھاتے ہوئے نظر آتی ہیں + صنعت لوہے شیشے اور ریشم سے ہمکنار رہے اور تجارت
ریشم شراب انگور اور زعفران سے لطف اندوز + اک زمانہ تھا کہ بلنسیہ ریشم کے کیڑوں کی پرورش گاہ تھا ،
سوداگر کیڑوں کو دور دراز ممالک میں لے جاتے تھے ، یہاں ایک خاص قسم کا کپڑا تیار ہوتا تھا جو نسیج
بلنسی کے نام سے مشہور تھا ، شمالی افریقہ میں اس کی بہت مانگ تھی + نارنگیاں یہاں اس کثرت سے ہوتی ہیں کہ
اگر اس کو نارنگیوں کا شہر کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا ۔ بلنسیہ کو اپنی قدامت پر ناز ہے ، ایک زمانہ میں پومپی نے اس
کی اینٹ سے اینٹ بجا دی مگر کچھ عرصہ کے بعد از سرِ نو تعمیر ہو کر آباد ہوا ۔ جب مسلمانوں نے ۷۱۳ء میں اس کو
فتح کیا تو اُس وقت گاتھ قوم برسرِ حکومت تھی ، ۱۰۹۴ء میں عیسائیوں نے اس پر حملہ کیا اور یہ مسلمانوں کے
مستحکم ہاتھوں سے نکل گیا ، ملثمین کی فوج نے دوبارہ اس کو پامال کیا مگر ۱۲۳۸ء میں کار پردازانِ قضا و قدر نے
ہمیشہ کے لئے اس شہر کی حکمرانی سپینی عیسائیوں کی قسمتِ زریں میں لکھ دی ۔ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں بلنسیہ
ایک صوبہ کی حیثیت رکھتا تھا ، اور اس کا دارالحکومت شہرِ بلنسیہ نہایت آباد پُر رونق اور فضل و کمال کا مرکز تھا
تاریخ جغرافیہ اور ادب کی کتابوں کے ہزاروں صفحے بلنسیہ کے باغات اور عمارات ، یہاں کے علماء فضلا اور شعرا
کے تذکروں سے معمور ہیں ۔ اس زمانہ میں بھی شہر کا بیرونی حصہ نہایت پُر فضا اور آباد تھا ، سطحِ سمندر سے آفتاب

کی شعاعیں منعکس ہو کر اس حصے کو روشن رکھتی تھیں مگر اندرونی حصہ صفائی کے نہ ہونے سے متعفن اور تنگ و تاریک تھا۔ پسّوؤں اور مچھروں کے لشکروں کے لشکر موجود رہتے تھے، چنانچہ غرناطہ کا ایک مشہور شاعر ابو جعفر بن مسعدہ کہتا ہے۔

ھی الفردوس فی الدنیا جمالاً لساکنہا ما مکان بہا البعوض

یعنی جمال و لطافت کے لحاظ سے تو بلنسیہ اپنے ساکنوں کے لئے بہشت ہے مگر اس میں مچھروں کی مصیبت ہے۔

ایک اور شاعر کہتا ہے۔ کہ

رقص البراغیث فیہا علی غناء البعوض

یعنی مچھر تو اس میں گیت گاتے ہیں اور پسو رقص کرتے ہیں۔

اس زمانہ میں بلنسیہ کے باغات کی یہ کثرت تھی کہ ہر طرف سبزہ زار لہلہاتے اور چشمے رقصاں نظر آتے تھے رصافہ اور مدینۃ المنصور دو مشہور رسمنے تھے، ان میں نہریں بہتی تھیں اور نہروں پر پل بنے تھے۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی یا تو زعفران کے زریں کھیت دعوتِ نظارہ دیتے تھے یا نارنگیوں کے ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ نظر آتے تھے۔ ایک مورخ لکھتا ہے۔ بلنسیہ رصافہ اور پل کے اعتبار سے رونق اور لطافت میں بغداد کے ساتھ ہمسری کرتا ہے۔ سبزہ زاروں اور باغوں چشموں کی کثرت کے باعث بلنسیہ کو مطیب الاندلس، یعنی سیرگاہِ سپین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بلنسیہ کے دلربا مناظر کی تصویر اکثر شعرائے اندلس نے اپنے اشعار میں نہایت حسن و خوبی سے کھینچی ہے۔ مگر جو عربی زبان کے مذاق اور علم سے محروم ہیں لاریب کہ انہیں ان مدحیہ اشعار کی آب و تاب اور لطافت سے بھی محروم ہی رہنا پڑے گا، چنانچہ ان کے نفس مضمون ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے

ابنِ زقاق لکھتا ہے "انصاف کی پوچھو تو بلنسیہ اپنی خوبیوں کے لحاظ سے تمام شہروں سے گوئے سبقت لے گیا ہے، میرے اس دعوے کی دلیل خود بلنسیہ ہے جس کا جمال آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہے، خدائے حسن نے اُسے حسن کا خلعت بخشا ہے جو دریا اور سمندر کے نقش و نگار سے مزین ہے!" بلنسیہ کے تاجدار، مروان نے کہا ہے۔ بلنسیہ وہ نوجوان معشوق ہے جو سندسِ سبز کا لباس زیبِ تن کئے ہوتے ہے، اگر تم اُس کے قریب جاؤ تو وہ اپنے آپ کو پھولوں اور شگوفوں میں چھپا لے گا۔"

بلنسیہ کو کبھی کبھی قحط سے بھی دوچار ہونا پڑتا تھا اور ہر روز عیسائی آئے دن اُس پر یورش کرتے تھے۔

ابوالحسن بن حریق اس بات کا اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے: یہ بات مشرق و مغرب میں مسلّم ہے کہ بلنسیہ ہر قسم کے حسن کا مرکز ہے اگر کوئی کہے کہ اس میں قحط کی آفت برپا ہوتی ہے اور تلواروں اور نیزوں کا مینہ برستا ہے تو اس کو کہہ دو کہ بلنسیہ ہے تو بہشت، مگر قحط اور جنگ کی دو مصیبتوں کی اوٹ میں!

علم و فضل کے اعتبار سے سرزمین بلنسیہ بہت بلند مرتبہ ہے، مادر گیتی نے اس مردم خیز خطے میں ایسے ایسے علما اور شعرا کو جنم دیا کہ جن کے نام آسمان ادب و شہرت پر رہتی دنیا تک چاند سورج بن کر چمکتے رہیں گے اگر شاعروں کی فہرست تیار کی جائے تو یہاں کے مندرجہ ذیل شعرا نمایاں طور پر داد کے مستحق ٹھیریں گے:-

ابوالعباس بن امیہ، ابن محذر، ابن حجاف، ابوجعفر بن عبدالولی، ابوالحکم ابن عماز، ابن جبیر، ابن عبدون، علی بن احمد، ابن سعد الخیر، رصافی وغیرہم۔

محدثین کے اسمائے گرامی بلنسیہ کی تاریخ میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں:- ابوالمطرف بن عمیرہ، ابواحمد جعفر الخزراعی، ابوعبداللہ بن یعیش، ابن ہاجراور ابن ہذیل وغیرہم

بلنسیہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں ایک صوبے کی حیثیت رکھتا تھا، اور اس میں بہت سے قصبے اور قریے آباد تھے، جن میں سے مشہور قصبہ شاطبہ ہے جو خصوصیت کے ساتھ قرات اور حدیث کی درس گاہ تھا اور منظر کی لطافت و خوبی کے لحاظ سے بھی بے نظیر تھا، یہاں کا کاغذ تمام اندلس میں مشہور تھا اور دور دور تک جاتا تھا۔ ۶۴۵ میں مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے صوبوں کی فہرست میں اس کے نام کا بھی اندراج ہو گیا! اندہ جس کے پہاڑوں میں لوہے کی کانیں ہیں بلنسیہ کے مضافات میں شامل تھا، یہی وہ سرزمین پاک ہے جس کو ابوجعفر احمد بن حسن القضاعی جیسے بلند پایہ محدث کی زاد بوم ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ابوجعفر کو حدیث کے علاوہ ادب اور فن طب میں بھی کمال حاصل تھا اور وہ ایک عرصہ تک غرناطہ کے گورنر عثمان بن عبدالمومن کے سکرٹری بھی رہے تھے۔

یہ ہے بھولے بسرے بلنسیہ کی مجمل سی تاریخ اور مسلمانوں کی گذشتہ عظمت کی داستان کا ایک پارینہ اور پُردرد ورق!

امین

برسات
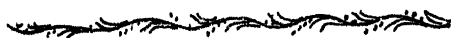
کل تک بیساکھ کی گرمی تھی آج آئی ہوا برکھارُت کی
کیا کیا نہ دعائیں کرتی تھی مخلوقِ خدا برکھارُت کی

اللہ یکایک یہ بادل گھر گھر کے کدھر سے آئے ہیں
اللہ کہاں سے آنکلی یہ سرد ہوا برکھارُت کی

بجلی کی کڑک بادل کی گرج، زوروں کی جھڑی اور طغیانی
دکھلا گئی کیا کیا دم بھر میں گھنگھور گھٹا برکھارُت کی

لو بھر گئے پل میں سب جل تھل، لو ندی نالے چلنے لگے
چشمے ہر سمت ابلنے لگے جن سے ہی فضا برکھارُت کی

کیسی ہے زمیں پر ہریاول، ہیں چرخ پہ کیا پیارے بادل
ہے ارض و سما پر کیفیت، کیا جلوہ نما برکھارُت کی

کیا وادی کیا صحرا کیا بن، کیا کوہ کا دامن کیا گلشن
ہر چیز بنی فردوسِ نظر، برسی جو گھٹا برکھارُت کی

دھرتی کو ملا ہے لباس نیا، آتا ہے نظر آکاس نیا
ہے رُوپ انوپ جدھر دیکھو تاثیر ہی کیا برکھارُت کی

کیا پیڑ ہیں، کیسی بیلیں ہیں، کیا پھول ہیں کیسا سبزہ ہے
گھر سے تو نکل جنگل کو تو چل، لذت تو اٹھا برکھارُت کی

اشجار ہیں کیا جھومے ہیں بڑے کس لطف میں ہیں سب چھوٹے بڑے
کیا جھولتے ہیں کیا گاتے ہیں، کر کر کے ثنا برکھارُت کی

کیا پیاری کوک ہے کوئل کی، کیا راگ چھیڑا ہے بھونرے کا
کیا کیف فزا و ہوش ربا، ہے موج ہوا برکھارُت کی

بھنگراج کہیں، دراج کہیں، پنڈول کہیں، طاؤس کہیں
ہر پنچھی راگنی گاتا ہے ہر صبح و مسا برکھارُت کی

کیا ناچ رہی ہے ہر تتلی، کیا جھوم رہی ہے ہر ڈالی
اللہ یہ کیفیت کتنی، ہے ہوش ربا برکھارُت کی

چشموں کی صدا اللہ اللہ، جھرنوں کی نوا اللہ اللہ
کیا میٹھے سُروں میں رہ رہ کر گاتی ہی ہوا برکھارُت کی

مصروفِ تبسم ہیں کلیاں، مشغولِ ترنم ہیں چڑیاں
کس کس کو نہ جوش میں لائے گی مستانہ ادا برکھارُت کی

نسرین سمن جوہی چمپا، بیلا کیوڑا ہر سُو ہے کھلا
کس درجہ معطر رہتی ہے ہر وقت ہوا برکھارُت کی

دیکھو تو ذرا اے اہلِ نظر کیسا ہی سماں یہ گردوں پر
بگلوں کی قطار ایسی اُجلی، کالی یہ گھٹا برکھارُت کی

رنگین گھٹا کی چادر پر کیسے ہیں شفق کے گل بوٹے
خورشید نے کیسی اوڑھی ہے خوش رنگ ردا برکھارُت کی

پھر جھُوم کے بادل آئے ہیں، پھر دھار لگی ہی مینہ کی نجیب
ہاں بہرِ خدا پھر نظم ذرا تُو اپنی سنا برکھارُت کی

میر سعادت حسین
نجیب

ساڑھی اور سُوٹ

کچھ عرصہ ہوا کہ شملہ کی کسی سڑک پر ایک خالی ساڑھی خراماں تھی یعنی ساڑھی تھی پر ساڑھی کے اندر کچھ نہ تھا یا کم از کم معلوم یہ ہوتا تھا کہ گھر والی گھر میں ہے اور ساڑھی ہوا خوری کے لئے تن تنہا خود ہی نکل پڑی ہے۔ خدا جانے ساڑھی اور ساڑھی پوش میں تُو تُو میں میں تک نوبت پہنچی تھی اور ساڑھی تنگ آ کر نکل پڑی تھی یا بچاری پہننے والی کو گھر کے کام کاج سے فرصت نہ تھی اور اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ میں تو مرتی ہی ہوں یہ بچاری کیوں یونہی سڑے بُسے، بہر حال کچھ بھی وجہ ہو چند آنکھوں والوں نے دیکھا کہ ساڑھی موجود ہے اور ساڑھی پوش غائب۔ ان میں سے ایک حضرت نے جرات کر کے قدم بڑھایا۔ اور ادھر اُدھر دیکھ کر کہ کوئی تاک میں تو نہیں یہ صاحب ساڑھی کے پاس جا نکلے اور ٹوپی اٹھا کر قدم ساتھ ملانے کو تھے کہ کسی غیبی طاقت نے ان حضرت کو سوٹ سے غائب کر دیا اور ان کا خالی سوٹ اس ساڑھی کے ساتھ مٹر گشت کرنے لگا۔ اسی غیبی طاقت نے صاحب موصوف کو سوٹ اور ساڑھی کی گفتگو سمجھنے کی لیاقت تو دے دی اور یہ بھی مجبور کیا کہ یہ ساڑھی اور سوٹ کے عقب میں چلتے رہیں مگر اور ہر قسم کی طاقت اُن سے لے لی۔ جو مکالمہ ان حضرت نے ساڑھی اور سوٹ کا سنا اُسے آپ یوں بیان کرتے ہیں۔

سوٹ۔ معاف کیجئے، مگر جی چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ سیر کا لطف اٹھاؤں انکار نہ کیجئے!

ساڑھی۔ آپ ساتھ ساتھ تو چل ہی پڑے مگر میں سوچتی ہوں کہ میرا آپ کا کیا ساتھ؟

سوٹ۔ کیوں؟

ساڑھی۔ جناب یہ بندی کسی غریب ہندوستانی جلاہے کی دستکاری کا سیدھا سادھا نمونہ اور وہ بھی ایسا جیسے جیسی کہ وہ ہی بھولے پن سے لپٹ جانے کی عادت، اور آپ ماشا اللہ مغربی چستی و چالاکی کا بہترین اشتہار۔ چلیں تو اکڑ کر اور نہ ہوں تو وہ بھی شکنجے میں۔

سوٹ۔ بنانے میں تو آپ مشاق معلوم ہوتی ہیں۔

ساڑھی۔ واللہ بنا نہ رہی تھی۔ کیا جو کہتی ہوں وہ غلط ہے؟ مجھ غریب کا تو دامن آج تک جیب سے

آلودہ نہیں ہوا اور آپ ہیں کہ اوپر جیب نیچے جیب، اندر جیب، باہر جیب۔

سوٹ (ہنسکر) خالی جیب سے جیب نہ ہونا اچھا ہے۔

ساڑھی (اندازِ دلربائی سے) جی ہاں، جیب خالی اور اس پر اکڑ بازی۔

سوٹ۔ جناب یہ آپ کے آنچل کا ذرا سا کھسکنا سب کس بل نکال دیتا ہے۔

ساڑھی۔ اوہو، آپ تو شاعر مزاج معلوم ہوتے ہیں۔

سوٹ۔ ہوں تو نہیں مگر بننا پڑتا ہے۔

ساڑھی۔ اچھا آپ زبردستی شاعر نہ بنئے اور کچھ آپ بیتی کہئے۔ جھوٹ چاہے کتنا دلفریب ہو سچ کے سامنے ہیچ ہے۔

سوٹ۔ تعمیلِ ارشاد میں عذر نہیں مگر بہتر تو یہی ہے کہ آپ بیتی نہ کہوں۔

ساڑھی۔ جی نہیں، ہم تو ضرور سنیں گے۔

سوٹ۔ اچھا تو سنئے۔ میں جب سے اس ملک میں آیا ہوں در اصل جلا بھنا رہتا ہوں۔ میرے وطن میں بہت ہی میری ذلت ہوتی تو بھی یہ خوشی ضرور ہوتی رہتی کہ کبھی کبھار کوئی اچھا سا فراک میری گود میں بیٹھتا گاہے ماہے قہقہوں کی لہر مجھ سے فراک تک اور فراک سے مجھ تک رواں ہوتی۔ چہل پہل میں وقت گذرتا مگر جس دن سے یہاں آیا ہوں میری تو مٹی خوار ہے۔ یہ سنتے سنتے کہ حد سے تجاوز نہ کرو، اعتدال سے کام لو، چلو تو سنبھل کر، بیٹھو تو سمٹ کر، دیکھو تو جھک کر، پاس رہو مگر دور دور رہیں تو جان بلب ہوں۔ اچھا ہو جو کسی دن پھٹ پھٹا کر اس دنیا سے چل دوں۔

ساڑھی۔ کیوں؟ میں نہ کہتی تھی کہ میرا آپ کا ساتھ نہیں۔ آپ کون ہیں یہاں کی تہذیب پر نکتہ چینی کرنے والے؟ کیا اتنا بھی پتہ نہیں کہ غیر کا کیا مذکور بھائی بہن کو نہیں کہہ سکتا کہ "بہن تم حسین ہو"۔ جب زمانہ بدلے گا تو بدلے گا فی الحال تو پرانی تہذیب رائج ہے اور اس کے مطابق خوبرو کو حسین کہنا گناہ ہے اور اپنے آپ کو برا ثابت کرنا ہے۔

سوٹ۔ یہی تو رونا ہے کہ دیکھیں تو برے، کہیں تو برے اور جو قدرے قلیل آزادی چاہیں تو برے آپ نے مجھ سے میرا حال پوچھا کیوں تھا؟

ساڑھی۔ خدا جانے کیوں مگر مجھے تو کچھ ہمدردی پیدا نہیں ہوئی۔ ہمارا پرانا فلسفہ تو یہ کہتا ہے کہ رنج میں

بھی راحت ہے اگر انسان کا ایمان ٹھیک ہو۔

سوٹ ۔ یہ بات مطلقاً سمجھ میں نہیں آئی ۔ رنج میں کس طرح راحت ہو سکتی ہے ؟

ساڑھی ۔ آپ روحانیت سے بالکل عاری معلوم ہوتے ہیں ۔ رنج خدا کی طرف سے ہے اور جب اُس کی مرضی سے ہے تو اُسے بخوشی قبول کرنا چاہئے ۔ آپ کی خواہشات کے مطابق دنیا کا نظام جب نہیں ہے تو بہتر ہے کہ آپ وہ خواہشات ترک کر دیں ۔ یہاں اگر فراک اور ساڑھیاں آپ سے ملنے سے کتراتی ہیں تو آپ اُن سے ملنے کی خواہش ہی دل سے نکال دیں ۔ قسمت کے آگے سر تسلیم خم کریں ۔

سوٹ ۔ یہ ہو چکا ۔ اگر روحانیت یہی ہے کہ کوشش نہ کی جائے تو اپن جانب کا روحانیت کو دور ہی سے سلام ہے ۔ کوشش کر کے آپ سے نہ ملتا تو یہ چند لطف کی باتیں کیسے سنتا ؟

(۲)

صاحب سوٹ بیان کرتے تھے کہ کسی نکڑ پر یک لخت ساڑھی غائب ہو گئی اور اُن کا سوٹ پھر اُن کے گلے کا ہار ہو گیا اور یہ بھی کہتے تھے کہ اُس دن سے وہ اپنے سُوٹ کے سامنے سخت خجل رہتے ہیں کہ اس پردیسی کی زندگی عبث حرام کی ۔ جب ان کی طبیعت ذرا زیادہ گداز ہوا کرتی ہے تو فرمایا کرتے ہیں کہ اس ملک میں انسان تو کیا اچھا کپڑا بھی اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاتا ہے ۔

اس امر کی بہت کوشش کی گئی کہ پتہ چلایا جائے کہ کیا ساڑھی پوش سے اس ملاقات کا ذکر کیا یا اس تمام واقعے کو کھا گئی مگر اڑتی اڑاتی بھی کوئی خبر نہ سنی ۔ البتہ اس واقعہ سے ایک دو مہینے بعد کسی خاتون کی تحریر ایک رسالے میں شائع ہوئی اور اس تحریر سے شاید عقدہ کشائی ہو سکے ۔ وہ تحریر حسب ذیل ہے

ساڑھی سے گفتگو

"چڑیل یہ تیرا اچھڑکنا مجھے کہیں کا نہ رکھے گا! کیا کہا کہ بیوی! یونہی خفا ہوتی ہو! الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے بھلا جو میں یونہی خفا ہوتی ہوں تو یہ بتا کہ کل جو میں جوہری کی دوکان پر کھڑی تھی تو تو کیوں اس جنٹلمین کے سوٹ کو چھو رہی تھی ؟ ہوا کی اٹھکھیلیاں ' اُف ری لپاڑن ! ہوا کا تو وہاں نام و نشان نہ تھا ۔ اچھا ہاں سچ بتاؤ ۔ کیا کہا کہ ایک دفعہ یونہی ملاقات ہو گئی تھی ۔ سوٹ کا مجھ سے اور میرا سوٹ سے رنگ کھلتا تھا ۔ اچھا کہاں ملاقات ہوئی تھی ؟ بیوی وہ نہ ہونے کے لئے گیا تھا اور مجھے آپ نے رنگنے کے لئے دیا تھا ۔ وہ ایک بھلے سے آدمی کی دکان ہے نا ٹھنڈی

سڑک پر۔ بس وہیں۔ ہم دونوں تیار تھے لیکن لینے کوئی نہ آیا تو ہم یونہی چہل قدمی کے لئے ذرا نکل پڑے تھے۔ اللہ قسم ایسے مزے کی باتیں کرتا ہے کہ کیا کہئے مگر میں نے اُسے خوب بنایا' اب آیا میری سمجھ میں یہ تیرا اپنا ٹھنا رہنا۔ شرم حیا گھول کر پی گئی ہو۔ کیا کہا؟ کیا کروں کہ رنگ ہی شوخ ہے' تیرا تو دماغ چل گیا ہے مگر بندی اس آزادی کی حامی نہیں۔ کیا کہا کہ تم نے اسے بہت سمجھایا؟ بچارا رو دیا تو رحم آیا؟ جی نہیں ایسے رحم کو تم رہنے دو۔ لوگ کچھ کا کچھ سمجھنے لگتے ہیں۔ اب تمہاری زبان بند بھی ہوگی یا یونہی قینچی کی طرح چلتی جائے گی؟ کیا کہا کہ ہنسنا بولنا کیسے بند ہو؟ ہے نا تو آفت! اب جو کچھ کہوں گی تو رو دو گی۔ کیا کہا کہ بُرا ماننے کی بات نہیں مگر امر واقع یہ ہے کہ انسان کپڑے سے ہی بنتا ہے' جی ہاں۔ گویا وہ مہاتما لوگ جو کپڑا انہیں پہنتے انسان ہی نہیں۔ ارہی ہے تو تُو دیسی مگر باتیں تیری سب فرنگنوں کی سی ہیں۔ کیا کہا کہ میری بلا فرنگن ہو۔ بات یہ ہے کہ سب ساڑھیوں نے حلف اُٹھایا ہے کہ ہندوستان کی خاتونوں کو آزاد کر کے چھوڑیں گی' اُف ری تیرے دعوے! گویا یہ جو ہندوستان میں ترقی کی رو ہے اُس کے محرک سوت، کپاس اور ریشم ہیں۔ کیا کہا کہ ہاں بیوی سچ تو ہے۔ مرد کمبخت ولایت گئے تو وہاں سے ٹوپڈ اٹھا لائے مگر ایک صدی سے ہندوستان کی روئی سفر کر کے ململ بن کر آرہی ہے آخر کچھ تو اس سفر کا اثر ہونا تھا مجھ میں بھی ولایتی تاگا ہے مگر اس کی بدولت نہیں بلکہ نشوونما کا تقاضا ہے کہ ہم آزادی چاہیں۔ دیسی کھیتوں میں امریکن کپاس کا بیج، انگریزی نہروں کا پانی، جاپانی کارخانوں کی مانگ۔ چھوڑیئے وہ اب اپنی پرانی ترنگ تُو تو بڑی عالم فاضل نکلی۔ کیا کہا کہ اب مسکرا دوں۔ کیوں؟ کیا تجھے میرا مسکرانا بھاتا ہے؟ اری کیوں لپٹی جا رہی ہے۔ چلوں؟ کہاں؟ باہر۔ دیوانی ہو خواہ مخواہ چل نکلوں۔ کیا کہا کہ اور کئی ساڑھیاں مل جائیں گی۔ اور جوان کے ساتھ مرد ہوئے؟ کیا کہا کہ اگر ہوئے تو کوئی اچھی سی بات ہی کہیں گے کچھ کھا نہ جائیں گے۔ نہ بابا تو تو بڑی دلیر ہے"۔

فلک پیما

محبت ایک آتش ہے سردی سے معمور، ایک شیرینی ہے کڑواہٹ سے بھرپور، اور ایک درد ہے مسرت کا سرمایہ دار، یہی وہ جذبہ ہے جو خیالات واحساسات کو دل آنکھیں اور کان تفویض کرتا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے خواہش جس کی خوراک ہے، مسرت جس کی تربیت ہے، حسد جس کا امتناع ہے، مکر و فریب کی چالیں جس کی موت ہیں اور بے توجہی جس کا کفن ہے ــــــ للی

امین

تاثرات

دے کر تسلیاں دلِ حسرت نشاں کو میں
پھر ڈھونڈنے چلا ہوں ترے آستاں کو میں

مسرور ہوں مٹا کے دلِ سخت جاں کو میں
فانی سمجھ رہا ہوں نشاطِ جہاں کو میں

دے کر فریب تیری نوازش کا رات دن
تسکین دے رہا ہوں دلِ نیم جاں کو میں

گردش نے جس کی خونِ تمنّا بہا دیا
ہمدرد جانتا تھا اسی آسماں کو میں

شکوہ ترے ستم کا نہ ہوگا بیاں کبھی
روکے رہوں گا حشر میں اپنی زباں کو میں

بجلی کو ضد ہوئی ہے کہ گلشن کو پھونک دے
لے جاؤں یا الٰہی کہاں آشیاں کو میں

تم چھپ گئے ہو دے کے مجھے دعوتِ تلاش
اب ڈھونڈتا پھروں گا تمہارے نشاں کو میں

کب تک سناؤں آپ کو رودادِ بے کسی
سو بار کہہ چکا ہوں اسی داستاں کو میں

رفعت پسندیاں ہیں یہ میری نگاہ کی
کعبہ سمجھ رہا ہوں ترے آستاں کو میں

جلوہ ہے ہر کلی میں کسی کے جمال کا
جنّت سمجھ رہا ہوں ظفر گلستاں کو میں

نذیر احمد ظفر

تاریخی جامعات

علمی مدارس کا رواج حقیقت میں زمانۂ قدیم سے جاری ہے۔ مغربی عمران کے ظہور سے بہت پہلے کلدانیوں اور مصریوں نے مدارسِ علمیہ کی تشئید کی تھی۔ ان کے مدرسوں میں طب و حکمت، اور فلکیات کی بہترین تعلیم دی جاتی تھی۔ پھر سب سے پہلے یونانیوں نے اُن کے نقشِ قدم کی پیروی کی، اور یونان کی تبعیت میں رومن قوم نے بھی مدارس کا افتتاح کیا لیکن رومن قوم کی اس ترقی اور اٹھان سے پہلے بطالسہ نے (اسکندر مقدونی کی اجازت پر) اسکندریہ میں ایک مدرسے اور کتب خانے کی بنا ڈالی تھی۔ جو تھوڑے ہی عرصہ میں دنیا کے تمام مدارس و مکاتب پر فوقیت لے گیا۔ اسکندریہ کا یہ مدرسہ تقریباً سات صدیوں تک اعلیٰ پیمانے پر چلتا رہا۔

ابتدا میں پیروانِ مسیح نے زمانی علوم کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اس زمانے میں اُن کی تمام تر ہمت و توجہ کا اصلی مرکز دینی علوم تھے۔ اس میدان میں فارس اور عرب مسیحیوں سے بہت آگے ہیں، نوشیروان عادل نے ۵۲۵ء میں جندیسا پور میں طب و حکمت کا اعلیٰ پیمانے پر ایک مدرسہ کھولا تھا جو عباسیوں کے زمانۂ حکومت تک قائم رہا۔ چنانچہ خلیفہ منصور عباسی نے اُسی نقش پر بغداد میں ایک نئے دارالعلوم کا افتتاح کیا۔ لیکن ہارون رشید جب سریر آرائے خلافت ہوا تو علوم و فنون کی گرم بازاری بہت بڑھ گئی، حتیٰ کہ ہر جامع مسجد کے پہلو میں ایک پرائمری اسکول قائم تھا۔ مامون کے زمانہ میں باپ کی علمی یادگاریں اور زیادہ آب و تاب کے ساتھ چمکیں۔ دمشق و بغداد، بصرہ و بخارا، اسکندریہ و قاہرہ، مراکش و فارس اور اندلس وغیرہ میں مدارس علمیہ کا رواج بڑی دھوم سے پھیلا۔ سنہ ۱۰۰۰ میلادی میں صرف قاہرہ کے اندر ۲۰ بڑے بڑے مدارس تھے۔ قرطبہ میں ۷ عظیم الشان کتب خانے بہترین اور لاجواب کتابوں سے مملو موجود تھے۔ اندلس کے ہر پرگنے میں چھوٹے چھوٹے مدارس کے علاوہ ایک بڑا مدرسہ بھی تھا۔ سنہ ۱۱۲۶ میلادی میں خود قرطبہ کے اندر ۱۵۰ مریہ میں ۵۲، پرتگال میں ۲۵، مریہ میں ۱۷ علمی انجمنیں تھیں، اشبیلیہ، غرناطہ اور بلنسیہ کی علمی انجمنوں کی تعداد مزید برآں تھی۔ علامہ مقری کا بیان ہے کہ اہلِ اندلس علم کے بڑے حریص تھے۔"

خود علم اور علمی کتابوں کے ساتھ خلیفہ المستنصر کی عنایتوں کا یہ حال تھا کہ اُس نے اپنی طرف سے علمی

کتابوں کی خریداری کے لئے مصر و افریقہ فارس و عرب کی طرف مختلف وفود بھیجے، جو ہر قسم کی علمی کتابوں کو خریدتے اور نقل کرتے۔ خلیفہ نے مصنفینِ زمانہ سے اُن کی تمام تصنیفات طلب کیں، اور معاوضے میں زر و جواہر سے اُن کے دامن کو مالا مال کیا۔ یہاں تک کہ علمی جواہر ریزوں کا چار کروڑ یا چھ کروڑ کتابوں کی صورت میں ایک انبار لگ گیا۔

ابو الفرج المطلی کی روایت ہے کہ قاضی صاعد بن احمد اندلسی قاضی طلیطلہ المتوفی ۴۶۲ھ نے لکھا ہے کہ:۔ عرب نے صدرِ اسلام میں زبان اور احکامِ شریعت کی معرفت کے علاوہ کسی دوسرے علم کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ کہیں کہیں بعض افراد ضرورت کی مجبوریوں سے صرف طبی مشغلہ رکھتے تھے۔ عربوں کی یہ رفتار دولتِ امویہ کے خاتمہ تک قائم رہی لیکن جب ہاشمیہ کا دور آیا اور یہ لوگ ملک کے بادشاہ ہوئے تو سب سے پہلے جس نے علوم کی طرف توجہ کی وہ خلیفہ ثانی ابو جعفر المنصور کی ذاتِ گرامی تھی۔ موصوف کو تبحرِ فقہ کے علاوہ فلسفہ و نجوم کے مسائلِ دقیقہ میں بھی مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ اسی سلسلہ کا ساتواں فرمانروا مامون بن ہارون رشید جب سریر آرائے خلافت ہوا تو اُس نے اپنے دادا المنصور کے ناتمام عزائم کو بڑی خوبی سے پورا کیا۔ مامون نے علوم و فنون کی جو گرانقدر خدمات انجام دیں، وہ تاریخ کے اوراق میں زندۂ جاوید رہیں گی۔ مامون نے ملوکِ روم کے پاس بہت سے وفود بھیجے۔ اور اُن کے کتب خانوں کی نادر اور جیّد فلسفیانہ کتابیں منگوا کر ماہرینِ فن سے اُن کے ترجمے کرائے اور لوگوں کو فلسفہ پڑھنے کی ترغیب دی۔ مامون کو حکما سے بہت زیادہ انس تھا۔ وہ ان کے مذاکرات اور مناظروں کو بڑی دلچسپی کے ساتھ سنا کرتا تھا۔

بغداد میں عباسیوں نے، مصر میں فاطمیوں نے، اندلس میں امویوں نے مامون کے اس مبارک طرز کی عرصہ دراز تک تقلید کی۔ جس کی بدولت مدارسِ عربیہ کے انتشار کا دائرہ سمرقند و بخارا سے لے کر فارس و قرطبہ تک پھیل گیا۔ امراو ملوک ان مدارس پر بڑی بڑی رقمیں صرف کرتے تھے۔ مشہور مورخ گبن نے نقل کیا ہے کہ:۔ کسی وزیر نے بغداد میں صرف ایک مدرسہ جامعہ کے انشا پر ۲۰۰ ہزار گنی خرچ کی تھی اور ۹ ہزار گنی سالانہ کی آمدنی کی جائداد اُس پر وقف کی تھی۔ (یہ فیاض ذات نظام الملک طوسی کی ذات تھی اور وہ مدرسہ بغداد کا مشہور مدرسہ نظامیہ تھا)

قاہرہ کے صرف ایک کتب خانے میں مختلف علوم و فنون کی ایک لاکھ سے زیادہ نادرِ روزگار کتابیں موجود تھیں اور اُن کے مطالعہ کی ہر شخص کو عام اجازت تھی۔ اس مکتبہ کی صرف فلکی اور طبی کتابوں کا شمار ۶۵۰۰ مجلدات

سے زیادہ تھا۔

مدارسِ عربیہ اور اُن کی علمی خدمات کے حیرت انگیز کارناموں کی یہ ایک معمولی توصیف ہے۔ اگر موقعہ ملا تو کسی اگلی صحبت میں انشاءاللہ بسط کے ساتھ ہم پھر عرض کریں گے، لیکن بااین ہمہ تاریخ کی یہ ایک ناقابلِ برداشت حقیقت ہے کہ گیارھویں اور بارھویں صدی سے پہلے حقائق و معارف اور علوم و فنون کا آفتابِ عالمتاب مشرق سے مغرب کی طرف مائل ہوگیا۔ اور ایشیا و افریقہ سے ہٹ کر اس کی نورانی شعاعیں سرزمینِ یورپ پر پڑنے لگیں۔ یورپ میں سب سے پہلے علوم و فنون کے مدارس کا رواج اٹلی میں شروع ہوا۔ نویں صدی میں مدرسہ "سالرنو" کی بنیاد ڈالی گئی۔ اور گیارھویں صدی میں یہ مدرسہ طب میں اتنا مشہور ہوا کہ اقطارِ یورپ سے جوق درجوق طلبا آنے لگے۔ دسویں صدی کے اواخر میں مدرسہ "بولونا" کا افتتاح ہوا۔ اور گیارھویں صدی میں اس مدرسے نے قانون میں عام شہرت حاصل کی۔ اور ۱۲۶۰ء میں طب و قانون اور الٰہیات کی اعلیٰ ڈگری دینے لگا۔

پیرس کا مدرسہ ایک زمانے سے قائم ہے لیکن تیرھویں صدی کے اوائل میں جاکر قانون اور طب، فنون اور الٰہیات وغیرہ کا اس میں باقاعدہ انتظام ہوا۔ ۱۲۵۳ء میں پیرس کے اندر ایک جدید مدرسہ "سارین" کی تعمیر شروع ہوئی۔ اور ابھی چودھویں صدی عیسوی ختم نہیں ہوئی تھی کہ فرانس میں ۴۰ یونیورسٹیاں تیار ہوگئیں۔ "سلامنکا" کا مشہور مدرسہ ۱۲۴۲ء میں قائم ہوا۔ اور مسلسل ۵۰۰ برس تک اسپین والوں کے لئے باعثِ فخر رہا۔ آکسفورڈ کے متعلق صحیح طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کب قائم ہوا لیکن غالب گمان یہ ہے کہ بارھویں صدی کے شروع میں اس کا مکمل افتتاح ہوچکا تھا۔ ۱۲۳۳ء میں "کیمبرج" کا مدرسہ، جامعہ کی حیثیت میں منتقل ہوا۔ ۱۳۴۷ء میں مدرسہ "براگ" اور ۱۳۶۵ء میں مدرسہ "وائنا" کو یونیورسٹی بنایا گیا۔ پھر مدارسِ جامعہ کی تاسیس اور تشئید اس کثرت سے پھیلی کہ سارے یورپ میں عام ہوگئی۔ امریکہ والوں نے بھی اپنے یورپین اسلاف کی پیروی میں بےنظیر ہمت اور انفاق کے ساتھ یونیورسٹیوں کا افتتاح کیا۔ امریکہ میں کتنے ہیں جنہوں نے بیسیوں لاکھ گنی یا اس سے بھی زیادہ کی رقمیں مدارس پر وقف کی ہیں۔ امریکہ والوں کی یہ عدیم النظیر قربانی اور ایثار حقیقت میں ساری دنیا کے لئے ایک پیغامِ درس و عمل ہے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار لعلکم تفلحون

بدر اصلاحی

خدا حافظ

اے گلِ گلستانِ رعنائی — جانِ محبوبی و دلآرائی
میرے دم سے ہے سوزِ پروانہ — تجھ سے روشن ہے شمعِ زیبائی
میرا جینا بھی کوئی جینا ہے — تجھ بن اے نورِ چشمِ بینائی
تجھ بن آرامِ زندگی معلوم — اے سرورِ دلِ تمنّائی
کیسے گزرے گی رات فرقت کی — کیسے کاٹوں گا روزِ تنہائی
جاں ہی لے کر رہے گی آخرِ کار — دردِ فرقت کی کارفرمائی
مر رہا ہوں میں اس تصوّر سے — ہے مرے دل پہ غم کی یغمائی

از جگر دود میرود بسرم
شعلہ ام خشک مغز و سودائی (نظیری)

تجھ کو جانے نہ دوں کہیں ہرگز — چاہتا ہے یہ شوقِ سودائی
لیکن اس وقت کی عنان گیری — ہے سراسر خلافِ دانائی
کہہ رہا ہوں تجھے خدا حافظ — گو نہیں طاقتِ شکیبائی

بسفر رفتنت مبارک باد
بسلامت روی و باز آئی (سعدی)

جلال الدین اکبر

شادی کیونکر ہو

سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا مکان ہے۔ مردانی بیٹھک میں ایک چھوٹی کوٹھڑی اور دو خاصہ کمرہ ہیں زنانے میں ایک چھوٹا سا صحن ہے دو جانب دالان اور اندر کے رخ تین چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ بیچ میں ایک شاہ نشین سی بنی ہے۔ اوپر ایک چبوترہ اور اس کے بعد تین در کا دالان۔ دالان کے بعد ایک سہ درہ کمرہ اور بازوؤں میں دو چھوٹے کمرے ہیں۔ دالان میں دری کا فرش ہے وسط میں گاؤ تکیہ اور سوزنی بچھی ہے۔ اس چھوٹے سے صاف ستھرے گھر کی مکین دو بہنیں ہیں۔ بڑی بہن عصمت لاولد ہیں۔ بیوہ ہو چکی ہیں اپنی چھوٹی بہن رفعت کے پاس رہتی ہیں۔ رفعت کے دو بچے ہیں لڑکی پندرہ سال کی اور لڑکا دس سال کا ہے۔ رفعت کا میاں وکیل ہے کافی آمدنی ہے۔ گھر کا خرچ اجلا ہے۔ شریفانہ زندگی بسر ہوتی ہے۔ موقع موقع سے کچھ پس انداز بھی ہو رہتا ہے۔

رفعت دالان میں بیٹھی کچھ سی رہی ہیں۔ عصمت کسی اور کام میں مشغول ہیں

رفعت۔ اے باجی ذرا ورے آنا۔

عصمت۔ بوا کیا ہے۔ آج فرصت تھی میں نے کہا لاؤ خمیری سمبوسہ ہی تل لوں تمہارے میاں کو پسند ہیں چار اور رہ گئے ہیں، ذری ٹھہر جاؤ یہ نکال لوں۔ نہیں تو کڑاہی جلے گی۔

رفعت۔ اے ہے آپا آپ کو تو جب دیکھو جب بھی تلتا پکاتا۔ وہی مثل ہے اُٹھ ساسو پیٹ کا دکھ۔ وہ رحمت بیٹھی کیا کر رہی ہے۔ اسے دیجے نا۔

عصمت۔ رے رحمت تو آ بیٹھ تیری بیوی کوئی کام بھی قرار سے کرنے دیتی ہیں؟ دیکھیو ذرا سنہری نکالیو جلا نہ دیجو۔

عصمت کفگیر چھوڑ بہن کے پاس آ بیٹھیں۔ پٹاری گھسیٹ کے پان بنایا۔

رفعت۔ آپا کل مہرالنسا پھر آئیں گی میں کیا جواب دوں گی۔

عصمت۔ جواب کیا "ہاں" اس کے لئے بھی کسی تام جھام کی ضرورت ہے؟

رفعت۔ اوئی لو اور سنو۔ آپ نے تو کیسی آسان "ہاں" کہہ دی۔
عصمت۔ تو بوا اور کیا کہوں۔ بیٹی کا معاملہ ٹھہرا آخر لڑکے میں کیا نی ہے۔ ٹک ٹک سے ٹھیک۔ ننھال ددھیال صاف۔ پڑھا لکھا وہ موا بی اے ٹی اے کیا ہوتا ہے اس میں پڑھتا ہے سو پچاس کا نوکر بھی ہو جائے گا اور تمہیں کیا چاہئے۔ یہی چودھویں پندرہویں برس شادی کا وقت ہوتا ہے۔
رفعت۔ آپا ابھی تو شوکت کی پڑھائی بھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ اور پھر جب تک لڑکا کھاتا کماتا نہ ہو کس امید پہ لڑکی دے دوں۔ میں تو بیس سے پہلے کبھی بھی میری شوکت کو نہ بیاہوں اور وہ بھی جب تک شوکت کی رائے نہ ہو ہاں کیسے کہہ دوں۔
عصمت۔ تو بوا پھر پوچھتی کیوں ہو جو دل میں آئے سو کرو۔ نا بوا ہمارے زمانے میں اماں باوا نے جس کے چاہا حوالے کر دیا۔ جیسا ملا اُسے بھرا بھگتا۔ جب آئی گور میں جا سوئے کسی نے ہوں سنی نہ ہاں۔ یہ موئے فرنگیوں کے طور طریق انہیں کو مبارک رہیں۔ بھلا غضب تو دیکھو شوکت سولہویں برس میں موئے لونڈوں کی طرح مدرسوں میں پڑھنے جائے نہ ڈولی نہ گاڑی۔ اچھی بُری نظریں پڑیں۔ بیٹی ذات ٹھہری۔ اللہ اماں باوا کی عزت رکھے۔ نا بوا مجھے تو یہ بات ایک آنکھ نہیں بھاتی۔
رفعت۔ آپا بے شک والدین اولاد کے لئے اچھا ہی کرتے ہیں لیکن انہیں اولاد کے خیالات کا احساس کیسے ہو۔ اب آپ ہی بتائیے میرے دل میں اس وقت کیا ہے۔ آپ اپنی ہی کہئے آغا دولہا سے آپ خوش تھیں۔ ایک نہیں دو دو سوکنوں کا جلاپا رات دن کی دانتا کل کل آپ دن کہتیں تو وہ رات۔ آپ نے اپنے کو تمام کر لیا۔ مگر انہیں کبھی پروا بھی نہ ہوئی۔ کیوں کیا ابا جان کو اُن کے اطوار معلوم نہ تھے بچپن سے دیکھا تھا۔ مگر وہی کوتاہ نظری۔ خاندان سے باہر نگاہ ہی نہ کی۔ بیسیوں پیام آئے مگر خدا بخشے اماں جان نے کسی کو کشمیر کا جلاہا ٹھہرایا کسی کو نو دولتا کہا کسی کی ددھیال میں فی نکالی۔ کسی کی ننھال میں کیڑے ڈالے ایک نہ پسند آیا۔
عصمت۔ نا بوا۔ میرے موئے اماں باوا کو کیوں بنتی ہو قسمت میں جیسا لکھا تھا مل گیا۔ تم ہی کہو شمنوں کے لئے آخر تمہیں بھی تو مانگا تھا۔ وہ بھی تو ان کا بھانجا ہی تھا۔ پھر تمہیں کیوں نہ دے دیا۔
رفعت۔ تو مجھے جھونکنے میں کسر ہی کیا تھی۔ اللہ بخشے نانا جان نہ اڑتے نہ ان سے میری شادی ہوتی ایک نواسی کا حشر تو دیکھ چکے تھے دوسری کی چھاتی پر کیوں مونگ دلواتے۔ دیکھ لو شمنوں کیا کر رہا ہے ایک پہ ایک سوکن لا رہا ہے باپ کی اس گاڑھے پسینے کی کمائی یوں خاک میں ملا رہا ہے۔ باجی یہ سب جہالت کی باتیں ہیں قسمت کے

لکھے کو تو کون میٹ سکتا ہے۔ مگر اللہ نے جب آنکھیں دی ہیں تو اندھے کیوں ہو جائیں

عصمت۔ ہاں بوا سچ ہے۔ چودھویں صدی ہے۔ لڑکی کو کُو لیے سے لگائے بیٹھی رہو۔ تم ہی نے تو اس لڑکی کو غارت کیا ہے۔ موئی پچھل پائیاں میموں جیسا لہنگا پھڑکاتی پھرے۔ بوا چاہے برا مانو یا بھلا میں تو خدا لگتی کہوں گی۔ توبہ کنبہ کی لڑکیاں ایسی ہوائی دیدہ ہوں۔ نہ سینا نہ پرونا نہ پکانا نہ ریندھنا۔ جب دیکھو جب نگوڑی پرچیاں۔ یہ فلانی مس کی ہے یہ ڈھمکی میم کی ہے۔ بس یہی کسر رہ گئی بیٹی سے میاں بھی پسند کرا لو (کانوں پہ ہاتھ رکھ کر) نا بوا۔ اللہ بچائے بُرا زمانہ ہے۔

رفعت۔ آپا آپ سچ کہتی ہیں۔ اگلے زمانے میں اور اب میں بہت فرق ہے۔ اس زمانے میں نہ کوئی شرم کو پوچھتا ہے نہ گھرداری کو۔ جہاں دیکھو تعلیم پوچھی جاتی ہے۔ جس لڑکے کو دیکھئے انگریزی تہذیب کا دلدادہ، انگریزی رہائش کا شیدا۔ اگر لڑکی اس جیسی نہ ہوئی تو دونوں کی جان ضیق میں اور اماں باوا کے گلے میں جوتیوں کا ہار۔ تو باجی اپنے کو جنجال میں کون ڈالے۔ اولاد جانے اور اُس کا کام۔ ہاں اچھا بُرا ہم بھی بتا دیں گے۔

عصمت۔ بس بوا تو پھر تم پہ کاہے کا بوجھ ہے۔ لڑکی خود جواب دے لے گی۔

رفعت۔ توبہ آپا آپ تو ناراض ہوتی ہیں۔

عصمت۔ ناراض نہ ہوں تو کیا کروں۔ لڑکی کو تم نے ہوّا بنا دیا۔ بوا بیٹی نہ ہوئی اتالیق ہوئی۔

رفعت۔ آپا اتالیق کی کیا بات ہے۔ لڑکی سے پوچھنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ میں تو کل مہرالنسا سے کہہ دوں گی لڑکا پڑھ لکھ لے کام سے لگ لے پھر دیکھا جائے گا۔ ایسی جلدی ہی کیا ہے۔

سردار محمد معظم خاں

تھوڑے پر قناعت کرنا بہت بڑی دانائی ہے۔

نیکی کی محبت خوشی پیدا کرتی ہے۔

محبت کا ہاتھ افلاس کو شکست دیتا ہے۔

کاہل کو اپنا نفس بارِ گراں اور زندگی وبالِ جاں معلوم ہوتی ہے

آرشد بدایونی

بھابی کے نام خط

اے بی بھابی سلام

کہوگی تو سہی کہ اللہ ری سعیدہ کتنی جھوٹی ہے۔ مگر بھئی بھابی دیدوں گھٹنوں کی قسم جو مجھ نگوڑی کو دم لینے کی بھی مہلت ملی ہو۔ یوں تو مجھے گھر پہنچے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہو گئے مگر ادھر تو نگوڑے گھر کے دھندے اور اُدھر ماما ایسی کم بخت ہے کہ بس اگر خبر نہ رکھوں تو کھانا دیکھتے ہی بجائے بھوک لگنے کے بھاگ جاتے۔ مصالحہ کی ہراند گوشت کی بساند کے مارے متلی ہونے لگتی ہے۔ یہ نگوڑی دیہات کی عورتیں ہماری دہلی کے کھانے کیا جانیں۔ یہ تو خیر بیچاری غریب عورت ہے جو سونے سے پیلی ہوئی پڑی ہیں اُن کو بھی دیکھو تو بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ روپیہ ہو جانے دو موا گنوارپن کہاں جائیگا کل یہاں کے تحصیلدار کی بیوی ملنے آئی تھیں، کوئی پچاس برس کی عورت، سر میں کڑبڑے بال، سانولا رنگ، موٹا نقشہ تلوں سے سارے منہ پر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ سبز مخمل کا سر بیب پاجامہ جس کی مہریوں پر لچکا ٹنکا، اودا مخمل کا کرتا نھی جان تو ئی لچکا لگا، سبز جھپا نتے رنگ کا بنارسی دوپٹہ، زیور میں گوندنی کی طرح لدی، پاؤں میں پازیب رم جھول چوراہی پل لچھے الم غلم پھنسے، ہاتھ میں آرسی جس میں بار بار اپنا منہ دیکھتی تھیں۔ غرض کہ عورت کیا تھی خاصا ہولی کا سوانگ تھی۔ بے خبر بے اطلاع آدھمکیں۔ میں غسل کر رہی تھی بسنتی نے جا کر کہا، جلدی جلدی تین لوٹے ڈال باہر نکلی۔ یہ ہیئت کذائی دیکھ کر ہنسی بہت آئی مگر ضبط کیا۔ افروز جہاں جیسی شریر ہے تم کو معلوم ہے۔ وہ باتیں کر رہی تھیں یہ پیچھے کھڑی نقلیں اتار رہی تھی میری مارے ہنسی کے بُری حالت تھی۔ اے ہے بھابی ان دیہات والیوں کی شکل پر روڑھاپن کیسا برستا ہے۔ خدا کسی دلّی والے کو تو دیہات میں لائے نہیں۔ بات کرو تو مزا نہیں، نگوڑی سخت زبان، میرا تو دم الٹتا ہے، آٹھ دن میں دل گھبرا گیا۔ سچ کہوں تمہاری نندوئی کی تکلیف کا خیال نہ ہو تو ایک دن بھی نہ ٹھہروں۔ سونے میں لدی پڑی ہیں مگر قرینہ نہیں۔ اے لو میں تم کو ایک دعوت کا حال سناؤں۔ پیر کے دن یہاں ایک بڑے زمیندار ہیں، گاؤں گراؤں کوٹھی باغ سب کچھ، باہر کا کارخانہ بہت بڑا ہے میں سمجھی اُن کی بیوی سے مل کر ضرور جی بہل جائے گا۔ خیر بھابی میں جو پہنچی تو دیکھا کہ آنگن بہت بڑا پختہ، مگر نارنگی امرود کے چھلکے جا بجا کوڑے کے ڈھیر، حوض سنگِ مرمر کا کیسا خوبصورت بنا ہوا مگر اس میں بھی ٹوٹے ٹھیکرے، ماش کی دال کے چھلکے نوکریں تین چار اترولنے آئی تھیں۔ میلے چکٹ کپڑے جھنڈے بال۔ میرے کپڑے دیکھ کر لگیں چہ غم چہ غم کرنے میں اس حیرت میں تھی کہ یہ تماشا کیا ہے۔ آگے بڑھی چبوترے پر ایک بان کی چارپائی پر ایک تیرہ چودہ برس کی لڑکی بیٹھی ہوئی۔ ایک ماما اُس کی جوئیں دیکھ رہی تھی۔ لڑکی کے کپڑے ریشم کے تھے اور گوٹا کناری لگا تھا مگر میلے چکٹ۔

معلوم ہوا یہ سردار صاحب کی صاحبزادی ہیں۔ میں یہ تماشا دیکھتی چلی جا رہی تھی کہ دو تین لونڈیاں دھپڑ دھپڑ بھاگتی ہوئی اور یہ کہتی ہوئی آئیں کہ بی بی جی بی بی آتی ہیں۔ بوا میں ان کی شکل حیران ہو کر دیکھنے لگی بے خیالی میں منہ اوپر اٹھائے جا رہی تھی نگوڑے کیلے کے چھلکے پر پاؤں پھسلا، اوندھے منہ گرنے سے بچی، ابھی پوری طرح سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ ایک بیوی سیاہ فام، بھدی سی آ کر نہ سلام نہ دعا گلے سے لپٹ گئیں۔ میں ہکا بکا کہ یہ تماشا کیا ہے۔ خیر جب وہ الگ ہوئیں تو معلوم ہوا سردار صاحب کی بیوی یہی ہیں۔ کہنے لگیں بوبو اندر چلو۔ اُن کے اس فقرے پر ایسی ہنسی آئی کہ بے اختیار ہنس پڑی۔ ہنستے ہوئے دوپٹے پر جو نظر پڑی تو نگوڑا ابا ربلیٹ کا دوپٹہ جس پر اللہ بخشے دو اخوش قدم کے ہاتھ کی کیکری اور کٹاؤ بنا ہوا تھا غارت ہو کر رہ گیا۔ چکنے ہاتھ کا پورا نیچے کا نشان دوپٹے پر ہو گیا۔ صدر دالان میں پہنچی۔ چوکوں پر قیمتی دالان کا فرش مگر منوں گرد۔ قیمتی اشیاء جو طاقچوں میں سجی تھیں وہ بھی خاک آلود۔ اب کھانے کا حال بھی سنو۔ سینی نہ لبتنی خوان پوش، دو لونڈیاں طشتریوں میں کھانا لے کر آئیں۔ پیچھے سے ایک روٹیوں کی تھئی لے کر آئی۔ کھانے تو بہت تھے مگر نگوڑے سراندے بساندے، گوشت کچر کچر کرتا۔ بہ مشکل تھوڑا بہت کھایا۔ اور تو خیر سب کچھ تھا مگر شامی کبابوں پر ورق دیکھ کر ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ کھانا شروع کرنے سے ذری دیر پہلے ایک بیوی نے آ کر پاؤں پکڑ لئے۔ میں نے سردار صاحب کی بیوی کی طرف حیرت سے دیکھا، کہنے لگیں یہ بہو ہیں، ہمارے ہاں بہوئیں پاؤں چھوتی ہیں۔ ان کا بھی حلیہ سنو شکل تو خیر خاصی تھی مگر دیہات کا روڑھا پن کہاں جائے۔ بچہ کوئی چار برس کا گود میں، ٹانگوں سے ننگا سر پر گوٹے کی ٹوپی، ہاتھ میں گاجر کا ٹکڑا۔ کھانا شروع ہوا لڑکا بہت بے باکی سے سب چیزیں بہت بہت سے کر کھا رہا تھا، شب دیگ کا پیالہ اٹھانے کے لئے جو ہاتھ بڑھایا تو پانی کا گلاس جو بھرا رکھا تھا وہ اس سے ٹکرا کر گرا۔ شامتِ اعمال سے وہ مجھ نگوڑی کے قریب تھا۔ پانی بہ کر آیا اور جب تک میں اٹھوں اٹھوں غرارے کے پائنچے سب گیلے ہو گئے۔ اس قدر غصہ آیا کہ بس کیا کہوں مگر دادی نے مسکرا کر کہا۔ ننھے نچلے بیٹھو، دیکھو پانی گر گیا۔ لڑکا اس کہنے پر بگڑ گیا اور منہ اوندھا کر جو لات ماری تو تلاجی کا پیالہ جو پاس رکھا تھا اوندھ گیا۔ بہ مشکل ماں نے خوشامد منت سماجت سے اٹھایا۔ میں تو ایسی گھبرائی کہ کھانا ختم کرتے ہی اجازت مانگی۔ لے ہے بھابی کبھی اماں جان یہاں ہوں اور تم ہو تو تماشا دیکھو۔ اے بھابی افروز کہتی تھی کہ جنئے کا خیر سے پیر بھاری ہے اس چھوٹی پیاڑن کا تو مجھے یقین نہیں تم لکھو تو یقین آئے۔ ہم تو اس دن کی آس سنا رہے ہیں۔ ماموں ابا تو بہت خوش ہونگے! افروز تم کو سلام کہتی ہے۔ یہ خط ذری حمیدہ کو دکھا دینا۔ ذرا مہلت ہو تو اُن کو بھی خط لکھوں۔ اماں جان کی خیریت لکھنا۔ لو خدا حافظ۔ اب غسل کرنے جاتی ہوں، مارے گرمی کے دم بولا رہا ہے۔ فقط تمہاری سعیدہ

ماہرخ

لمعات

حیات و ذوقِ طرب، اے رہینِ بےخبری | گئی نہ ظلمتِ شب تا ستارۂ سحری

غمِ زمانہ صبر آزما مبارک باد | کہ رازِ ہمتِ پرواز ہے شکستہ پری

ہر ایک ذرۂ تاریک ہے حریمِ جمال | حجابِ دید اگر ہو نہ تیری کم نظری

مگر بطرزِ جنوں چاک پیرہن کر لے!! | جنوں اگرچہ نہ دیتا ہو درسِ جامہ دری

نثار لاکھ نشاطِ ارم، جو ممکن ہو | شرابِ ناب و لبِ جوئبار و رقصِ پری

مقامِ شکر ہے اے شکوہ سنجِ ناپرسی | کہ ننگِ زخمِ جگر تھا خیالِ بخیہ گری

حدودِ میکدہ ہیں، کائناتِ لامحدود | جہانِ بیخودی و صد جہانِ بےخبری

ذلیل کیوں نہ متاعِ کمال ہو اختر

ہوئی ہے زینتِ بازارِ جنسِ بےہنری

سید علی اختر

خالد اور حمیدہ

(عرب کے مشہور شاعر اصمعی کا ایک افسانہ)

محارب اور ظہیر ایک ہی ماں باپ سے دو بھائی تھے، دونوں اپنی جرات اور شجاعت کی وجہ سے ملک بھر میں مشہور تھے۔ لیکن محارب قبیلے کا سردار تھا اور ظہیر اُس کا وزیر تھا۔ محارب اُس کے مشورے پر چلتا تھا مگر ظہیر پھر بھی اُس کا تابعِ فرمان تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اُن کے درمیان کسی معاملہ پر سخت تکرار ہوئی اور بڑا بگاڑ پیدا ہو گیا۔ ظہیر اُٹھ کر اپنے خیمے کی طرف چل دیا۔ وہ نہایت مغموم تھا اور نہ جانتا تھا کہ اب کیا کرے۔ اُس کی بیوی نے اُس سے پوچھا "اے عربی سرداروں کے سردار! تم اس قدر آزردہ خاطر کیوں ہو؟ کیا تمہیں کسی نے ناراض کیا ہے یا کسی نے تمہاری توہین کی ہے؟" ظہیر نے کہا "میں کیا کروں وہ جس نے میرے دل کو زخمی کیا ہے وہ ہے جس پر میں اپنا ہاتھ نہیں ڈال سکتا، جسے میں کوئی مضرت نہیں پہنچا سکتا وہ دنیا میں میرا ایک ہی رفیق، میرا بھائی ہے۔ آہ، اگر وہ کوئی اور ہوتا تو میں اسے بتا دیتا کہ وہ کیسے شخص کا مدمقابل ہوا ہے اور اپنی قوم کے روسا کے سامنے اس کی مثال کو ایک عبرت بنا کر پیش کرتا۔" اُس کی بیوی نے کہا "اُسے اپنے مال و منال سے لطف اٹھانے دو اور تم یہاں سے چلو۔" اور ظہیر کو آمادہ کرنے کے لئے اُس نے بڑے بڑے شعرا کے شعر پڑھے، جن میں مذکور تھا کہ توہین انسان کو اپنے ماں باپ کی جانب سے بھی قبول نہیں کرنی چاہئے۔

ظہیر نے اپنی بیوی کے مشورہ کو مان لیا۔ اُس نے رخصت کی تیاری کر لی۔ اپنے خیمے لپیٹ لئے اونٹوں پر اسباب لادا، اور قبیلۂ سعد کی قیام گاہ کی طرف چل دیا جو اُس کے حلیف تھے۔ مگر اُس کے دل میں اپنے بھائی سے جدا ہونے پر رہ رہ کر ایک درد اُٹھتا تھا ـــــ اور اُس نے کہا "اس سفر میں جو مجھے تجھ سے دور لے جا رہا ہے مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں ہزار سال چلتا رہوں گا اور ہر سال مجھے تجھ سے ہزار میل دور لے جائے گا۔ . . . . اگر اب تو مجھ پر ہزار مصر کے برابر بھی احسان کرے اور ہر مصر میں ایک ہزار نیل ہوں تو میں انہیں حقارت کے ساتھ ٹھکرا دوں گا جب تک میں تجھ سے دور رہوں گا اپنی کم مائگی پر قناعت کروں گا اور جدائی کے دنوں میں اس شعر کو پڑھوں گا جو تابناک موتیوں کی لڑی سے بھی زیادہ قیمتی ہے: "جب کسی شخص کی اپنی ہی قوم اور اپنے ہی وطن میں تحقیر کی جائے تو

اُس کے لئے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ تو جس نے میرے دل کو یوں زخمی کیا ہے بہت جلد رحمٰن و رحیم خدا کی قوت کو محسوس کرے گا کیونکہ وہی میرے اور تیرے درمیان فیصلہ کرنے والا اور قائم و دائم ہے"

آخر ظہیر قبیلۂ سعد میں پہنچ گیا اور گھوڑے پر سے نیچے اُتر آیا۔ بنو سعد نے اس کا نہایت پُرجوش خیر مقدم کیا اور اسے اپنے پاس رہنے پر مجبور کیا۔ اُس کی بیوی جلد ہی ایک بچے کی ماں بننے والی تھی، اور ظہیر نے اُس سے کہا "اگر خدا نے ہمیں لڑکا دیا تو یہ اُس کی عین عنایت ہے لیکن اگر لڑکی پیدا ہوئی تو اس کا چرچا نہ کرنا اور لوگوں کو اس مغالطے میں رہنے دینا کہ ہمارے ہاں لڑکا ہوا ہے تاکہ میرے بھائی کے لئے وجہ شماتت پیدا نہ ہو" آخر وہ وقت بھی آن پہنچا اور ظہیر کی بیوی کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی انہوں نے اس کا نام جیّدہ رکھا لیکن ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا کہ باہر لوگوں میں اُسے جُندر کہہ کر پکارا جائے تاکہ وہ اسے لڑکا سمجھیں۔ اور لوگوں کو اس کا مزید یقین دلانے کے لئے ان کے ہاں کئی دن تک صبح و شام دعوتیں اور جلسے ہوتے رہے۔

قریب قریب اسی زمانے میں دوسرے بھائی محارب کے گھر بھی لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اُس نے خالد رکھا۔ اُس نے یہ نام خدا کی بارگاہ میں شکرانہ کے طور پر منتخب کیا، کیونکہ جب سے اُس کا بھائی اُسے چھوڑ کر چلا گیا تھا اُس کے معاملات سلجھ رہے تھے۔

دونوں بچے جوان ہو گئے اور اُن کی شہرت عرب کے طول و عرض میں پہنچ گئی۔ ظہیر نے بیٹی کو گھوڑے کی سواری اور تمام وہ فنونِ جنگ سکھا دیئے تھے جو ایک جری اور بہادر سپاہی کے لئے سیکھنے لازمی ہیں۔ اُس نے اُسے سخت سے سخت محنت اور خطرناک سے خطرناک مہم میں کود پڑنے کا عادی بنا دیا تھا جب کبھی وہ کسی جنگ پر جاتا قبیلہ کے اور عربوں کے ساتھ وہ اُسے بھی ہمراہ لے لیتا۔ اور ان جنگی سواروں میں جیدہ نے اپنی شجاعت کے طفیل جلد ہی ایک امتیازی درجہ حاصل کر لیا۔ اور ایسا ہوا کہ وہ بہادری میں اپنے رفقا سے سبقت لے گئی، یہاں تک کہ وہ تنِ تنہا شیروں پر اُن کے غاروں میں جا کر حملہ کر دیا کرتی تھی۔ اُس کا نام سن کر لوگ کانپ جایا کرتے تھے۔ جب وہ کسی بہادر کو مغلوب کرتی تھی تو وہ ضرور کہا کرتی تھی:۔"میں جندر ابنِ ظہیر ہوں جو قبیلوں کا شہسوار ہے"

اُدھر اُس کے عم زاد بھائی خالد نے بھی اپنے دلیرانہ کارناموں کے باعث بڑا نام پیدا کیا تھا۔ اُس کے باپ محارب نے جو ایک نہایت عقلمند اور دانا سردار تھا اجنبیوں کی تواضع کے لئے محلات تعمیر کرا رکھے تھے جہاں بہادرانِ ملک کی خصوصاً بڑی آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ خالد بڑے بڑے جنگجوؤں کی صحبت میں پلا اور بڑھا تھا۔ یہی وہ مکتب تھا جس میں اُس کے ذوق کی تربیت ہوئی تھی۔ یہیں اُس نے شہسواری کا فن سیکھا تھا،

اوراب ایک بے باک سپاہی اور ایک خوف انگیز مبارز بن گیا تھا۔ اُس کے سپاہیوں کو اب علم ہو چکا تھا کہ اُس کے جوش اور اُس کی قوت پر کوئی غلبہ نہیں پا سکتا۔

آخر اُس نے اپنے بھائی جندر کے متعلق سنا اور اُس کے دل میں اُس سے ملنے، اُس کے حالات معلوم کرنے اور اُس کے کرتب دیکھنے کا بے انتہا شوق پیدا ہوا لیکن وہ اپنے اس شوق کو پورا نہ کر سکتا تھا کیونکہ اُس کا باپ اپنے بھائی کے اس بیٹے کے متعلق اکثر ناپسندیدگی کا اظہار کیا کرتا تھا۔ خالد کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اُس کے باپ محارب کا انتقال ہو گیا۔ جس سے اعزاز دولت اور حکومت اُس کے اپنے قبضے میں آ گئی۔ اجنبیوں کی تواضع، غربا اور مساکین کی دستگیری اور بھوکے ننگوں کو کھانا کپڑا دینے میں وہ اپنے باپ کا پیرو تھا اُس نے اپنے بہادر سپاہیوں کی معیت میں بادیہ پیمائی کا سلسلہ بھی جاری رکھا جس نے اُس کی جسمانی قوت اور جرأت کو اور بڑھا دیا۔ کچھ عرصے کے بعد اُس نے بہت سے قیمتی تحائف جمع کئے اور اپنی ماں کو ساتھ لے کر اپنے چچا سے ملنے کے لئے چل کھڑا ہوا۔ اُس نے اُس وقت تک اپنے گھوڑے کی لگام نہ کھینچی جب تک وہ ظہیر کے خیمے کے پاس نہ پہنچ گیا۔ ظہیر اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اُس نے اس کی خاطر تواضع کا بڑا اہتمام کیا۔ کیونکہ اُس نے اپنے بھتیجے کی قابلیت اور شجاعت کی باتیں کئی موقعوں پر سنی تھیں۔ خالد جیدہ سے بھی ملا۔ اُس نے اُسے سلام کیا اور پھر گلے سے لگا کر اُس کی پیشانی کو چوما یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ بھی اسی کی طرح مرد ہے۔ جیدہ کی رفاقت میں اُسے بے انتہا خوشی حاصل ہوئی اور وہ دس دن تک اپنے چچا کے ہاں مقیم رہا۔ اس اثنا میں اُس نے شہسواری اور سپہگری کے کتنے ہی مقابلوں میں حصہ لیا۔ اُدھر جیدہ کا یہ حال تھا کہ جب سے اُس کی نظر خالد کی شجاعت اور حسن پر پڑی تھی وہ سو جان سے اُس پر نثار ہو چکی تھی۔ اُسے نیند نہ آتی تھی، اُسے کھانا پینا بھول گیا تھا اور اُس کی محبت اس درجہ بڑھ گئی تھی اور اُسے اپنا دل یہاں تک خالد کے قبضے میں نظر آتا تھا کہ اُس نے اپنی ماں سے کہا "اے میری ماں، اگر خالد مجھے چھوڑ کر چلا گیا تو میں اُس کی جدائی میں مر جاؤں گی۔" اُس کی ماں نے جب یہ سنا تو اپنی بیٹی پر اُسے بڑا رحم آیا۔ اُس نے اُسے کچھ نہ کہا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ناراض ہونا بے کار ہے۔ اُس نے کہا "جیدہ، اپنے جذبات کو چھپاؤ اور غم سے اپنے آپ کو نجات دو۔ تم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی، کیونکہ خالد تمہاری پسند کا لڑکا ہے اور اُس کی رگوں میں تمہاری قوم کا خون دوڑ رہا ہے۔ اُسی کی طرح تم خوبصورت اور دلربا ہو اور اسی کی طرح تم بہادر اور شہسواری میں فرد ہو۔ کل صبح جب اُس کی ماں ہمارے ہاں آئے گی تو میں سب معاملہ اُس کے سامنے پیش کروں گی، پھر ہم جلد ہی تمہاری شادی خالد سے کر دیں گے اور آخر کار ہم سب اپنے وطن کو واپس چلے جائیں گے۔

ظہیر کی بیوی آنے والی صبح کا انتظار کرتی رہی۔ جب خالد کی ماں اُن کے ہاں آئی تو وہ اپنی بیٹی کو اُس کے پاس لے آئی۔ جیدہ کے لمبے لمبے بال کندھوں پر پڑے ہوئے تھے۔ حسن کی اس تصویر کو دیکھ کر خالد کی ماں ششدر رہ گئی، اور کہنے لگی: "کیا! یہ تمہارا بیٹا جندر نہیں ہے؟" جیدہ کی ماں نے کہا: "نہیں! یہ جیدہ ہے ــــ ماہِ حسن کو دیکھو وہ طلوع ہو چکا ہے۔" پھر اُس نے وہ تمام باتیں سنائیں جو اُس کے اور اُس کے شوہر کے درمیان بچے کی تذکیر و تانیث کو چھپانے کے متعلق قرار پائی تھیں۔ خالد کی ماں نے جس کی حیرت ابھی کم نہ ہوئی تھی جواب دیا: "میری پیاری بہن ملکِ عرب کی تمام بیٹیوں میں جو اپنے حسن کے لئے مشہور ہیں میں نے کبھی اس سے زیادہ پیارا چہرہ نہیں دیکھا۔ اس کا نام کیا ہے؟" جیدہ کی ماں نے کہا: "میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اس کا نام جیدہ ہے اور اس راز سے تمہیں آگاہ کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ میں یہ حسن و جمال کا تحفہ تمہیں پیش کروں۔ میری دلی خواہش ہے کہ میں اپنی بیٹی کو تمہارے بیٹے سے بیاہ دوں اور اس طرح پھر ہم اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔" خالد کی ماں نے فوراً اس تجویز کو مان لیا۔ اور کہنے لگی: "جیدہ کی رفاقت یقیناً میرے بیٹے کو بہت مسرور کرے گی۔ وہ فوراً اٹھی اور خالد کو تلاش کر کے اُس نے جو کچھ دیکھا اور سنا تھا اسے بتا دیا اور جیدہ کے حسن و جمال کا خاص طور پر ذکر کرتی رہی اُس نے کہا: "مجھے اپنے ایمان کی قسم، اے بیٹے، میں نے جیدہ سے زیادہ خوبصورت لڑکی نہ کبھی صحرا میں دیکھی ہے اور نہ کبھی شہر میں۔ کوئی چیز اپنے حسن میں اس سے زیادہ کامل نہیں ہے اور کوئی چیز اس سے زیادہ دلآویز اور اس سے زیادہ دلکش نہیں ہے۔ جلدی کرو میرے بیٹے اور اپنے چچا سے مل کر اُس کی لڑکی کو اپنے لئے مانگ لو۔ اگر وہ تمہاری استدعا کو قبول کر لے تو یقیناً تم خوش قسمت ہو گے۔ جاؤ اور جلد سے جلد اُسے حاصل کر لو۔"

یہ الفاظ سن کر خالد کی آنکھیں جھک گئیں۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ کچھ متفکر سا ہو گیا، پھر اُس نے کہا "اماں، میں یہاں اب اور نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے اب اپنے سواروں اور فوجیوں سمیت یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیئے مجھے اب جیدہ سے کچھ نہیں کہنا، مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ ایک لڑکی ہے جس کا مزاج اور جس کا فلسفہ غیر معین ہے، اُس کی سیرت اور اس کا طرزِ کلام استحکام اور استقلال سے عاری ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنی زندگی سپاہیوں کے درمیان گزاری ہے جن پر میں اپنا روپیہ صرف کرتا ہوں اور جن کے ساتھ مل کر میں نے اپنی سپاہیانہ شہرت حاصل کی ہے۔ اب رہی جیدہ کی میرے لئے محبت، سو یہ ایک عورت کی کمزوری ہے، ایک نوجوان لڑکی کی۔" پھر اُس نے اپنا زرہ بکتر پہن لیا، اپنے گھوڑے پر سوار ہوا، چچا کو خدا حافظ کہا اور اسی وقت اپنی روانگی کا اعلان کر دیا۔ ظہیر نے پوچھا "آخر اس جلدی کے کیا معنی ہیں؟" خالد نے کہا "میں اب یہاں زیادہ نہیں ٹھہر سکتا۔" او

گھوڑے کو ایڑ لگا کر یکایک صحرا کی وسعت میں کود پڑا۔ خالد کی ماں بھی وہ تمام گفتگو جو اُس کے اور خالد کے درمیان ہوئی تھی جیدہ کو بتانے کے بعد ایک اونٹ پر سوار ہوئی اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

جیدہ کی حساس روح نے اس تحقیر کو بڑا محسوس کیا۔ وہ اسی سوچ میں ڈوب گئی ــــ اُس کی نیند اڑ گئی اور اُس کی بھوک زائل ہو گئی کچھ دن کے بعد جب اُس کا باپ اپنے سواروں کے ساتھ دشمنوں پر ایک حملے کی تیاریوں میں مصروف تھا تو اُس کی نگاہ جیدہ پر پڑی ۔ اُسے یوں افسردہ اور پژمردہ دیکھ کر اُس نے کچھ نہ کہا۔ اُس نے سوچا کہ کچھ دنوں کے بعد وہ یقیناً پھر اپنے آپ میں آجائے گی۔

ابھی ظہیر نظروں سے اوجھل ہوا ہی تھا کہ جیدہ نے جو اپنے آپ کو موت کے بالکل قریب سمجھ رہی تھی اور جس کی اداسی اب ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی اپنی ماں سے کہا "اماں، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں مر رہی ہوں، درآنحالیکہ یہ کم بخت خالد اپنی زندگی کی قوتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اگر خدا مجھے قوت دے تو میں چاہتی ہوں کہ اسے موت کے قہر و غضب کا تجربہ کراؤں اور اُس کے درد و کرب کا مزہ چکھاؤں" یہ کہہ کر وہ ایک شیرنی کی طرح اُٹھی، اُس نے زرہ پہنی اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ماں سے کہنے لگی کہ میں شکار کے لئے جا رہی ہوں۔ تیزی سے اور بغیر کہیں ٹھہرے وہ چٹانوں اور پہاڑیوں کو طے کرتی ہوئی اور اپنے بڑھتے ہوئے جوش کو بڑھاتی ہوئی خالد کی قیام گاہ میں پہنچ گئی۔ چونکہ اُس نے بھیس بدل رکھا تھا اس لئے کسی نے اُس کو نہ پہچانا اور وہ اُس خیمے میں داخل ہو گئی جو اجنبیوں کے قیام کے لئے مخصوص تھا۔ اُس کے خود کی آنکھیں حجازی سواروں کی طرح جھکی ہوئی تھیں۔ غلاموں اور خادموں نے اس کا استقبال کیا اور اس طرح اُس کی خاطر و مدارات کی جیسے وہ ملک کی کوئی بہت عالی رتبہ شخصیت تھی۔ اُس رات جیدہ نے آرام کیا، لیکن دوسرے دن فوجی ورزشوں میں اُس نے حصہ لینا شروع کر دیا، بہت سے بہادروں کو دعوتِ مقابلہ دی اور اپنی کاردانی اور بہادری کی ایسی نمائش کی کہ دیکھنے والے حیرت زدہ رہ گئے۔ دوپہر سے بہت پہلے اُس نے خالد کے سب بہادروں سے اپنی فوقیت تسلیم کرالی۔ خالد خود اُس کی شجاعت کا نظارہ کرنے آیا، اور جب اُس نے اُس کا کمالِ فن ملاحظہ کیا تو وہ حیران رہ گیا، اور اپنے آپ کو اُس کے مقابلہ کے لئے پیش کیا۔ جیدہ فوراً مقابلے کے میدان میں آگئی اور پھر دونوں لڑائی میں گتھ گئے۔ ایک ایک کر کے انہوں نے حملے اور مدافعت کے تمام داؤں آزما ڈالے یہاں تک کہ رات کے سائے اُن پر چھانے لگے۔ جب وہ جدا ہوئے تو کسی کو کوئی مضرت نہ پہنچی تھی اور دونوں میں سے کوئی بھی نہ کہہ سکتا تھا کہ فریقِ غالب کون ہے۔ یوں جب جیدہ تماشائیوں پر اپنی بہادری کا سکہ بٹھا رہی تھی تو اُس نے دیکھا کہ لوگ

اپنے سردار کو ایک اجنبی کے ہاتھوں مجبور دیکھ کر کچھ جزبز سے ہو رہے ہیں۔ خالد اپنے حریف کے لئے ہر ممکن خاطر و مدارات کے احکام دے کر اپنے خیمے کی طرف چل دیا۔ اُس کا دل آج کے معرکے کے خیالات سے بھرا ہوا تھا۔ جیدہ تین دن تک خالد کے ہاں مقیم رہی۔ ہر صبح وہ مقابلے کے میدان میں آ دھمکتی اور جب تک رات نہ ہو جاتی وہ اپنے ہتھیار ہاتھ سے نہ رکھتی۔ اُس نے ان مقابلوں سے خُوب لطف اٹھایا مگر اپنے آپ کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ اُدھر خالد نے بھی اُس سے کچھ نہ پوچھا، کوئی سوال نہ کیا کہ وہ کون ہے اور کس قبیلے سے ہے۔

چوتھے دن صبح کے وقت جب خالد حسبِ معمول اپنے گھوڑے پر چڑھ کر باہر نکلا اور مہمانوں کے خیموں کے پاس پہنچا تو اُس نے جیدہ کو بھی ایک گھوڑے پر سوار دیکھا۔ اُس نے اسے سلام کیا اور اُس نے سلام کا جواب دیا۔ خالد نے کہا "اے شریف عرب میں تجھ سے ایک سوال کرتا ہوں گو میں اب تک اظہارِ نیازمندی سے قاصر رہا ہوں لیکن اب میں اُس خدا کے نام پر تجھ سے التجا کرتا ہوں جس نے تجھے یہ قوت اور چستی عطا کی ہے مجھے بتا کہ تو کون ہے اور تیرا تعلق کس بادشاہ سے ہے؟ کیونکہ میں نے تیرے جیسا بہادر جنگجو آج تک نہیں دیکھا۔ مجھے بتا میں تجھ سے عاجزانہ درخواست کرتا ہوں کیونکہ میں یہ معلوم کرنے کے لئے سخت بیتاب ہوں۔"

جیدہ مسکرائی، اور خود کو اوپر اٹھاتے ہوئے اُس نے جواب دیا "خالد میں ایک عورت ہوں جنگجو نہیں ہوں میں تیرے چچا کی بیٹی جیدہ ہوں جس نے اپنے آپ کو تیرے سامنے پیش کیا تھا اور اپنا آپ تجھے دے ڈالنے کی خواہش کی تھی مگر تو نے انکار کر دیا ــــ اپنے اُس غرور میں جو تجھے اپنی تلوار کے باعث ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنے گھوڑے کا منہ موڑا۔ ایڑ لگائی اور ہوا کی رفتار سے اُسے اڑاتی ہوئی اپنے گھر کی سمت روانہ ہو گئی۔

خالد حیران پریشان اپنے خیمے میں واپس آ گیا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ کیا کرے اور نہ جانتا تھا کہ اُس بیتاب محبت کا جو یکایک اُس کے سینے میں لہریں لینے لگی ہے کیا انجام ہو گا۔ وہ اپنے اُس جنگجویانہ ذوق اور اپنی اُن سپاہیانہ عادات سے سخت بیزار ہو گیا جنھوں نے اُسے اس رنج و اندوہ کے کرب و اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا۔ عورتوں سے اُس کی نفرت یکایک محبت سے بدل گئی۔ اُس نے اپنی ماں کو بلا کر سب ماجرا کہہ سنایا۔ ماں نے کہا "میرے بیٹے یہ تمام حالات ایسے ہیں کہ جیدہ تمہیں اس سے بھی زیادہ عزیز ہونی چاہئے، مگر تھوڑی دیر صبر سے انتظار کرو، تاکہ میں جا کر اُس کی ماں سے اُس کا رشتہ تمہارے لئے مانگوں۔" یہ کہہ کر وہ ایک اونٹ پر سوار ہو گئی اور صحرا میں اُن نقوشِ قدم پر پڑ لی جو جیدہ کے گھوڑے کے سموں سے ریت پر بن گئے تھے۔ جیدہ نے گھر پہنچ کر تمام واقعہ من و عن اپنی ماں کو سنا دیا تھا۔ خالد کی ماں نے آتے ہی اپنے آپ کو ظہیر کی بیوی کی جھولی

میں ڈال دیا اور اپنے بیٹے کے لئے جیدہ کا رشتہ مانگا کیونکہ ظہیر ابھی اپنی مہم سے واپس نہ لوٹا تھا۔ جب جیدہ نے اپنی ماں سے خالد کی درخواست کو سنا تو اُس نے کہا "یہ کبھی نہ ہوگا خواہ مجھے اس کے لئے موت کا جام ہی کیوں نہ پینا پڑے۔ جو کچھ اُس کے خیموں کے پاس واقع ہوا اُس کا مقصد محض غم واندوہ کی اُس آگ کی پیاس کو بجھانا تھا جو میرے سینے میں شعلہ زن تھی اور میری روح کو جھلسے ڈالتی تھی۔"

یہ الفاظ سن کر خالد کی ماں مایوس واپس اپنے بیٹے کے پاس چلی گئی جسے جیدہ کی جدائی میں کسی پہلو قرار نہ آتا تھا۔ ماں کو دیکھ کر وہ دفعتہً اُٹھ کھڑا ہوا اور مضطربانہ اپنی نسبت جیدہ کے خیالات دریافت کرنے لگا۔ جب اُس نے جیدہ کا جواب سنا تو اُس کا اضطراب حد سے گزر گیا۔ اور جیدہ کا انکار اُس کے سمندِ شوق پر ایک اور تازیانہ ہوگیا۔ اُس نے کہا "اے میری ماں، میں کیا کروں مجھے اس دام سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔" اُس نے جواب دیا "مگر یہ کہ تم اپنے تمام شہسواروں کو اکٹھا کرو اور اُن دوسرے قبائل کے بہادروں کو بھی جو تمہارے حلیف ہیں اور اُس وقت تک انتظار کرو جب تمہارا چچا اپنی مہم سے واپس آجائے، اور پھر اپنے آدمیوں کو لے کر اُس کے پاس جاؤ اور ان سپاہیوں کے درمیان کھڑے ہو کر اُس سے اس کی بیٹی کا رشتہ طلب کرو۔ اگر وہ کہے کہ میری کوئی بیٹی نہیں ہے تو اُسے تمام قصہ سنا دو اور اپنا دامن پھیلائے رکھو یہاں تک کہ وہ تمہارے مطالبے کو قبول کرلے۔" اس تجویز نے خالد کے غم کو کسی قدر کم کر دیا۔ جونہی اُسے معلوم ہوا کہ اُس کا چچا گھر واپس آگیا ہے اُس نے اپنے رؤساءِ خاندان کو اکٹھا کیا اور اپنی کہانی انہیں کہہ سنائی۔ وہ سخت حیران ہوئے اور معدی کرب جو خالد کا بہادر ترین رفیق تھا یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ "یہ عجیب بات ہے کیونکہ ہم تو ہمیشہ سے یہی سنتے آئے تھے کہ تمہارے چچا کے ہاں ایک بیٹا ہے جس کا نام جندر ہے مگر حقیقت آج کھلی۔ اور یقیناً تم ہی ایک شخص ہو جو اپنے چچا کی لڑکی پر سب سے بڑھ کر حق رکھتے ہو۔ اس لئے ہمارے لئے بہترین طریقِ عمل یہ ہے کہ ہم سب اُس کے سامنے جا کر اپنے سر جھکا دیں اور اُس سے اپنے خاندان میں واپس آنے کی التجا کریں اور کہیں کہ وہ اپنی بیٹی کسی اجنبی کو نہ دے۔" خالد کچھ اور سنے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا، اور اپنے ساتھ اُن ایک سو بہادر سواروں کو جو بچپن سے محارب اور ظہیر کے ساتھ پلے اور بڑھے تھے اور پہلے سے زیادہ قیمتی تحائف لے کر روانہ ہوا اور اُس وقت تک دم نہ لیا جب تک وہ قبیلۂ سعد میں پہنچ نہ گیا۔ سب سے پہلے خالد نے اپنے چچا کو جنگ سے اُس کی کامیاب واپسی پر مبارک باد پیش کی۔ خالد کی اس دوبارہ آمد پر سب سے زیادہ حیرت ظہیر کو تھی، خصوصاً جب اُس نے اپنے بھتیجے کو تمام امرا و اعیان کے ساتھ دیکھا۔ اُسے سان گمان بھی نہ تھا کہ خالد کے دوبارہ آنے میں اُس کی بیٹی جیدہ کا بھی کچھ تعلق ہے۔ اُس نے خیال کیا کہ وہ

اُسے صرف وطن واپس چلنے پر آمادہ کرنا چاہتا ہے۔ ظہیر نے ان کی بڑی عزت و توقیر کی اُن کے لئے خیمے مہیا کئے اور نہایت تواضع سے پیش آیا۔ اُس نے اونٹ اور بھیڑیں ذبح کرنے کا حکم دیا اور اُن کی ایک عظیم الشان دعوت کی اور تین دن کے لئے ہر قسم کی ضروریات کا انتظام اُن کے لئے کر دیا۔ چوتھے دن خالد نے کھڑے ہو کر اپنے چچا کا شکریہ ادا کیا اور اُس کے بعد جیدہ کے رشتے کے لئے درخواست کی اور اپنے ملک کو واپس چلنے کی التجا کی۔ ظہیر نے کہا کہ جندر کے علاوہ میری کوئی اولاد نہیں لیکن خالد نے جو کچھ اُسے معلوم ہو چکا تھا کہہ دیا اور جو کچھ اُس کے ساتھ گزر چکا تھا بتا دیا۔ یہ باتیں سن کر ظہیر شرمندہ ہو گیا اور اُس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ کچھ دیر وہ خیالات میں غرق رہا اور یہ سوچ کر کہ کہیں حالات بد سے بدتر نہ ہو جائیں اُس نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا "میرے بھائیو! میں اس راز کو زیادہ چھپانا نہیں چاہتا۔ اس لئے میری بیٹی کی شادی اب خالد ہی سے ہو گی کیونکہ ہر اُس شخص سے جسے میں جانتا ہوں میں خالد ہی کو اُس کے لائق پاتا ہوں۔" اُس نے اپنا ہاتھ خالد کو پیش کیا جس نے فوراً اُسے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ خالد کے اکابر و اعیان اس معاہدے کے گواہ تھے۔ پانچ سو بھورے سیاہ چشم اونٹ اور یمن کی منتخب ترین پیداوار سے لدے ہوئے ایک ہزار اونٹ جہیز قرار پائے۔ لیکن قبیلہ سعد پر جن کے پاس ظہیر کا قیام تھا اس معاملہ کا کوئی بار نہ تھا۔

جب اس بات کے متعلق ظہیر نے اپنی بیٹی کی منظوری کے لئے سوال کیا تو جیدہ کی طبیعت اپنے باپ کے اس طریق عمل پر درہم برہم ہو گئی۔ مگر جب اُس نے لڑکی کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ وہ اب اُسے بن بیاہا نہیں رکھنا چاہتا تو اُس نے کہا "ابا، اگر خالد مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو میں اُس وقت تک اس کے خیمے میں داخل نہ ہوں گی جب تک وہ میرے بیاہ پر اُن اونٹوں میں سے ایک ہزار اونٹ حلال نہ کرے جو اس وقت "تلوار کے دھنی" قاسم بن مالک کی ملکیت میں ہیں۔" خالد نے اس شرط کو منظور کر لیا، لیکن اُس کے افسروں اور سپاہیوں نے اُس وقت تک ظہیر کا پیچھا نہ چھوڑا جب تک اُس نے تمام مال و اسباب اپنے وطن کو منتقل ہونے کی خاطر جمع نہ کر لیا۔ جیسے ہی یہ تیاریاں ختم ہوئیں خالد ایک ہزار سواروں کو ہمراہ لے کر مہم پر روانہ ہو گیا اور اُن کی مدد سے اُس نے قبیلہ عامر کو مغلوب کر لیا۔ "تلوار کے دھنی" کو اُس نے تین دفعہ زخمی کیا، بہت سے بہادروں کو موت کے گھاٹ اتارا، اُن کو لوٹا اور اُس سے بہت زیادہ مال غنیمت اُن کے ملک سے لے گیا جتنا جیدہ نے طلب کیا تھا۔ مال و دولت سے لدا ہوا اور فتح کے نشہ سے سرشار وہ واپس آیا۔ مگر جب اُس نے شادی کا دن مقرر کرنے کو کہا تو جیدہ نے اسے اپنے پاس بلا کر یہ الفاظ کہے، "اگر تم مجھے اپنی بیوی بنانا چاہتے ہو تو سب سے پہلے میری فرمائشوں کو پورا کرو اور جو عہد میں تم سے کرتی ہوں

اُس پر قائم رہو۔ میں چاہتی ہوں کہ میری شادی کے دن کسی ذی رتبہ آدمی کی بیٹی، جو اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئی ہو میرے اونٹ کی مہار تھامے، وہ ملک کے کسی معززترین رئیس کی بیٹی ہو تاکہ اُس دن میں عرب کی معززترین بیٹی سمجھی جاؤں۔" خالد نے مان لیا اور اُس کی خواہشات کے حصول کے لئے تیار ہوگیا۔ اُسی روز وہ اپنے سواروں کو لے کر چل کھڑا ہوا اور سرزمین یمن کو تلاش کرتا ہوا بہت سے میدانوں اور وادیوں کو طے کرگیا یہاں تک کہ وہ ملکِ حجاز میں پہنچا۔ اس جگہ اُس نے معاویہ بن مضل کے قبیلہ پر حملہ کیا۔ وہ طوفان کی طرح اُن پر ٹوٹ پڑا، اور مدافعین کی صفوں کو چیرتے ہوئے عین اُس وقت اُس نے عمیمہ بنتِ معاویہ کو گرفتار کیا جب وہ راہِ فرار اختیار کرنے کو تیار تھی۔

اُس نے اپنی تیغ کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ دشمن کے بہادر سپاہیوں کی سب مدافعت بے کار ہوگئی، اور وہ بھاگ کر منتشر ہوگئے۔ اس علاقے کے عربوں کی تمام دولت اُس نے چھین لی اور پھر گھر کی طرف رخ کیا۔ مگر وہ اُس وقت تک اپنے خیموں میں داخل نہ ہوا جب تک اُس نے وہ سارا مال و دولت اکٹھا نہ کرلیا جسے وہ صحرا کے مختلف مقامات پر چھوڑ آیا تھا۔

جوان لڑکیاں جھانجھیں اور کئی قسم کے دوسرے ساز بجاتی ہوئی اُس کے آگے آگے چلتی تھیں۔ سارا قبیلہ خوشیاں منارہا تھا اور جب خالد ظاہر ہوا تو اُس نے بیواؤں اور یتیموں کو کپڑے تقسیم کئے اور رفیقوں اور دوستوں کو اُس دعوت پر مدعو کیا جسے وہ اپنی شادی کی تقریب میں تیار کررہا تھا۔ شادی پر اس علاقے کے تمام عرب بہت بڑی تعداد میں جمع ہوئے۔ شراب و کباب کی فراوانی سے اُس نے انہیں سرمست کردیا لیکن جس وقت سب مہمان کھانے پینے میں مصروف تھے خالد اپنے ساتھ دس غلاموں کو لے کر شیروں شیرنیوں اور اُن کے بچوں کے شکار کے لئے جنگل کی طرف جانے کی تیاری کررہا تھا تاکہ اس تقریب کے مہمانوں کے لئے ایک انوکھی ضیافت کا سامان مہیا کرے۔

لیکن جیدہ کو کسی طرح پہلے ہی سے اُس کے ارادہ کا علم ہوچکا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو زرہ بکتر میں چھپالیا اور گھوڑے پر چڑھ کر تیز تیز خالد کے پیچھے روانہ ہوگئی۔ ابھی جشن کے تین دن باقی تھے کہ ایک غار میں اُن دونوں کا سامنا ہوا۔ وہ ایک وحشی درندے کی طرح اس پر ٹوٹ پڑی اور ایک شدید حملے کے ساتھ چلاکر بولی "اے عرب! اپنے گھوڑے سے اُتر جا اور اپنی زرہ بکتر اتار ڈال اگر تونے ذرا بھی لیت و لعل کی تو میرا یہ نیزہ ابھی تیرے سینے سے پار ہوگا" خالد نے اُس کے مطالبے کے جواب میں فوراً مدافعت کا ارادہ کرلیا۔ ذراسی دیر میں ایک شدید جنگ کی صورت پیدا ہوگئی۔ یہ کشمکش ایک گھنٹے سے زیادہ تک جاری رہی۔ پھر خالد کو اپنے حریف

کی آنکھوں میں ایک ایسی بات نظر آئی کہ وہ ڈر گیا۔ وہ پھر اپنے گھوڑے پر چڑھ گیا اور لڑائی کی جگہ سے ہٹ کر اُس نے کہا "میں تجھ سے دینِ عرب کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں، مجھے بتا کہ تُو اس صحرا کا کون سا بطلِ جلیل ہے، کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ تیرا حملہ اور تیرے وار مجھ سے روکے نہیں جاتے۔ تو نے میرے ارادوں کو اور میری دلی خواہشوں کو خاک میں ملا دیا ہے" یہ الفاظ سن کر جیدہ نے اپنا خود اوپر اُٹھایا تاکہ وہ اس کا چہرہ دیکھ لے۔ اُس نے کہا "خالد، کیا اُس لڑکی کے لئے جس سے تجھے محبت ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ وحشی درندوں کا شکار کرے تاکہ عرب کی بیٹیاں سیکھیں کہ اس کے واحد اجارہ دار جنگوں میں لڑنے والے مرد ہی نہیں ہیں؟" اس چبھتی ہوئی ملامت پر خالد شرم میں غرق ہو گیا۔ اُس نے جواب دیا "خدا کی قسم، جیدہ تیرے سوا اور کوئی مجھے مغلوب نہیں کر سکتا۔ لیکن کیا اس ملک میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جس نے تجھے دعوتِ مقابلہ دی ہو یا بس مجھ ہی پر تجھے اپنے زور و قوت کو ثابت کرنا تھا؟" جیدہ نے کہا "خدا کی قسم میں اس صحرا میں اس لئے آئی ہوں کہ وحشی درندوں کے شکار میں تیری مدد کروں، تاکہ تیرے سپاہی تجھے بیوی کے انتخاب پر طعنہ زنی نہ کر سکیں۔ یہ الفاظ سن کر خالد جیدہ کی جرات اور عزم پر حیرت اور تعجب سے مبہوت رہ گیا۔

پھر دونوں اپنے اپنے گھوڑوں پر سے اتر پڑے اور ایک غار میں داخل ہو گئے۔ خالد نے دو خونخوار جانوروں کو اسیر کیا اور جیدہ نے ایک شیر اور دو شیرنیوں کو مارا۔ یہ مہم انجام دے کر انہوں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی اور جیدہ خالد کی ہمراہی پر خوش تھی۔ اُس نے کہا "اور میں تمہیں اُس وقت تک اپنے خیموں سے جانے کی اجازت نہیں دوں گی جب تک کہ ہماری شادی نہ ہو جائے" پھر یکایک وہ اسے چھوڑ کر تیزی سے اپنی جائے سکونت کی طرف چل دی۔

خالد اپنے غلاموں کی طرف بڑھا جنہیں وہ کچھ فاصلے پر چھوڑ آیا تھا، اور اُس نے انہیں درندوں کو اٹھا کر خیموں کی طرف لے جانے کا حکم دیا۔ خوف سے کانپتے ہوئے کہ خالد نے کیا کیا ہے انہوں نے آپس میں کہنا شروع کیا کہ خالد تمام بہادروں سے بڑا بہادر ہے۔

دعوتوں کا سلسلہ جاری رہا اور جو لوگ آتے تھے اُن کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ دوشیزہ کنیزیں جھانجھیں بجاتی تھیں، غلام اپنی تلواریں ہوا میں ہلاتے تھے اور نوجوان لڑکیاں صبح سے شام تک گاتی رہتی تھیں۔ اس نشاط و سرور کے درمیان خالد اور جیدہ کی شادی ہوئی۔ عمیمہ بنتِ معاویہ دلہن کے اونٹ کی مہار تھامے ہوئے تھی اور عورتیں اور مرد جیدہ کے نام کو بلند کر رہے تھے۔

منصور احمد

جستجوئے حق

جنہیں علمِ حقیقت ہے عمل سے ہے مُدّعا اُن کا
جو دل رکھتے ہیں سینے میں خدا ہے منتہا اُن کا

ضمیر ایمان سے ہے جن کا جنہیں حاصل ہی یکسوئی
اُنہیں کعبے سے کیا؟ دل اُن کا ہے قبلہ نما اُن کا

کسی کو کیا ضرورت ہے کسی کی رہنمائی کی؟
خود اپنے رہنما ہیں جو خُدا ہے رہنما اُن کا

جنہیں وحشت جہاں میں زندگی راہِ ترقی ہے
اُنہیں منزل سے کیا مطلب؟ سفر ہے مُدعا اُن کا

خوشی ہو غم ہو کچھ ہو زندگی یہ ہے کہ خوش رہیے
جو خوش رہتے ہیں خوش اُن سے ہمیشہ ہی خدا اُن کا

جنہیں ہے آرزو حق کی جنہیں ہے جستجو حق کی
خدا ہے مبتدا اُن کا خدا ہے منتہا اُن کا

یہی رازِ حقیقت ہے خودی بھی بے خودی بھی ہو
جو بیخود ہیں خودی میں وہ خدا کے ہیں خدا اُن کا

ل ب

رات کی خاموشی میں

رات کی خاموشی میں تنگ و تاریک جھونپڑی کی گلا گھونٹنے والی ہوا کے اندر فرشِ خاکی پر لیٹے ہوئے کئی مرتبہ میں نے چاہا کہ اب ایسی نیند سو جاؤں کہ پھر نہ اٹھوں۔ گناہ کا بار سینے پر لیتے ہوئے اس طرح غائب ہو جاؤں کہ دنیا اور دنیا والوں کے لئے کوئی نشانِ عبرت بھی باقی نہ رہے۔ مگر ہر صبح جب صبحِ قیامت کے استقبال کو اٹھتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی روزمرہ کا سورج اپنی آتشیں شعاعوں کے ساتھ پھر ایک مرتبہ مجھے دنیا کی راز جو نگاہوں کے سامنے عریاں بدفِ استہزا بنانے کے لئے چمک رہا ہے۔ اندھیری راتوں کو جب جھکڑ کی خوفناک تندی اور آندھی کا زور بدن میں سنسناہٹ پیدا کر دیتا ہے، بڑے بڑے تناور درخت جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں۔ جب بارش اور اولوں کے طوفانی شور میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ خبیث روحیں تحت الثریٰ سے نکل کر کائنات کو اپنی لرزہ انگیز چیخوں سے تہ و بالا کر ڈالیں گی میں اپنے پر نگاہ ڈالتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ انسان کا دل ان طوفان زدہ عناصر سے کس قدر مشابہت رکھتا ہے۔ "انسان کا دل" میں نے غلط استعمال کیا۔

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا

وہ جنہیں زندگی کی تلخ کامیوں سے واسطہ ہی نہیں پڑا۔ جنہوں نے آنکھ کھولتے ہی گلشنِ حیات میں شگوفے نکلتے، کلیاں چٹکتی اور نوا سنجانِ چمن کو نغمہ پیرائی میں مصروف دیکھا۔ جن کے کان سازِ زندگی سے صرف نغمہ ہائے عشرت ہی سننے کے عادی رہے۔ جن کی سماعت نوحۂ غم کی دلدوز صداؤں سے ہمیشہ محفوظ رہی آہ وہ بھی انسان ہیں۔ اگر یہی "انسان" ہیں تو کیا اس لفظ کا اطلاق اُن سوختہ ساماںوں پر بھی ہو سکے گا جن پر آسمان کے ترکش کا آخری تیر ختم ہو چکا ہے۔ جنہوں نے آنکھ کھولی تو زندگی کے باغ میں پت جھڑ شروع ہو چکی تھی اور جوں جوں دن گزرتے گئے بادِ خزاں کے تند جھونکوں سے پتے گرتے اور پھول مرجھاتے چلے گئے جن کی امید کی کلی کھلنے سے پیشتر ہی مصائب کی گرم لو نے جلا کر خاک کر دی۔ جن کی کشتیٔ حیات سفر کی شروع منزل میں حوادث کی سخت چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔ وہ خوش نصیب جن کی آنکھیں اشکِ خونناب اور دل بارِ الم سے آزاد ہیں کیونکر سمجھ سکتے ہیں کہ انسان کا دل بھی ان طوفان زدہ عناصر کی طرح بجائے خود ایک پُرخروش طوفان ہے

وہ بیدار بخت ہستیاں جن کے لئے "بستر خار بستر" اور "سر رنج بالیں" نہیں ثابت ہوتا کیا جانیں کہ ایک طوفان زدہ دل کو پہلو میں لے کر سونا گویا کانٹوں پر لیٹنا اور دہکتے کوئلوں پر چلنا ہے۔

اکثر راتیں اسی طرح آنکھوں میں کٹ جاتی ہیں۔ صبح کے انتظار میں نہیں کیونکہ فکرِ فردا اور غمِ ماضی تو میری جان کے قاتل ہیں۔ آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں اور اندر ہی اندر مر جاتی ہیں خیالات آتے ہیں اور کسی کے کان یا زبانِ قلم تک پہنچنے سے قبل ہی فنا ہو جاتے ہیں۔ رات کے اختتام پر سپیدۂ سحر نمودار ہو کر حیاتِ تازہ کا پیغام دیتا ہے۔ ہر شب آسمان پر تیرہ و تار بادل چھائے رہتے ہیں اور کائنات ایک گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ملفوف رہتی ہے لیکن اس وقت بھی گاہے گاہے بجلی چمک کر زمان و مکان کو، ایک لمحہ کے لئے ہی سہی، پُرنور کر جاتی ہے۔ مگر آہ میرا مطلعِ حیات !!!!!! سالہا سال گزر جانے پر ایک امیدِ گریزاں، ایک فریبِ نفس میں مبتلا ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہوں کہ شاید اس کے افقِ تاریک پر بھی کوئی روشنی جلوہ گر ہو۔ مگر جہاں میری اور تمنائیں لاحاصل ثابت ہوئیں یہ آرزو بھی بجھتی نظر آ رہی ہے۔

میرے آقا عین اُس وقت جب میں صبحِ مسرت کی شادکامیوں سے ہمکنار ہونے والا تھا تو نے مجھے شامِ غم کی حسرتوں سے دوچار کر دیا۔ جامِ عشرت میرے لبوں تک پہنچتے پہنچتے تلخابۂ حیات میں متبدل ہو گیا۔ لوگ کہتے ہیں ہر شخص کو آگ اور پانی کے طوفان میں سے گزرنا پڑتا ہے اور پھر زندگی کی تکمیل ہوتی ہے سب صحیح۔ لیکن ایسے تہی دستانِ قسمت بھی تو ہیں جو تکمیلِ حیات کے اس مرحلہ سے گزرتے ہوئے شعلوں کی نذر ہو گئے یا موجوں کا لقمہ بن گئے۔ جاڑا، گرمی، برسات، بہار، خزاں رنگ رلیاں منانے والوں کے لئے قدرت کے مختلف اللون مظاہر ہیں جن سے بہ لحاظِ موسم بہ دلبستگی کے لوازمات بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ مگر غم کا ایک ہی موسم ہے غمگین دلوں کے لئے وقت بدلتا نہیں گردش کرتا ہے۔ کتنی برساتیں آئیں اور گزر گئیں مگر میرا دیدۂ گریاں نہ تھما۔ بادل آتے کھل کر برسے اور برس کر کھل گئے لیکن ادبار کی کالی گھٹائیں نہ چھٹیں۔ گرمی کی حدت دنیا کو نمونۂ جہنم بنا کر سردی میں تبدیل ہوتی گئی مگر اُس تپش کا کیا علاج جس نے میری جانِ ناتواں کو شعلہ زار اور روحِ نزار کو آتشکدہ بنا رکھا ہے۔

اے آقا میں تجھ سے شبہائے عشرت کا طالب نہیں ہیں حیاتِ مستعار کے چند دنوں کو جھوٹی خوشیوں سے بھر لینا نہیں چاہتا میں تیرے پاس شکایت لے کر نہیں آیا کہ کیوں مجھ سے کم استعداد والے لوگ موردِ الطاف و اکرام بن رہے ہیں۔ میں کون کہ تیری تقسیمِ انعامات پر حرف گیری کروں؟ ہاں اس دنیائے فانی میں،

جہاں روزِ محشر سے قبل ہی نفسا نفسی کا عالم طاری ہے۔ اطمینان کا ایک سانس چاہتا ہوں۔ قلب کو وہ کیفِ سرمدی عطا کر جو رنج و راحت، دکھ اور سکھ کو یکساں برداشت کرلے اور شکوہ زبان پر نہ آئے۔ تیری رضا سے اپنی رضا وابستہ کرلوں۔

مجھے دوست دشمن، کسی سے گلہ نہیں۔ ہر چند کہ اپنوں کی بیگانگی اور دوستوں کی بے مروتی نے کئی مرتبہ خون کے آنسو رلائے۔ تُو جو لطف و احسان کا سرچشمہ اور انوار و تجلیات کا منبع ہے مجھ سیہ کار کے قلبِ حزیں کو، جو کثرتِ عصیاں سے اپنی درخشانی کھو چکا ہے، لمعاتِ قدسی کے ایک پرتو سے منور کردے۔ تیری ذات میری حدِ نگاہ سے بھی بلند اور اتنی پاکیزہ ہے کہ یہ گنہگار اس کا تصور بھی کرنے کا اہل نہیں۔ مگر اے نحن اقرب کہہ کر کشتِ امید کو سرسبز کرنے اور مایوس دلوں کو ڈھارس دینے والے ہمیں دیوانہ وار تیری طرف دوڑتا ہوں۔ ناچیز کو دامنِ شفقت میں چھپالے۔ پانی کا بے مقدار قطرہ سمندر میں مل کر بحرِ بے پایاں کا لقب اختیار کرلیتا ہے۔ ریت کا حقیر ذرہ ریگ زار میں سماتا ہے تو صحرا بن جاتا ہے۔ میں بھی ہر چند کہ کون و مکان کی بے پناہ پہنائیوں اور عالمگیر وسعتوں میں گم کردہ راہ مسافر کی طرح بھٹک رہا ہوں، تیری جانب دوڑوں گا۔ اگر سمندر کی لہریں چاند تک پہنچ سکیں گی اگر دیدۂ نرگس کی بے نوری دیدارِ حبیب سے روشن ہو سکے گی اور اگر بلبلِ سینہ چاک کو بہارِ جاوداں کی دائمی مواصلت کبھی نصیب ہو سکے گی تو شاید میں بھی، آہ میں بھی ایک دن اپنی ذات کو جو میری روح کے لئے بوجھل اور روح کو جو میری ذات کے لئے بارِ گراں ہے تجھ میں فنا کر کے مقصدِ حیات پاسکوں۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

عاشق بٹالوی

زبان خدا کے اسرار کا خزانہ ہے تم اس پر خاموشی کا قفل لگاؤ ——— لقمان

تمام خزانوں سے بڑا خزانہ ہنر ہے ——— سقراط

سب سے بڑھ کر آسان بات دوسروں کو صلاح مشورہ دینا ہے ——— تھیلز

کون تمہیں باندھتا ہے؟ کون تمہیں غلام بناتا ہے؟ تمہاری اپنی خواہش! ——— سوامی رام تیرتھ

محمد داؤد

ضبطِ نفس

اکثر لوگ "ضبطِ نفس" "شکستِ آرزو" اور "فنائے خودی" کی مصطلحات کے متعلق نہایت مبہم اور غلط خیالات رکھتے ہیں بعض لوگ اور بالخصوص ایسے لوگ جن کی طبائع کا میلان قیاسیات کی طرف ہوتا ہے ضبطِ نفس کے مسئلہ کو کوئی مسئلہ مابعد الطبیعیات سمجھتے ہیں بعض ایسے بھی ہیں جو زندگی اور اس کی تمام قوتوں کو معدوم کر کے جمود پیدا کر دینے کی سعی کو ضبطِ نفس کا مرادف سمجھتے ہیں۔ یہ غلط اور پریشان خیالات جو اکثر لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں انہی کی ذاتی کوششوں سے دور ہو سکتے ہیں، اگر کسی کو سچائی کی تلاش ہو تو اس کی تمام لاطائل قیاس آرائیاں اس مسئلہ کو اپنی حقیقی شکل وصورت میں پیش کر کے نہایت آسانی سے رفع کی جا سکتی ہیں۔

اپنے نفس پر قابو پانے اور اسے مغلوب کر لینے کا مسئلہ نہایت سادہ ہے۔ اس قدر سادہ اور قابلِ عمل کہ ایک پنج سالہ بچہ جس کے دماغ پر قیاسیات مذہبیات اور فلسفیانہ خیال آرائیوں کے گرد وغبار کا پردہ ابھی نہیں پڑا ان سن رسیدہ لوگوں سے جن کی لوحِ دل سے پیچیدہ مسائل کے غبار نے تمام سادہ اور خوبصورت سچائیوں کو محو کر دیا ہے زیادہ آسانی سے اس کی کنہ کو پہنچ جاتا ہے۔

خودی کو فنا کر دینے کے یہ معنی ہیں کہ روح سے اُن تمام عناصر کو خارج کر دیا جائے جو تشتت، جنگ، مصائب، امراض اور آلام کے پیش خیمہ ہیں۔ اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ کسی امن پرور صفتِ حمیدہ کو تباہ کیا جائے، مثلاً جب ایک آدمی کو غیظ وغضب یا غصہ آنے لگے اور وہ کوششِ خاص سے اس کو ضبط کرے اور صبر ومحبت سے کام لے تو اُس کے اِس عمل کو ضبطِ نفس یا شکستِ خودی سے تعبیر کریں گے۔ ہر شریف آدمی خواہ وہ اس حقیقت سے انکار ہی کیوں نہ کرے اس پر جزواً عمل کرتا ہے۔ اور جو شخص اس عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیتا ہے اور ہر ایک خود غرضانہ خیال کو مٹا دیتا ہے حتیٰ کہ اس میں صرف الہیانہ صفات باقی رہ جاتی ہیں وہ اپنی خودی کو مٹا دیتا ہے اور صداقت کے درجہ پر فائز ہو جاتا ہے۔

خودی جو مٹا دینے کے قابل ہے اِن دس بے قیمت اور رنج زا عناصر سے مرکب ہے:۔ شہوت، نفرت لالچ، حظِّ نفس، خود غرضی، تکبر، غرور، شک، بداعتقادی اور فریب۔ ضبطِ نفس سے مراد یہ ہے کہ ان دس ذلیل عناصر کو بالکل معدوم کر دیا جائے۔ اس سے انسان میں تربیتِ ذات، عمل اور پاکیزگی، صبر وتحمل، تواضع، ایثار،

خود اعتمادی، بے خوفی، علم، عقل، حلم اور محبت جیسی صفاتِ حمیدہ کے تحفظ کا مادہ پیدا ہوجاتا ہے۔ صداقت انہی دس صفات سے مرکب ہے۔ اور جو شخص ان صفات کے دائرہ میں زندگی بسر کرتا ہے وہ صداقت سے آگاہ ہوجاتا ہے۔ بلکہ وہ خود صداقت کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ اول الذکر دس عناصر کے اجتماع کا نام خودی یا نفس ہے، اس کے برعکس آخر الذکر دس صفات کے مجموعہ کو صداقت کہتے ہیں جو انسان کو بے نفس، دائمی حقیقی اور زندۂ جاوید بنادیتی ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ ضبطِ نفس کا یہ مفہوم نہیں کہ کسی شریفانہ سچی اور متحملانہ صفت کو تباہ کیا جائے بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ غیر شریفانہ جھوٹی اور رذیل خصلت کو معدوم کردیا جائے۔ یہ بھی غلط ہے کہ انسان ضبطِ نفس سے مسرت، بہجت اور خوشی کھو بیٹھتا ہے۔ نہیں، بلکہ اس کے برعکس وہ صفاتِ حمیدہ کے دائرہ میں رہ کر ان چیزوں کو ہمیشہ کے لئے پالیتا ہے۔ ضبطِ نفس خوشی کی حرص کو ترک کرنے کا نام ہے نہ کہ خوشی ہی کو۔ یہ مسرت کی ہوس کو تباہ کرتا ہے نہ کہ مسرت کے وجود کو۔ یہ محبت طاقت اور اقتدار کی خود غرضانہ تمناؤں کا خاتمہ کرتا ہے نہ کہ محبت طاقت اور اقتدار ہی کا۔ ضبطِ نفس اُن تمام چیزوں کو قائم رکھتا ہے جو بنی آدم کو ایک دوسرے کی طرف کھینچتی ہیں اور انہیں رشتۂ اتحاد و مودت میں منسلک کردیتی ہیں۔ ضبطِ نفس جمود و موت کی پرستش سے ہٹا کر بلند ترین، شریف ترین، موثر ترین اور پایدار عمل کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ وہ شخص جس کے افعال مذکورہ دس رذائل پر مبنی ہوں اپنی قوتوں کو اپنی تخریب پر ضائع کرتا ہے اور اپنی روح کو محفوظ نہیں رکھتا، لیکن وہ شخص جس کے افعال کی محرک ثانی الذکر دس صفات ہوں نہایت دانائی سے صحیح راستہ پر گامزن ہے اور اپنی روح کو برقرار رکھتا ہے۔

ایسا شخص جو مذکورہ بالا دس رذائل کی تنگ دنیا میں زندگی بسر کررہا ہے تسلیم و رضا کے اصول میں کوئی کشش نہیں پاتا اور تمام روحانی حقائق کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کئے ہوئے ہے اور حق کی آوازوں پر پنبہ بگوش ہے کیونکہ اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تسلیم و رضا کے معنی یہ ہیں کہ ذات کو بالکل مٹا دیا جائے۔ اس کے برعکس وہ شخص جو ان دس اعلیٰ صفات کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنا لیتا ہے اس اصول کے حسن و شوکت کو بخوبی دیکھ سکے گا، اور اسے حیاتِ جاوداں کا سرچشمہ قرار دے گا۔ وہ یہ بھی دیکھے گا کہ جب بنی نوعِ انسان نے اس اصول کو اچھی طرح سمجھ کر اس پر عمل کرنا شروع کردیا تو صنعت و حرفت، تجارت و حکومت غرضکہ زندگی کا ہر شعبہ برائیوں سے پاک و صاف ہوجائے گا اور عمل، مقصد اور ادراک تباہ ہونے کی بجائے خوب بڑھیں پھولیں گے اور زندگی کی کلفت انگیز کشاکش دور ہوجائے گی۔

شفیع و اکبر

معارفِ محبّت

کھو گیا ہوں یہ اِن نظاروں میں | ڈھونڈتا ہوں تجھے بہاروں میں
کچھ نہ سمجھا کہ صبح کو غنچے | ہنس کے کیا کہہ گئے اشاروں میں
دیکھنا ہے کہ فرش کیوں ہیں گل | چھپ کے بیٹھوں کا لالہ زاروں میں
اوس برسا رہی ہے کیوں موتی | کون پھرتا ہے سبزہ زاروں میں
بزم کی بزم بے قرار ہے کیوں | کون بیٹھا ہے بے قراروں میں
کھینچے لیتا ہے دل کو اور کوئی | یا کشش خود ہے اِن ستاروں میں
تیرا ہی گیت گاتی ہے ہر شے | کیا ترنّم ہے آبشاروں میں
جب نظر اور اُوپر اُٹھتی ہے | دل نہیں لگتا چاند تاروں میں
آنسوؤں میں سفینۂ دل ہے | بہا جاتا ہوں جو نہاروں میں
تیری ممنون ہر خلش دل کی | لطف گلزار کا ہے خاروں میں
تجھے اکیلے نہ صبح کے تارے | تُو بھی تھا صبح کے ستاروں میں
صبح ہوتے ہی کلیاں کھلنے لگیں | نہ رہا راز، راز داروں میں
پایا ہر بزم میں تجھے یکتا | تُو مگر ایک ہے ہزاروں میں

بندۂ غیر تو نہیں گویاؔ!
ہوں اگرچہ گناہگاروں میں

گویاؔ جہان آبادی

ایک بالاتر ہستی — مصائب زندگی

یا

سنجیدہ خانم کا روزنامچہ

اے دوست! کیا تو کبھی آئینے میں اپنا منہ دیکھتا ہے؟ میں تو دیکھتی ہوں! اکثر میں گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑی رہتی ہوں اور غور سے اپنے چہرے کو اس میں دیکھتی ہوں۔ اور حیرت کرتی ہوں! کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میں اُس کو الٹ دیتی ہوں اور غور سے اس کی پشت کو دیکھنے لگتی ہوں! میں وہ راز معلوم کرنا چاہتی ہوں جس پر بدنصیب آئینے کے وجود کا انحصار ہے! مجھ کو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی سرخ سیندوری آنکھ سے میری طرف دیکھتا ہے۔ گویا وہ مجھ سے واقف ہے اور ہم کلام ہونا چاہتا ہے!

صبح سے شام تک میں ہزاروں سوال آئینہ سے کر لیتی ہوں۔ آہ! مگر کوئی جواب نہیں ملتا! ایک دھواں سا دل میں اٹھتا ہے اور وہیں گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ میں کیوں پیدا ہوئی تھی؟ مجھ کو یہ بھی معلوم نہیں! ایسا اوقات جب لوگ میرے کمرے کے پاس سے گذرتے ہیں ——— میری نوکرانی نصیرن اور ملازم رحیم ——— اور مجھ کو آئینہ سے بات کرتا دیکھتے ہیں تو مجھ کو دیوانہ سمجھنے لگتے ہیں! کیا اس میں کوئی حقیقت ہے؟ ہرگز نہیں!

کبھی میں اپنے آپ کو کسی صوفے پر پھینک دیتی ہوں اور اپنے سر کو نرم تکیوں میں ڈال دیتی ہوں! باوجود اتنی کوشش کے مجھ کو اپنی ہستی کا راز معلوم کرنے میں ناکامی ہوتی ہے! میری عمر اس وقت اٹھارہ برس کی ہے لیکن کیا میں اٹھاسی کی بھی ہو جاؤں گی؟ آہ جس وقت یہ خیال آتا ہے میرے دل میں ایک الجھن اور بے چینی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ قدرت کے سربستہ بھیدوں کو معلوم کرنے کے لئے دل کی آنکھ زیادہ متجسس ہو جاتی ہے! آہ کیا میں چھیاسٹھ برس کی بھی ہو سکوں گی ...؟ اکثر میں نے آئینہ سے پوچھا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ کبھی میں سوتے سوتے چونک پڑتی ہوں اور بے اختیار پوچھنے لگتی ہوں کہ میں ننانوے برس کی کب ہونگی؟ معبود جانے .....!

\+ + + + + + +

دوسرا دن

آج میں ایک خوشنما پھول کے پاس سے گزری تھی۔ وہ ساحل دریا پر ایک لہراتے ہوئے شاداب

کھیت کے خاموش کنارے پر رقص کر رہا تھا۔ شاید تھک کر اپنی نازک شاخ پر سو گیا تھا۔ کیا میں اس کا نام نہیں جانتی؟ کیا میں گوبھی کے پھول کو کبھی بھول سکتی ہوں؟ نہیں یہ پیارا نام میرے دل میں نقش فی الحجر کی طرح محفوظ ہو گیا ہے۔ میں اس کے اوپر جھکی اور پوچھا "ننھے خوبصورت پھول کیا میرا دل کبھی محبت کے جذبہ کا بار بردار ہوگا؟" وہ میرا پُرحسرت استفسار سن کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس لئے ساکت رہا!

واپسی پر مجھے ایک پیاز ملی۔ وہ شاہراہ کے کنارے کس مپرسی کے عالم میں پڑی تھی کسی بے درد نے اُس کی نازک پتیوں کو کچل ڈالا تھا آہ، پیاز کو کیسا صدمہ پہنچا ہوگا! میں نے اُس سے کہا بدقسمت پیاز! تیرے حسرتناک انجام اور میری پُرالم زندگی کے مصائب میں کچھ مطابقت سی معلوم ہوتی ہے! میری تمام ہمدردی تیرے ساتھ ہے!" میری آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری تھے اور آہستہ سے اٹھا کر میں نے مرحوم پیاز کو اپنے رومال میں لپیٹ لیا۔ اور سوتے وقت اپنے سرہانے رکھ لیا!

✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ پرسوں

میں محبت کرنا چاہتی ہوں مگر کسی سے محبت نہیں کر سکتی۔ میں نے کئی بار کوشش کی! مگر میں اپنے ماں باپ۔ بھائی بہن کسی سے محبت نہ کر سکی۔ میرے ابا جان نے میری منگنی مغموم نواز خاں سے کر دی تھی۔ جو فوج میں رسالدار میجر ہے، مگر میں اس سے محبت نہ کر سکی نہ کر سکتی ہوں۔ آہ! مجھے ان لوگوں نے کیسا مجبور کر دیا ہے! کتنا ستا رکھا ہے! مجھے سانس لینے کی اجازت نہیں ہے اور میں لے بھی نہیں سکتی! بارہا میں نے خودکشی کرنے کی کوشش کی مگر ان لوگوں نے میری کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ گزشتہ شب میں نے پھر کوشش کی میں نے اپنے پلنگ کے بالکل قریب میز پر "سہ آتشہ مار اللحم" کی ایک بھری ہوئی بوتل رکھ لی۔ مگر وہ کمبخت بھی میرا کام تمام نہ کر سکی! صبح کو جب میں اٹھی تو وہ اسی طرح پڑی تھی اور میں زندہ سلامت موجود تھی!

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ گزشتہ پرسوں!

مجھ کو ڈوبنے کی اجازت بھی تو نہیں! کیوں؟ یہ میں نہیں کہہ سکتی! بے سود میں صبا سے پوچھتی ہوں اور درختوں سے کہ کیا مجھ کو غرقاب ہو جانے کی اجازت ہے؟ آہ! وہ ظالم بھی خاموش رہتے ہیں!

تاہم میری انتہائی آرزو آزاد رہنے کی ہے۔ ننھی چڑیوں کی طرح آزاد! ان میں سے سب سے ننھی

کے برابر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !میں خزاں کی ٹہنیوں کو بادِ پریشاں کے جھونکوں پر دیوانہ وار ناچتا دیکھتی ہوں! کاش میں ایک پتا ہی ہوتی!

یہی نہیں۔ میری خوشیوں کو پامال کرنے کے اور بہت طریقے اُن کو آتے ہیں!

آہ! مجھ کو مجبور کرتے ہیں کہ کھاؤ! چنانچہ کل انہوں نے مجھ کو ایک اناناس کھلا دیا۔ جس نے میری تمام آرزوؤں کا ناس کر دیا!! میں اس کا مزہ اور خوشبو تمام عمر نہیں بھول سکتی!

\+ + + + + + نیا دن!

میرا دل دھڑکتا ہے! آج ایک آدمی میرے پاس سے گزرا! وہ سچ مچ پاس سے گزر گیا!

میں نے اپنی کھڑکی سے اُس کو جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ کھیت کے کنارے کنارے جا رہا تھا جہاں میرے خوبصورت گوبھی کے پھول کے پودے لگے ہیں! چلتا ہوا وہ کیسا اچھا معلوم ہوتا تھا! پست قد اور فربہ جسم ہونے کے باعث اس میں میرے پھول کی بہت مشابہت نظر آتی تھی! خوبصورتی میں وہ خوشنما گوبھی کا عکس معلوم ہوتا تھا! اُس کے ہاتھ میں ایک اسٹول تھا اور اُس کی کمر پر ایک میز لٹکی تھی۔ وہ سگار کا دھواں اڑاتا ہوا جا رہا تھا۔ جیسے ایک دخانی انجن سے دھواں اٹھتا ہو! اُس کے اندازِ رفتار میں کیسی دلکشی تھی! کیا میں اس سے محبت کرتی ہوں؟ نہیں کہہ سکتی! ابھی نہیں! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ! محبت ایک نازک پودے کی مانند ہوتی ہے! کوئی اس کو بڑھا نہیں سکتا! آہ اُس کے گندمی رنگ کے چہرہ پر دوڑتی ہوئی مسکراہٹ ایسی ہی بھلی معلوم ہوتی تھی جیسے وہاں کے کھیت پر بھاگتی ہوئی شہابِ ثاقب کی روشنی! میں نے گلدان سے نکال کر ایک گوبھی کا پھول اُس پر پھینکا۔ آہ مگر وہ اس پر نہ گرا! تب میں نے پیاز کی پتیاں (جن میں مرجھانے کے بعد بھی خوشبو باقی تھی) اُس پر پھینکیں۔ مگر اُن کو ہوا کے ظالم جھونکے اڑا کر لے گئے!

\+ + + + + + نئی کلی!

میری زندگی کے خشک باغ میں آخر بہار آئی! اُجڑے چمن کو محبت کی شگفتگی نے شاد و آباد کر دیا! آج میں نے اُس کو پھر دیکھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !اس سے بات کی۔ ۔ ۔ ۔ ! وہ لہریں مارتے ہوئے دریا کے کنارے اپنے اسٹول پر عالمِ محویت میں بیٹھا تھا۔ اسٹول پر بیٹھا وہ اتنا ہی اچھا معلوم ہو رہا تھا جتنا اپنی نازک شاخ پر سوتا ہوا میرا پسندیدہ پھول اس کے سامنے میز پر تصویر بنانے کا فریم تھا۔ جس میں وہ پہاڑ کے قدموں پر پڑے ہوئے شاہ بلوط کے خشک سایہ دار درختوں کے نیچے چرتے ہوئے باربرداری کے ایک ایسے کوہستانی چرندے

کی تصویر بنا رہا تھا جس کے سر سے بے ثباتیٔ دنیا اور گردشِ افلاک کے باعث سینگ اڑ گئے ہوں۔ اُس کے ایک ہاتھ میں مصوری کا پاپوش برش تھا۔ سامنے کئی قسم کے رنگوں کی کوبرا پالش کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت ڈبیاں رکھی تھیں! میں نے اُس سے بات کی! اب تو مجھ کو اُس کا نام بھی معلوم ہوگیا تھا! اُس کا نام ...... ! میرا دل دھڑکتا ہے ...... ! میں لکھنا چاہتی ہوں مگر نہیں لکھ سکتی ...... ! پھر کسی وقت ...... !

اُس کا نام مرزا گاؤ زبان بیگ تیموری لنگوی ہے ...... ! وہ کالے اور بادامی رنگوں سے کیسی اچھی تصویر بنا رہا تھا ...... ! میں دیر تک کھڑی دیکھتی رہی! اپنے تئیں سنبھالتے ہوئے میں نے اپنے دل میں اس سے یوں کہا "اس تصویر کے بنانے کا کیا راز ہے؟ کیا یہ کشمکشِ وجود کی تصویر ہے جس کو مرقعِ قدرت کی زیبائش کے لئے تصور کی مدد سے بنا رہے ہو؟ موجوداتِ عالم کے رازوں کو جاننے والے مصور! مصورانِ فطرت وغم کے قابل استاد کیا یہ تصویر بہشتِ بریں کے کسی نادر و نفیس جانور کی ہے؟" اس نے پُرمعنی طور پر جواب دیا "نہیں!" میں نے غور سے دیکھا واقعی اُس کا کہنا سچ تھا! میں نے اُس کی آنکھوں کی طرف پُراسرار نظر سے دیکھتے ہوئے کہا "یہ ہمارا راز رہے گا!"

پرانی کل ✢ ✢ ✢ ✢ ✢ ✢

ہر صبح میں دریا کے کنارے مرزا گاؤ زبان بیگ تیموری لنگوی (کیسا پیارا نام ہے) کے پاس جاتی ہوں! وہ خاموش تصویر بناتا رہتا ہے۔ میں پاس بیٹھی رہتی ہوں اور اس طرح ہم دونوں باتیں کرتے ہیں! میں جو کچھ سوچتی ہوں۔ جو کچھ پڑھتی ہوں۔ جو کچھ جانتی ہوں! جو کچھ محسوس کرتی ہوں یا جو کچھ کھاتی ہوں یا جو کچھ پہنتی ہوں سب حال اُس کو سناتی ہوں۔ وہ بے پروائی کے ساتھ خاموش بیٹھا تصویر بناتا رہتا ہے گویا ہمہ تن گوش ہے اور میری باتیں سن کر کسی گہرے خیال میں مستغرق ہوگیا ہے!

بعض مرتبہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ میری کوئی بات سُن ہی نہیں رہا ہے ...... ! ہم روز اسی طرح باتیں کرتے ہیں!

اس طرح تبادلۂ خیالات اور علمی مباحثوں سے مجھ کو اندازہ ہوا ہے کہ اُس کے سامنے میں ایک طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتی ہوں۔ کل میں نے اُس سے پوچھا تھا کہ "مولانا روم کی رباعیات میں کوئی خوبی ہے؟" اُس نے جواب دیا "نہیں"! علمی تحقیق، علمی گفتگو اور نئی معلومات سے بھی کیسا فائدہ ہوتا ہے!

دو دن پہلے! ✢ ✢ ✢ ✢ ✢

آج گاؤ زبان نے مجھ سے نشانی مانگی تھی! میں نے اُس کو خوشی سے اپنے جوتے کا تسمہ نکال کر دے دیا!

تھا۔ مگر اُس نے کہا "نہیں!" اور صندوق کر کے میرا ہیروں کا بروچ لے گیا! میں اُس کے اس مصلحت آمیز برتاؤ کا پوشیدہ سبب سمجھ گئی۔ وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ اُس کی نظروں میں میری اتنی ہی وقعت ہے جتنی ایک معمولی کم خیال ہستی کی نظروں میں ایک ہیرے کی ....!

+ + + + + + اس سے دو دن پیشتر!

آج صبح اُس نے دوسری نشانی مانگی! میں نے اپنے صندوقچے سے ایک اشرفی لاکر اُس کو دے دی اور کہا کہ اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دو تاکہ ہم دونوں کے پاس اُس کی یادگار رہ سکے! لیکن گاؤزبان نے کہا "نہیں!" میں اُس کے خیالات کا مفہوم سمجھ گئی۔ وہ اشرفی کو اس لئے نہ توڑنا چاہتا تھا کہ ہماری محبت ہمیشہ سالم رہے اور کبھی نہ ٹوٹے! وہ بہت دور اندیش ہے! اب وہ اشرفی کو ہم دونوں کے بدلے اپنے ہی پاس رہنے دے گا!

+ + + + + + آج سے بعد کل سے پہلے!

آج اُس نے پوچھا تھا کہ میرے پاس کوئی دوسری اشرفی بھی ہے؟ اُس کی سادہ باتیں مجھے بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں!

+ + + + + + نہ آج نہ کل!

آج میں نے دوسری اشرفی لاکر اُس کو دے دی! اُس کی خواب آلود آنکھیں محبت کی خوشی سے چمک اُٹھیں! اس کے عوض اُس نے مجھ کو تانبے کا ایک منصوری سکہ دیا ہے۔ گویا ہماری محبت سونے کی طرح پاک ہے اور "تانبے کی طرح مضبوط! میں اس کے اعلیٰ جذبات اور وسیع خیالات کی داد دیتی ہوں!

+ + + + + + گزشتہ پرسوں کے دو دن بعد!

مجھ پر خوف طاری ہے کہ میری شادی کا دن قریب آگیا اور مغموم نواز خاں آتا ہوگا! مجھے زیادہ ڈر اس بات کا ہے کہ کہیں گاؤزبان اس کو مار نہ ڈالے! وہ اس قدر خاموش رہتا ہے کہ میں ڈرتی ہوں وہ مغموم کا نہ معلوم کیسا حشر کرے! میں کانپتی ہوں!

+ + + + آنے والی کل سے ایک دن پہلے!

میں نے گاؤزبان سے مغموم کے متعلق کہہ دیا ہے اور یہ بتا دیا ہے کہ وہ سرحدی فوج میں افسر ہے۔ اور یہ کہ اُس سے میری منگنی ہو چکی ہے۔ پہلے تو گاؤزبان کو اس کا سننا ہی گوارا نہ تھا! اُس کے چہرے کی گھبراہٹ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اُس کو خوف ہے کہ کہیں اُس کو بہت زیادہ غصہ نہ آجائے! چنانچہ اُس نے اپنا سامان سنبھالنا

شروع کر دیا۔ تب میں نے اُس کو سمجھایا کہ معموم کے آنے میں ابھی عرصہ ہے! اُس کے چہرے پر سکون کے آثار نمایاں ہونے لگے! اس خیال سے مجھ کو خوشی ہوئی کہ اُس کا غصّہ فرو ہوا!

\+ \+ \+ \+ \+ بالکل نیا دن!

آہ! معموم کے آنے میں صرف پندرہ دن رہ گئے! اب زندگی عبث ہے! رات میں نے اپنا خاتمہ کرنے کی کوشش پھر کی تھی۔ اب مجھ کو جینے کی کیا ضرورت ہے جب کہ وہ نایاب شے، محبت، جس کی مجھ کو عرصے سے تلاش تھی مجھ کو مل گئی ہے! میں نے اپنے پلنگ کے پاس بھرے ہوئے کارتوسوں کا ایک ڈبہ رکھ لیا تھا! صبح کو اٹھی تو میں زندہ تھی! وہ بھی میرا کام تمام نہ کر سکے! میں جانتی ہوں اس کا کیا مطلب ہے! اس کے معنی ہیں کہ اب میرا اور گاؤزبان کا خاتمہ ایک ساتھ ہی ہوگا!

\+ \+ \+ \+ \+ گذشتہ دن سے ایک دن بعد!

آج میں نے گاؤزبان سے کہا ہے ہم دونوں کو چاہیئے کہ اپنے آپ کو ہلاک کر دیں۔ اُس نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ پھر اُس نے رائے دی کہ پہلے مجھ کو اپنی زندگی کا خاتمہ کر دینا چاہیئے بعد ازاں وہ میری قبر کا جاروب کش بن کے "بھوک ہڑتال" سے اپنے آپ کو فنا کر دے گا! مگر مجھ کو پسند نہیں کہ وہ اتنی بڑی قربانی کرے! میں نے اُس کو صلاح دی ہے کہ تم دریا کے کنارے اپنے گلے میں پھانسی ڈال لو۔ میں ہر طرح مدد کے لئے تیار ہوں! وہ اس پر غور کرے گا۔ اگر اُس نے پھانسی نہ ڈالی تو گولی ضرور مارے گا!

\+ \+ \+ \+ \+ بعد ازاں!

افسوس گاؤزبان ابھی زندہ ہے۔ وہ کہنے لگا کہ "میں رسی خریدنا بھول گیا"۔ بیچارے نے کئی بار اپنے دل میں گولی ماری۔ مگر ہر بار نشانہ خطا گیا اور گولی سر میں لگی! اور اس کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچا!

\+ \+ \+ \+ \+ قبل ازاں!

گاؤزبان اور میں ایک دوسرے سے محبت کرنے کے لئے ہمیشہ زندہ رہیں گے! اس بارے میں ہماری تمام خودکشی کی کوششیں رائگان گئیں اب ہم معموم کے آنے سے ایک دن پہلے کہیں باہر چلے جائیں گے! جب وہ آئے گا تو ہم کو نہ پائے گا . . . . ! میں اپنے پیارے گوبھی کے پھولوں اور باغ کی چڑیوں درختوں، پتوں اور مکھیوں کو خدا حافظ کہہ دوں گی!

\+ \+ \+ \+ \+ قیامت خیز شام!

کس دل سے میں ان واقعات کی تفصیل بیان کروں جن کو میں قلمبند کر رہی ہوں! آہ میرے قلم کی نب کانپتی

ہے! جس بات کا سخت خطرہ تھا آخر وہی ہوئی! اب میں زندہ رہ کر کیا کروں! آہ! پروردگار! کیسا خوفناک بیان ہے! میں اور گاؤزبان کھڑے تھے۔ میں اُس کو اپنے زیورات کا صندوقچہ دے رہی تھی اور ساتھ ہی اپنی محبت اور زندگی بھی۔ اتنے میں مغموم کو آتے دیکھا! وہ اپنے فوجی لباس میں کیسا شاندار معلوم ہو رہا تھا! بجلی کی طرح یہ خیال میرے دل میں کوندگیا کہ دنیا کیسی بے ثبات ہے اور ناپائیدار! اگر گاؤزبان نے مغموم کو قتل کردیا تو ابھی ذرا دیر میں اُس کا خون آلود جسم فرشِ خاک پر ایک بے جان چیز کی مانند خاموش اور بے حس وحرکت پڑا ہوگا! میں چلّائی "گاؤزبان بھاگو۔ اگر تم ذرا دیر اور ٹھہرے تو ضرور تم اُس کو قتل کر ڈالو گے!" گاؤزبان نے مغموم کو آتا ہوا دیکھا۔ اُس کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا! میری درخواست کو منظور کرتے ہوئے وہ بھاگا! جب وہ بھاگ رہا تھا تو کیسا شجیع اور رفیع الخیال معلوم ہو رہا تھا! صد آفرین ہے تجھ کو اے بہادر دل والے انسان! تو نے ایک ہم جنس کی زندگی کو بچانے کے لئے غصہ کی مطلق پروانہ کی اور اس طرح اپنے جذبات کی بڑی قربانی کر دکھائی۔ ...... ! مگر مغموم نے دوڑ کر اُس کو پکڑ لیا! گاؤزبان بہادری کے ساتھ لڑنے لگا۔ آہ! جب دو مرد آپس میں لڑتے ہیں تو کیسا ہیبت ناک نظارہ ہوتا ہے! مغموم نے ذرا دیر میں گاؤزبان کو اوپر اٹھا لیا اور کوٹ سے پکڑ کر اپنے گرد کئی دفعہ گھمایا۔ یہاں تک کہ کوٹ پھٹ گیا اور گاؤزبان ایک دھماکے کے ساتھ گھاس میں جاگرا! اُس کے گرنے کی آواز میں وہی نغمہ تھا جو کسی آبشار کے پتھروں پر گرنے سے پیدا ہوتا ہے! پھر مغموم نے اپنے فوجی بوٹ سے اُس کی کمر کو اس طرح چھؤا جیسے کوئی شریر لڑکا مظلوم فٹ بال کو تنگ کرتا ہے! پھر اُس نے تصویر کے تختہ کو اٹھا کر اُس کے سر پر پٹکا! تختہ پھٹ جانے کے باعث اُس کے گلے میں ہار کی طرح آویزاں ہوگیا! آہ! اس وقت گاؤزبان کیسا بہادر معلوم ہو رہا تھا! اُس کے گلے میں تختہ لٹکا ہوا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بہادر راجپوت سورما کے گلے میں ڈھال! تب مغموم نے اُٹھا کر اُس کو دریا میں پھینک دیا! میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ وہ کنول کے پھول کی طرح پانی پر تیرنے لگا! وہ نظارہ میں کبھی نہ بھولوں گی........!

چھ مہینے بعد

✢ ✢ ✢ ✢ ✢ ✢ ✢

میری شادی مغموم سے ہوگئی ہے اور اُس نے دہلی میں میرے لئے ایک عالیشان کوٹھی خرید لی ہے!

اب وہ کمانڈران چیف کا اڈیکانگ مقرر ہوگیا ہے۔ ہاں جس وقت گاؤزبان کنول کے پھول کی طرح

سطحِ آب پر تیر رہا تھا اُس وقت مغموم ہوٹل جاکر اُس کے کمرے سے میرا تمام وہ سامان واپس لے آیا تھا جو سفر کے خیال سے میں نے وہاں بھجوایا تھا۔ اب بھی میں سوچتی ہوں تو مجھ کو خیال آتا ہے کہ گاؤ زبان گومتی میں بہتا ہوا جمنا میں جا ملا ہوگا! اور جمنا سے نکل کر گنگا میں پہنچا ہوگا! آخر بہتا بہتا طویل سفر کے بعد خلیج بنگال میں جا ملا ہوگا!

"کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزلہا"

پاس سے گذرنے والے جہازوں کے مسافر اگر غور سے دیکھتے ہونگے تو اس میں اب بھی گوبھی کے پھول کی خوبصورتی کا تمام عکس موجود پاتے ہونگے!!

شاہد حسین بی، اے

ایک کشمیری گیت

ہائے میرا محبوب میری شاخِ حیات میں محبت کی آگ لگا کر چپکے سے چلا گیا۔

میری قسمت کا ستارہ اس وقت بلند ہوگا جب میرا محبوب میرے صحن میں آجائے گا۔

میرا محبوب چلا گیا۔ میں اُسے کہاں تلاش کروں۔ اے سکھی اس کو مجھ پر ذرا بھی رحم نہ آیا۔ جب میرے باغِ جوانی میں بسنت کے دن آئیں گے تو اس کی بہار کون لوٹے گا؟

ہائے وہ جوانی پھر نہ آئے گی جو تیر کی طرح نکلی جارہی ہے۔

اس کا جینا کس کام کا جس کے ساتھ اس کا محبوب نہ ہو۔ وہ ہاتھ مل کر پچھتائے گا کہ ہائے تیر کی طرح میرا جوبن نکل چلا۔

جو مر گئے وہ اس دنیا کی تمام مصیبتوں سے چھوٹ گئے مٹی کے ساتھ مٹی مل جائیگی۔ ہائے جوبن تیر کی طرح نکل گیا۔

اس جوانی پر غرور نہ کرو یہ زمانہ سوچنے کا ہے۔ یہاں سے جانا ہے یہ سوچ کر تیار رہو۔ جوبن تیر کی طرح نکل گیا۔

مندرجہ بالا گیت جس کا میں نے ترجمہ کیا ہے کشمیر میں بہت مشہور ہے۔ کشتیوں پر ملاح، کھیتوں اور کھلیانوں میں کسان اور بوجھ ڈھونے والے مزدور اس گیت کو خوب جھوم جھوم کر گاتے ہیں۔

اعظم کریوی

تجلّیات

قدر آموزِ وفا خونِ شہیداں ہوگا | ہم نہ ہونگے نہ سہی تُو تو پشیماں ہوگا

ہر نظر پردہ بر انداز ہے چھپنے والے | تو کہاں جا کے نظر والوں سی پنہاں ہوگا

چارہ فرمائی عبث، فکرِ سکوں بے حاصل | درد ہی بڑھ کے ہمارے لئے درماں ہوگا

موت آئی نہیں اور یاد تری بُھول چلی | کون اب حالِ دلِ زار کا پُرساں ہوگا

پھر بہار آئی کھِلے پُھول چلی بادِ مراد | مژدہ پھر تا بہ جگر چاک گریباں ہوگا

اے جنوں ہوش سی آزاد کیا خوب کیا | اب غمِ جیب نہ اندیشۂ داماں ہوگا

یوں ہوا اک قطرۂ خوں شورشِ محشر بہ کنار! | دل جسے کہتے ہیں وہ آپ کا ارماں ہوگا

یوں تو دنیا میں ہزاروں ترے دیوانے ہیں
کہیں مجھ سا بھی کوئی بے سر و ساماں ہوگا

نُورجہاں بیگم نازؔ

بچّے اور بُوڑھے

ہر شب سونے سے پہلے بچے آپس میں باتیں کیا کرتے۔ وہ سب ایک کمرے میں ایک تخت پر بیٹھ جاتے اور جو کچھ اُن کے ننھے دماغوں میں آتا بکا کرتے۔ اور دھندلی کھڑکی میں شام کی تیرگی خواب آلود آنکھوں سے انہیں جھانکتی رہتی۔

ہر کونے سے خاموش سائے اپنے ساتھ عجیب و غریب حکایات اور کہانیاں لئے ہوئے اوپر کی طرف اُٹھتے ہوئے نظر آتے۔

اُن کے دماغ میں جو کچھ آتا کہہ ڈالتے، لیکن اُن کے دماغ میں صرف بہار اور روشنی کی محبت اور امید افزا داستانیں ہی آتی تھیں۔ سارا مستقبل اُن کے لئے ایک مسرت ناک تعطیل کا روشن دن ہوتا تھا۔ الفاظ زبان سے نکلتے تھے —— نہایت آہستہ —— سرگوشیوں کے لباس میں مستور، اور صرف نصف سمجھ میں آتے تھے اُن کے قصوں کی نہ ابتدا ہوتی تھی نہ انتہا، اور نہ اُن میں تسلسل ہوتا تھا۔ بعض اوقات چاروں بچے ایک ساتھ بول اُٹھتے، لیکن ایک کی وجہ سے دوسرا گھبراتا نہ تھا۔

بچے ایک دوسرے سے اس قدر مشابہت رکھتے تھے کہ دھندلی سی چاندنی میں، سب سے چھوٹے چار سالہ تان شیک اور سب سے بڑے دس سالہ لوئی کا کی شکلوں میں امتیاز نہ ہو سکتا تھا۔

اس شام کو ایک ایسی خبر جسے وہ نہ سمجھ سکتے تھے ایک ایسے مقام سے جسے وہ نہ جانتے تھے اس فردوسی فضا میں پہنچی اور اُس نے کہانیوں اور لطیفوں کا خاتمہ کر دیا۔ ڈاک سے انہیں یہ خبر ملی تھی کہ اُن کا باپ سرزمینِ اطالیہ میں چل بسا۔

"لیکن وہ کب واپس آئیں گے؟" تان شیک نے تعجب سے پوچھا۔

لوئی کا نے اُسے کہنی مارتے ہوئے مغموم لہجہ میں جواب دیا:- "وہ کس طرح واپس آ سکتے ہیں جب کہ وہ خدا کے ہاں چلے گئے"

یہ سُن کر سب خاموش ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک بڑی سیاہ دیوار کے سامنے کھڑے تھے

اور اُس کے آگے کچھ نہ دیکھ سکتے تھے۔

"میں بھی جنگ پر جا رہا ہوں" میٹی چی نے بلا غور و خوض زور سے چلا کر کہا۔

"تم ابھی بہت چھوٹے ہو" تان شیک تضحیکاً بولا۔

سب سے زیادہ لاغر، نازک اندام اور نحیف ملکا نے، جو اپنی ماں کے بڑے دوشالے میں لپٹی ہوئی تھی اور ایک مسافر کی گٹھری معلوم ہوتی تھی، اپنے نرم اور دھیمے لہجہ میں کسی پوشیدہ مقام سے پوچھا "جنگ کیسی ہوتی ہے، مجھے بھی بتاؤ میٹی چی"

میٹی چی نے مطلب یوں سمجھایا "سنو جنگ اس طرح کی ہوتی ہے کہ لوگ ایک جگہ جمع ہو کر ایک دوسرے پر چاقوؤں سے حملے کرتے ہیں، تلواروں سے قتل کرتے ہیں اور بندوقوں سے مارتے ہیں۔ جتنا زیادہ کوئی مارے اور قتل کرے اتنا ہی اچھا سمجھا جاتا ہے ۔۔۔۔ یہی جنگ ہے"

"لیکن وہ لوگ کیوں قتل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی جان لیتے ہیں؟" ملکا نے پوچھا۔

"شہنشاہ کے لئے" میٹی چی نے کہا۔ اور سب چپ ہو گئے۔

پھر فوراً ہی میٹی چی نے اپنے خیالات یکجا کئے۔ تاکہ اُس خاموشی کو دور کر دے جو اس وقت ان پر بار گذر رہی تھی۔

"میں بھی دشمن کے خلاف لڑائی پر جا رہا ہوں"

"دشمن کیسا ہوتا ہے؟ کیا اُس کے سینگ ہوتے ہیں؟" ملکا کی کمزور آواز نے فوراً سوال کیا۔

"درحقیقت اُس کے سینگ ہوتے ہیں۔ ورنہ پھر وہ دشمن کیسے ہو سکتا؟" تان شیک نے متانت اور کسی قدر غصہ سے جواب دیا۔ اور اب خود میٹی چی بھی صحیح جواب نہ جانتا تھا۔

"میں نہیں سمجھتا ۔۔۔۔ کہ اس کے سینگ ہوتے ہیں۔!" اُس نے رکتے رکتے آہستہ سے کہا۔

"اُس کے سینگ کیسے ہو سکتے ہیں؟ وہ ہماری طرح ایک انسان ہے،" لوئی کا نے کہا۔ "مگر صرف یہ بات ہے کہ اس میں روح نہیں ہوتی"

"چند لمحوں کے بعد تان شیک نے پوچھا۔ "لیکن جنگ میں آدمی خدا کے ہاں کیسے چلا جاتا ہے؟"

"لوگ اُسے جان سے مار ڈالتے ہیں،" میٹی چی نے جواب دیا،

"ابا جان نے میرے لئے ایک بندوق لانے کا وعدہ کیا تھا!" تان شیک غمگین لہجہ میں بولا۔

"وہ بندوق کیسے لاسکتے ہیں، جب کہ خدا کے ہاں چلے گئے" لوئی کا نے کسی قدر سختی سے پوچھا
"اور لوگوں نے انہیں جان سے مارڈالا؟" تان شیک نے سوال کیا۔
"ہاں جان سے!" لوئی کا نے جواب دیا۔
معصومیت اور بچپن سے آلودہ اور حیرت سے کھلی ہوئی آنکھوں میں سے سکوت اور غم تاریکی میں گھورنے لگا ـــــ کسی نامعلوم فضا میں ـــــ دماغ اور دل میں محسوس نہ ہونے والی فضا میں۔

اس وقت جھونپڑے سے باہر ایک بنچ پر اُن کی دادی اور دادا بیٹھے تھے۔ آفتاب کی آخری سرخ اور سنہری شعاعیں گھنے درختوں میں سے گذر کر باغ میں آرہی تھیں۔ شام نہایت پُرسکون تھی، مگر ایک مسلسل رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ غالباً یہ بچوں کی جوان ماں کے گریہ و بکا کی آواز تھی۔ دونوں بوڑھی جانیں کمر خمیدہ ایک دوسرے سے ملی بیٹھی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ اس طرح پکڑے ہوئے تھے جیسے عرصۂ دراز کے بعد یہ موقع ملا ہو۔ وہ دونوں آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے، اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے محروم تھیں اور وہ کچھ نہ بول سکتے تھے۔

محشر عابدی

غم خوشی کے نقشِ قدم پر دبے پاؤں چلتا ہے۔
خیال عمل کی روح ہے۔
قسمت ممکنات پر ہنستی ہے۔
انسان فانی ہے مگر غم ابدی۔
بہترین استاد وقت ہے، بہترین کتاب دنیا۔
نیکی کرنا ہی کافی نہیں بلکہ اُسے صحیح طریق پر کرنا چاہیئے
چالاک آدمی اچھے ہوتے ہیں مگر بہترین نہیں ہوتے۔
ہر پہلو میں ایک ہی دل ہے۔

(ماخوذ) نسیم رضوانی

غزلیات

۱

بہارِ گلشنِ ہستی کا اعتبار نہیں — خزاں نہیں ہے اگر آجکل بہار نہیں
ملے ہیں سب کی نشانی ہیں داغ ناکامی — وہ کونسی ہے تمنا جو یادگار نہیں
بتا گئی نگہ واپسیں ہیں رازِ فراق — وہ آنکھ ہائے جوابِ محوِ انتظار نہیں
عدم سے واں مجھے لائی ہوائے آزادی — جہاں کہ اپنی طبیعت پہ اختیار نہیں
ہوا نے دوش پہ رکھی ہے خاکِ دیوانے — شہیدِ عشق کا لاشہ زمیں پہ بار نہیں

وفا کا عہد وہ کرتے ہیں مجھ سے میں چپ ہوں
نگاہِ یاس نہ کہدے کہ اعتبار نہیں

علی حسنین نیّر باردولوی

۲

جان و دل ہم نثار کرتے ہیں — اس طرح اُن کو پیار کرتے ہیں
اُن سے امید ہے وفا کی ہمیں — دل جو بے کروگار کرتے ہیں
تیرِ طعنوں کے یہ رقیب آخر — کیوں مرے دل کے پار کرتے ہیں
آبلے دیکھ اپنے وحشی کے — یہ خزاں کو بہار کرتے ہیں

کر کے وعدہ بھی یہ جواب آیا
آپ کیوں انتظار کرتے ہیں

اندرجیت شرما

۳

مدعی ہے کہ عاشقی میری — دشمنی ہے کہ دوستی میری
میں اڑاتا تھا چٹکیوں میں جنہیں — اب اڑاتے ہیں وہ ہنسی میری

جی سے جانا ہی ہوش میں آنا — مجھ سے کہتی ہے بیخودی میری
غش بھی آتا نہیں خبر لینے — کتنی بے کس ہے بے کسی میری
قصۂ غم دراز ہے میرا — اور کوتاہ زندگی میری
بن گئے وہ عدو کی روحِ رواں — موت ہے اب تو زندگی میری
کون ان کو منا کے لے آئے — مجھ سے روٹھی ہے زندگی میری
بھول کر آ گئے ہو تربت پر — دیکھتے جاؤ بے کسی میری
دل کو نالے ہیں رات کو آہیں — یوں ہی کٹتی ہے زندگی میری

خاک سمجھے گا مدعی شائق
اک معمّا ہے شاعری میری

سید محمد کاظم علی شائق

۴

کسی صورت مجھے قرار نہیں — طاقتِ دردِ انتظار نہیں
کون سی چیز ہے جو دنیا میں — مستِ صہبائے حسنِ یار نہیں
طور پر حسن کی جھلک سی ہے — برقِ مضطر نہیں شرار نہیں
کہہ رہی ہے خزاں کی پامالی — رنگِ ہستی کا اعتبار نہیں
جب شگفتہ نہ ہو کلی دل کی — لطفِ رعنائیِ بہار نہیں
ہائے دشتِ جنوں کی ویرانی — آبلہ پا ہوں اور خار نہیں

دعوئ عشق ہے غلط تنہا
دل اگر رشکِ لالہ زار نہیں

محی الدین تنہا

محفلِ ادب

ادیب آقا ہے یا غلام ؟

جب یونانیوں کی آزادی چھن گئی اور رومی اُن پر حکمران ہوگئے تو ادب آقائی کے درجہ سے گر کر غلامی کے درجے پر آ گیا۔ یونانی ادبا فلسفہ کے مالک اور ڈرامے کے بانی ہونے کی وجہ سے اپنی قوم کو اس نظر سے دیکھتے تھے جس نظر سے بادشاہ اپنی رعایا کو دیکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ قوم کی اصلاح کے طریقے نکالنے، اس کی حکومتوں کو منظم کرنے، اس کے اخلاق کی سطح کو بلند کرنے اور اُسے ترقی کی طرف لے جانے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ تم ارسطو یا افلاطون کا مطالعہ کرو تو ان میں سے ہر ایک کو ایک بادشاہ کی طرح اپنی رعیت کی دشواریوں کو دور کرنے کی فکر میں مبتلا پاؤ گے جو دل سے چاہتا ہے کہ اُن کے اخلاق وسیع اور ان کی حکومتیں با نظم ہو جائیں۔ تم ان میں سے کسی کو بھی ایک غلام کی طرح نہیں پاؤ گے جو عوام سے چاپلوسی کرے۔ قوم کو دھوکے میں رکھے اور اُن کی برائیوں کو بھی اچھا بتائے۔

بہرحال جب رومی یونانیوں پر غالب آ گئے اور انہیں یونانی زبان سیکھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور بچوں کو اس کی تعلیم دینے کی خواہشات بڑھنے لگیں تو رومی اس مقصد کے لئے کثرت سے یونانی غلام خریدنے اور اپنی اولاد کو اُن کے سپرد کرنے لگے۔ اور اس طرح یونانی اہلِ ادب غلام ہو کر رومی بچوں کے استاد بن گئے۔ یہ شاگرد اپنے معلم کی باتیں ضرور مانتے اور اس کی نصیحتیں بھی قبول کرتے۔ لیکن اسی طرح جیسے ہم اپنے ڈرائیور کی بات مان لیتے ہیں جب وہ ہم کو قریب ترین راستہ بتاتا ہے یا جس طرح ہم اُس قلی کی رائے پر چلتے ہیں جو ہمارا اسباب اٹھائے ہم کو ریل پر سوار کرانے جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم دونوں کی وقتی اطاعت اور ایک قسم کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ لیکن ہمارا ضمیر کہتا رہتا ہے کہ ہم ان دونوں سے بالا و برتر ہیں۔ اس حالت کا اثر لازمی طور پر معلم پر بھی ہوا اور اُس نے محسوس کیا کہ اپنے آقاؤں کے مقابلہ میں تعلیم دینے اور بات بات پر ٹوکنے والا استاد ہونے کے بجائے ایک خوش باش مصاحب ہونا زیادہ ضروری ہے۔

پھر ازمنۂ وسطیٰ کا دور آیا جس میں عرب اور اہلِ فرنگ مذہبی پیشوا خلیفہ یا پوپ کے خود مختار نظامِ حکومت کے لحاظ سے اور ادب کی یک رنگی کے اعتبار سے تقریباً برابر ہو گئے اور دونوں کا ادب مذہبی اور دنیاوی آقاؤں

کی خوشامد میں آقائی رتبے سے گر کر غلامی کے درجے میں آگیا۔ علاوہ ازیں اس دور میں ادب اور دو بڑی قسموں میں تقسیم ہوگیا۔ ایک قسم دینی ضروریات کو پورا کرتی، دوسری ضروریاتِ زندگی کو۔

ادب کا جو حصہ ضروریاتِ زندگی کے لئے وقف تھا وہ آقائی کے اُس بلند مرتبہ تک نہیں پہنچ سکا جو قدیم یونانی اہلِ قلم کا مرکز تھا بلکہ غلامی کے اُس درجے میں اتر آیا جس میں یونانی ادیب غلام ہو کر اتر آتے تھے۔

بنی عباس کے زمانے میں جس طرح بغداد میں تم کو غلاموں کی ایک بڑی جماعت ملے گی جس نے ادب حاصل کر کے اپنی ساری عمر اپنے آقاؤں کی مدح گوئی میں صرف کر دی اسی طرح انہیں ایام میں اٹلی میں بھی تم ہر امیر کے پاس ایک شاعر کو اُس کی مدح سرائی میں رطب اللسان پاؤ گے۔ غرض کہ ازمنۂ وسطیٰ میں مشرق اور مغرب کے تمام اہلِ ادب اسی رنگ پر جا رہے تھے اور اس خیال نے اعتقاد کی جگہ لے لی تھی کہ اُن کی سب سے بڑی مہم اور اُن کا سب سے اہم فرض دولت مندوں اور آقاؤں کو خوش کرنے تک محدود ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آگیا کہ ادب امرا کے اثر سے ایک حد تک آزاد ہوگیا اور اہلِ ادب کو امرا کی مدح سرائی سے نجات ملی۔ لیکن اب انہوں نے اپنے ناظرین کو محظوظ اور مسرور کرنا اپنا فرض قرار دے لیا اور اس طرح حریری اور ہمدانی جیسے خوش گویوں اور نقالوں کی خاصی تعداد پیدا ہوگئی جس نے الفاظ کے ذریعے سے وہی کر دکھایا جو مجلسوں میں لوگوں کا دل بہلانے اور ہنسانے کے لئے بھرُوپیے اور بھانڈ اپنے حرکات کے ذریعہ سے کرتے ہیں۔

بعد ازاں یورپ کی بیداری اور ترقی کا دور آیا اور اُس نے قدیم ادب کے ناخداؤں کو زندہ کرنا اور دامانِ ادب کو غلامی کے گرد و غبار سے پاک کرنا شروع کیا۔ آخر میں یورپ کے جدید ادب میں آقائی کا رنگ جھلکنے لگا اس دور کا انشا پرداز تم کو ہنسانے کے لئے تمہارے سامنے نہ چوپائے کا روپ بھر کر آسکتا ہے اور نہ تم کو خوش کرنے کے واسطے بھانڈپن دکھا سکتا ہے بلکہ وہ تم کو اس حقیقی دنیا کے ایسے سبقوں سے آشنا کرتا ہے جن سے تم کو بسا اوقات دردمند بنا دیتا ہے اور تم اسی دردمندی میں لذت اور مزا محسوس کرتے ہو کیونکہ تم کو اس طرح دردمند بنانے سے انشا پرداز کا مقصد محض تمہیں صاحبِ بصیرت اور روشن ضمیر بنانا ہے جس سے تمہارے لئے اس دنیا میں احتیاط کے ساتھ ترقی کرنے کا دائرہ وسیع ہو جائے۔

مگر ہم میں اب تک اہلِ قلم کا ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو بہ نسبت آقاؤں کے غلاموں کے مرکز سے زیادہ قریب ہے جس کی ساری ہمت شوخی نقالی اور گرانڈیل الفاظ تک محدود ہے میں بعض خاص حالات میں لفظی آرائش اور مرعوب کر دینے والی صنعتِ ترصیع کے فائدوں سے انکار نہیں کرتا۔ اگرچہ میں خوب جانتا ہوں کہ سونے کا

کٹورا سادہ ہی بھلا معلوم ہوتا ہے ایک حسین وجمیل ہستی لباس سے عریاں اور برہنہ ہو کر ہی زیادہ جاذب نظر اور فتنہ انگیز دکھائی پڑتی ہے اور ریشمی کپڑا نقش ونگار کے بغیر ہی زیادہ خوبصورت نظر آتا ہے۔ لیکن سونا اور ریشم ہر شخص کو دستیاب نہیں ہوسکتا اور سینکڑوں عورتوں میں شاید ہی ایک دو کے جسم کی بناوٹ ایسی ہو جو عریانی میں زیادہ حسین وجمیل معلوم ہوتی ہوں۔ چونکہ کوئی سادہ چیز اُس وقت تک بھلی نہیں معلوم ہوتی جب تک کہ وہ کسی مادہ سے اعلیٰ طرز کی نہ بنی ہو اور لغت ہماری ہر ضرورت کو سادہ اور حسین مادہ سے اعلیٰ طرز پر پورا نہیں کرسکتا اس لئے ہم کو کبھی کبھی لفظی نقش ونگار اور اچھوتا اسلوب بیان اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن میں اس کا بالکل مخالف ہوں کہ انشا پرداز کی ساری ہمت صرف الفاظ کی ندرت، عبارت کی شگفتگی اور طرز بیان کی شوخی پر صرف ہوجائے۔ اور وہ اپنے ناظرین کے سامنے ایک غلام کے رتبے میں رہ جائے جو صرف ان کو مسرور کرنے اور راضی رکھنے پر قناعت کرے۔ میری تمنا ہے کہ ہر ادیب اپنے آپ کو آقائی کے درجہ میں رکھے اور اپنے ناظرین کا فائدہ اُن کی تعلیم اور اُن کی رہنمائی اس کو مدنظر رہے۔ مگر یہ رتبہ وہی ادیب حاصل کرسکتا ہے جو عالم موجودات میں اپنی بصیرت اور بصارت کو کافی وسعت دے۔ اور وسعتِ نظر اسی انشا پرداز کو نصیب ہوسکتی ہے جو انسان اور اس کی تاریخ، اس کی اصلیت، اس کے حاضر و مستقبل، اس کے رسم ورواج، اس کی جہالتوں، اس کے قصے کہانیوں، اس کے علوم و آداب اور اس کی تہذیب وتمدن کا مسلسل اور گہرا مطالعہ کرے۔

یہی چیزیں ایک ادیب کا موضوع ہیں اور ہر ادیب پر لازم ہے کہ خود ان کی تعلیم حاصل کرے اور اپنے ناظرین کے سامنے انہی کو پیش کرے تاکہ اُس کا ادب غلاموں کے ادب سے ممتاز ہوکر آقاؤں کا ادب ہوجائے۔

(سلامہ موسیٰ مصری) "ادبی دنیا"

کیفیات

کوئی نہیں پچھتانے والا	مرجائے مرجانے والا
محفل میں بیٹھے گا کیوں کر	خلوت میں شرمانے والا
میں روکوں لیکن کیا روکوں	جائے گا گھر جانے والا
صبر مرا بے کار نہ جائے	تڑپے وہ تڑپانے والا
اپنا دل بہلاؤں کس سے	ہے کون آنے جانے والا

وہ نہ ملیں مجھ کو مل جائے کوئی جی بہلانے والا
ہم نہ کریں گے ترکِ محبت سمجھا کیا سمجھانے والا
دل وہ شے ہے جس کا شاکی کھونے والا پانے والا
سب سے مشکل بات یہی ہے زندہ ہو مر جانے والا
کیا سمجھے اسرارِ محبت دل دے کر پچھتانے والا
جان مری ہے جانے والی دل ہے اُن پر آنے والا
پھولوں کا مرجھانا، دیکھے کلیوں پر اترانے والا
کب سنتا ہے میری آہیں باتوں سے گھبرانے والا
یا میں ہوں یا میرا دل ہے روز نیا غم پانے والا

نوحؑ مرا کافی یہ پتہ ہے
وہ طوفان اٹھانے والا

"چمن"

گرمی

کالے کالے بھونرے پھر کنول کے پتوں کے نیچے سے جھانک جھانک کر دیکھنے لگے! اور سبز طوطوں کی سرخ چونچوں میں پکے پکے شہتوت نظر آرہے ہیں +

اونچے اونچے پہاڑوں پر اب وہ سبزی نظر نہیں آتی۔ بادامی رنگت کی گھاس اُگی ہوئی ہے۔ جنگلوں کے رسیلے پھولوں پر شہد کی مکھیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ اور بکریاں پہاڑوں کے دامن میں سوکھی گھاس چباتی نظر آتی ہے +

گرمی کے دن آگئے! ـــــ وہ دن جو شاعر کے خواب کی طرح چمکیلے ہوتے ہیں اور مشک کی طرح گرم ہوتے ہیں +

او معبود! معلوم ہوتا ہے کہ یہ روشنیاں پیدا ہونے کے دن ہیں! کہ ہر طرف اک محبوب نور برس رہا ہے!

جیسے درِ فردوس پر برس رہا ہو *

گہرے نیلے آسمانوں سے اک روشنی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہے۔ جو سمندر، پہاڑ اور پوری زمین کو چمکا رہی ہے *

گرمی کے دن آ گئے!

پھر آفتاب بلند ہو ہو کے چمکے گا۔ پھر جنگلوں میں خرگوش خوش ہو ہو کے ناچیں گے!

دوست! دیکھو۔ گرمیوں کے شفاف آسمان پر ستارہ کیسا جگمگا رہا ہے جیسے کم سن ہرن کی آنکھ میں روشنی کانپ رہی ہو۔

خوبصورت پرندوں کے پروں پر آفتاب کی تیز کرنیں کیسی پھسل رہی ہیں! جیسے ہلکی ہلکی برف پہاڑوں پر سے پھسل رہی ہو۔

گرمی کے دن آ گئے *

ہر طرف اک نور کا دریا لہریں مار رہا ہے *

"تہذیب النسواں"

سمندر کی آخری تان

شہرت و اقتدار اور محبت و آرام کی لذتوں سے میں ناآشنا ہوں وہ لوگ ایک ایک کر کے میری نظر کے سامنے ہیں جو ان چیزوں میں بسے ہوئے ہیں ہنس بول کر جیتے اور زندگی کو سازِ عشرت سمجھتے ہیں لیکن کیا بتاؤں کہ مجھے قدرت نے زندگی کے اور ہی گھونٹ پلائے! اب یاس و حرماں، ہوا اور پانی کی طرح میرے لئے شیریں بن گئے ہیں۔ ایک تھکے ہوئے بچے کی طرح میں اس جنجال کی زندگی کو رو رو کر اپنے آنسوؤں سے بہا سکتا ہوں تا آنکہ موت دبے پاؤں نیند کی طرح مجھ پر چھا جائے، ہوا کی گرمی میں میرے گال ٹھنڈے پڑنے لگیں اور سمندر کی آخری تان میری مائل بہ پرواز روح پر ٹوٹ جائے" (شبلی)

"مجلۂ عثمانیہ"

مطبوعاتِ جدیدہ

تاریخ اسلام۔ یہ کتاب عہدِ حاضر کے مشہور ادیب اور مورخ علامہ محی الدین خیاط مصری کی مستند اور جامع "تاریخ اسلام" کا اردو ترجمہ ہے جو پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں فلسفۂ تاریخ کی ماہیت، تاریخ کے مآخذ اور رسولِ کریم صلعم کے سوانح درج ہیں۔ دوسرے حصے میں خلفائے راشدین کے حالات ہیں۔ تیسرا حصہ خلافتِ بنی امیہ کے حالات میں ہے، چوتھا حصہ خلافتِ بنی عباس اور پانچواں تاریخ اندلس پر مشتمل ہے۔ ترجمہ مولانا مولوی ابوالمحمود محمد حامد خاں صاحب فاضلِ ادبیات نے کیا ہے۔ زبان ایسی سلیس اور عام فہم ہے، کہ عورتیں اور بچے بھی بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ اصل کتاب قریب قریب تمام ممالکِ اسلامیہ میں بطورِ نصاب تاریخ رائج ہے، اور یہ اُس کے مستند اور مفید ہونے کی بڑی دلیل ہے۔ کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ ہے۔ ہر حصہ میں ضروری نقشے بھی شامل کئے گئے ہیں۔ قیمت مع محصول پانچ روپے مقرر ہے۔ مدارس اسلامیہ اگر بطورِ نصاب رائج کرنا چاہیں تو ان کے ساتھ خاص رعایت کی جاتی ہے۔ ملنے کا پتہ منیجر صدیق بک ڈپو لکھنؤ۔

اربابِ نثرِ اُردو، از مولوی سید محمد صاحب قادری ایم اے۔ فورٹ ولیم کالج کے اردو نثر نویسوں کا تحقیقی و تنقیدی تذکرہ ہے اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس موضوع پر پہلی کتاب ہے، قابل مولف نے اسے نہایت محنت اور جانفشانی سے ترتیب دیا ہے۔ سوا سو سال سے زیادہ کا زمانہ گزرا کہ فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں پڑی تھی۔ اس کا مقصد صرف اس قدر تھا کہ چند ادبا کو اکٹھا کر کے ان سے انگریز اہلکاروں کے لئے آسان زبان میں درسی کتابیں لکھوائی جائیں چنانچہ نثرِ اردو کے یہ ارباب ملک کے مختلف حصوں سے یہاں جمع ہوئے اور انہوں نے قصص، تاریخ، قواعدِ زبان، اخلاق اور مذہب پر ایسی ایسی کتابیں لکھیں کہ اردو نثر کی بنیاد قائم ہوگئی۔ اس تذکرہ میں تقریباً بیس ایسے اربابِ نثر کے حالات اور اُن کے کارناموں کی تنقید درج ہے اور ہمارے خیال میں تاریخ ادبیات اردو کا یہ ایک اہم باب ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ کے لحاظ سے بھی کتاب بہت اچھی ہے۔ حجم ۳۰۰ صفحات مجلد کی قیمت دو روپے۔ مکتبۂ ابراہیمیہ امدادِ باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے طلب فرمائیے۔

چمنستان۔ اس نام کا ایک نیا مصور ادبی رسالہ ماہِ اگست سے مولوی محمد فضل خاں صاحب اور سید ظفر ہاشمی صاحب کے زیرِ ادارت شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ دوسرا نمبر ہمارے سامنے ہے جس میں نظم و نثر کے نہایت شستہ نمونے جمع کئے گئے ہیں۔ ایک سہ رنگی اور ایک یک رنگ تصویر بھی رسالہ کی زینت ہے۔ حجم ۴۶ صفحات اور سالانہ چندہ دو روپے۔ منیجر "چمنستان" امرتسر سے منگائیے۔

جلد ۱۶ — نمبر ۵

فہرست مضامین

بابت ماہِ نومبر ۱۹۲۹ء

تصویر:- داستان گو

رباعیات

(۱)

ہم وہ ہیں کہ خاموشی سخن ہے ہم کو
خلوت ہی ہماری انجمن ہے ہم کو
دنیا سے الگ ہے اپنی دنیائے خیال
ویرانہ ہی ویرانہ وطن ہے ہم کو

(۲)

ہر دشت ہے کوئی نہ کوئی آبادی
ہر بند ہے کوئی نہ کوئی آزادی
پابستی ہے وادئ حق سے جس کی فریاد
ہر جیب میں ہے کوئی نہ کوئی بربادی

(۳)

جو کچھ بھی یہاں ہے خشک و تر میں موجود
جو کچھ بھی نہیں ہے آج وہ ہیں موجود
انسان کی روح میں ہے ایک ایک کا عکس
کیا کچھ نہیں سب کچھ ہے بشر میں موجود

(۴)

گردش میں رہے جو تو وہ سیارہ بن
اپنے ہی فلک سے ٹوٹ اور تارہ بن
یہ راہ وہ ہے جس راہ میں کچھ آرام نہیں
منزل پہ پہنچنا ہے تو آوارہ بن

ل ب

جہاں نما

شتاقوا

امریکا کے تعلیمی طریقوں میں ہمیشہ یہ مقصد ملحوظ ہوتا ہے کہ وہ تعلیم کو تقویت پہنچائیں اور سب لوگ اس سے مستفید ہوسکیں۔ ایشیا اور یورپ کے بالمقابل امریکا کو جمہوریت کی نمایاں فوقیت حاصل ہے۔ یہاں ہندوستان میں ہم جمہوریت کے اُس عظیم الشان کارخانے کا تصوّر بھی اپنے دماغوں میں نہیں لاسکتے جس کے ماتحت مدرسوں کے اُستاد اور ریاست کے عہدہ دار بھی عوام کی رائے سے منتخب ہوتے ہیں۔ مگر امریکا میں عام انتخاب کا دستور جاری ہونے سے پہلے ہی تعلیم عام ہوچکی تھی۔ حکومتِ ہند ملک کی تعلیم پر کل ۸۰ لاکھ روپیہ خرچ کرتی ہے لیکن امریکا میں صرف ایک یونیورسٹی پر ایک کروڑ پچاس لاکھ روپیہ صرف ہوتا ہے۔

بہت دیر تک امریکا کے تعلیمی طریقے بھی انگریزی امارت کی روایات سے متاثر رہے لیکن امریکا نئے نئے آئین وضوابط کی سرزمین ہے اور وہاں کی جدید جامعات نئی ذہنیت کی پیداوار اور ملک کے جمہوری آئین روایات اور عادات کا نتیجہ ہیں۔

امریکا میں صرف مدرسے اور کالج ہی ایسے ادارات نہیں ہیں جو لوگوں کی تہذیب و تربیت کا کام کر رہے ہیں، بلکہ بیسیوں اور ایسے طریقے ہیں جن سے امریکا عام تعلیم اور مدنی علم کو اپنے کروڑوں فرزندوں کے لئے پھیلا رہا ہے۔ ان تمام طریقوں میں شتاقوا غالباً سب سے حیرت انگیز ہے۔

آج سے نصف صدی پہلے شتاقوا محض نیویارک کی ایک جھیل کا نام تھا۔ لیکن آج یہ لفظ اُس زبردست ترین مدنی طاقت کی نمائندگی کرتا ہے جس کے ذریعہ سے دیہاتی اور قصباتی آبادی کو دنیا کی موجودہ عظیم الشان دماغی ترقیات سے روشناس کرایا جاتا ہے۔

نصف صدی گزر چکی ہے کہ امریکہ کے بعض بڑے بڑے معلموں اور شہریوں نے جھیل شتاقوا کے پُرفضا کناروں پر گرمیاں گزارنے کے لئے اپنے خیمے گاڑے۔ تقریروں، نصابوں اور مختلف قسم کی دلچسپیوں کا انتظام کیا گیا، اور بڑی عمر کے آدمی اور کاروباری لوگ جو اوائلِ عمر میں کالج کی تعلیم سے محروم رہ گئے تھے یہاں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آنے لگے۔ تقریریں ہر مضمون کے متعلق ہوتی تھیں اور طالبِ علم کو علم کے جس کسی شعبہ سے دلچسپی

ہوتی وہ اس کا مطالعہ کرسکتا تھا۔ معلمین کا طرز بیان نہایت آسان ہوتا تھا اور کتابیں ان تقریروں کا نہایت موزوں و مناسب ضمیمہ ہوتی تھیں۔ رات کو ناچ راگ اور دوسرے کھیل تماشے ہوتے تھے اور ہر شخص اپنے مذاق کے مطابق ان میں حصہ لے سکتا تھا۔ بعد میں اسی جھیل کا نام جس کے بلوریں پانیوں کے کنارے یہ لوگ آ جمع ہوئے تھے اس نئی عضویت کو دے دیا گیا۔

امریکن، ہندوستانیوں کے برعکس نئے خیالات کو قبول کرنے میں ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ ہر نئی بات انہیں اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے چنانچہ شتاقوا کا طریقۂ تعلیم تمام جمہوریہ میں نہایت سرعت سے پھیلا۔ آج جس قصبے اور جس گاؤں میں جاؤ شتاقوا کی روشنی ہزاروں گھروں کو منور کرتی نظر آتی ہے۔

موجودہ شتاقوا ایک مختلف چیز ہے۔ اس نے اب کتابی اور انفرادی تعلیم کی منزل سے گزر کر ایک سالانہ قومی میلے، خطبات، راگ اور ناٹک کی صورت اختیار کرلی ہے۔ ڈاکٹر سدھندر ابوس اس کے موجودہ مقاصد کو یوں بیان کرتے ہیں۔

"شتاقوا کا ایک باقاعدہ لائحہ عمل تیار کرنا بڑی مشکل بات ہے۔ اس کا مقصد قلب کو وسیع کرنا ہے اور اس لئے اس میں اسفار، ادبیات اور سائنس پر خطبات پڑھے جاتے ہیں۔ پھر زندگی کے لطیف رخ کو بھی اس وقت تک نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جب تک دنیا میں موسیقی، شاعری اور آرٹ کا وجود ہے۔ ہر شخص کے لئے یہاں کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ مذہب، تعلیم، تفریح ان تینوں کا نام شتاقوا ہے۔ لوگ روزانہ زندگی کے بار اور فرائض یک قلم اتار کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں اور شتاقوا میں آ شامل ہوتے ہیں ——— تفکر و تدبر کے لئے، سیر اور نظارے کے لئے، تفریح و تبسم کے لئے اور اس طرح وہ اپنے قلب اور جسم کو سکون دینے اور تازہ دم ہونے کے لئے ایک ہفتہ کی مہلت دیتے ہیں۔"

جدید شتاقوا کے جلسے مسلسل دس روز تک جاری رہتے ہیں۔ صبح سیاسی، مذہبی اور ادبی موضوعات کی تقاریر کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ بچے کھیلتے ہیں۔ تیسرے پہر موسیقی شروع ہوتی ہے اور تمدنی اور بین الاقوامی مسائل پر تقریریں کی جاتی ہیں۔ شیکسپیر کے کھیل، رقص اور دوسری تفریحات رات کے پروگرام میں شامل ہوتی ہیں۔

لیکن امریکہ کے ماہران تعلیم نے محسوس کیا ہے کہ صرف ایک یا دو بڑے بڑے مقامات پر ایسی تقریریں اور نمائشیں کافی نہیں ہیں کیونکہ اس طرح جمہوریہ کا ایک نہایت قلیل تناسب ان میں حصہ لے سکتا ہے۔

سو انہوں نے شتاقوا کو ایک قومی تہوار بنا لیا ہے اور شتاقوا کے ہفتے کے دوران میں اتنے ہی جلسے منعقد ہوتے ہیں جتنے جمہوریہ کے قصبے اور شہر ہیں۔

اس ہفتے سے چند دن پہلے تمام قوم کے سینے جوش و خروش سے لبریز ہو جاتے ہیں۔ لوگ نفیس نفیس لباس پہنتے ہیں۔ مکان، دوکانیں اور سرکاری عمارات قومی جھنڈوں سے مزیّن کی جاتی ہیں۔ جا بجا بڑے بڑے اور چھوٹے اشتہارات لگے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لوگ شتاقوا کے خاص رنگ بٹن اور ٹوپیاں پہنتے ہیں۔ نوجوان موٹروں میں بیٹھ کر ملک کے طول و عرض میں نعرے لگاتے پھرتے ہیں "ہماری شتاقوا!" ہر شہر اور ہر قصبے کے باہر بڑے بڑے خیمے نصب کئے جاتے ہیں۔ شتاقوا کے منتظم اور رہنما آتے ہیں۔ میئر بلد آتا ہے اور ایک برجستہ تقریر میں انہیں شہر کی آزادی کا پیغام دیتا ہے۔ یک بیک ہنسی مذاق، اور تہذیب و تعلیم کے ہفتے کا آغاز ہو جاتا ہے۔ دوکانیں، بنک، ڈاک خانے سب بند ہو جاتے ہیں۔ شہر سنسان ہو جاتا ہے اور سب شتاقوا کے خیموں کی طرف چل دیتے ہیں۔

شتاقوا کے میلوں کو انفرادی شرکتیں منعقد کرتی ہیں۔ در حقیقت یہ ایک عظیم الشان تجارت بن گئی ہے اور خیموں میں داخلہ ٹکٹ کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ شرکتیں بڑا روپیہ کماتی ہیں لیکن ایک اچھی شتاقوا منعقد کرنے کے لئے بھی بڑے روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔

شتاقوا کا سب سے نمایاں پہلو وہاں کی تقاریر ہیں۔ ماہر حکما اور سیاس اور بڑے بڑے خطیب اور پروفیسر شتاقوا کے منبر پر آ کر بولتے ہیں۔ جھوٹی قابلیت کو وہاں کوئی جگہ نہیں ملتی۔

شتاقوا کی تحریک لیاقت اور قابلیت کا ایک بابِ مفتوح ہے۔ اول اول مقرروں کو ان کی محنت کا نہایت قلیل معاوضہ ملتا تھا لیکن اب اس کی مقدار بہت بڑھ گئی ہے۔ مسٹر ولیم جننگ برائن نے صرف ایک تقریر کا معاوضہ ۷۵۰ روپے وصول کئے اور اندازہ کیا گیا ہے اُن کی تقریروں کی سالانہ آمدنی چار لاکھ روپیہ سالانہ تک پہنچ گئی۔

غرض کہ شتاقوا ساری قوم کے لئے ایک دماغی کارنیوال ہے۔ امریکی جمہوریت کی کامیابی زیادہ تر انہیں تعلیمی تحریکوں کی مرہونِ منت ہے

یورپی زاہد

ٹائمز آف انڈیا کا ایک نامہ نگار کہتا ہے کہ شہر یونا میں یورپ کے مسیحی زاہدوں کا ایک گروہ ہے جنہوں نے یہ قسم کھا رکھی

ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کی طرح زندگی بسر کرنے کی کوشش کریں گے، چنانچہ ہر بات میں اُن کے پیشِ نظر حضرتِ مسیح کا نمونہ ہوتا ہے ان کی کوئی جائداد نہیں ہے اور وہ اپنی خدمات کی کوئی تنخواہ نہیں لیتے۔ ان کے اخراجات مشترک ہیں اور وہ معاشرہ کے غریب ترین افراد کے پہلو بہ پہلو رہتے ہیں، اپنے گھروں کا کام خود کرتے ہیں، جھاڑو دیتے ہیں اور کھانا چن لیتے ہیں۔

اس سلسلہ کا نام کرسٹا سیوا سنگ ہے اور اس کے افراد بالکل رومن کیتھلک پادریوں کا سا لباس پہنتے ہیں جو ایک نہایت معمولی کپڑے کا سفید چغہ ہوتا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ وہ ننگے پاؤں چلتے ہیں۔ اس برادری نے جس میں ہندوستانی بھی شامل ہیں اور یہ سب اکٹھے ایک آشرم میں رہتے ہیں ہندوستان میں جنم لیا ہے اور یہی اس کا گھر ہے۔ ان میں کچھ شادی شدہ گھرانے بھی ہیں۔ یہ اُن کے مقاصد کے حامی اور اُن کے کام میں مددگار رہیں لیکن انہوں نے ابھی آخری قسم نہیں اٹھائی۔ ہندوستانی اور یورپی ایک ہی جگہ رہتے سہتے اور اکٹھے عبادت اور خدمت کرتے ہیں۔ سب سے بڑا دنیاوی اعزاز جو اس برادری کے بڑے بڑے ارکان کو ملتا ہے، اور یہ ارکان غیر شادی شدہ ہوتے ہیں، یہ ہے کہ وہ زعفرانی رنگ کا چغہ پہن سکیں جو ایک طویل امیدواری کے بعد عطا ہوتا ہے۔

صحافت اور خواتین

نیشنل انڈین ایسوسی ایشن کے شعبۂ خواتین کا حال ہی میں ایک جلسہ ہرہائی نس لیڈی آغا خاں کے مکان پر ہوا مسٹر ایس جیپن نے "صحافت اور خواتین" کے موضوع پر تقریر کی۔ مسز میک کنزی صدر تھیں۔

یورپ اور امریکا کی موجودہ صحافت پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر جیپن نے بتایا کہ خواتین نے وہاں اخبارات اور رسائل کی پیداوار میں کس طرح حصہ لیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اب تقریباً تمام اخبارات میں بعض خاص باتیں عورتوں کے پسند کی بھی ہوتی ہیں، اور یہ باتیں عورتوں کے لئے عورتوں کی جمع کی ہوئی اور لکھی ہوئی ہوتی ہیں جو صحافت کے تقریباً ہر شعبہ میں پہنچ چکی ہیں۔ یہاں تک کہ اشتہارات بھی ایسی وضع و ترکیب سے شائع کئے جاتے ہیں کہ وہ گھر کی مالکہ اور مصارف کی مختار کو مسحور کر سکیں۔ ہندوستان کی ترقی کے ساتھ بھی ایسی مطبوعات کی مانگ بڑھ جائے گی جو خواتین کے لئے دلچسپی کا باعث ہونگی، جو امریکا اور یورپ کی مطبوعات سے سبقت لے جائیں گی۔ اور اگلے دس بیس سال میں ہم دیکھیں گے کہ ہندوستان کے زنانہ رسائل مغرب میں مقبول ہو رہے ہیں۔ اگر ہندوستان کی صحافت میں خواتین نے اپنا دخل پیدا کر لیا جیسا کہ انہوں نے مغرب میں کیا ہے تو مجھے یقین ہے کہ اس کے اثرات ترقی و تہذیب کے لئے ممد و معاون ثابت ہونگے۔

داستان گو
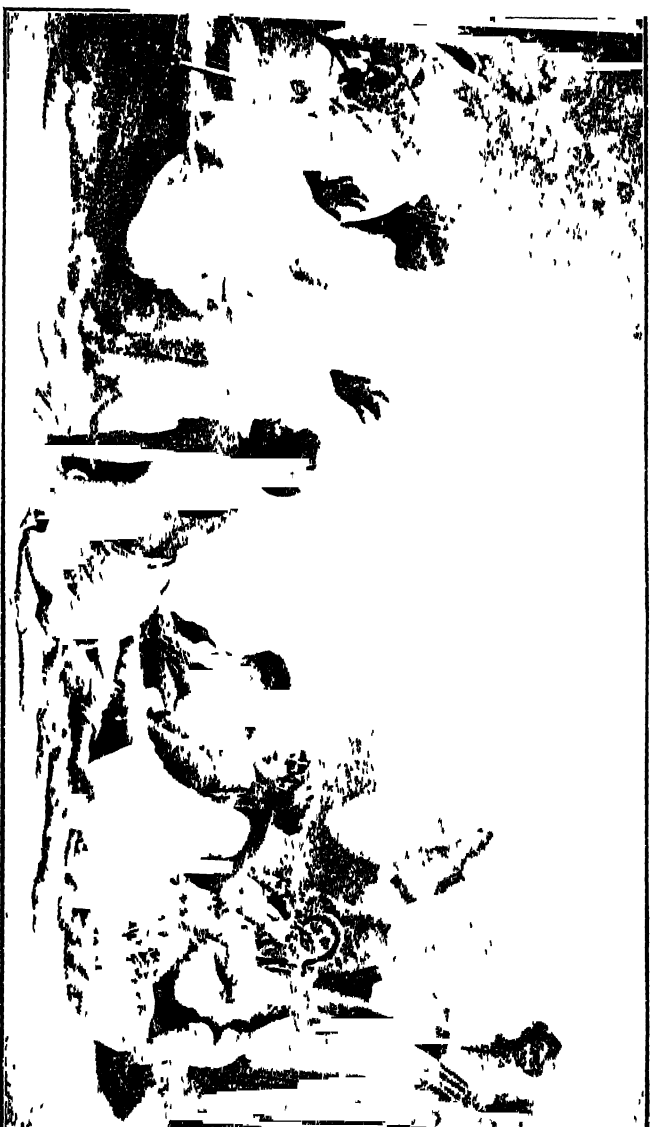
افسانہ

لہانی کسی ایزدی نغمے کی طرح نرم رو ہے ——— ہومر

ں کہانی ایسی ہے جو بچوں کو کھیل سے اور بڑوں کو آرام سے روکے رکھتی ہے ——— سر فلپ سڈنی

نان کبھی پرانی نہ ہوگی ——— ہنری فیلڈنگ

ت کے رخ سے میں نقاب نہیں اٹھا سکتا،
نہیں افسانہ سناتا ہوں کہ میں نے خود اسے یوں ہی سنا ہے ——— سر والٹر سکاٹ

ادب کی شاعری ہے ——— مادام نیکر

شاعری اور مصوری کا نچوڑ ہے ——— ڈرائیڈن

م دل کو خوش کرنے کے لئے کہانی سچی معلوم ہونی چاہئے
ل، دلچسپ، مختصر اور انوکھی بھی ہونی چاہئے۔
ب کبھی وہ ان قوانین سے انحراف کرتی ہے،
ند سو جاتے ہیں اور بیوقوفوں کو واہ واہ کے لئے چھوڑ دیتے ہیں ——— سٹلنگ فلیٹ

وہ کہانی سنانے سے نفرت ہے جو ایک مرتبہ کہی جا چکی ہو ——— ہومر

منصور احمد

یہ دلچسپ مضمون فرانسیسی مستشرق کرادے وو (Carra de Vaux) کی کتاب "مفکّرینِ اسلام" (Les Penseurs de l'Islam) جلد اول (ص ۶۷-۷۴) سے رسالہ ہمایوں کے لئے براہِ راست فرانسیسی زبان سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ اسی کتاب سے ہم قبل ازیں چند مضامین رسالہ اردو میں خیام، عطار، سعدی اور حافظ کے متعلق شائع کرا چکے ہیں +

"تاریخِ عالم کی بعض شخصیتیں اپنی عظمت و خوبی کے لحاظ سے ہمیشہ مورخین کی جاذبِ نظر اور غور و بحث کا مرکز رہیں گی۔ ہندوستان کی تاریخ میں بادشاہوں میں بلاشبہ یہ رتبہ ہندو عہد میں "اشوک" کو اور اسلامی عہد میں اکبر کو حاصل ہے +

کرادے وو نے اکبر کو مفکرین کی جماعت میں شمار کیا ہے، اور زیادہ تر اسی نقطۂ نظر سے اُس کی سیرت سے بحث کی ہے۔ اکبر کے متعلق بے شمار اہلِ قلم اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کر چکے ہیں، لیکن کرادے وو کا یہ مختصر مطالعہ بھی خالی از جدت و لطف نہیں ہے

(سید حسن برنی)

باعظمت مغلوں میں سب سے عظیم الشان اکبر، جس نے ۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء تک سلطنت کی، فی الواقع ایک مفکّر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس نے اپنی سلطنت کے مختلف اقوام و مذاہب کو ایک حکومت اور تقریباً ایک ہی مذہب کے تحت میں لانے کے مسئلہ پر غور کیا تھا۔ اس کام کی دشواری بہت بڑی تھی، جس کا اندازہ وہ لوگ بخوبی کر سکتے ہیں جو اس امر سے واقف ہیں کہ ہندوستان میں نسل اور ذات کے تعصبات کس قدر قوت رکھتے ہیں۔ اکبر نوجوانی ہی سے اس مسئلہ کے مذہبی پہلو میں نہایت دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ تقریباً ہمارے زمانہ کے تھیاسوفی اور جدید عیسائی (Neo-Christians) جماعت کی طرح مذاہب کی تالیف یا کم از کم اتحاد کا خواب دیکھتا تھا، جس میں مختلف ملّتیں ایک وسیع و بلند تصور کے ماتحت جمع ہو جائیں۔ اس غرض سے اُس نے ایک قسم کی مذہبی مجلس قائم کر رکھی تھی۔ اپنے مستقر فتح پور سیکری میں، جو عمارات کے بہترین نمونوں سے پُر ہے، اُس نے مختلف فرقوں کے نمائندوں کو بلایا، اور اپنے سامنے مباحثے کرائے۔ اُس نے یسوعی فرقہ (Jesuites) کے عیسائیوں کو بلا کر انہیں اپنے مذہب کے لئے ایک چھوٹا

سا گرجا بنانے کی اجازت دی۔ اب بھی وہ کمرہ موجود ہے جس کے وسط میں ایک ستون اور گوشوں سے آکر اُس
ستون پر مل جانے والی گیلریاں ہیں، جہاں یہ مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں۔ اس کا نام "عبادت خانہ" تھا۔ مقررین
نہایت آزادی سے تقریریں کرتے تھے۔ ایک سیرت نگار کا بیان ہے کہ بادشاہ یہاں متشکک ہو گیا۔ اکبر نے ان مجالس
شبینہ پر اکتفا نہیں کی۔ وہ صبح اُٹھ کر دیر تک تنہائی میں عام مسائل زندگی اور خاص فرائض شاہی پر غور کیا کرتا تھا۔

اکبر کا مخصوص مذہب، جو کہ ایک طرح کا مختلف خیالات سے انتخاب کیا ہوا[۵] "ہمہ اوستی مسلک"
(Pantheisme Eclectique) ہے بہت کم کامیاب ہوا۔ اُسے صرف ایک درجن متبعین نصیب ہوئے
جو گھر ہی کے لوگ تھے، اور کوئی فرقہ قائم نہ ہو سکا۔ ہندوستانی اسلام کو البتہ اس منصوبہ سے نقصان پہنچا۔ کلمۂ
شہادت سکہ اور خطبہ سے نکال دیا گیا، بچوں کے نام پیغمبر کے نام پر نہیں رکھے جاتے تھے۔ مسجدیں خالی ہو گئیں
اور بعض میں فوجیوں کے لئے بارکیں بنا دی گئیں۔ مذہب اسلام کے احکام کے خلاف جو زندہ چیزوں کی تصاویر
ممنوع قرار دیتے ہیں، اکبر نے اپنے محل میں ایسے مناظر جو عیسائی اور بدھ مذہب کی روایات سے ماخوذ تھے، نقش
کرائے۔ الیکساندر سیویر (Alexandre Severe) کا بیان ہے کہ اُس نے یسوع اور بدھ کی مورتیں اپنے
کمرہ میں رکھ چھوڑی تھیں۔ سول حکومت میں رواداری و ائتلاف کا اصول زیادہ کامیاب ثابت ہوا۔ اکبر کے

---

۵ اکبر کی لامذہبی اور بدعات کے متعلق یورپین مصنفین بالعموم مبالغہ سے کام لیتے، اور اکثر ناواقفیت یا غلط فہمی کا شکار
ہو جاتے ہیں۔ اکبر کا مذہب طویل اور گہری بحث کا محتاج ہے جس کے لئے اس وقت موقع نہیں ہے، لیکن اتنا بتا دینا
ضروری ہے کہ اکبر کی زندگی میں مختلف مذہبی دور گزرے ہیں۔ ابتداءً وہ ہندوستانی معیار سے (اور یہ یاد رکھنا چاہئے کہ
یہ معیار چنداں بلند نہ تھا) پکا مسلمان مانا جاتا تھا۔ ابوالفضل اور فیضی کے اثر سے اکبر کے خیالات میں تغیر پیدا ہوا۔ ایک
زمانہ آزاد مشربی، تشکک اور ہمہ اوستی و ہمہ دوستی میں گزرا۔ لیکن خود اکبر اور اُس کے مذہبی مرشد و معلم ابوالفضل اور
فیضی اسلام کی بندش سے کبھی آزاد نہیں ہوئے، بالخصوص اسلامی تصوف کا ان پر نہایت زبردست اثر رہا۔ اسلامی تصوف
کی وسیع مشربی ہی کے تحت میں وہ تمام دنیا کے مذاہب کا خیر مقدم کرتے رہے۔ ابوالفضل فیضی اور اکبر ہندوستانی مسلمانوں
(مثلاً تنگ دل مگر باستثنا ملا عبدالقادر) کی نظروں میں ہمیشہ مطعون رہے، اور انہیں لوگوں کے مبالغہ آمیز بیانات نے
بعد کے مورخوں میں بہت کچھ غلط فہمیاں پیدا کر دیں۔ یورپین مورخوں نے اپنی تخیل کی مدد سے اور بھی رنگ آمیزیاں کیں،
جس کی وجہ سے اکبر کی سیرت کے بیان میں صداقت سے انحراف ہو جاتا ہے۔ اخیر عمر میں اکبر کے خیالات میں ردعمل ہو
گیا تھا، اور اُس کی موت یقینی طور پر ایک مسلمان کی حیثیت سے ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اکبر (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر دیکھئے)

دوش بدوش اس اصول کی تعلیم اُس کے وزیر اور دوست ابوالفضل نے بھی دی جس کا ہم آگے چل کر ذکر کریں گے۔

انتظامِ سلطنت میں اکبر نے ایک سابق غیر مغل پادشاہ شیر شاہ کے کام کو جاری رکھا۔ کچھ ہی عرصہ پیشتر اُس پادشاہ نے ہندوستان میں نہایت دانشمندی کے ساتھ سلطنت کی تھی۔ وہ مغلوں کا دشمن تھا۔ خراج شاہی زیادہ عدل کے ساتھ قائم کیا گیا اور مالگذاری مقرر کرنے میں اور ٹکسوں کی نگرانی میں زیادہ انصاف برتا گیا۔ وہی اصول اب تک چلے آتے ہیں۔ ایک راجہ کی لڑکی سے عقد کرتے وقت اکبر نے دو ٹکس جو ہندوؤں کی دل آزاری کا موجب تھے معاف کر دیئے۔ ایک تو وہ ٹیکس جو اُن جاتریوں کو دینا پڑتا تھا جو جاترا کے لئے برہمنوں کے تیرتھ کی جگہوں پر جاتے تھے، اور دوسرا ٹیکس جزیہ تھا، جو اسلامی فقہ کی رُو سے غیر مسلموں کو دینا پڑتا تھا۔ اکبر نے مقامی سکوں کے مسئلہ پر بھی توجہ کی۔ اُس نے مقامی سکّوں کو ممنوع قرار دیا، مروجہ سکّوں میں اصلاحیں کیں، اور رائج الوقت سکوں کی قیمتیں قائم کیں۔ اخلاقی حیثیت سے اُس نے جنگی قیدیوں پر سختی کرنے کی ممانعت کی اور اپنے ایک رضاعی بھائی کو جو مجرم تھا اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا۔ اُس نے ستی کی رسم کو خلافِ قانون قرار دیا۔

اکبر کا ایک دوسرا بڑا کارگذار ملازم، سپہ سالار ٹوڈرمل تھا، جو ایک لائق فوجی افسر اور ایک ممتاز ماہر سیاست تھا۔ اُس نے اس عہد کے انتظامی کام میں بڑا حصہ لیا۔ باغی راجاؤں کے خلاف مسلسل فوج کشیوں کے دوران میں جن میں وہ ہمیشہ کامیاب رہا، اس نے ایک سلسلہ ایسے مالی انتظامات کا سرانجام دیا، جو کہ بہترین ماہر مالیات ہی کا حصہ ہو سکتی ہیں۔ اُس نے املاک کی ایک صحیح فہرست بنائی، جور و تشدد کی دادرسی کے لئے سہولتیں نکالیں بندوبست انیس برس تک کے لئے کیا، اس کا خیال رکھا کہ اس دوران میں لٹیرے یا مقامی عہدہ دار دست اندازی نہ کر سکیں، بعض چھوٹے عہدہ دار کم کئے، کاشتکاروں کے لئے نقد اور غلہ کی تقاوی مقرر کی، محصّلوں کو ہر سال حساب پیش کرنے کا حکم دیا اور حساب خزانچی کو دیا جاتا تھا۔ مصائب مثلاً ژالہ باری و طغیانی کی فوری اطلاع کی جاتی تھی۔ تحصیل سال میں چار مرتبہ ہوتی تھی۔ یہ ہیں وہ خاص خاص انتظامات جن کا نفاذ گویا کسی زمانۂ

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) اسلام سے کبھی دست بردار یا بے تعلق نہیں ہوا۔ اسی وسیع مشربی کے زمانہ میں جب کہ فتح پور سیکری میں عبادت خانہ تعمیر ہو رہا تھا فتح پور سیکری کی شاہی مسجد بھی بنائی جا رہی تھی جو اکبر کے عہد کی بہترین عمارت ہے۔ حکومت کا اسلامی نظام (قاضی، مفتی، امام خطیب) برابر قائم رہا۔ بجز اس کے کہ دربار کے چند آدمیوں کے خیالات میں ہیجان ہوا، ہندوستان کے اسلام پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ تصاویر کا رواج عمارات وغیرہ میں پہلے سے بھی تھا۔

حال کے دماغ نے کیا تھا۔

انتظامات ملکی کی عمدگی کے ساتھ ہی اکبر کا عہد فنون کی ترقی کے لئے ممتاز ہے۔ شمالی ہند میں عالی شان تعمیرات موجود ہیں جو اکبر نے بنوائی تھیں۔ آگرہ کا قلعہ جواب بھی ہمارے سامنے موجود ہے، اسی کا بنوایا ہوا ہے۔ اکبر نے صنائع کی طرف بھی خاص التفات کیا۔ آئینِ اکبری میں لکھا ہے کہ اُس نے توپوں کو بہتر بنایا، ایک نئی قسم کی گاڑی ایجاد کی اور ایک ڈنڈا توپوں کے صاف کرنے کے لئے بنوایا۔

سلطان جہانگیر نے جو اکبر کا بیٹا اور جانشین اور خود بھی ایک ممتاز شخصیت تھا، ایک تزک یا روزنامچہ چھوڑا ہے، جس کا طرزِ تحریر عالی، سہل و درخشاں ہے۔ اس کتاب میں اکبر کی سیرت اور اُس کے خیالات کے جاننے کے لئے بعض قیمتی مقامات ہیں۔ جہانگیر ابتدا ً آگرہ میں اپنے باپ کے بعد اپنے تخت پر بیٹھنے کا حال لکھتا ہے اُس نے ایک سکہ چلایا، جس کا مضمون یہ تھا:۔

"اسے آگرہ میں مسکوک کیا۔ خسروِ عالم، محافظِ دنیا، پادشاہِ نور الدین جہانگیر بن شاہِ اکبر نے"

وہ لکھتا ہے:۔

"اس موقع پر میں نے اُس تخت کا استعمال کیا جو میرے والد نے بنوایا تھا، اور جس کی آرائش ایسے شاندار طریقہ پر کی گئی تھی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ میں نے سالِ نو کا جشن منایا اُس وقت آفتاب برج حمل میں تھا۔

اکبر نے ایک نیا سنہ ایجاد کیا تھا، جو کہ اعتدالِ ربیعی سے شروع ہوتا ہے۔ وہ آگ اور سورج کی تعظیم کرتا تھا۔ ابو الفضل لکھتا ہے "پادشاہ کا خیال ہے کہ آگ اور روشنی کی تعظیم کرنا ایک مذہبی فرض ہے"

جہانگیر نے بعض ایسے واقعات لکھے ہیں جن سے اکبر کی رواداری کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ علاوہ بعض دیگر امور کے وہ ایک یہ واقعہ لکھتا ہے کہ اکبر کی زندگی میں راجہ مان سنگھ نے ایک مندر تعمیر کرایا، جس پر پانچ کروڑ چالیس لاکھ روپیہ صرف ہوا! خاص بت کے سر پر ایک تاج تھا جس میں جواہرات جن کی قیمت کل مصارف کا بارھواں حصہ ہوتی تھی لگے ہوئے تھے۔ اس بت کے گرداگرد اور بت بھی تھے جو سونے سے بنائے گئے اور مرصع تاج پہنے ہوئے تھے جہانگیر نے اکبر سے پوچھا کہ آپ ان بت پرستی کی کارروائیوں کو کیوں نہیں روکتے۔ اکبر نے جواب دیا "اے میرے عزیز بیٹے! میں جانتا ہوں کہ میں ایک نہایت طاقتور بادشاہ ہوں اور دنیا میں خدا کا سایہ۔ میں دیکھتا ہوں کہ خدا کی رحمتیں تمام مخلوق پر بلا امتیاز نازل ہوتی ہیں۔ میں اپنے عالی رتبہ کے فرائض میں کوتاہی کروں گا اگر میں اپنی مرحمت و نوازش کو اُن لوگوں سے جو میری حمایت میں ہیں دریغ رکھوں گا۔ میں تمام انسانی اقوام، تمام خدا کی مخلوق کے ساتھ صلح کر چکا ہوں۔ پس میں کس طرح روا رکھ سکتا ہوں کہ ایک دوسرے کو ستائے یا دست درازی کرے؟"

جہانگیر کا بیان ہے کہ جوانی میں اکبر لذائذِ دہن سے مستغنی نہیں تھا لیکن وہ ہمیشہ خدا کی برتر قوت کا ایسا مخلصانہ و منکسرانہ احساس رکھتا تھا کہ باوجود زبردست افواج، بے شمار مہیب جنگی ہاتھیوں، بے نظیر خزائن اور عظیم الشان سلطنت کے جس کی شان پر فوقیت نہیں دے جا سکتی، مالک ہونے کے وہ کبھی اُس بے زوال ہستی کو فراموش نہیں کرتا تھا جس کی وہ عبادت کرتا تھا۔ ہمیشہ یہ الفاظ اُس کی زبان پر رہتے تھے۔

"ہر حال میں اور ہمیشہ تمام انسانوں کے ساتھ صلح رکھ اور ہر حال میں پوشیدہ طور پر اپنی آنکھیں اور اپنا دل اپنے رفیقِ ازلی کی طرف رکھ۔" اُس کی سیرت کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ تمام مذاہب کے ساتھ کامل دوستی رکھتا اور جب موقع ملتا ہر جماعت کے نیک اور روشن دل بزرگوں کی صحبت اختیار کرتا تھا۔"

اکبر فی الواقع ہمارے زمانہ کے تھیاسوفی خیالات کے بانیوں میں سے ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا طرزِ عمل، اُس کا نقطۂ خیال حتیٰ کہ اُس کے الفاظ دوبارہ لے لئے گئے ہیں۔ اُس نے مختلف مذاہب کے ایسے جذبات کو جو کہ پاکیزہ و عالی معلوم ہوئے منتخب کر لیا تھا، لیکن عقاید کے متعلق وہ مشکک تھا اور ایسے بیرونی مراسم کی جو اسے نامناسب معلوم ہوتے تھے کھلی ہوئی مخالفت کرتا تھا مثلاً اسلام کی رسومِ ختنہ اور کتّوں کا ناپاک سمجھا جانا اور ہندوؤں کی رسم ستی۔ بلا شبہ اکبر دنیا کی ان بڑی ہستیوں میں سے ہے جو مذہبی خیالات کے میدان میں پیدا ہوئیں۔ جو خیالات اُس نے ہندوستان میں آج سے تین سو برس پہلے ظاہر کئے تھے وہ ہمارے زمانہ میں بھی ہمیں نئے معلوم ہوتے ہیں۔

اکبر کا مقبرہ سکندرہ میں ہے۔ جہانگیر کا بیان ہے کہ اکبر میانہ قامت سنہرہ رنگ، سیاہ ابرو، سیاہ چشم تھا۔ اُس کا جسم "شیر کا" تھا، سر بڑا، بازو اور ہاتھ لمبے تھے۔ اُس کی آواز بلند تھی۔ اُس کا اندازِ گفتگو اور اطوار و عادات نہایت شائستہ اور ممتاز تھے۔ ہندوستان کی آبادی نے اُس کی یاد کو محفوظ رکھا ہے ہندوؤں کی قومی شاعری نے اُس کے کام کی وسعت، اُس کی بہادری، اُس کی عالی ظرفی اور اُس حمایت کو جو اُس نے اُن کی قوم کے ساتھ دکھائی پیشِ نظر رکھتے ہوئے بطور اپنے ملک کے ایک سربرآوردہ سورما کے اُسے زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔

سید حسن برنی

پیرانِ سالوس

(۱)

مجرم ہیں، ہمیں سزائیں دینے والے
طوفاں ہیں، خود سفینے کھینے والے
واللہ کہ اس وبا میں بندوں کے لیے
ظاہر میں خدا کا نام لینے والے

(۲)

ایماں جو حسینوں پہ نثار کرتے ہیں
شغلِ دل و دلبری بپا کرتے ہیں
پیچیگر دلوں سے غافل ہو کر
جیبوں کو مریدوں کی تہی کرتے ہیں

(۳)

نیکی کی ہمیں راہ بتاتے رہیے
اللہ سے ہر وقت ڈراتے رہیے
تسبیح کی گردشوں میں رہیے مصروف
اور شوق سے مالِ غیر کھاتے رہیے

(۴)

وہ رشتۂ تسبیح ہیں، ہم پھندے ہیں
ہر ایک وہ بری کار ہیں، ہم گندے ہیں
دیکھو وہ نکل آئے ہیں مسجد سے شیخ جی
گویا وہ خدا ہیں اور ہم بندے ہیں

جوش ملیح آبادی

طنزیہ شاعری

سب جانتے ہیں کہ ہماری شاعری کا جزوِ اعظم ہمیشہ سے غزل رہی ہے۔ غزل کے لغوی معنی ہیں حدیثِ عشق بازناں۔ اس اعتبار سے غزل یا تغزل کی بنیاد جن مضامین پر ہے وہ عموماً وصفِ معشوق، آرزوئے وصال، شکایتِ فراق، رشکِ رقیب، مذمتِ ناصح، زارنالی، شکوۂ چرخ، طنز و تعریض، چھیڑ چھاڑ وغیرہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اگرچہ متاخرین نے غزل کو اس قدر ہمہ گیر و وسیع بنا دیا کہ تصوف، فلسفہ، اخلاق غرض کوئی مبحث ایسا نہ تھا جو تنگنائے غزل میں داخل نہ ہو گیا ہو، مگر قدما نے غزل کو اُس کے حدود سے متجاوز نہ ہونے دیا اور خلطِ مبحث سے اجتناب کیا۔ یہ فارسی شاعری کا حال تھا۔ اردو شاعری کے عروج کا زمانہ فارسی شاعری کے انحطاط کا دور تھا۔ اس لئے شعرائے اردو کے سامنے جو نمونہ تھا وہ فارسی کے شعرائے متاخرین کا کلام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شعرا کی غزلوں میں (بہ استثنائے بعض) متقدمین شعرائے فارسی کی سادگی، اثر، جوش، صدقِ جذبات کم نظر آتا ہے اور تصنع اور تکلف زیادہ۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ یہ امر فی نفسہٖ اچھا تھا یا بُرا۔ مگر کم از کم غزل میں تغزل کی شان باقی نہیں رہی۔

تغزل کے اجزائے ترکیبی میں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ایک چیز طنز و تعریض بھی ہے جو اردو شعرا کے کلام میں شاذ و نادر نظر آتی ہے۔ اس مختصر مضمون میں ہم اسی موضوع پر بحث کرنی چاہتے ہیں۔

طنز (طعنہ دینا) اور تعریض (کنایہ میں بات کہنا) کا مقصد کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ مخالف کو جلی کٹی سنا کر دل کا بخار نکالا جائے اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ اشتعال دے کر اپنی مطلب برآری کی جائے۔ کلام میں تعریض سے کام لینا ایک طرف تو شاعر کی نازک خیالی کی دلیل ہے۔ دوسری طرف اُس کی قدرتِ زبان کا ثبوت۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے اساتذۂ اردو میں مومن خاں سے زیادہ طنز کا استعمال کسی نے نہیں کیا۔ یہ منجملہ اُن چند خصوصیاتِ شاعری کے ہے جن میں وہ منفرد اور اپنے دوسرے معاصرین سے ممتاز ہیں۔ چونکہ اُن کے کلام پر رائے لکھنے والوں نے بیشتر اس پہلو کو نظرانداز کر دیا ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان اوراق میں مومن کی اس خصوصیت پر اجمالی تبصرہ کیا جائے۔

مومن کو قدرت نے غیر معمولی دماغ عطا کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کبھی روشِ عام پر چلنا پسند نہ کیا۔

نزاکتِ خیال اور ندرتِ اسلوب میں اُن کے ہم عصروں میں صرف غالب اُن کے شریک کہے جاسکتے ہیں اگرچہ شریکِ غالب نہیں ۔ مومن کی غزل حقیقی معنے میں غزل ہوتی ہے ۔ اور تغزل کی محدود جولانگاہ کے باوجود ان کی نادرہ کار طبیعت اس میں وہ نقش آرائیاں کرتی ہے کہ نگارخانۂ چین کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے خیر یہ بحث تو کسی آیندہ فرصت پر اٹھا رکھنی چاہئے، اس وقت ان کے طنزیہ اشعار سے غرض ہے ۔

ملحوظ رہے کہ طنز میں کبھی متکلم حقیقت کو مستہزیانہ انداز میں شکایتًا پیش کرتا ہے اور کبھی امرِ غیر حقیقی کو غیرت دلانے کی نیت سے بطورِ حقیقت بیان کرتا ہے ۔ ذیل کے اشعار سے طنز کا اندازہ ہوگا

محبوب نے آکر عاشقِ بیمار کو قتل کر دیا ہے ۔ شاعر اس پر یوں چٹکی لیتا ہے ۔

غیر عیادت سے بُرا مانتے ۔۔۔ قتل کیا آن کے اچھا کیا

معشوق نے عاشق پر اتنے ستم کئے کہ اب آسمان کو بھی رحم آنے لگا ۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر تم اس قدر ظلم نہ کرتے تو چرخِ بے مہر کو ہرگز رحم نہ آتا ۔ اب گویا تمہارا ستم کرم ہوگیا ۔

رحم فلک اور مرے حال پر ۔۔۔ تو نے کرم اے ستم آرا کیا

لوگ کہتے ہیں کہ اُس (معشوق) نے عاشق کو خاک میں ملا دیا ۔ مومن کو اس سے انکار ہے ۔ دیکھنا کس مزے سے انکار کیا ہے جس میں ہزار طعن و طنز پنہاں ہیں ۔ لکھتے ہیں ۔

مٹی نہ دی مزار تلک آکے اُس پہ بھی ۔۔۔ کہتے ہیں لوگ خاک میں اُس نے ملا دیا

ناصح نے کہیں کہہ دیا تھا کہ عشق کا انجامِ کار وصال ہے ۔ مومن وصال کے لفظ سے خاص فائدہ لیتے ہیں ملاحظہ ہو ۔

فرماتے ہیں وصال ہے انجامِ کارِ عشق ۔۔۔ کیا ناصحِ شفیق نے مژدہ سنا دیا

دوسرا شعر اور سنئے،

نامِ وصال سنتے ہی ہوتا ہے مضطرب ۔۔۔ کیونکر کہوں اسے مرے مرنے کا غم نہیں

رقیب اپنے لئے عمرِ دراز کی دعا مانگ رہے ہیں ۔ شاعر اپنے تجربہ کے مطابق عمرِ دراز کو طولِ زمانۂ ہجر کا مترادف سمجھتا ہے اور کہتا ہے ۔

عمرِ دراز کی ہے رقیبوں کو آرزو ۔۔۔ دیکھو زمانِ ہجر کے امیدوار ہیں

شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ میرا حال اس قدر زار ہے کہ سنگدل آدمی کے سوا دوسرا سننے کی تاب نہیں لا سکتا

سنگدل یا رقیب ہوسکتا ہے یا معشوق۔ مگر اس بات کو صاف صاف نہیں کہتا بلکہ تعریض سے کام لیتا ہے۔ ملاحظہ ہو

سنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں — کہ سخت چاہئے دل اپنے رازداں کیلئے

عاشق نے اتفاق سے ایک دن ناصح کی گفتگو کان دھر کر سن لی۔ چونکہ دورانِ گفتگو میں معشوق کا ذکر آتا تھا جی لگ گیا۔ اس واقعہ کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔

کیا جی لگا ہے تذکرۂ یار ہیں، عبث — ناصح سے مجھ کو آج تلک اجتناب تھا

گویا قولِ ناصح صرف اس لئے قابلِ سماعت ہے کہ اس ہیں کہیں کہیں تذکرۂ یار آجاتا ہے۔ چارہ گر جوشِ جنوں کا علاج کرنا چاہتا ہے۔ عاشق اس از خود رفتگی کے عالم ہیں بھی کس مزے سے چٹکی لیتا ہے۔

کر علاجِ جوشِ وحشت چارہ گر — لادے اک جنگل مجھے بازار سے

یعنی جس طرح بازار ہیں جنگل کی جستجو جنون ہے اسی طرح میرے جوشِ وحشت کا علاج بھی دیوانگی ہے۔ معشوق کی نظرِ التفات رقیب کی جانب دیکھ کر عاشق رسم وراہِ الفت ترک کر دیتا ہے۔ اتفاق سے کہیں ملاقات ہوتی ہے محبوب رشکِ دشمن کا عذر تسلیم نہیں کرتا۔ اس پر عاشق کہتا ہے۔

رشکِ دشمن بہانہ تھا سچ ہے — میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

غرض معمولی تفحص سے مومن کے اشعار کا معتد بہ حصہ ایسا ملے گا جس ہیں نہایت لطیف نوک جھوک یا چھیڑ چھاڑ سے کام لیا گیا ہے۔ ذیل ہیں اسی رنگ کے چند شعر اور ملاحظہ ہوں جن کی تشریح کرتے ہوئے یہ ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں اُن کی لطافت کا خون نہ ہو جائے اس لئے یوں ہی نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

کیا پسند آئی اپنی جور کشی — چرخ کے انتخاب نے مارا

جو پھر جائے اُس بے وفا سے تو جانوں — کہ دل پر نہیں زور چلتا کسی کا

کس دن تھی اُس کے دل ہیں محبت جو اب نہیں — سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

دیکھ مضطر کیوں نہ پھیرے دشنہ پھر — یار ہے وہ کچھ تماشائی نہیں

شبِ ہجر ہیں کیا ہجومِ بلا ہے — زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شبِ فراق — ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں

ہم حال کسے جائیں کے سنئے کہ نہ سنئے — اتنا تو یہاں صحبتِ ناصح کا اثر ہے

کیا رحم کھا کے غیر نے دی تھی دعائے وصل — ظالم کہاں وگرنہ اثر میری آہ میں

طنز و تعریض سے ملتی ہوئی ایک اور طرزِ سخن ہے جس میں کوئی استاد مومن کے قریب کیا معنی ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا۔ یعنی اس رنگ کے بھی وہی بلا شرکتِ غیرے مالک ہیں۔ میں اس طرز کو مکرِ شاعرانہ سے تعبیر کرتا ہوں۔ اس مکر سے مراد یہ ہے کہ مومن اپنے مقصود کو اس طریقہ سے بیان کرتے ہیں کہ مخاطب سمجھتا ہے کہ اس میں مومن کا نہیں بلکہ خود میرا فائدہ ہے۔ اس اعتبار سے طنز و مکر ایک حد تک متحد المقصد ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ شاعر پیچ سے اپنا مطلب نکالنا چاہتا ہے۔ چونکہ مومن کا تغزل حقیقی تغزل اور اُن کا عشق وارداتِ قلب کا آئینہ ہے اس لئے یہ شوخی اور بھی پُر لطف اور یہ شراب اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔

شاعر کی یہ عین تمنا ہے کہ محبوب اُس کی طرف ملتفت ہو مگر وہ کیوں ہونے لگا۔ اس لئے اپنی خواہش کو اس بہانہ سے بیان کرتا ہے۔

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا — میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

یعنی قصداً مجھ سے اجتناب کرو گے تو غیر تاڑ جائیں گے کہ "کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے" دیکھنا اس شعر میں کس طرح محبوب کو اشتعال دلا رہے ہیں۔

شعلۂ دل کو نازِ تابش ہے — اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا

یعنی میرے شعلۂ دل کو چمک کا دعویٰ ہے، تم اگر جلوۂ رخ دکھاؤ تو اس کا غرور مٹے۔ اسی طرح ایک شعر میں مہر (سورج) کو غیرت دلاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

اس منہ پہ اُس سے دعوئ حسن، اک ذرا نہیں — اے مہر روشنی مرے روزِ سیاہ میں

یعنی اگر تو میرے روزِ سیاہ (بدنصیبی) کو روشنی سے مبدل کر سکے تو دعوائے حسن کرنا بھی تجھے زیب دے۔

اگر محبوب سے عرضِ وصال کرتے ہیں تو حصولِ تمنا معلوم۔ اس لئے دعوتِ ستم دیتے ہیں اور اس حیلہ سے مطلب برآری چاہتے ہیں۔

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں — اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

چونکہ عادت کے خلاف ہر بات تکلیف دیتی ہے، اس لئے اگر مجھے تکلیف دینا مقصود ہے تو وصل سے بہتر ستم اور وصل سے بڑھ کر ایذا میرے حق میں اَور کیا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ سہتے سہتے ہجر میں اب اذیت نہیں رہی اثر کو شاعر کی دعا سے دشمنی ہے، اس لئے شاعر نے ارادہ کیا ہے کہ آیندہ سے ہم ہجر کی دعا مانگا کریں گے تاکہ جو مانگیں اُس کے خلاف ملے۔

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

مرزا غالب نے بھی اسی مضمون کو باندھا ہے مگر بندش ذرا سست اور انداز غیر شاعرانہ ہو گیا ہے۔

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے (غالب)

اس رنگ کے اشعار مومن کے کلیات میں بکثرت ملتے ہیں۔ بخوفِ طوالت فرداً فرداً ہر شعر کی توضیح سے قطعِ نظر کر کے چند اَور اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔ یقین ہے کہ قارئینِ کرام اس امر میں ہم سے متفق ہونگے کہ یہ شوخ رنگ دوسرے اساتذہ کے کلام میں کہیں نہیں ملتا۔

مت رکھیو گرد تارکِ عشاق پر قدم پامال ہو نہ جائے سرافراز دیکھنا

بے جرم پائمال عدو کو کیا گیا مجھ کو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں

لذتِ جور کشی نے مجھے شرمندہ کیا طعنے کیا کیا اُسے اربابِ ستم دیتے ہیں

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

ہجرِ بتاں میں تجھ کو ہے مومن تلاشِ زہر غم پر حرام خوار توکّل نہ ہو سکا

خارِ بستر پہ شبِ ہجر بچھاؤں کیونکر دل میں تو ہے وہ گل اندام اگر بر میں نہیں

جلایا آتشِ ہجراں نے دل کو ترے گھر میں لگی لے بے خبر آگ

خو رنج شکِ غیر کی بھی ہم کو ہو گئی اب اَور کچھ نکالئے آزار کی طرح

رحم کر خصمِ جانِ غیر نہ ہو سب کا دل ایک سا نہیں ہوتا

درباں کو آنے دینے پہ میرے نہ کیجے قتل ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا

گر ذکرِ وفا سے یہی غصہ ہے تو اب سے گو قتل کا وعدہ ہو تقاضا نہ کریں گے

نوک جھوک کرنے اور جلی کٹی سنانے کے لئے شعرا نے واسوخت یا واسوز کا میدان تلاش کیا ہے اِس کی ایجاد کا سہرا متاخرینِ شعرائے عجم کے سر ہے۔ اساتذۂ اردو نے بھی اس رنگ میں بہت کچھ دادِ سخن دی ہے اور تمام طعن و تشنیع کی قوت اسی محدود موضوع پر صرف کی ہے۔ مومن جو عملاً عشق (یا ہوس) کی وادیوں میں مدتوں سرگشتہ رہے ہیں کیونکر دوسروں سے پیچھے رہتے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اُن کے واسوختوں نے اصلاً واسوخت کے منشائے ایجاد کو پورا کر دیا۔ پر واسوخت تو درکنار، اُن کی بعض غزلوں پر بھی واسوخت کا دھوکا ہوتا ہے۔ ہم یہاں ان غزلوں کے چند اشعار درج کرتے ہیں اور صحت و عدمِ صحتِ مذاق کا فیصلہ اربابِ فہم پر چھوڑ کر مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ ایک غزل میں فرماتے ہیں۔

اب اَور سے لَو لگائیں گے ہم جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم
برباد نہ جائے گی کدورت کیا کیا تری خاک اڑائیں گے ہم
دل دے کے اک اَور لالہ رُو کو پھر داغ پہ داغ کھائیں گے ہم
لب کا ترے دعوئ مسیحی مر اَور پہ آزمائیں گے ہم
گر تیری طرف کو بے قراری کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم
گر خواب میں آن کر جگایا سوتے مرے جگائیں گے ہم
بت خانۂ چیں ہو گو ترا گھر مومن ہیں تو اب نہ آئیں گے ہم

دوسری غزل کے چند شعر اور سنتے جائیے

توبہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کریں گے وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کریں گے
ٹھیرے ہی کہ زنجیر سے ٹھیرائیں گے دل کو پر بر بھی زلف کا سودا نہ کریں گے

پھر جائے نہ تا چشمِ صنم آنکھ کے آگے
سیرِ چمنِ نرگسِ شہلا نہ کریں گے

ضیاء احمد

مسافر

فلک فرسائیاں کچھ ہو چکیں، جو باقی ہیں سو ہوتی رہیں گی مگر آج ایسے مسافروں کا ذکر مقصود ہے جن کی عالم بالا تک قطعی رسائی نہیں۔ یہ شوریدہ سر مسافر ٹڈی دل کی طرح آتے ہیں، پھیلتے ہیں، جو کچھ ملے اسے چپٹ کرتے ہیں مگر پھر ایسے غائب ہوتے ہیں کہ گویا کبھی آئے نہ تھے۔ طرفہ یہ ہے کہ ان مسافروں کی زندگی کا مدار باہمی کشمکش پر ہے جس قدر ایک دوسرے سے برسرپرخاش رہیں اسی قدر ان کی گرم بازاری ہے۔ جہاں ان کا لڑائی ڈگمگاتا وہیں یہ خود بھی کس مپرسی کے بوجھ تلے دب مرے۔

یہ مسافر عقائد ہیں۔ عالم بالا میں جبرائیل بیچارے کے پر جلتے ہیں تو ان لڑاکوں کی کیا مجال ؟ ۔ وہ جگہ جو تُو تُو مَیں مَیں سے خالی ہو، جہاں جو پہنچے وہ کچھ نہ رہ کر سب کچھ بن جائے عقائد کے جنجال سے آزاد ہے، وہ جگہ جو ہے مگر جس کا ذکر گناہ برتراز کفر ہے...... نہیں، نہیں! میں اپنے قارئین کو وہاں نہ کھینچوں گا۔ جسے وہاں جانا ہو وہ پہلے یہاں کے مسافروں کا حال سنے اور جب ان سے چھٹکارا ہو جائے (قطعی اور کلّی) تو پھر ممکن ہے کہ.......

دوست! پیارے دوست! کیا تم نے سمجھا کہ یہ قلم کیوں رکا ؟ ۔ یہ بھی اک عقیدہ ہے کہ "عقیدہ نہ ہو" میں ایسی مہلک چیزوں سے کوسوں بھاگتا ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مجھے عقائد سے محبت ہے اور مجھے اچھی طرح علم ہے کہ لنگڑوں کو تیمور ہوتے اور قیصروں کو بے دست و پا ہوتے دیر نہیں لگتی۔ لو اب سنو۔

(۲)

جب میں چھوٹا ہوتا تھا تو جادو میں اعتقاد خاص لاہور میں کافی زوروں پر تھا۔ ہر شخص کی زبان پر تھا "جادو برحق جادو کرنے والا کافر" اس زمانے میں بہت سی بیماریاں جو اب جراثیم کے سر تھوپی جاتی ہیں جادو کا نتیجہ ہوتی تھیں۔ ان کا علاج بھی جادو ہی کے ذریعہ سے ہوتا تھا کئی آدمی مشہور جادوگر تھے۔ ان کی خاصی دوکان چلتی تھی۔ مقدموں میں ہار جیت بعض دفعہ جادو کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ نئی لاہور اب ہے کہ نہ جادوگر ہیں نہ جادو۔ یہ پرانا اعتقاد اب موت کی طرف رینگ رہا ہے اور کوئی ایسا نہیں کہ اس بڈھے کے مرنے پر شادیانے بجانے کی آرزو رکھتا ہو۔

یہ بھی ایک اعتقاد تھا کہ بڈھے کا مرنا خوشی کا موجب ہے۔ اب اول تو کوئی بڈھا مرنا نہیں چاہتا۔ دسوں سٹ کے طالب علموں سے اس کا حال پوچھا چاہیئے، اور مرے بھی تو کس امید پر۔ کوئی خوشی کرنے والا نظر نہیں آتا۔ چنانچہ یہ اعتقاد بھی تپ دق کے تیسرے درجہ میں مبتلا ہے۔ تعویذ باز بھی اپنے پرانے ایمان سے پھرے نظر آتے ہیں یا جھاڑ پھونک نہ گنڈے۔ ڈاکٹروں کی چاندی ہے۔ پیروں کے گھر تک رہے ہیں مگر کیا مجال کہ کسی کمبخت آنکھ سے ایک آنسو بھی بہا ہو کہ تعویذوں میں اعتقاد اب بستر مرگ پر ہے۔

ایک سب سے بڑا اعتقاد تھا کہ ہاتھ کا دیا کام آتا ہے۔ کئی خضر نما بزرگوں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ چھپ چھپ کر خیرات کرتے تھے کہ اس مولا کے نام کے سودے کا چرچا نہ ہو۔ اب جس چندہ دہندے کا نام بیس اخباروں میں نہ چھپے وہ سمجھتا ہے کہ دنیا احسان فراموش ہے۔ یہ پرانا اعتقاد بھی چل بسا۔ وہ اللہ والے مولیٰ پرست ہی نہیں تو مولا سے سودا کون کرے؟

تعجب ہوتا ہے کہ جب انسان اعتقادوں کے لئے زندہ ہیں اور اعتقادوں کی یہ حالت ہے کہ کچھ دن فیشنیبل ہو کر پھر وہ ایسے مرتے ہیں کہ کوئی اُن کا نام لیوا تک نہیں رہتا تو کیوں اس قدر اعتقاد پرستی پر زور ہے؟ کیوں انسان اس قدر بے بس ہیں کہ بجائے اس کے کہ اپنے لئے زندہ رہیں وہ پسند کرتے ہیں کہ اپنے دماغوں کو مرنے والوں، اعتقادوں کی مزاریں بنائیں؟

اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ تین چار پھٹے پرانے کپڑوں والے کمرے میں داخل ہوئے محض عادتاً میں تعظیم کے لئے کھڑا ہوا اور ان حضرات سے اشارے سے کہا کہ آپ تشریف رکھئے۔ بیٹھتے بیٹھتے ان لوگوں نے رسم تعارف ادا کی۔ ایک صاحب بولے "مجھ مسکین کا نام **خیرات** ہے۔" دوسرے بزرگ بولے "اس عاجز کو **پیری مریدی** کہا جاتا تھا" تیسرے پرانے نے دبی زبان سے کہا "مجھ خاکسار کو **جادو** کے نام سے یاد کیا جاتا تھا" چوتھے صاحب کچھ کہنے کو تھے کہ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں بول اٹھا، "حضرت تعارف تو ہوتا ہی رہے گا آپ بیٹھئے تو سہی مسلمان کا گھر ہے۔ آپ کا اپنا گھر ہے اس قدر تکلف کیوں فرماتے ہیں؟" یہ جملہ چونکہ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا تو ان بزرگوں کے چہرے پر کچھ رونق سی نظر آئی۔ دل ہی دل میں خوش ہوا کہ مجھ بدنصیب سے آج تک کوئی نیک کام نہ ہوا تھا۔ شاید یہی نیکی کام آجائے کہ میں ان لوگوں سے اچھی طرح ملا ہوں۔

تھوڑی دیر تو ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ گردش ایام کی نسبت فقرے چست ہوئے۔ غرض کے بندوں کو بُرا بھلا کہا گیا۔ لوگوں کے ظاہر باطن کا پول کھولا گیا مگر آخر کار یہ وفد اپنے اصل مطلب پر آیا۔

جادو۔ سنئے مسٹر۔ ہم جو مخل ہوئے ہیں تو کسی غلط فہمی کی وجہ سے نہیں ہوئے۔ اپنا وقت اچھا یا برا ہم لوگ گذار چکے۔ نیا دور دورہ ہے اور اگر ہم لاکھ معقول وجہ بھی آپ کی سائنس کے برخلاف پیش کریں تو بھی ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہم ہزار دفعہ کہیں کہ "طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خرمی بینم" مگر ہماری سنتا کون ہے۔ جن لوگوں کی نظروں میں خر خر ہی نہیں بلکہ براق ہے ان سے بحث فضول ہے۔ ہمیں یہ فخر کافی ہے کہ ہماری اترن سائنس کے زیبِ سر ہے۔ ہم تو صرف یہ کہنے آئے ہیں کہ اگر ہم لوگوں کے لئے پنشن بھی میسر نہیں ہو سکتی تو آپ کم از کم یہ تحریک تو کریں کہ ہماری تجہیز و تکفین تو ایک معقول طریقے سے کر دی جائے۔ اس سے زیادہ ہمارا کچھ مطلب نہیں۔ ہم اہلِ دنیا کی خدمت کرتے کرتے تھک گئے۔ خود اپنے آپ سے تھک گئے۔ ہم اب چلتے بھلے مگر کیا آپ کی خودداری اس امر کی اجازت دے گی کہ آپ کے بزرگوں کے ہم نوالہ ہم پیالہ اس غیر حالت سے مریں کہ ع

کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

میں۔ (رسمی طور پر) بندہ پرور للہ مجھ سے تو ایسے الفاظ نہ کہتے۔ بزرگوں سے جو آپ کی مراعات تھیں وہ میرے دل پر نقش ہیں اور کافر ہو جو یہ جانے کہ آپ کا وقت پورا ہو چکا۔ ابھی تو ہندوستان میں صدیوں آپ کا ڈنکا بجے گا۔

خیرات۔ آپ ہم مسکینوں سے یہ رسمی جملے استعمال نہ کریں۔ ہمارا جنازہ آج نہ نکلا تو کل نکلے گا۔ آپ سے عرض کرنے کا مدعا صرف اس قدر تھا

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

خدا کی شان کہ خود آپ بچپن میں ہم سے کھیلے اور اب یہ بیگانگی کہ مغربی تہذیب کے دامِ تزویر پھیلائے جاتے ہیں۔

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

میں۔ معاف کیجئے۔ آپ کی حالت واقعی قابلِ رحم ہے۔ قوم کی احسان فراموشی کی آپ زندہ تصویر ہیں مگر آخر یہ تو فرمائیے کہ قوم بیچاری خلافت والوں سے طلاق لینے کے بعد سیدھی تبلیغ تنظیم والوں کے گھر جا پڑی اور وہ لوگ پیسے پیسے کے پیر ہیں اب آپ کے لئے رقم آئے تو کہاں سے؟

پیری مریدی۔ تو گویا آپ کی طرف سے صاف جواب ہے۔

میں۔ جی نہیں۔ میں تو آپ لوگوں کا خادم ہوں۔ جس باوفا نے آپ لوگوں کو لندن اور پیرس میں نہ بھلایا جس نے

وہاں سفید ہاتھوں پر بیعت کی ہو اور جو اخضر آنکھوں کے جادو سے نہ بچا ہو وہ آپ سے کیا بے اعتنائی کریگا مگر آپ ہی ارشاد کیجئے کہ اب صورت ہو تو کیا ہو؟

جادو، خیرات، پیری مریدی - (یک زبان ہوکر نہایت مایوسی کے لہجے میں) کیا آپ کو یقین ہے کہ مسلمان ایسے گئے گذرے ہو گئے کہ ہمارے نام سے بھی بیزار ہیں۔

میں - معاذ اللہ معاذ اللہ آپ یہ نہ فرمائیے۔ ابھی لاکھوں خدا کے بندے ہیں جو آپ کا دم بھرتے ہیں مگر رفتارِ زمانہ کو تو دیکھئے۔

سب - تو ہم آپ سے کیا امید رکھیں؟

میں - مجھ بے بس کا زور چلے تو آج آپ سب کو مثل سابق تخت نشین کردوں اور میری قوم کو بھی شاید عذر نہ ہو مگر مصیبت تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو غیر مذاہب وہابی ہونے پر مجبور کر رہے ہیں۔ مکّے مدینے میں لوگ وہابی ہوگئے تو لاہور بچارے پر کیا گلہ۔

سب - بڑی مشکل ہے، مرنے آپ نہ دیں جینے کے یوں لالے، ہم کریں تو کیا کریں۔

میں - حضرت - قرائن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کو رحلت ہی کرنی ہوگی اور وہ بھی خفیہ خفیہ مگر شرطِ ایمان تو یہ ہے کہ لَا تَقْنَطُوْا ممکن ہے کہ آپ کے دن پھریں اور پھر آپ اور میری قوم شیر و شکر ہو کر رہیں۔

سب - آپ نے رہا سہا بھی ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ گو ہم تھک گئے ہیں مگر ہم اب چلیں گے۔ رونا صرف یہی ہے کہ اگر ہم کو ذرا بھی شبہ ہوتا کہ مسلمان بھی ہم سے غداری کریں گے تو ہم آج سے کئی سو سال پہلے اس قوم سے پہلو تہی کرتے۔ افسوس ہے تو بس اس قدر کہ آپ نے بھی حقِ صحبتِ دیرینہ ادا نہ کیا۔ لیجیے۔ خدا حافظ

وہ بزرگ تو چل دیئے مگر ان کا آخری جملہ تیر کی طرح کھٹکا۔ میں ان کے پیچھے لپکا کہ انہیں بلاؤں، گلے سے لگاؤں اور یقین دلاؤں کہ اوروں کا تو ذمہ لینا مشکل ہے مگر جہاں تک میرا دم ہے ان کی عزت حرمت میں فرق نہ آئے گا۔ مگر وہ تھکے مسافر بلا کے گرم رفتار نکلے۔ یونہی جھلک سی دکھائی دی کہ وہ اسی گروہ میں مل گئے جس میں پرانے مصری فرعونی اعتقاد۔ پرانے یونانی اعتقاد۔ پرانے رومن اعتقاد۔ پرانے نورانی اعتقاد تھے بہت دیر تک کلیجہ مسوسا کیا مگر آخر شکر کیا کہ اب مسلمانوں کو بھی موقع ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ یہ سوچیں کہ کیا تھا، یہ سوچیں کہ کیا ہو۔ مگر میرا شکر قبل از وقت ثابت ہوا کیونکہ جونہی میں مڑا تو پہلو سے ایک ناگوار قہقہہ کی

آواز آئی اور وہ بزرگ جن کو اپنا تعارف کرانے سے میں نے ٹوک دیا تھا تضحیک آمیز لہجہ سے فرمانے لگے "آپ نے اُس وقت میری بات نہ سنی۔ مجھ ہیچمدان کا نام رواج ہے۔ آپ چند بوسیدہ اعتقادوں کے اُٹھ جانے پر اس قدر خوش کیوں ہیں؟ ابھی تو میرا تسلّط قائم ہے۔ جب تک شادی بیاہ، ترکہ میراث اور روزانہ میل جول میں پرانے رسم و رواج قائم ہیں تب تک کیا ہو گی تدبیر عبث ہے۔ مشرقی انڈوں سے مغربی مرغے پیدا ہو چکے مگر میں آپ کو وعظ سنانے کے لئے حاضر نہیں ہوا۔ میں جو ان جوانا مرگوں کے ساتھ مل کر آپ کے پاس پہنچا تو اس کی علتِ غائی صرف یہ تھی کہ آپ کو اس خطرہ سے آگاہ کروں جو ذاتی طور پر آپ کو درپیش ہے۔ ایک دفعہ آپ میرا مقابلہ کر کے زک اٹھا چکے ہیں۔ اب آپ کا خیال یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں غازی کمال پاشا کے خیالات کی توسیع ہو اور دعویٰ آپ کا یہ ہے کہ آپ کے یہ خیالات اُس وقت سے ہیں جب ابھی کسی نے غازی پاشا کا نام بھی نہ سنا تھا۔ آپ کے لئے بہتر یہی ہے کہ قوم کے لیڈروں کی ہاں میں ہاں ملایئے اور اپنی مشرقی لکڑوں کوں کو جاری رکھئے۔

(۳)

جب یہ بڈھا اپنی بک بک ختم کر چکا تو مجھے خیال ہوا کہ رواج مذہبی عقائد سے کہیں زیادہ مضبوط ہے اور جو چند مستورات اس بڈھے کا گلا دبانے میں مصروف ہیں وہ اسے مذہب کے پھندے سے پھانسی دینا چاہتی ہیں حالانکہ رواج کی جان یہ ہے کہ جہاں اس سے لڑو وہیں وہ پہلے سے زیادہ مستحکم ہوتا ہے۔ یہ سوچتے ہی ہر روحانی روزانہ اخبار میں ایک اشتہار روانہ کیا۔

"ضرورت ہے سخت ضرورت ہے۔ فوراً ضرورت ہے۔ ایسے خندۂ پیہم کی جو ایک بڈھے کو ہنساتے ہنساتے اس کا دم نکال دے۔"

سائنس کی طرف سے جواب آیا کہ جنابِ من میرے کارخانے میں اور سب کچھ ہے مگر ہنسی کی ساخت شروع نہیں ہوئی۔

مذہب کی طرف سے جواب آیا "کارِ خیر میں بھی ہنسی سے امداد طلب کرنا مذہب کی توہین ہے۔"

اس جواب پر تو لاحول پڑھا اور پھر شیطان کا خط شوق سے کھولا۔ لکھتے ہیں۔

"حضرت میرے ایک چیلے سے میرے دوسرے چیلے کو قتل کرانا چاہتے ہو! بڑے اُستاد ہو کہ مولویوں کے کام میں ابلیس کی اعانت کے مدعی ہو۔"

جب ابلیس سے بھی مایوس ہوا تو عقل کے پوسٹ کارڈ پر نظر پڑی۔ بڑی بی نے صرف ایک

جملہ لکھا۔

"تم تو سودائی ہو"

(۴)

مگر مجھے اس بڈھے مسافر کو ضرور اگلے جہان کا ٹکٹ لے کر دینا ہے۔ اور اس ٹکٹ کے دام وہی ہیں یعنی خندۂ پیہم۔ اس قدر اس بڈھے پر ہنسا جائے، اس قدر اسے ہنسایا جائے کہ جہاں پیری مریدی کی قبر ہے وہیں اس کی بھی مڑھی بن جائے۔

فلک پیما

یاد

مجھے یاد کرنا جب میں یہاں سے چلا جاؤں

دور دراز کے خاموش اور سنسان ملک میں۔

جب تم میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہ لے سکو گی

اور نہ میں جاتے جاتے مڑ کر پھر رک سکوں گا۔

مجھے یاد کرنا جب وہ دن گذر کر دور ہو جائیں گے

جب ہم تم اپنے مستقبل کے لئے لطیف منصوبے باندھا کرتے تھے۔

صرف مجھے یاد کرنا تم جانتی ہو

کہ اس وقت مدد اور التجا کا وقت ختم ہو چکا ہو گا۔

لیکن اگر کچھ عرصہ کے لئے میری یاد فراموش ہو جائے

اور اس کے بعد میں پھر یاد آجاؤں، تو رنج نہ کرنا۔

اگر موت کی تاریکی اور قبر کے ڈراؤنے تغیرات کے خیالات

میرے گذشتہ جذبات کا ایک شمہ بھی تمہارے دل میں باقی چھوڑیں

تو کہیں بہتر ہے کہ تم مجھے بھلا کر مسکرا دو

بجائے اس کے کہ مجھے یاد کر کے رنجیدہ ہو۔

(روزیٹی)

محسن عبداللہ

درسِ عمل

علّامہ سر اقبال

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
لیک نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
موجِ ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر میروم، گر نروم نیستم

ترجمہ از آزاد انصاری

کسی کنارۂ ساکن نے بحر سے یہ کہا
اگرچہ خلق ہوئے مجھ کو مدتیں گذریں
مگر ہنوز عجب گومگو کا عالم ہے
نہ زندگی ہی مسلّم، نہ موت ہی کا یقیں
سنا جو موج نے لہرا کے یہ جواب دیا
"اگر رواں ہوں تو زندہ سمجھ، نہیں تو نہیں"

حکیم آزاد انصاری

مبادئ سیاسیات

باب ۸

حکومت کا حیطۂ اقتدار

اس سے پچھلے باب میں[1] یہ دکھایا جاچکا ہے کہ عملی انتظامِ مملکت میں نہ تو مجرد انفرادی نظریہ سے ہی کام نکل سکتا ہے نہ مکمل اشتراکی نظریہ سے، بلکہ جب کسی ملک میں کوئی فریق برسرِ اقتدار ہوتا ہے تو سب سے پہلے اُسے غالیت اور انتہا پسندی کو خیرباد کہہ دینا پڑتا ہے اور مملکت کے حسبِ حال حکومت کرنی پڑتی ہے۔

اسی باب میں یہ بھی سرسری طور پر دکھایا گیا تھا کہ آج کل اُن ملکوں میں جہاں انفرادی اصول پر حکومت ہوتی ہے، ایسے اشتراکی انتظامات جیسے ریل، تار، ڈاک اور سرپرستیٔ مصنوعاتِ ملکی نظر آتے ہیں، اور اس کے برعکس روس جیسے ملک میں جہاں اشتمالیت کا دور دورہ ہے، اب حکومت اپنے اصل اصول سے ہٹ کر خانگی تجارت اور بیع وشریٰ کی اجازت دے رہی ہے۔ موجودہ باب میں اس موضوع پر ذرا غائر نظر ڈالی جائے گی اور دونوں قسم کے ممالک میں حکومت کا دائرۂ اقتدار متعین کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

مملکت کا مطمحِ نظر۔ اگر نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو انفرادی حکومت ہو یا اشتمالی، اس کا سب سے اہم، بلکہ بعض کے نزدیک تو شاید واحد کام یہی ہے کہ وہ حتی الامکان افرادِ مملکت کے سود و بہبود کی کوشش کرے بلاشبہ یہ مقصد یعنی بہبود کی کوشش نہایت ہی مبہم ہے، اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر مملکت والوں کے فائدہ کا تعین کون کرے گا۔ اس مسئلہ پر تو آئندہ بحث کی جائے گی، یہاں صرف یہ بیان کرنا کافی ہے کہ حکومت خواہ کسی اصول پر کاربند کیوں نہ ہو، اُس کا ظاہری مقصد ملک والوں کی بہتری کی تلاش ہے، اور یہ فرق جو انفرادیت، اشتراکیت، اشتمالیت، تراج اور اتحادیت کے مابین نظر آتا ہے، در اصل مقصدِ آخری کا فرق نہیں

---

[1] رسالہ ہمایوں، ستمبر ۱۹۲۹ء۔

بلکہ محض طرزِ کار کا فرق ہے۔ ایک فریق کہتا ہے کہ ملک کا مفاد اسی میں مضمر ہے کہ افراد کے خانگی معاملات میں حکومت کی دسترس ہو تو دوسرا یہ کہتا ہے کہ ملک والوں کے لئے بہترین طرزِ کار یہی ہے کہ حکومت کی مداخلت کو کم سے کم کر دیا جائے، بلکہ شاید مناسب یہی ہے کہ سرے سے حکومت ہی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ بہرنہج اس موجودہ باب میں یہ دکھانے کی کوشش کی جائے گی کہ آج کل کی حکومتیں کن کن امور کو اپنے حیطۂ اقتدار میں سمجھتی ہیں، اور ساتھ ہی مختلف انفرادی اور اشتراکی حکومتوں کی مثالیں دی جائیں گی۔

مملکت کی شیرازہ بندی ۔ حکومت کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ حتی الامکان مملکت کا شیرازہ منتشر نہ ہونے دے۔ اس کے لئے دو مختلف النوع فرائض انجام دینے پڑتے ہیں، ایک تو اندرونی امن و امان اور تہذیب، دوسرے بیرونی دشمنوں سے ملک کو مامون و مصئون رکھنا۔ گو ان دونوں مقاصد کے لئے ایک ہی قسم کا طرزِ عمل اختیار کیا جاتا ہے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ دو فرائض دراصل مختلف النوع ہیں، اور غور کیا جائے تو اندرونی حفاظت کا کام بیرونی حفاظت سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ بیرونی حملوں سے بچاؤ کا انتظام ایک محض میکانی کام ہے، یعنی اگر حکومت کو فوج کی ایک خاص تعداد یکجا کرنے پر دسترس ہو اور اس کے پاس کافی سامانِ حرب بھی موجود ہو تو وہ ایک بڑی حد تک بیرونی خطرات سے محفوظ رہے گی۔ لیکن مملکت کو اندرونی بغاوتوں کا شکار نہ ہونے دینا اور خود اپنی بقا کی تدابیر کرنا یہ اس لئے مشکل ہے کہ حکومت مملکت کی خادم ہے[۵۲]، اور مملکت جملہ باشندگانِ ملک کی اجتماعی کیفیت کا نام ہے جس میں بے چین اور شورش پسند عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ فی نفسہٖ امن و امان اور ترتیب و تنظیم کوئی آخری مقصد نہیں بلکہ دراصل کسی آخری مقصد کے حصول کی تدابیر ہیں، اور وہ مقصد مملکت کے وقتی مطمحِ نظر کا حصول ہے۔ "جس طرح کسی چڑیا خانے میں ایک قسم کی تنظیم، جیل خانے میں دوسری قسم کی تنظیم، مدرسے میں تیسری طرح کی تنظیم، اور گھرانے میں چوتھی طرح کی تنظیم ہوتی ہے[۵۳]۔ اسی طرح اگر ملک کسی غیر قوم کا دست نگر ہو تو ایک طرح کی تدابیرِ امن، اور اگر آزاد ہو تو دوسری طرح کی تدابیرِ امن کی ضرورت لاحق ہوتی ہے" تنظیم کے معنی مختلف ممالک میں مختلف ہوتے ہیں، چنانچہ دست نگر ملک میں تنظیم اور امن و امان سے مراد وہ کیفیت ہوتی ہے جس کے تحت ملک پر آسانی سے حکومت کی جا سکے، درآنحالیکہ کسی آزاد ملک میں اس سے مراد وہ صورتِ حال ہے جس میں باحسن وجوہ مفادِ عامہ کے حصول کی کوشش ممکن ہو۔

---

۵۲ باب ۳ - ہمایوں، مارچ ۱۹۲۸ع

۵۳ میک آئیور مملکت حالیہ Mac Iver: The Modern State حصہ ۲، باب ۵، جزو ۳

الغرض حکومت اپنی حفاظت کی جو تدابیر عمل میں لاتی ہے اور اُس کے لئے افراد کو اپنے احکام ماننے پر مجبور کرتی ہے، وہ اسی وقت حق بجانب سمجھی جا سکتی ہیں جب اُن سے اُن کے مخصوص مطمح نظر کے حصول میں سہولت پیدا ہو۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ حکومت خواہی نخواہی افراد کے ہر نوع کے خیالات و اقوال کو منظم کرنے کی کوشش کرتی ہے، بلکہ اس کے برعکس افراد کی بہت سی ایسی حیثیتیں ہیں جنہیں انفرادی حکومت علی العموم چھوتی بھی نہیں، مثلاً رسم و رواج، اخلاق و عادات، گو اُسے ان میں بھی مداخلت کرنے کا حق حاصل ہے۔ عام طور پر اس کا کام یہ ہے کہ ہر فرد کو دوسرے افراد اور مجموعوں کی بے جا دست برد سے محفوظ رکھے، اس کے ذاتی امور میں بے جا دست اندازی سے باز رہے اور مملکت کو دوسرے ممالک سے آزاد رکھے۔ یہ وہ فرائض ہیں کہ اگر حکومت ان کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو اُسے قائم رہنے کا کوئی حق نہیں رہے گا۔ مملکت کی اس کم از کم مداخلت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مختلف افراد کے باہمی تعلقات کا تعین معمولی دیوانی و فوجداری قوانین کے ذریعے سے حکومت اور افراد کے باہمی تعلقات کا تعین دستوری و فوجداری قوانین کی مدد سے اور مختلف ممالک کے باہمی تعلقات کا تعین قانونِ بین الاقوام کے ذریعے سے کیا جاتا ہے لیکن حکومت ان ہی امور میں مداخلت کرنے پر قانع نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ اپنا دائرۂ عمل وسیع کرتی رہتی ہے۔ حکومت کو ایک طرف مملکت سے گہرا تعلق ہے، اور دوسری جانب وہ ہیئت حاکمیہ کی ساختہ پرداختہ ہے[۵۴] اور اپنے جملہ فرائض کی انجام دہی میں اس سے مدد لیتی رہتی ہے، چنانچہ ملک کے تمام وسائل و پیداوار عملاً اسی کی دسترس میں ہوتے ہیں۔ اگر حکومت چاہے تو بہت سے ایسے کام کر سکتی ہے جن سے ملک والوں کی حالت بہتر ہو جائے، اور انہیں اپنے ذاتی کاروبار میں مدد مل سکے۔ افراد کی بہ نسبت اس کے پاس روپیہ بدرجہا زیادہ ہوتا ہے، اس لئے وہ صنعت و حرفت، زراعت، تحقیقات و تفحص میں طرح طرح کے تجربے کر کے ان کی مدد سے پیداوار دولت میں خاطر خواہ اضافہ کر سکتی ہے، نیز چونکہ وہی سکہ سازی کا انتظام کرتی ہے اور محصول درآمد و برآمد اور چنگی کا محصول وصول کرتی ہے اس لئے اگر چاہے تو ملک کی صنعت و حرفت اور تجارت میں ترقی کر سکتی ہے۔

فوج۔ بہر نہج ملک کی حفاظت و انتظام کے لئے دو چیزیں نہایت ضروری اور لابد ہیں، ایک فوج، دوسرے روپیہ۔ علاوہ بعض مستثنیات[۵۵] کے آج کل کے زمانے میں تمام متمدن ممالک کی فوجیں خود اس ملک کے باشندوں

---

۵۴ باب ۵، ہمایوں، جون ۱۹۲۸ء

۵۵ بعض ممالک (مثلاً فرانس) میں ایک "غیر ملکی رسالہ" ہوتا ہے جس میں وہ غیر ملکی بھرتی کئے جاتے ہیں جنہیں اس ملک کے خارجی طرز عمل سے ہمدردی ہو۔ فرانس کا غیر ملکی رسالہ جنگِ ریف میں فرانس کے دوش بدوش لڑا۔

پرمشتمل ہوتی ہیں، اور دو ممالک خواہ سیاسی معنے میں کتنے ہی آپس کی دوستی و ہوا خواہی کا دم کیوں نہ بھرتے ہوں کبھی یہ پسند نہیں کرتے کہ ایک دوسرے کے شہریوں کو اپنی اپنی فوجوں میں شریک ہونے دیں۔ سو برس پہلے یہ معمولی بات تھی کہ کسی ملک کے شہری دوسرے ملک میں جائیں اور تنخواہیں مقرر کرا کر فوج میں بھرتی ہو جائیں، لیکن آج کل کی عام بین الاقوامی معاشی و سیاسی کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب کوئی ملک کسی دوسرے ملک والے کو اپنے معمولی رسالوں میں بھرتی نہیں ہونے دیتا۔ بعض ممالک میں تو فوجی خدمت پر محض شہریت کے علاوہ دوسری شرائط بھی لگائی جاتی ہیں، مثلاً روس میں کوئی شخص جب تک اپنے ذاتی کسب سے براہِ راست دولت میں اضافہ نہ کرتا ہو اُس وقت تک اُسے ملک کی حفاظت میں تلوار اُٹھانے کی اجازت نہیں، جس کے معنی یہ ہوئے کہ اکثر ممالکِ حاضرہ میں صرف ملک والوں پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ اسی طرح روس میں صرف وہی باشندے قابلِ اعتماد سمجھے جاتے ہیں جو مملکت کے بنیادی اصول پر عمل کرتے ہوں، یعنی جو خود اپنے ہاتھ پاؤں چلا کر اپنا پیٹ پالتے اور ملک کی دولت میں اضافہ کرتے ہوں۔ یہی کیفیت عروجِ دولتِ اسلام کے زمانے میں شرعِ مروجہ کی تھی، جس کے مطابق فوجی خدمت کے لئے صرف مسلمانوں ہی کو مجبور کیا جاتا تھا اور "اہلِ ذمہ" (یعنی غیر مسلموں) کی حفاظت اور فوجی خدمت سے معافی کے معاوضے میں ان سے جزیہ لینے پر کفایت کی جاتی تھی[۵۵]۔ اکثر قدیم متمدن ممالک میں یہ قاعدہ رائج تھا کہ خطرے کے وقت حکومت جس کسی شہری کو چاہتی مملکت کی حفاظت کے لئے طلب کر لیتی، اور چونکہ قواعد، تنظیم و ترتیب کا آج کل کی طرح رواج نہ تھا، اس لئے حکومت کو اس میں بہت آسانی ہوتی تھی۔ آج کل کی مرتب و منظم افواج کے دور میں بہت سے ممالک ایسے ملیں گے جن میں جبری فوجی خدمت کا طریقہ جاری ہے، مثلاً فرانس میں ہر ۲۱ سالہ شہری کو ایک یا سوا سال کے لئے فوجی تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے، اور حکومت جب چاہے ۵۲ سال تک کے شہریوں کو باضابطہ فوجی خدمت کے لئے طلب کر سکتی ہے، اسی طرح جاپان میں ہر شہری کو جس کی عمر ۱۷ سال سے تو متجاوز ہو لیکن ۴۰ سال سے بڑھ نہ گئی ہو، حکومت ملک کی حفاظت کرنے کے لئے قانوناً طلب کر سکتی ہے۔ سلطنتِ

---

[۵۵] جزیہ کے متعلق بہت کچھ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی مقدار کا تعین یا تو عہد نامے کے ذریعے سے ہوتا تھا ورنہ خلیفۂ وقت اس کا تعین کرتا تھا۔ بہر حال یہ محصول در اصل "اہل الذمہ" یعنی غیر مسلموں کے حقوق، جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری کے معاوضے میں عائد کیا جاتا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ مسلمانوں پر فوجی خدمت لازمی تھی اور غیر مسلموں پر معاف تھی، چنانچہ اول الذکر پر ملک کی حفاظت کا پورا بار پڑتا تھا۔ جزیہ سے عورتیں، بچے، اندھے، مریض اور تارکانِ دنیا بری تھے۔ دیکھو عبد الرحیم "اصولِ قانونِ اسلامی" Abdur Rahim: Muhammadan Jurisprudence باب ۱۱ و ۱۲۔

برطانیہ اور ممالکِ متحدۂ امریکہ دو ایسی ہیئتیں ہیں کہ ان میں فوجی خدمت لازمی نہیں بلکہ اختیاری ہے، گو پچھلی جنگِ عظیم میں برطانیۂ عظمیٰ میں بھی چند سال کے لئے فوجی خدمت لازمی کر دی گئی تھی۔

روپیہ۔ ملک کا انتظام چلانے کیلئے دوسری ضروری چیز روپیہ ہوتا ہے چنانچہ حکومت کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ کاروبار کی انجام دہی کیلئے باشندگانِ ملک پر محاصل عائد کرے۔ ان محاصل کی نوعیت مختلف ممالک میں مختلف ہوتی ہے۔ ہندوستان قدیم میں ہندوؤں کے عروج کے زمانے میں سرکاری آمدنی کے ذرائع محاصلِ درآمد و برآمد کے علاوہ زر و جواہر، جنگلات، پیداوار باغات، پیداوارِ خور و نوش، اور سرکاری اراضیات پر مشتمل تھے[۵۷]۔ شیوعِ اسلام کے بعد عہدِ خلافت میں مسلمانوں سے عشر، زکوٰۃ و خمس، اور غیر مسلموں سے جزیہ لیا جانے لگا[۵۸]۔ ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ میں دوسرے امور کی طرح محاصل میں اس قدر ترتیب و تنظیم نہیں تھی جتنی آج کل پائی جاتی ہے، اور اکثر شاہانِ مغرب اجاروں اور عہدوں کی خرید و فروخت، پیش کش اور جبری قرضوں کے ذریعے سے (جنہیں واپس دینے کا خیال بھی نہ ہوتا تھا) روپیہ کی کمی کو پورا کرتے تھے[۵۹]۔ زمانۂ حال کے متمدن ممالک کی آمدنی کا دارومدار عام طور پر علاوہ محاصلِ درآمد و برآمد و محصول چنگی کے محاصلِ وراثت، اور محاصلِ آمدنی، زمینداری و مکانات پر ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اکثر مملکتوں میں بعض ایسے کاروبار انجام دیئے جاتے ہیں جن سے حکومت کو خاصہ منافع ہو جاتا ہے، مثلاً ڈاک، تار، ٹیلیفون، کاغذِ ممہور وغیرہ، اور آج کل پٹینٹ کے جو قوانین رائج ہیں انہیں دراصل قدیم اجارہ فروشی کے باقیات تصور کرنا چاہیئے۔ بعض ممالک میں حکومت ہی کو چند مخصوص اشیا کے بنانے اور فروخت کرنے کا واحد اجارہ ہوتا ہے۔ جیسے فرانس میں سگریٹ اور دیاسلائی، اور ہندوستان میں افیون۔ اسی طرح ان ممالک میں جہاں وفاقی حکومت رائج ہے، عام طور پر بعض محاصل مرکزی ادارات کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں اور بعض ریاستی ادارات کو تفویض کر دیئے جاتے ہیں؛ مثلاً ممالکِ متحدۂ امریکہ میں محاصلِ درآمد و برآمد، محصولِ آمدنی و دیگر ہم جنس محاصل کے عائد

---

۵۷ دیکھو ارتھ شاستر، مترجم انگریزی ڈاکٹر شام شاستری، حصہ ۲، باب ۶

۵۸ اسلامی محاصل کے لئے دیکھو عبدالرحیم حسب بالا، باب ۱۱ عشر اس اراضی کی آمدنی کا دسواں حصہ ہوتا تھا جو مسلمانوں کی ملک ہو۔ اور خمس اس اراضی کی آمدنی کا پانچواں حصہ جو غیر مسلموں سے مسلمانوں کے قبضے میں آگئی ہو۔ خرید کے لئے دیکھو حاشیہ نمبر ۶ بالا خراج اُن ممالک سے وصول کیا جاتا تھا جو غیر مسلموں کے قبضے میں چھوڑ دیئے گئے ہوں۔

۵۹ "پیش کش"، "جبری قرضوں" وغیرہ کے لئے دیکھو گرین: "تاریخ اہلِ انگلستان" مترجمہ قاضی تلمذ حسین، (مطبوعاتِ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن) یا کوئی دوسری تاریخِ دستورِ انگلستان۔

کرنے کا اختیار مرکزی ادارات کو حاصل ہے، اور محاصلِ مملوکات و دیگر براہ راست محاصل کو ریاستوں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔
برطانوی ہند میں مرکزی اور صوبہ داری مالیات کا دار و مدار دونوں ادارات کی باہمی تقسیم کار پر ہے، چنانچہ مرکزی ادارات درآمد و برآمد، آمدنی، ریل، تار، ڈاک اور نمک پر محاصل عائد کرنے کے مجاز ہیں، اور صوبہ جات مالگذاری، آبکاری، زراعت، جنگلات، کاغذِ ممہور اور تسجیل کی مدات سے روپیہ وصول کرتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ محصولِ آمدنی میں جو اضافہ ہوتا ہے اس میں سے ۲۵ فی صدی اس صوبہ کے حوالہ کر دیا جاتا ہے جہاں کی آمدنی میں وہ اضافہ ہوا ہو۔ ۱۹۲۸ء سے پہلے ہر صوبہ کو ایک خاص رقم مرکزی حکومت کی نذر کرنی پڑتی تھی، لیکن اب مرکزی محاصل میں اضافہ ہو جانے کی وجہ سے اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

تنظیم۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ مملکت ایک ایسا فطری ارادہ ہے جو ہماری زندگی کا جزوِ لاینفک ہے اور اس کی ضرورت سب سے زیادہ اس لئے پیش آتی ہے کہ مختلف افراد کے مابین اور نیز ان کی اجتماعی اور انفرادی خواہشات کے درمیان تصادم ہوتا رہتا ہے اور اس سے معاشرۂ انسانی کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے اُس کا انسداد کرے[۱] ۔ افراد اور مجموعوں کو مرتب و منظم کرے اور ایسے قوانین بنائے جن سے اس تصادم کا کم سے کم اندیشہ باقی رہ جائے، نیز اگر کوئی ان کی خلاف ورزی کرے تو اسے سزا دے۔ اس ترتیب و تنظیم کے لئے سب سے پہلے تو ملک کے حدودِ اربعہ کا تعین اور ملک کو مختلف انتظامی اکائیوں میں تقسیم کرنے کا کام ہوتا ہے جس کے بغیر کسی حکومتی ادارے کے لئے اپنے دائرۂ اقتدار کا تعیّن ممکن ہی نہیں۔ اس کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ ہر انسان کے جان و مال کو دوسروں کی دست برد سے بچانے کے لئے قواعد بنائے جائیں اور ایسی سزائیں تجویز کی جائیں جو دوسروں کے لئے باعثِ عبرت، اور ساتھ ہی (بشرطِ امکان) خود مجرم کے لئے باعثِ تنبیہ ہوں۔ ایسے محکمہ جات کا قیام بھی لازمی ہے جو ان قواعد یا قوانین کی خلاف ورزی یا افراد کے باہمی تصادم کی صورت میں حکم یا پنچ کا کام کرے اور ان قواعد کے مطابق تجویز کر کے اس کا نفاذ کرائے۔

امورِ مفصلۂ بالا سے معلوم ہوا کہ حکومت کے فرائض سہ گانہ ہیں، یعنی ملک کو بیرونی حملوں اور اندرونی بے چینی سے محفوظ رکھنا، افراد کی بیش از بیش آزادی، مملکت کے حصول و قیام کی غرض سے خاندانی تعلّقات، جان و مال، تجارت و حرفت کے لئے قوانین بنا کر انہیں نافذ کرنا، اور ایسی عدالتیں قائم کرنا جو ان قوانین کے مطابق ان افراد سے بازپرس کر کے ان لوگوں کو پاداش کو پہنچائے جنہوں نے قوانینِ مروجہ کی خلاف ورزی کی ہو۔

---

[۱] ۔ باب ۵ ۔ ہمایوں، جون ۱۹۲۸ء ۔

یہ تو وہ فرائض ہوئے جن کے بغیر حکومت ملک کا انتظام چلا ہی نہیں سکتی۔ لیکن جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے[۵] آج کل کے زمانے کا عام رجحان یہ ہے کہ حکومت کی مداخلت کا دائرۂ اقتدار روز بروز وسیع ہوتا ہے، چنانچہ ان ممالک میں بھی جہاں انفرادی طرز پر انتظام کیا جاتا ہے، بہت سے ایسے امور حکومت کے دائرے میں آ گئے ہیں جو نصف صدی قبل اس سے باہر تھے۔ انہیں آسانی و سہولت کی خاطر اختیاری فرائض کہنا مناسب ہوگا تاکہ ان کا لازمی فرائض حکومت سے امتیاز کیا جا سکے۔ اختیاری فرائض دو قسم کے سمجھنے چاہئیں، ایک میں تو وہ امور شامل ہیں جو حکومت کی مداخلت کے بغیر بروئے کار آنے ہی نہیں اور دوسرے وہ جو حکومت کی مداخلت کے بغیر بھی انجام پا سکتے تھے لیکن جن کا تعلق ایسی حالت میں افراد سے ہوتا۔ ثانی الذکر امور میں مداخلت گویا اشتراکیت نما ہوگی، اور اول الذکر امور کی نگرانی نیم اشتراکی۔

نیم اشتراکی فرائض۔ سب سے پہلے نیم اشتراکی فرائض حکومت یعنی اُن فرائض کو لیجئے جو حکومت کی مداخلت کے بغیر غالباً پورے نہ ہو سکتے یا کم از کم زیادہ وسیع پیمانے پر انجام کو نہ پہنچتے۔ آج کل کے زمانے میں حکومت نے اپنا فرض اس کو سمجھ لیا ہے کہ حتی الامکان باشندگانِ ملک کو بہتر بنانے اور ان کی معاشی حالت کو درست کرنے کی کوشش کرے، چنانچہ اب شاید مشکل سے کوئی ایسا عقیدہ پرست انفرادی نکلے گا جو ہربرٹ سپنسر کی طرح کلیتہً بقائے اصلح کے مسئلے پر اعتقاد رکھتا ہو۔ آج کل کی انفرادی حکومتیں بھی اس کی کوشاں رہتی ہیں کہ لوگوں کی تعلیم و تربیت کے بہترین وسائل بہم پہنچائیں، ان کی تندرستی کی نگہداشت رکھیں، گاؤں گاؤں حفظانِ صحت کا انتظام کریں، جگہ جگہ شفاخانے کھولیں، تحقیقات و حکیاتی تجسس کی خاطر مناسب مقامات پر عجائب خانے اور نوادرخانے کھولیں اور کوشش کریں کہ ملک کے صنعتی حرفتی و زراعتی وسائل میں اضافہ ہو۔ نیز متمدن اور ترقی یافتہ حکومتیں اعداد و شمار کا محکمہ بھی قائم کرتی ہیں تاکہ مختلف شعبوں اور محکموں کو ملک کی موجودہ حالت کا اندازہ ہو سکے اور اعداد و شمار کو پیشِ نظر رکھ کر وہ اس حالت کی اصلاح کی کوشش کر سکیں۔

یہ تو وہ فرائض ہوئے جو زمانۂ حال کی متمدن انفرادی حکومتوں نے اپنے سر لے لئے ہیں، اور اگر ان کی انجام دہی میں وہ کوشاں نہ ہوں تو یہ امور شاید سرے سے انجام ہی نہ پائیں، اس لئے کہ افراد کے وسائل اس قدر بڑھے ہوئے نہیں ہیں اور نہ ان کا حلقۂ اثر اس قدر وسیع ہے کہ وہ ان سب باتوں کو فرداً فرداً یا باہم متفق ہو کر بھی بڑے پیمانے پر پورا کر سکیں۔ بلاشبہ امریکہ اور مغربی یورپ میں پچھلے چند سالوں میں بعض نہایت عظیم الشان

---

[۵] باب ۷، ہمایوں، ستمبر ۱۹۲۹ء

شرکتیں اور کاروباری جتھے قائم ہو گئے ہیں جن کا سرمایہ کروڑوں اور اربوں روپیہ کا ہے، تاہم ان میں سے ہر ایک صرف ایک مخصوص تجارت سے متعلق ہے، اور اس کا نصب العین مملکت کا مفاد نہیں بلکہ حصہ داروں کا فائدہ اور سرمایہ میں اضافہ کرنا ہے، چنانچہ یہ بھی اس کمی کو پورا نہیں کر سکتے جو حکومت کے ان نیم اشتراکی فرائض سے دست بردار ہونے پر پیدا ہو گی۔[۵۱۲]

اشتراکی فرائض اس کے علاوہ حکومت نے اپنے سپرد ایسے کام بھی کر رکھے ہیں جو بالکلیہ اشتراکی ہیں یعنی جو مجرد انفرادی اصول کے مطابق حکومت کی دسترس میں نہیں رہنے چاہئیں بلکہ افراد ہی کو انجام دینے چاہئیں۔ اس زمرے میں سب سے پہلے ذرائع حمل ونقل آتے ہیں جیسے ریلوں کی تعمیر، سڑکوں کی درستی، ڈاک اور تار کا انتظام، ٹیلیفون کی نگرانی وغیرہ۔ آج کل کے زمانے میں یہ تقریباً ناممکن ہے کہ ان کارآمد اور ضروری وسائل ترقی کو حکومت اپنے حال پر چھوڑ دے۔ چنانچہ اکثر ممالک میں تو یہ سب حکومت کے حیطۂ اقتدار میں آگئے ہیں، اور بعض میں حکومت نے ان پر اپنی نگرانی ہی رکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ تمثیلاً ریلوں کو لیجئے۔ یورپ اور ہندوستان میں عام رجحان یہ ہے کہ ریلیں مملکت ہی کی ملک ہوں، چنانچہ پچھلے پانچ سال میں ہندوستان کی تین بڑی بڑی ریلیں، یعنی ایسٹ انڈین، گریٹ انڈین پینن سولا، اور اودھ و روہیلکھنڈ، اپنی اپنی کمپنیوں سے نکل کر حکومت کے قبضے میں آگئی ہیں۔ انگلستان میں اس کے برعکس ریل کی مختلف شرکتوں کو مدغم کر کے بڑی بڑی شرکتیں بنائی جا رہی ہیں اور حکومت ان پر براہِ راست نگرانی رکھتی ہے؛ جرمنی میں ریلیں علی العموم حکومت ہی کے قبضے میں ہیں۔ ریلوں کے علاوہ ملک کے قدرتی وسائل میں ترقی کے سامان بہم پہنچانا بھی حکومت کا فرض ہے، چنانچہ اگر ملک میں کوئی خاص صنعت یا کسی حصۂ ملک میں زراعت میں کمی یا سقم ہو تو حکومت خزانۂ سرکاری سے روپیہ خرچ کرتی ہے، کاشتکاروں کو تقاوی دیتی ہے، آبپاشی کے سامان فراہم کرتی ہے اور جگہ جگہ نمونے کے کھیت اور کارخانے قائم کر کے لوگوں کو بہترین ذرائع استعمال کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔

سب سے آخر میں وہ فرائض ہیں جو بالخصوص مزدوروں اور غرباء کے مفاد کی غرض سے حکومت پر عائد کئے جاتے ہیں اور یہ وہ ہیں جن پر اشتراکیت کا پرتو خاص طور پر نمایاں ہے۔ پکے انفرادی بھی اس واقعہ کا

---

۵۱۲ زمانۂ حال میں یورپ اور امریکہ کے تجارتی ارتقا کی تاریخ دراصل کاروباری جتھوں کی تاریخ ہے۔ اس کے لئے دیکھو ج، و، جنکس "کاروباری جتھوں کا مسئلہ" J. W. Jenks: The Trust Problem باب ۱۲ و ضمیمہ د

انکار نہیں کرسکتے کہ مزدوروں اور محنتیوں کی حالت عام طور پر نہایت زبوں ہے، اور وہ جو ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ملک کی عام مرفہ الحالی میں اضافہ کرتے ہیں، انہیں اس کا صحیح معاوضہ آرام و آسائش کی شکل میں نہیں ملتا۔ اسی وجہ سے فلاکت زدہ طبقے کی حالت سدھارنا اور مزدوروں کی آسائش کا انتظام، دونوں باتیں ترقی یافتہ حکومتوں نے اپنے ذمہ کرلی ہیں، اور جبری بیمہ، وظائفِ معمرین، ارزاں آرام دہ مکانات کی تعمیر[۱۳] قوانینِ کارخانہ جات اور ایسے ہی دوسرے طریقوں سے غریب اور نیچے درجہ کے طبقے کا معیارِ زندگی بڑھایا جاتا ہے۔ جبری بیمے کا قاعدہ ۱۸۸۳ء میں جرمنی میں شروع ہوا اور اس کا اتباع ۱۹۰۸ء میں انگلستان میں کیا گیا۔ وظیفۂ معمرین کا قاعدہ آسٹریلیا میں مدت سے جاری ہے، اور اس کے مطابق ہر درخواست گذار شہری کو جس کی عمر کم سے کم ۶۵ برس کی ہو اور جو کم از کم ۲۰ سال سے آسٹریلیا میں رہتا ہو، اس شرط پر وظیفہ دیا جاتا ہے کہ درخواست گذار کی کل آمدنی کی مقدار گیارہ سو روپیہ سالانہ سے متجاوز نہ ہو جائے۔ آج کل کی انفرادی حکومتوں کو مزدوروں کے آرام تندرستی اور معیارِ زندگی کا اس قدر خیال ہے کہ بعض انفرادی ممالک (مثلاً انگلستان و جرمنی) میں اس کے لئے ایک وزیر مختص کردیا گیا ہے، اور انجمنِ اقوام کے زیرِ سایہ ایک بین الاقوامی اجتماع ہر سال منعقد ہوتا ہے جس میں مختلف مملکتوں سے مزدوروں کے آرام و آسائش کی تدابیر کی سفارش کی جاتی ہے[۱۴] اور حکومتیں حتی الامکان ان پر کاربند ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔ نیز آج کل کے اکثر متمدن ممالک میں کارخانوں اور اورگزنیوں کے مزدوروں کے لئے روزانہ اور ہفتہ وار گھنٹوں کی تعداد مقرر کردی جاتی ہے تاکہ اپنے کام سے ان پر زیادہ بار نہ پڑے اور ان کی زندگی و تندرستی برقرار رہے[۱۵]۔

اشتمالی روس پر انفرادی اثرات ۔ اوپر کے پاروں میں اُن اشتراکیت نما امور کو واضح کرنے کی

---

[۱۳] اس قسم کے مکانات منجملہ دوسرے ہندوستانی شہروں کے بمبئی اور فرخندہ بنیاد حیدرآباد دکن میں بھی بنوائے گئے ہیں۔

[۱۴] دیکھو "سالنامہ مدبرین" Statesman's Year Book. ۱۹۲۸ء صفحہ ۲۰ جہاں پچھلے دس سال کے اجتماعوں کی قراردادیں دی ہوئی ہیں۔

[۱۵] کارخانوں کے متعلق ہندوستان میں جو قواعد رائج ہیں وہ قانونِ کارخانہ جات نمبر ۱۲ سنہ ۱۹۱۱ء پر مبنی ہیں۔ انگلستان کے قانونِ کارخانہ جات کے لئے دیکھو ہالسبری: قوانینِ انگلستان Halsbury Laws of England جلد ۱۴، حصہ ۵ "کارخانہ جات" Factories دفعہ ۳۳۲ تا ۳۴۴۔

کوشش کی گئی ہے جو زمانہ حال کی انفرادی حکومتیں انجام دیتی ہیں[۱۶]۔ اب اس باب کے آئندہ حصہ میں اسی طرح یہ دکھایا جائے گا کہ دنیا کی واحد اشتمالیت پسند مملکت، یعنی روس، مجرد اشتمالی عقیدے سے کس قدر ہٹ گئی ہے، اور وہاں کون کون سے انفرادی اصول کو اختیار کر لیا گیا ہے۔ ہمیں اس موقع پر وہ سیاسی واقعات دہرانے کی ضرورت نہیں ہے جو ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب سے پہلے اور اس کے بعد پیش آئے، چنانچہ اس وقت یہ بیان کر دینا بالکل کافی ہوگا کہ مارچ ۱۹۱۷ء سے آٹھ ماہ بعد تک روس میں مختلف سیاسی فریق یکے بعد دیگرے برسرِ اقتدار رہے، اور اس ملک کی سیاسیات کو اُس وقت تک استقلال نصیب نہیں ہوا جب تک ۷ نومبر ۱۹۱۷ء کو لینن کے قبضے میں تمام حکومتی پرزے نہیں آ گئے۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۰ء تک کا زمانہ انتہائی اشتمالی اصول کی ترویج کا زمانہ ہے، اشتمالی گروہ کو ایک عظیم الشان ملک اپنے تجربات کے لئے مل گیا تھا، چنانچہ ابتدا میں انہوں نے خوب دل کھول کر اپنے اصول کی ترویج کی[۱۷]۔ تمام اراضی ضبط کر لی گئی اور اسے کاشتکاروں میں تقسیم کر دیا گیا۔ کاشتکاروں کو صرف اسی قدر پیداوار رکھنے کا حق دیا گیا جتنے کی انہیں ضرورت تھی، باقی تمام پیداوار حکومتی کھتیوں میں جمع ہونے لگی، گرنیاں۔ تماشا گاہیں، کارخانے، مختلف دھاتوں کی کانیں، ریلیں، قہوہ خانے غرض جس قدر سامانِ ضرورت و سامانِ تعیش تھا سب پر حکومت قابض ہو گئی اور اپنی طرف سے اس کا انتظام کرنے لگی۔ ۱۹۲۰ء کا زمانہ اس انتظام کے انتہائی عروج کا زمانہ ہے، لیکن یہی وہ دور ہے جب ملک کی پیداوار میں کمی، ضروریاتِ زندگی کی گرانی اور ملک میں عام افلاس کی کیفیت صریحاً نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس غالی اشتراکی طرزِ عمل کی وجہ سے بحران کی جو کیفیت رونما ہوئی اس کا فوری سبب ایک تو یہ تھا کہ زراعت کو ایک بڑا دھکا

---

[۱۶] ل، س، لائن L.S.Lyon کی کتاب موسومہ "پیشے کا انتخاب Making a Living" کے صفحات ۴۲۵ و ۵۲۴ پر دو نہایت نفیس جدول دیئے گئے ہیں۔ جن میں سے اول الذکر میں ممالکِ متحدۂ امریکہ کی مرکزی حکومت کے کاروبار کو اور دوسرے میں وہاں کی ایک ریاست یعنی منے سوٹا کی حکومت کی مساعی کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان جدولوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ حال کی انفرادی حکومتیں کس حد تک افراد کی بہبود کے واسطے کوشاں ہیں۔

[۱۷] بولشوی اصول کے ارتقا کے لئے دیکھو فارب مین: "لینن کے بعد Farbman: After Lenin" حصہ اول و ۲؛ نیز جنتری سالانہ "Annual Register." بابت سالہائے ۱۹۱۷ء و ۱۹۱۸ء و ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء و ۱۹۲۵ء۔ اس کے مختصر حالات کے لئے "پُر واقعات سال" These Eventful Years جلد ۲، باب ۳۸ کا مطالعہ کافی ہوگا۔

لگا تھا، اور زراعتی پیداوار میں قلت اور اس کی گرانی کی وجہ سے اس کے اور مصنوعاتِ دستکاری و میکانی کی قیمتوں کے مابین ایک عظیم الشان تفاوت پیدا ہوگیا تھا، ساتھ ہی اس کے سکے یعنی کاغذی روبل کی قیمت تقریباً صفر رہ جانے سے بھی ملک کے مصائب میں گونہ اضافہ ہوا۔ بہرحال ان سب باتوں کا یہ اثر ہوا کہ وہ طبقہ جو جدید حکومت کا گویا پشت پناہ بنا ہوا تھا (یعنی مزدور و کاشتکار) حکومت کے مخالفین میں شامل ہوگیا اور حکومت کو جبراً و قہراً اپنا طرزِ عمل بدل دینا پڑا۔ آخر کار ۱۹۲۱ء کے ابتدا ہی میں لینن کے خاص ایما سے "جدید معاشی طرزِ عمل" کی بنیاد پڑ گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ طرزِ عمل کی اس تبدیلی کے آثار پہلے ہی نظر آ رہے تھے، اور خود لینن ملک کو اس کے لئے تیار کر رہا تھا۔ دسویں اشتراکی کانگریس میں لینن نے ایک زوردار تقریر میں یہ تحریک کی کہ بجائے غلّہ کے حکومتی کھتیوں میں جمع ہونے کے کاشتکاروں کو اس کی قیمت (یعنی دوسرے الفاظ میں ایک مقررہ لگان) ادا کرنا مناسب ہوگا، اور اپنی مقبوضہ پیداوار کے مبادلہ و انتقالِ ملکیت کا اختیار خود کاشتکار کو ہونا چاہیئے، چنانچہ ۲۱- مارچ ۱۹۲۱ء کو یہ تحریک قانون کی شکل میں منظور ہوگئی، اور کاشتکاروں کو غلّہ منتقل کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ یہی وہ قانون تھا جسے "جدید معاشی طرزِ عمل" کی بنیاد کہنا چاہیئے۔ ہمارے نزدیک لینن کا شاید سب سے اہم کارنامہ یہی تھا کہ اُس نے بھانپ لیا کہ غالی اشتراکی طرزِ عمل کا رواج بالکل ناممکن ہے، چنانچہ اُس نے جان بوجھ کر سرمایہ داری کی طرف قدم بڑھایا اور کہہ دیا کہ "حضرات، ہم اصل داری کو روک نہیں سکتے لیکن اسے مملکتی اصل داری کے راستے پر لگا سکتے ہیں"[۱۵]

۵- جولائی ۱۹۲۱ء کو ایک قدم اور بڑھایا گیا، یعنی کارخانے اور گرنیاں مختلف شرکتوں اور افراد کو پٹے پر دے دی گئیں۔ اس کے بعد پہلے تو انجمن ہائے امدادِ باہمی کو روپیہ کام میں لانے کی اجازت دی گئی اور رفتہ رفتہ زر کی ترویج کے راستے سے جملہ رکاوٹیں اٹھا دی گئیں، چنانچہ اب روسی معاشی اصول اور انفرادی معاشی طرزِ عمل میں بہت کم فرق باقی رہ گیا۔ روپیہ کی ترویج کی وجہ سے تجارتی کاروبار کا ازسرِ نو احیا ہوگیا، دوکانیں کھل گئیں اور ازسرِ نو خرید و فروخت کی کیفیت تین سال بعد نظر آنے لگی۔ ۹- جولائی کو ریلوں پر سفر کرنے کا کرایہ لیا جانے لگا، یکم اگست کو ڈاک اور تار کا محصول عائد ہوگیا، ۵ استمبر کو پانی، بجلی اور گیس خرچ کرنے کا معاوضہ مانگا جانے لگا اور ساتھ ہی کئی سال بعد ٹراموے کا کرایہ اور کپڑوں کی دھلائی لی جانے لگی۔ ستمبر اور اکتوبر میں اراضی، گودامول

---

[۱۵] لینن کی تقریر ۶ مئی ۱۹۲۱ء، دیکھو رجسٹر سالانہ Annual Register ۱۹۲۱ء صفحہ ۱۹۴

اور وہ کانوں کے کرایہ کا طریقہ دوبارہ رائج کیا گیا اور رفتہ رفتہ ہر ایک چیز کی قیمت یا اجرت روس میں پہلے کی طرح ایک معمولی بات ہوگئی۔ سرمایہ داری کی طرف یہ میلان برابر جاری رہتا ہے تاآنکہ ۱۹۲۵ء میں دوازدہ سالہ پٹے کے ذریعے سے اراضی منتقل کرنے کی اجازت دی جاتی ہے اور مزدوروں کو چھوٹے چھوٹے کارخانوں کا انتظام کرنے دیا جاتا ہے، ساتھ ہی غیر ممالک کے سرمایہ کو روس کی طرف منتقل کرنے کے طرزِ عمل کی ابتدا ہوتی ہے جس کا اولین مظاہرہ یہ ہے کہ اسی سال "شرکتِ معدنیاتِ زرِ دریائے لینا" کو از سرِ نو سونے کی کانوں کا ٹھیکہ دے دیا جاتا ہے۔

الغرض جہاں زمانہ حال کی انفرادی حکومتیں انتہائی انفرادی اصول سے ہٹ کر بہت سے ایسے کام کرتی ہیں جنہیں افراد بھی آسانی سے انجام دے سکتے ہیں، وہاں روس جیسے اشتمالیت پسند ملک کو، جس میں جملہ قدیم آثارِ انفرادیت کو بالکل نابود کرکے اشتمالیوں نے گویا ایک جدید باب کی ابتدا کردی تھی، اپنے مرغوب اور چہیتے اصول سے بہت کچھ ہٹ جانا پڑا ہے۔ اگر غور کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ انفرادیت، اشتراکیت اور اشتمالیت یہ سب مملکت کے حقیقی مقاصد کے حصول کے مختلف طریقے ہیں۔ ان طریقوں کا تعین مختلف ممالک کی تاریخ ان کی جغرافی کیفیات اور وہاں کے باشندوں کی عادات و اطوار پر منحصر ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت تک کوئی ایسا سیاسی طرزِ عمل دریافت نہیں ہوا جو یکساں جملہ ممالک پر حاوی ہو۔ وہی حکومت بہترین ثابت ہوگی جو مملکت کے مقاصد کی ترویج میں حتی الامکان کوشاں ہو، اور مملکت کے حقیقی مقاصد کیا ہیں اور کیا ہونے چاہئیں، اس پر آئندہ باب میں بحث کی جائے گی۔

ہارون خاں شروانی

اصطلاحات باب ۸

اجارہ	Monopoly	انجمنِ اقوام	League of Nations
اجتماع	Convention	انجمنِ امدادِ باہمی	Cooperative Society
اعداد و شمار	Statistics	بقائے اصلح	Survival of the fittest
اکائی	Unit	پارہ	Paragraph

پیش کش	Benevolence	عشر	Tithe
تسجیل	Registration	غیر ملکی رسالہ	Foreign Legion
تنظیم	Organization	کاروباری جتھے	Trusts & Pools
جدید معاشی طرزِ عمل	New Economic Policy (Nep.)	کاغذِ ممہور	Stamped Paper
چنگی	Excise	مبادلہ	Barter
حکیاتی	Scientific	محاصلِ وراثت	Death Duties
خمس	Fifth	محصولِ آمدنی	Income Tax
شرکت	Company	میکانی	Mechanical
شرکتِ معدنیاتِ زرِ دریائے لینا	Lena Gold Fields Company	نوادرخانہ	Museum
		وفاقی حکومت	Federal Government

شاعر

دور بہت دور، آسمانوں میں، موسمِ خزاں کے وقت بجلیاں چمک چمک کر آنکھوں کو چندھیا دیتی ہیں۔

آندھی آہستہ آہستہ اٹھتی ہے، وہ زور زور سے سائیں سائیں کرتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ فنا ہو جاتی ہے اور اکثر اپنے خوفناک پروں اور طویل بازوؤں پر، دور افتادہ مسافر کی دھیمی دھیمی کراہوں اور آہ و فغاں کی دردناک صداؤں کو لئے ہوئے اڑا کرتی ہے

اور جب تمام دنیا پر ایک وحشتناک سکوت طاری ہو جاتا ہے اور رات کی تاریکی اپنا سیاہ برقعہ اسے اڑھا دیتی ہے تو شاعر غمگین اور متفکر شاعر باہر آتا ہے۔ ویران، سنسان اور غیر آباد راستوں پر چلنے لگتا ہے اور اُن برائیوں پر نظر دوڑاتا ہے جن کی طرف جانے کے لئے زندگی نے بہت سے دروازے کھول دیئے ہیں۔

خطرات سے مستغنی، جابجا ٹھوکریں کھاتا چلا جاتا ہے اور ہر ظاہرہ برائی سے غافل رہتا ہے تاہم اکثر اس کا سینہ سرد آہوں کا مسکن بن جاتا ہے اور اکثر اس کے افسردہ رخساروں پر بڑے بڑے آنسو جمع ہو جاتے ہیں۔

آہ یہ آنسو دماغی اور روحانی تکلیف کا ثبوت ہیں، جن سے اس کا دل روز بروز زخمی ہوتا جاتا ہے اور جو اسے یاس کی تلقین کیا کرتے ہیں۔

(ترجمہ)

محشر عابدی

تقاضائے وفا

گئے وہ دن کہ دل میں سوزِ غم تھا ‏ گئے وہ دن لبوں پر جب تھیں آہیں
تھی ہر دم دید کی دل میں تمنّا ‏ نظارہ جُو ہمیشہ تھیں نگاہیں
کسی کی گردنِ نازک میں ہر دم ‏ محبت سے حمائل تھیں یہ باہیں
کوئی نازو ادائے جاں فزا سے ‏ بتاتا تھا مجھے جینے کی راہیں

مگر وہ عہدِ زرّیں ہو چکا ہے ‏ نہیں باقی وہ اُن کی جلوہ گاہیں
ہوئیں محروم اب کیفِ اثر سے ‏ نگاہیں! آہ وہ جادو نگاہیں!!

دماغ اب تو ہمیں بھی یہ نہیں ہے ‏ کہ ظالم گیسوؤں والوں کو چاہیں
کہاں سے آئے دل میں شوقِ سجدہ ‏ نہیں ہیں حسن ہی کی بارگاہیں
ہو رنج، اگر جانکاہ، روئیں ‏ اگر چوٹیں لگیں دل پر، کراہیں

غرض دنیا ہی اپنی اور ہے اب ‏ نہ وہ ہم ہیں نہ وہ اُن کی نگاہیں

مگر با ایں ہمہ چپکے سے کوئی ‏ یہ دل میں کہہ رہا ہے پھر بھی چاہیں
تقاضائے وفا اکبرؔ یہی ہے
محبّت ہو نہ ہو لیکن نباہیں

اکبرؔ سروری لکھنوی

جزیرۂ جاوا

بحر ہند میں جزیرۂ جاوا ایک سرسبز و شاداب زمردین خطۂ زمین ہے۔ گرد و نواح کے تمام جزیروں میں یہ سب سے زیادہ زرخیز ملک ہے۔ اس جزیرے پر ڈچ قوم کی حکومت ہے اور یہ اُن کا بڑا بیش قیمت مقبوضہ ہے کوہِ آتش فشاں کا سلسلہ جزیرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاری ہے۔ اکثر پہاڑ ہمیشہ آگ برساتے رہتے ہیں۔ دریا یہاں بے شمار ہیں اور زمین کا چپّہ چپّہ زرخیز ہے۔ چونکہ سطح سمندر سے یہاں کی زمین بہت بلند ہے۔ اس لئے باوجود خطِ استوا پر واقع ہونے کے یہاں کی آب و ہوا نہایت معتدل و خوشگوار ہے۔ جو سطحِ زمین آٹھ سو فٹ سے زیادہ بلند ہے وہاں سرد ملکوں کے پودے اور درخت پائے جاتے ہیں۔ وادیوں اور میدانوں میں مختلف قسم کی پیداوار ہوتی ہے۔ مثلاً چاول، کافی، چاء، نیل وغیرہ۔ گنّے اور یہاں کے مخصوص مصالحوں کی کاشت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

ضروریاتِ زندگی اس قدر افراط کے ساتھ قدرت نے مہیا کر دی ہیں کہ باوجود اس کے کہ ملک کا بیشتر حصہ اب تک جنگل ہے یہاں کی آبادی جس کا شمار دس لاکھ سے زائد ہے پچاس ہزار مربع میل پر پھیلی ہوئی ہے جزیرے کا طول تقریباً چھ سو میل اور وسط میں اُس کا عرض تقریباً ساٹھ میل ہے۔

یہاں کی آبادی میں ملائے قوم کا عنصر غالب ہے، جو مغربی کوہستانی علاقہ میں سنڈین کے نام سے موسوم ہے یہ قوم اب تک غیر ملکی لوگوں میں مخلوط ہونے سے بچی ہوئی ہے۔ مشرقی علاقہ میں مادوری ایک قوم آباد ہے یہ لوگ بڑے مضبوط اور مستقل مزاج ہوتے ہیں۔ زمانۂ قدیم میں ہندو فتوحات کے زیرِ اثر وسطِ جزیرہ کی آبادی نسبتاً مہذب و متمدن ہو گئی تھی۔ اس دورِ تمدّن کے آثار اب تک بکثرت شکستہ مندروں کی صورت میں پائے جاتے ہیں، جن سے اُس زمانہ کی معاشرت و صنعت و فنون کا پتہ چلتا ہے، کہ یہ لوگ بھی اسی قدر ذہین اور کاریگر تھے جس قدر کہ وہ لوگ جنہوں نے اہرامِ مصری تعمیر کئے تھے۔ پندرھویں صدی میں مسلمانوں نے اس جزیرے پر حملہ کیا تھا۔ ان کے تسلّط سے یہاں کے قدیم مذہب اور خصوصیاتِ ملکی پر بڑا اثر پڑا۔

یہاں کے باشندے عموماً ذہین ہوتے ہیں۔ ان کی زبان اور لب و لہجہ میں اور ان کی رسوم وغیرہ میں مذہبی رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ان کے پاس ان کی قدیم زبان میں جو سنسکرت سے بہت مشابہ ہے ایک مقدس کتاب

ہے۔ اس کتاب کے علاوہ ادب وعلومِ قدیمہ کا کچھ اور ذخیرہ بھی اس زبان میں اب تک محفوظ ہے۔ یہاں خوشخطی کا بڑا رواج ہے۔ اہلِ جاوا کی تحریر کی خوبصورتی اور خوشنمائی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ لوگ زیب و زینت، رنگ ونفاست کے بڑے دلدادہ ہیں۔ یہاں کی مشہور صنعت وحرفت کشتی سازی، کاسہ گری، چرم سازی، پارچہ بافی کشیدہ کاری رنگ سازی ہے۔ یہ لوگ کپڑوں پر تصویریں بنانے اور ہتھیاروں اور برتنوں پر نقش ونگار بنانے میں بڑے ماہر ومشاق ہیں۔ اس کے علاوہ زراعت بھی یہاں کا مرغوب پیشہ ہے۔ کاشتکار بڑے جفاکش اور محنتی ہوتے ہیں۔

اہلِ جاوا عموماً خوش اطوار وعافیت پسند ہوتے ہیں۔ فرمانبرداری ان کی فطرت میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈچ حکومت کے زیرِ اثر یہ لوگ نہایت امن وامان کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں اہلِ چین اہلِ ہند، اہلِ عرب اور دوسرے ملکوں کے لوگ بسلسلۂ تجارت وہاں آکر آباد ہو گئے ہیں اور اصلی باشندوں کے ساتھ مخلوط ہو گئے ہیں۔ کیونکہ اہلِ جاوا بہت آزادی کے ساتھ دوسری اقوام سے شادی بیاہ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اہلِ چین کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے یہ لوگ اپنے ملک سے اپنی عورتیں ساتھ لاتے ہیں۔

ابتدا میں جب یورپ نے یہاں نوآبادیوں کا سلسلہ قائم کیا تو سب سے پہلے پرتگالی یہاں آئے لیکن اُن کے وہم وگمان میں بھی نہ آسکتا تھا کہ یہاں کی سرزمین میں قدرت نے کیسے کیسے خزانے چھپا رکھے ہیں۔ سولھویں صدی کے آخر میں ڈچ قوم نے اپنے قدم جمانے شروع کئے۔ اسی درمیان میں انگریزوں کی آمد ورفت بھی شروع ہو گئی۔ لیکن ایک صدی کے بعد انگریز تو یہاں سے چلتے بنے مگر ڈچ لوگ اپنا ڈیرہ ڈالے رہے اور جنگی محاربوں کے ساتھ رفتہ رفتہ تمام ملک پر انہوں نے اپنا قبضہ کر لیا۔ ۱۸۱۱ء سے ۱۸۱۶ء تک جاوا پر انگریزوں کا تسلّط تھا لیکن صلحِ عام کے بعد انگریزوں نے یہ نوآبادی ہالینڈ کو دے دی۔ اب یہاں ہالینڈ کی دو عملی حکومت ہے کچھ تو ایسی ریاستیں ہیں جن پر ملکی شہزادے حکمران ہیں لیکن اُن کے مشیرِ کار ڈچ ریزیڈنٹ ہیں، اور دوسری صورت یہ ہے کہ ہر گاؤں میں ایک سردار یا سرگروہ منتخب کر لیا جاتا ہے اور وہی ان پر حکومت کرتا ہے۔ اہلِ جاوا کی طینت میں غلامی کا مادہ سرایت کئے ہوئے معلوم ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی انتہائی تمنا یہ ہوتی ہے کہ اُن کو ڈچ حکومت کی ماتحتی میں کوئی ملازمت مل جائے۔

جزیرۂ جاوا میں سُریبیا ایک نہایت آباد تجارتی شہر ہے اور بڑا عالی شان بندرگاہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں جزیرہ مدورا واقع ہے۔ اس بندرگاہ سے ایک ریلوے لائن سولو تک جاری ہے۔ شہر سولو جزیرے کے

اندرونی حصے میں واقع ہے اور یہاں کا دارالحکومت ہے۔ ایک ملکی شہزادہ یہاں برائے نام بادشاہ ہے۔ ورنہ دراصل عنانِ حکومت ڈچ ریزیڈنٹ کے ہاتھ میں ہے۔ سولو ریلوے لائن کا بہت بڑا جنکشن ہے۔ جزیرے میں ہر چہار طرف یہاں سے ریلوے لائن جاری ہے۔ جزیرے کے اس حصے میں جوکجوکارتا ایک اور دارالسلطنت ہے۔ یہاں کا رئیس سلطان کے لقب سے موسوم ہے۔

یہاں اکثر شہر بارونق اور آباد ہیں ریلوں کی کثرت سے ان میں روز بروز ترقی ہو رہی ہے۔ سڑکیں بہت کشادہ اور صاف ہیں۔ دیہاتوں کی سڑکیں بہت عمدہ اور سایہ دار بنی ہوئی ہیں۔ دریاؤں پر کثرت سے پل بنائے گئے ہیں یا کشتی کے پلوں کا انتظام ہے۔ شہروں میں خوب ہل چل رہتی ہے۔ سڑکیں ہمیشہ آدمیوں سے بھری رہتی ہیں۔ لوگ طرح طرح کے رنگین اور بھڑکیلے لباس پہنے چلتے پھرتے اچھے معلوم ہوتے ہیں مردوں کی ٹوپیاں چھاتے سے ملتی جلتی پٹاری کی طرح ہوتی ہیں۔ یہ چپٹا ؤدار اور مختلف رنگوں کی بنائی جاتی ہیں۔

دیہاتوں میں کثرت سے کیلوں اور بانسوں کے کنج سرسبز و شاداب کھیتوں کے درمیان پائے جاتے ہیں یہاں تمام سال ہر موسم میں تخم ریزی ہوتی رہتی ہے اور ساتھ ساتھ فصلیں کٹتی رہتی ہیں۔ زمین کا ایک ایک بسوہ کارآمد بنا لیا گیا ہے۔ یہاں کی پہاڑیوں کا منظر بھی خوب ہوتا ہے۔ ہرے بھرے لہراتے ہوئے دھانوں کے کھیت ان پر چاروں طرف دکھائی دیتے ہیں اور ان کے بیچ بیچ میں چھوٹی چھوٹی نہریں جاری ہوتی ہیں جن کی وجہ سے پہاڑیوں کا نظارہ نہایت دلفریب و دلکش معلوم ہوتا ہے۔

موسم کی حالت تمام سال یہاں ایک سی رہتی ہے۔ اور ہمیشہ بہار جیسا سماں رہتا ہے۔ اس لئے قدرتی مناظر میں ایک دائمی حسن پیدا رہتا ہے۔ قدرتی مناظر میں جس قدر رنگوں کی افراط اور گوناگونی یہاں پائی جاتی ہے شاید ہی اس قدر کہیں اور ہو۔ مارچ سے اکتوبر تک البتہ آسٹریلیا کے ریگستان سے خشک آندھیاں اس جزیرے کے شرقی حصہ میں کچھ دنوں کے لئے خزاں کی سی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں پھر ملک سرسبز و شاداب ہو جاتا ہے۔ شاذ و نادر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پانی متواتر کئی کئی سال تک نہیں برستا خشک سالی کی وجہ سے قحط پڑ جاتا ہے اور خلقِ خدا تباہ و برباد ہونے لگتی ہے۔ لیکن جیسے ہی پانی برسنا شروع ہوا تمام ملک میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور ساری فضا خوشحالی اور فراغ بالی کے ترانوں سے گونج اٹھتی ہے۔ بارش عموماً سہ پہر کو ہوتی ہے۔ اور اس قدر پابندی اور التزام کے ساتھ ہوتی ہے کہ گویا کہیں بارش کا ذخیرہ موجود ہے اور ہر روز وقتِ معینہ پر اُس کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے اور بادل اُٹھ کر پانی برسا جاتے ہیں +

محمد عبدالحی

میں حیران ہوں!

میں یہ سوچتا ہوں کہ آج سے چھ سات ہزار سال پہلے جب آدم نے پہیے کو ایجاد کیا تو اُس نے کیا خیال کیا ہوگا؟ ـــــ اُس نے ایک ایسے عقدہ کو حل کیا جس کے طفیل اس نے اپنے زمانے کو بار برداری، سواری اور دیگر ضروریات کے لئے بیل گاڑی جیسی کارآمد چیز دی۔ اور پھر ساتھ ہی کمہار کو چاک جیسی مفید شے مل گئی جس سے برتن اور دیگر اشیا بننے لگیں۔ چرخا بنا، آدمی کاتنے، بننے، کپڑا پہننے لگا۔ دنیا کا وہ اولین محسن جو چکر کا موجد ہے جس نے وہ چیز نکالی جو آج کل موٹریں، ریل یں، ہوائی جہازیں رونما ہے اپنے زمانہ کا ایڈیسن ہوگا۔ اُن دنوں لوگ اپنے آبا و اجداد سے اپنے آپ کو بڑھ چڑھ کر جانتے ہونگے۔ اُس وقت کے لوگ یہ کہتے ہونگے کہ اس "جدید زمانے" میں بھی لوگ کتنے جاہل ہیں کہ انہیں کسی بات کی سمجھ نہیں۔ وہ حیوانوں کے مشابہ ہیں، ان میں "ابھی تک" بربریت، بہیمیت اور سفاکی پائی جاتی ہے۔ جوان آدمی کہتے ہونگے کہ ابھی تک لڑکیاں اُن سے جھینپتی ہیں، ان سے بچتی ہیں اور محبت کو نہیں جانتیں۔ نوخیز، پختہ کاروں کو ابلہ، سٹھیایا اور بہترا کہتے ہونگے۔ لوگ تانبے، پیتل کے برتن، ہتھیار، ساز و سامان اور زیورات کے استعمال میں پھولے نہ سماتے ہونگے۔ وہ ازمنۂ حجریہ کے باشندوں کو کتنا حقیر جانتے ہونگے اور بزعم خود دنیا کے افضل ترین، اشرف ترین اور افہم ترین انسان ہونگے۔

اس کے بعد زمانۂ جدیدیہ کے لوگ اور بھی مغرور، طاقتور اور لائق ہونگے۔ پیتل تانبے کے زمانوں کو وہ بہت نیچا گردانتے ہونگے۔ پچھلے لوگوں کی باتوں، قصوں اور روایتوں پر خوب ہنستے ہونگے۔ ان کے کھنڈرول اور دیگر آثار کو دیکھ کر وہ لوگ کون جانے کن کن خداؤں کی درشتی اور غیض و غضب سے تھرّاتے ہونگے۔ اُن دنوں ایہوا جو بعد میں یہودہ۔ جیہووا (Jehovah) جوپیٹر (Jupiter) جوو (Jove) اور God بنا دنیا پر اور لوگوں کے دماغوں پر متمکن تھا۔ ان دنوں ہر خارجی طاقت ذی روح تھی، ان دنوں خدا لوگوں کے بہت نزدیک تھے اور بہت مغلوب الغضب تھے۔ وہ قہاریت، جبروت اور ہیبت سے عالم کو منظم کرتے تھے۔ ان دنوں آدم بہت پست تھا کیونکہ خداوند ستانے اور مٹانے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے، مگر لوگوں کے دل وسیع تھے کیونکہ وہ ایک خدا کا تصور اپنے باقی ماندہ خداؤں کی بے حرمتی شمار کرتے تھے۔ اِخناٹن بیچارا وہ فرعونِ مصر جو نوجبسد کا

پہلا مُبلّغ تھا مصریوں کے غصّہ کا شکار ہوا اور اپنی سلطنت تک کھو بیٹھا۔ مگر لوگ خداوندانِ عالم کی اُسی تعبد، ذلّت اور خوف سے پرستش کرتے رہے۔ آدم جب بھی اپنے زمانے کی بہترین مخلوق تھا۔

اسیریوں، بابلیوں اور کلدانیوں کی دنیا جو دجلہ و فرات کے منبع سے لے کر خلیج فارس تک لمبائی میں اور ایران سے لے کر مصر تک چوڑائی میں پھیلی ہوئی تھی۔ جنہوں نے علم النجوم کی بنیاد ڈالی، جنہوں نے پہلے پہل قانون مرتب کئے، وہ جنہوں نے اول اول گھوڑوں کا استعمال کیا اور جنہوں نے اپنی تہذیب کو مصری پیوند دے کر حطّیوں کو ورثہ میں چھوڑا، اُن کا آدم دنیا کا اکمل ترین انسان سمجھا جاتا تھا۔

حطّی، کریطی، ایجی اور دُوسری اقوام پے بہ پے مہذب ہوئیں، بڑی بڑی سلطنتوں کی موسس ہوئیں تمدن کی راہ میں کئی ایک قدم بڑھیں، علم التعمیر میں انہوں نے رنگ رنگ کی اختراعات کیں۔ کتنی چیزیں سونے میں بہتر ہوئیں، علم میں، دولت میں، طاقت میں ترقی ہوئی۔ ان دِنوں جب کناسس کے محلات میں منوئی بادشاہ لڑکیوں کا ناچ اور سرکس کے کھیل دیکھا کرتے تھے، جب آدم کا دماغ ماقبل سے کئی درجہ اونچا تھا۔

یونانیوں میں آدم بہت بڑھا پھولا، ان کی تخم ریزی لوگ اب تک نہیں بھولے، ان کے آثار ابھی تک تحسین کا خراج لے رہے ہیں۔ اور معلوم نہیں ان کی آبیاری کتنی دیر تک پھل لاتی رہے گی۔ ان دنوں جب سقراط دنیا کا اجہل ترین اور اعقل ترین شخص تھا، وہ زمانہ کیا تھا؟ جب حسن کی تفہیم میں آدمی بلند ترین مقاموں تک جا پہنچا۔ جب قضا و قدر کے مسائل نے ادیبوں کو رفعت دی۔ جب فلسفی حقیقت کو بے نقاب کر رہے تھے، جب وطنیت کے جذبات محترم سمجھے جانے لگے، جب شہبازی اور شہامت لوگوں میں معزز اور موقر بن گئی، جب دلاور، شاعر، عالم و فلسفی ابطالِ زمان ہو گئے، جب دنیا کو غور و فکر کی عادت پڑ گئی تب آدم کا سر بادلوں سے بھی بلند ہونے لگا۔

پھر جب یونانیت پر رومیت حاوی ہوئی اور رومیت جہانگیر ہو گئی، جب زمین افواجِ روما سے لرزنے لگی۔ جب قیصری صولت خدائی کی دعویدار ہوئی جس وقت عیسیٰ کے عاشقوں سے اُس کا تصادم ہوا اور جب انہیں عیسائیوں نے سیرزی کبر و نخوت اور دعوائے خدائی کو خلافتِ خدائی میں تبدیل کیا اس وقت عربستان میں ایک ہیجان پیدا ہوا اور ایک عظیم ہستی کا ظہور ہوا، جس کے نور کی کرنوں نے ازمنۂ مظلمہ کو روشن کر دیا۔ اس وقت جب عربی عظمت نے یونانی علم و فضیلت کو سینا و فارابی، ابنِ رشد اور ابنِ طفیل جیسے چار چاند لگاتے، جب بغداد و قرطبہ دنیا کے مکتب تھے، ان دنوں زمانہ جدید کی بنیاد پڑی، جب لوگ اس آنے والے دور کی دھندلی

تصاویر دیکھنے لگے اس وقت آدم فضائے بسیط میں اُڑنے لگا۔

اور اب جس وقت لاسلکی کے ذریعہ سے عکاسی ہورہی ہے اور روحانیات اور دوراحساسی کے مسائل ابعادِ ربعہ کی باریکیوں کے ساتھ ہمارے دماغوں میں کھولے جارہے ہیں، جب آدم نیچر کو تسخیر کررہا ہے، جب ہم دس ہزار سال کی سعیِ پیہم کے جائز وارث سمجھے جاتے ہیں، جب ہم مستقبل کو جوان نظروں سے دیکھ رہے ہیں، جب ہمارے خون میں حدت ہے، دل میں جوش ہے، دماغ میں بصیرت ہے اس وقت میں تنہائی میں بیٹھا سوچتا ہوں کہ میرے آباواجداد میں کوئی آج سے ہزار، دوہزار، دس ہزار سال پہلے بھی سوچ رہا ہوگا کہ وہ کتنا ترقی یافتہ، مہذب اور متمدن ہے۔ وہ ماضی کی سطح سے کتنا اونچا اور اُس کی فکر کتنی رسا ہے۔

اور جب میں خیال کرتا ہوں کہ آج سے دوہزار سال بعد میری اولاد یہ سوچتی ہوگی کہ بیسویں صدی میں دنیا ابھی صغرسن تھی اور لوگ کورانہ خیالات رکھتے تھے، وہ کس قدر توہم پرست تھے ان کے افکار کتنے طفلانہ تھے تو چالیسویں صدی کا آدم مجھے یہ کہتا سنائی دیتا ہے "میں کتنا اعلیٰ اور برتر ہوں"۔ میں یہ سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں!

فیاض محمود گیلانی

---

(۱) کام میں تیزی نہیں بلکہ خوبی مدِنظر رکھو کیونکہ لوگ کام کی مدت نہیں پوچھتے وہ تو عمدگی کو دیکھتے ہیں

(۲) جب اقبال آتا ہے تو خواہشیں عقل کے تابع ہوجاتی ہیں اور جب ادبار آتا ہے تو عقل خواہشوں کی مطیع ہوجاتی ہے۔

(۳) درگذر آدمی کو اتنا ہی بگاڑتی ہے جتنا اعلیٰ کو بناتی ہے۔

(۴) شریف کے حملہ سے بچو جب وہ بھوکا ہو اور کمینہ سے جب وہ آسودہ ہو۔

(۵) آدمی کو جب اپنی بساط سے بڑھ کر دنیا مل جاتی ہے تو لوگوں کے ساتھ اُس کا برتاؤ برا ہوجاتا ہے۔

(۷) فتح شریفوں کے پاس گنہ گاروں کی سفارش ہے۔

(۸) آدمی کا دل جب مضبوط ہوتا ہے تو وہ عقل پر بھروسا کرتا ہے اور جب کمزور ہوتا ہے تو تقدیر پر۔

(۹) اپنا دل اپنی عقل کے سوا کسی کو نہ بخشو ورنہ بُرے کو اس کا مالک بناؤ گے۔

سید دبیر حسین دبیر حیدرآبادی

جامِ صہبائی

(۱)

جامِ مئے لالہ گوں کہاں سے لاؤں!
درمانِ غمِ دروں کہاں سے لاؤں!
مانا کہ ہے اضطراب غارتگرِ زیست
بیتاب کو سکوں کہاں سے لاؤں!

(۲)

تاریکیٔ شب میں روح گھبراتی ہے
پیغامِ طرب بانگِ سحر لاتی ہے
مستی میں پیا جو زہر تریاق بھی ہے
یوں سب کی گزرتی ہے گزر جاتی ہے

(۳)

گزری ہے جگر پہ زخم سہتے سہتے
زہرابِ الم کے جام پیتے پیتے
سو بار اگرچہ شکوۂ غم بھی کئے
گردن نہ کبھی جھکا سکی جیتے جیتے

(۴)

جو لطف ہے جستجو میں حاصل میں نہیں
لذت جو تگ و دو میں ہے منزل میں نہیں
وہ منظرِ زندگی کہ امواج میں ہے
کشتی میں نہیں سکونِ ساحل میں نہیں

اثر صہبائی

دیوار پر چہرہ

گزشتہ شام ڈیبنی کے ہاں ایک واقعہ پر مجھے اتنی خفت اٹھانی پڑی کہ اب تک میں سخت منفعل ہوں، ہاں اتنا اطمینان ہے کہ اس انفعال میں بہت سے دوسرے لوگ بھی میرے شریک حال ہیں،

مرگِ انبوہ جشنے دارد

فوق الفطرت واقعات کا تذکرہ ہو رہا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ موضوع جس قدر لاحاصل ہے اسی قدر دلفریب بھی ہے۔ چنانچہ ہم میں سے تقریباً ہر شخص نے کوئی نہ کوئی واقعہ بیان کیا لیکن ان بیانات سے سننے والے کچھ بہت زیادہ متاثر نہ ہوئے۔ جن لوگوں سے میری شناسائی نہ تھی اُن میں مختصر سے قد و قامت کا ایک زرد رو شخص بھی تھا جو بشرے سے بہت متفکر معلوم ہوتا تھا۔ اس شخص کو رڈسن وائٹ اپنے ساتھ لایا تھا۔ وہ ہم میں سے ہر ایک کا بیان نہایت توجہ سے سنتا رہا لیکن اپنی زبان کو اُس نے مطلق جنبش نہ دی۔ پھر اُسے بھی گفتگو میں شریک کرنے کے لئے ڈیبنی نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا" کیا آپ کو کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جو قابلِ ذکر ہو، کوئی ایسی داستان جس کا کوئی حصہ ناقابلِ توجیہ ہو؟"

اُس نے تھوڑے سے تامل کے بعد کہا" اچھا تو پھر سنئے مگر یہ کوئی داستان نہیں، یعنی داستان کا لفظ عرفِ عام میں جس مفہوم کا حامل سمجھا جاتا ہے اس کا اطلاق میرے بیان پر نہیں ہو سکتا۔ آپ میں سے اکثر صاحبوں نے محض سنی سنائی باتیں بیان کی ہیں، لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ میرا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ حقیقت افسانہ کے مقابلہ میں نہ صرف بدرجہا تحیر خیز ہوتی ہے بلکہ بدرجہا زیادہ دل آویز بھی ہوتی ہے۔ میری داستان آپ بیتی ہے، اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ آج ہی سہ پہر کے وقت یہ داستان تکمیل کو پہنچی"

ہم نے بہ اصرار اس سے داستان شروع کرنے کی درخواست کی۔

اس نے کہا" سال یا دو سال قبل میں نے" گریٹ آرمنڈ سٹریٹ" میں ایک قدیم مکان کے چند کمرے اپنے رہنے کے لئے کرایہ پر لے رکھے تھے۔ سونے کے کمرے کی دیواروں پر کسی سابق کرایہ دار نے رنگ کرایا تھا لیکن چونکہ جگہ سیلی تھی اس لئے دیواروں پر جا بجا رنگ کے چٹخنے سے بڑے بڑے نقش بن گئے تھے۔ ان میں سے ایک، جیسا کہ اکثر اتفاق ہوتا ہے ہو بہو انسانی چہرے سے مشابہ تھا اور یہ مشابہت معمول سے بہت زیادہ

قریبی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ چونکا دینے والی تھی۔ صبح کے وقت بستر پر لیٹے لیٹے اور بیٹھتے اُٹھتے یہ چہرہ دمبدم میری آنکھوں کے سامنے رہتا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ مجھے ایک حقیقی چہرہ معلوم ہونے لگا اور میں اسے اپنا شریک خانہ سمجھنے لگا۔ تعجب یہ تھا کہ دیواروں پر اس قسم کے دوسرے تمام نقوش بڑھتے اور اپنی ہیئت تبدیل کرتے رہتے تھے لیکن ہمیشہ بالکل غیر متغیر اور ہمیشہ بالکل ویسے کا ویسا رہتا۔

"اسی زمانے میں مجھ پر نزلہ اور بخار کا ایک شدید حملہ ہوا اور مرض نے کسی قدر پیچیدہ صورت اختیار کر لی میں دن بھر بستر پر لیٹا مطالعہ اور سوچ بچار میں مستغرق رہتا تھا۔ اس کے سوا مجھے اور کوئی کام نہ تھا۔ انہیں دنوں وہ چہرہ میرے دل و دماغ پر اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ مستولی ہونے لگا۔ میں اُسے روز بروز زیادہ حقیقی اور روز بروز زیادہ جاذب توجہ پاتا تھا بلکہ وہ دن اور رات ہر وقت میرے خیالات پر حاوی رہتا تھا۔ ناک کی ایک نرالی وضع اور پیشانی کے ایک مخصوص جھکاؤ کی وجہ سے اس چہرے میں انفرادیت کا امتیاز بدرجۂ اتم موجود تھا۔ یہ ایک ایسے شخص کا چہرہ تھا جسے ہم ہزارہا انسانوں میں سے صاف الگ پہچان سکتے ہیں۔

صحت پانے کے بعد بھی میرے خیالات اس چہرے کی قید سے آزاد نہ ہونے پاتے۔ میں بازاروں میں اُس کے ہم صورت کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا تھا۔ مجھے پختہ یقین ہو چکا تھا کہ کہیں نہ کہیں ایسا ایک حقیقی شخص بھی ضرور موجود ہے اور میرا اس سے ملنا ناگزیر ہے۔ مجھے اس کی کوئی وجہ معلوم نہ تھی کہ میں اپنی اور اس کی ملاقات کو کیوں اٹل سمجھتا تھا، مجھے صرف اتنا یقین تھا کہ کارفرمایانِ قضا و قدر نے کسی پُراسرار طریقہ سے میری اور اُس کی ذات کو باہم وابستہ کر رکھا ہے۔ میں عام اجتماعات میں کثرت سے آنے جانے لگا۔ سیاسی مجالس، فٹ بال وغیرہ کے مقابلوں اور ریلوے سٹیشنوں پر میری جستجو پرور نگاہیں ہر طرف دیوانہ وار پھرا کرتی تھیں ــــــ بالخصوص صبح کے وقت، جب مضافاتی ٹرینیں پلیٹ فارم پر آ کر انسانوں کو انبوہ در انبوہ اگل دیتی تھیں، اور پھر شام کے وقت، جب وہ انہیں دوبارہ نگل جانے کے لئے آن موجود ہوتی تھیں۔ لیکن میری یہ تمام تگ و دو بالکل بے حاصل ثابت ہوئی۔ یہ حقیقت اس سے قبل مجھ پر کبھی اتنی واضح طور پر نہ کھلی تھی کہ انسانی چہرے کی اس قدر کثیر التعداد مختلف صورتیں ہیں، اور پھر اس قدر کم! کیونکہ اس اختلاف کے باوجود ہم ان کو از روئے اصطفات اتنے قلیل التعداد گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں کہ اُن کا شمار ہاتھوں کی انگلیوں پر ہو سکتا ہے۔

"یہ جستجو میرے لئے ایک سودا بن گئی اور میں بجز اس جستجو کے دوسری ہر بات سے غافل ہو گیا۔ میں بیچ بیوپار کی منڈیوں اور عام گزرگاہوں میں لوگوں کی بھیڑ پر نظر جمائے برابر پہروں کھڑا رہتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ مجھے دیوانہ سمجھنے

لگے۔ اُدھر کوتوالی کی توجہ میری طرف منعطف ہوگئی اور وہ مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ نسوانی چہروں سے میری غلط انداز نگاہیں کوئی واسطہ نہ رکھتی تھیں۔ بس مرد اور صرف مرد ہی میری نظر بازی کا مرکز تھے "

احساسِ کوفت کی شدت کے باعث اُس نے اپنا ہاتھ پیشانی پر پھیرا اور پھر اپنی داستان کو جاری رکھتے ہوئے کہا "آخر میں نے اُسے دیکھ لیا وہ ایک ٹیکسی میں سوار تھا جو پکیڈلی میں مشرقی سمت کو جا رہی تھی میں دفعتہً مڑا اور کچھ دور تک اُس کے ساتھ بھاگا۔ پھر مجھے ایک خالی ٹیکسی نظر آئی۔ میں نے ڈرائیور سے ہانپتے ہوئے کہا اس ٹیکسی کا تعاقب کیجے اور خود اچھل کر اس میں سوار ہوگیا۔ ڈرائیور نے اس ٹیکسی کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ آخر ہم چیرنگ کراس پہنچے اور میں ٹیکسی سے اترتے ہی پلیٹ فارم کی طرف بھاگا۔ وہاں میں نے اُس شخص کو دو خاتونوں اور ایک ننھی بچّی کے ساتھ کھڑا پایا۔ وہ دو بج کر بیس منٹ کی گاڑی سے فرانس کو روانہ ہونے والے تھے۔ میں اس کے ساتھ ایک آدھ بات کرنے کا موقع پانے کے لئے اس کے قریب اِدھر اُدھر منڈلاتا رہا لیکن مجھے اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ بہت سے اور لوگ بھی اُسے رخصت کرنے کے لئے سٹیشن پر آپہنچے تھے اور وہ اُن کے درمیان گھرا ہوا گاڑی میں سوار ہوگیا۔ پھر میں نے بھی جلدی سے فوکسٹن کا ٹکٹ خرید لیا۔ مجھے امید تھی کہ وہاں جہاز کے روانہ ہونے سے قبل میں اس سے مل سکوں گا۔ لیکن فوکسٹن میں وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ مجھ سے قبل جہاز کے عرشے پر پہنچ گیا اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوگیا۔ جہاز کے اس حصے میں اُس نے متعدد کمرے اپنے لئے مخصوص کرا رکھے تھے میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی نہایت متمول شخص ہے۔

"مجھے پھر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن اس پر میں نے بھی سمندر کو عبور کرنے کا ارادہ کر لیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ جہاز کا سفر شروع ہونے کے بعد وہ خاتونوں کو تنہا چھوڑ کر عرشے پر ٹہلنے کے لئے باہر آئے گا۔ میرے پاس اُس وقت بولون تک صرف ایک طرف کے کرائے کی رقم تھی لیکن ان باتوں سے میرا عزم کہاں متزلزل ہونے والا تھا۔ میں اس کے کمرے کے دروازے کے سامنے ہی بیٹھ کر انتظار کی ساعتیں گننے لگا۔ ایک مدت کے انتظار کے بعد دروازہ کھلا اور وہ باہر نکلا لیکن چھوٹی بچّی اس کے ساتھ تھی۔ میرا دل نہایت زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے اس کے چہرے کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہوئی تھی۔ ایک ایک خال اور ایک ایک خط اسی دیوا والے چہرے کا تھا۔ اُس نے میری طرف گھور کر دیکھا اور پھر عرشۂ جہاز کے بالائی حصے پر جانے کے لئے ایک بغلی راستے کی طرف ہو لیا۔ میں نے دل میں کہا کہ اگر اب بھی میں ناکام رہا تو پھر مجھے کامیابی سے ہمیشہ کے

لئے ہاتھ دھولینے چاہئیں۔ چنانچہ میں نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہہ ہی دیا "معاف فرمائیے میں حارج ہوا لیکن اگر آپ مضائقہ نہ سمجھیں تو مجھے اپنا ملاقاتی کارڈ عنایت فرمائیے۔ میں نہایت اہم وجوہ کی بنا پر آپ سے تعارف حاصل کرنے کا خواہشمند ہوں"۔

"وہ یہ سُن کر کچھ متحیّر سا رہ گیا لیکن اُس نے میری درخواست قبول کرلی چنانچہ نہایت دلجمعی کے ساتھ اُس نے جیب میں سے اپنا کارڈ نکالا اور اسے میرے حوالہ کرکے خود بسرعت تمام بچّی کی معیّت میں آگے نکل گیا۔ ظاہر ہے کہ اُس نے مجھے دیوانہ خیال کیا اور یہی زیادہ مناسب سمجھا کہ میری خواہش پوری کردی جائے۔

"میں کارڈ کو مضبوطی کے ساتھ اپنی گرفت میں لے کر اُسے پڑھنے کے لئے جہاز کے ایک تنہا گوشے میں چلا گیا۔ میری آنکھیں پتھرا گئیں اور میرا سر چکرانے لگا جب میں نے کارڈ پر اُس کا نام پڑھا: مسٹر آرمنڈ وال⁵ پٹس برگ، ریاستہائے متحدۂ امریکا۔ اس کے بعد مجھے اَور کچھ یاد نہیں۔ جب میں ہوش میں آیا تو میں نے اپنے آپ کو بولون کے ایک شفاخانے میں پایا۔ وہاں میں ہفتوں خراب وخستہ حالت میں پڑا رہا اور اب مجھے وہاں سے واپس آئے بہ مشکل مہینا بھر گزرا ہے۔"

اس کے بعد وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگیا۔

ہم سب فرطِ حیرت سے کبھی اُس کی طرف اور کبھی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے۔ اس شام ہم نے جس قدر باتیں سنی تھیں وہ اس چھوٹے سے زرد رُو آدمی کی داستان کے مقابلہ میں بالکل ہیچ معلوم ہوتی تھیں۔

چند لمحوں کے بعد اُس نے کہا "میں نے گریٹ آرمنڈ سٹریٹ میں واپس آکر اس امریکن کے حالات کی تحقیق وتفتیش کا کام شروع کیا جس کی زندگی میں بعض پُر اسرار اتفاقات نے مجھے یوں دخل انداز کردیا تھا۔ میں نے پٹس برگ میں لوگوں کو خطوط لکھے، امریکن ایڈیٹروں سے مراسلت کی اور لنڈن میں جو امریکن مقیم تھے اُن سے میل ملاقات شروع کی لیکن مجھے بجز اس کے اور کچھ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ ایک کروڑپتی ہے اور اُس کے والدین انگریز تھے جو لنڈن میں رہا کرتے تھے۔ یہ مجھے باوجود انتہائی کوشش کے معلوم نہ ہوسکا کہ لنڈن میں اُن کی جائے سکونت کس مقام میں تھی۔

"گزشتہ صبح تک حالات بدستور رہے۔ میں رات کو معمول سے زیادہ تھکا ماندہ لیٹا تھا، اس لئے دیر تک سوتا رہا۔ جب میں بیدار ہُوا کمرے میں دھوپ پھیل رہی تھی۔ میں نے حسبِ عادت سب سے پہلے دیوار پر چہرہ

---

⁵ WALL دیوار

دیکھنے کے لئے نظر اٹھائی۔ میں نے اپنی آنکھوں کو ہاتھوں سے مل مل کر دیکھا اور خوف و ہراس سے کانپ اٹھا۔ چہرے کے محض دھندلے سے نقوش دکھائی دے رہے تھے۔ گزشتہ ہی شب چہرہ حسبِ سابق بالکل صاف صاف نظر آتا تھا بلکہ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے بات کیا ہی چاہتا ہے لیکن اب صرف ایک ہیولیٰ سا باقی رہ گیا تھا۔

"میں افسردہ و سراسیمہ بستر سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ صبح کے اخبارات چھپ کر بازاروں میں فروخت ہونے کے لئے آ چکے تھے۔ فہرستِ مضامین کے اشتہاروں میں میری نظر اس عنوان پر پڑی "امریکن کروڑپتی کو موٹر کا حادثہ" آپ سب نے اخبارات میں یہ واقعہ پڑھا ہو گا۔ میں نے فوراً اخبار خرید لیا اور جو خبر مجھے پڑھنی چاہیئے تھی پڑھی۔ "پٹس برگ کے کروڑپتی مسٹر آرمنڈ وال متعلقین کے ساتھ ایک موٹر کار میں سپیزا سے پیسا کو جا رہے تھے کہ ان کی موٹر ایک چھکڑے سے متصادم ہو کر الٹ گئی۔ مسٹر وال کی حالت نازک ہے"۔

"میں اسی سراسیمگی کی حالت میں واپس اپنے کمرے میں آیا اور پلنگ پر بیٹھ کر اپنی دھندلی آنکھوں سے دیوار پر چہرے کو دیکھنے لگا۔ اسی حالت میں چہرہ دفعتہً بالکل غائب ہو گیا۔

"بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ضربات کی شدت کے باعث مسٹر وال غالباً ٹھیک اسی وقت جاں بحق ہو گئے تھے"۔

اس کے بعد وہ پھر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔

ہم سب نے فرداً فرداً مختلف کلمات سے اظہارِ تعجب کیا اور فی الواقع یہ مقامِ استعجاب تھا۔

پھر اجنبی نے کہا "مجھے اس واقعہ میں تین باتیں نہایت ہی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ لنڈن کے ایک مکان کی دیوار کے چٹخنے سے نہ صرف ایک ایسے شخص کی صورت بن گئی جو امریکا میں تھا بلکہ یہ صورت اُس شخص کی زندگی کے ساتھ نہایت گہرا ربط بھی رکھتی تھی اس واقعہ کی توجیہ سائنس سے فی الحال ممکن معلوم نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس شخص کا نام بھی اسی مقام سے ایک نسبت رکھتا تھا جہاں کسی پوشیدہ قوت نے ایک عجیب و غریب طریقے سے اس کی صورت بنا دی تھی۔ یقیناً آپ کو بھی ان واقعات پر حیرت ہوئی ہو گی"۔

ہم سب نے اِس سے اتفاق کیا اور پھر ہم لوگوں کے درمیان فوق الفطرت مظاہر کے متعلق دوبارہ وہی بحث پہلے سے دو چند جوش و خروش کے ساتھ چھڑ گئی۔ اس اثنا میں وہ اجنبی شخص اٹھا اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوا۔ ابھی وہ دروازے ہی میں پہنچا تھا کہ ہم میں سے ایک شخص نے (مقامِ مسرت ہے کہ وہ میں نہیں تھا) اُس سے

اس دلچسپ واقعہ کے متعلق تیسری حیرت انگیز بات دریافت کر کے ہمیں اپنی گرما گرم بحث کے محرک کی طرف دوبارہ متوجہ کیا سپینٹن نے اُسے یاد دلایا کہ اُس نے تین حیرت انگیز باتیں کہی تھیں۔

اُس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا "ہاں وہ تیسری بات، میں اِسے بھول ہی رہا تھا۔ تو اس داستان کے متعلق وہ تیسری حیرت انگیز بات یہ ہے کہ میں نے اسے نصف ہی ساعت قبل تصنیف کیا تھا۔ لیجیے خدا حافظ"

ہوش و حواس درست ہونے کے بعد ہم نے رڈسن وائٹ کو تلاش کیا جو اس مارِ آستین کو محفل میں لے کر آیا تھا لیکن وہ خود بھی غائب ہو چکا تھا۔

(ترجمہ) **حامد علی خاں**

دیہاتی گیت

۱۔ میری بارہ برس کی عمر میں میرے پران ناتھ پردیس گئے۔ بارہ برس کے بعد لوٹے تو باغ میں ڈیرا ڈالا۔ انہوں نے گاؤں والوں کو بلا کر پوچھا کہ میری بیوی کی چال ڈھال کیسی ہے۔

۲۔ گاؤں والوں نے کہا آپ کی بیوی بڑی نیک ہے اُس کے چہرے سے روحانیت برستی ہے وہ عالی خاندان اور نہایت شریف ہے

۳۔ باغ سے اٹھ کر شوہر اپنے دروازے پر آیا اور اُس نے خادمہ کو بلا کر پوچھا کہ میری بیوی کا رنگ ڈھنگ کیسا ہے؟

۴۔ خادمہ نے جواب دیا "مالک! آپ کی بیوی انگوٹھا دبا کر چلتی ہے۔ گھونگھٹ کاڑھ کر قدم اٹھاتی ہے وہ بڑے گھر کی لڑکی ہے اُس نے تینوں خاندانوں (ننہال۔ ددھیال اور سسرال) کی عزت کو برقرار رکھا ہے۔

۵۔ شوہر اب اپنے گھر میں داخل ہوا اُسے دیکھتے ہی ماں نے چوکی بچھا دی اور بہن پانی لے کر دوڑی۔

۶۔ اُس نے ماں سے پوچھا کہ میری بیوی کا چال چلن کیسا ہے۔ ماں نے کہا۔ بیٹا! تیری بیوی تیری محبت میں مگن ہمیشہ نیچی نظر کر کے چلتی ہے

۷۔ میرے لختِ جگر! میری بہو کا بدن تو سوکھ گیا لیکن اس کے چہرہ پر شوہر کی غیر فانی محبت چمکتی رہتی ہے۔ وہ شریف خاندان کی لڑکی ہے اُس نے تینوں خاندانوں کی عزت کا خیال رکھا ہے۔

۸۔ شوہر اب اپنی خوابگاہ میں پہنچا اس کی بیوی وہاں سو رہی تھی۔ اُس نے جگا کر اُس کو چھاتی سے لگا لیا اور پوچھا کہو! کیسی ہو؟ بیوی نے جواب دیا "میرے سرتاج! آپ کے بغیر نہ تو میں نے پان کھایا اور نہ چھالیا کتری۔

۹۔ آنگن تو میرے لئے بیابان جنگل اور دروازہ خواب و خیال تھا آپ کی جدائی میں مجھے سیج کالی ناگن کی طرح کاٹتی تھی۔

اعظم کریوی

غزل

یہ کاوش باوجودِ سعیِ امکانی نہیں جاتی
محبت کی خلش دل سے بآسانی نہیں جاتی

نظر آیا تھا اک دن جلوۂ رخ بے حجابانہ
اُسی دن سے تصوّر کی پریشانی نہیں جاتی

طلسمِ رنگ و بُو کی سب حقیقت کُھل گئی پھر بھی
سرابِ زندگی! تیری درخشانی نہیں جاتی

شعاعِ حُسن سے پھر جگمگا دے خلوتِ غم کو
دلِ ویراں کی ہیبت ناک ویرانی نہیں جاتی!

کہیں بُھولے سے حرفِ آرزو اک دن جو نکلا تھا
لبِ فریاد کی اب تک پشیمانی نہیں جاتی

غمِ حرماں اُڑا لایا ہے مجھ کو اس بلندی پر
جہاں سے حسن کی صُورت بھی پہچانی نہیں جاتی

دکن چھوڑے زمانہ ہو گیا ذوقیؔ مگر اب تک
دلِ برباد کی آشفتہ سامانی نہیں جاتی

ذوقیؔ

نیند کا غلبہ

رات کا سناٹا ہے۔ تیرہ برس کی نوعمر ملازمہ کریمن پالنے کو آہستہ آہستہ جھلا رہی ہے اور نہایت مدھم آواز میں گنگناتی جاتی ہے۔

آجا ری نندیا آجا ری آ — بالے کی آنکھوں میں گھل مل جا

کمرے میں ایک چھوٹی سی ہری ہری لالٹین جل رہی ہے۔ اس سرے سے اُس سرے تک ایک سوت کی رسی بندھی ہے، جس پر بچے کے ننھے کپڑے، مالک کی قمیصیں اور مالکہ کی ساڑھیاں لٹک رہی ہیں۔ چھت پر روشنی کا ایک بڑا سا سبز دھبا جھلملا رہا ہے۔ پالنے کا نصف حصہ، کریمن اور الگنی کے کپڑے نیم تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہیں جب قندیل کی لَو جھلملانے لگتی ہے تو چھت کے سبز دھبے اور کپڑے کے سایوں میں جان پڑ جاتی ہے اور وہ بھی آہستہ آہستہ جنبش کرنے لگتے ہیں۔ کمرے میں گرمی محسوس ہو رہی ہے۔ باورچی خانہ سے گندے پانی اور باہر جوتے کی دوکان کی بدبو اندر داخل ہو رہی ہے۔

بچہ رو رہا ہے۔ روتے روتے اس کا گلا بیٹھ گیا ہے، بے دم ہو گیا ہے مگر اب بھی اس کا رونا برابر جاری ہے، خدا معلوم کب چپ ہوگا۔ کریمن کو نیند آ رہی ہے، اس کا سر جھک گیا ہے آنکھیں مندی جا رہی ہیں، بیٹھے بیٹھے اس کی پیٹھ اکڑ گئی ہے، اُس کی گردن میں شدت کا درد ہو رہا ہے، اس میں آنکھیں کھولنے کی طاقت نہیں، اس کے ہونٹوں کی قوت سلب ہو چکی ہے، اس کی آواز لڑکھڑا رہی ہے، مگر پھر بھی وہ گنگنا رہی ہے۔

آجا ری نندیا آجا ری آ — بالے کی آنکھوں میں گھل مل جا

چولہے سے ایک جھینگر کے بولنے کی بہیم آواز آ رہی ہے۔ دوسرے کمرے میں مالک اور بیوی پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔ گہوارے سے "چُر چوں" "چُر چوں" کی کراہ نکل رہی ہے۔ کریمن کی آواز رات کی فرحت فزا سنسناہٹ سے ہم آہنگ ہے۔ اُسے اب اپنی لوری سے اذیت پہنچ رہی ہے۔ اس سے خود اُس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں۔ مگر اسے سونا نہیں ہے۔ خدا نہ کرے کہ اس کی آنکھ لگ جائے۔ مالک کی بید اس کے لئے تیار ہے۔

قندیل جھلملا رہی ہے۔ چھت کا سبز دھبا اور کمرے کے سائے حرکت کر رہے ہیں اور خواہ مخواہ کریمن کے چہرے آنکھوں پر ناچ رہے ہیں۔ اس کے نیم خفتہ دماغ پر دھندلی دھندلی مبہم تصویریں صورت پذیر ہو رہی ہیں وہ آسمان

پر رنگ برنگ کے بادلوں کو ایک دوسرے کا تعاقب کرتے اور بچے کی طرح چیختے چلاتے دیکھ رہی ہے۔ لیکن ہوا چلنی شروع ہوئی ہے۔ بادل آسمان پر بکھر کر غائب ہو جاتے ہیں۔ کرمین کی نظر ایک وسیع سڑک پر پڑتی ہے جو کیچڑ اور پانی سے لبریز ہے۔ یہاں سے وہاں تک سڑک پر لدی ہوئی گاڑیوں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ بھاری بھاری بوجھ پیٹھوں پر لادے ہوئے، لوگ اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں، ان کے سائے اُن کے پیچھے پیچھے ناچ رہے ہیں، ہوا کہر آلود ہے۔ سڑک کے دونوں جانب جنگل دھندلا دھندلا نظر آرہا ہے، ایک بیک سڑک پر سب لوگ کیچڑ پانی میں گر پڑتے ہیں اور بالکل ساکت ہو جاتے ہیں۔ "ہائے یہ کیا ہو گیا" کرمین تعجب سے پوچھتی ہے "ہمیں نیند آرہی ہے، ہم سوئے جارہے ہیں" لوگ یک آواز ہو کر جواب دیتے ہیں۔ وہ سب گہری نیند میں سو جاتے ہیں اور مزے سے سوتے رہتے ہیں۔ صبح ہو جاتی ہے۔ وہ اب بھی پڑے سوتے ہیں۔ درختوں کی پھلنگیوں پر سے قسم قسم کے پرندے بچے کی طرح چیخ چیخ کر انہیں جگانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں ......

دفعتاً اس کا سر پالنے سے ٹکرا جاتا ہے وہ چونک کر آنکھیں کھولتی ہے اور اِدھر اُدھر دیکھ کر گنگنانے لگتی ہے

آ جا ری نندیا آ جا ری آ　　　　بابے کی آنکھوں میں گھل مل جا

کرمین ایک تنگ و تاریک کمرے میں ہے۔ اُس کا مرحوم باپ کلن فرش پر لوٹ رہا ہے اور وہ اسے دیکھ نہیں سکتی، صرف اس کے لوٹنے اور کراہنے کی آوازیں اس کے کانوں میں آرہی ہیں "ہائے ہائے میری انتڑیاں پھٹ گئیں" وہ چلاتا ہے اور شدتِ درد سے اس کی آواز بند ہو جاتی ہے۔ اُس کو سانس لینے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ اس کے دانت کٹ کٹ بج رہے ہیں گویا وہ سردی سے کانپ رہا ہے۔ اُس کی ماں اپنے مالک کو خبر کرنے گئی ہے کہ میرا خاوند مر رہا ہے۔ اسے گئے بہت دیر ہو گئی ہے۔ اب اُسے واپس آجانا چاہئے۔ کرمین جاگ رہی ہے اور چولہے کے پاس بیٹھی اپنے باپ کی کراہ سن رہی ہے۔

دروازے پر ایک گاڑی آکر کھڑی ہوتی ہے۔ ایک نوجوان ڈاکٹر اس میں سے اترتا ہے اور اندر داخل ہوتا ہے۔ اندھیرے میں وہ دکھائی نہیں دیتا۔ دروازے کی چُول بجتی ہے اور اس کے کھانسنے کی آواز سنائی دیتی ہے "کوئی چراغ تو جلاؤ" ڈاکٹر کہتا ہے

"ہائے میں مرا۔ میں مرا" ڈاکٹر کے حکم کا اس کے باپ کی کراہ جواب دیتی ہے۔ اس کی بوڑھی ماں دوڑ کر چولہے کے پاس آتی ہے۔ دیا سلائی جلا کر ٹوٹے ہوئے چراغ کی تلاش کرتی ہے۔ چراغ میں تیل نہیں ہے۔ ایک لمحہ خاموشی سے گزر جاتا ہے۔ ڈاکٹر اپنی جیب سے ٹٹول کر دیا سلائی کی ڈبیہ نکالتا ہے۔ کمرے میں اجالا ہو جاتا ہے

"حضور میں ابھی آئی۔ ابھی آئی" کہتی ہوئی اُس کی ماں باہر چلی جاتی ہے اور چند منٹ بعد پڑوس کے گھر سے ایک موم بتی کا ٹکڑا لئے ہوئے پھر واپس آتی ہے۔

اُس کے باپ کی آنکھیں چمک رہی ہیں۔ اس کے رخسار انگارے کی طرح سرخ ہیں وہ سب کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نظریں ڈاکٹر اور دیوار دونوں کو پار کرتی ہوئی باہر کسی چیز کو دیکھ رہی ہیں۔

ڈاکٹر اُس کی طرف مڑتا ہے "کیا کر رہے ہو۔ کس خیال میں غرق ہو"؟ وہ پوچھتا ہے "کیا کر رہا ہوں؟" اُس کا باپ جواب دیتا ہے "مر رہا ہوں میرا وقت آگیا۔ میرا شمار اب زندوں میں نہیں ہے"

"خرافات مت بکو۔ میں تمہیں اچھا کر لوں گا" ڈاکٹر تسلّی دیتا ہے۔

"شکریہ۔ شکریہ حضور بہت بہت شکریہ" اس کا باپ کہتا ہے "مگر میرا وقت آگیا ہے۔ موت میرا انتظار کر رہی ہے۔ وہ دیکھو سامنے کھڑی ہے!"

پندرہ منٹ تک ڈاکٹر مریض کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہتا ہے۔ پھر کھڑا ہو جاتا ہے اور اُس کی والدہ کو ایک طرف لے جا کر کہتا ہے۔

"آہ۔ بہت مشکل ہے، میں کچھ نہیں کر سکتا۔ شفا خانے لے چلو، وہاں ہم سب مل کر دیکھیں گے۔ فوراً تیار ہو جاؤ۔ وقت ضائع مت کرو۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ سب سو گئے ہونگے، لیکن کوئی مضائقہ نہیں۔ میں رقعہ لکھے دیتا ہوں۔ کچھ سُن رہی ہو! ——"

"مگر بندہ پرور" اس کی ماں جواب دیتی ہے "جائیں گے کاہے پر، ہم لوگوں کے پاس سواری بھی نہیں ہے"

"اس کی فکر نہ کرو" ڈاکٹر کچھ سوچ کر کہتا ہے "میں تمہارے مالک سے کہتا ہوں، اس کا گھوڑا لے لینا"

ڈاکٹر چلا گیا۔ موم بتی بجھ گئی۔ پھر وہی "آہ آہ" کی دلدوز آوازیں آ رہی ہیں۔ آدھ گھنٹے کے بعد ایک گاڑی آتی ہے۔ کرمین کا باپ تیار ہو کر شفا خانے جاتا ہے۔

اب صبح کی روشنی تمام دنیا پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی ماں مکان پر نہیں ہے، شفا خانے میں اُس کے باپ کی تیمار داری کر رہی ہوگی۔ کسی گھر سے بچّے کے رونے کی آواز آ رہی ہے اور کوئی کرمین کی آواز کے ساتھ گا رہا ہے۔

آجا ری نندیا آجا ری آ   بالے کی آنکھوں میں گھل مل جا

اُس کی ماں واپس آتی ہے۔ خاموشی سے بیٹھ جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے۔

. دم لے جانے میں بہت وقت لگ گیا۔ صبح ہوتے ہوتے اُس نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی
خدا مغفرت کرے ——"

اُس کی ماں رو رہی ہے مگر اُسے رونے سے منع کر رہی ہے۔

"نہ بیٹی اب رونے دھونے سے کیا ہوگا! صبر کر بیٹی صبر کر۔ تیری قسمت میں یہی لکھا تھا ۔۔۔ ہائے میری بچی
یتیم ہوگئی" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔

کریمن باہر چلی جاتی ہے اور وہاں خوب دل کھول کر روتی ہے۔ اتنے میں کوئی بڑے زور سے اس کی پیٹھ
پر گھونسا مارتا ہے۔ وہ گرتی ہے، درخت کا سہارا لینے کے لئے ہاتھ بڑھاتی ہے، آنکھ کھل جاتی ہے۔ نہ درخت ہے
نہ جنگل، نہ اس کی کٹیا! اس کا مالک اُسے تیوری چڑھائے گھور رہا ہے۔

"نامعقول، نمک حرام کہیں کی۔ بچہ کب سے چیخ رہا ہے اور آپ پڑی خراٹے لے رہی ہے۔ لے میں تجھے سونے
کا مزہ چکھاتا ہوں" اور بید لے کر سٹراک سٹراک دو رسید کرتا ہے۔ کریمن آنکھ ملتی ہے۔ گہوارے کو ہلاتی ہے اور
سسکیاں لیتی ہوئی گاتی ہے۔

آجا ری نندیا آجا ری آ   بالے کی آنکھوں میں گھل مل جا

چھت پر روشنی کا سبز دھبا اور دیواروں پر کپڑے کے سائے پھر ناچنے لگتے ہیں، پھر اُس کا دماغ معطل
ہونے لگتا ہے اسی وسیع کیچڑ والی سڑک پر وہ پھر چل رہی ہے۔ لوگ اسی طرح میٹھی نیند میں پڑے سو رہے ہیں۔
اُس کا بھی پڑ رہنے کو دل چاہتا ہے مگر اُس کی ماں اُس کے ساتھ ہے۔ وہ اُسے ٹھہرنے نہیں دیتی اور کہہ رہی
ہے بیٹی شہر چلنا ہے۔ کہیں نوکری چاکری ڈھونڈیں گے۔ آخر کب تک بھوکوں مریں گے۔

"بال بچوں کی خیر، بابا" اُس کی ماں راہگیروں سے کہتی ہے "تین دن کا فاقہ ہے۔ میری بچی بھوک سے
بے دم ہو رہی ہے —— خدا کی راہ پر کچھ دو بابا ——"

اس کے جواب میں کوئی مانوس آواز اُس کے کانوں میں آتی ہے "بچے کو مجھے دے" ایک لمحہ کے بعد اس
آواز کی پھر تکرار ہوئی۔ "بچے کو مجھے دے —— مار کھانے پر بھی ہوش ٹھکانے نہیں ہیں، امیر زادی کہیں کی۔ بچے کو
چھوڑ کر بے ہوش پڑی سو رہی ہے!"

کریمن چونک کر اٹھ بیٹھتی ہے اور چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتی ہے۔ کہاں کی ماں؟ کہاں
کی سڑک، کہاں کے راہگیر؟ اُس کی مالکہ پالنے کے پاس کھڑی غصے سے اُس کی چوٹی کھینچ رہی ہے!

مالکہ بچّے کو چمکار کر دودھ پلا رہی ہے مگر کریمن کھڑی انتظار کر رہی ہے کہ بچّہ دودھ پی چکے تو مالکہ سے لے لے۔ کھڑکی سے اندر آنے والی ہوا اب خوشگوار ہے۔ چھت کی سبز روشنی اب زردی مائل ہوتی جا رہی ہے، بہت جلد اب صبح ہو جائے گی۔

"لے بچّے کو لے" مالکہ سلوکے کے بٹن لگاتے ہوئے کہتی ہے "منع کرتی ہوں کہ بچّے کو باہر نہ گھمایا کر۔ آخر نظر لگ گئی تیر اکیا بگڑ گیا۔ تکلیف تو ہمیں ہو رہی ہے۔ بیچارہ رات بھر چلاتا رہا ہے ———"

کریمن نے بچّے کو گہوارہ میں لٹا دیا ہے پھر اُسے آہستہ آہستہ ہلا کر اپنی لوری سنا رہی ہے۔ روشنی کا سبز دھبّا اب بالکل غائب ہو گیا ہے، کپڑوں کے سائے معدوم ہو گئے ہیں صبح کی روشنی کمرے میں آنی شروع ہو گئی ہے، مگر اُس کی پلکوں پر نیند کا خمار اب بھی تھرک رہا ہے۔ وہ اپنا سر پالنے پر رکھ دیتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے سارے جسم کو جنبش دیتی ہے کہ کمبخت نیند کسی طرح تو اس کا پنڈ چھوڑے۔ مگر اُس کا سر چکرا رہا ہے۔ نیند اس کی پلکوں کو گوند کی طرح جوڑے دے رہی ہے ...

"کریمن چولہا جلا" اس کے مالک کی آواز آتی ہے۔

ہاں۔ پھر کام کاج کا وقت آگیا۔ غریب چھوکری دوڑ کر ایک کمرے میں لکڑی لانے کے لئے جاتی ہے۔ وہ خوش ہے، جب انسان چلتا پھرتا ہے تو اُسے نیند سے اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی کہ ایک جگہ ساکت بیٹھنے سے!

وہ چولہا جلاتی ہے۔ اُسے محسوس ہو رہا ہے کہ اس کا چہرہ اب پہلے کی طرح سخت نہیں ہے۔ اس میں پھر نرمی آ چلی ہے۔ اس کے سر کا چکرانا بند ہو رہا ہے۔ اس کے خیالات اب اتنے پراگندہ نہیں ہیں۔

"کریمن چائے تیار کر" اُس کی مالکہ اپنے کمرے سے آواز دیتی ہے۔ اُس نے ابھی کیتلی آگ پر نہیں رکھی کہ ایک دوسرا حکم صادر ہوتا ہے۔

"کریمن اپنے مالک کے جوتے صاف کر ڈال"

وہ زمین پر جوتے صاف کرنے کے لئے بیٹھ جاتی ہے۔ وہ سوچ رہی ہے کہ ایک بڑے سے جوتے میں سر ڈال کر سو جانا کس قدر آرام دہ ہو گا۔ یک لخت جوتا بڑھنا شروع ہوتا ہے اور بڑھتے بڑھتے کمرے کے برابر ہو جاتا ہے اس کے ہاتھ سے برش چھوٹ جاتا ہے۔ مگر فوراً وہ اپنا سر ہلاتی ہے اور سب چیزوں کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھنا شروع کرتی ہے تاکہ اُن کا بڑھنا بند ہو جائے اور وہ اس کی آنکھوں کے سامنے نہ ناچیں۔

"کریمن، اندر بیٹھی کیا کر رہی ہے؟ سیڑھیاں جھاڑ ڈال۔ گاہک دیکھیں گے تو کیا کہیں گے" اس کی مالکہ کہہ رہی ہے۔

کرمین سیڑھیوں کو پانی سے صاف کرتی ہے۔ کمرے میں جھاڑو دیتی ہے، پھر چولہا جلاتی ہے اور دوڑ کر دوکان میں آتی ہے۔ کام پر کام نکلتے چلے آ رہے ہیں، سانس تک لینے کی فرصت نہیں ہے۔

نعمت خانے میں ایک مقام پر بیٹھ کر آلو چھیلنا کتنا تکلیف دہ ہے۔ اس کا سر زمین میں گڑا جا رہا ہے آلو اُس کے سامنے شعبدہ باز کے گیندوں کی طرح ناچ رہے ہیں۔ اُس کے ہاتھ سے چاقو گر پڑتا ہے۔ مالکہ جو آستینیں چڑھائے برابر کمرے میں ٹہل رہی ہے اُسے گھور کر دیکھتی ہے اور اس زور سے چلاتی ہے کہ کرمین کے کان دیر تک گونجتے رہتے ہیں۔

اس کے بعد دسترخوان بچھانا، کھانے کے وقت حاضر رہنا، برتن مانجھنا، بچّے کے گندے صاف کرنا اور پھر سینا پرونا بھی وبالِ جان ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ ان سب کو چھوڑ کر، فرش پر پڑ کر سو جائے اور کئی دن تک سوتی رہے۔

دن گذر جاتا ہے۔ شام کی تاریکی ہر شے پر مسلّط ہو جاتی ہے۔ کرمین اپنی تپتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ پھیرتی ہے اور خدا معلوم کیوں خود بخود مسکراتی ہے۔ شام کا دھندلکا اُس کی مخمور آنکھوں کو گہری نیند کا پیغام دیتا ہے!

رات کو اُس کے مالک کے دوست احباب اور ملنے جلنے والے آتے ہیں۔ کرمین کو چائے بنانے کا حکم ملتا ہے چھوٹی سی کیتلی ہے، چائے کا دور چل رہا ہے۔ اُسے پانچ پانچ سات سات مرتبہ چائے بنانی پڑتی ہے۔ چائے کا دور ختم ہو جاتا ہے مگر کرمین وہیں کھڑی ہے۔ مالک اور اس کے دوستوں کو اس سے سو کام ہیں۔ وہ وہاں سے کیونکر ٹل سکتی ہے۔

"کرمین دوڑ کر ایک پیکیٹ سگریٹ تو لینی آ"

وہ تیز تیز قدم رکھتی ہوئی دوکان پر جاتی ہے تیز چلنے سے شاید نیند بھاگ جائے! "کرمین پان بنا کر لا۔ کرمین حقّہ بھر لا۔ کرمین ذرا تمبا کو لیتی آ۔ کرمین یہ کر ڈال۔ کرمین وہ کر ڈال" احکامات کا تانتا بندھا ہوا ہے!

لیکن اب مہمان جا چکے ہیں۔ روشنیاں گل کر دی گئی ہیں گھر میں خاموشی ہے۔ مالک اور مالکہ اپنے خانگی کمرے میں جا چکے ہیں۔ "کرمین بچّے کو جھولا جھلا" آخری حکم مل چکا ہے۔

چولہے میں جھینگر بول رہا ہے۔ روشنی کا سبز دھبا پھر چھت پر نمودار ہے، کپڑوں کے سائے پھر اُس کی آنکھوں پر ناچ رہے ہیں۔ پھر اس کا دماغ معطل ہو رہا ہے۔ پھر وہ پالنے کو ہلا ہلا کر گنگنا رہی ہے۔

آجا ری نندیا آجا ری آ　　　　بالے کی آنکھوں میں گھل مل جا

بچہ پھر چلانا شروع کرتا ہے اور روتے روتے بے خود ہو جاتا ہے۔ پھر کرمین ایک کیچڑ اور پانی سے لبریز سڑک پر اپنی ماں اور باپ کو دیکھ رہی ہے، سب کچھ سمجھ رہی ہے۔ سب کو پہچان رہی ہے، مگر اس نیم بیداری نیم خواب کے عالم میں یہ

سمجھنے سے قاصر ہے کہ کونسی قوت اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈالے ہوئے ہے۔ کونسی طاقت اُس کے سینہ کو پتھر سے دبائے ہوئے ہے اور اُس کی زندگی کو دوبھر کئے ہوئے ہے؟

وہ نظریں پھیر کر چاروں طرف دیکھتی ہے کہ اگر اس طاقت کا پتہ چل جائے تو اس سے نکل کر بھاگ جائے یا اسے زیر کرنے کی کوشش کرے مگر اُس کی تلاش بے کار ثابت ہوتی ہے۔

انتہائی اور آخری کوشش کے بعد وہ آنکھیں کھول کر سب چیزوں کو دیکھنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ بچے کی چیخ سنتی ہے۔ روشنی اور تاریکی کا آنکھ مچولا دیکھتی ہے اور اس روشنی اور تاریکی میں اُس دشمن کی تلاش کر لیتی ہے جو اُسے مار ڈالنے پر تلا ہوا ہے!

وہ دشمن گہوارہ میں پڑا ہوا طفل شیرخوار ہے!

وہ ہنستی ہے۔ اُسے تعجب معلوم ہوتا ہے کہ اتنی سلیس اور آسان سی بات اُس کی سمجھ میں اس سے پہلے کیوں نہ آئی۔ روشنی کا سبز دھبا کپڑوں کے سائے اور چولہے میں بولتا ہوا جھینگر سب کے سب اُس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

اُسے پھر طلسمی مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ پھر اُس کی آنکھ اسے دھوکا دینے لگتی ہے مگر اب کی بار وہ مسکرا کر اٹھ بیٹھتی ہے اور کمرے میں ٹہلنے لگتی ہے۔ اُسے ایک خیال آچکا ہے۔ وہ خوش ہے کہ بہت جلد وہ اس سنگِ راہ سے نجات حاصل کر لے گی!

"بچے کو مار ڈال اور پھر سو جا۔ آرام سے گہری نیند میں سو جا" ہوا کی سائیں سائیں اُسے تعلیم دیتی ہے۔

کرپین ہنستی ہے۔ روشنی کے سبز دھبے کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتی ہے اور دبے پاؤں جا کر پالنے پر جھک جاتی ہے۔

اور جب وہ بچے کا گلا گھونٹ چکتی ہے تو چپکے سے بلا کچھ سوچے ہوئے زمین پر دراز ہو جاتی ہے۔ اُسے ملال نہیں ہے۔ اُسے تاسّف نہیں ہے۔ وہ زیرِ لب مسکرا رہی ہے کہ اب وہ گہری نیند سو جانے کے لئے آزاد ہے!

اور اب وہ مُردوں کی طرح بے حس و حرکت پڑی گہری نیند میں سو رہی ہے!!

(چیخوف)

سیّد
ممتاز اشرف
قادری

ترانۂ گویا

پوچھو نہ مری سوزشِ پنہاں کو ابھی
جلنے دو چراغِ تہِ داماں کو ابھی

دیکھا ہے گلِ چاک گریباں کو ابھی
سمجھے ہی نہ تھے رنگِ گلستاں کو ابھی

پوچھو نہ مآلِ گلِ خنداں کو ابھی
دیکھو تو ذرا رنگِ گلستاں کو ابھی

روداد چمن، پھول سے! اے صبح غضب!
کیوں توڑ رہی ہے دلِ مہماں کو ابھی

توحید جبھی تک ہے کہ باقی ہے "دوئی"
رہنا ہے یونہی فرقِ دل و جاں کو ابھی

ہے دَور تو ہاتھ آئے گا جام اپنے کبھی
سمجھیں نہ برا گردشِ دوراں کو ابھی

تا صبح جسے یاد کیا ہے شبِ غم
کیا بھولیں گے اس شمعِ شبستاں کو ابھی

وہ آنکھ کہ جو منکرِ دیدار ہوئی
پہنچی ہی نہیں جلوۂ پنہاں کو ابھی

ہر اشک ہے اِک گوہرِ دریائے نظر
معلوم نہیں دیدۂ گریاں کو ابھی

اے یاس! ابھی امید ہی سے دل کی بہار
برباد نہ کر میرے گلستاں کو ابھی

اے نورِ سحر پردۂ شب چاک نہ کر
محجوب نہ کر شمعِ فروزاں کو ابھی

ایمان جبھی تک ہے کہ نادیدہ ہے وہ
پردے ہی میں رکھ حاصلِ ایماں کو ابھی

قائل ہوں اگر اس کا کہ ناظر ہے خدا
ظاہر نہ کروں میں غمِ پنہاں کو ابھی

گویا ہے اسی در سے تو امیدِ نظر
رہنے دو یونہی چاکِ گریباں کو ابھی

گویا جہان آبادی

دولت یا محبت؟

مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ محبت کرنا روپیہ کمانے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ روپیہ تو ایک احمق بھی پیدا کرسکتا ہے لیکن ایک ایسا آدمی نہایت ہی کمیاب ہے جو اپنے کلبۂ احزان میں پڑا پڑا دم توڑ دینے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ اور شاید کسی کلبی ہی کو اس پر اصرار ہوگا کہ کوئی بیوقوف بھی محبت کرسکتا ہے، کیونکہ اس صورت میں ہمیں دنیا کا شیرازہ منتظم نظر نہ آتا؛ آپ عدالت ہی میں جاکر طلاقوں کی فہرست دیکھ لیجیے کہ کتنوں نے اپنی حماقت سے محبت کو مکدّر کر دیا ہے۔

آلیور ہیل بران ایک کامیاب مصنف ہے جو اپنے پُرتکلّف دارالمطالعہ میں بیٹھا ایک ناول کے ابتدائی ابواب اپنی ٹائپسٹ جیسیکا کاکس سے لکھوا رہا ہے۔ ہیل بران اپنی عمر کے ساٹھ برس گزار چکا ہے مگر محبت کے افسانوں کا اثر ہے کہ اس کا دل ابھی جوان ہے، کامیابی کی گرمی اُس کے خون میں جوش پیدا کرتی ہے اور وہ ہر سال نہایت باقاعدگی سے پچیس ناول لکھ ڈالتا ہے۔ اُس کے رقیب جو ابھی نوجوان ہیں اس پر طیش بھی کھاتے ہیں مگر تخیل کی رسائی پر کس کا زور چلتا ہے۔

جیسیکا کاکس صرف اکیس برس کی ہے، مگر چونکہ سترہ برس کی عمر سے کمانے کا بار اُس کے سر پر پڑ چکا ہے اس لئے اب وہ اچھی خاصی عورت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یتیم ہے ہمیشہ اکیلی رہی ہے اور اُس کی واقفیت بہت کم ہے۔ اُس کا جسم مختصر سا ہے مگر اُس میں کام کرنے کی غیر معمولی قوت ہے، اور اس کی ایک خاص ادا ہے جو بعض اوقات اسے بے اندازہ خوبصورت بنا دیتی ہے۔

ہیل بران نے کہا "میری یہ کہانی پہلی تمام کہانیوں سے مختلف رنگ رکھتی ہے"۔

تجربہ کار جیسیکا نے جواب دیا "ہاں، سب مصنّف یوں ہی کہا کرتے ہیں۔ میں نے جس کسی کی کتاب بھی لکھی ہے اُسے اسی زعم میں دیکھا ہے کہ اُس کی یہ کتاب صدی کی بہترین کتاب ہے"۔

مصنف نے کہا "مگر یہ کہانی اُس مقام سے شروع ہوتی ہے جہاں لوگ ختم کرنے کا خیال کر رہے ہوتے ہیں"۔

جیسیکا نے کاغذ کے صاف تختے پر موٹے حرفوں میں "پہلا باب" لکھا اور کہنے لگی "اچھا، تو میں تیار ہوں"

آپ شروع کیجے۔"

ہیل بران نے کہا "افسانے کا نام ہے "دولت یا محبت؟" ہیروئن ایک مصیبت زدہ لڑکی ہے اور میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اُس کی تصویر کھینچنے میں میرے مدِنظر تمہاری ذات ہے۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا"

جیسیکا نے رنجیدہ آواز میں جواب دیا "نہیں بالکل نہیں۔ اب مجھے ان باتوں کی کچھ عادت سی ہوگئی ہے، اور جب تک مجھے ہر جمعہ کے دن اپنی مزدوری مل جاتی ہے میں نے ایسی باتوں کا خیال کرنا چھوڑ دیا ہے۔"

"آؤ پھر شروع کریں"

"بہت اچھا"

ہیل بران نے لکھوانا شروع کیا "دوپہر کا وقت تھا، باغ میں تپتی ہوئی دھوپ میں ایک آدمی اور ایک لڑکی کھڑے تھے۔ لڑکی کا سر سونے کی طرح چمک رہا تھا۔ سٹیفن بریسٹ نے حریص نظروں سے خوبصورت لڑکی کی طرف دیکھا جو ایک آرام کرسی میں لیٹی ہوئی تھی۔" نیا پارہ، "یکایک وہ اُس کی طرف مڑا "گلوریا، مجھے تم سے محبت ہے، بے اندازہ محبت، تمہاری محبت میرے دل میں مدت سے بسی ہوئی ہے۔ تم دنیا میں اکیلی ہو، مجھے اپنی تنہائی کا مونس بنالو۔ گلوریا، تم مجھ سے شادی کروگی؟" "نہیں" اُس نے جواب دیا، "تم مجھ پر بڑی مہربانی کرتے ہو مگر میں تم سے شادی نہیں کرسکتی۔"،"

مس کاکس نے جو خاموش لکھ رہی تھی پنسل ہاتھ سے رکھ دی اور ہیل بران کی طرف دیکھنے لگی "معاف کیجئے گا، لیکن آپ حقیقت سے ذرا دور چلے گئے ہیں۔ ایک لڑکی جو مجھ جیسی بے یار و مددگار ہو ـــــ گلوریا جیسی ـــــ وہ شادی کے پیغام کو اس آسانی سے رد نہیں کرسکتی، یہ فطرت کے خلاف ہے۔"

ہیل بران وقت ضائع نہیں کیا کرتا تھا مگر بولنے سے پہلے اُس نے کوئی دس سیکنڈ تک جیسیکا کی طرف غور سے دیکھا۔

اُس نے کہا "عام طور پر محبت کے متعلق کچھ کہنے کا حق جوانوں ہی کے لئے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ میرا شمار اب بوڑھوں میں ہے۔ مگر مجھے امید ہے کہ میں ابھی اتنا بوڑھا نہیں ہوا کہ محبت کی نسبت میرے خیالات کو غلط سمجھا جائے ـــــ گو لوگوں نے اب نئے نئے انداز اختیار کرلئے ہیں اور تہذیب بھی بہت ترقی کرگئی ہے۔"

جیسیکا کی ہنسی سے کمرہ گونج اٹھا۔

اُس نے جواب دیا "بڑھاپے کی تو خیر کوئی بات نہیں، لیکن آپ کے خیالات ضرور دقیانوسی ہیں۔ آج کل ہم لوگ زندگی کو تجارتی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں ——— ہر شخص اور ہر چیز آج کل دنیا میں ایک مالی حیثیت رکھتی ہے۔ مجھے اس کا تجربہ تو نہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ لڑکیاں محبت کی بجائے دولت پر زیادہ فریفتہ ہو جاتی ہیں۔"

ہیل بران نے آہستہ سے کہا "کلبیت"۔

لڑکی نے جواب دیا "کلبیت ہی تو تہذیبِ حاضر کا پروانہ ہے"۔

ہیل بران نے کہا "میں اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ مگر یہ اس بات کا صرف نظریاتی پہلو ہے اور عملی نکتۂ نظر سے مجھے یقین ہے کہ کوئی اس زمانے کی لڑکی بھی کسی کروڑپتی سے شادی کا فیصلہ کرنے میں اُسی قدر متامل ہوگی جتنی آج سے دو پشت پہلے کی لڑکی ہوتی تھی، بجز اس کے کہ اُسے اُس سے محبت ہو"۔

"میں آپ کے اِس دعوے سے متفق نہیں جب آپ مانتے ہیں کہ نظریاتی پہلو سے میں درست کہتی ہوں تو آپ کو یہ بھی ماننا چاہئے کہ گلوریا یقیناً سٹیفن کو بغیر کسی غور کے قبول کر لیتی"۔

ہیل بران نے پرغرور انداز سے کہا "میرے افسانے حقیقی زندگی پیش کرتے ہیں۔ اگر میرے ناولوں کی بنیاد نظریوں پر ہو تو وہ بک نہیں سکتے۔ گلوریا، جیسا میرا اُس کا ——— تمہارا ——— تصور ہے، کسی شخص سے محض اس لئے شادی کر کے اپنے آپ کو ذلیل نہیں کر سکتی کہ وہ اتفاق سے بڑا امیر ہے"۔

جیسیکا نے جواب دیا "آپ کا خیال غلط ہے۔ چونکہ آپ مجھے اس افسانے میں گھسیٹ رہے ہیں اس لئے میں کہہ سکتی ہوں کہ اگر مجھ سے کوئی بدصورت سے بدصورت آدمی بھی شادی کرنے کو کہے تو میں انکار نہ کر سکوں بشرطیکہ اُس کے الفاظ کی پشت پر چوکھا سونا کھنکھنا رہا ہو۔

ہیل بران نے کہا "کچھ بھی ہو تمہارا خیال غلط ہے"۔

"نہیں، غلط نہیں ——— کام، کام، کام ——— اور کس لئے؟ کیا میں اتنا کما لیتی ہوں کہ زندگی کا لطف اٹھا سکوں؟ میں آپ کو ایسی لڑکیاں دکھا سکتی ہوں جو عسرت کے مصائب سے تنگ آکر آرام کے اُن اوقات کی حسرت دل میں رکھتی ہیں جنہیں دولت خرید سکتی ہے"۔

ہیل بران نے مایوسانہ لہجہ میں کہا "دنیا میں بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جنہیں دولت نہیں خرید سکتی"۔

جیسیکا نے کہا "سچ ہے، مگر موجودہ حالت میں میرے پاس کیا ہے —— حالانکہ روپیہ ہو تو ——"

"بعض ایسے اُمور بھی ہو سکتے جن کا فی الحال تمہیں علم نہیں"

جیسیکا نے ہنس کر کہا "ایک وقت میں میں ایک ہی خاوند سے شادی کر سکتی ہوں اور میرا خیال ہے کہ وہ بالکل کافی ہے"

ہیل بران لڑکی کے اس سبک سرانہ طرزِ گفتگو پر چیں بہ جبیں ہو گیا، پھر یکایک اُس کے چہرے کی کیفیت بدل گئی، وہ اس کی طرف بڑھا اور اُس نے جیسیکا کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔

"مس کاکس —— جیسیکا —— جو کچھ تم کہہ رہی ہو مجھے اس میں امید کی ایک کرن چمکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے —— بے اندازہ محبت —— تمہاری محبت میرے دل میں مدت سے بسی ہوئی ہے —— تم دنیا میں اکیلی ہو —— مجھے اپنی تنہائی کا مونس بنالو —— جیسیکا، تم مجھ سے شادی کرو گی؟" اُس نے یہ الفاظ نہایت پُر ارمان نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے ختم کئے، اور اُس کی آواز میں ایک غیر معمولی تڑپ تھی۔

"شادی کروں؟" جیسیکا نے گھبرا کر کہا۔ پھر بولی "نہیں، آپ مجھ پر بڑی مہربانی کرتے ہیں مگر میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے آپ سے محبت نہیں —— ایک طرح مجھے آپ سے محبت ہے —— مگر میں جوان ہوں اور آپ بوڑھے ہیں —— اور —— اور سخت ... ... "اور اُس نے اپنے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔

ہیل بران نے بے تاب ہو کر کہا "سٹیفن برلیسٹ بھی ایسا ہی تھا۔ چلو اب لکھو۔ کھانے سے پہلے پہلے میں افتتاحی باب ختم کرنا چاہتا ہوں۔

ترجمہ منصور احمد

غزلیات

۱

مر کے کیا قبر میں راحت ہوگی — آنکھ کھلتے ہی قیامت ہوگی

دل کو یہ کہہ کے تسلی دی ہے — بعد تکلیف کے راحت ہوگی

ذکرِ جنت ہے نہ فکرِ دوزخ — آج واعظ کہیں دعوت ہوگی

اک نگاہِ غلط انداز سہی — دل کی آخر کوئی قیمت ہوگی

سو گئے گھر سے آتے آتے — نیند اُن کی مری قسمت ہوگی

اشک کس نے سرِ بالیں ٹپکائے — میری شمعِ سرِ تربت ہوگی

وصل کی شب نہ بڑھاؤ زیور — سادگی اور قیامت ہوگی

تم اُٹھے اور مرا دم نکلا — تم سے پہلے مری رخصت ہوگی

گلِ معنی بھی کھلیں گے صفدر
کچھ شگفتہ جو طبیعت ہوگی

صفدر مرزاپوری

۲

نشاطِ روح کو چونکا رہا ہے — محبت کا فرشتہ گا رہا ہے

ذرا دیکھوں تو مجھ میں کیا رہا ہے — زمانہ آئنہ دکھلا رہا ہے

سنائی آئے گی کوئی چمن سے — دل آپ ہی آپ بیٹھا جا رہا ہے

قفس میں آ تو یوں دنیا یہ سمجھے — سفر سے لوٹ کر گھر آ رہا ہے

مری فطرت مجھے رلوا رہی ہے — زمانہ اپنی اپنی گا رہا ہے

ذرا چہرہ تو دیکھو ناخدا کا — کوئی طوفان جیسے آ رہا ہے

بڑی جنت یہی ہے تو ہو راضی — وگرنہ خلد میں کیا رہا ہے

باسط سہسوانی

۳

اس خزاں کو بہار ہونا تھا — گل چراغِ مزار ہونا تھا

کشتۂ انتظار ہونا تھا — آپ سے شرمسار ہونا تھا

حسن کی پردہ پوشیاں کب تک — عشق کا راز دار ہونا تھا

بے نیازی نے موت کی مارا! — جبر پہ اختیار ہونا تھا

کیوں بھلا بیٹھے وعدۂ فردا — حشر کیا بار بار ہونا تھا

آنکھ ساقی کی کھل چکی ہے تپش
تجھ کو بھی ہوشیار ہونا تھا

عبداللطیف تپش

۴

بے اختیار چھیڑ دیا ان کو پیار میں — وہ کون ہے کہ جس کے ہو دل اختیار میں

بھر کر نگاہ دیکھتا اُن کو مری مجال — "پنہاں تھا آفتاب حجابِ غبار میں"

میں جانتا ہوں لذتِ خمرِ وصالِ دوست — یہ کیف وہ نہیں ہے جو ہے انتظار میں

میں اور بزمِ غیر میں جاؤں محال ہے — یہ جرم اگر ہوا تو ہوا شوقِ یار میں

جمعیتِ سکونِ دلِ مبتلا گیا — تم کیا گئے کہ جان گئی اضطرار میں

میدانِ شاعری کے نہیں مردِ ہم شہاب
کچھ بات ہے کہ آ گئے اس کار زار میں

مہر محمد خاں
شہاب
مالیر کوٹلوی

محفلِ ادب

زبان کی تدریجی ترقی

اول اول جب انسان نے ہوا کو تکلم کا واسطہ بنایا اور اوزاروں کے ذریعہ سے ادائے مطلب کا اہتمام کیا تو وہ صرف انہیں محدودے چند سہل المخرج آوازوں کے نکالنے پر قادر تھا جنہیں بول کر چھوٹے بچے اپنی خواہشات وجذبات کا اظہار کرتے ہیں لیکن جوں جوں انسان کو آلاتِ گویائی کے استعمال میں مہارت ہوتی گئی، وہ حسبِ ضرورت انہیں چند سہل المخرج اصوات کو اونچے نیچے سروں میں ادا کر کے یا اُن میں اتار چڑھاؤ پیدا کر کے یا اُن کو گھٹا بڑھا کر مختلف معنی پیدا کرتا گیا۔ صاحبِ فرہنگِ آصفیہ کا خیال ہے کہ شروع شروع جب انسانوں نے اصوات کو ادائے مطلب کا ذریعہ بنانا چاہا تو انہوں نے صرف تین مفرد حرکتوں یا آوازوں کو منضبط کیا، جنہیں ہم اعراب یا حرکاتِ ثلاثہ کے نام سے نامزد کرتے ہیں۔ یہ تینوں آوازیں یعنی اَ اِ اُ وہی ہیں جو زمانہ پیدائش سے اُن کے ساتھ سانس کے ہمراہ آئی تھیں اور سہل المخرج ہونے کے سبب ہر شخص سے بآسانی اپنے اپنے موقع پر سرزد ہو جایا کرتی تھیں یعنی درد کے موقع پر درد کا سماں ان میں تھا دریا کی موجیں، ہوا کی نہریں، گنبدوں کی گونجیں، اترنے کی سیڑھی، چڑھنے کا زینہ، اور اپنے پیاروں کو پکارنے کی ندا، ہر قسم کی صدا، ہاتھیوں کی چنگھاڑ، شیروں کی دھاڑ، اور بادلوں کی گرج، بھنبیری کی بھنبھناہٹ، مگس کی تنتین، قریب اور بعید کی چیزوں کے اشارے، دنیا کے ابتدائی دھندے، ان ہی تین آوازوں یعنی "اَ، اِ، اُ" میں موجود تھے۔ اور ہر ایک کیفیت اُن ہی کے گھٹانے بڑھانے سے حاصل ہو جاتی تھی لیکن یہ رائے غلو اور مبالغے پر اور حقیقت سے دور معلوم ہوتی ہے۔ مختلف خیالات، جذبات اور واقعات کو صرف ایک ہی آواز کی تین صورتوں کی مدد سے بیان کرنا اور لوگوں کا متکلم کے منشا کو معلوم کر لینا بعید از قیاس ہے۔ ننھے بچے بھی مندرجہ بالا حرکاتِ ثلاثہ کے علاوہ چند اور سہل المخرج آوازیں بولتے ہیں۔ جیسے: ماما، بابا، داوا، اما وغیرہ۔ لہٰذا انسان بھی عہدِ رموزی ہی میں اپنے جذبات چند قسم کی آوازوں سے ظاہر کرتا ہوگا۔ لیکن "عہدِ صوتی" میں ضروریات واحتیاجات، خیالات ومعلومات میں اضافہ ہو جانے کے باعث زیادہ آوازوں کی ضرورت آن پڑی۔ چونکہ طویل مدت کے گزر جانے سے دماغ کے حصۂ گویائی کی بھی پہلے سے زیادہ نشوونما ہو گئی تھی اور اُس کے ساتھ آلاتِ گویائی مثلاً ہونٹ، ناک، منہ، زبان، تالو، حلق، دانت وغیرہ کی ساخت اور ہیئت میں بھی کسی قدر ترقی ہو گئی تھی، اس لئے انسان کو ان کی مدد سے مختلف قسم کے اصوات نکالنے میں سہولت

واقع ہوئی۔انسان نے آوازوں کو اس طرح ترقی دی کہ کسی کو دونوں ہونٹ ملاکر، کسی کو تالو سے، کسی کو حلق سے، کسی
کو زبان کی نوک سے، کسی کو ناک کی شرکت سے نکالا۔اب مختلف قسم کی آوازیں انسان کے قابو میں آگئیں۔پس
مختلف مفرد آوازوں سے مختلف قسم کے خیالات یا اشیا کا اظہار ہونے لگا۔لیکن روزافزوں حاجتوں اور ضرورتوں کے
سبب سے یہ محدود مفرد آوازیں تمام معلومات کے اظہار کے لئے ناکافی ثابت ہوئیں۔لہذا مفرد اصوات کے اختلاط سے
تمام اشیا کے نام رکھے جانے لگے۔اول اول جس شے کی جو فطری آواز تھی اس کی مناسبت سے اسما بنائے گئے، کیونکہ یہ طریقہ
سہل اور قدرتی بھی تھا جیسے ہوا کے چلنے کو سائیں سائیں اور پانی برسنے کو جھم جھم، کتے کے بھونکنے کو بھوں بھوں، بلّی کی بولی کو
میاؤں میاؤں وغیرہ سے تعبیر کیا۔اسی طرح جھیں جھیں کرنے والے جانوروں کا نام جھینگر، اور ٹرٹر کرنے والے کا ٹرّو، بھن بھن کرنے
والے بھونرا، جھر جھر بہنے والے پانی کا نام جھرنا پڑا۔جس شے کے ساتھ کوئی فطری آواز وابستہ نہ تھی، اس کا جو کچھ مناسب سمجھا
گیا نام رکھ دیا گیا۔اس طرح ایک معقول تعداد اسما کی تیار ہو جانے پر زبان کو غیر معمولی گرانباری سے بچانے کے لئے یہ اصول
رکھا گیا کہ اگر کسی نئی شے میں دو یا زیادہ اشیا کی صفات یا مشابہات پائی جائیں تو اس شے کا ایک نیا نام تجویز
کرنے کے بجائے اشیاءِ معلومہ کے اسما کی آمیزش سے مرکب لفظ بنا لیا جائے۔مثلاً "کنسلائی" اُس سلائی کے مانند باریک
کیڑے کو کہا جو کان میں رینگ جاتا ہو، "کنکھجورا" اُس کیڑے کا نام پڑا جو کھجور کے مشابہ ہو اور کان میں بیٹھ جائے "اجگر"
(اج۔بکرا۔ گر۔نگلنے والا) اُس اژدھے کو کہنے لگے جو بکرے کو نگل جائے۔اگر کوئی جانور دو یا زیادہ جانوروں کے مشابہ
ہو تو اس کا نام ان ہی مشابہ جانوروں کے اسما کا مجموعہ قرار پایا مثلاً شتر مرغ۔گاؤمیش، فیل مرغ، شترگاؤپلنگ (زرافہ) وغیرہ۔
بعض جانوروں کے نام ان کی صفات یا خواص کی مناسبت سے رکھے گئے۔مثلاً "ہاتھی" یعنی ایک ہاتھ والا جانور، سونڈ
ہاتھ کی بجائے سمجھی گئی۔ "چیتا" وہ درندہ جس کی کھال پر چتیاں ہوتی ہیں۔سمندر (سام۔آگ × اندر۔درمیان) اُس کیڑے
کا نام پڑا جو آگ میں رہے۔بعض چیزوں کے نام اُن کے افعال کے باعث رکھے گئے۔مثلاً مارخور، چوہے مار، چڑی مار،
نیولا (نیو یعنی بنیاد، کھودنے والا) وغیرہ۔الغرض ان ہی اصول پر تمام اشیا کے اسما قرار دیئے گئے۔اوپر کی تمام
مثالیں فرہنگِ آصفیہ سے دی گئی ہیں۔لیکن مندرجۂ بالا بیانات سے ہرگز یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ ابتدائی دورِ تمدن میں
اشیا کے وہی نام تھے جو اُوپر بیان کئے گئے اور دورِ بربریت کا انسان اردو بولنے پر قادر تھا۔محض اصول سمجھانے کے خیال
سے ایسے الفاظ کی مثالیں دی گئی ہیں جو اردو میں مستعمل ہیں۔ابتدائی انسانوں نے ان ہی اصول پر اشیا کے نام رکھے
نام کچھ ہی کیوں نہ ہوں، لیکن ان کے مقرر کرنے کے لئے اصول وہی تھے، جو اوپر بیان ہوئے۔یہی وہ ابتدائی زینے تھے
جن پر رفتہ رفتہ گامزن ہو کر زبان نے اعلیٰ زینے تک صعود کیا۔واضح رہے کہ الفاظ کے نام بھی پہلے فطری آوازوں ہی کی

مناسبت سے رکھے گئے ، مثلاً بھونکنا ، گڑگڑانا ، غرانا ، کھٹکھٹانا وغیرہ ، جہاں قدرتی آوازوں کا فقدان تھا وہاں جو کچھ مناسب سمجھا گیا فعل کا نام رکھ دیا گیا - اکثر افعال کے نام اسمائے اشیا سے بنائے گئے - ہتھیانا یعنی کوئی شے ہاتھ میں لینا اور اس پر قابض ہوجانا ، برقانا یعنی کسی شے میں بجلی گذارنا وغیرہ - انگریزی زبان میں اس قسم کی بے شمار مثالیں ملیں گی اس کے بعد اسما میں باہم نسبت دینے کے لئے روابط قائم کئے گئے - جب اسماء ، افعال اور روابط مقرر ہوچکے تو گویا ایک باقاعدہ زبان کا ڈھانچہ تیار ہوگیا - رفتہ رفتہ اس کالبد کی مناسب عضوبندی ہوتی رہی ، یہاں تک کہ بالآخر ایک گنتھا ہوا سڈول جسد تیار ہوگیا اور علم وفن کی ترقی نے آگے چل کر اس میں جان ڈال دی - تشبیہ واستعارہ کا نقاب ہٹانے سیدھا سادھا مطلب یہ ہے کہ معاشرت کی ترقی ، احتیاجات کے اضافے ، ضروریات کے ہجوم ، معاملات کی پیچیدگی زندگی کی کشاکش کے زیر اثر زبانِ صوتی ، دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی گئی ، ذخائرِ الفاظ میں اضافہ ہوتا گیا اور لغات بڑھتی گئیں - جس طرح بچوں کی معلومات محض اشیائے مادی ومحسوس ومقرون تک محدود ہوتی ہیں اور انہیں مجردات کا تصوّر نہیں ہوتا ، اسی طرح ابتدائی انسان کی واقفیت مادی اور مرئی چیزوں تک محدود تھی - لیکن تمدّن کی ترقی اور ارتقائے ذہن کے باعث خیالات میں لطافت اور پاکیزگی آتی گئی اور مجردات وتوصیفات کے لئے بھی نام تجویز کئے گئے - رفتہ رفتہ ادائے مطلب کے لئے عمدہ پیرایۂ بیان اور اظہارِ خیالات کے لئے حسنِ اسلوب کی جانب ذہنِ انسانی رجوع ہوا - چنانچہ بمرورِ زمانہ ایک مرتب اور باقاعدہ زبان کی مستقل حیثیت قائم ہوگئی - آبادی اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ زبان بھی ترقی کرتی گئی - جوں جوں زمانہ گذرتا گیا پچھلے الفاظ زبان کی رگڑ کھا کھا کر منجھتے ، صاف ہوتے اور گھل گھل کر سلیس ہوتے گئے - چنانچہ امتدادِ زمانہ سے الفاظ زبان کی خراد پر چڑھ کر تراش خراش پاتے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر زبان میں شستگی ، حلاوت اور گھلاوٹ پیدا ہوگئی - لیکن تقریری زبان میں اس حد تک ترقی ہونے پر بھی رسم الخط وطرزِ تحریر ہنوز پردۂ خفا میں تھی - الفاظ وخیالات ابھی ضبطِ تحریر میں آکر پابندِ سلاسل نہیں ہوئے تھے - دیوتاؤں کے بھجن ، پیشوایانِ دین کی تعلیم ، دانشمندوں کے اقوال ، راجاؤں اور سورماؤں کے کارنامے عرصۂ دراز تک محض زبانی طور پر نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے رہے -

"اردو"

مشاہدات

حوض میں مستانہ بط کے تیرنے سے جس طرح ۔۔۔ کائی میں پڑتا چلا جاتا ہے خطِ رہگزار

حافظے پر یوں ہی اک بیدار کن گہری خراش ۔۔۔ ڈال دیتی ہے شبِ مہ میں پپیہے کی پکار

مسکرایا خواب میں اس طرح اک طفلِ صبیح — ہوگیا دل دیکھنے والوں کا شاد و باغ باغ
اور اس نرمی سے جیسے بتکدے کے طاق میں — جھٹپٹا ہوتے ہی روشن کردیا جائے چراغ!

شب کو اکثر کھوکھلی تاریکیاں میدان کی — روح پر کرتی ہیں طاری اس طرح خوابِ گراں
دل سمجھتا ہے کہ ہے غم کی گھٹا چھائی ہوئی — جس طرح کہرے پہ ہو جاتا ہے بارش کا گماں!

سب سے پہلے عشق کی شب میں دلِ عشاق کو — چٹکیوں میں یوں مسلتا ہے خیالِ روئے یار
صبح کچی نیند سے جس طرح چونک اُٹھنے کے بعد — کمسنی کی بھول سی آنکھوں میں چبھتا ہے خمار!

وداعِ طفلی و قربِ شباب کے باعث — نری "نگاہ" ہے، یا دہ "خیالِ دل افروز"
بدل رہا ہے جو پہلو ضمیرِ شاعر میں — اور آب و تاب سے موزوں نہیں ہوا ہے ہنوز!

جوش ملیح آبادی

"نگار"

نغمۂ الفت

"مجھے اگر تو میرے "حسن" کی خاطر چاہتا ہے — تو مجھ سے الفت کرنا چھوڑ دے!
آفتاب، شاندار حسین آفتاب سے الفت کر — اُس کی ضیا مجھ میں کہاں؟
میری "جوانی" پر اگر تو فدا ہوا ہے — تو مجھ سے الفت کرنا چھوڑ دے!
بہار کو دیکھ اس کے شباب کو ہر سال نئی بقا ہے — میری طرح اُسے فنا نہیں!
"دولت" کے لئے اگر تو مجھ سے محبت کرتا ہے — تو مجھ سے الفت کرنا چھوڑ دے!
بے بہا نایاب گوہر سمندر میں پوشیدہ ہیں — پھر تو انہیں کیوں نہیں چاہتا؟
اگر تو مجھے محض "محبت" کی خاطر چاہتا ہے — تو پیارے مجھ سے الفت رکھ!
میرا دل جو سورج سمندر اور بہار سے کم نہیں — ہمیشہ کے لئے تیرا ہے!

"نظام کالج اردو میگزین"

اندھے کا گیت

میں اندھا ہوں، اے باہر والو، ایک عذاب ہے یہ،
ایک نقیض ہے ایک تضاد ہے یہ،
ایک دن دونا رات چوگنا بوجھ
اپنا ہاتھ اپنی جورو کے کاندھے پر رکھ لیتا ہوں
اپنا بیرنگ ہاتھ اُس کی بے رنگ بے رنگی پر،
اور وہ مجھ کو ایک خالی عالم میں لئے پھرتی ہے
تم کتراتے ہو، ذرا ہٹتے ہو، جگہ دیتے ہو اور سمجھتے ہو
کہ تمہارے ہٹنے بچنے کی آوازیں پتھروں کے ٹکرانے کی آوازوں سے شیریں تر ہیں۔
لیکن تم غلطی پر ہو۔ میں تنہا
جیتا ہوں، رنج سہتا ہوں، شور کرتا ہوں۔
میرے اندر نالوں کا ایک طوفان ہے۔
اور مجھے پتہ نہیں چلتا کہ یہ میرے اندر کون چلا رہا ہے
میرا دل یا میری انتڑیاں۔
سنے تم نے یہ گیت؟ کچھ تم نے تو گائے نہ تھے یہ،
اور گائے بھی تھے تو بالکل اسی انداز سے نہیں۔
تمہارے کھلے کھلے گھروں میں تمہارے لئے
روز کے روز ایک نئی گرمی، ایک نئی روشنی نازل ہوتی ہے۔
اور تم ایک دوسرے کے چہروں سے متاثر ہوتے ہو،
اس سے آدمی آدمی کا خیال کرتا ہے۔

"جامعہ"

مطبُوعاتِ جدیدہ

تفسیر سورۂ فاتحہ ۔ یہ کتاب علامہ محمد عبدہٗ مفتیٔ اعظم مصر کی تفسیر کا اردو ترجمہ ہے ۔ علامہ موصوف ایک بلند پایہ مفسر تھے اور اُن کی تصانیف تمام عالمِ اسلام میں مشہور و مقبول ہو چکی ہیں ۔ چونکہ سورۂ فاتحہ ام الکتاب ہے یعنی اس میں سارے قرآن مجید کے معارف بشکلِ اجمال موجود ہیں اس لئے علامہ عبدہٗ کی تصانیف میں اس کتاب کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے تنزل اور انحطاط کا سبب اُن کی قرآن کی تعلیمات سے غفلت ہے اور اگر وہ پھر قرآن کو اپنا دستور العمل بنالیں تو اپنے شاندار ماضی کی روایات کو تازہ کر سکتے ہیں ۔ بلاشبہ یہ کتاب بصیرت اور بیداری پیدا کرنے والی ہے ۔ کتابت ، طباعت اور کاغذ بہت اچھا ہے حجم ۸۰ صفحات اور مجلد کی قیمت ایک روپیہ ہے منیجر اسلامک لٹریچر کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۳۱ لاہور سے طلب فرمائیے ۔

اسرار الاطبا جلد سوم مولفہ حکیم عبدالمجید صاحب عتیقی ادیب عالم ۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے ۔ پہلے حصے میں آفتابِ حکمت حکیم عبدالعزیز صاحب کامل مرحوم کے تمام وہ مجربات ہیں جو اُن کے اپنے مطب کے لئے مایۂ ناز تھے اور دوسرے حصے میں مشہور اطبائے ہند کے معمولات درج ہیں ۔ کتاب میں کل ۴۸۰ نسخے ہیں جن میں سر سے لے کر پاؤں تک کے تمام امراضِ بدن کا علاج بتایا گیا ہے ۔ نسخوں کے متعلق ہم کوئی رائے نہیں دے سکتے کیونکہ ہمیں اس فن سے واقفیت حاصل نہیں البتہ ہم اُن باکمال اطبا کے ناموں کو اس امر کی کافی ضمانت خیال کرتے ہیں جنہوں نے اس کتاب کی تکمیل میں حصہ لیا ہے اسرار الاطبا یقیناً ایک بہا تالیف ہے اور ہمیں اہلِ فن سے توقع ہے کہ وہ اس کی پوری پوری قدر کریں گے حجم پونے چار سو صفحات کے قریب ہے لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ہے اور اطبا کی آٹھ عکسی تصویریں کتاب کی زینت ہیں ۔ مجلد کی قیمت چار روپے دس آنے مقرر کی گئی ہے ۔ کارپردازانِ کامل بک ڈپو لاہور سے منگائیے ۔

حکمت '' ماہ جون ۱۹۲۹ء سے یہ طبی رسالہ زبدۃ الحکما حکیم سید نوازش علی صاحب کے زیر ادارت نکلنا شروع ہوا ہے اس میں طبِ قدیم اور تحقیقاتِ جدیدہ کے متعلق نہایت مفید اور کار آمد مضامین شائع ہوتے ہیں اور اس کے علاوہ بڑے بڑے حکما کے مجرب صدہا نسخے بھی درج کئے جاتے ہیں ۔ اس وقت تک ہم اس کے دو تین نمبر دیکھ چکے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ یہ رسالہ کامیاب ثابت ہوگا ۔ حجم ۵۰ صفحات اور سالانہ چندہ ایک روپیہ آٹھ آنے ہے نمونہ مفت بھیجا جاتا ہے پتہ منیجر رسالہ حکمت والاسرار ، حویلی نچھراں والی ، موچی دروازہ لاہور

آپ کی [illegible] کیلئے لاجواب تحفہ

کشیدہ کاری کی اصلی مشین

یہ وہی بے نظیر مشین ہے جس کی نسبت اخبار تہذیب نسواں میں ایک محترم خاتون اپنے مضمون کے دوران میں فرماتی ہیں کہ سچ تو ہے کہ اشتہار کی تعریف و توصیف بے بنیاد نہیں واقعی یہ ننھی سی چیز اپنی بساط سے زیادہ کارآمد ہے جو بہنیں اسکے صحیح استعمال سے بخوبی واقف ہیں ضرور مجھ سے متفق ہونگی کہ آرائشی اشیا ایسی خوبصورت کاڑھی جاتی ہیں کہ کمرۂ ملاقات گویا ایک ننھا سا سدا بہار باغیچہ بن جاتا ہے جہاں بادِ سموم کا خوف نہ خزاں کا اندیشہ ——— پردے، میز پوش، گدیاں، فوٹو فریم، سلیپر وغیرہ کے لئے یہ کاریگری نہایت موزوں ہے۔ اگر احتیاط سے زیر استعمال رکھیں تو سالہا سال تک یہ چیزیں خراب نہیں ہوتیں۔ بچوں کے کلوک اور فراک پر بھی خصوصاً گو لباس پر ایک ایک چھوٹا سا پھول خوشنما معلوم ہوگا اور پردے تو عموماً بہت خوبصورت کاڑھے جاتے ہیں"

ان الفاظ پر ہمارا کچھ اضافہ کرنا بے سود ہوگا آپ ایک مشین معہ سامان منگا دیکھئے دونوں میں آپ کا گھر پر رونق ہو جائیگا۔

مخمل، دوسوتی اور دوسرے مناسب کپڑوں پر نہایت عمدہ بیل بوٹے نکالنے کیلئے ہماری مشین نہایت کارآمد ثابت ہوئی ہے۔ جو گھنٹوں کا کام منٹوں میں سرانجام دیتی ہے اس کا ابھرا ہوا کام فی الحقیقت بڑا دلفریب ہوتا ہے

یہ مشین آپ کی بچیوں کے لئے ایک نہایت اچھی سہیلی ثابت ہوگی جو انہیں دنوں میں ایسی ہنرمند بنا دے گی کہ لوگ حیران ہونگے

قیمت مشین و سامان متعلقہ حسب ذیل ہے

مشین درجہ اول جو بہت مضبوط اور اعلیٰ درجہ کے مخملی بکس میں بند ہے چار روپے آٹھ آنے درجہ دوئم تین روپے یہ مشین بھی اچھی خاصی ہے۔ کپڑا تاننے کا فریم مع ٹیکن قسم اعلیٰ ایک روپیہ آٹھ آنے ریشم کی گچھیاں ایک روپیہ (عہ) فی درجن۔ کپڑے پر چھپے ہوئے نقشے آٹھ آنے فی عدد سب چیزوں کا اکٹھا محصول ڈاک ۸/

اس مکمل سٹ کو سنبھال کر رکھنے کے لئے ہم نے ایک اعلیٰ درجہ کا پالش شدہ بکس بھی تیار کروایا ہے قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے ہر مشین کے ہمراہ کام کا نمونہ اور مفصل ترکیب استعمال اردو اور انگریزی میں بھیجی جاتی ہے۔ نقلی مشینیں بازار میں بہت آگئی ہیں اصلی مشین کے لئے آپ صرف ہمارا پتہ یاد رکھیں ہماری فرم کی نسبت محترمہ جناب بنت ممتاز الحق صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس بھوپال رقمطراز ہیں :- تصدیق کی جاتی ہے کہ ایس احمد صاحب کے یہاں کی کشیدہ کاری کی مشین کارآمد اور پائدار ہے ہر ایک بہن اس سے مستفید ہو، ریشم اعلیٰ بھی اس کارخانہ سے اچھا دستیاب ہوا۔ اخبار کا حوالہ دینے سے پیکنگ کا خرچ نہیں لگے گا۔

زرنگار مخملی جوتیاں

نفیس اور خوبصورت جوتیاں جن پر نہایت وضعدار سنہرا کام بنا ہوا ہے نفیس مزاج اصحاب اور بیگمات کیلئے تیار کروائی گئی ہیں پہننے میں آرام دہ اور ہلکی دیکھنے میں خوشنما اور دلکش اور داموں کے لحاظ سے گویا مفت ہیں گھروں میں پہنئے سلیپروں کا عمدہ بدل ثابت ہونگی کہیں آنے جانے کے وقت پہنئے آپکی زینت دوبالا کریں گی قیمت زنانہ ساز مخمل پر سچے سنہرے کام والی دو روپے چار آنے فی جوڑہ مردانہ ساز مخمل یا چمڑہ پر سنہرا کام، دو روپے دس آنے فی جوڑہ پاؤں کا خاکہ فرمائش کے ساتھ آنا چاہیئے۔ فرمائش میں رسالہ کا حوالہ دینے سے پیکنگ مفت۔

ملنے کا پتہ :- ایس احمد اینڈ کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۴۵ لاہور

فہرستِ مضامین

جلد ۱۶ — نمبر ۶

بابت ماہِ دسمبر ۱۹۲۹ء

تصویر:- گوئٹے اٹلی میں

نمبر شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ

سالگرہ نمبر

ہمایوں کے آٹھویں سال کا یہ آخری پرچہ ہے۔جنوری کا رسالہ سالگرہ نمبر ہوگا، اور اس تقریب پر حسب معمول وہ خاص اہتمام سے تیار کیا جائے گا۔اس کا حجم پونے دوسو صفحات سے زائد تجویز کیا گیا ہے اس کیلئے بہترین اور بلند پایہ ادیبوں اور مصوروں کے مضامین و تصاویر صرفِ کثیر اور کاوشِ عظیم سے حاصل کئے گئے ہیں۔مضامین کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے کہ ہمایوں کا یہ سالگرہ نمبر گزشتہ کی بہ نسبت زیادہ دلچسپ اور زیادہ کارآمد ہوگا۔تصویروں پہ دلکش نظمیں ہونگی یعنی مصوری کی ترجمانی شاعر کے احساساتِ لطیف کریں گے۔

دنیا کے نئے تمدن کے متعلق ایک جامع اور مبسوط مضمون ہوگا جس میں انسان کی آئندہ رفعت وعظمت کا نقشہ پیش کیا جائے گا۔

ہمایوں کے فلک پیما نامہ نگار کے قلم سے ایک "کلیمانہ" مضمون ہوگا، جس کی ندرت اور شگفتگی کیف انگیز ہونگی چار یا پانچ مختلف النوع افسانے ہونگے جن میں زندگی، کمال ہنمی، محبت اور اخلاق کے بصیرت افروز مناظر نظر آئیں گے۔

عورتوں کی زبان میں ایک پُر لطف سیر کی سرگزشت ہوگی جسے ایک مسلّمہ اور مستند اہلِ زبان نے لکھا ہے۔

زبانِ اردو کی ایک نہایت اہم تحریر پر تنقید ہوگی جو اپنی دلچسپی کے لحاظ سے لاجواب ہوگی۔

دوسرے عالی پایہ مضامین، دل افروز نظمیں اور خوبصورت یک رنگی و سہ رنگی تصاویر بھی قابلِ دید ہوں گی۔ نظم کا حصہ خاص طور پر بلند ہوگا۔

سالگرہ نمبر میں مندرجہ ذیل بڑے بڑے ادبا و شعرا جلوہ افروز ہونگے:۔

میاں عبدالعزیز، سید سلطان حیدر جوش، آغا حیدر حسن دہلوی، حکیم آزاد انصاری، مولانا جوش ملیح آبادی حضرتِ اصغر گونڈوی، جناب حمید احمد خاں، حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی، عاشق حسین صاحب بٹالوی، میاں عطاءالرحمٰن، حضرت احسن مارہروی، جنابِ آثر صہبائی، جناب جگر بریلوی۔

سالگرہ نمبر نئے سال کا بہترین تحفہ ہوگا۔اسے کثیر تعداد میں چھپوایا جا رہا ہے۔اپنے دوستوں کے لئے زائد جلدوں کی فرمائشیں جلد بھیج لیئے قیمت ایک روپیہ مقرر کی گئی ہے سالانہ خریدار بننے والوں سے اس پرچے کی علیحدہ قیمت نہ لی جائے گی۔

مینجر

رباعیات

(۱)

آزاد تصور ہے ایک حد کے اندر
شاکر ہی اپنے نیک و بد کے اندر
ممکن ہے بہشت و زشت اس کی پروا
محبوس ہے گر روح جسد کے اندر

(۲)

یہ زندگی عاقل بھی ہے جاہل بھی ہے
یہ زندگی صادق بھی ہے باطل بھی ہے
وابستہ ادھر حق سے ادھر دنیا سے
یہ زندگی ناقص بھی ہے کامل بھی ہے

(۳)

بیکار ہے اب کام نہ کچھ ہادی کا
ضامن ہی ہے اب اپنے غم و شادی کا
کٹ جائیں گے ایک ایک کر کے بندھن
دنیا میں زمانہ ہے اب آزادی کا

(۴)

کچھ کام ہیں ایسے کہ پشیماں ہوں میں
کچھ کام ہیں ایسے بھی کہ نازاں ہوں میں
اب ناز کروں اپنی پشیمانی پر
یا ناز پہ پھر اپنے پشیماں ہوں میں

بشیر احمد

جہاں نما

امریکا میں حبشیوں کی ترقی

گذشتہ بیس سال کے عرصہ میں انقلاب انگیز تبدیلیوں نے جہاں ممالکِ متحدہ امریکا کو اقوامِ عالم کی سب سے اگلی صف میں لا کھڑا کیا وہاں حبشیوں کے لئے بھی ترقی کا راستہ کھول دیا۔ اب حبشی خوش بختی کے دور میں داخل ہو چکا ہے اور جلد جلد حیاتِ ملیہ کا ایک جزو شمار ہو رہا۔

آج سے بیس سال قبل اسے ملک کی ترقی کے لئے بڑی بھاری رکاوٹ سمجھا جاتا تھا، ایک ابدی و ازلی ذلیل ہستی جسے امریکی زندگی سے کوئی سروکار نہ ہو۔ اُس وقت اسے بھی اپنے آپ پر اعتماد نہ تھا۔ اسے اپنی ذلت کا پورا یقین تھا اور اسے خیال تک نہ تھا کہ اپنے حقوق منوانے کے لئے وہ اپنے پراگندہ شیرازے کو منظم کر سکتا ہے۔ اُس زمانے کی سائنس اُسے ادنیٰ قسم کا انسان شمار کرتی تھی۔ اس پر صرف حبشی کا اطلاق ہوتا تھا اور یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ اُس کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ لوگ ہر ہفتہ تین حبشی ہلاک کر دیتے تھے۔ اُن کے مال و املاک چھین لئے جاتے تھے جنوبی علاقوں میں نوواردوں نے حبشیوں سے وہ کام چھین لئے جو نسلاً بعد نسلٍ شمالی علاقوں میں انہیں کے قبضے میں چلے آتے تھے۔ اُن ابتدائی صنعتوں میں جنہوں نے امریکا کا مرتبہ بلند کیا حبشیوں کا کوئی حصہ نہ تھا۔ بہت کم حبشی کالجوں میں تعلیم پاتے تھے اور بہت کم حبشی تعلیم یافتہ پیشوں میں تھے حبشی ادب بالکل موجود نہ تھا چسٹ نٹ اور ڈنبار جیسے مصنفین مستثنیات میں سے سمجھے جاتے تھے۔ جنوب میں حبشیوں کی تعلیم پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔ سیاست دانوں کو پختہ یقین تھا کہ حبشی تپِ دق، جرم اور کمزوری کی وجہ سے بالکل نابود ہو جائیں گے۔

آج حبشی ایک زبردست اور منظم قوم ہے جو اپنے حقوق کی خود حفاظت کر سکتی ہے، اپنی ترقی کے لئے راستہ صاف کر سکتی ہے اور اپنی ضروریات کو مہیا کر سکتی ہے۔ اب وہ اپنی نسل پر نازاں ہیں۔ اب سائنس بھی اُن کا ہمنوا ہے اور کہتا ہے کہ اُن کی پستی کا کوئی ثبوت نہیں اور امریکی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ان میں ہر طرح کی اہلیت موجود ہے۔ اب گورے اور کالے سکولوں میں حبشی تاریخ پڑھائی جاتی ہے افریقہ کے حبشی تمدن کی اب قدر سمجھ آچلی ہے اور اسے پسند بھی کیا جاتا ہے۔ حبشیوں کے قتل کے واقعات ۱۹۲۸ء میں صرف گیارہ تک رہ گئے۔ اب بہت سے شہروں میں حبشی ارکانِ کونسل موجود ہیں۔ وہ رکنِ مجلس قانون ساز ہیں، بلکہ ملکی کانگرس

میں بھی ان کا ایک رکن موجود ہے۔ دس ہزار حبشی ہر سال امریکن کالجوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے نکلتے ہیں۔ ان کے ۴۵ ہزار معلم ہیں جن میں سے ۴ اسو اعلیٰ تعلیمی مراکز میں ہیں۔ حبشی ناول نویس مضمون نگار اور شاعر امریکا کے ادب میں نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔ جارج کارور اور ارنسٹ جسٹ بہت بڑے سائنس والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ۳۵ سو حبشی ڈاکٹر اور سرجن ہیں۔ ایک ہزار سے زائد حبشی وکیل ہیں جن میں سے کئی جج ہیں اور دونوں نسلوں میں دادِ انصاف دے رہے ہیں۔

حبشیوں کے جلد نابود ہو جانے کے متعلق تمام پیشین گوئیاں غلط ثابت ہوئی ہیں۔ برخلاف اس کے دوسروں کے مقابلہ میں ان کی موت میں اک نمایاں کمی واقع ہوگئی ہے۔ ۱۹۱۱ء اور ۱۹۲۲ء کے درمیان صرف تپِ دق کی اموات میں ۴۲ فی صدی کمی واقع ہوگئی ہے۔ حبشیوں کی رفتارِ پیدائش اس وقت وہی ہے جو آج سے ۳۰ سال قبل گوری قوم کی تھی اور جو کئی یورپین ممالک سے زیادہ ہے۔ عام تعلیم، بہتر اقتصادی حالت اور بہتر صحت کی وجہ سے اس میں اور بھی ترقی ہو رہی ہے۔

گذشتہ بیس سال میں حبشی ترقی کی راہ میں بہت آگے نکل گئے ہیں لیکن بعض مشکلات اب تک اُن کے راستے میں حائل ہیں۔ ابھی اُن کو بہت طویل راستہ طے کرنا ہے لیکن وہ صحیح راستے پر گامزن ہیں اور پچھلے بیس سال کے واقعات پر نظر ڈالنے سے صاف طور پر نظر آتا ہے کہ وہ بہت جلد منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں گے۔

ٹالسٹائی کس طرح مرا

اخبار "لونگ ایج" لکھتا ہے کہ سوویٹ حکومت ایسی تحریریں نہایت سرگرمی سے شائع کر رہی ہے جن سے کونٹ ٹالسٹائی کے عہد اور اس کی شخصیت پر کوئی نئی روشنی پڑتی ہو، شاید اس لئے کہ لینن نے ایک دفعہ کہا تھا کہ "جنگ اور امن" دنیا کی بہترین تصنیف ہے۔ ان تحریروں میں سے آخری وہ تاروں کا مجموعہ ہے جو اسٹاپوو کے مقام سے بھیجے گئے جہاں ٹالسٹائی کا انتقال ہوا۔ ذیل کی سطور ہم اس اخبار سے نقل کرتے ہیں:-

اواخر اکتوبر ۱۹۱۰ء میں معمر کونٹ نے اپنے گھر کو چھوڑا اسے خیال تھا کہ اس کی نقل و حرکت بالکل پردۂ خفا میں ہے لیکن حقیقت میں پولیس اُس کے ساتھ تھی جو اُس کے تمام حالات سے اُس کی بیوی کو خبردار رکھتی تھی۔ اُس نے ڈان سے راسٹوو کا ٹکٹ لیا اور اپنے دوست ڈاکٹر میکووش کی معیت میں سفر کر رہا تھا کہ ۳۱ اکتوبر کو تیسرے پہر کو ایک بیماری نے آن دبایا۔ اس وقت گاڑی اسٹاپوو کے گاؤں سے گذر رہی تھی۔

کونٹ کو فوراً گاڑی سے اُتار لیا گیا۔ سٹیشن ماسٹر نے اپنا مکان اپنے معزز مہمان کو پیش کر دیا۔ پولیس ٹالسٹائی کے

خاندان، جرائد اور پادریوں کو فوراً خبر دی گئی اور یہ تمام اس چھوٹے سے قصبے میں آوارد ہوئے۔ ٹالسٹائی کی بیوی گاڑی کے ایک ڈبے میں فروکش ہوئی اور اس علاقے کا گورنر ایک دوسرے ڈبے میں۔ فوجیں بلائی گئیں اور توپیں اور بارود موقع پر جمع کر دیئے گئے۔ کلیسا نے اس وقت تک اُس کے لئے دعا کرنے سے انکار کر دیا جب تک وہ دوبارہ کلیسا کے حلقہ میں داخل ہونے کے لئے رضامند نہ ہو جاتے۔ حکام کے اوسان خطا تھے اور وہ تشدد پر آمادہ ہو رہے تھے لیکن تمام قوم میں ہمدردی کی ایک لہر دوڑ رہی تھی۔

اس چھوٹے سے اسٹیشن سے برقی پیغامات کا ایک طوفان امڈا چلا آتا تھا۔ ان پیغامات کے مختلف مضامین سے معاشرہ کے مختلف طبقوں کے دلوں کا ایک مدہم سا نقشہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔ پہلا پیغام پولیس افسروں کا ہے! "مصنف کونٹ ٹالسٹائی گاڑی میں بیمار ہو گیا۔ اسٹیشن ماسٹر روزولن نے اُسے پناہ دی" دوسرے روز خود ٹالسٹائی نے اپنے ایک دوست کو تار دیا "کل بیمار ہو گیا۔ مسافروں نے مجھے گاڑی سے اترتے ہوئے دیکھ لیا۔ آج حالت اچھی ہے اپنا سفر جاری رکھوں گا۔ تدبیر کرو "نکولیو"۔ لیکن یہ بات جلد ہی صاف ہو گئی کہ "نکولیو" جیسا کہ اُس نے اپنا نام ظاہر کیا تھا اس اسٹیشن سے زندہ رخصت نہ ہو سکے گا۔ اُس کے باقی حالات مندرجہ ذیل پیغامات سے ظاہر ہوتے ہیں "اگر امن قائم رکھنے کے لئے مدد کی ضرورت ہو تو لیبیڈین سے پولیس بھیج دی جائے" یہ ایک ہمسایہ صوبے کے گورنر نے مقامی گورنر کو لکھا۔ "آج اسٹاپووو پہنچا۔ کونٹ کا گھرانہ یہیں ہے۔ کل پھر تار دوں گا۔ دعا کے لئے تہ دل سے استدعا کرتا ہوں۔ وارسونوف (پادری)" ایک اخبار نویس نے پیغام بھیجا "خزاں کی تاریک اور طوفان انگیز رات تمام حاضرین کی روحوں کے ساتھ غم انگیز خیالات میں ہمنوا ہے۔ کیا روس کا آفتاب غروب ہو جائے گا؟" پولیس لکھتی ہے "بالکل امن ہے۔ اسٹاپووو کے باشندے کونٹ کی طرف سے بے پرواہ ہیں۔ انتظامات معقول ہیں"

جب کونٹ کا آخری وقت آن پہنچا تو پیغامات میں زیادہ ہیجان پیدا ہو گیا "دل کو سخت تکلیف ہے حالت نازک ہے" "گھر والوں کو جگا یا گیا اور بلایا گیا ہے۔ حالت خطرناک ہے" "دل کمزور ہو رہا ہے۔ گھر والے اسٹیشن پر پہنچنے والے ہیں۔ کونٹس بھی۔ ڈاکٹر رو رہے ہیں" "تیار رہو" "سو رہا ہے نبض کمزور ہے۔" "ڈھائی بجے، کوئی قابل ذکر بات نہیں" "تین بجے۔ نئے خطرے پیدا ہو گئے ہیں" "مارفائن کا ٹیکہ لگایا گیا۔ حالت ویسی ہے۔ سو رہا ہے۔ ٹانگیں گرم ہیں" "پانچ بجے۔ دل یکایک کمزور ہو گیا حالت سخت خطرناک ہے۔ دھند جھکڑ چل رہا ہے۔ پولیس پہرے پر ہے" اس کے پانچ منٹ بعد پولیس افسر نے اعلیٰ عہدہ دار کو تار دیا "ٹالسٹائی مر گیا" اُس کی موت کی پہلی خبر اُس کی بیماری کی پہلی خبر کی طرح پولیس ہی نے بھیجی۔

پنجاب میں علم کی سرپرستی

مندرجہ ذیل شذرہ ہمیں پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی کی طرف سے اشاعت کے لئے موصول ہوا ہے:-

مولفوں اور مصنفوں کی حوصلہ افزائی کے لئے ایک فنڈ قائم ہے، تاکہ اس صوبے کی دلیسی زبانوں کے اہل قلم کو مفید اور عمدہ کتابیں لکھنے کی ترغیب اور تحریک ہو، اور علم ادب میں ترقی ہو۔ یہ انعام صرف اس صوبے کے رہنے والوں کے لئے ہیں اور صرف چیدہ اور خاص تعریف کے قابل کتابوں کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ تم جب تک غیر معمولی اور انوکھی قابلیت کے نہ ہوں انتخاب انعام میں نہیں آسکتے۔ انتخاب انعام کے متعلق کمیٹی نے چند قواعد و ضوابط مرتب کر دیئے ہیں، اور انتخاب کے وقت ان پر عمل ہوتا ہے۔ ان قواعد کی نقل دفتر پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ واضح ہو کہ انعام دینے کی غرض سے کمیٹی ان تصانیف پر غور نہیں کرتی جن میں سیاسی اور مذہبی متنازعہ معاملات پر بحث مباحثہ ہو، یا جو کسی خاص فرقہ کے متعلق ہوں، یا ان میں سے ایسے مضامین ہوں کہ جن سے کسی طرح قوموں میں باہمی نفرت پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، یا جن میں موجودہ فرقہ وارانہ سیاسی متنازعہ معاملات پر بحث کی گئی ہو، یا جو درسی کتابیں ہوں، یا جن کا کسی پیشہ سے تعلق ہو۔ ترجیح ایسی کتب کو دی جاتی ہے جو عوام الناس کے واسطے مفید ہوں اور جو عام فہم سائنس تاریخ، سوانح عمری یعنی سیرت اور سیاحت سے تعلق رکھتی ہوں۔ یا جن کا مدعا یہ ہو کہ مدرسوں کے بچوں کے لئے آسان مفید اور دلچسپ علم ادب مہیا کیا جائے، یا جو کہ خاص طور پر لڑکیوں کے لئے لکھی گئی ہوں +

ہر سال ماہ جنوری میں ٹکسٹ بک کمیٹی کتب موصولہ پر غور کیا کرتی ہے۔ اس سال کی کتابیں برائے انتخاب ۲-جنوری ۱۹۳۰ء تک دفتر میں آنی چاہئیں۔ گویا یہ آخری دن ہے +

موجودہ قواعد کی رو سے بہترین کتاب کے لئے انعام ہزار روپے تک ہو سکتا ہے اور کوئی انعام پانچ سو سے کم نہ ہوگا۔

تفصیل انعامات سال ۱۹۲۹ء حسب ذیل ہے:-

نمبر شمار	جس کو انعام دیا گیا	نام کتاب	رقم انعام
۱	حافظ محمود شیرانی لکچرار پنجاب یونیورسٹی لاہور	پنجاب میں اردو	ایک ہزار
۲	ڈاکٹر سولکھن سنگھ ایم بی بی ایس میڈیکل آفیسر خالصہ کالج امرت سر	شری رک رکھیا	سات سو پچاس
۳	لالہ سنت رام بی اے لاہور	البیرونی کا بھارت حصہ سوم	پانچ سو
۴	ڈاکٹر سکھا رام مہدی رتا ایم بی بی ایس لاہور	جڑی بوٹی حصہ اول و دوم	پانچ سو

گوئٹے اٹلی میں

گوئٹے اپنی جوانی میں ایک رندِ لاابالی تھا، لیکن ۱۷۸۱ء کے موسم بہار میں جب وہ سوئٹزرلینڈ میں سردیاں گزار کر واپس آیا تو اُس کے دل میں پھر ادبی جوش پیدا ہوا۔ اُس نے سپینوزا کی تصانیف کا مطالعہ شروع کیا اور اس کی زندگی میں متانت اور مستعدی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ اُس نے ولہلم میسٹر اور ٹمیسو دو تصانیف کی طرح ڈالی اور سیزر، محمد، آوارہ یہودی اور پرومی تھیوس پر مضامین کے خاکے تیار کئے۔

چھ اور سالوں تک وہ اپنے چھوٹے سے خوبصورت گھر میں رہا جس کے چاروں طرف باغ تھا اور جو ڈیوک کارل آگسٹ نے اُسے دے رکھا تھا۔ لیکن اُس کی طبیعت یہاں بھی بے کیف ہی رہتی تھی۔ اُسے ایک تازہ فضا کی ضرورت تھی جس میں اُس کے خیالات ابھریں۔

سو ۱۷۸۶ء میں کسی کو اطلاع دیئے بغیر گوئٹے چپکے سے اٹلی کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ عمر بھر اُسے اٹلی جانے کی تمنا رہی تھی۔ جب انگور کی بیلیں، زیتون کے جھنڈ، پرانے شہر اور اس سے بھی پرانے کھنڈر اُس کی نظروں سے گزرتے تھے تو اُسے یہ سفر گھر سے زیادہ خوشگوار معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے اپنی شدید کلاسیکی رنگ میں ڈوبی ہوئی تصنیف افی گینیا یہیں مکمل کی جو جرمن زبان میں ایک یونانی المیہ ناٹک ہے۔ روما سے وہ سسلی میں پہنچا جس میں اُس نے یونان سے زیادہ یونانیت پائی۔

اٹلی میں گوئٹے نے اپنے عمر بھر کے ذوقِ تصویر کشی و نقاشی کو خیرباد کہی اور ہمہ تن شاعری میں محو ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے سمجھ لیا کہ فطرت نے اُسے شاعری کے لئے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ وہ پھر ویمر میں آیا تا کہ اپنے عزائم کو بارور ہوتا دیکھے۔ اُس نے ڈیوک سے کہہ کر دفتری تفکرات سے آزادی حاصل کر لی اور ادب کی خدمت کے لئے تیار ہو گیا۔

منصور احمد

گوئٹے اٹلی میں

غالب اور ہائنے

کامرڈ کے ایک پرانے پرچے میں ہندوستان کے مشہور مستشرق پروفیسر صلاح الدین خدابخش نے جرمنی کے جلیل القدر شاعر ہائنے کا موازنہ غالب سے کیا تھا۔ مضمون گو پرانا ہے مگر پرانی شراب کی خاصیت رکھتا ہے۔ اس لئے اس کے پیش کرنے میں کسی خاص معذرت کی ضرورت نہیں۔

(مترجم)

حال میں ہائنے کے سوانح زندگی شائع ہوئے ہیں جن سے اس کے تمام خصائل وخصوصیات، اس کے افکار و آلام اس کے عشق ومحبت کی داستان اور آخر میں اس کی تکالیف اور علالت کے واقعات من وعن معلوم ہوجاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہائنے خود ہمارے سامنے موجود ہے اور اپنے مخصوص بذلہ نواز لہجے میں اپنے اسرار دلی کہہ رہا ہے۔ جب اس کے دل پر سے واقعات عالم کا پردہ اٹھتا ہے تو ہمیں اس آئینہ میں اس کی صورت صاف نظر آتی ہے۔ گویا اس کا دل غمگین ہے، بے قرار ہے، اور کسی کی جستجو میں خون بہا رہا ہے۔

ہائنے پر اٹھارہویں صدی کے خیالات کا بہت گہرا اثر تھا اور یہ اثر مرتے دم تک ایک صورت پر قائم رہا۔ ہائنے جرمنی کے شہر ڈسلڈارف میں ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوا۔ تاریخ کے لحاظ سے گو وہ اٹھارھویں صدی کے اختتام پر پیدا ہوا، لیکن اس صدی کا نقش اس کے دل پر پتھر کی لکیر کی طرح ثبت تھا۔ اس کی ماں فرانس کے مشہور فلسفی اور سیاس روسو کی شاگرد تھی اور روسو کی مشہور تصنیف "ایمیل" سے جو تعلیم پر ایک معرکۃ الآرا کتاب ہے، پورے طور پر واقف تھی۔ ہائنے کو اس طرح اٹھارہویں صدی کے خیالات وراثۃً ملے تھے۔ اٹھارھویں صدی سیاسی مباحث اور تحقیر مذہب کے لئے خاص طور پر مشہور ہے۔ اس زمانہ میں عقل ہی ہر چیز کا معیار سمجھی جاتی تھی۔ فلسفہ، علم، سیاست، سائنس غرض ہر شعبۂ زندگی میں انسان اپنی ان تھک کوششوں کا ثبوت دے رہا تھا۔ گذشتہ واقعات اور روایات پر سختی سے نکتہ چینی ہوتی تھی۔ مذہب کو بغیر سوچے سمجھے قبول کر لینے کے خلاف ایک ہنگامہ گرم تھا۔ خون اور نسل کا تفوق مٹتا جا رہا تھا۔ خدا کی ودیعت کردہ حکومت کے اصول کے خلاف آوازیں بلند ہو رہی تھیں، اور سوسائٹی کو ایک نئے مرکز پر لانے کی کوششیں جاری تھیں اور ساتھ ہی ساتھ سیاست بھی اپنا رنگ بدل رہی تھی۔ اس صورت حالات میں جب کہ یورپ ایک انتشار

کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اور اس پر سے دماغی اور سیاسی انقلابات کی موجیں گزر رہی تھیں ہائنے نے دنیا میں قدم رکھا۔ جو کچھ روسو نے سیاست کی دنیا میں کیا بالکل وہی ہائنے نے عقل کی دنیا میں کیا۔ ایک طرف روسو انسان کے طوقِ غلامی کے خلاف برابر آواز بلند کرتا رہا۔ اور ہمیشہ انسان کو سیاسی غلامی سے نجات دلانے کی فکر میں سرگرداں رہا۔ دوسری طرف ہائنے نے اپنی تلوار سنبھالی اور اُن تمام گتھیوں کو کاٹ دیا جو عقل میں لپٹی ہوئی تھیں۔

ہائنے کو اوائلِ عمری سے لکھنے کا شوق تھا۔ اُس نے سولہویں ہی برس میں اپنے قلم کو جنبش دینا شروع کر دیا تھا۔ اور اس کے بعد جب اس دریا میں طوفان آیا تو آخر تک یہی کیفیت باقی رہی۔ اُس کا قلم اُس کے خیالات کی ترجمانی میں کبھی سست نہیں رہا۔ اُس کی ماں کو بڑا شوق تھا کہ وہ اپنے جوان بیٹے کو ایک کامیاب ساہوکار بنتا ہوا دیکھے اور وہ روپے سے کھیلے لیکن اُس کو کیا خبر تھی کہ اس کا بیٹا ایک ایسا پیشہ اختیار کرے گا جس کا اُس کو سان گمان تک نہیں۔ ماں کے اصرار پر بہرحال اُس نے ایک ساہوکار کی دوکان پر نوکری کر لی اور وہاں آنے جانے لگا مگر اس لین دین میں اُس کی طبیعت نہ لگتی تھی۔ تین ہفتہ تک بمشکل اُس نے اپنے دل پر صبر کی سل رکھ کر اس مصیبت کو برداشت کیا اور اس کے بعد اپنی ماں کو کسی طرح راضی کر کے وہاں سے علیحدہ ہو گیا۔ وہ اب جاننے لگا کہ تجارت سے اُس کا مذاق کوسوں دور ہے اور اپنی تمام کمزوریوں اور قوتوں پر اس غرض سے غور کرنے لگا کہ اب اُس کو کیا کرنا چاہئیے۔ اُس نے سوچا کہ مجھ کو اگر کہیں خوشی نصیب ہو سکتی ہے تو وہ ادب کی دنیا ہے اور واقعی اس دنیا میں اُس نے جو نام پیدا کیا وہ نہ صرف اُس کے لئے بلکہ اُس کے تمام ملک کے لئے تاریخ کے صفحات میں ایک زریں کارنامہ رہے گا۔ ساہوکارہ چھوڑ کر اُس نے قانون کی طرف رجوع کیا لیکن یہ بھی اُس کے مذاق کے مطابق نہ نکلا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ بے شک ایک ایڈووکیٹ بن گیا مگر اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اس پیشے سے اُس کو اپنی روزی پیدا کرنے میں کسی قسم کی سہولت نہ ہوئی۔

بڑے بڑے اصحابِ نظر کی طرح اس کو وقت کی سوسائٹی سے بالکل لگاؤ نہ تھا۔ ۲۶ سال کی عمر میں جب ایک جلاد کی لڑکی سے اُس کو عشق ہو گیا تو وہ لکھتا ہے کہ میں اس سے اپنے جذبات کی بنا پر عشق نہیں کرتا بلکہ مجھ کو سوسائٹی کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے میں مزا آتا ہے۔

یہاں ہم پر اس کے مزاج کی حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ اپنی تمام زندگی اُس نے ایک کمربستہ سپاہی کی طرح کاٹ دی ہمیشہ وہ آزادی کے لئے لڑتا رہا۔ کون سی آزادی؟ وہ آزادی جو انسان کو گذشتہ روایات کی جماعتی اور عقلی غلامی سے آزاد کرائے۔

اپنے متعلق وہ لکھتا ہے کہ میں حسین عورت اور انقلابِ فرانس کا ہمیشہ شیدائی رہا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ دنیا کا کون سا صاحبِ

دل ایسا ہے، خواہ وہ لشکر شکن سپہ سالار ہو یا ملکوں کو تہ و بالا کرنے والا سیاسی گوشہ میں بیٹھ کر فلسفہ کے ادق مسائل پر غور و فکر کرنے والا فلسفی ہو یا ادب کے لطائف اور نکات پر مسرور ہونے والا شاعر جو ایک حسین عورت کا شیدائی نہ ہو۔ قیصر کو لیجئے۔ خود جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کیجئے۔ خالد اور ابو سینا کو دیکھئے۔ کیا یہ لوگ محبت کی دیوی کے پرستار نہ تھے؟ لیکن بہت ممکن ہے کہ ہائنے کا دل عورتوں پر اس زمانے کی سختیاں دیکھ کر پسیج گیا ہو اور اس طرح اس کے عشق میں ایک قسم کی شعریت پیدا ہو گئی ہو۔ عورتوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے آواز بلند کرنے سے اُس کی مراد کمزوروں کی حمایت تھی۔

اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں اُس کو دولت کی دیوی کے دربار میں حاضری کا کم موقع ملا لیکن جب ملا تو اس کا نتیجہ اس کی طویل علالت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس کے اس بیان میں کتنا درد ہے کہ میں نے اپنے زمانۂ قیام یونیورسٹی میں جواہرات زیرِ حلق اتارے ہیں اور موتیوں کو ہضم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن میری گھڑی کو میرے دل کا راز مجھ سے زیادہ معلوم ہے اور وہ اس کو مشتہر بھی کرتی ہے اس لئے کہ وہ کبھی کبھی کسی یہودی کے تہ خانہ کی بے تکلف سیر بھی کرتی ہے۔ ان الفاظ میں محض شاعری کی لطافت نہیں ہے بلکہ یہ وہ تلخ حقائق ہیں جن کو ہائنے نے محسوس کیا مگر معمولی طور پر ظاہر کیا۔ اس کی تمام زندگی غربت اور علالت کی وجہ سے بے کیف رہی اور ایک دفعہ اُس نے کس حسرت بھرے انداز میں کہا ہے "کاش میں دنیا سے اُٹھ جاتا۔ اے سوزِ جانگزا تیرا نام ہائنے ہے!"

اُس کی تمام تحریروں میں، کیا نظم، کیا نثر، اس کے ذاتی سوز و گداز کا ذکر موجود ہوتا ہے۔ اس کی شوخ اور مذاحیہ تحریروں میں بھی یہ رنگ صاف جھلکتا ہے اور اکثر اوقات یہ رنگ اتنا واضح ہو جاتا ہے کہ گویا ہم فریاد جرس سن رہے ہیں ہائنے کی افتادِ طبیعت روسو سے بالکل مختلف تھی۔ روسو کی سرشت میں تعمیر تھی اور ہائنے تخریب پسند تھا۔ اس کے اندازِ تحریر میں ایسی کوئی بات نہیں ملتی جس سے معلوم ہو کہ ہائنے کو کسی نئی چیز کے تیار کرنے میں لطف آتا تھا۔ اُس کا مقصد محض اس قدر تھا کہ وہ عقل کو تمام فرسودہ روایات سے پاک کرے۔ نپولین کے اور اُس کے خصوصیات میں بڑی حد تک یکرنگی تھی۔ اور اسی وجہ سے وہ نپولین کا شیدائی تھا۔ نپولین بھی اس کی طرح توڑ پھوڑ میں مشاق تھا۔ انقلابِ فرانس کا وہ بڑا مداح تھا۔ اس لئے کہ اُس نے اُن تمام روایات کو خاک کے ذروں کی طرح اڑا دیا جو اخوت آزادی اور مساوات کے راستے میں حائل تھے۔ مذہب پر اس کے تمام حملوں کا ذکر بھی اسی روشنی میں ہو سکتا ہے۔ مذہب ہمیشہ قدامت پسند طبقے کا بڑا قلعہ رہا ہے اور اُس نے خیالات کی ترقی میں کافی روکاوٹیں ڈالی ہیں۔ ہائنے نے اس لئے مذہب پر سخت حملے کئے کہ یہ نئے خیالات کی ترویج کو روکتا اور قدیم کو مستحکم کرتا ہے۔ وہ مذہب کا تار و پود بکھیرتا ہے اور اپنی نظموں میں

اس پر آوازے کستا ہے۔ معجزات کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ خدا کو اپنے افعال کی تنقید اب منظور نہیں اسی لئے معجزات بند ہو گئے ہیں۔ اُس کے زمانہ میں جرمنی کے اندر مذہب کے خلاف ایک تحریک شروع ہوئی۔ ہائنے اس میں شریک ہوا اور اس نے مذہب پر خوب خوب حملے کئے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھ پر چند حلقوں میں اعتراض ہوا ہے کہ میں نے جرمنی کے رخ سے کیوں نقاب الٹ دیا اور کیوں میں نے جرمن قوم پر یہ ظاہر کر دیا کہ وہ جس بہشت کی پرستش کر رہے ہیں وہ سراسر دیوتاؤں سے خالی ہے۔ ہاں وہاں البتہ ایک خضر صورت ہستی ضرور نظر آتی ہے جس کے دل میں رنج و غم کا وفور ہے اور اُس کے ہاتھ کسی بوجھ سے دبے ہوئے ہیں۔ اور اس صورت کا نام "ضرورت یا احتیاج" ہے۔ میں نے تو صرف ایک تنبیہ کی ہے کہ ہر شخص کو خود اس طرف قدم بڑھانا چاہئے اور اپنی بساط کے مطابق علم حاصل کرنا چاہئے۔ اور جو انوکھی باتیں میں آج کر رہا ہوں وہ دریائے رائن کے اُس کنارے پر (فرانس) مدتوں سے کہی جا رہی ہیں۔ ہم میں وحدانیت کے ایسے پرستار بھی ہیں جو والٹیر کو زندہ جلا دیں اس لئے کہ وہ پوشیدہ طور پر موحد ہے۔"

آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اس کی تحریر میں کتنی تلخی ہے اور اُس نے اپنے مطمح نظر کو ثابت کرنے کے لئے کتنا وحشیانہ پہلو اختیار کیا ہے۔ اُس کو صرف مذہب ہی سے نہیں بلکہ سارے جماعتی نظام سے نفرت ہے۔ بادشاہ سے لے کر غلام تک، رئیس سے لے کر گداگر تک اور فلسفی سے لے کر بیوقوف تک سب اس کے تیر ملامت کا نشانہ بنتے ہیں۔ دنیا اس کے نزدیک گویا اپنے محور سے ہٹ گئی ہے۔ اس میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے اور ان حقائق کو وہ برابر لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔

لیکن کیا وہ دنیا کی تمام خرابیوں کو لاعلاج سمجھتا تھا کہ اس کی تباہی کا خیال ہر وقت اس کو رہتا تھا؟ نہیں اُسے ہرگز یہ خیال نہ تھا۔ وہ ان خرابیوں کی اصلاح مستقبل کے پردہ پر اپنی دوربین آنکھوں سے دیکھتا تھا، اور اس معاملہ میں اس کی وسعت نظر اس کے پیش رووں اور پس رووں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ وہ تمام انسانوں کی ایک مجلس کے قیام کا موید تھا۔ وہ دنیا میں ایسا دستور چاہتا تھا جس سے ہر شخص کا دوسرے سے لگاؤ پیدا ہو۔ ذیل میں اس کی ایک عبارت کا ترجمہ دیا جاتا ہے جس سے انسانوں کے متعلق اس کی محبت صاف طور پر آشکارا ہوتی ہے:

"کتنی بہاریں آئیں اور چلی گئیں لیکن اُن کا جوبن کبھی نہیں نکھرا۔ میں بہار کی ترنم ریز بلبل کے شیریں مگر دروغ نالوں پر ہرگز یقین نہیں کرتا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کا فروغ بے ثبات ہے اور جب میں کلی کے ننھے دل کو پھول میں بدلتے خون ہوتے اور آخر میں ہوا کے کسی شوخ جھونکے کی تاب نہ لا کر مرجھاتے اور پیوند خاک ہوتے

دیکھتا ہوں تو میرے سامنے بے ثباتی کی ایک مجسم تصویر ہوتی ہے۔ مجھ کو ہر جگہ موسم سرما کا ظہور نظر آتا ہے جو دلوں کی گرمی شباب کی شوخی اور موجوں کی روانی کو سرد کر دیتا ہے۔ اس کے باوجود بھی میرے سینہ میں ایک چنگاری موجود ہے جس میں تمام عالم پر چھا جانے اور اُس کو مسخر کر لینے کی ایک آرزو پوشیدہ ہے۔ ستاروں کی رفاقت اس کو ناپسند ہے اس لئے کہ اُن میں سراسر سردی ہے۔ کہکشاں کی سفیدی اُس کو منظورِ نظر نہیں اس لئے کہ وہ بے میل ہے۔ غرض آسمان اور زمین میں اس کے بسنے کے لئے اگر کوئی ممکن جگہ ہے تو وہ صرف میرا دل ہے یہی محبت ہے جس کا ظہور اکثر دیوتاؤں کی صورت میں ہوا ہے"۔

زندگی میں ہم کو تعمیری اور تخریبی دونوں قوتوں کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ دونوں کے حلقۂ عمل جداگانہ ہیں اور ضروری ہیں۔ ہر قوم کی تاریخ میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب تخریب کی ضرورت اشد ہوتی ہے اور اس وقت ہم تخریبی قوائے عملیہ کو برسرِ کار لا کر تمام خرابیوں کا قلع قمع کر دیتے ہیں تاکہ ہم سچائی کو اس کی پوری شان و شوکت کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ فرمائی کا موقع دیں۔ اور اس ذیل میں ہائنے نے بنی نوعِ انسان کی جو خدمت کی ہے وہ تاابد زندہ رہے گی۔ بے ایمانی، ریاکاری، مکاری کا اس کے ہاں مطلق گذر نہیں۔ اس کے علم پر انصاف اور سچائی کے الفاظ کندہ تھے۔ اور اُس نے اس علم کو تازندگی کبھی سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ وہ ہر قسم کے حوادثِ زمانہ کا ثابت قدمی اور دلیری سے بلاخوفِ نتائج مقابلہ کرتا رہا۔ اگر وہ عیش و آرام کی زندگی میں پڑ جاتا تو اتنا بڑا کام کبھی نہ انجام دے سکتا۔ اس کے باپ نے اس کو ایک دفعہ نصیحت کی تھی کہ "بیٹا۔ تمہاری ماں چاہتی ہے کہ تم ریگٹر شلیمر سے جا کر فلسفہ پڑھو۔ یہ اس کا معاملہ ہے۔ مگر میں فلسفہ پسند نہیں کرتا۔ اس لئے کہ یہ صرف خیالی اور وہمی چیز ہے۔ میں بیوپاری آدمی ہوں۔ مجھ کو اپنے بیوپار میں اس سے کیا مدد ملے گی۔ لیکن اگر تمہارا جی چاہے تو میں تمہیں اس سے روکتا نہیں مگر عوام کے سامنے تم اپنے انکار کا ذکر نہ کیا کرو۔ اس لئے کہ اس سے میرے بیوپار کو نقصان پہنچے گا خاص کر اُس وقت جب لوگ سنیں گے کہ میرا لڑکا خدا پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ یہودی تو مجھ سے لین دین مطلق بند کر دیں گے اور تم جانتے ہو کہ یہودی کتنی جلدی قیمت ادا کر دیتے ہیں اور اپنے مذہب پر کتنی سختی سے پابند ہیں"۔

لیکن باپ کی یہ نصیحت ہونہار بیٹے کے لئے بالکل بے سود ثابت ہوئی۔ ہائنے نے اپنا عندیہ اپنے باپ سے صاف اور واضح طور پر کہہ دیا۔ اس کو بہت سا لالچ بھی دیا گیا مگر ہائنے کا پختہ دل اپنے راستے سے تنکا برابر بھی ہٹنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ آزادی کا یہ علمبردار جرمن زبان کی نثر کا پیغمبر بھی تھا۔ جرمن زبان شاید ہی کسی دوسرے شخص کا نام بتا سکتی ہے جو اس قدر صاف، رواں سلیس

پُرزور اور پُرمعنی تحریر پر قادر ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہائنے اپنے فن میں لاثانی ہے۔ کون سا دل ہے جو اُس کی غزلیں پڑھ کر بے قرار نہ ہو جائے اور کون سا ہاتھ ہے جو کوہ ہرز کا سفرنامہ پا کر مصنف سے مصافحہ کا شائق نہ ہو جائے۔ ہاں، کون ہے جو اس کے انگریزی حالات کو پڑھ کر اپنے دل کو قابو میں رکھ سکے۔ لیکن اس کی زندگی قریب قریب رنج و غم کی ایک داستان ہے جس میں مسرت اور خوشی کے صفحات کم نظر آتے ہیں۔ ۱۶۔ فروری ۱۸۵۶ء کی وہ شام پُرحسرت تھی جب کہ اُس کا آفتابِ حیات ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ اُس کے حسبِ ذیل الفاظ سے اُس کے دردِ دل کا حال کسی حد تک معلوم ہوتا ہے:-

"دیکھو میرے تابوت کی لکڑیاں مضبوط اور عمدہ ہوں۔ خیال رکھنا کہ وہ دریائے رائن کے پل سے لمبی ہوں۔ میری نعش کو کاندھا دینے کے لئے کم سے کم بارہ قوی ہیکل جوانوں کو بلانا تاکہ وہ میری بھاری نعش کو اٹھا کر قبر کے گڑھے میں ڈال دیں۔ مگر سنو میری نعش کے لئے سمندر کی گہرائی زیادہ موزون ہے۔ میری نعش آخر کیوں اتنی بھاری ہوگی اس لئے کہ میرے دل میں دو عالم کے خزائن پوشیدہ ہیں۔ سمندر کی گہرائی میرے لئے مناسب ہے اور میں وہیں رہ سکوں گا کیونکہ ایک طرف مجھ میں دنیا کی ساری کلفتیں ہنگامہ آرائی کرتی ہونگی اور دوسری طرف محبت اپنی پوری تیزی کے ساتھ جوش مار رہی ہوگی"

تھوڑا عرصہ ہوا کہ میں نے غالب اور ہائنے کا موازنہ کیا تھا جو محض سطحی تصور کی بنا پر نہ تھا بلکہ خاصی فکر اور دماغی کاوش کا نتیجہ تھا۔ ہائنے کے سوانح شائع ہونے سے یہ رنگ ذرا صاف ہو جاتا ہے، اور ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ غالب اور ہائنے کے سینوں میں ایک ہی دل تڑپتا تھا۔ رقعاتِ غالب پڑھئے اور ساتھ ہی ساتھ ہائنے کے خطوط کا بھی مطالعہ کیجئے پھر آپ کو معلوم ہوگا کہ ان دونوں میں کتنی دماغی قربت تھی۔ دونوں میں آورد کا نام تک نہیں اور نہ وہ کسی جوش کو دبانے یا ظاہر کرنے کی کوئی خاص کوشش کرتے ہیں۔ ان کا کلام گویا ایک پردہ ہے جس کو اٹھا کر وہ اپنے دل کی کیفیت عالم پر آشکارا کرتے ہیں۔ خلوت میں وہ بالکل اطمینان اور صفائی قلب سے باتیں کرتے ہیں۔ ان کی صحبتوں میں ہر حسین اور پُر رونق چیز کا ذکر ہوتا ہے۔ دونوں میں حقیقت کے دریافت کرنے کی تڑپ موجود ہے۔ دونوں کو آپ کسی خیالی معشوق کے لئے سرگردان اور پریشان پائیں گے۔ اُن کے کلام سے روح کو تازگی اور فرحت ملتی ہے، دماغ کو روشنی اور تاریکی کا امتیاز حاصل ہوتا ہے۔ اور عالی حوصلگی و رفعتِ خیال کو تقویت ہوتی ہے۔ دونوں اپنے فن کے کامل استاد ہیں اور کون ہے جو اُن کے اثرات سے زندگی کے پوشیدہ راز کو معلوم کرنے کا خواہاں نہیں ہے؟ دونوں دنیا کی تکالیف پر آنسو بہاتے ہیں۔ اُن کا دل انسانیت کے غم میں

بے قرار ہے لیکن انسان کی آخری تباہی پر کون ہے جس کو یقین نہیں ہے؟ دونوں ملول ہیں مگر ان کے اس انداز میں بھی ایک شاہانہ تمکنت ہے۔

اردو ادب میں غالب کا وہی درجہ ہے جو جرمن ادب میں ہائنے کا ہے۔ اردو نثر کی شگفتہ بیانی کی ابتدا کا سہرا بجا طور پر غالب کے سر ہے۔ غالب نے اس میں سلاست، ترنم، روانی اور حسن پیدا کیا اور اسکی ترقی کے لئے لامتناہی راستہ کھول دیا۔ لیکن غالب اور ہائنے کا موازنہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ اس سے بھی آگے جاتا ہے۔ دونوں ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے جب ایک دور ختم اور دوسرا شروع ہو رہا تھا۔ موجودہ طرزِ زندگی اور خیالات کی رُو سے پریشان ہو کر دونوں نے اپنی دنیا الگ آباد کی۔ دونوں کے حسرت و ارمان اور رنج و مسرت کے بیان سے رازِ دلی صاف ظاہر ہوتا ہے اور یہی اُن کے فن کا سب سے بڑا جادو ہے جو دلوں کو مسخر کر لیتا ہے۔ دونوں نے دل کی زبان میں نغمہ سنجی کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کا کلام تا ابد تازہ اور شاداب رہے گا۔

دونوں اس طرح حقیقت کے چہرہ سے نقاب کشائی کرتے ہیں اور اس طرح انسانی دل کے راز کو آشکار کرتے ہیں کہ ہم فوراً اُن کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ اور اکثر ہمیں اپنے طرز بیان سے اس طرح حیرانی میں مبتلا کرتے ہیں کہ گویا اس راز کا افشا ہماری زندگی کا عین مقصد تھا۔ دونوں کے دل میں انسانی ہمدردی اور محبت کا سمندر جوش مارتا ہے۔ دونوں کمال نومیدی وحیرت کے عالم میں انسانی گوشت پوست کو امید کے روح افزا پیاموں سے مسرور کرتے ہیں۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں دونوں مشعل کا کام دیتے ہیں۔ دونوں ایک خیالی حقیقت کے پیچھے بڑی سرگرمی اور جوش سے دوڑتے ہیں اور ہر راہرو کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں لیکن دونوں کی سعیِ پیہم عالم کی لامتناہی وسعت میں جا کر گم ہو جاتی ہے۔ دونوں زخمِ دل کا علاج کرتے ہیں اور انتہائی حرماں کے وقت دستگیری کرتے ہیں۔ دونوں انسانیت کو ایک خوش آیند زندگی کا مسرت آمیز پیغام دیتے ہیں۔ کمال اور اطمینانِ قلب دونوں کا اصل الاصول ہے۔ اور اس لئے اُن کے راستہ میں جتنی دقتیں حائل ہوتی ہیں اُن کا بڑی مردانگی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ مذہب پر غالب کا حملہ ویسا ہی سخت اور تیز ہے جیسا ہائنے کا سخت اور تمسخر آمیز ہے۔ دونوں کو ایسے مذہب سے بالکل انس نہیں جو صرف نام کی خاطر زبان سے ادا کیا جائے۔ دونوں کبھی اپنی محنتوں کے ثمر حاصل کرنے کے شائق نہ تھے۔ دونوں ہمیشہ قسمت کے ہاتھوں نالاں رہے اور برابر زورِ قلم اسی کی شکایت پر صرف کرتے رہے ؏

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اگر ہائینے نے انسانی ادب کی جنگ میں اپنی سپہ گری کا کمال دکھایا تو غالب بھی اس سے پیچھے نہیں رہا۔ غالب ہمیشہ رنگ و بو کے پردے میں حقیقت کو تلاش کرتا تھا اُس کا دل ہمیشہ محبت کے ولولوں سے سرشار رہا۔ قدیم روایات کا وہ مرے سے مخالف تھا اور ان کے خلاف اسی جوش اور سرگرمی سے آواز بلند کرتا رہا جس جوش اور سرگرمی سے جرمنی میں ہائینے نے کی۔ دونوں کے کلام میں محبت کی چاشنی اور انسان کی نیکیوں اور کمزوریوں کا بیان بدرجۂ اتم موجود ہے۔ لہٰذا دونوں کے کلام صفحۂ ہستی پر روشن حروف میں جگمگا رہے ہیں اور اس عالم میں ہمیشہ تاریکی کو دور کرنے میں مدد دیتے رہیں گے۔

"قراخاں"

نوائے راز

کوئی ادا فروش ہے کوئی جفا فروش
بازارِ حسن میں ہوں مَیں تنہا وفا فروش

ہے کوئی اہلِ ہوش ہیں جاں بازِ تشنہ کام
تیغِ فنائے عشق ہے آبِ بقا فروش

اہلِ جہاں سے اپنی نبھے بھی تو کس طرح
وہ ہیں خدا فروش تو ہیں ماسوا فروش

اب منکرانِ حق سے شکایت نہیں مجھے
جو بُت شکن تھے آج وہ خود ہیں خدا فروش

بزمِ سخن میں اور بھی تو خوش کلام ہیں
اے راز ایک تو ہی نہیں ہے نوا فروش

راز چاندپوری

نشاطِ رُوح

اب نہ کہیں نگاہ ہے، اب نہ کوئی نگاہ میں
محو کھڑا ہوا ہوں میں حُسن کی جلوہ گاہ میں

اے تو بہارِ رنگ رنگ، وائے تو ورائے آب و رنگ
عشق کسی نگاہ میں، حُسن کسی نگاہ میں

حُسنِ ہزار طرز کا ایک جہاں اسیر ہے
ملحدِ بے خبر بھی گم جلوۂ لا الٰہ میں

اب وہ زماں نہ وہ مکاں اب وہ زمیں نہ آسماں
تم نے جہاں بدل دیا آکے مری نگاہ میں

لفظ نہیں بیاں نہیں یہ کوئی داستاں نہیں
شرحِ نیاز و عاشقی ختم ہے ایک آہ میں

رازِ فتادگی نہ پُوچھ لذتِ خستگی نہ پُوچھ
ورنہ ہزار جبرئیل چھپ گئے گردِ راہ میں

در پہ ترے جو آگیا اب نہ کہیں مجھے اُٹھا
گردشِ مہر و ماہ بھی دیکھ چکا ہوں راہ میں

اصغر
گونڈوی

حُسنِ خاموش

مغربی تہذیب نے ہماری طرزِ معاشرت، ہمارے اخلاق اور زبان وغیرہ پر تو اثر ڈالا ہی تھا، مگر یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ صنعت وحرفت اور دستکاری پر بھی اس قدر جلد اثر پڑے گا جیسا کہ سوسائٹی اور اخلاق پر۔ کیونکہ اہلِ مشرق کے خمیر میں مذہبیت اور ہندوستان والوں میں عبودیت کا عنصر بہت ہے۔ کتنی ہی رند مشربی کیوں نہ پھیلے خدا کی یاد شکل سے جاتی ہے۔ سائنس ہم کو کتنا ہی پابندِ دہریت کیوں نہ کرے پھر بھی روحانی جذبات خودبخود دل پسند چیز میں، خواہ اس کا وجود دستِ قدرت سے ہو خواہ صنعتِ انسانی سے، حسنِ کمال کے ساتھ ساتھ جمال کو بھی دیکھنے کے خواہاں ہوتے ہیں اور اگر کوئی مرغوب شے پسند کی اس کسوٹی پر پوری نہ اُترے تو اس کا توازن معیارِ اخلاق سے بھی درست نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں تو فطرتاً اہلِ عقل پر روحانی ذوق حاوی ہو کر یہ کہلواتا ہے کہ ؎ لائے گل تو خورسندم تو بوئے کسے داری

لیکن آخر کار مغربی تہذیب نے ہماری اس پاک پسند کو مائل بہ پستی کر دیا اور مادیات ہی نہیں بلکہ نفسیات کے اُن مظاہر کا خوگر بنا دیا جن کو کسی زمانے میں ہم خواب میں بھی دیکھنا گوارا نہ کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زمانۂ حال کی صنعت سے وہ روحانیت تو درکنار وہ سادگی بھی مٹتی معلوم ہوتی ہے ؎

سب سیکھ لیا غیر سے افسونِ شرارت ۔۔۔ باقی وہ کہاں سادگیٔ یار کا اب رنگ

زیادہ عرصہ نہیں ہوا اہلِ مشرق کا یہ خیال ہو گیا تھا کہ قدیم ہندوستان میں مصوری ونقاشی کا وجود نہ تھا ہی نہیں، اور اگر قرونِ وسطیٰ میں کچھ مثالیں ملتی ہیں تو وہ چین یا ایران سے مستعار کی ہوئی ہیں۔ مگر چند جفاکش تلاش کرنے والوں نے ثابت کر دیا کہ ہندوستانی صنعتِ مصوری اور بت تراشی کی صنف میں یورپ سے کہیں زیادہ دلچسپ اور قدیم ہے۔ قدامت کے اعتبار سے اگر یونان کی صناعی کو ہم نظرانداز کر دیں تو یورپ میں کہیں کوئی ایسی مثال نہ ملے گی جو ہندوستان پر اپنی بزرگی کا سکّہ جما سکے، یونان بھی ایک حد تک مصر و ایران کا خوشہ چین رہا ہے، اگر ہندوستان میں آئے دن انقلابات نہ ہوتے تو آج ہمارا ملک مصوری ونقاشی کا پورا پورا عجائب خانہ ہوتا، پھر بھی بہت کچھ ہے کیونکہ جس قوم نے ہند کو اپنا ملک اور گھر بنایا کچھ نہ کچھ اپنی نشانی از قسمِ مصوری و دستکاری چھوڑ دی تاکہ حسنِ خاموش سے قومی تہذیب کی یادگار قائم رہے اور دیکھنے والی آنکھیں آثار الصنادید سے کمالِ رفتگاں کا اندازہ کر لیں ؎

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری ۔۔۔ خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

قوموں کے انقلاب نے ہندوستان میں اس فن کی صد ہا قسمیں چھوڑی ہیں۔ نمایاں طور پر ہم بدھ۔ ہندو مسلم اور موجودہ زمانے میں مغربی اثرات کی مثالوں کو زیادہ پاتے ہیں جو حسب مراتب اپنی اپنی خصوصیتوں میں کامل دیکھی گئیں ہیں۔

ابتدائی زمانے یعنی تخلیق تہذیب کے وقت جب انسان پیٹ کے دھندوں سے کسی قدر فراغت کا وقت بھی پا چکا ہوگا جب زمین و آسمان پر ظاہری ہی نہیں بلکہ باطنی نظریں بھی پڑتی ہونگی، جب وہ نقاشِ عالم "شوخیٔ تحریر" کے ہر "پیکرِ تصویر" پر متعجبانہ نظر ڈالتا ہوگا، المختصر جب ان مظاہر کو دیکھ کر اُسے اظہارِ خیالات کے ذریعے کی جستجو ہوئی ہوگی اُس وقت خواہ مخواہ طبیعت بھلی بُری شکلوں کو دیکھ کر ویسی ہی نقل کرنے پر مائل ہوئی ہوگی، چنانچہ واقعتہً ایسا ہی ہوا جس کی شہادت علینی مصر کے "خطوطِ نقشی" سے عیاں ہے۔ یہی خطوط یا شکلیں آج کل رسم خط کی ابتدا سمجھی جاتی ہیں اور اُن کا اثر چینی رسم الخط میں اب بھی نمایاں ہے۔ مصری "خطوطِ نقشی" گو مجموعۂ حروف یعنی الفاظ ہیں تاہم چونکہ وہ حروف اظہارِ اشکال پر مبنی ہیں اس لئے ایک قسم کی تصویر بھی کہے جاسکتے ہیں لفظ "آدمی" بجائے اتحاد الف۔ دال میم اور ی کے اس وقت محض سر و سینہ اور ہاتھ پاؤں رکھنے والی شکل سے ظاہر کیا جاتا تھا اور کھڑی بیٹھی اور لیٹی تصویریں حرکاتِ انسانی کے لئے اظہار کا ذریعہ سمجھی جاتی تھیں اور یہ شکلیں اس زمانے کی طرزِ تحریر تھیں۔ اس کی مطابقت آج کل کی مصوری سے اس طرح سمجھنا چاہئے کہ موجودہ مصوری خیالات و جذبات کو بھی ظاہر کردیتی ہے مگر اس وقت صرف ایک خاکہ ہی کافی تھا۔ رفتہ رفتہ ان شکلوں سے اصل کی نقل کا عنصر دور ہوتا گیا یہاں تک کہ ایران کے "خطوطِ مخروطی" ایجاد ہوئے اور رسم خط ایک علیحدہ فن ہوگیا۔ شاید پہلے ایک ہی رسم خط کا وجود ہو مگر اب تو کثرتِ تحریر تہذیب پر نمایاں اثر ڈال رہی ہے اور چونکہ ہندوستان کی موجودہ تہذیب میں نفاق بہت کچھ شامل ہے اس لئے رسمِ خط بھی اردو ہندی کی "تُو تُو مَیں مَیں" میں پڑا ہوا ہے۔ حتّٰی کہ خود یہ فن اس جھگڑے سے عاجز آگیا ؎

کس کی ملت میں گنوں آپ کو بتلا اے شیخ　　　تو کہے گبر مجھے گبر مسلماں مجھ کو

مصوری کے وجود کا بہانہ رسم الخط کے علاوہ ہم کو فسانہائے پاستاں سے بھی مل سکتا ہے۔ ہندی پاستان نامے میں بیان کیا جاتا ہے کہ برہما نے برہمن کے مردہ لڑکے کو زندہ کرنا چاہا لیکن یم[1] نے روح واپس دینا گوارا نہ کیا اس لئے برہما نے ایک تصویر بنا کر اُس میں جان ڈال دی۔ پس تصویر بننے کی ابتدا یوں ہوئی۔ اہلِ اسلام اور عیسائیوں کے یہاں

---

[1] یم۔ فضائے آسمانی کا خدا۔ سرخیٔ شام کا بادشاہ جہاں نیک لوگوں کی روحیں فضائے آسمانی کی سیر کرتی ہیں (آریہ لوگوں کا عقیدہ)

تو آدم کا پتلا بنایا ہی گیا تھا جس کی شہادت بائیبل اور قرآن شریف میں اظہر من الشمس ہے پس حضرت انسان نے بھی اللہ میاں اور برہما کی نقل کرنی شروع کی۔ اللہ میاں نے آدم کا پتلا بنا کر فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم کیا، شیطان نے انکار کیا، نکالا گیا، شاید جل بھن کر اُس نے حضرتِ انسان کو یہ تدبیر سجھائی کہ تم اللہ میاں کا پتلا بنا کر سجدہ کرو۔ ہمیں اس وقت شیطان کی مخالفت یا موافقت سے کچھ واسطہ نہیں مگر اور سنئے شاعر کو جب الہام ہوتا ہے تو عالمِ بالا کے راز بتا جاتا ہے۔ مصور کو بھی کچھ ایسا ہی وسیلہ خواب کے ذریعے سے ممکن ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ اوشا دیوی نے ایک حسین نوجوان کو خواب میں دیکھا اور اپنی سہیلی چتر لیکھا سے کہا کہ "میں چاہتی ہوں کہ اس کو پھر دیکھوں" چنانچہ چتر لیکھا نے کنہیا کے پوتے انردھ کی تصویر بنائی اور اسی زمانے سے مصوری کی ابتدا ہوئی۔ یا مشہور ہے کہ شاہجہان بادشاہ دہلی نے چوتھے آسمان پر دہلی کی جامع مسجد خواب میں دیکھی اور ایک فقیرِ کامل کے ذریعہ سے معمار نے یہ نقشہ بنایا جس کی تعمیر دار الصدر میں ہو گئی۔ شاید آگرے کا تاج محل بھی باغِ فردوس کے کسی محل کا نمونہ ہے چنانچہ شاہجہان کی اکثر عمارتوں کے دروازے پر لکھا ہے ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است | ہمین است و ہمین است و ہمین است

اور یہ واقعہ ہے۔ بدھ کے مجسمے روحانی جذبات ظاہر کرتے ہیں، ہندوؤں کی تصویریں کرشن جی کی محبت آمیز اور بھولی ادائیں دکھلاتی ہیں اور مغل لوگ آرائشِ دربار وغیرہ کا اظہار زیادہ پسند کرتے ہیں۔ پس اگر مسلمان جنت الفردوس کے نمونے پیش کریں تو کوئی تعجب نہیں۔ رہے روحانی جذبات وہ بھی مسلمانوں کی مصوری میں ظاہر کئے گئے ہیں بشرطیکہ روحانیت سے متعلق تصویریں دیکھی جائیں۔ یوں تو پستیٔ نفس کے خوف سے اسلام میں مصوری ناجائز رکھی گئی ہے مگر پھر بھی بدرجۂ کمال یہ چیزیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہم حضرت ابراہیم ادہمؒ کی تصویر کا ذکر مناسب سمجھتے ہیں۔ جس میں روحانیت اور نیچریت کے تمام مظاہر حتی الامکان دکھائے گئے ہیں۔ "حضرتِ موصوف مراقبہ میں، یا یوں کہئے کہ محویتِ الفت میں دریا کے کنارے ایک لکڑی کے سہارے علی الصباح بیٹھے ہوتے ہیں، آسمان پر کہیں کہیں ابر کے ٹکڑے ہیں اور ایک ٹکڑا آپ کے سر پر سایہ فگن ہے جس میں پریاں (یا حوریں سمجھئے مگر پر دکھلائے گئے ہیں) سر نکالے، بانسری اور شہنائی لئے ترانۂ روحانی آسمانی سازوں کی آواز پر گا رہی ہیں اور نورِ رحمت اس ابر سے چھن چھن کر آپ کے فرق کی طرف مائل بہ زمین ہے" مگر مسلمانوں نے زیادہ تر فردوس ہی کو ظاہر کیا ہے جو باغ، عمارت، بیل بوٹوں پر مبنی ہے یوں تو مغل بادشاہوں کے یہاں کمالِ مصوری کے نمونے روحانی معاشرتی

لـہ یہ تصویر امیر الدولہ پبلک لائبریری، قیصر باغ لکھنؤ میں موجود ہے۔

اور ہر قسم کے فطرتی جذبات ظاہر کرنے والے ملیں گے۔

کہا جاتا ہے کہ پہلے پہل مصوری ہندوستان میں چین سے آئی اور یہاں سے تقدیس کا رنگ لے کر پھر بدھ مذہب کے ذریعے سے چین اور تمام مشرق میں پھیل گئی۔ بعد ازاں بدھ مذہب کے زوال پر کرشن جی اور مرلی منوہر ایسے دیوتاؤں کے مجسمے بنائے جانے لگے اور رادھا کی سواری ہنس اور طاؤس وغیرہ پر ظاہر کی گئی اور یہ اس فن کی ترقی کا وہ دور ہے جب رامائن اور مہابھارت کی داستانیں پیکرِ تصویر اختیار کرنے لگیں جیسے آج کل متوسطین شعرا کے خیالات ادبِ اردو کے رسالوں میں آرٹ بلاکس کے ذریعے سے پیکرِ تصویر اختیار کر رہے ہیں۔ اُس وقت یہی اثرات یونان میں بھی مقابلتہً دیکھے جاسکتے ہیں۔ ہومر کے خیالات بتوں اور تصویروں میں عیاں کئے جاتے تھے۔ خدائے محبت[1] کی رتھ فاختاؤں کا جوڑا اپنے کندھوں پر رکھ کر کھینچتا تھا اور مغبچۂ[2] الفت کا تیر یا یوں کہئے کہ تیرِ نظر صاف دل کے پار ہو جایا کرتا تھا۔ مگر ٹھیک اسی وقت ہندوستان میں کنھیا جی نے اپنی بانسری سے وہ داستانِ محبت سنائی کہ رادھا تو رادھا جنگل کے جانور بھی محوِ الفت ہو گئے۔ اور جہاں تک اس بانسری کی آواز گئی اتنی فضا ایک بقعۂ نور بن گئی۔ ایسے ہی خیالات کی بنا پر قرونِ وسطیٰ کی تصویریں کھینچی گئیں اور آج کل بھی بعض ہندو ماہرین ان خیالات کو پیکرِ تصویر دیتے ہیں۔ شاعروں نے تو یہاں تک لکھنا شروع کیا کہ چندرماں دیوی آگرے کے تاج روضے پر آتی ہے اور رادھا کی روح دریائے جمن کے کنارے گوکل کے گنڈ پر رشی مہاتماؤں کی آنکھوں سے اشنان کرتی ہوئی دیکھی جاسکتی ہے۔ چنانچہ انشا ایسے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

یہ جو مہنت بیٹھے ہیں رادھا کے گنڈ پر	اوتار بن کے گرتے ہیں پریوں کے جھنڈ پر
شیو کے گلے سے پاربتی جی لپٹ گئیں	کیا ہی بہار آج ہے برہما کے رُنڈ پر
اے موسمِ خزاں لگے آئے کو تیرے آگ	بلبل اداس بیٹھی ہے اک سوکھے ڈُنڈ پر

چنانچہ ہندو مصوری میں دریاؤں کے گھاٹ، پہاڑوں کے دامنوں میں سادھوؤں کے ٹھکانے اور قدرت کی فضا میں مندروں کے مناظر وغیرہ بہت ہیں۔ اکثر کسی ویرانے میں مندر دکھایا گیا ہے جس کے پاس برگدوں کے درخت سادھوؤں کی طرح بڑی بڑی جٹائیں لٹکائے کھڑے ہیں، جڑ کے پاس مہادیو جی کے چکنے چکنے مجسمے رکھے ہیں اور کنواری دیویاں تھال ہتھیلی پر رکھ کر آرہی ہیں اور عقیدت کی مجسم تصویر بن کر کسی چھوٹے گنبدار

---

[1] خدائے محبت Bacchus. [2] کیوپڈ Cupid

مندریں پرشاد چڑھانے داخل ہو رہی ہیں۔ ہنود نے اپنے مذہبی احساس کے مطابق یہاں تک امتیاز ظاہر کیا ہے کہ شیوجی کے مندر اور مجسموں میں ایک مقدس خوف طاری رہتا ہے کیونکہ وہ خدائے فنا ہیں، وشنوجی کے یہاں رحم و مرحمت کے محبت آمیز اثرات نمایاں ہیں کیونکہ وہ خدائے حسن وعنایات ہیں، اور برہما کے یہاں بزرگی اور پُر تعظیم محبت دلوں پر طاری ہو جاتی ہے کیونکہ وہ خدائے تخلیق ہیں ؎

چاہے جس شکل سے تمثال صفت اس میں درآ　　عالم آئینہ کے مانند دریا ر ہے ایک

پس یہی اثرات قرونِ وسطیٰ کی مصوری سے بھی ظاہر ہیں۔

ہندوستان میں مصوری کی ترقی کا ابتدائی زمانہ مہاتما بدھ کا عہدِ زریں ہے جب کہ بدھ مذہب کے فیض سے تمام ملک پر امن و مرحمت کی ہوا چل رہی تھی اور ہر شخص کشت وخون سے عاجز آ کر نروان کی شکل میں محو تھا۔ اس زمانے میں بدھ کے مجسمے ایسے بنائے گئے جو اپنی ماہیت سے حصولِ نروان یا فنا فی المسرت ہونے کے طریقے بتلا رہے ہوں اور نیک کاموں کی نصیحت کر رہے ہوں۔ ان مجسموں کی شکل سے دنیا کی ناپائیداری اور عالمِ بالا کی رعب دار تقدیس ظاہر ہوتی ہے۔ یہ صنعت بدھ مذہب کی ترقی کے ساتھ تمام ایشیا میں پھیل گئی اور جب بدھ کو اوتار اور اس کے بعد خدا مان لیا گیا تو اُس کے مجسموں کو بھی ویسا ہی رنگ روپ دے دیا گیا اور بدھ کے سامنے لوگ ہاتھ جوڑے دعائیں مانگتے اور اپنی حاجتیں پیش کرتے ہوئے دکھائے گئے۔ ماہرینِ فن نے بدھ کے مجسموں میں روحانی کشش دوڑانے کی کوششیں کیں جس کا اثر تبت میں اب تک ہے اور کہا جاتا ہے کہ ایک بُت تراش نے بدھ کی شکل بنا کر تبت کے کسی راجہ کو پیش کی جس کی پُر تاثیر کشش نے اُس کو بدھ مذہب کا پیرو بنا دیا۔

یہی بات ایران[۱] کے نامی مصوّر مانی سے بھی وجود میں آئی تھی جس نے اپنی تصویروں کو دستِ قدرت کی کاریگری ثابت کر کے پیغمبری کا دعوے کر لیا تھا۔

ہندوستان میں بھکشو نقاشوں کو بہت جلد زوال ہونا شروع ہوا کیونکہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد ہندو مذہب میں بیداری شروع ہو گئی۔ بدھ کی صلح کل نصیحتیں شجاعانہ جذبات کو مردہ کئے دیتی تھیں، اس لئے راجپوت چھتریوں کے سورج بنسی اور چندر بنسی خون نے جوش مارا اور بدھ کی تصویروں اور مجسموں کی جگہ رامائن اور مہابھارت کے رزمیہ اور معاشرتی نمونے تصویروں میں دکھائے جانے لگے۔

۱؎ بعض مورخ "مانی" کو چین کا باشندہ لکھتے ہیں۔

مسلمانوں کے دورِ حکومت میں مغلوں کا زمانہ اور مغلوں میں خصوصاً اکبر و جہانگیر کا زمانہ مصوری کے لئے عہدِ زریں تھا۔ سلاطینِ تیموریہ خاص طور پر مصوری کے دلدادہ تھے۔ بڑے بڑے مشہور نقاش ان بادشاہوں کی سرکار میں ملازم تھے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں سلطان حسین والیٔ خراسان کے یہاں بہزاد ایسا مشہور مصور گزرا ہے جس کا ذکر بابر نے اپنے خود نوشت حالات میں بہت تعریف سے کیا ہے۔ یہ لوگ نظامی و فردوسی وغیرہ کے تخیل کو اپنے ہنر میں ایسی طرح نمایاں کرتے کہ اگر مغربی مصور Raphael بھی دیکھتا تو وجد کرتا۔ اُس وقت کی مصوری نے جس کا بیان آئینِ اکبری میں خاص طور پر کیا گیا ہے ہر رنگ کی تصویریں چھوڑی ہیں جو اب ہندوستان سے یورپ چلی گئیں اور جن کو اب ہم نگاہِ یاس سے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ ہندوستان میں جو تصویریں باقی ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانے کی مصوری نے علمِ مجلس، دربار، سیر و شکار، میدانِ کارزار، قلعہ گیری، قدرتی مناظر اور اظہارِ جذباتِ حسن و الفت، وغیرہ کے تمام اقسام پر ہنر آزمائی کی۔ آج کل جذباتِ حسن و الفت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور معاشرتی نمونے بھی تمام و کمال ظاہر کئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ "مرقع چغتائی" کے نمونوں سے ظاہر ہے۔ لیکن مغلوں کے وقت میں بھی اظہارِ حسن و محبت کی بہت کوشش کی گئی۔ چنانچہ ایک تصویر[1] میں ظاہر کیا گیا ہے کہ معشوق عاشق پر مائل بہ مرحمت ہے اور عاشق گلدستہ لئے وارفتگی کے عالم میں سامنے کھڑا ہے اور کچھ سوال و جواب ہو رہے ہیں۔ حاشیۂ تصویر پر سوال لکھا ہے ؎

بگو اے عاشقِ صادق چرا گلدستہ آوردی؟ دلِ بلبل شکستی غنچہ را دل بستہ آوردی؟

عاشق جواب دیتا ہے ؎

نہ بہرِ زیب و ستم جانِ من گلدستہ آوردم بہ خوبی لاف مے زد گل بہ پیشت بستہ آوردم

اور کمال یہ ہے کہ پھولوں کو کچھ خنداں اور کچھ پژمردہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اسی طرح کمالِ مصوری اور کمالِ شاعری کے نمونے ساتھ ساتھ دیکھے گئے ہیں اور حتی الامکان "حسنِ خاموش" کو بولتی تصویر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ آج کل ہندوستان کی نقاشی میں بعض لوگ اس بات کے کوشاں ہیں کہ مغربی اثرات کے ساتھ ساتھ قدیم راجپوت اور مغل خوبیوں کو بھی تصویر میں زندہ رکھیں۔

مصوری کے علاوہ دیگر فنونِ حرفت و دستکاری اپنی مقامی خصوصیتوں کے ساتھ مشہور ہیں۔ دکنی، پنجابی، مرادآبادی، جے پوری کام اپنی اپنی جگہ پر خصوصیت رکھتے ہیں۔ جن میں سے دلی اور لکھنؤ کی دستکاریاں زبانِ اردو

---

[1] یہ تصویر "حمیدیہ لائبریری" بھوپال میں دیکھی گئی۔

کی امتیازی خصوصیتوں کی طرح مشہورِ عام ہیں مصوری سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو ہندوستان نے عام دستکاری میں ایرانی اثرات کی وجہ سے بہت ترقی حاصل کی ۔مغل بیگمات کی جدت پسند طبیعتوں نے آرائش و زیب و زینت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ،چنانچہ نور جہاں ،ممتاز محل اور زیب النسا کی کوششوں نے صرف لباس و زیور ہی نہیں بلکہ عام دستکاری کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا ۔اور آج کل یورپ کی کمال پسندی اور فطرت طرازی نے اُس پر چار چاند لگا دیئے ۔

یہ ظاہر ہے کہ مشرقی مصوری "جزو" یعنی خط و خال کی طرف زیادہ مائل ہے اور مغربی مصوری "کل" بلکہ آس پاس کا خاکہ بھی ضروری سمجھتی ہے ۔مشرقی نقاش بھی اب کُل کی طرف مائل ہو گئے ہیں اور یہی ایک اچھا اثر ہے جو یورپ کے آرٹ سے ہم کو حاصل ہوا۔

المختصر قدیم مصوری و نقاشی بالکل روحانی تھی ۔قرونِ وسطیٰ میں رزم و بزم کی تصویریں دکھلائی گئیں ۔اور اب فطرت اور نیچریت غالب ہے ۔لیکن اردو رسالوں میں جو شعرائے متوسطین کے خیالات پر فنِ مصوری کی ہنر آزمائیاں کی جاتی ہیں اور اُن کے ساتھ عالمِ خیال کا ایک منظوم طلسم بھی باندھا جاتا ہے اگر حسن و سادگی اور مظاہرِ فطرت کے ساتھ کچھ روحانی جھلک بھی لئے ہوں تو صحیح معنیٰ میں فنِ مصوری کا نمونۂ کمال ہیں۔

جہاں تک کہ مذہب کا تعلق مصوری اور بت تراشی سے ہے ہم ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام عالم کو زمانۂ قدیم میں گمراہ پاتے ہیں ۔حضرت ابراہیم کی سبق آموز بت شکنی سے لے کر محمود غزنوی کی بت شکنی تک یہی رونا رہا مگر اسلام نے بہت کچھ مسیحائی کی جس سے بہرہ اندوز ہو کر کبیر داس اور گرونانک ایسے بزرگ خود بخود بت پرستی کے خلاف لیکچر دینے کھڑے ہو گئے اور اب یہ روحانی مرض قریب قریب مٹنے لگا ، گو پست درجے کے لوگوں میں ابھی باقی ہے۔

ان باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے لوگ اپنے خیال ہی کو نہیں بلکہ روح کے اُس مقدس احساس کو بھی پیکرِ تصویر میں لانے کے کوشاں تھے جو انہیں وجودِ معبود کا پتہ دے رہا تھا ۔تاکہ دقتِ مراقبہ اور سعیِ تصور کی تکلیف رفع ہو جائے اور یہ ایک غلطی تھی جس کو مسلمانوں نے رفع کرنے کے لئے بتوں اور تصویروں سے اختلاف ظاہر کیا۔ کیونکہ ؎

جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے
پردے پہ مصوّر ہی تنہا نظر آتا ہے

تاہم حسنِ خاموش سے ہم کو ارتقائے روحانیت کی بہت کچھ تاریخ مل جاتی ہے اور روحانیت ہی نہیں بلکہ امتیازِ حسن اور معاشرتی پہلو کا بھی بہت کچھ حال معلوم ہو جاتا ہے ۔ کوئی تعجب نہیں اگر قدیم مصوری ہمارے جذبات کو بیدار کر کے زبان سے تعریف کے کلمات کہلائے ۔ کوئی حیرت نہیں اگر شاعر[۵۱] "حسنِ خاموش" کی زندہ مثال دیکھ کر "حسن کو حق[۵۲] اور حق کو حسن" کہے ۔ گو اسی شرط پر کیوں نہ ہو کہ حسن جب ہی تک حسن ہے جب تک کہ رسوا نہ کیا گیا ہو ۔ یہ عجیب بات نہیں اگر کوئی سیاح[۵۳] شاعرانہ انہماک کے ساتھ روضۂ تاج کو دیکھ کر ساختۂ انسان نہیں بلکہ ساختۂ ملائک کہے کہ "روئے زمین کے سر کا تاج ہے" یا یہ کہ اُس جنت کا جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے زندہ خاکی نمونہ ہے ۔ اگر ہماری نگاہیں نگارِ فطرت کے حسن کو دیکھ کر حیران ہوتی اور دل کو محوِ کیفیت کر دیتی ہیں تو انسانی جدوجہد اور کوشش بھی کچھ نہ کچھ کر گزرتی ہے ، پس گزشتہ قوموں کی یادگاریں اپنے قیام تک اُن کا نام روشن رکھیں گی ع

جاگ رہی ہیں نکہتیں پھول ہیں خوابِ ناز میں

اگر ہم فنِ مصوری اور نقاشی کے ان مظاہر اور ان جیتی جاگتی تصویروں کو زندگی کے دھندوں میں پڑ کر یا کسی اور قسم کی غفلت سے فراموش کر دیں اور اُن کی قدر نہ کریں اور اُن کو حوادثِ آسمانی میں تباہ ہو جانے یا غیر قوموں کا ذخیرہ ہو جانے دیں تو ہماری کم نصیبی ہے ۔

جن چیزوں میں روحانیت ، صداقت ، عزت اور محبت کی کچھ بھی بو ہو وہ اگر پرستش کے لائق نہیں تو کم از کم پرورش کے لائق ضرور ہیں ورنہ ہاتھ سے گئی چیزوں کا افسوس تو ہمیشہ رہتا ہے ۔ وہ چیزیں پھر کہاں ؟[۵]

عاشق و معشوق بھی آخر فسانہ ہو گئے
جائے گریہ اب یہاں لیلیٰ کہاں مجنوں کہاں ؟

سیّد مقبول حسین

Keats: Beauty is truth, truth beauty. ۵۲   Keats on Grecian Urn ۵۱

۵۳ سر رابندرا ناتھ ٹیگور ۔

غزل

تبسّم نہیں ہے، گل افشانیاں ہیں
تکلّم نہیں ہے غزلخوانیاں ہیں

زہے آپ کے حُسن کا دورِ نصفت
جدھر دیکھتا ہوں ستم رانیاں ہیں

ترے گھر کی جانب نمازوں میں رُخ ہے
ترے در پہ سجدوں میں پیشانیاں ہیں

خوشا! اک تری نسبتِ غم کہ جس سے
خوشی پر خوشی کی فراوانیاں ہیں

مہ و مہر مشّاطہ بن کر چلے ہیں
نئی سے نئی جلوہ سامانیاں ہیں

کوئی پردہ داری کرے بھی تو کب تک
ترا درد ہے اور عُریانیاں ہیں

سزائیں تو ہر حال میں لازمی تھیں
خطائیں نہ کر کے پشیمانیاں ہیں

تقاضے کرم کے نہ شکوے ستم کے
ادا دانیاں سی ادا دانیاں ہیں

اگر کارِ الفت کو مشکل سمجھ لوں
تو کیا ترکِ الفت میں آسانیاں ہیں

اِدھر فکرِ دُنیا، اُدھر خوفِ عقبےٰ
پریشانیوں پر پریشانیاں ہیں

اگر اذن ہو ہر دو عالم سے کہہ دوں
تمہارے مقدّر میں ویرانیاں ہیں

اب آزاد ہے اور سکوتِ مسلسل
وہ لفّاظیاں ہیں نہ لسّانیاں ہیں

حکیم آزاد انصاری

شیطان اور بزرگ

بیٹھے بیٹھے انجیل کا ایک جملہ جو یاد آیا تو معًا یہ خیال گذرا کہ یا اگلے وقتوں کے لوگ بہت غصیلے تھے یا آج کل کے لوگ زیادہ شائستہ ہیں۔ وہ فقرہ یہ ہے "Get thee behind me, Satan." اس کا لفظی ترجمہ ہے "پیچھے ہٹ بے شیطان!" لاحول ولاقوۃ۔ یہ کہاں کی شائستگی ہے کہ ایک ہستی اپنا فرضِ منصبی ادا کرے اور اُسے جھڑک کر کہا جائے چل! ہم نہیں آتے۔ تیری ایسی کی تیسی"! اگر بفرضِ محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ نیک رہنے کے لئے ترش رو ہونا لابدی ہے پھر بھی ناگوار سا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی مقدس ترش روئی کے ساتھ اندازِ گفتگو بھی بازاری ہو۔ آج کل کی زندگی میں سینکڑوں دفعہ دیکھنے میں آیا ہے کہ شیطان کو سخت سے سخت جواب اگر کسی نے دیا تو بس اتنا ہی کہا "واللہ معاف کیجئے۔ آج ناچ میں شریک نہ ہوسکوں گا"! قصہ ختم ہوا۔ نہ یہ کہ بازاری زبان اور پھر ہزاروں سالوں تک اس کا چرچا! آخر وہی دنیا ہے وہی شیطان ہے مگر اخلاق وسیع تر ہیں، یہاں تک کہ آج کل کے محمد شاہ رنگیلوں کو عیش پرستی کا تواتر بھی بارِ خاطر ہے۔ یہ فرق کیوں ہے؟ اسی خیالی کشمکش میں تھا کہ حضرتِ ڈیش کی خوشبو آئی۔ نہیں اُن کے سگرٹ کی! ابھی کمرے سے باہر ہی تھے کہ فرماتے ہیں۔

ڈیش۔ اب کہیں چلوگے بھی یا یونہی اس کمرے کا ناک میں دم کروگے؟ تمہارا کمرہ تم سے اکتا چکا ہے۔ کمرے کا حق ہے کہ کبھی کبھی تازہ ہوا اسے بھی نصیب ہو۔

میں۔ ایک مشکل حل کردو تو جہاں کہو چلوں۔

ڈیش۔ اگر مشکل مشکل ہے تو تو بندہ حاضر ہے لیکن آسان مشکلوں کے لئے کسی قومی لیڈر کو چندہ عطا کیجئے۔

میں۔ واقعی خوفناک مشکل ہے (یہ کہہ کر اسے "ہٹ بے شیطان" والی وقت پیش کی۔ ڈیش صاحب نیا سگرٹ جلا کر فرماتے ہیں)

ڈیش۔ میں تم سے بیس دفعہ کہہ چکا ہوں کہ موجودہ زندگی کا پہلا سبق یہ ہے کہ زمانہ گذشتہ کی کسی بات کو بھی اس طرح سے بیان نہ کرو جس طرح کہ وہ ہوئی بلکہ اس طرح سے بیان کرو جس طرح سے کہ تمہارا اپنا نصب العین

پورا ہو۔ مرنے والے مر مرا چکے۔ نہ ہم سے پُوچھ کر وہ پیدا ہوئے نہ ہم سے پوچھ کر انھوں نے کھایا، پہنا، برتا
پوجا۔ اگر ان کا ہم پر کوئی حق ہے تو بس اس قدر کہ ہم یہ ثابت نہ کریں کہ وہ بہت گمراہ تھے۔

میں۔ تو گویا تاریخ کوئی چیز نہیں۔

ڈیش۔ بہت بڑی چیز ہے، بالخصوص اس لئے کہ اسے بدلتے رہنا ہمارے اپنے اختیار میں ہے۔ اخبار روزانہ کھلم کھلا حالاتِ حاضرہ کو بدلتے رہتے ہیں۔ ایک اخبار میں ایک وزیر دانشمندی کا پُتلا ہے تو دوسرے میں تعصب کا بھوت۔ آخر تاریخ اسی مصالح سے تیار ہوگی اور آج کل کے ٹکے سیر والے وزیر تو کیا ہمارے سامنے کئی نپولین، کئی کلائو، کئی اورنگ زیب موجود ہیں اور جیسی ضرورت ہوگی ابھی اور تیار ہو جائیں گے۔

میں۔ اچھا! آپ تاریخ کو رہنے دیجئے۔ اصل مطلب پر آئیے۔

ڈیش۔ یہی تو اصل مطلب تھا کہ جس طرح ہم تاریخی ہستیوں کی حسبِ ضرورت اصلاح کرتے رہتے ہیں اسی طرح ہمیں پیغمبروں کی اصلاح کا بیڑا بھی اٹھانا چاہیئے۔

میں۔ توبہ کرو توبہ! کیا کفر بکتے ہو!

ڈیش۔ کفر تم تو لتے ہو۔ تم اور تمہارے ہم خیال ہر دفعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہو کہ سب کے سب پیغمبر ناکامیاب ہوئے اور دنیا ویسی ہی بُری ہے جیسی کہ ان کے نازل ہونے سے پہلے بُری تھی۔ میرے دل میں چونکہ پیغمبروں کی سچی عظمت ہے میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ بے انتہا کامیاب ہوئے۔

میں۔ وہ کیسے۔

ڈیش۔ بالکل آسان ہے۔ فرض کرو کہ کسی پیغمبر نے حکم دیا کہ زیتون کا تیل حرام ہے۔ مگر خود اس کی امت کے کچھ لوگ وبغاد میں نعزہی میں ہلدی میں زیتون کے تیل کے خم لنڈھاتے رہے۔ تم لوگ تو یہ کہہ دوگے کہ اس امر کی تعمیل نہیں ہوئی۔ گویا پیغمبر کو اس خاص معاملے میں ناکامیابی ہوئی۔ میں یہ کہوں گا کہ ممانعت ہرگز نہ تھی۔ صرف یہ حکم تھا کہ جنہیں آسانی سے میسّر نہ ہو سکے وہ خواہ مخواہ زیتون کے تیل کی ہوس میں مقروض نہ ہوں۔ یہی صورت اس جملے کی ہے۔ میں اس جملے کا ترجمہ یوں کروں گا "جناب من۔ مجبوراً میں آپ کی طرف پیٹھ کر رہا ہوں۔ مجھے دوسری طرف جانا ہے"۔ قصہ ختم ہوا۔ فرض کرو کہ تم نے یہ نتیجہ نکالا ہوتا کہ اگلے وقتوں کے لوگ بہت صاف گو تھے اور آج کل منافقت کا زور ہے۔

میں۔ یہ نتیجہ تو ہرگز نہیں نکل سکتا تھا۔ اگلے وقتوں کے لوگ تو ذرا ذرا سے عقائد کے فرق پر دھمکیاں دیتے

تھے کہ جلوگے، بھنوگے، دنیا غرق ہوجائے گی۔ بات بات پر قیامت کے آثار دکھائی دیتے تھے۔

ڈیش۔ تم بہت اکھڑ ہو۔ یہ اُن لوگوں کا محاورہ تھا، رنگین بیانیاں تھیں۔ اور کچھ بھی ہو سوال یہ نہیں کہ وہ کیا تھے بلکہ یہ کہ ہم انہیں کس کام میں لاسکتے ہیں؟ کسی چیز کو برا کہنا اور پھر اُسے استعمال کرنا کہاں کی دانشمندی ہے؟ ہمارا فرضِ عین یہ ہے کہ اگلے وقتوں کے لوگوں کے عقاید تبدیل کرتے رہیں۔ تمام موجودہ تنقیدی تفسیروں کا مرکزی اصول ہی یہ ہے کہ زمانۂ سابق کے عقاید کی اصلاح کی جائے۔ نہ صرف عقاید کی بلکہ عادات کی۔

میں۔ خاک تم نے میری مشکل حل کی۔ ایک مشکل کو دس مزید گورکھ دھندوں میں لپیٹ دیا۔

ڈیش۔ بھائی تم فیشن ایبل انسان ہو۔ میں بچارا سیدھا سادھا قدامت پسند ہوں۔ مجھے واقعیٔ زمانۂ ماضی کی ہر وہ چیز پسند ہے جو میری رائے کے موافق ہے اور جو بظاہر میری رائے کے موافق نہیں اُسے میں عقل کے زور سے اپنی رائے کے موافق کرلیتا ہوں۔ آخر خدا نے عقل انسان کو اس لئے تو نہیں دی کہ اُس کا استعمال نہ کیا جائے۔ بندۂ خدا! لوگ معجزوں پر ہاتھ صاف کرچکے۔ ضروری غیر ضروری احادیث رائج کرچکے اور تم ابھی یہ ٹھوکریں کھارہے ہو کہ معمولی سے ترجمے میں تصرف جائز ہے کہ نہیں۔ اگر کچھ بھی تمہیں پاسِ وفا ہے تو اللہ کا نام لو اور ماضی کو بدنام نہ ہونے دو۔

(میری بیگم کمرے میں داخل ہوتی ہیں)

ڈیش۔ (کرسی اُن کی طرف کھسکاتے ہوئے) آداب۔ اجی بیگم صاحب کچھ ان حضرات کی تو اصلاح کیجیے۔ فیشن کے مارے بزرگوں سے علیک سلیک رکھنے کے روادار نہیں۔

میں۔ تم ڈیش کی بک بک پر نہ جاؤ۔ آپ فرماتے ہیں کہ بزرگوں کے عقائد کی اصلاح ہمارا فرضِ عین ہے۔

بیگم۔ سبحان اللہ۔ اپنے دھندوں سے تو فراغت نہیں بزرگوں کے پیچھے عقل کی لاٹھی لئے کون پھرے!

ڈیش۔ این خانہ تمام آفتاب است۔ بیگم صاحبہ یہ تو سوچئے کہ ہمارے بزرگ نہ ہوتے تو ہم کہاں ہوتے۔ اگر اور ان سے اچھا کام کوئی نہ بھی ہوا ہو تو یہ تو کارِ خیر وہ کرگئے کہ ہم سے جانشین چھوڑ گئے۔

بیگم۔ مگر اُن کے عقائد کی اصلاح کس طرح ممکن ہے؟

ڈیش۔ وہ خود تو میدان میں آکر لڑنے سے رہے۔ اب تو جو ہم کہیں سو وہ وہ ہیں۔ عصائے موسوی اور قبائے یوسفی سے آخر ہمیں کچھ کام لینا ہے یا نہیں؟ اگر لینا ہے تو اپنی طرح ان چیزوں کو بدل کر قدامت پسندی کا ثبوت دیں۔

بیگم - آپ دراصل ہر بات کی تضحیک کرتے رہتے ہیں اور مولوی بچارے سچ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں الحاد کا زور ہے -
خود تو ملحد ہوئے سو ہوئے اب بزرگوں کو بھی آزاد خیال کرنے چلے - یہ بے ایمانی کیا نیا مذہب ایجاد ہوا ہے ؟
ڈیش - عورتوں کی اس تنگ خیالی سے دق آ کر اسلام نے گذشتہ سات آٹھ سو سال میں کوئی عالم عورت پیدا نہیں ہونے دی - ہر نیا مذہب ابتدا میں ایک ناپسندیدہ بدعت ہوتا ہے - مگر ساتھ ہی ہر نیا مذہب یہی کہتا ہے کہ دنیا کو وہی سکھایا جا رہا ہے جو پہلے پیغمبر سکھلا گئے -
بیگم - میں تو بحث کے مخمصے سے کوسوں بھاگتی ہوں - یہ بتائیے کہ چائے ابھی منگواؤں یا تھوڑی دیر ٹھیر کر !
میں - جیسے تمہاری خوشی ڈارلنگ
ڈیش (تمسخر سے) ایمانداری کے دعوے اور ساتھ ہی ملحدوں کو چائے کی دعوت ؟
بیگم (قہقہہ لگا کر) یہی تو ہماری اخلاقی عظمت کا ثبوت ہے کہ سوشل تعلقات میں مذہبی اختلاف حارج نہیں ہوتے -
اللہ کے بندے آپ کو چائے پلائیں گے مگر اللہ آپ کو جہنم ہی بھیجے گا -
ڈیش - مجھے جہنم رسید کر کے آپ کو کیا خوشی ہوگی ؟
بیگم (ہنستے ہوئے) بے انتہا خوشی ! یہ خوشی کہ انصاف ہوا اور سچ پوچھو تو جنت میں رہنے کی اصل خوشی یہی ہے کہ جن لوگوں نے یہ نہ مانا وہ جہنم میں ہیں - تمام اصلی اور سچی خوشی کی بنیاد یہ ہے کہ کوئی اور اپنی غلطی کے باعث تکلیف میں ہو -
ڈیش - معاذ اللہ ، معاذ اللہ -

(بیگم چائے کے لئے حکم دینے جاتی ہے)

میں - کیا تم کبھی بھی متانت سے کسی مشکل مسئلہ پر گفتگو کر سکتے ہو ؟
ڈیش - میں تو ہمیشہ ہی متانت سے گفتگو کرتا ہوں - تم ہی بتاؤ کہ تمہیں کیوں تکلیف ہوتی ہے اگر کسی نے شیطان سے درشت کلامی کی ؟
میں - لاحول ولا قوۃ ! عجب احمق ہو ! شائستگی سے گفتگو کرنا ہر شریف آدمی کا ذاتی فرض ہے ، متکلم چاہے کوئی ہو - میرا اپنا خیال یہ ہے کہ شیطان جو مسلمانوں کا پیچھا نہیں چھوڑتا اس کی وجہ زیادہ تر غالباً یہ ہے کہ ہم اسے ہر وقت ستاتے رہتے ہیں - کبھی شیطان الرجیم کہتے ہیں ، کبھی اعوذ باللہ کہتے ہیں - آخر اس فضول دل آزاری سے حاصل کیا ہے ؟ اگر ہم اس کے ساتھ شریفانہ برتاؤ کریں تو ممکن ہے کہ وہ بھی ہمیں کم دکھ دے !

ڈیش ۔کیا مطلب؟

میں ۔یہ مطلب کہ اگر خوشامد خود خدا کو پسند ہے تو شیطان کو تو بہت ہی زیادہ پسند ہوگی۔کیوں ہم شیطان کی اس کمزوری کا فائدہ نہ اٹھائیں؟ جس مسلمان کو شیطان ملے وہ بجائے نعوذ باللہ کہنے کے خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ اسے موٹر میں سیر کرائے اور اگر موقع ملے تو کسی ہندو کانگرسی یا مہا سبھائی لیڈر سے شیطان کا تعارف کرائے۔شیطان کے لئے بھی ایک نئی دلچسپی ہوگی اور کانگرس کا بھی بھلا ہوگا۔ہم لوگ اپنی کج اخلاقی سے خواہ مخواہ شیطان کو اپنی طرف راغب کرتے ہیں۔

ڈیش ۔خیال تو بہت اچھا ہے مگر مہاتموں اور پنڈتوں میں شیطان بچارا کیا کرے گا؟

میں ۔کرے یا نہ کرے ہمارا تو کچھ چھٹکارا ہو۔

ڈیش ۔اچھا تو تم شیطان کو ہر دلعزیز بناؤ اور میں بزرگوں کے عقاید کی اصلاح کروں۔اس تقسیم کار سے شاید قوم کچھ ابھرے۔

فلک پیما

سحرِ نغمہ

شبِ سیاہ، خموشی، تلاطمِ انجم

فضا میں نالہ کناں ہے مغنّیہ کی صدا

عیاں ہے کیفیتِ کائنات تو لیکن

جو میرے دل پہ گزرتی ہے کہہ نہیں سکتا

اختر

بزم خرابات

(۱)

ساقی! افق سے جام بادہ گلگوں لئے بڑھا
ظلمت میں لئے ہوئے ہے دل کو شب سیاہ
میں اور تصورِ جنت کو توڑتا!
لاحول و لاقوۃ الا باللہ

(۲)

ہے اوج ہی اوج پیش پیش اے ساقی
باقی نہیں اب کوئی ہوس اے ساقی
یہ آگیا عرش، دورِ صہبا موقوف!
وہ جھک گیا آسمان، بس اے ساقی!!

(۳)

رندوں کو روا ہے کامرانی ساقی
ہے روزِ جزا فقط کہانی ساقی
محشر میں اگر ہوئی بھی باز پرس بالفرض
دے دے گی جواب نوجوانی ساقی

(۴)

جو رنج ہے نہ لطف ہے اوقات اے دل
یکتا ہے کوئی ہول بھی جو آفات اے دل؟
روتا ہے کہ وقت صبح رونا ہوگا
ناخوش کہ باقی ہے ابھی رات اے دل

جوش
ملیح آبادی

تاریکی

میں نے ایک خواب دیکھا، جو اصل میں خواب نہ تھا،

روشن سورج بجھ گیا تھا، دھندلے بے نور ستارے لامحدود خلا میں بھٹکتے پھرتے تھے، اندھی اور تاریک دنیا چاند کی کرنوں سے محروم ٹھنڈی ہوا میں گردش کر رہی تھی۔

صبح آئی اور چلی گئی، آئی اور اپنے ساتھ دن نہ لائی۔

انسان اپنی بربادی کے خوف میں ساری خواہشات بھول گئے تھے، تمام دل روشنی کے لئے خود غرضانہ دعاؤں میں مشغول تھے، لوگ آگ جلا جلا کر زندہ تھے۔ حکومت کرتے ہوئے بادشاہوں کے محلات، غریبوں کی جھونپڑیاں اور تمام ذی روحوں کے مسکن روشنی اور گرمی پہنچانے کے لئے جلاڈالے گئے تھے۔

شہر کے شہر جل رہے تھے اور انسان اپنے مشتعل گھروں کے چاروں طرف جمع تھے، کہ ایک دوسرے کی شکل دیکھ کر دل کو ڈھارس دیں۔

ایک خوفناک امید تھی جو ساری دنیا میں باقی رہ گئی تھی۔

جنگلوں کو آگ لگادی گئی تھی — لیکن لمحہ بہ لمحہ وہ جل جل کر گرتے جاتے تھے، اور اُن کی روشنی مدھم ہوتی جاتی تھی، چٹختے ہوئے درختوں کے تنے مہیب آواز سے پھٹ کر بجھ جاتے تھے، اور اندھیرا ہوجاتا تھا۔

آدمیوں کے چہرے اس ڈگمگاتی ہوئی روشنی میں ڈراؤنے معلوم ہوتے تھے — اُن میں سے کچھ لیٹ گئے، اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگے، اور بعض نے اپنی ٹھوڑیوں کو اپنی بند مٹھیوں پر رکھ لیا اور مسکرانے لگے، اور کچھ اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے تھے، کہ اپنی جلتی ہوئی چتاؤں میں لکڑیاں ڈالیں اور پھر مایوس ہوکر اندھیرے آسمان کی طرف جو گذری ہوئی دنیا کا سیاہ تابوت معلوم ہوتا تھا، مجنونانہ بے چینی سے دیکھتے تھے، اور لعنت بھیجتے ہوئے زمین پر گر کر کراہنے لگتے تھے۔

جنگلی پرندے چیختے تھے اور سہم کر اپنے بیکار بازوؤں کو پھڑپھڑاتے ہوئے زمین پر آگرتے تھے، خوفناک درندے مطیع ہوگئے تھے اور کانپتے ہوئے شہروں میں گھس آئے تھے، سانپ زمین پر رینگتے تھے اور لوگوں کو لپٹ لپٹ کر پھنکاریں مارتے تھے، مگر اُن کا زہر ختم ہوچکا تھا — اُن کو کھانے کے لئے مار لیا جاتا تھا۔

جنگ جو کچھ عرصے کے لئے بالکل ختم ہوگئی تھی پھر اپنا اثر دکھانے لگی۔

ایک ایک نوالہ خون سے خریدا جاتا تھا، اور ایک دوسرے سے دور دور اندھیرے میں بیٹھ کر زہر مار کر لیا جاتا تھا۔

محبت باقی نہ رہی تھی۔

دنیا کو صرف ایک خیال تھا اور وہ فوری اور گمنام موت کا خیال تھا۔

قحط نے اپنا اثر تمام اعضا پر ڈالنا شروع کر دیا تھا، آدمی مرتے تھے اور اُن کی ہڈیوں کو مثل اُن کے گوشت کے کوئی مزار نصیب نہ ہوتا تھا، ایک کمزور آدمی دوسرے کمزور آدمی کو کھا لیتا تھا، حتیٰ کہ کتے بھی اپنے مالکوں پر حملہ کر کے انہیں کھا گئے، سوائے ایک کے کہ جو اپنے آقا سے اُس کے مرنے کے بعد بھی وفادار رہا، پرندوں، درندوں اور بھوکے آدمیوں سے اُس نے اپنے آقا کی لاش کو بچایا، یہاں تک کہ بھوک نے اُن میں سے بہت سوں کو آلیا اور باقی کے اُن مرے ہوؤں کو چٹ کر گئے۔ خود اپنے لئے اُس نے کوئی غذا تلاش نہ کی، بلکہ اپنے مالک کا ہاتھ چاٹتے ہوئے جس سے کہ اُسے تھپکی کی کوئی اُمید نہ تھی، وہ ایک دردانگیز سسکی بھرتا ہوا مر گیا +

مجمع آہستہ آہستہ ختم ہوتا گیا۔

ایک بڑے شہر میں سے صرف دو زندہ رہے، اور وہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن تھے، وہ دونوں ایک بڑے مندر میں قربان گاہ کے بجھتے ہوئے انگاروں کے قریب ملے جہاں بہت سی متبرک اشیاء ناپاک استعمال کے لئے ڈھیر کر دی گئی تھیں، انہوں نے اپنے ٹھنڈے اور سوکھے ہوئے ہاتھوں سے بھوبل کو کریدا اور چند مدھم انگاروں کو اپنے کمزور سانس سے ایک موہوم زندگی کی امید میں پھونکا، ایک چھوٹا سا تمسخر آمیز شعلہ بلند ہوا، شعلے کی بڑھتی ہوئی روشنی میں اُن دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور چیخ ماری، اور چیخ مار کر مر گئے، وہ صرف ڈر کر مر گئے، اور کسی نے کسی کو نہ پہچانا، کیونکہ اُن میں سے ہر ایک کے چہرے کو بھوک نے شیطان کی طرح بھیانک کر دیا تھا۔

دنیا خالی ہو گئی تھی — کبھی آباد و پُرشوکت، اب ایک بیکار ڈھیر، بے موسم، بے برگ، بے انسان، بے زندگی، موت کا ڈھیر۔ مٹی کا بے ترتیب مجموعہ دریا، جھیلیں، سمندر سب ساکن تھے، اُن کی خاموش گہرائیوں میں کوئی حرکت نہ ہوتی تھی۔

جہاز بے ملاحوں کے سمندروں میں سڑ رہے تھے اور اُن کے مستول ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے، اور جونہی کہ وہ پانی پر گرتے تھے، خاموشی سے تیرنے لگتے تھے، کوئی لہر نہ اٹھتی تھی — لہریں مر گئی تھیں، مدوجزر اپنی اپنی قبروں میں پہنچ چکے تھے، آندھیاں بدبودار ہوا میں تحلیل ہو گئی تھیں، اور بادل ضائع ہو گئے تھے۔

تاریکی کو ان کی ضرورت نہ تھی — وہ خود تمام جہان تھی +

(لارڈ بائرن)　　　　محسن عبداللہ

نفاست کا طلسم

بعض دولت مند ہندوستانی کوٹھیوں کے گول کمرے میں فرش فروش، میز اور کرسی، پردے اور قالینیں، آتشدان
کے نمائشی نوادرات اور دیواروں پر رکھے پھیکے فوٹو کمپنیوں کے نو تعلیمیافتہ (یا نا تعلیمیافتہ) مذاق کا زندہ ثبوت ہیں، قالین اگر
آگ بھبھوکا ہے تو پردے جوگی اور میز پوش خاکی۔ کرسیوں کے غلافوں کی آب و تاب اگر ایک بھی ہو تو بھی ہر کرسی کا دم خم
الگ ہے۔ ایک پر بیٹھو تو تحت الثریٰ تک پہنچائے بغیر نہیں چھوڑتی، اور جو دوسری پر سستانا چاہو تو گویا کمر میں کسی نے
آہنی سلاخ ٹھونک دی۔ جس قدر یہ کمرے آنکھ کے لئے گستاخ اور کمر کے لئے ناہموار ہیں اسی قدر ان کی روحانی آب و ہوا
کثیف ہے۔ بھلا جہاں قالین چیخ چیخ کر پردے سے کہہ رہی ہو "بھیّا! خدارا اپنے پاؤں تو ذرا ہٹاؤ" اور جہاں زرق برق میز
پوش دیوار کی تصویروں پر ناک بھوں چڑھا رہے ہوں وہاں ملنے کا کیا لطف، اور اگر مل بھی بیٹھیں تو ناممکن ہے کہ فرنیچر کے اس
شور دبکا میں نیچی نظروں کا، میٹھی باتوں کا جادو چلے اور رنگ لائے۔

انسان بالکل پھول ہیں۔ جسطرح لو پھولوں کو جھلس دیتی ہے اسی طرح گرم فرنیچر خیال کو، خیال کی عروسیت کو سوخت کر
دیتا ہے۔ ہزار رعنائی تصور سے انسان ایسے کمرے میں داخل ہو، فصاحت کے ہزار درِ شاہوار نثارِ خندۂ سیم تناں ہونے کے
لئے طیار ہوں مگر جہاں ایسے کمرے میں ذرا بیٹھے تو باتیں یہ ہوتی ہیں کہ کلب میں آجکل جوتے میں دال بٹ رہی ہے، کانگرس کا چرخا
نہیں چلتا، سرکار کا حقہ پانی بند ہے اور علیٰ ہذا القیاس۔ یعنی جو باتیں برآمدے کے کسی ذلیل کونے میں ہونی چاہئیں وہ فرنیچر
کے تشدد سے گول کمرے میں اُگلی جاتی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ایسے گول کمرے ہیں بھی اسی قابل۔

جن لوگوں کو اس تنقید پر شک ہو، وہ ایک سیدھے سادھے معیار سے اپنے گول کمرے کی لیاقت کو پرکھ لیں۔ کسی ماہر
راگ شیریں ادا سے دو بول سن لیں۔ اگر کمرے کا رنگ، پردے اور باقی لباس موزوں نہیں تو راگ دیواروں سے سر پٹخ پٹخ کر
جان دیدیگا۔ لیکن اگر کمرہ کسی مستعلیق ہستی کی توجہ کا ممنون ہوا ہے تو راگ پھیلے گا، چیزوں سے لپٹے گا، دلوں میں کھنچے گا،
آنکھیں بند ہونگی، سارے جسم میں خفیف سا رقص ہوگا اور راگ روح کو لے اُڑے گا۔

راقم حروف کو کسی کمرے کی توہین مقصود نہیں اور یہ تنقید محض تعلیمی ہے۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ امیر ہندوستانی
کوٹھیوں میں اگر بچوں کی تعلیم کی طرف توجہ ہے تو اب یہ بھی لازمی ہے کہ کمروں کی تعلیم کی بھی ابتدا ہو۔ بعض کوٹھیوں میں

اس وقت بھی گول کمرے نمایاں طور پر دلفریب ہیں۔اس ضمن میں بیگم ب، ت کا گول کمرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔داخل ہوتے ہی معلوم ہوتا ہے کہ کمرے میں انسانیت ہے۔اگلے دن چند منٹ مجھے تنہا اس کمرے سے ملاقات کا موقع ملا۔نہ تو کمرہ مجھ پر جھنجھلایا نہ "اِدھر دیکھو، اُدھر دیکھو" کہہ کر اُس نے میرے کان کھائے۔نہ کہیں رنگ ایک دوسرے کو پھاڑے ڈالتے تھے نہ تصویروں سے دیواریں جھکی پڑتی تھیں۔بعض اچھے گول کمروں کا سامان بھی بسا اوقات اس قسم کا ہوتا ہے جیسے غزل میں شعر یعنی ایک دوسرے سے آزاد، مگر بیگم ب، ت کے کمرے کے سامانِ آرائش میں غرورِ حسن سے بھی بڑھ کر خلوصِ یگانگت کی جھلک تھی، یعنی یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی مزاج شناس نے ہر مختلف چیز کو زندہ اور با مذاق سمجھ کر اس کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اس کے لئے ٹھیک جگہ اور مناسب ہمنشیں تجویز کئے ہیں اور اس مزاج شناسی کی داد میں کمرے کی ہر چیز خوش و خرم تھی +

جب میں داخل ہوا تو پہلی ہی کرسی نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ساتھ والی میز نے رسیلی آواز سے کہا "اس فوٹو کو تو ملاحظہ کیجئے!" فوٹو نے انداز سے کہا "میرے بناوٹ پرستند کا کل میری .Chin[1] کے لئے کس قدر دلفریب (پس منظر) ہیں"۔ Background بندے نے پنجاب میں بیٹھے بیٹھے اس بہاری ادا کے عکس کی داد دی اور دل ہی دل میں کہا "کمرہ کیا ہے کسی کی طبعی نفاست کا طلسم ہے +

پرستارِ حسن

[1] نوٹ - Chin کا اُردو ترجمہ ایسے کمرے کے ذکر میں استعمال کرنا گناہ ہے۔یہ سخت گنوار لفظ ہے، اس کمرے کی نفاست کا یہی کافی ثبوت ہے، کہ سینکڑوں میل اس سے دُور بیٹھے بھی اس کے خیال کے ساتھ زنخدان اور ذقن جیسے لفظ بھی ثقیل معلوم ہوتے ہیں +

پروانہ

سلمائے سحر کے حُسن کی ضَو تاریک فضا پر چھانے لگی
وہ انجمِ رقصاں ڈوب چلے، وہ شمع کی لَو تھرّانے لگی

جو مُطرب وَ مے سے رنگیں تھی وہ محفلِ عشرت ختم ہوئی
خوابیدہ فضا نے کروٹ لی کیفیتِ غفلت ختم ہوئی

کچھ خاک کے ذرّے، کچھ پر ہیں بے برگ و نوا پروانوں کے
یا، دیکھ کہیں انجام نہ ہوں یہ شب کے حسیں عنوانوں کے

وہ آخرِ شب وہ دھندلا سا تجلّی بار سماں بھی ختم ہوا
وہ شمع بجھی اُٹھا وہ دھواں، لو اب وہ دھواں بھی ختم ہوا

پروانہ کی ہستی میں کیا کیا عبرت کے خزانے ملتے ہیں
ہر دَور میں اس کے کتنے لامحدود زمانے ملتے ہیں

اعجازِ وفا ہے صبر و سکوں سے، تلخئ پیہم سہہ جانا
یوں آتشِ دل کے شعلوں میں خاموش سلگ کر رہ جانا

شبِ تیرہ دروں تھی شمع کی ضو نے محفلِ شب نورانی کی
پروانہ کو دیکھو، جس نے محبت ہی کے لئے قربانی کی

احسان کی لذت شمع کے جل بجھنے کی ہوس کا عنواں تھی
پروانہ کے دل میں لیکن صرف الفت کی تجلّی رخشاں تھی

تعمیرِ حیاتِ شمع ہے مضمر شمع کے پیہم جلنے میں
پروانہ مگر مجبور نہیں اِس راہِ وفا پر چلنے میں

اس طرح کوئی آزادِ غرض، جاں اپنی کسی پر کھو نہ سکا
وہ کام ہوا پروانہ سے خود شمع سے بھی جو ہو نہ سکا

اختر

"بھلا کیوں وہ لوگ جنہیں میں چاہتی ہوں یہاں نہ آئیں۔ آخر کوئی سبب بھی؟"

"بہت خوب تو پھر آپ مختار ہیں"

"میں بھی یہی چاہتی ہوں" یہ کہتے ہوئے عطیہ دریچہ کی طرف گئی اور غصہ میں وہاں کھڑی ہو کر دریچہ سے باہر کی طرف یونہی دیکھتی رہی۔ اگرچہ دراصل وہ کسی چیز کو دیکھ نہیں رہی تھی"

"کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتی ہو کہ یہ لوگ میرے کس کام کے ہیں"

"میری سمجھ سے بیزار کہ کون ہمارے کس کام کا ہے" عطیہ نے جھلا کر کہا۔

جمال نے تیزی سے کمرے کے فاصلہ کو طے کیا اور بڑھ کر کسی حد تک کرختگی سے اپنا ہاتھ اپنی بیوی کے نازک کندھے پر رکھا اور کہا "مگر میں چاہتا ہوں کہ تم سمجھو کہ میں ان بے فکرے مردوں اور عورتوں کو ہر شام اپنے گھر میں بھرے ہوئے دیکھنا پسند نہیں کرتا"

"آپ ایسے ہی مہمان نواز تو ہیں" عطیہ نے طعن سے کہا "اور تم تو ہمیشہ ان ہی لغو قانونی کاغذات یا مختلف اخبارات میں دفن ہوئے رہتے ہو۔ اور میں تمہارے گھٹنے سے لگی بیٹھی رہا کروں، اور تمہاری جرابیں سیتی رہا کروں، کیوں ہے نا یہی بات؟"

عطیہ! میں تو یہ کوشش کر رہا ہوں کہ قانونی دنیا میں نام پیدا کروں۔ اور پھر تمہارے لئے روپیہ کی ریل پیل کر دوں"

"ہاں؟ تو یہ سب میرے ہی لئے ہے؟ جی بجا کیوں نہیں"!

بیوی کے الفاظ سُن کر جمال اس سے پرے ہٹ کر دور چلا گیا اور بولا "عورتیں بڑی ہی کوتاہ عقل ہوتی ہیں"

"میں عورتوں کے بارے میں تمہاری اس رائے کے خلاف احتجاج کرتی ہوں" عطیہ نے بیٹھتے ہوئے سرد مہری سے کہا۔

"اور ہاں کیا یہ بھی ضروری ہے کہ ہم بچوں کے سامنے یوں لڑا کریں؟"

"استغفر اللہ، قطعاً ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ میں بالکل تم سے متفق ہوں" وہ جھکا اور اُس نے اپنے بیٹے

کے بل کھائے ہوتے بالوں کو چھوا اور بولا "لو بچّو اب اپنے اپنے بستروں پر جاکر سو رہو۔ دارا تم اور صفیہ تم بھی اپنا انجن لے لو۔"

"دیکھو جی یہ سگنل تو میرا ہے۔"

"جھوٹ جھوٹ یہ میرا تو ہے۔"

"اری بس کی گانٹھ کل تو تُو نے اپنا سگنل توڑ ڈالا تھا" یہ کہنے کے ساتھ دارا نے غصّہ سے اپنا سگنل چھین لیا۔ بس پھر کیا تھا صفیہ لگی چیخنے چلّانے اور سسکیاں بھرنے۔

"صفیہ! دارا! مت لڑو" عطیّہ نے یہ کہا اور اُٹھ کر اپنی ننھی سی بیٹی صفیہ کو گود میں اٹھا لیا۔ پھر بولی "ادھر آؤ میرے بچو! کل تمہاری انّا تلاش کر کے سگنل مرمت کر دے گی۔"

قبل اس کے کہ ماں بیٹی دوسری طرف جائیں۔ دارا نے اپنا کھلونا لے لیا اور اپنے باپ کی طرف متوجہ ہو کر بولا "ابّا جان بھلا کیا یہ صفیہ ضدّن بس کی گانٹھ ہے کہ نہیں۔ دیکھئے اپنا انجن اور سگنل تو کل توڑ پھوڑ ڈالا اور اب میرے کھلونے پر قبضہ جما بیٹھی۔ ڈھٹائی تو اس کی دیکھئے۔"

جب تنہائی ہوئی اور جمال اپنے بیٹے کو گود میں لینے کے لئے جھکا تو اُس کا چہرہ کسی قدر مکدّر تھا۔ اور اُس نے بیٹے سے کہا "ارے میاں وہ غریب چھوٹی سی لڑکی ہی تو ہے۔ اس لئے تمہیں کو صبر و تحمّل کی عادت ڈالنی چاہیئے۔"

"ابّا جان! وہ لڑکی ہے اسی لئے تو ضدّی ہے۔ کیوں ہے نا؟"

اُس وقت اُس کی ماں کمرے میں واپس آگئی۔ اس کا باپ بولا۔ وہ ضدی نہیں ہے، دارا وہ ضرور تمہاری چیز تم کو دے دیتی، اگر تم ہی ذرا نرمی کا برتاؤ اس سے کرتے۔"

لڑکے نے برہمی سے تیوری چڑھائی اور بولا "لیکن میری بجائے وہی کیوں نرمی نہ برتے" اس سوال پر اُس کا باپ یوں ہی سا مسکرا دیا۔

"ارے بوڑھے بزرگوار دارا یہ ہم مردوں ہی کا حصہ ہے کہ نرمی برتا کریں۔"

"لیکن کیوں"؟ معصوم بیٹے نے اپنی مضبوط ٹانگیں پھیلاتے ہوئے جرات سے اپنے باپ کو دیکھتے ہوئے بتکرار کہا۔

باپ بولا "بیٹے! نرمی اور مہربانی اچھی چیز ہے اور جب تم بڑے ہو گے تب تم کو یہ بات معلوم ہو جائے گی۔ لو اب جاؤ اور اگر ہو سکے تو کل اپنی بہن کا انجن مرمت کر دو۔"

دارا لڑکیوں کے متعلق کچھ بڑبڑاتا اور لڑکیوں کی ضد اور الجھنوں اور سگنلوں کی باتیں آپ ہی آپ کرتا ہؤا ماں کی طرف بڑھا تاکہ وہ اُسے پیار دے۔اور گو وہ ناراض سی تھی تاہم اُس نے اُسے پیار کیا۔دارا ماں سے پیار لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور ہر ہر قدم پر مخالفت اس کی حالت سے ظاہر تھی۔

بچے کا جانا تھا کہ عطیہ غضبناک ہو کر خاوند پر برس پڑی۔اور بولی یہ کیا غضب ہے کہ تم ہمیشہ عورت ذات پر ناک بھوں چڑھاتے رہتے ہو؟ اور یہی تم ابھی سے اپنے بچے کو سکھا رہے ہو کہ وہ بھی تمہاری طرح عورت سے نفرت کرنے لگے اور تم ہمیشہ بچے کو دکھاتے ہو اور سمجھاتے ہو کہ نامراد عورتیں ہی بیہودہ اور الٹی سمجھ کی ہوتی ہیں۔اس وقت بھی تم نے یہی ثابت کیا ہے کہ نصیبوں جلی صفیہ ہی ضدی اور ذلیل ہے۔

"بجا! تو کیا اس میں کچھ جھوٹ بھی ہے؟"

"مجھے تو پتہ نہیں کہ تم نے کبھی اس بات کے جاننے کی بھی کوشش کی ہو کہ سگنل درحقیقت ہے کس کا؟"

جمال یہ سن کر کسی قدر تلخ ہنسی ہنسا۔اور بولا "میری پیاری عطیہ کیا یہ بھی کوئی سمجھ کی بات ہے کہ بچوں کے سامنے یوں لڑا جائے؟"

"میں نے تو کوئی لڑائی نہیں کی ہاں تم ہی ہو جو لڑائی مول لیتے ہو۔اور یہ تمہارا قاعدہ ہے کہ تم خطا ہمیشہ مجھ کم نصیب کی بتایا کرتے ہو۔میرے ملنے والوں سے تمہیں نفرت ہے اور یہ بات بھی تمہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی کہ میں کبھی ہنس بول ہی لیا کروں۔سچی بات تو یہ ہے کہ اگر بچوں کا خیال نہ ہو تو میں ——— میں تو تم کو بالکل چھوڑ چھاڑ کر کہیں کو نکل گئی ہوتی۔"

"اور یہاں سے جا کر اپنی ماں کے پاس رہتیں کیا یہی بات ہے نا؟" جب اُس کے خاوند نے یہ فقرہ کہا تو کہہ کر مزاحاً ہنسا بھی "عطیہ! بھلا تم اپنے آپ کو کچھ کم سمجھتی ہو۔ماشاءاللہ تم ایک آتش فشاں پہاڑ ہو۔میری تو خیر جب تم اپنی ماں کے ساتھ رہا کرتی تھیں تو اُس سے تمہاری کیا بنتی تھی؟"

"بس جی بس! میرا تو آپ سے جی جلا ہؤا ہے" عطیہ نے چلا کر کہا اور تمہارے آئے دن کے طعنوں سے میرا سینہ چھلنی ہو چکا ہے اور تمہارے عورتوں کے متعلق پرانے فرسودہ اور احمقانہ خیالات سے مجھے دلی نفرت ہے میں تو اب یہ چاہتی ہوں کہ یہاں سے کہیں چلی جاؤں اور اپنے ٹکڑے کی آپ فکر کروں۔آخر رزاق تو خدا ہے میں تو کب کی سب کچھ کر گزرتی اگر بچوں کا پاس نہ ہوتا اور میں ——— میں تو آج ہی چلی جاؤں گی ——— بس میں تو اب جا کر سوتی ہوں"

یہ کہتے ہی وہ گویا کود کر کمرے سے باہر نکل گئی اور اپنے پیچھے زور سے کواڑ بند کر گئی۔

جمال کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے قانونی کاغذات اٹھا کر قریب ہی بچھی ہوئی آرام کرسی پر دراز ہوگیا۔ امید اور مسرت کی کیسی تباہی اور بربادی ہے! وہ اور عطیہ جو پوری والہیت سے ایک دوسرے کے پجاری تھے اب ان کا کیا حال ہے! عطیہ جس میں وہ تمام نسوانی محاسن بحدِ انتہا موجود تھے جو وہ کسی عورت میں خیال کر سکتا تھا کیسی سمجھدار اور خوش دل ہشاش بشاش اور ہمیشہ اور ہر حال میں اُس کی ہمدرد اور اس کے اشاروں کو سمجھنے والی تھی۔ اسے اب کیا ہوگیا۔ ابتداءً اُن کے باہم مل کر زندگی بسر کرنے کے کیسے کیسے دلربا ارادے تھے، جو اب خاک میں مل چکے ہیں۔ جمال کو آرام کرسی پر لیٹے لیٹے اپنی شادی کے ابتدائی ایامِ مسرت جو کشمیر میں بسر ہوئے تھے یاد آگئے۔ گلمرگ کی طویل، خاموش، پُرکیف چاندراتوں اور مسرت و سرشاری کے مختصر دنوں کا نقشہ اُس کی آنکھوں کے آگے پھر گیا۔ اُس زمانہ میں کام کاکسے ہوش تھا۔ دنیا رہے یا جائے اک پیار کرنے والی عورت سب کا نعم البدل ہے۔ پھر اسے وہ زمانہ بھی یاد آگیا کہ اس جنتِ ارضی کی سیر سے وہ کس بے دلی کے ساتھ بمبئی میں اپنے کام پر واپس آیا تھا اور یہاں آکر انہوں نے اپنے لیے ایک مکان کرایہ پر لیا۔ بیوی کی سلیقہ شعاری اور سلیم مذاق کے باعث ہر ایک بات دونوں کی طبیعت اور میلان کے مطابق انجام پاتی تھی۔ اس کے بعد اُسے اپنی بیوی کی تکلیف کی وہ گھڑیاں بھی یاد آئیں جب وہ اپنے پہلوٹے بیٹے اور بیٹی کی پیدائش پر موت کے پنجے سے بمشکل بچی تھی۔ اور پھر اس کی بتدریج آہستہ آہستہ شفایابی، اور خود اس کا اپنی بیوی کی نہایت دلسوزی سے تیمارداری کرنا اور محبت وغیرہ غرض گذری ہوئی ایک ایک بات اُس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ اس کے بعد دفعتہً اُس کی بیوی کے مزاج میں ایک انقلاب پیدا ہوا۔ وہ ہر روز زیادہ سے زیادہ روپیہ اپنے مصارف کے لئے مانگنے اور نئے نئے طریقے اپنے دل بہلاؤ کے لئے ایجاد کرنے لگی۔ اور اس طرح آئے دن روپے کے سوال نے میاں بیوی کے باہمی تعلقات میں ایک ناگوار تغیر پیدا کر دیا۔

عطیہ نے ایک گراموفون خریدا۔ اور جمال کو اس سے چڑ تھی۔ اُس نے نہ صرف معمولی طور پر اپنی سہیلیوں کے ساتھ نغمہ و سرود کی مجالس منعقد کرنی شروع کیں، بلکہ کھانے کے بعد روزانہ چند نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو بھی بلانا شروع کر دیا۔ جمال کو مجال نہ تھی کہ وہ ان کدکڑوں کی شکایت کر سکے۔ وہ اسی طرح اپنے آپ کو اپنے دل بہلاؤ میں مختار سمجھتی تھی جیسا کہ اُس کے نزدیک جمال اپنے مذاق کی باتوں میں مختار تھا۔ یہ باتیں ہوتی رہیں۔ مگر اُس کے ساتھ اب شاید نادانستگی میں آزادی کی ایک نئی ہوا بھی بیوی صاحبہ کے دماغ میں بھر گئی کہ بعض اوقات کسی قدر سختی اور زندگی کے

ساتھ وہ اپنے خاوند کی معمولی سے معمولی بات کو بڑھا چڑھا کر رائی سے پہاڑ بنا دیا کرتی تھی "یہ روپیہ میرا ہے" یہ تو اُس کی روز کی بولی تھی۔ باہر کے لوگ جب اُس کے گھر پر آتے تو وہ شوہر کے لئے معمولی رقعہ لکھ کر یا پیغام دے کر جہاں جی چاہتا چلی جاتی۔

اب تو یہ حال تھا کہ جمال کو اپنی بیوی کی زندگی میں کوئی حیات بخش عنصر دکھائی نہ دیتا تھا حتیٰ کہ یہ بچے بھی میاں بیوی میں باہمی سرپھٹول کا ایک خطرناک ذریعہ بن گئے تھے۔ اس لئے وہ کیا کر سکتا تھا؟ عطیہ اس کے پیشہ سے بھی ناراض تھی اور وہ چاہتی تھی کہ اُس کا خاوند کام وام تو سب ترک کر کے رکھ دے اور اُس کے کھیل کود میں شامل ہو جائے۔ اور اس کے باوجود روپیہ دینے میں کمی نہ ہونے پائے۔ لیکن جمال کا اصولی طور پر یہ پختہ اعتقاد تھا کہ ہر ایک شریف آدمی کا گھر اُس کی ذاتی سلطنت ہے۔ اگر اُس کے گھر پر اِدھر اُدھر کے "بنتے ہوئے" شرفا کی چڑھائی ہو تو کم از کم اس کی اجازت سے ہونی چاہئے۔

اسراف نے عطیہ کو بدل دیا۔ اُس کے لئے زندگی کے بعض عجیب مگر نئے دروازے کھل گئے۔ وہ خود توان میں بذوق و شوق داخل ہوگئی، لیکن اپنے خاوند کو تنہا، حیرت زدہ اور بے چین کھڑا چھوڑ گئی۔ یہ سب باتیں تو تھیں مگر جمال کو یقین تھا کہ یہ سب باتیں ٹھیک ہو جائیں گی اور یقیناً ہو جائیں گی، مگر اُس وقت جب اس کو مقدمات میں بڑی بڑی فیسیں ملنے لگیں گی۔ جمال کو اپنی ذات پر غیر محدود اور بجا بھروسا تھا کہ اُس کی آمدنی ضرور ترقی کرے گی۔ اُس وقت وہ عطیہ کی ہر ایک فرمائش بجا لایا کرے گا لیکن ابھی تو یہ بات میسر نہ تھی۔ جب زمانہ بدلے گا تو وہ اسے اپنے ہمراہ کہیں باہر لے جائے گا، اور یوں اُن کے لئے گویا ایک نیا دورِ مسرت شروع ہوگا۔ رہے یہ باہمی جھگڑے اور شکر رنجیاں جن سے اس کے دل میں گھاؤ پڑے ہوئے تھے ان کے متعلق اس کا خیال تھا یہ کدورتیں محض اُن کی زندگی کی سطح پر ہیں جو جلد ہی فراموش ہو جائیں گی۔

جمال تو اپنے ان خیالات کے سمندر میں تیر رہا تھا اور عطیہ اپنے بستر پر بیٹھی لباسِ شب خوابی پہن رہی تھی اور آپ ہی آپ غصہ اور اشتعال کی حالت میں باتیں کر رہی تھی وہ اپنے خاوند کے فرسودہ خیالات سے تنگ آ چکی تھی۔ موجودہ زمانہ کی اصطلاحاتِ شکایت اُس کی نوکِ زبان پر تھیں۔ "اب میں ان بیہودگیوں کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اور میری ان "مصیبتوں" کی تلافی کوئی چیز حتیٰ کہ بچے بھی نہیں کر سکتے۔ میں اس روز روز کی دانتا کلکل سے "نفرت" کرتی ہوں اور میرا تمام اندوختہ اپنا غم غلط کرنے میں صرف ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ جمال نے تو روپیہ دینے سے "انکار" کر دیا ہے۔ وہ ان باتوں کو پسند

نہیں کرتا اس لئے وہ روپیہ بھی نہیں دیتا۔" آپ" کہتے ہیں کہ میں بچوں کے لئے روپیہ جمع کر رہا ہوں ۔ بات یہ ہے کہ چاہتے ہیں میری جوانی بغیر کسی تفریح و تفنن کے گزر جائے"۔ سرکشی کا ایک طوفان اُس پر سوار ہوا اُس نے اپنا لبادہ اوڑھا اور اُٹھ کر ملاقاتی کمرے کی طرف دوڑی ۔ اُس نے دروازہ کھولا اور بگولے کی طرح اپنے خاوند کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"اُدھر دیکھو! تم سے طعنے سنتے سنتے اور یہ دیکھ دیکھ کر کہ میرا ہی لڑکا میرے اور اپنی بہن صفیہ کے مخالف ہو گیا ہے، میرا کلیجہ پک گیا ہے اور میں سخت بیمار ہوں ۔ اس لئے بھی کہ میں بہت سست اور بے کار رہتی ہوں اور جب کچھ تفریح کرنا چاہتی ہوں تو بُرے الفاظ سنتی ہوں، میں کل یہاں سے رخصت ہوتی ہوں۔

جمال نے کہا "میں خود بچے کو ہمراہ لے کر پونا جا رہا ہوں ۔ تم بھی کسی قدر خستہ ہو چکی ہو ۔ یہ تبدیلی تمہارے لئے بہتر ہوگی"

"میں بہتری ہی کے لئے تو یہاں سے جا رہی ہوں" عطیہ نے باختصار کہا۔

"کیا تم دیوانی ہوئی ہو"

"میں کیوں دیوانی ہوئی بالکل تندرست اور باہوش ہوں لیکن اب میں تمہارے پاس نہیں رہ سکتی"

"مجھے تم خارج از بحث سمجھو ۔ مگر کیا سچ مچ تمہارا یہ ارادہ ہے کہ تم اپنے بچوں کو چھوڑ دو گی محض اس لئے کہ ہم میں کچھ شکر رنجیاں ہیں"

"نہیں" عطیہ گرج کر بولی "اس لئے نہیں کہ ہم میں بعض شکر رنجیاں ہیں ۔ بلکہ اس لئے کہ میں بیمار ہوں ـــــ سخت بیمار ۔ اور میری بیماری تمہارے ہر وقت کام میں لگے رہنے اور تمہارے طعنوں اور میری اپنی بے کاری و سستی اور زندگی کی خوفناک یکسانیت کے باعث جو تم میرے لئے تجویز کرتے ہو بڑھتی جائے گی"

"میں اب تک ایک بہت بڑے اور نہایت مشکل مقدمہ کے لئے تیاری کر رہا تھا" جمال نے نرمی سے جواب دیا۔

"جی ہاں! تم تو تعطیلات کے موقع پر بھی اس سال یونہی لگے رہے تھے ۔ تم خود تو کسی تفریح میں شامل ہوتے نہیں البتہ ہر ایک چیز پر طعنہ زنی کرتے رہتے ہو"

"میں بے کاروں اور بے فکروں کی طرح راتوں کو موٹروں پر اِدھر اُدھر مارا مارا نہیں پھر سکتا"

"بہت اچھا ۔ تو میں تو یہی کروں گی ۔ لو بس میں جاتی ہوں" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"جاتی کہاں ہو؟" اب جمال کا چہرہ بالکل سفید اور سخت ہو گیا اور اُس پر شکنیں پڑ گئیں ۔ مگر باوجود اس کے اُس کی آواز اُس کے قابو میں تھی۔

"مجھے نہیں معلوم شاید پہلے لیلیٰ کے پاس جاؤں"

"یہ تو وہ عورت ہے کہ میں ابداً روادار نہیں کہ تم اُس کے پاس ٹھیرو"

"نہیں میں اس کے پاس نہیں ٹھہرتی لیکن میری بیزاری سے کہ تم کیا خیال کرتے ہو کیا نہیں کرتے۔ وہ میری دوست اور سہیلی ہے"

"یا دشمن"؟

"نہیں وہ تو دشمن نہیں البتہ تم میرے دشمن اور جان کے لاگو ہو" عطیہ نے وحشیانہ طور پر چیخ کر کہا۔ "ذرا خیال توکرو میرے دوستوں کے متعلق کیسی کیسی باتیں کہتے ہو۔ میں لیلیٰ کو چاہتی ہوں مجھے اس سے محبت ہے۔ وہ میری دوست ہے!"

"اسے کوئی قابلِ رشک شہرت حاصل نہیں"

"بالکل جھوٹ سفید جھوٹ۔ چند بے شعور اور حاسد لوگ ایسی ایسی افواہیں اڑا رہے ہیں۔ لو میں جاتی ہوں میں تو کل کو یہاں سے چلی ہی جاؤں گی"

یہ کہہ کر عطیہ جھپٹ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اور غریب جمال پھر دوبارہ اپنی آرام کرسی میں لیٹ گیا۔ یقیناً یہ بہت بیہودہ بات تھی۔

شاید یہ بات غیر صحیح تھی کہ عطیہ محض چند بے معنی شکر رنجیوں کی بنا پر اس کو اور اپنے بچوں کو چھوڑ کر چلی جانے والی تھی۔ مگر کیا اسے اپنے قانونی پیشہ کی بنا پر یہ تجربہ حاصل نہ تھا کہ تقریباً روزانہ بعض احمق نوجوان عورتیں اپنے خاوندوں کو بغیر کسی معقول وجہ کے چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔ معاً ایک خیال بجلی کی طرح اس کے دل میں چمک گیا۔ اور ایک لمحہ کے لئے تو جمال اس خیال سے ادھ موا سا ہو گیا۔

اس کے ایک لمحہ بعد وہ تیزی سے اپنی بیوی کے کمرے کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ اُس نے بلا تامل اُس کے کمرے کے کواڑ کھول دیئے۔ اُس نے دیکھا کہ وہ ایک معمولی برش ہاتھ میں لئے کسی خیال میں گم بیٹھی ہے "عطیہ!" یہ کہہ کر قدم بڑھاتا ہوا وہ اُس کے پاس پہنچ گیا۔ اور ایک ایسی آواز میں جو اس کی بیوی نے آج سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی بولا۔

"کیا تم میں اور مجھ میں کوئی اور شخص تو روک نہیں ہو گیا؟"

"اُس کی بیوی نے تقریباً تبسم کے ساتھ اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اس ستم ظریفی کا شکریہ۔ میری ہتک کے لئے کچھ اور کسر رہ گئی ہو تو وہ بھی اٹھا نہ رکھئے"؟

عطیہ کی آنکھوں میں کوئی ایسی چیز ضرور تھی جس سے اُس کے خاوند کو یقین ہوگیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے اس کا حرف حرف درست ہے اس خیال سے جو نوری اور اچانک راحت اُسے حاصل ہوئی اُس نے ایک لمحہ کے لئے تو اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا کر دی کہ وہ اپنے بڑے اور مضبوط بازوؤں میں اُسے لے لے اور اپنے سینہ سے بھینچ کر لگا لے، مگر ایک طبعی شعور نے اُسے فوراً متنبہ کر دیا کہ یہ طریقہ برتنا موزوں نہیں۔ دل میں یہ خیال گذرنے کے ساتھ ہی وہ بولا۔

"تو پھر تم دیوانی ہوئی ہو جو کہتی ہو کہ مجھے اور بچوں کو چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟"

"نہیں صاحب میرے ہوش بجا ہیں۔ کم از کم اتنی باہوش تو ہوں جتنے آپ کسی صورت میں بھی نہیں ہو سکتے بس بس یہاں سے آپ تشریف لے جایئے۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ یہاں آئیں اور آسمان سر پر اٹھائیں۔ واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ اور نہیں تو اتنی مہربانی تو کیجئے کہ میرے کمرے کو میرے ہی لئے رہنے دیجئے"

"میں تو خود اسے چھوڑ کر جانے کو ناپسند کرتی ہوں لیکن میں اسے ایک سبق دینا چاہتی ہوں" عطیہ اپنے زانوؤں پر پیڈ رکھے ہوئے ایک سہیلی کو خط لکھ رہی تھی "میں امّاں حوّا کے زمانہ کی کہنہ اور پھوہڑ عورتوں میں سے نہیں ہوں، جو ہم پر تو طعنہ زنی کرتی ہیں لیکن خود کسی ایک مرد کی بھی دیکھ بھال نہیں کر سکتیں۔ وہ خیال کرتا ہے کہ میں اس سے نفرت کرتی ہوں اور اسی لئے میں اُسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ لیکن برخلاف اس کے سچ تو یہ ہے کہ وہی وہ میری رگ رگ اور ذرہ ذرہ میں سمایا ہوا ہے۔ مگر اس کا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ وہ میری ہر ایک تفریح اور کھیل سے بے کیف ہو جاتا ہے اور اتنا بُرا مناتا ہے کہ الٰہی توبہ۔ تم نے کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ دیولالی آؤں یا کسی دوسری جگہ کا نام لیا تھا۔ بہر حال اب میں دو مہینوں کے لئے آزاد ہوں۔ اور خدا کا شکر اپنی تنہائی مبارک تنہائی کے لئے ادا کرتی ہوں۔ اور وہ بھی سمجھ تو جائے گا۔ خدا اس کو برکت دے۔ جس وقت اُسے گھر کا انتظام آپ کرنا پڑے گا اور بچوں کی نگرانی بھی کرنی پڑے گی تو وہ یقیناً سمجھ جائے گا۔ میں خوشی سے اُسے معاف کرتی ہوں اے میرے پیارے خدا میری مدد کر۔ میری ازدواجی زندگی کو آسان کر۔ لیکن ہائے ہائے۔ ارے دیکھو تو سہی یہ مردوے کس قدر احمق ہیں؟" . . . .

عطیہ نے اپنے خط کو سر بمہر کر کے بند کر دیا تو مینا کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔

"بانو! میاں دارا اب سے دُور کچھ علیل تو نہیں ہیں۔ مجھ سے تو انہیں دیکھا نہیں جاتا۔ کیا آپ آئی ہیں؟ جب میں کھانا کھا کر اُن کے کمرے میں آئی تو دیکھا کہ وہ کپکپا رہے تھے۔ اور اُن کا ماتھا تو بہت ہی گرم ہے"

عطیہ یہ سنتے ہی اچھل کر کھڑی ہوگئی اور دفعتہً اُس کا دل بیٹھنے لگا۔

"کیا کہتی ہے ری مینا! نہیں وہ بیمار نہ ہوگا۔ ابھی وہ چائے کے لئے نیچے آیا تھا تو بالکل بھلا چنگا تو تھا۔"

"جی ہاں بیوی! وہ دن بھر تو ماشا اللہ اچھے خاصے تھے" کھلائی مینا نے کہا "پر ابھی ابھی کچھ مزاج خراب ہوا ہے۔

میں جانوں بہتر تو یہ ہے کہ فوراً ڈاکٹر تیر صاحب کو بلالیں۔"

عطیہ نے اپنے بستر پر دراز ہو کر دوسری طرف رکھے ہوئے ٹیلیفون کا "ریسیور" سنبھالا اور کہا "نہیں میں نہیں، مینا تم ہی ٹیلیفون پر ڈاکٹر صاحب کو بلاؤ اور کہو کہ فوراً یہاں آجائیں۔ اور میں دارا کے پاس جاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تو دوڑتی ہوئی اپنے کمرے سے نکلی اور بچوں کے کمرے میں پہنچ گئی۔ اس کا ننھا سا معصوم بچہ بار بار کرب و اضطراب سے کروٹیں بدل رہا تھا اور تنہائی میں یوں بول رہا تھا "مینا! یہاں آؤ مجھے پیاس لگی ہے۔ اری مینا میرا سر پھٹا جاتا ہے مجھے پانی دو پانی۔"

ماں کو تو گویا وہ جانتا ہی نہ تھا۔

"میری جان، یہ دیکھو تو تمہاری امّی یہاں ہے۔ قربان ہوگئی، واری گئی امّی! میرے بچے امّی تمہیں پانی پلائے گی۔"

بچے نے بڑی چاہت سے پانی پیا اور پھر بے سدھ ہو کر لیٹ گیا۔ اور ناطاقتی میں پڑا کراہتا رہا۔

کھلائی واپس آگئی اور بولی ڈاکٹر صاحب ابھی آتے ہیں۔ ہاں میں غریب صفیہ کو تو آپ کے بستر پر سلا دوں خدا نخواستہ کوئی متعدی مرض نہ ہو۔"

عطیہ نے اپنے لڑکے پر جھکے جھکے ہی رضامندی کے لئے سر ہلا دیا۔ اور کھلائی صفیہ کو جو وہیں اپنے بستر پر سو رہی تھی اٹھا کر باہر لے گئی۔

ڈاکٹر آیا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑی ہی دیر میں آیا ہے۔ بچے کا معائنہ کیا اور پھر عطیہ کو مخاطب ہو کر مختصراً کہا کان کی تکلیف ہے۔ میں ایک دوسرے آدمی کو اس کی نگرانی کے لئے کل لے کر آؤں گا۔ یہ دوائی تو آج شب کو پلا دیجئے اور نرس کا اس کے پاس رہنا بہت ضروری ہے۔"

"یہ کان کی تکلیف کیا ہے۔ کہیں کان میں کوئی پھوڑا پھنسی تو نہیں ہے؟"

"میں صبح تک تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں مجھے امید ہے کہ بچہ اچھا ہو جائے گا۔ آپ کے میاں کہاں ہیں؟"

"ڈرائنگ روم میں۔"

ڈاکٹر چند ضروری ہدایات اور ہمدردانہ الفاظ کہنے کے بعد جمال کے پاس چلا گیا۔ اور اُس سے کہنے لگا
کان کے پیچھے ایک خطرناک قسم کا پھوڑا ہے۔"

"آپ کا مطلب کیا ہے؟" جمال نے کہا۔ اور اُس کا چہرہ بے رنگ اور ستا ہوا تھا۔

"مجھے توقع ہے کہ یہ پھوڑا بڑھے گا نہیں۔ میں نے نرس کو سمجھا دیا ہے کہ اُسے کیا کرنا چاہئے۔ لیکن اگر اپریشن کی ضرورت ہی پڑی ——— ممکن ہے کہ اپریشن کسی قدر گھرا بھی ہو۔ میں صبح غور کروں گا اور صبح سویرے ہی حاضر ہوں گا"

دوسرے دن تو دارا کی حالت بہت ہی خراب تھی اور غیر معمولی تعجیل کے ساتھ فیصلہ کیا گیا کہ اپریشن ہی ضروری ہے۔ پھر کیا تھا آن کی آن میں ڈاکٹر اور نرسیں گھر میں بھر گئیں۔ کیونکہ عطیہ اس بات پر بالکل راضی نہ تھی کہ اُس کا بچہ شفاخانے میں جائے۔ صفیہ اپنے کھلنڈرے ساتھی کو یوں اچانک کھو کر کچھ پریشان سی ہوئی۔ مگر اتنی ہی جتنی کہ ایک ننھی بچی ایک معصوم کے لئے ہو سکتی ہے۔

دارا کی حالت دم بدم بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی اور اُس کے ماں باپ اس فکر و اندیشہ سے بے حال ہوئے جا رہے تھے کہ کیا یہ بچہ اُن سے چھن جائے گا۔ عطیہ کے دل میں کئی بار خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنے خاوند کے بازوؤں میں گر پڑے۔ لیکن اس کے مضبوط مگر پریشان چہرے پر ایک نظر کر کے وہ اپنا دل اُس کی طرف سے پتھر بنا لیتی تھی۔ بعض اوقات تو اُس نے جمال کے یوں مردہ دلی اور بے جگری سے اس کمرے میں آنے پر بھی برا منایا۔ اسے یہ خیال بھی بار بار آتا تھا کہ یہ شخص کوشش کرتا ہے کہ اس معصوم کو عورتوں کا مخالف بنا ڈالے۔ اور یہی ہمیشہ بیچاری صفیہ کے مقابلے میں لڑکے کی طرفداری کرتا ہے۔ غرض اس کی فکرمندیوں نے اُس کی نفرت کو اور بڑھا دیا۔ اور جمال بھی ان باتوں کو دیکھ رہا تھا اور افسوس کے ساتھ اپنے بچے کی حالت اور کام کی کثرت سے گھلا جا رہا تھا اُس کے ہونٹوں پر مہر سی لگ گئی۔ اُس نے بیوی کی طرف کوئی میلان ظاہر نہ کیا۔ کیونکہ یہ باتیں بے کار تھیں۔

آخر کار وہ دن بھی خدا خدا کر کے آیا کہ میاں دارا کمزور و نقیہ ایسے کہ جسم میں خون کا ایک قطرہ نہ تھا چند منٹ کے لئے اپنے کمبلوں میں لپٹے لپٹائے بستر پر ہی بیٹھ گئے۔

"ماشاء اللہ اب تو ہمارے "بڑے میاں" تم اچھے ہو رہے ہو" صبح کو ناشتے سے کچھ ہی پہلے اُس کے باپ نے کہا۔

"ابا جان! تو کیا میں کل نیچے چل سکوں گا؟"

"نہیں بھئی کل تو نہیں پرسوں شاید۔ اور میں تمہیں خود اپنی گود میں اٹھا کر نیچے لے جاؤں گا۔ ہے نا؟"

"نہیں ابّا جان! میں خود چل سکوں گا۔"

اُس کا باپ ہنسا اور بولا "کیا تم چل سکو گے بہت اچھا ہم بھی دیکھیں گے۔"

دارا نے پُوچھا "کیا صفیہ میرے انجن کے ساتھ کھیل رہی ہوگی؟"

اُس کے باپ نے مسکرا کر کہا "بھئی تم اچھے تو ہو جاؤ۔ میرا خیال ہے وہ ضرور کھیلتی ہوگی مگر تم اس کی پروا نہ کرو۔"

اتنا کہہ کر جمال اپنی بیوی کی طرف ہمدردی و صفائی کے لئے دیکھا کیا لیکن وہ دارا پر جھکے ہوئے اُس کے اردگرد کے کھلونوں کو درست کرتی رہی۔

"دیکھتے جاؤ پھر دارا کو صفیہ کے خلاف بھڑکایا جا رہا ہے" وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔ "اب جونہی کہ دارا تندرست ہؤا وہی پرانے جھگڑے پھر زندہ ہو گئے۔"

جمال اپنے مطالعہ کے کمرے میں جا کر گذشتہ فکر و تردد کے تین ہفتوں کے متعلق سوچنے لگا۔ کیا عطیہ نے اُس کو چھوڑ کر چلے جانے کی احمقانہ دھمکی کا خیال اپنے سر سے نکال دیا ہے؟ اب تو اُس نے بھی جی میں ٹھان لی تھی کہ اپنی بیوی کو دکھا دے کہ اب وہ ایسی باتوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اُس نے سرسری طور پر ایک مسودہ بھی تیار کر لیا تھا وہ دکھا دینا چاہتا تھا کہ وہ اس کے قول کے مطابق عمل کرنے کو تیار ہے۔ اور پھر جب بھی عطیہ نے اپنی گفتگو شروع کی وہ فوراً یہ تحریر اُس کے سپرد کر دے گا۔

آہ! اُس کی حسینہ و جمیلہ پری وش عطیہ! وہ اپنا کام شروع کرنے سے پہلے اُس کی تصویر کو جو کمرے میں آویزاں تھی ایک وارفتگی کے عالم میں کھڑا دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ اس سے اتنی سختی کرے گا؟ کر سکے گا؟ یا وہ حد سے زیادہ نرم تھا اور ابھی اسے اور نرم اور ملائم ہونے کی ضرورت تھی؟ وہ اسے اپنے محبوب ننھے بچّے کی نگرانی اور مسلسل تیمارداری میں فداکارانہ مصروف دیکھ کر پہلے سے زیادہ پیار کرنے لگا تھا۔ لیکن جھگڑوں کو چکایا کس طرح جائے؟ اور عورتوں سے نباہنے کی صورت کون سی ہے؟ وہ اپنی آیندہ زندگی کے متعلق جب عطیہ اُس کے پاس نہ ہوگی غور کر رہا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ اس کے بغیر جینا ناممکن ہے حتی کہ عطیہ کے نئے نئے خیالات اور اُس کے حد سے بڑھے ہوئے غصے اور نئی نئی آزادیوں کے باوجود وہ ہر طرح اُس کی محبت میں مبتلا اور ثابت قدم تھا۔ وہ اس کی زندگی بخش آواز، اُس کی نازک و دلکش ہنسی، اس کے حسن اور فہم و فراست کا شیدائی تھا عطیہ کی یہ رکھائی اور اکھڑپن

تو بعد میں اُن کی مسرور زندگی میں داخل ہوگیا تھا۔ اُس نے بتکرار اپنے دل میں اُس ناچاقی اور اس کے اسباب پر غور کیا جس نے ان کی مسرتوں کے ساز کو بے آواز کر دیا تھا لیکن اس درز کو بند کرنے کی کوئی تدبیر بھی اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔

اس دوران میں عطیہ بھی اپنے خاوند کی اس ہلکی طعن آمیز ہنسی پر غور کر رہی تھی جب کہ اُس نے دارا سے کہا تھا کہ "میں سمجھتا ہوں کہ صفیہ ضرور تمہارے انجن سے کھیل رہی ہوگی"، اُس کی نفرت کا بجھتا ہُوا شعلہ دوبارہ بھڑک اٹھا۔ اُسے عورتوں کے متعلق اس بے مہرانہ بولی ٹھولی اور "نیم متوہمانہ" آواز کے سننے سے نفرت تھی۔ اس لئے اب جیسا کہ طے ہوچکا تھا وہ اپنی دوست لیلی کے پاس جانے پر آمادہ تھی جس نے اُس کے آنے کے ارادے پر بار بار کبادکی تھی اور جس نے اس خلیج کو جو خود عطیہ نے اپنے اور اپنے میاں کے درمیان پیدا کرلی تھی اور وسیع کردیا تھا۔ اتنے میں اُس کے بیٹے نے پکارا "امّی جان! کیا صفیہ آکر میرے ساتھ کھیلے گی؟" دارا کی آواز تھکی ہوئی اور خستگی لئے ہوئے سنائی دی "ہاں میرے بچے! قربان گئی امّی! کیوں نہیں وہ ضرور کھیلے گی اور اس سے تمہارا دل بہلے گا"

عطیہ نے صفیہ کو بلایا اور کہا "میری بچی بیٹھے بیٹھے کوئی اچھا سا کھیل کھیلو جس میں شور نہ ہو اور نیچے اوپر دوڑتی نہ پھرو کہ اس سے تمہارے بھائی کے سر میں درد ہونے لگے گا۔ امّی کو اب چند خط لکھنے ہیں وہ جاتی ہے اور ابھی واپس آکر پیار کرے گی"

عطیہ نے یہ کہہ کر صفیہ کو ایک چھوٹی سی کرسی پر اُس بڑی کرسی کے سامنے جس پر میاں دارا کپڑوں میں لپٹے لپٹائے بیٹھے تھے بٹھادیا اور خود سیڑھیوں سے اتر کر اپنے کمرے میں خط لکھنے کے لئے چلی گئی۔ وہاں جاکر اُس نے لیلی کو تو یہ لکھا کہ وہ آیندہ دوشنبہ کو آتی ہے اور جمال کے لئے اس مضمون کا ایک مختصر رقعہ لکھا کہ وہ پونا جارہی ہے اور موسم سرما وہیں گزارے گی۔ اور واپس صرف اُسی وقت آسکتی ہے کہ جمال تمرد چھوڑ کر اپنے موجودہ رویہ کو بالکل بدل دے۔ بینا بچوں کی نگرانی کرے گی کہ وہ ان کی "پجارن" ہے۔ لیکن اگر سچ پوچھئے تو نہ تو میاں بیوی اور نہ بچے ان مسلسل ہنگاموں کے لئے تیار تھے۔

اُس کا خط تمام ہوگیا۔ وہ "نرسری" میں گئی کہ صفیہ کو وہاں سے لے کر سلادے۔ بینا نیچے اپنے کسی ضروری کام میں لگی ہوئی تھی۔ نرسری میں صرف بچے ہی تنہا تھے۔ عطیہ نرسری کی طرف تاریکی میں سے ہو کر گئی۔ اور قبل اس کے کہ کمرے میں داخل ہو دفعتہً صفیہ کی یہ آواز سن کر جہاں تھی وہیں تھم گئی۔

لو آؤ امّی جان اور ابا جان والا کھیل پھر کھیلیں۔ مجھے تو وہ کھیل بہت ہی اچھا لگتا ہے۔"

دارا ماندگی کے ساتھ سنبھلا۔

یہ خیال کر کے کہ یہ بچّے کیا کھیل کھیلتے ہیں۔ عطیہ ٹھٹک کر رہ گئی۔

"بہت اچھا" دارا نے کہا "تو اب کس طرح شروع کریں؟"

"ایسے ہی جیسے کہ پچھلی دفعہ امی جان اور ابا جان میں ہُوا تھا۔"

صفیہ نے سر ہلایا اور بولی "ہاں تم گھنونے بنو اور میں ناراض ہونگی، خوفناک ناراض۔ اور چیخ چیخ کر آواز نکالوں گی۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنے تیور بدل لئے۔ اور غصے سے اُس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

عطیہ نے ایک قدم آگے بڑھایا اور جب اُس نے صفیہ کا چہرہ دیکھا تو اس کا رنگ اڑ گیا۔ اُس نے حیرت زدہ ہو کر قدم پیچھے ہٹا لیا۔

"جمال تم نے مجھے کبھی سُکھ نہیں دیا تم تو کہیں کے وحشی درندے ہو۔"

"میری جان عطیہ!" دارا نے پورے طور پر اپنے باپ کی نقل اُتارتے ہوئے متبسم ہو کر اپنی بھنووں کو اُٹھانے کے بعد کہا "کیا میں نے کبھی تمہاری کسی فرمائش کو رد کیا ہے؟ تم عورتیں بھی عجیب ناشکرگزار ہوتی ہو۔"

"بس رہنے دو۔ تم ذرا ذرا سی چیز لانے سے تو انکار کر دیتے ہو۔ تم تو بس ایک درندہ ہو۔ میرا تو تم سے جی جلتا ہے۔ تم کبھی "انسان" نہ بنو گے۔ میری تو قسمت پھُوٹ گئی۔ میں تو اس وقت کو روتی ہوں جب میں نے تم سے شادی کی تھی۔ کاش نہ ہوتی۔"

صفیہ گرم ہو ہو کر اُٹھتی تھی اور نرسری کے فرش پر اچھل اچھل پڑتی تھی اور کہتی جاتی تھی "تم وحشی ہو وحشی۔ تمہارے خراٹے ہی ختم نہیں ہوتے۔ نہیں معلوم تم ایسے جانور میرے پلّے کہاں سے پڑ گئے۔"

"میری پیاری عطیہ تمہیں بتاؤ میں اس سے زیادہ تمہارے لئے اور کیا کر سکتا ہوں۔"

"کرنا چاہو تو بہت کچھ،" صفیہ نے چیخ کر کہا "میں تو ہر رات نئی نئی تفریحیں، نئے نئے کھیل قسم قسم کے گراموفون باجے چاہتی ہوں۔ لیکن میں تم سے سیر ہو چکی ہیں۔ میں نے تو تم سے بھر پایا۔ میرے لئے تو تم ایک خوفناک مصیبت اور مہیب بلا ہو۔ میں تو اب یہی دعا کرتی ہوں کہ تمہارا جنازہ اُٹھے۔ کسی کی آئی جمال بندے تم کو آئے۔ جیسا تم نے مجھ کو جلایا ہے۔"

دارا نے آہ بھری اور تھک کر کمزوری سے پیچھے کو جھک گیا اور پھر کسی قدر گہری ٹھنڈی سانس بھری۔

"اب بولتے کیوں نہیں۔ کیا منہ کو تالے لگ گئے ہیں"۔ صفیہ نے بپھر کر کہا۔
"افوہ! عطیہ میں تو تمہیں سمجھاتے سمجھاتے بے جان ہوگیا۔ لیکن مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں ابھی اپنے متعلق بہت کچھ کہنا ہے"۔

عطیہ آہستگی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ صفیہ کے قدم جہاں تھے وہیں جم گئے۔
"بچّو یہ سونے کا وقت ہے"۔ اُس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔ لیکن اُس کی آواز میں ایک مترحمانہ لرزش پائی جاتی تھی۔ اور دارا کے چہرے پر تکان اور خستگی کی علامات ہویدا تھیں جو بالکل اس کے مشابہ تھیں جو اکثر جمال کے چہرہ پر ہویدا ہو جایا کرتی تھیں۔

عطیہ کے لئے یہ ایک اچانک انکشاف تھا۔ اُس کا دل بیٹھ سا گیا۔ ایسا روشن اور صاف سبق آج تک کسی عورت کو نہیں ملا تھا۔ اُس پر یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ اُن کے آپس کے جھگڑے میں خطا کس کی تھی۔ عطیہ کے لئے یہ ایک روح فرسا صدمہ اور ایک جانکاہ حادثہ تھا کہ صفیہ بیماری کے مارے صابر و شاکر دارا کو گالیاں دے دے کر آپ مزے لے رہی تھی۔ جب اُس نے صفیہ کو گود میں اٹھایا تو اُس نے دارا کو آہستگی سے یہ کہتے سنا کہ "لڑکیاں بڑی وحشی ہوتی ہیں"۔ یہ بات عطیہؔ پر صادق آتی تھی۔ وہی جمال کے لئے وحشی بنی ہوئی تھی۔
وہ جمال جس سے شادی کرنے کی اُسے اس قدر آرزو اور تمنا تھی اور جو غریب اپنی جان مار مار کر اُس کے لئے کام کرتا تھا اور اسے اپنے ساتھ رکھنے کے لئے ہر وقت اپنے ہی کو قصور وار سمجھتا تھا۔
اسے خیال آیا کہ کیا اس کی دوست لیلیٰ خوش تھی؟ اس نے تو اسے کبھی شاد نہیں دیکھا جب سے اُس نے اپنے خاوند سے علیحدگی اختیار کی ہے اور وہ بھی بلا کسی معقول وجہ اور سبب کے وہ کبھی خوش نہیں ہوئی۔

کسی چیز نے نامعلوم طور پر اُس کی نسوانی محبت میں ایک جوش سا پیدا کر دیا جس نے عطیہ کے گہرے روحی زخموں کو یک دم معجزانہ طور پر مندمل کر دیا۔ اسے اپنے بیمار بچّے دارا کے چہرے پر بالکل جمال جیسی گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار نظر آئے اور اُس نے دل میں سوچا کہ وہ کیا غضب کرنے والی تھی کہ اپنے جمال، اپنے شوہر اپنے قابل رشک شوہر کو چھوڑ جانا چاہتی تھی۔ اس خیال کا آنا تھا کہ اُس نے جھٹ پٹ صفیہ کو بینا کی گود میں دے کر دارا کو بڑے ہی پیار سے بوسہ دیا اور پھر نہایت تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

صفیہ کے الفاظ اس کے کان میں گونج رہے تھے کہ "امّی جان تم ناراض تو نہیں کہ میں تمہاری طرح ناراض ہو رہی تھی" اور مینا کے بے کیف چہرے نے اُس کے دل میں ایک اور درد پیدا کر دیا۔

وہ آرام کرسی پر بے اختیار گر پڑی اور سسکیاں لینے لگی۔ ایسی سسکیاں جو اُس نے اپنی عمر میں کبھی نہ لی تھیں......آخر کار......بے حالی میں لرزتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھی اور اُس نے اپنے منہ پر پانی ڈالا اور آنسوؤں کو خشک کیا اور اس کے بعد آہستگی سے اپنے خاوند کے مطالعہ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔

"عطیہ کیا تم ہو؟" اُس نے بغیر دیکھنے کے کہا۔

"ہاں جمال میں ہی ہوں"

وہ اٹھا اور اُس کی نگاہ کاغذوں پر جھکی ہوئی تھی "میں نے ایک تجویز کی ہے کہ جب تم باہر ہو گی تو میں تمہارے اخراجات کے لئے کس قدر روپیہ دے سکوں گا۔ اُس نے آہستگی سے کہا اور میں ــــ عطیہ؟ ہیں یہ کیا؟" جب اُس نے اس کے چہرے کی طرف نظر کی تو دیکھا کہ وہ نہایت پژمردہ اور افسردہ ہو رہا ہے وہ پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا پھر اُس نے کہا "کیا دارا کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟" اور اس کی آواز میں فکر مندی کی علامات نمایاں ہو گئیں۔

"نہیں جمال لیکن میں ــــــ میں ــــــ" وہ اپنی باہیں پھیلا کر اُس کی طرف بڑھی اور ان کو مضبوطی سے اس کی گردن میں حمائل کر دیا۔

"ہائے جمال! جمال" اس نے کہا اور سسکیاں لیتی ہوئی اس کے اور قریب ہو گئی۔

"میری پیاری میری جان!" جمال نے آہستہ سے کہا اور زور سے اُس کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ اور کوئی سوال نہیں پوچھا۔ وہ مطمئن تھا کہ ایک فوری راحت اُسے مل گئی ہے، اور وہ نہ جانتا تھا اور نہ جاننے کی پرواہی کرتا تھا کہ عطیہ میں یہ تغیر کیسے پیدا ہوا۔

"جمال میں ہی اب تک تمہارے لئے وحشی بنی رہی"

"اور میں بھی کچھ کم احمق نہ تھا"

"اب تو تم مجھے اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتے۔ کیا جدا کر دو گے؟" نادان عطیہ نے پوچھا۔

جمال نے کہا "میں نے تو کبھی بھول کر بھی یہ ارادہ نہیں کیا کہ تم کو، اپنی نادان بھولی زندگی کی رفیقہ کو اپنے سے جدا کر دوں"

مہر محمد خاں شہاب

غزل

نہ مَیں زمیں کے لئے ہوں نہ آسماں کے لئے
ہوا ہوں خلق ترے سنگِ آستاں کے لئے

بشر کے دم سے کون و مکاں کی آرائش
کھچا ہے نقش یہ تزئینِ دو جہاں کے لئے

مرے بیانِ وفا پر نہ لے عتاب سے کام
کیا ہے ذکر ترا حسنِ داستاں کے لئے

فدا ہوا ہوں میں تجھ پر کہ عیش میں کاٹوں
فنا ہوا ہوں میں آرامِ جاوداں کے لئے

بہارِ گلشنِ ہستی میں جی نہیں لگتا
خبر نہیں کہ میں بیتاب ہوں کہاں کے لئے

ہوائے الفتِ منزل! اڑائے چل مجھ کو
مثالِ گردِ پریشاں ہوں کارواں کے لئے

مزارِ افسرِ بیکس زمیں پہ رہنے دو
کوئی جگہ تو رہے دورِ آسماں کے لئے

افسر
صدیقی امروہوی

چھلاوہ

فیروز نے اخبار ہاتھ سے رکھتے ہوئے کہا "آج اس میں میرے ایک دوست کے انتقال کی خبر ہے۔ میں نے اُسے صرف ایک دفعہ دیکھا ہے مگر وہ اکثر میرے خیال کی آنکھوں کے سامنے رہا ہے۔ کیا خوب آدمی تھا!

"رات کا وقت تھا اور گاڑی راولپنڈی کی طرف جا رہی تھی۔ میں ایک اول درجہ کے کمرے میں تھا اور میرا ایک ہی ہم سفر کہیں راستے میں اتر چکا تھا۔ تنہائی مجھے ناگوار نہ تھی کیونکہ اب میں جس قدر چاہتا پھیل سکتا تھا اور نرم نرم گدیلے مجھے دعوتِ استراحت دیتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ چنانچہ میں نے لمپ بجھا دیا، اپنا اوورکوٹ اوڑھا اور اطمینان کا ایک لمبا سانس لیتے ہوئے دراز ہو گیا کہ اب وہاں کوئی نہ تھا جسے میرے پاؤں پھیلانے سے تکلیف ہوتی۔

"گاڑی اب ایک وسیع میدان میں سے گزر رہی تھی۔ انجن پوری رفتار پر جا رہا تھا اور میرا کمرہ کسی پرانے یکّے کی طرح ہچکولے کھاتا رواں تھا۔ یہ ہچکولے مجھے اپنے کندھوں کے بل پر آگے اور پیچھے مسلسل جنبش دے رہے تھے، سر کے اوپر میرے سوٹ کیس میں سے ایک باریک آواز نکل رہی تھی، کھڑکیاں کھٹ کھٹ بج رہی تھیں اور پہیوں اور بریکوں سے ہولناک چیخوں کی سی آواز آ رہی تھی۔ لیکن جونہی کہ میں نے آنکھیں بند کیں اس شور کی لے مجھ پر چھانے لگی، میں اپنے آپ کو پھر بچپن کے زمانے میں پانے لگا اور مجھے اپنی کھلائی کی لوری کی شیریں آواز آنے لگی۔

"انہیں مہمل خیالات میں مجھے نیند آ گئی۔ گاڑی چلتی رہی اور اُس کا شور میرے کانوں میں گونجتا رہا۔

یکایک کمرے کی فضا متغیر ہو گئی اور میں جاگ اٹھا۔ میرے منہ کے قریب تیز سرد ہوا چل رہی تھی میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو کمرہ بدستور خالی تھا اور میرے سامنے والا دروازہ بھی بند تھا۔ مجھے پھر نیند آ رہی تھی کہ رات کی سرد ہوا کا ایک اور تھپیڑا آ کر مجھے لگا۔ میں نے اٹھ کر دیکھا تو میرے سر کی طرف کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا اور فرش پر ایک شخص بیٹھا تھا جس کے پاؤں پائیدان پر تھے۔

"میرے حواس باختہ ہو گئے کیونکہ میرا دماغ ابھی نیم بیداری کی حالت میں تھا۔ سب سے پہلے مجھ پر متوہمانہ خوف سا چھا گیا۔ کیونکہ پوری رفتار سے جاتی ہوئی گاڑی میں یکایک کسی انسان کے ظاہر ہونے پر یہی

خیال ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی بھوت ہے۔ پھر مجھے گاڑیوں میں آگھسنے والے لٹیروں، اچکوں اور خونیوں کا خیال آیا اور میں نے محسوس کیا کہ میں اکیلا ہوں اور گو میرے اور دوسرے مسافروں کے درمیان صرف ایک لکڑی کا تختہ حائل ہے لیکن میں کسی ذریعہ سے بھی اُن کو اپنے خطرے سے آگاہ نہیں کرسکتا۔ یہ شخص ضرور کوئی ڈاکو ہے!

حفاظت نفس کے جذبے سے مجبور ہوکر میں اُس پر ٹوٹ پڑا اور اپنی کہنیوں اور گھٹنوں سے اسے باہر کی طرف دھکیلنے لگا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا لیکن دروازے کو بے تحاشا پکڑے رہا، اور میں اُس کی گرفت ڈھیلی کرکے اُسے باہر پھینکنے کی سعی میں مصروف رہا۔ اس میں شک نہیں کہ میں ایک محفوظ جگہ پر کھڑا تھا اور مجھے یہ فوقیت حاصل تھی۔

"خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو، میں تمہیں کوئی مضرت نہ پہنچاؤں گا!" یہ الفاظ اُس نے ایسی لجاجت سے کہے کہ مجھے اپنے سلوک پر شرم آگئی اور میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ ہانپتا کانپتا وہ پھر بیٹھ گیا۔ میں نے وہاں سے ہٹ کر لمپ روشن کردیا۔

"اس کے بعد مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ کون ہے۔ وہ ایک غریب کسان تھا اور اُس نے موٹے کھدر کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اُس کی سیاہ پگڑی اُس کے چہرے سے کچھ زیادہ تاریک نہ تھی جس میں اس کی بڑی بڑی آنکھیں اور پیلے پیلے دانت نمایاں تھے۔ وہ احمقانہ ممنونیت میں کھلکھلا رہا تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے تھیلے میں سے کچھ تلاش بھی کررہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں اپنی نیکی پر افسوس کرنے لگا۔ ابھی وہ تلاش میں مصروف تھا کہ میں نے اپنے ریوالور پر ہاتھ ڈالا۔ اب وہ بے خبری میں مجھ پر حملہ نہ کرسکتا تھا۔

"آہستہ سے اُس نے کوئی چیز اپنے تھیلے میں سے نکالی، اور میں نے بھی اُس کی تقلید میں اپنا ریوالور آدھا باہر نکال لیا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں محض ایک فرسودہ کاغذ کی چھوٹی سی کترن تھی، جسے وہ خوشی سے میری طرف بڑھا رہا تھا۔

"دیکھ لو، میرے پاس ٹکٹ موجود ہے!"

"میں نے اُس کی طرف دیکھا اور ہنس پڑا

"میں نے کہا "لیکن یہ تو پرانا ہے! یہ تو سالہا سال سے بے کار ہوچکا ہے۔ اور اس کے علاوہ کیا یہ تمہیں چلتی گاڑی میں چھلانگیں لگانے اور یوں لوگوں کو ڈرانے کی معافی دے سکتا ہے؟"

"اس پر اُس کے چہرے کا رنگ زرد ہوگیا، اُسے پھر خوف ہوگیا ہے کہ میں اسے باہر پھینک دوں گا لیکن

اپنی حساسیت کے باعث مجھے اس پر رحم آنے لگا۔

"میں نے کہا تم اندر آجاؤ اور دروازہ بند کردو"

"نہیں صاحب، شکریہ!" اُس نے کڑی آواز سے کہا "مجھے اندر آنے کا حق نہیں ہے؛ میں یہیں باہر بیٹھوں گا۔ میں اُس جگہ کے قابل نہیں"

"اور وہ دروازے ہی میں بیٹھا رہا۔ میں بھی اُس کے قریب ہی بیٹھا تھا اور میرے گھٹنے اُس کے کندھوں کو چھو رہے تھے۔ گاڑی کی رفتار کے ساتھ ہوا طوفان کی طرح اندر آرہی تھی، اور روشنی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دروازے میں سے چھن کر اور ہمارے بے ڈول سایوں کو ساتھ لے کر بنجر میدان کو چھوتا ہوا ہمارے ساتھ سفر کررہا تھا۔ تار کے کھمبے رات کے سیاہ پردے پر زرد رنگ کے عمودی نقوش کی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرتے چلے جاتے تھے، اور چنگاریوں کے جگنو انجن سے نکل نکل کر پیچھے کی طرف بھاگتے تھے۔

"وہ مضطرب سا نظر آتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے اطمینان سے بیٹھنے کی عادت ہی نہیں۔ میں نے اُسے ایک سگار پیش کیا۔ ذرا سی دیر کے بعد اُس نے باتیں شروع کردیں۔

اُس نے مجھے بتایا کہ وہ ایسا سفر ہر ہفتے کیا کرتا ہے۔ وہ سٹیشن سے دور کھڑا گاڑی کا انتظار کرتا رہتا ہے اور جب وہ قریب پہنچتی ہے تو دوڑ کر ایک ہی چھلانگ میں اُسے پکڑ لیتا ہے، اور پائدان پر کھسکتا ہوا کسی خالی کمرے تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر گاڑی کے کسی سٹیشن پر داخل ہونے سے پہلے ہی کود جاتا ہے اور جب وہ چل پڑتی ہے تو پھر اس پر چڑھ آتا ہے۔ اور وہ ہمیشہ اپنی گاڑی بدل لیتا ہے تاکہ سنگ دل گاڑی والوں کی نظر سے بچا رہے۔

"میں نے پوچھا لیکن تم کہاں جارہے ہو؟ اور ہر ہفتے تم اتنے بڑے خطرے میں کیوں پڑتے ہو؟"

معلوم ہوا کہ وہ اتوار کی چھٹی اپنے بال بچوں میں گزارنا چاہتا تھا مگر وہ اور اس کی بیوی انتہائے غربت کے باعث اکٹھے نہ رہ سکتے تھے۔ وہ ایک شہر میں کام کرتا تھا اور اُس کی بیوی کسی دوسرے شہر میں۔ پہلے پہل وہ یہ سفر پیدل طے کیا کرتا تھا اور ساری رات چلتا رہتا تھا، مگر جب وہ وہاں پہنچتا تو بے حال ہوکر گر جاتا تھا اور تکان کے باعث نہ اپنی بیوی سے بات کرسکتا نہ بچوں سے کھیل سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بے باک ہوگیا اور اب اس نے گھر پہنچنے کا ایک آسان رستہ نکال لیا۔ بچوں کو دیکھ کر اُس کے اعضا میں بقیہ ہفتے کے لیے زیادہ تن دہی سے کام کرنے کی قوت پیدا ہوجاتی تھی۔ اُس کے تین بچے تھے۔ سب سے چھوٹی لڑکی ابھی اچھی طرح چل بھی نہ سکتی تھی لیکن

وہ اپنے باپ کو پہچانتی تھی اور جب کبھی وہ آتا وہ پیار لینے کے لئے اُس کی طرف اپنی باہیں پھیلا دیتی تھی۔

"میں نے اُس سے کہا لیکن کیا تم ڈرتے نہیں کہ کسی دن یہ سفر تمہارا آخری سفر نہ ہو جائے؟"

"وہ مسکرایا اور اُس کے مسکرانے سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے اپنے پر اعتماد ہے "نہیں، جب گاڑی کسی گسستہ عناں گھوڑے کی طرح شعلے اگلتی اُس کی طرف بڑھی چلی آتی تھی تو اس کو ڈر نہ آتا تھا۔ وہ کافی دلیر تھا، ایک ہی جست میں وہ اس کے اوپر ہوتا، اور گو کبھی کبھی اترتے وقت اُسے ایک آدھ دھکا لگ جاتا لیکن وہ پہیوں کی زد سے اپنے آپ کو صاف بچا لیا کرتا۔

"اُسے صرف مسافروں کا خطرہ ہوتا تھا۔ اول درجہ کی گاڑیاں اُسے عموماً خالی ملتی تھیں لیکن آج کی طرح کے مواقع بھی اسے پیش آہی جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جو عورتوں کے لئے مخصوص تھی۔ وہاں دو عورتیں بیٹھی تھیں اُن کی چیخوں نے اسے ایسا ڈرایا کہ اسے گاڑی سے اترتے ہی بنی اور باقی راستہ پیدل چل کر جانا پڑا۔

"ایک رات جب وہ چوری چوری ایک دروازہ کھول رہا تھا کسی نے اُس کے سر پر اس زور کی ضرب رسید کی کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ بس اُس دن اُسے یقین تھا کہ یہ اُس کا آخری سفر ہے! یہ بات سناتے سناتے اُس نے اپنی پیشانی پر مجھے ایک بہت بڑا داغ دکھایا۔

"آہ، اُس کے ساتھ بڑی بدسلوکی ہوئی تھی لیکن اس کی اُس کو شکایت نہ تھی، اُسے لوگوں سے گلہ نہ تھا کہ کیوں وہ اس سے ڈرتے اور اپنی حفاظت کی کوشش کرتے ہیں۔ جو سلوک اُس سے ہوتا تھا وہ اپنے آپ کو اس کا مستحق سمجھتا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ کا۔ مگر جرم کے سوا اُس کے پاس چارۂ کار ہی کیا تھا جب کہ وہ مفلس و قلاش تھا اور اسے اپنے بچوں کو دیکھنے کی آرزو بھی تھی۔

"اتنے میں گاڑی کی رفتار کم ہونی شروع ہوئی جیسے کوئی سٹیشن آرہا ہو۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے کہا "دیکھو، تمہارے سٹیشن پر پہنچنے سے پہلے راستے میں ایک قیام اَور ہو گا، تم بیٹھے رہو اور تمہارا کرایہ میں ادا کر دوں گا؟"

"اُس نے بلا تامل جواب دیا "نہیں صاحب، گارڈ پھر بھی مجھے دروازے سے گزرنے نہ دے گا۔ اُس نے کبھی مجھے اچھی نظر سے نہیں دیکھا اور نہ میں چاہتا ہوں کہ وہ دیکھے۔ مگر میں دعا کرتا ہوں کہ آپ کو یہ سفر مبارک ہو۔ میں نے آپ جیسا رحم دل اور نیک کوئی آدمی نہیں دیکھا!"

"یہ کہہ کر اُس نے پائدان پر پیر رکھا اور غائب ہوگیا"

"جلد ہی گاڑی ایک چھوٹے سے سٹیشن پر ٹھیر گئی۔ مجھ پر پھر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی کہ یکایک مجھے پلیٹ فارم پر اشتعال آمیز آوازیں سنائی دیں۔ یہ قلی وغیرہ تھے جو گاڑی کے محافظوں کو کسی کے تعاقب کا رستہ دکھا رہے تھے۔

"وہ جا رہا ہے! تم میں سے ایک دوسری طرف ہو جاؤ تاکہ وہ بچ کر نکل نہ جائے!...... لو وہ گاڑی کے اوپر چڑھ گیا!... جلدی کرو!

"اور چند ہی لمحوں میں میرے کمرے کی چھت غضبناک پولیس کے بھاری بھاری قدموں سے ہلنے لگی۔

"میں نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر دیکھا تو اگلی گاڑی کی چھت سے ایک آدمی نیچے گر رہا تھا۔ ایک تودے کی طرح وہ زمین پر آپڑا، پھر بے تحاشا بھاگ اٹھا اور جلد ہی رات کے سیاہ پردے میں چھپ گیا۔

"گارڈ اور اُس کے دوسرے ساتھی زور زور سے بول رہے تھے اور طیش سے ہاتھ ہلا رہے تھے

"میں نے اُن میں سے ایک سے پوچھا یہ کیا بات ہے؟

"اُس نے کہا "یہ وہی ہے وہی سواری کا چور! یہ چھلاوہ کسی کے ہاتھ نہیں آتا، مگر ہم ضرور اسے پکڑ کر رہیں گے!"

"چھلاوے" کو میں نے پھر کبھی نہیں دیکھا۔ اکثر سردی کی راتوں میں میں یہ سوچ سوچ کر حیران ہوا ہوں کہ آیا وہ اس وقت بھی کہیں باد و باراں کے طوفان میں کھڑا ناساز گار گاڑی کی آمد کا انتظار کر رہا ہوگا، اور پھر دشمن کے مورچے کو مسخر کر لینے والے کسی بے باک سپاہی کی طرح وہ اس پر چڑھ رہا ہوگا"

پھر فیروز نے اخبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اور آج اس میں لکھا ہے کہ چک لالہ کے قریب کسی کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے اڑے ہوئے پائے گئے۔ یہ وہی ہے ——— مجھے یقین ہے کہ یہ وہی ہے۔ آہ، وہ جو خطرے کو ڈھونڈتا ہے، اس میں پڑتا ہے اور فنا ہو جاتا ہے، چار طویل سالوں تک اُس نے اپنا یہ وظیفہ جاری رکھا، جب اُس کا دل اپنے بچوں کو چومنے کے لئے چاہا وہ کسی وحشی درندے کی طرح اپنے شکار پر جھپٹا کیا، یہاں تک کہ آج صبح کی روشنی نے اُسے اُس رستے پر پڑا پایا جس پر تاریک رات نے اُسے اکثر ایک بہادر انسان کی طرح موت کو دعوتِ مقابلہ دیتے ہوئے دیکھا تھا۔

(ترجمہ)

منصور احمد

دنیائے رنگ و بُو

(۱)

دلچسپ ہیں مناظر دنیائے رنگ و بُو کے
حیرت زدہ ہے ناظر نظارۂ چمن سے
ہر گُل ہے جانِ راحت
سرمایہ دارِ عشرت

(۲)

حسنِ بہارِ رنگیں دلکش ہے دلکشا بھی
آئینہ دارِ نزہت نرگس ہے موتیا بھی
نیرنگِ شانِ یزداں
ہر سمت ہے نمایاں

(۳)

اہلِ نظر ہزاروں ہر ایک گُل بداماں
بے خوف و بے محابا ہیں محوِ دیدِ گلشن
وہ بے خودی ہے طاری
پروا نہیں کسی کی

(۴)

کچھ اہلِ دل نشستہ سایہ میں تاک کے ہیں
وہ بے پیے ہوئے ہی بیخود بنے ہوئے ہیں
ہر گل نظر میں اُن کی
ہے جامِ زندگانی

(۵)

ہشیار، دیکھ غافل! یہ وقت ہے غنیمت
اِک جام تُو بھی لے لے بڑھ کر، اگر ہو ہمت
انجام سے نہ گھبرا
انجام نیک ہوگا

راز
چاندپوری

شاعر اور مغنّیہ

لندن میں ہر جگہ سُن نہیں برستا، بلکہ بعض ایسے محلے بھی ہیں جہاں افلاس اور تہی دستی کے دل ہلا دینے والے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ اسی گھر کو لیجئے جو گلی کے نکڑ پر واقع ہے، اور تنگ دستی کے جملہ نوادر کا معدن بن رہا ہے۔ ایک بیوہ عورت بسترِ علالت پر کراہ رہی ہے، اور اس کا یتیم لڑکا پائتی سرہانے بیٹھا گنگنا رہا ہے بیماری بجائے خود ایک مصیبت ہے، مگر جب اس کے ساتھ ناداری بھی حملہ کردے تو کوڑھ میں کھاج کی مثل صادق آتی ہے۔ عورت کراہے جاتی ہے لڑکا گنگنائے جاتا ہے اور کسی ایسی بات کا امکان نہیں جو اس ماحول میں کوئی تغیر پیدا کرسکے۔ عورت کو اپنے سہاگ کے دن یاد آتے ہیں، لڑکے کو باپ کی محبت برماتی ہے لیکن یہ اتحادِ خیال کسی گفتگو کا موجب نہیں ہوتا۔ آفتاب اپنے سفر کی وہ منزل طے کرچکا ہے جہاں بیٹھ کر وہ اہلِ دنیا کو رخصتِ چاشت دیتا ہے۔ لیکن آج اس کی فرد سے ان ماں بیٹوں کا نام خارج ہے۔ ماں کو خوراک تو کجا دوا تک میسر نہیں آتی، اور لڑکے کے منہ میں کھیل تک اڑ کر نہیں پڑی، مگر وہ گنگنائے جاتا ہے اور اس بے مزہ زندگی کی ناخوشگوار گھڑیاں مزے سے گزارنے کی کوشش کررہا ہے۔ آخر ضبط کی بھی حد ہوتی ہے۔ اس لئے معذور ہے اگر اس ہولناک تنہائی، اس بھیانک ناداری اور ماں کی اس طویل بیماری میں دامنِ صبر اس کے ہاتھ سے نکل جائے اور اُس کی آنکھیں اُن مہربانِ دردِ دروں سے داد طلب کریں جنہیں عرفِ عام میں آنسو کہتے ہیں۔ لڑکا گو ابھی اس سن کے اُس حصار سے نکلا ہے جسے بچپن کہتے ہیں۔ مگر آخر مرد کا بچہ ہے اور اس کی غیرت قبول نہیں کرتی کہ اُس کی ماں ایک سنگترے کے لئے ترسے اور کہے۔ "میری زندگی ایک سنگترے کے لئے ختم ہوتی ہے" اور وہ منہ دیکھتا ہے۔ لنڈن اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے ساتھ ایک خوش رقم کتاب کی طرح اس کے سامنے کھلا پڑا ہے، لیکن وہ اس کے پڑھنے کے ناقابل ہے۔ تنازعِ بقا میں ایک ایسا خاموش اعترافِ شکست اُس کے سمندِ غیرت پر تازیانہ کا کام کرتا ہے مگر بے کسی رنگ جمائے جاتی ہے اُسے سنگترہ حاصل کرنے کی تمام راہیں مسدود نظر آتی ہیں۔

تھوڑی دیر کی رائگان خاموشی کے بعد پھر وہ گنگنانے میں مصروف ہوگیا۔ اُس کی بے معنی گن گن سے حسرت و یاس ٹپکتی تھی، اور اس دردناک منظر کو اور بھی اداس کردیتی تھی۔ اس گنگناہٹ کی صورت کو معانی سے پیوند دیا جائے تو وہ گیت صورت پذیر ہوتا تھا جسے اُس نے خود تیار کیا تھا اور جس کے گنگنانے میں وہ اپنی

پُرالم زندگی کو یک قلم بھول جاتا تھا۔ یہ گیت نہ صرف شاعری بلکہ موسیقی کے اعتبار سے بھی ایک احسن تصنیف کا قابلِ تحسین نمونہ تھا۔ لیکن نوخیز مصنف اپنی متاعِ گرانمایہ کی قدر وقیمت سے بیگانہ نہ تھا۔ اس گلوگیر گردوپیش کے نامتناہی سلسلہ سے تنگ آگیا تو اس نے کھڑکی سے جھانک کر اپنی نگاہوں کے لئے کوئی اَور فضا پیدا کرنی چاہی نیل گوں آسمان پر سورج سنہری پوڈر بکھیر رہا تھا۔ آبِ رواں سے ہوا اٹھکھیلیاں کر رہی تھی۔

کارخانوں کی سر بفلک چمنیوں سے دھواں نکل کر آسمان کی خبر لا رہا تھا۔ سڑکوں پر کوئی آ رہا تھا کوئی جا رہا تھا۔ دوکانوں پر خریداروں کا جمگھٹا تھا۔ کوئی خریدتا تھا کوئی بیچتا تھا۔ گاڑیوں کا تانتا بندھا تھا۔ ڈھور باربرداری کے فرائض بڑی بردباری سے بجا لا رہے تھے۔ پرند فضا میں چکر کاٹ کاٹ کر دانے دنکے کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ غرض کائنات کا ہر ذرہ اپنے فرائض کی بجا آوری اور روزی پیدا کرنے میں سرگرم تھا مگر اس وسیع گیند پر ایک گوشہ ایسا نہ تھا جہاں پاٹری کسبِ معاش کے لئے تگ و دو کر سکے۔ سب کل پرزے مصروفِ کار تھے۔ کارخانۂ قدرت میں ایک بےکار ایک عضوِ معطل صرف پاٹری کی ذات تھی۔ اتنے میں ایک بڈھا بڑے بڑے اشتہاروں کا بستہ بغل میں دابے، ایک ہنڈیا ہاتھ میں لئے آ نکلا۔ اُس نے سامنے والی دیوار کو غور سے دیکھا اور ٹھہر گیا۔ پھر اُس نے ایک قدِ آدم اشتہار وہاں چسپاں کیا اور چلتا بنا۔ پاٹری کی آوارہ نگاہیں اشتہار پر جم گئیں اور اس کے علم میں یہ اضافہ ہوُا کہ اس شب کو میڈم ملبرن ایک ایوانِ موسیقی میں نغمہ سرا ہونگی اس اشتہار کے مطالعہ نے جلتی آگ پر تیل ڈال دیا۔ بیم ورجا کی کشمکش زیادہ تیز و تند ہوگئی۔ کاش میں بھی میڈم کا گانا سن سکتا" ایک نیا زخم تھا جس کا مرہم اس کے گیت کے پاس نہ تھا۔ آخر درد اس حد سے تجاوز کر گیا جب بقولِ حکیم غالب وہ دوا بن جاتا ہے۔ پاٹری نے ایک غبار آلود آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سنہرے بالوں کو سنوارا، ٹوپی سر پر رکھی اور لکڑی کے ایک پرانے اور بےرنگ و روغن صندوقچے سے چند بوسیدہ اور رنگ پریدہ کاغذ جیب میں ڈال کر گھر سے باہر نکل گیا۔

اس عالی شان محل میں وہ سب سامانِ عیش و تنعم مہیا ہے جو دولت کے اشارے پر لگا رہتا ہے۔ فرش فروش، آرائش زیب و زینت مبالغے اور سلیقے کے درمیان ٹھٹھر کر رہ گئی ہے۔ ضروریاتِ راحت و آرام کی بوقلمونی قدرت کو جنتِ جدید کی طرح اندازی کا مشورہ دیتی ہے۔ اس محل کی جلوہ گاہ میں ایک پری پیکر کمرے کے قدِ آدم آئینوں میں عکس افگن ہے۔ اور "کثرت میں وحدت" کی حقیقت پر وعظ کہہ رہی ہے۔ سرمایۂ ہوش و

خرد کو پریشان کرنے کا سامان ہنوز کندھوں پر جھول رہا ہے نیم باز آنکھیں طمانیتِ قلب کا اظہار کر رہی ہیں سفید ریشم سے بدن پھوٹ پھوٹ کر نکل رہا ہے۔ غرض حسنِ نسوانی کے جملہ نوادر کی نمائش اس مجسمہ میں بند ہے۔ سامنے ایک تپائی پر ایک سونے کی گھنٹی پڑی تھی۔ اس پر انگلی رکھی۔ ایک دلکش آواز سے کمرہ معمور ہو گیا۔ خادم باادب حاضر ہوا۔

مغنیہ نے کہا "کون ہیں آپ؟ ان ملاقاتوں سے دم ناک میں آگیا ان کے نزدیک مغنیہ اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ شب کو گاتی رہے اور دن بھر اُن کی تعریفوں پر سر دھنتی رہے (ذرا خاموشی) جیمز تم بڈھے ہو گئے مگر کسی کو ٹالنا نہ آیا۔"

"حضور کیا عرض کروں۔ سرکار کی بدولت کیا نہیں آتا مگر معصوم بھولے بھالے لڑکے کے سامنے کس منہ سے جھوٹ بولوں۔ ورنہ میری سخن سازی کا لوہا بڑے بڑے لارڈ مانتے ہیں۔"

"یہ بات ہے تو آنے دو اُسے۔ بچوں کا دل توڑنا مجھے بھی گوارا نہیں۔"

پاٹری ایک ہاتھ میں کاغذ اور دوسرے میں ٹوپی پکڑے داخل ہوا جھک کر آداب بجا لایا اور اُس کی جنبش ابرو پر کہنے لگا "اور اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ اماں بیمار ہیں، اور ہمیں کھانا تو رہا ایک طرف دوا تک خریدنے کی توفیق نہیں۔ اس امید پر آیا ہوں کہ اگر آپ ایک دفعہ میرے اس گیت کو گانے کا شرف عطا کریں تو ممکن ہے کہ کوئی اس کا حقِ تصنیف خرید لے اور میں اماں کے لئے دوا اور سنگترہ خرید سکوں۔"

سرو قد حسینہ مسکراتی ہوئی اٹھی۔ اُس نے پاٹری سے کاغذ لے کر اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ مگر اس ایک نظر نے اُسے جتا دیا کہ یہ گیت سرسری نظر سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔ اس لئے پہلے تو اس نے یونہی گنگنا کر اس کی موسیقیت کا امتحان کیا پھر دوڑی دوڑی گئی اور پیانو پر گا کر پرکھا اور اُلٹے پاؤں واپس آکر کہنے لگی۔

"یہ گیت تم نے لکھا ہے! بہ سن اور الفاظ کا یہ حسنِ انتخاب! اچھا تو آج شب گانا سننے آؤ گے"۔

"شوق سے، مگر اماں ——"

"میں کسی کو تیمارداری کے لئے بھیج دوں گی۔ اس کی فکر نہ کرو۔ یہ لو دس شلنگ۔ ان سے فی الحال دوا اور خوراک خرید لو اور یہ ٹکٹ ہے اسے دکھا کر تم میرے پاس پہنچ جاؤ گے"۔

پاٹری رخصت ہوا تو اُس کی رفتار میں فرق تھا سورج کی روشنی زیادہ روشن اور دنیا رہنے کے قابل نظر آتی تھی۔ وہ چیزیں جن کے نہ مل سکنے کا خیال اُسے قناعت کی تلقین کرتا تھا اب اسے لوازمِ حیات سے معلوم ہوتی تھیں۔ دوا اور سنگتروں کے علاوہ اُس نے اتنی چیزیں خریدیں کہ دس شلنگ ٹھکانے لگ گئے۔ گھر آیا اور چیزیں سامنے رکھ کر ماں سے لپٹ گیا۔

پاٹری کو آج کا دن معمول سے زیادہ لمبا معلوم ہؤا۔ کم بخت کٹنے ہی میں نہ آتا تھا۔ آخر آفتاب نے سرمایہ داری سے روتابی کر کے مزدور کے حال پر رحم کھایا اور خدا خدا کر کے دنیا کا پیچھا چھوڑا۔ پاٹری نے کھانے سے فرصت پائی ہی تھی کہ ایک ڈاکٹر ایک نرس کو لے کر آپہنچا اور بیمار کے آرام کا انتظام کرنے لگا۔ ماں کی نگہداشت سے مطمئن ہوکر پاٹری نے ایوانِ موسیقی کا رخ کیا۔ داخل ہؤا تو اُسے اور ہی دنیا نظر آئی۔ بجلی کی روشنی کی چمک اور خواتین کے جواہرات کی دمک نے ایوان کو رشکِ فلک بنا رکھا تھا۔ کوئی نشست خالی نہ تھی۔ اور یہ جمِ غفیر ہمہ تن گوش ہوکر پردے کی طرف ٹکٹکی باندھے تک رہا تھا۔ آخر ساز چڑھے۔ حاضرین کی نشست گاہ میں روشنی برائے نام رہ گئی۔ پردہ اٹھا تو ایک ماہ جبیں جلوہ فگن تھی۔ اس کے حسنِ گلو سوز کو دیکھ کر یہ محوِ حیرت دنیا خراجِ تحسین ادا کرنے میں کھو سی گئی اور اُسے دھیان تک نہ رہا کہ اس مجسمۂ رعنائی وزیبائی کا فرض صرف بصارت افروزی نہیں بلکہ سماعت پروری بھی ہے۔

یہ عالم دیکھ کر دم بخود پاٹری کا ننھا سا دل دھکڑ دھکڑ کر رہا تھا۔ پہلے ہی اسے کچھ شک سا تھا۔ اب تو بالکل ناامید ہوگیا کہ یہ خاتون ایسے پُروقار مجمعے کے سامنے اُس کا گیت گانے کو کیونکر روا رکھے گی۔ لیکن پیانو کی دلکش صدا نے خشک دھانوں پر پانی ڈالا اور وہ سمجھ گیا کہ اس کے پردوں میں اس کا گیت بول رہا ہے۔ گانا کیا تھا ایک بولتا ہؤا جادو تھا جس نے حاضرین کی سدھ بدھ ہی چھین لی، اور یہ قصرِ تعیش ماتم خانہ کی صورت سوگوار نظر آنے لگا۔ سیدھے سادھے الفاظ میں سوز و گداز اور رقت کے ایسے نشتر پوشیدہ تھے کہ حاضرین کے دل میں اتر گئے۔ بڑے بڑے گھاگ تھیٹر نواز معترف تھے کہ انہوں نے آج تک ایسا پُراثر اور درد انگیز گیت نہیں سنا۔

پاٹری اس غیر متوقع کامیابی سے مدہوش ہو رہا تھا۔ وہ کئی دفعہ اس حقیقت کو خواب سمجھا۔ اُسے کچھ معلوم نہ ہؤا کہ وہ کب ایوانِ موسیقی سے نکلا اور کب گھر پہنچا۔

دوسرے دن پاٹری یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میڈم بلین کی شاہانہ گاڑی نہ صرف اُس کے مکان کے سامنے آکر رک گئی، بلکہ میڈم اس کے مکان میں آ داخل ہوئی اور ایک شکستہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ پاٹری کو اُس نے گود میں لے لیا۔ اور اس کے سنہرے بالوں میں اپنے ہاتھ سے شانہ کرتے ہوئے اُس کی ماں سے کہنے لگی "بی بی تمہارے بیٹے نے تمہاری عسرت کو تمول سے بدل دیا ہے۔ مبارک ہے وہ ماں جسے خدا نے ایسا بیٹا عنایت کیا۔ آج صبح لندن کے ایک مشہور ناشر نے اس کے گیت کے عوض ساڑھے چار ہزار روپے کی رقم پیش کی ہے اور عہد کیا ہے کہ جب اس کی فروخت سے ایک خاص رقم وصول ہو جائے گی تو پاٹری شریکِ منفعت شمار ہوگا۔ تمہارا بچہ حقیقی معنوں میں نامیند رحمٰن ہے۔ لو بنک کی کتاب اور دل کھول کر خرچ کرو۔"

نور الٰہی
محمد عمر

اے سکھی! راز و نیاز کے وہ گوناگوں محسوسات جو تیری موجودگی میں سراپا راحت تھے اب مجھے محض پُرالم خواب معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے خیال کی نیرنگیاں تھیں!

کون جانتا تھا کہ کسی دن میں اور تو ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے!

لوگ کہتے ہیں پریت کے جالوں میں پھنس کر تو نے میری محبت کے اُس تار کو توڑ ڈالا ہے جو میرے اور تیرے من کو ایک کئے ہوئے تھا۔ کیا واقعی وہ ٹوٹ گیا اور اب تجھے میرے دل کی دھڑکن نہ سنائی دے گی؟

سچ بتا میری سکھی! آج جب کہ میرے دل کے مندر میں گم کردہ مسرتوں نے ایک شورش بپا کردی ہے کیا اس وقت تو میرے ان جذبات سے محض بیگانہ ہے؟

اے سکھی! خزاں کے موسم میں، جب سورج افقِ مغرب میں غائب ہو گیا تھا اور تو مجھ سے مل کر آہستہ خرامی کے ساتھ واپس جارہی تھی تجھے نہیں معلوم (آہ تو نے پھر کر میری طرف نہیں دیکھا تھا) کہ میں نے تیری واپسی کی راہ میں کتنے موتی بکھیرے! میں دور تک تیرے پیچھے پیچھے چلی گئی۔

اے سکھی! تو نے اپنی محبت پر میرے دل کا آرام قربان کردیا مگر میں تجھ کو بے وفا نہ کہوں گی کیونکہ ریت کے دیوتا نے تیری طرف دیکھا اور تو ان نگاہوں کی طرف کھنچی چلی گئی!

آہ! ایک شام تھی جب تو مجھ سے بچھڑ گئی اور مجھے نہیں معلوم کہ اب کون دن آئے گا جب میرے خیال کی تاریک بستیوں میں تیرے ملاپ سے ایک نور افشاں روشنی کی نمود ہو گی۔ نہ معلوم فطرت کے دھیان میں اس پریم کی تجلی کا کون سا وقت ہے!!! تو چلی گئی! تیرے نگاہوں سے اوجھل ہونے کے بعد مجھے مطلق ہوش نہیں کہ کیا ہوا تھا ——— شاید میں تھوڑی دیر کے لئے کھو سی گئی مگر اب میرا اضطراب نہ پوچھ؟ میں نہیں جانتی اے سکھی! کہ اب دنیا میں کیا ہو گیا ہے!

آہ! نہ معلوم کیوں یہ دنیا کے راہ و رسم دو محبت کرنے والوں کے درمیان خلیج بن کر حائل ہو جاتے ہیں اس لئے میں جانتی ہوں کہ کسی محبت کا ایک آتشین ہاتھ تجھ کو مجھ سے چھین کر لے گیا۔ مگر میں حیران ہوں کہ میرے دل نے پندارِ مسرت کیوں چھوڑ دیا؟ اسے کس سماوی طاقت نے مجبور کر دیا ہے!!!

اے سکھی تیری جدائی کی الم خیز لذتوں نے، شاید دنیاوی مناظر کا دلکش رنگ سلب کر لیا ہے۔ وہ تمام نظارے جو تیری موجودگی میں مسرت نواز معلوم ہوتے تھے مجھے اب ذرا بھی تسکین فزا نہیں محسوس ہوتے!

مگر یہ کیوں؟ اے میری سکھی! یہ تمام دلی بے چینیاں کیوں؟ صرف اس لئے کہ تُو مجھ سے دور ہے۔ موسم بہار کی دلفریبیاں اب میرے لئے ناخوشگوار ہو گئی ہیں۔ جب میں غنچہ کو چٹکتا ہوا دیکھتی ہوں تو مجھے تیرے نرم و خوش آیند قہقہوں کا خیال آ جاتا ہے اسی طرح جب بلبل کوئی موسمی راگ گاتا ہے تو مجھے وہ گیت یاد آ جاتے ہیں جو میں اور تو ہم آواز ہو کر گایا کرتے تھے!

اے سکھی! کیا تو وہ دلفریب رات بھول گئی جب پھولوں میں نکہت تھی۔ جب چاند کی ترنم پاش روشنی چھائی ہوئی تھی۔ جب راہ نورد ستارے بھی ٹکٹکی باندھے ہماری طرف دیکھ رہے تھے اور جب بلبل کی میٹھی میٹھی لوریاں سُن کر کائنات بھی سوئی ہوئی تھی ——— اُس رات چمن کا ایک پر نور ستارہ ——— چاندنی کا ایک نازک پھول ہمیں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں اسے توڑنے کے لئے لپکی لیکن تو نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "حسن کچھ دور ہی سے نظر افروز ہوتا ہے"!

میں رک گئی لیکن میرا دل مچلا جاتا تھا کیونکہ چاہت کو ہمیشہ حصول کی آرزو رہتی ہے!

بس اے سکھی! وہی میرے اور تیرے ملاپ کی آخری رات تھی جس کا خیال میری دلسوزی کے لئے تازیانہ ہے۔ رقص موسیقی کے بغیر ہمیشہ تشنہ رہتا ہے! پھر میں تجھ سے جدا ہو کر کیسے شاد رہوں۔ میں نے تو تیرے بغیر کبھی کسی منظر کا لطف نہیں اٹھایا!!!

اے سکھی! یہ ایک سہانی شام ہے جنگل میں کیف چھایا ہوا ہے۔ آفتاب غروب ہو چکا ہے۔ دھندلی سی سرمئی نقاب کے نیچے نوزائیدہ چاند "ماہ پارہ" بن کر چمک رہا ہے اور اس کے گرد تاروں کے پھیلے ہوئے شرار، بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کے نیل پر ایک افشاں چھڑک دی گئی ہے!

سماوی سطح ہموار و نظر فریب ہے لیکن متبسم و گلریز صحرا تو خوبیوں کا مرقع بنا ہوا ہے، جہاں لطیف اور تازہ ہواؤں نے عجیب ترنم زا کیفیت پیدا کر دی ہے۔ خوشنما اور دلفریب پھولوں پر آج غیر معمولی نکہت ہے۔ ندی کی لہریں برابر لوٹ رہی ہیں اور کبھی کبھی ان کے ٹھہرنے پر معلوم ہونے لگتا ہے کہ پانی کی عمیق گہرائی فلک تمثال بن گئی ہے!

خاموش جنگل میں، دریا کے کنارے پر معلق، خدا جانے کتنی کافوری شمعیں روشن ہیں یعنی جگنو تیز ہوا سے ٹکرا ٹکرا کر نیچے گرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے تارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہیں!

آہ! کہیں پپیہا گا رہا ہے مگر اس کا وجد آفریں ترانہ مجھے اب ایک دل سوز نغمہ معلوم ہوتا ہے!

مجھ سے بہت دور کہیں آبشار الاپ رہے ہیں لیکن اُن کے راگ میرے لئے اب ایک "ماتمی لَے" ہیں!

جس میں ربابِ دل کے غمگین تاروں کو چھیڑ دینے کے سوا، کوئی اور حلاوت نہ ہو! مجھے ہوا کی شوخیاں بھی ناپسند ہیں اور پھولوں کی مسکراہٹ سے ایک غمناک خیال میری روح میں نفوذ کر رہا ہے۔ آہ کائنات اپنی حسن آرائی کے لئے کوئی موقع و محل نہیں دیکھتی!

ملائم و نازک گھاسیں بھی میرے لئے آرام دہ نہیں محسوس ہوتیں۔ ندی کا خرامِ عشوہ پاش برابر جاری ہے اور میں نہیں جانتی کہ اس کی لہریں میرے کتنے آنسوؤں کو بہا لے گئیں ہیں!

یہ شام نہ جانے کیوں اتنی دلفریبیاں لے کر طلوع ہوئی ہے جو حسن کو نظارہ کا آرزومند کردے لیکن آہ مجھے اس سے کچھ سروکار نہیں کیونکہ میں بہار کے سارے لطف بھول چکی ہوں۔ اے سکھی! گزر جانے والی رات میری آنکھوں میں سما گئی ہے جب تو میرے ساتھ تھی۔ اب کوئی منظر میری نگاہوں میں نہیں سماتا۔ جب تو ساتھ نہ ہو تو ایک اکیلی، تیری سکھی، کس چیز سے دلچسپی لے؟ کیونکہ اے سکھی! بہار کے بغیر تو، کبھی بلبل بھی چمن میں نہیں آیا کرتی!

اے کاش! وہ مسرت بار لمحے پھر پلٹ آئیں جن میں تو مجھ سے ملنے آیا کرتی تھی۔ کاش تو پھر اسی اندازِ خرام سے واپس آجائے!

تجھے ان لہروں کی سوگند! بتا؟ اے میری اچھی سکھی کہ تو کب آئے گی؟ کیا تو اس لئے نہیں آتی کہ میں نے تیری واپسی کے لئے، ندی کے کنارے سے کوئی نایاب تحفہ نہیں چنا؟

دنیا میں نایاب تحفے تو شاید یہی ہیں، پھولوں کی کلیاں، مسرت کے الفاظ، محبت کے جذبات موتیوں کی لڑیاں اور ستاروں کی ہنڈیاں مگر سب اپنی جگہ پر خوبصورت و نظر فریب ہیں اس لئے میں ان میں سے کس کو انتخاب کرتی؟؟

ہاں مجھے یاد آتا ہے کہ تجھے چھائے ہوئے آسمان کے بکھرے ہوئے ستارے بہت پسند تھے مگر میں تیرے لئے تاروں کے سنہرے گوہر کہاں سے پاؤں؟

اچھا سُن اے سکھی! میں اپنے اشکوں کا، اُن اشکوں کا جو میں نے تیری یاد میں بہائے ہیں قطرہ قطرہ جمع کر کے اُن کی لڑیاں پروؤں گی اور اے سکھی! جب تو واپس آئے گی تو میں یہ ہار تیرے گلے میں ڈال دوں گی!!!

خاک نشیں

تہذیب فاطمہ عباسی

محفلِ ادب

ملی جلی بولی

۱۹۲۹ء کی آل انڈیا ہندی پرچار سبھا کے صدر ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری تھے۔ اُن کا خطبۂ صدارت جہاں ہندوستانی زبان کی ترقی اور اصلاح کی مؤثر تجاویز کا حامل ہے وہاں ادبی لحاظ سے بھی ایک نہایت دلکش اور بلند پایہ چیز ہے۔ ہم اس کا اقتباس یہاں درج کرتے ہیں:۔

ہم ایک ملی جلی ہندوستانی زبان کے پھیلانے کی ترکیبیں سوچنے اور اس راستہ میں جو دشواریاں اور کٹھنائیاں ہیں ان پر غور اور وچار کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں۔

اس ملی جلی زبان کی بابت میں دو باتیں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ ایک تو خود زبان کی شکل صورت دوسری اس کی لکھن کی بابت۔ پہلے خود زبان کو لیجیئے۔ کوئی بھاشا یا تو بولنے والوں کے دل کی حالت اور جذبات کو ظاہر کرتی ہے جسے نہ کوئی روک سکتا ہے نہ بدل سکتا ہے۔ یا پھر یہ اس کا ذریعہ ہوتی ہے کہ دن رات کی زندگی میں جو ضرورتیں پڑیں ان کو ایک دوسرے پر ظاہر کر سکیں۔ بھاشا ان دونوں صورتوں میں سے کیسے پیدا ہوئی اس کی بابت کسی کا کوئی خیال ہو ہندوستانی بھاشا کے لئے تو ہر حالت میں ایک ہی راستہ پر آگے بڑھنا ہے۔ ہم اگر یہ مان لیں کہ ملی جلی زبان اپنی اصلی غرض کی وجہ سے کبھی بھی صرف ایک گروہ کی زبان نہیں ہو سکتی جس میں دوسرے گروہ کی بھاشا ذرا بھی ملی نہ ہو تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم کسی گروہ کے اچھے لکھنے والوں کا یہ حق چھینے لیتے ہیں کہ وہ اپنے خاص انوکھے انداز میں لکھیں اور اس طرح بھاشا کے خزانے کو مالا مال کریں۔ ہاں یہ بات ضرور غور کرنے کی ہے کہ جان بوجھ اور سوچ سمجھ کر اچھے لکھنے والے کہاں تک زبان میں دخل دیں۔ اور میں اس پر اس جگہ زیادہ کہنا نہیں چاہتا لیکن یہ تو سب مانیں گے کہ آپس میں میل جول سے جو ضرورتیں پیدا ہوتی ہیں اُن کا زبان پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ معاشی اور آرتھک ضرورتوں سے بھاشا میں کتنے ہی نئے نئے لفظ آجاتے ہیں اسی میل جول سے چھوٹے چھوٹے گانوؤں کی زبان بڑھ کر صوبہ کی زبان اور یہ بڑھ کر ساری قوم سارے دیس کی زبان بن جاتی ہے۔ یہی نہیں کہ ایک جگہ اور دوسری جگہ کی زبان الگ ہوتی اور پھر مل جل کر ایک بنتی ہے خود سماج میں ایک حصہ ایک طرح بولتا ہے اور دوسرا دوسری طرح۔ گانوں کے کسان اور شہر کے شہری بات چیت کا اپنا

اپنا انداز رکھتے ہیں شاعر اور کوی بھاشا میں اپنی جدا رسم بنا لیتے ہیں۔ اپدیش اور وعظ کہنے والے اپنا الگ رنگ نکال لیتے ہیں مگر پھر بھی یہ سب مل جل کر ایسی بھاشا بنا دیتے ہیں جو سب کی سمجھ میں آتی ہے اور جسے سب مان لیتے ہیں اور یہ سب کچھ چپکے چپکے ہوتا رہتا ہے۔ بھاشا کے جو بولنے والے سچ مچ کوئی اچھی بات یا کوئی بری بات کہتے ہیں یا کسی بات کو اوروں سے اچھی طرح کہہ دیتے ہیں انہیں کا طریقہ سب کو بھاجاتا ہے اور سب اسی پر چلنے لگتے ہیں۔ مدرسے، اخبار، کتابیں ناٹک یہ سب چیزیں اپنے اثر سے زبان کو ایک سا بنانے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ پر اگر ان اثروں سے کوئی بھی جان بوجھ کر اس کی فکر کرے کہ کسی ایک گروہ کی زبان تو ملی جلی بھاشا میں زیادہ آجائے اور دوسرے کی اس میں ذرا نہ ملنے پائے، کسی ایک پیشہ والے کے شبد تو لے لئے جائیں اور دوسرے کے نہیں، کسی ایک صوبہ کی بات چیت کا انداز بھاشا میں جان بوجھ کر ملایا جائے دوسروں کا نہیں، تو پھر یہی سب چیزیں قومی راشٹری بھاشا کی ترقی میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ یہی بات ہے کہ میں ان کوششوں سے بہت ڈرتا ہوں جو ہندوستانی زبان کو مسلمانوں کی زبان بنانے کے لئے عربی لفظ ٹھونس کر اور ہندوؤں کی زبان بنانے کے لئے سنسکرت لا کر کی جاتی ہیں۔ جو لوگ اپنے دیس کے لوگوں سے بات چیت ہی نہیں کرنا چاہتے اچھا ہے کہ وہ عربی یا سنسکرت ہی کو اپنی زبان بنا لیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ ان زبانوں میں بھی کچھ بہت نہ کہہ سکیں گے۔ مگر خیر ان کی خوشی۔ مگر وہ ایک ملی جلی ہندوستانی زبان کی جڑ کیوں کاٹتے ہیں انہیں اگر عربی یا سنسکرت سے بہت لگاؤ ہے تو وہ ہندوستانی زبان کو ہندو مسلمان راجا اور پرجا اوترا اور دکھن کے رہنے والوں کی ملی جلی زبان بننے سے کیوں روکتے ہیں . . . اگر وہ ایسا کریں گے تو یہ ننھا سا بچّہ جو اسی میل کے لئے پیدا ہوا تھا کیسے بڑھے گا۔ ہندوستانی بھاشا نہ عربی ہے نہ سنسکرت، اور نہ ہو سکتی ہے، یہ تو بس ہندوستانی ہے یعنی اس بڑے دیس کے سب رہنے والوں کی زبان جس میں سب ایک دوسرے کی بات سمجھیں جس پر سب کو ناز ہو جس کی سیوا میں سب کا حصہ ہو، جس پر پورا قبضہ کرنے کا حوصلہ کوئی نہ کر سکے جو لوگ ہندوستانی زبان کا پرچار کرتے ہیں ان کا پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ اس میں زبردستی ایسے عربی اور سنسکرت لفظ نہ ملنے دیں جن سے یہ سب کی زبان نہ رہنے پائے اور کسی ایک فرقہ کی زبان بن جائے۔ اس لئے کہ سب کے میل جول کی یہاں تو ملی جلی زبان ہونی چاہئے۔

میں نے جو کچھ کہا اس سے آپ یہ سمجھیں گے کہ میں بھاشا کو بس کام کاج کے لئے ضروری جانتا ہوں کہ ایک آدمی دوسرے سے اپنا مطلب کہہ سکے، منڈی اور بازار میں اپنا لین دین کا کام نکال سکے اور اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ بھاشا سہل اور سادہ، اور سب کی سمجھ میں آنے والی اور سب کے لئے ایک سی ہو۔ ہاں آپ کا یہ سمجھنا بہت کچھ ٹھیک ہے میں بے شک بھاشا کا یہ کام سمجھتا ہوں پر خالی یہی نہیں سمجھتا الگ الگ دیسوں کے لوگوں میں بات

چیت کے لئے جو زبانیں لوگوں نے بنائی ہیں جیسے مولینا کی ہماری زبان یا اسپرانتو جس میں ہر چیز کے آخر میں "وہ" ہر صفت کے آخر میں "آ" ہر کام کے نام کے آخر میں "ای" سارے حکموں کے آخر میں "او" ہے یا اسی طرح، اور میں نہیں چاہتا کہ آپ ہندوستانی بھاشا کو کتر بیونت کر ایسا با قاعدہ کر دیں۔ میں مانتا ہوں کہ کار و بار، کام کاج سے آگے بڑھ کر ہر زبان اپنے آپ کو خوبصورت اور سندر بنانے کا بھی حق رکھتی ہے۔ ہر زبان کے ٹکڑوں میں آپس میں ایسا رشتہ ہوتا ہے جو بس اسی میں ہوتا ہے اور کسی میں نہیں ہوتا اور ہر زبان کو اس خوبصورتی کے پیدا کرنے کا حق ہے پر میرا یقین ہے کہ جہاں کہیں آدمی اپنے دل کے حال کو اچھی اور خوبصورت اور سندر طرح سے دوسروں پر ظاہر کرتا ہے، چاہے بھاشا میں چاہے تصویر میں، چاہے بات میں چاہے راگ میں چاہے بڑی بڑی عمارتوں میں۔ جو چیز سچی طرح سندر ہوتی ہے اس کا کسی نہ کسی مفید اور کام کی چیز سے ضرور بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ بھاشا میں بھی حسن اور خوبصورتی کام کی باتوں کے ساتھ چل سکتی ہے، نہیں تو یہ ممکن ہے کہ بھاشا ضرورت سے زیادہ خوبصورت، ضرورت سے زیادہ بناوٹی ہو جائے۔ بہت زیادہ لکھے پڑھے بن بن کر باتیں کرنے والے ہمیشہ زبان کو ایسا ہی بناوٹی بنا دیتے ہیں پر ہر کوئی جانتا ہے کہ یہ لوگ زبان کے کچھ بہت بڑے دوست نہیں ہوتے۔ کام کی بات اور بناوٹ سجاوٹ میں جب آپس کا رشتہ کمزور ہو جاتا ہے تو زبان نیچے گرنے لگتی ہے، ایک دوسرے کو اپنا مطلب سمجھانے کی ضرورت اپنا راستہ لیتی ہے اور بناوٹ سجاوٹ اپنا۔ عام لوگ پہلی کے ساتھ ہوتے ہیں، بہت پڑھے لکھے دوسری کے ساتھ لیکن جدائی سے زبان کے دونوں حصے بڑے ٹوٹے میں رہتے ہیں۔ لیٹن زبان کا حشر یہی ہوا۔ یونانی اور سنسکرت پر یہی گزری۔ میرے نزدیک تو کسی زبان کے اوپر بڑھنے اور نیچے گرنے کی اس سے بہتر کوئی نشانی نہیں کہ اس میں کام کی بات اور بناوٹ سجاوٹ میں کیا تعلق ہے۔ جب کوئی قوم بنتی ہوتی ہے، جب بڑی بڑی باتیں اور نئے نئے خیال سب تک پہنچانے ہوتے ہیں، جب آپس کے جھگڑے مٹنے مٹانے ہوتے ہیں، جب سب چیزوں کی کایا پلٹنی ہوتی ہے تو زبان کو سہل اور سادہ رہنا پڑتا ہے اور بناوٹ سجاوٹ دور کھڑی رہتی ہے۔ پر جب قوم بن جاتی ہے ترقی کے رستے پر پڑ لیتی ہے با چین سے دن کاٹتی ہے، جب مدت بڑھ جاتی ہے، لوگ سب ایک طرح رہنے سہنے لگتے ہیں رسم و رواج سب میں ایک سے ہو جاتے ہیں تو زبان میں بناوٹ سجاوٹ کے دن آتے ہیں، ہم تو ابھی اپنی قوم بنا رہے ہیں ہماری زبان کو سہل اور سادہ رہنا چاہئے۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ اس سادگی کے ساتھ جس کے لئے میں آپ سے کہہ رہا ہوں آپ کی بھاشا سندر اور خوبصورت اور زوردار نہیں ہو سکتی۔ ضرور ہو سکتی ہے۔ پر تب ہی کہ یہ آدمی آدمی میں بس اپنا کام نکالنے کے لئے بول چال کا

کا ذریعہ نہ ہو بلکہ دل کے اندر بھری ہوئی آگ کی گرمی ہو جو باہر نکلے۔ دلوں کے اندر لہریں مارتے ہوئے دریا کا بہاؤ ہو جو سینہ میں نہ سما سکے اور باہر بہ نکلے۔ ہندوستانی زبان کے لئے دل کی یہ گرمی اور خیالات کا یہ بہاؤ ایک ملی جلی ہندوستانی قوم کے خیال سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ ہندوستانی زبان اسی ملاپ کا نشان ہے، ہم میں یہ خیال جتنا سچا ہوگا اور اسی خیال کے ساتھ جن چیزوں کو لگاؤ ہے جب وہ بڑھیں گی تو ہماری زبان میں بھی گرمی اور خوبصورتی آئے گی۔ قوم کو جن چیزوں سے لگاؤ اور جن باتوں سے پریم ہوتا ہے اُنہی کا روپ اُس کی زبان کی خوبصورتی اور زور میں دکھائی دیتا ہے۔

اب رہا لکھن کا سوال ہیں جہاں لفظوں کے معاملہ میں ہندو مسلمان دونوں سے چاہتا ہوں کہ وہ ایک دوسرے کا خیال کریں اور اپنا الگ الگ خاص حق نہ جتائیں اور زبان میں جس جس جگہ سے ہو سکے ایسے لفظ لائیں جو ہماری بھاشا کے رنگ سے میل کھاتے ہوں۔ ہاں لکھن کے معاملہ میں ہندو یا مسلمان کسی سے نہیں چاہتا کہ وہ اپنی لکھن چھوڑ دیں۔ میں نے اپنی سواگت سمیتی کے سبھاپتی کی وہ بات بڑی دلچسپی سے سنی جو انہوں نے مسلمانوں سے کہی ہے کہ وہ عربی لکھن چھوڑ کر دیوناگری لکھن اختیار کر لیں۔ انہوں نے یہ بات دل سے کہی ہے اور صاف صاف کہی ہے، جسے میں بہت پسند کرتا ہوں لیکن میرا خیال ایسا نہیں ہے۔ میرا یقین ہے اور میں نے کانگریس کے سبھاپتی کی حیثیت سے بھی یہی کہا تھا کہ ہندو مسلمانوں میں جو سیاسی یا مذہبی بگاڑ ہے وہ اصل میں ایک زیادہ گہرے مقابلہ کی اوپری شکل ہے جو ہندوستان کے سوا اور ملکوں میں بھی رہا ہے اور تاریخ جس سے ناآشنا نہیں۔ یہ دراصل دو الگ تہذیبوں کا فرق ہے جو ایک دوسرے سے آکر ملی ہیں۔ اس بگاڑ کو دور کرنے کی سب سے اچھی شکل میرے خیال میں یہ ہے کہ ہر تہذیب کو باقی رہنے کا حق دیا جائے، آپس میں رواداری اور ایک دوسرے کی عزت پیدا کی جائے اور ایسے موقع نکالے جائیں کہ دونوں آپس میں مل کر ایک دوسرے کی دل کی لگی کو سمجھ سکیں۔ اس میں ہندوستان کا سیاسی بھلا ہی نہیں دیکھتا بلکہ اس کی تہذیب اور تمدن کی ترقی کے لئے بھی یہی ضروری ہے کہ اس دیس میں جتنی قومیں آباد ہیں اُن کے تمدنوں کو اپنی اپنی جگہ پر رہنے اور پھلنے پھولنے کا حق دیا جائے تاکہ آنے والی ہندوستانی تہذیب کے دل لبھانے والے راگ میں ہر ایک اپنا اپنا سر ملا سکے۔ یہ ضروری ہے کہ اس میں دیر لگے گی مگر تمدنوں کا ملنا اور بدلنا کوئی بازیگروں کا کھیل اور تماشا نہیں کہ جب چاہا انہیں ملا دیا اور جب چاہا بدل دیا۔ ہم میں اتنی عقل ہونی چاہئے کہ ہم ٹھہر سکیں انتظار کر سکیں۔ مسلمانوں سے یہ کہنا کہ وہ اپنی عربی لکھن چھوڑ دیں، ان سے یہ کہنا ہی کہ تم اپنی ساری تاریخ کے سرمایہ سے ہاتھ دھو بیٹھو، اس لئے کہ اسی لکھن کے ذریعہ تو اس خزانہ کی کنجی اس کے ہاتھ میں آئی ہے جس میں اس کے سارے پچھلے کام رکھے ہیں۔ یہ کنجی اس سے چھین لینا خود اسی کے لئے برا نہیں ساری دنیا کے لئے برا ہے۔

وجدانیات

ہر جلوہ ترے حسن کی محفل نکلا ہر ذرہ ترے درد کا حامل نکلا
جب غور سے یہ ہستی عالم دیکھی تاحد نظر سلسلۂ دل نکلا

کیا لطف نظارہ ہے یہ جلوہ کیا ہے ترکیب دل و دیدۂ بینا کیا ہے
کیا دیکھا نگاہوں نے، نہ دیکھو اس کو یہ دیکھو نگاہوں میں تماشا کیا ہے

خون دل پر شوق بہا دیتی ہیں اشکوں سے گل تازہ کھلا دیتی ہیں
روتا ہوں تو سیر غم ہجراں کے لئے آنکھیں مری اک باغ لگا دیتی ہیں

"خضر راہ"

تعلیمات کبیر

۱- پھولوں کے باغ میں نہ جا، اے دوست وہاں نہ جا!
خود تیرے جسم میں پھولوں کا باغ پوشیدہ ہے۔
"تو کنول کی ہزارہا پتیوں میں اپنی جگہ بنا اور وہاں سے حسن لازوال کا تماشا کر۔

۲- "مخلوق برہما (خالق) میں ہے اور برہما خود مخلوق میں موجود ہے" وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہیں اور ملے ہوئے بھی۔
وہ خود درخت بھی ہے بیج بھی اور نمو بھی وہی ہے۔ وہ خود پھول ہے۔ میوہ بھی اور سایہ بھی وہی ہے۔
وہ خود سورج ہے، روشنی بھی اور ہر وہ چیز بھی جو روشنی سے منور ہو جائے۔ وہ خود برہما ہے، مخلوق بھی اور مایا بھی۔
وہ خود مختلف صورتوں میں اور لامحدود مکان میں جلوہ گر ہوتا رہتا ہے۔
وہ خود سانس ہے، لفظ بھی اور لفظ کا مفہوم بھی وہی ہے۔
وہ خود حد ہے، خود ہی لامحدود بھی ہے، اور محدود اور لامحدود کی حدود سے بالاتر بھی ہے۔
وہ خود پاک ہے اور ہر آلائش سے مبرا ہے، وہ برہما اور مخلوق سائر و دائر ہے۔

۳- "اے پانڈے! تو کہتا کیا ہے؟ ہندو اور ترک، یہ کہاں سے آئے ہیں۔ یہ راستہ کس نے نکالا ہے؟ اپنے دل کی تلاشی لو، بہشت کہاں ہے۔ کس نے اُسے حاصل کیا ہے؟ اے بیوقوف! ان خالی خولی باتوں کو ترک کر اور رام نام جپ۔ تم تو بدمعاشی کی باتیں کرتے ہو۔ اے کبیر! جس نے آخری وقت میں رام کی حفاظت قبول نہ کی وہ سخت گھاٹے میں رہا"

"اردو"

مطبوعات جدیدہ

پروازِ خیال ۔ یہ جیبی تقطیع کی ایک نہایت خوبصورت مجلد کتاب ہے، جسے خواجہ حمید الدین صاحب حمید لکھنوی کا دیوان کہنا چاہئے۔ ابتدا میں خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی کے قلم سے ۴۵ صفحے کا ایک مبسوط مقدمہ ہے، اس کے بعد صاحب دیوان کی مختصر التماس ہے اور پھر غزلیات ہیں جو ۲۸۰ صفحات پر ختم ہوتی ہیں۔ کتابت طباعت اور کاغذ کا بڑا اہتمام کیا گیا ہے۔ ہر صفحہ دو رنگوں میں چھپا ہے، بیل دار جدول کا رنگ سرخ ہے اور مضمون کے لئے عام سیاہ روشنائی استعمال کی گئی ہے۔

مقدمہ میں عشرت صاحب نے پہلے تو زبان اردو کی مختصر تاریخ لکھی ہے، پھر مرکز کا جھگڑا چھیڑا ہے اور اس سلسلہ میں عثمانیہ یونیورسٹی کی "مردم ناشناسی" اور خدمتِ زبان میں عوام کی شرکت کا گلہ کسی قدر ناگوار الفاظ میں کیا ہے اور پھر حمید صاحب کی شاعری پر تنقید لکھی ہے۔ حمید صاحب کی زبان واقعی نہایت صاف اور صحیح ہے۔ اشعار فن کے لحاظ سے بے عیب ہیں، لیکن ان میں کیف و اثر اور جدت و ندرت کی بہت کمی ہے۔ عموماً مضامین بالکل سادہ ہیں۔ چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں:۔

طور پر لطفِ دید کا نہ ہوا ۔۔۔ آج تک صورت آشنا نہ ہوا

تیرے بیمار سب اچھے ہیں ۔۔۔ کوئی منت کشِ دوا نہ ہوا

جلوہ گر جب تیغ لے کر سامنے قاتل ہوا ۔۔۔ نازکی چلا کے بولی تو بھی اس قابل ہوا

مٹ گیا چمن والو حیف ہے نشاں اپنا ۔۔۔ تھا اسی فضا میں تو کل تک آشیاں اپنا

قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ یہ ہے:۔ خواجہ حمید الدین صاحب، ۹۔ امین الدولہ پارک لکھنؤ۔

"دی سٹار" انگریزی زبان کا ایک ہفتہ وار علمی، ادبی اور سیاسی اسلامی اخبار ہے جو مولوی عزیز احمد صاحب کی ادارت میں الہ آباد سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ اسلامیات پر اس میں بعض نہایت مفید اور پر معلومات مضامین شائع ہوتے ہیں۔ قومی معاملات پر آزادانہ رائے رکھتا ہے۔ ہمارے خیال میں مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے میں یہ اخبار بہت بڑا حصہ لے گا۔ حجم ۲۰ صفحات اور سالانہ قیمت چھ روپے بارہ آنے ہے۔

"کامیابی" ۔ حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لمیٹڈ دہلی کا ماہوار رسالہ ہے۔ اس وقت تک اس کے چھ پرچے شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں اچھے اچھے ادیبوں کے قلم سے تجارتی اور اخلاقی مضامین شائع ہوتے ہیں جن میں مسلمانوں کو علم و عمل کی تلقین کی جاتی ہے اور انہیں ترقی و کامیابی کے راستے بتائے جاتے ہیں۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت اچھا ہے۔ سرورق مصور ہے اور بلاک کے ذریعہ سے چھاپا گیا ہے۔ حجم ۴۸ صفحات اور سالانہ چندہ دو روپے۔

مخزن الحساب و الجبر ۔ یہ حساب و الجبرا کی ایک جامع کتاب ہے جس میں ورنیکلر مڈل ایس وی کلاس اور نارمل سکولوں کے نصاب کے مطابق ایک ہزار دو سو نہایت اہم امتحانی سوالات درج کئے ہیں۔ مشکل سوالات کے حل اور حل کے متعلق ہدایات بھی لکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ۱۹۰۰ء سے لے کر ۱۹۲۹ء تک ورنیکلر فائنل امتحانات کے پرچے بھی دیئے ہیں جن سے کتاب اور زیادہ کارآمد ہو گئی ہے۔ مخزن الحساب یقیناً حساب کی تمام مروجہ کتابوں کا نچوڑ ہے، اور جو طلبا اسے زیر مشق رکھیں گے ضرور کامیاب ہوں گے۔ حجم ۲۵۶ صفحات، قیمت ایک روپیہ۔ کتب خانہ ناشر العلوم لاہور سے طلب فرمایئے۔